سترونمبر اِل–۱۸۹۲



جامعہ

اُردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد (۲۴) | ماہ جنوری سنہ ۳۵ء | نمبر (۱)

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

اسلام اور عورت

اگرچہ "اسلام اور عورت" ایک ایسا مبحث ہے جو آج کل بہت پامال اور فرسودہ ہو چکا ہے۔ اُنیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع سے لے کر اس وقت تک اس پر سینکڑوں مقالات اور بیسیوں رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق صحیح کی روشنی میں خالص قرآن و حدیث کے اعتبار سے اس مسئلہ پر ابھی تک اس حیثیت سے کوئی تفصیلی نظر نہیں ڈالی گئی ہے کہ اسلام نے انفراداً و اجتماعاً عورت کو کیا حیثیت دی ہے۔۔ بہشتی زیور کی قسم کے رسائل اور مصری مصنفین کی بعض کتابیں اس موضوع پر پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اُن میں قرآن و حدیث سے اس درجہ سطحی بحث کی گئی ہے کہ جو تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابل اعتنا قرار نہیں پا سکتی۔ پھر اس قسم کی کتابیں چونکہ اُن حاملانِ علم شریعت کی طرف سے شائع ہوئی ہیں جو خود اپنے قول کو کسی سند سے کم بلند نہیں سمجھتے اس لئے ان میں حوالوں سے افسوسناک طریقہ پر بے توجہی برتی گئی ہے۔ پھر نفس موضوع پر بھی جو کچھ بحث کی گئی ہے اُس میں اس قسم کی مناظرانہ شان پائی جاتی ہے جس کے بعد مقالہ نگار اس تصور کو پیش نظر رکھ کر قلم اُٹھاتا ہے کہ وہ حریف کے ہر رطب و یابس اور عا کو باطل قرار دے گا۔ اور اس لئے اس قسم کی تصانیف میں دلائل سے زیادہ مذہبی پندار، اپنی معلومات اور اپنے انہماکِ علمی کا اظہار، حریف کی علومِ دینیہ سے بے خبری، تہذیب جدیدہ پر رکیک الزامات اور سب سے بڑھ کر نامناسب سخر و استہزا اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ اس کی موٹی تہوں میں اصل حقیقت سمٹ سمٹا کر ناقابل التفات ہو جاتی ہے۔ پھر نئے انگریزی داں نوجوانوں نے اس مبحث پر جو دماغی کاوشیں پیش کی ہیں اُن میں بھی خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ سے اسی قسم کی بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ علما کے کیرکٹر جائز یا ناجائز حملوں، قدامت پرستانہ ذہنیت کی برائیوں اور رسم و رواج کی تباہ کاریوں پر جذباتی اعتبار سے جتنا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے اُس کا عشر عشیر بھی بے لوث تحقیق کی نذر نہیں کیا گیا۔ بلکہ اکثر اوقات تو نصوص و سنن بھی اس قدر جذباتی رنگ میں پیش کی جاتی ہیں کہ اطمینان بخش

نہیں کہا جاسکتا۔ اور اس لئے اس بظاہر بوسیدہ عنوان میں ابھی بہت سی جدّتیں ایسی پنہاں ہیں جن کو آشکار کرنا میرے اس مقالہ کا مطمح نگاہ ہے۔

میں اس میں پردہ، تعلیم نسواں، آزادی نسواں یا طلاق و خلع کے مسائل پر کوئی خصوصی بحث نہ کروں گا۔ بلکہ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ نصوصِ صریحہ اور شہاداتِ نبویہ کی رہبری سے یہ تبلاؤں کہ "اسلام نے عورت کو کیا سمجھا ہے"

پھر مجھے افسوس ہے کہ اس چیز کو پیش کرنے میں شاید میں اُن دلدادگانِ تقلید کی نظر میں معتوب ہو جاؤں جو اسلام کو صرف فقہا کے اقوال اور صوفیہ کے طرزِ عمل کی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ اس کے بالکل خلاف میرے استدلال کی ساری بنیادیں صرف قرآن کریم کی آیات اور نبیٔ عربی کے اقوال و اعمال پر قائم ہوں گی۔

ہمارے فقہا اور علما کا جو نظریہ عورت کے متعلق ہے اُس کے اعتبار سے عورت انسانی جماعت کا ایک ایسا جزو قرار پاتی ہے جو انفراداً کور دماغ پیدا ہوتی ہے، منزلاً غلام ہوتی ہے، اور اجتماعاً یا مدنیتہً کچھ نہیں ہوتی۔ پھر بدقسمتی سے اس کے ثبوت میں قرآن و حدیث کے بعض اقوال اس درجہ عمومیت کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں کہ آج ایک بچہ بھی "ھُنّ ناقِصاتُ العَقْلِ" کے مرعوب کن الفاظ استعمال کر کے عورت کی انفرادی شخصیت کو غیر وقیع سمجھتا ہے۔ اسی طرح " الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ " کی آیت کا جو مفہوم سمجھا گیا ہے اس کے ماتحت منزلی اور ملّی زندگی میں عورت کی تمام آزادیاں سلب ہو کر رہ گئی ہیں۔ اور اس لئے آج کل حالت یہ ہے کہ اگر علما اور فقہا کے اقوال نقل کر کے ایک جوابِ استفتا تیار کیا جائے تو اس کا ماحصل یہ ہوگا کہ "عورت سوسائٹی کی غلام بن کر پیدا ہوئی ہے اور اس کا فخر غلامی ہے، شادی سے پہلے باپ یا ولی اس کی قسمت کا مالک ہے، شادی کے بعد شوہر اس کے "منافع" خرید لینے کے سبب سے اس پر مالکانہ تسلّط رکھتا ہے، انفرادی اعتبار سے اس کو خود اپنے متعلق بہت کم اختیارات ہیں، معاشرتی زندگی میں اس کی آواز ناقابل التفات ہے۔ قومی اور ملّی معاملات میں تو اس کا ذکر بھی مضحکہ خیز ہے"

یہ ہے عورت کا وہ منظر جو خالص اسلامی منظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جو حقیقۃً موجودہ تحقیقات کے اعتبار سے قابلِ تسلیم بھی ہے۔

پھر میں اگر یہ ظاہر کروں کہ اسلامی نقطۂ نظر اس کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ میں خدانخواستہ گذشتہ صدیوں کے ائمہ کبار، فقہائے عظام یا محدثین کرام کی نیتوں پر شبہہ کر رہا ہوں یا ان کی مذہبی معلومات سے انکار کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی عظمت ہر اس قلب میں ہونا چاہئے جو علمی تحقیقات کی کاوشوں سے بے خبر نہیں ہے حقیقۃً انھوں نے جو کچھ کہا وہ حسنِ ضمیر کے ساتھ صداقت سمجھ کر کہا۔ اور اس لئے مجھے جو کچھ شکایت ہے وہ اِن تقویٰ پرست علما سے نہیں ہے بلکہ اُس مسموم سوسائٹی سے ہے جس نے خلافتِ راشدہ کے بعد اموی بادشاہوں کے جھنڈوں کے نیچے پرورش پائی۔ اُس افسوسناک بدعت سے ہے جس کی بنیاد یں حضرت معاویہ نے شام میں استوار کر کے اسلامی تعلیمات کے رُخ کو بالکل منقلب کر کے رکھ دیا۔ اور جس کے بعد سے وہ پودا جس کو دنیا کی بلند ترین شخصیت نے اپنے قول و عمل کی مبارک طاقتوں سے لگایا تھا۔ اور جسکو صحابہ نے اپنی صداقت اور راستبازی کے خون سے سینچا تھا آج تک صحیح معنیٰ میں برگ و بار نہ لا سکا۔

خیر سوسائٹی کی اس بادِ صرصر نے عورت کے مسئلہ پر جو کچھ اثر کیا اُس سے تو ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں۔ ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ قرآن و حدیث کے اعتبار سے عورت کی کیا قدر و قیمت سمجھ میں آتی ہے۔

دنیا میں انسانی زندگی کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ عورت کی زندگی پر بھی ہم انھیں تین پہلوؤں کے اعتبار سے نظر ڈال سکتے ہیں:۔

(۱) انفرادی زندگی

(۲) منزلی زندگی

(۳) سیاسی اور ملی زندگی

عورت کی انفرادی زندگی

انفرادی زندگی میں اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کو جو حیثیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ جگہ یہ بتلایا گیا ہے کہ عورت و مرد کو اعمال کا اجر مساوی ملے گا۔ اور اخلاقی اعتبار سے کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جس سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں زیادہ احتراز کی ضرورت ہو۔

البتہ بعض مقامات پر عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خلقتاً ایسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس کو ناقص العقل کہنا اس کی جبلّت اور خلقت کے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ ایک ایسی کیفیتِ عارضہ کی بنا پر ہے جو زائل ہو سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جس طرح ہر رنگین کپڑے کو سرخ، سبز، نیلا، پیلا کہہ سکتے ہیں اور یہ کہنا ہر حیثیت سے صحیح بھی ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ سرخ کپڑے کی تخلیق میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہمیشہ سرخ رہے اسی طرح ہزاروں برس کی بے انصافیوں کی بنا پر عورت کی دماغی صلاحیتوں پر جو زنگ آگیا تھا اس کی وجہ سے اس کو ناقص العقل کہا گیا ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ "نقصانِ عقل" اس کی فطرتِ اصلیہ کا جزو ہے۔ یا اس میں فطرتاً وہ استعداد ہی مفقود ہے جو مرد میں پائی جاتی ہے۔

بہر حال احادیث نبوی میں جہاں جہاں عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے وہ اسی "کیفیتِ عارضہ" کی بنا پر ہے۔ اس لئے ایک عرصہ سے عورت کو سوسائٹی نے جو پست درجہ دے رکھا تھا اس کی وجہ سے نقصانِ عقل اس کی ذات میں طبیعت ثانیہ کی طرح راسخ ہو گیا تھا۔ اسلام نے عورت کو بلند کرنا چاہا لیکن دفعتہً اس کو اُس سطح پر نہیں لایا جا سکتا تھا جس پر مرد کھڑا تھا اس لئے اس کے تحفظ کے لئے کچھ اس قسم کا نظام بنایا کہ اگر اس کے مطابق انسانی معاشرت اپنا لائحۂ عمل مرتب کرتی تو آج "اسلامی عورت" کی جو پوزیشن دنیا میں ہوتی وہ یورپ کی ذہنیت کے مقابلہ میں ہزار درجہ بلند نظر آتی۔

پھر جس طرح کسی کو تعلیم پانے سے پہلے جاہل کہنا اس کی "صلاحیتِ علمی" کو فنا نہیں کر دیتا

اسی طرح عورت کو ناقص العقل کہنے کے معنے صرف یہ ہیں کہ اس وقت کی سوسائٹی میں عورت کی حالت حقیقۃً ایک ایسی ہستی سے کچھ بلند نہ تھی جس کی عقل میں فتور آچکا ہو۔

بہرحال اسلام کے خلاف یہ ایک شرمناک بہتان ہوگا اگر ناقص العقل سے یہ مراد لی جائے کہ عورت فطری اعتبار سے فاترالعقل پیدا ہوتی ہے۔

اس امر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات و احادیث پر غور کیجئے:

"ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ نے نبی کریم سے فرمایا کہ مہاجرین کے فضائل میں مردوں ہی مردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی" [۵۱]

"بیشک میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا، خواہ مرد ہو یا عورت،

تم آخر ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو" (پارہ ۴ سورۂ آل عمران، رکوع ۲۰، آیت ۱۹۴)

اس آیت کی تفسیر میں شیخ زادہ نے حاشیہ بیضاوی میں لکھا ہے:-

"جس طرح مرد و عورت انسانیت کے اعتبار سے ایک ہی اصلیت رکھتے ہیں اور پھر آپس میں ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح اعمال کے اجر کے اعتبار سے بھی وہ یکساں ہیں جس طرح مرد کو اس کے اعمال کا اجر دیا جائے گا اسی طرح عورت کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا۔" [۵۲]

یہاں قرآن مجید نے جس اصول کو پیش کیا ہے وہ اس قدر واضح اور غیر مبہم ہے کہ اس کے بعد یہ کسی حیثیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ عورت فطرتاً مرد کے مقابلہ میں عقلی اعتبار سے ناقص ہے۔ اس لئے کہ "بعضکم من بعض" (تم آخر ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو) کا ایک مستحکم اصول پیش کرنے کے بعد گویا یہ بتلایا گیا ہے کہ عورتوں کو مردوں سے جدا کوئی ایسی جنس نہ سمجھو جن کے احکامات میں بنیادی اختلاف ہو۔ پھر اگر آپ اس آیت کو ذرا غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ

[۵۱] رواہ الترمذی

[۵۲] جلد سوم صفحہ ۱۹۷

حضرت ام سلمہؓ کے جواب میں عورتوں سے یہ کہا جارہا ہے کہ " تم خواہ مخواہ ایسے سوالات کیوں کرتی ہو جو بے ضرورت ہیں ۔ بھلا خدا کسی عورت کے اعمال کو ضائع کرسکتا ہے درآنحالیکہ مرد و عورت دونوں کچھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں "

ایک مرتبہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :- " مجھ کو دنیا میں صرف تین چیزیں پسند ہیں ، خوشبو عورتیں اور نماز کا سکون "

اس پر صاحب عنایہ لکھتے ہیں ۔

" معاذ اللہ یہاں عورتوں سے محبت کا سبب جسمانی تلذذ اور مادی انتفاع ہرگز نہیں ہے جیسا کہ ایک دفعہ کسی منہ پھٹ نے یہ کہہ دیا کہ خواہشاتِ نفسانی سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ بچ سکے اور اپنی جہالت کی بنا پر اس کی تائید میں یہ حدیث نقل کردی ۔ اس کو سن کر ایک بزرگ نے اس کو برا بھلا کہا اور اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا ۔ مگر ذاتِ مبارک کے خلاف اس رکیک الزام کو سننے سے سخت فکر میں مبتلا ہوگئے ۔ اتفاقاً خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے دیکھا ! " اس نے ہم پر تہمت رکھی تھی ۔ اس لئے ہم نے اس کو قتل کردیا " چنانچہ اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد کسی ڈاکو نے اس کو قتل کر ڈالا " ۵۷

اس حدیث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عورت سے بے لوث دوستانہ رابطہ پیدا کرنا " تلذذ جسمانی " کے رابطہ سے کہیں زیادہ بلند ہے ۔ اس لئے کہ جب " جنسی انتفاع " کو علیحدہ کرلیا جائے تو عورت سے محبت کرنے کی حیثیت وہی ہوسکتی ہے جو ہم کو اپنے کلاس فیلو، اپنے پروفیسر، اپنے بھائی، باپ، چچا اور پڑوسی سے ہوتی ہے ۔

اس حدیث کی روشنی میں عورت کی انفرادی پوزیشن جس درجہ رفیع ہو جاتی ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے ۔

---

۵۷ جلد ثالث صفحہ ۳۹

"هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" (پارہ ۲، سورہ بقرہ رکوع ۲۳، آیت ۱۸۷) کی تفسیر میں علامہ ابن جریر نے قتادہ، سدی اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کے اقوال بسند نقل کر کے لکھا ہے کہ یہاں "لباس" کے معنے "سکن" (یعنی "سکون و آرام کا سبب") ہیں[۵۱] اور اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا:۔

"عورتیں مردوں کے لئے سکون و آرام کا سبب ہیں اور اسی طرح مرد عورتوں کے لئے"

یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ اگر عورت کی انفرادی حیثیت مرد کے مقابلہ میں قابلِ وقعت نہ ہوتی تو صرف عورتوں کو مردوں کے لئے باعثِ آرام کہہ دیا جاتا۔ لیکن دونوں کو ایک حیثیت سے پیش کرنا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی سطح گو سوسائٹی نے پست کر رکھی ہو لیکن حقیقۃً وہ دونوں باہم مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے اثنا میں فرمایا:۔ "اے مردو! تم عورتوں کے مسئلہ میں، خدا سے ڈرتے ہوئے، بہت احتیاط برتا کرو اس لئے کہ وہ خدا کی امانت ہیں جو تمہارے پاس ہیں"

یہ خطبہ چونکہ رسول کریم کی زندگی کا آخری خطبہ تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے۔ گویا اس کا ہر ہر لفظ ایک مستقل وصیّت نامہ ہے جو آنحضرت نے اپنی اُمت کو عطا فرمایا ہے۔

عورتیں ایک عرصہ سے پامال چلی آرہی تھیں۔ سوسائٹی کی اس طویل پامالی نے ان کے دل و دماغ تک کو متاثر بنا دیا تھا۔ جہل اور بد خلقی ان کی طبیعت میں مرکوز ہو چکی تھی۔ عوام کی ذہنیت یہ ہو گئی تھی کہ عورت سے لذّتِ جنسی کے علاوہ اور کسی قسم کے تعلق کا امکان ہی باقی نہ رہا تھا۔ پھر دنیا کے تمام مذاہب بھی متفقہ طور پر عورت کی اس بد حالی پر شد ید ضربیں لگاتے رہتے تھے۔ عیسائیت کی زندگی میں منزلی مودّت و محبت کا نام نہ تھا[۵۲] بدھ مذہب کا بلند معیار یہ تھا کہ مرد کو چاہئے کہ عورت کو ایک گھناؤنی

---

[۵۱] جلد ثانی صفحہ ۹۱۔ [۵۲] انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا جلد ہفتم صفحہ ۱۷۱

چیز سمجھ کر اُس سے الگ الگ رہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی ایک جداگانہ عبادت گاہ بنوائی جائے[۹۱] خود عرب میں عورتوں کی جو کچھ درگت تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں جائداد کی طرح بیٹے کے قبضہ میں ورثہ کے طور پر منتقل ہو جاتی تھی۔

یہ تھی عورت کے مسئلے میں دنیا کی حالت جب رسول کریم نے عورت کے ساتھ انصاف کرنا چاہا۔ لیکن ہزاروں برس کی پامال شدہ ہستی کو دفعتہً خاک سے اٹھا لینا ناممکن تھا۔ اس لئے تدریجی طور پر لوگوں کی ذہنیت بدلنا شروع کی اس لئے کہ خود عورتوں کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ کسی بلند اصلاح کو اپنے اندر جذب کر لیتیں۔ اسی بنا پر ایک طرف تو عورتوں کو اخلاقی رفعتوں کی جانب اُبھارا، اُن پر حصول علم کو فرض قرار دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے معائب بھی ان پر ظاہر کئے۔ اور دوسری طرف مردوں کو حسنِ سلوک کی ترغیب دی۔ اور ان پر اپنے گھر کی عورتوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دینا واجب بتلایا۔[۹۲] حیاتِ مسعود کے آخری سال حجۃ الوداع کے خطبہ میں جو جملے عورت کے متعلق فرمائے گئے ہیں وہ حقیقتہً اپنے اندر معانی کا ایک دریا پنہاں رکھتے ہیں جس چیز کو آپ نے دو جملوں میں ادا فرمادیا ہے میں کوشش کے بعد بھی اس کو کئی صفحات میں کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا۔ بہر حال اجمالی حیثیت سے اس حدیث کا ماحصل یہ ہے؛ مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کے مسئلہ میں بہت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔ اور اپنی ذاتی رائے سے یا رسم ورواج کے ماتحت کوئی کام نہ کریں بلکہ ہر وقت خدا سے ڈرتے رہیں اور سوسائٹی کے مرعوب کن فیصلوں کے خلاف ان تمام احکامِ قرآنی کی پابندی کریں جن سے عورت کو علم وعقل کی بلندی حاصل ہو سکے گی۔ مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کو بالکل خدا کی امانت سمجھیں اور اس لئے اپنے نفع نقصان کے ڈر سے اُن کے نشوو ارتقا کے راستہ میں پہلے کی طرح کوئی چیز حائل نہ کریں۔

۹۱ انسائیکلو پیڈیا برٹیانیکا جلد ۲ صفحہ ۴۳۰

۹۲ ملاحظہ ہو بخاری ومسلم کتاب العلم

یہ ہے اس وصیت نبوی کی مختصر سی تفصیل جو نبی کریم نے اپنی زندگی کے آخری سال مکہ معظمہ کو منبر پر کھڑے ہو کر عورت کے مسئلہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ رسم و رواج کے جس بُت کو اس گرز سے ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا اس نے رسول کریم کی وفات کے کچھ دن بعد پھر لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ پا لیا۔ پھر گو عورت کی مظلومیوں میں بہت کچھ کمی آگئی لیکن جس بلند معیار کی طرف نبی کریم نے رہبری فرمائی تھی وہ بروئے کار نہ آسکا۔

اس قدر بحث کے بعد عورت کی انفرادی پوزیشن بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن مزید تحقیق کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کر لیجئے:۔

۱۔ سورۂ بقر میں طلاق کے مسائل کا ذکر کر کے کہا گیا ہے:۔

"یہ قوانین خدا نے مقرر کئے ہیں۔ تم ان کے خلاف ہرگز کچھ نہ کرنا۔ اور جو کوئی بھی خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنے لئے دوزخ مول لے گا" (رکوع ۲۹، آیت ۲۲۹)

اصولی نقطۂ نظر سے طلاق کے قوانین بتلا دینے کے بعد قرآن کو خاموش ہو جانا چاہئے تھا لیکن قرآن ایک ٹھوس قانون ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کی اصلاح کے لئے ایک مستقل ہدایت نامہ بھی ہے اس لئے ضرورت تھی کہ طلاق کے مسئلہ میں عورت کے جس عزت و وقار کو قرآن نے ملحوظ رکھا تھا اس پر مرد کو سختی کے ساتھ عمل کرانے کے لئے خاص طور پر تنبیہ کی جاتی۔ کیوں کہ جو ذہنیتیں ہزارہا سال سے بگڑی ہوئی تھیں ان کی اصلاح کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے عورت کے مسائل کا ذکر کرنے میں جگہ جگہ تنبیہی جملے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً "اِتَّقُوا اللّٰہ" "حُدُودُ اللّٰہ" "سَمِیعٌ عَلِیم" "عَزِیزٌ حَکِیم" "بَصِیرٌ خَبِیر" "ھُمُ الظَّالِمُون" "فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ" وغیرہ وغیرہ

۲۔ ایک جگہ ہے:۔

"اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور اُن کی عدت پوری ہو جائے تو یا تو تم قاعدہ کے مطابق (تجدید نکاح کر کے) ان کو اپنے گھر میں رہنے دو اور یا ان کو خندہ پیشانی کے ساتھ گھر سے جانے کی اجازت دیدو لیکن اُن کو تکلیف پہنچانے

کی نیت سے یا ان پر زیادتیاں کرنے کے ارادہ سے اُن کو نہ روکو۔ اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے لئے دوزخ مول لیتا ہے۔ اور دیکھو! خدا کے احکامات کو بے وقعت سمجھ کر ہنسی میں نہ اُڑانا۔" (پارہ ۲، سورہ بقرہ، رکوع ۲۹، آیت ۲۳۱)

اس آیت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے مسئلہ میں عوام کی ذہنیتیں کس قدر زہر آلود ہو چکی تھیں۔ ورنہ خدا کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی:۔

"اور دیکھو! خدا کے احکامات کو بے وقعت سمجھ کر اُن کو ہنسی میں نہ اُڑانا۔"

ایک جگہ ہے:۔

"جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی عدّت کا زمانہ بھی پورا کر چکیں اور پھر وہ باہمی رضامندی سے قاعدہ کے مطابق کسی شخص کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ تم ان کو اس نکاح سے منع کرو۔ اس مضمون سے اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ پر ایمان لایا ہے۔ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ اس نصیحت کا قبول کرنا تمھارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(پارہ ۲، سورۂ بقرہ، رکوع ۳۰، آیت ۲۳۲)

اس آیت میں کس درجہ وضاحت کے ساتھ مردوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عورتوں کی فطری آزادی میں دخیل نہ ہوں۔ پھر یہ کہہ کر کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" رسم و رواج کے اس دیرینہ بت کو توڑا گیا ہے جس کی وجہ سے مردوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ عورتوں کے ساتھ بھی انسانوں کی طرح سلوک کرنا اُن کا فرض ہے۔

ایک جگہ ہے:۔

"جن عورتوں کو تم طلاق دیدو (اُن سے بالکل بے تعلق ہو کر نہ بیٹھ رہو بلکہ) اُن کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ اللہ سے ڈرنے والوں

خدا کی طرف سے یہ چیز مقرر کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے فائدہ
کے لئے احکام بیان کرتا ہے (اس توقع پر) کہ شاید تم میں عقل آ جائے اور تم سمجھ سکو۔"

(پارہ ۲۔ سورہ بقرہ، رکوع ۳۱، آیت ۲۴۱ و ۲۴۲)

اس آیت کے آخری حصہ پر غور کیجئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس چیز کو خوب سمجھتا تھا کہ سوسائٹی کے فیصلوں کے مطابق عورت کو بہت بے وقعت سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی لئے جب اس نے یہ حکم دیا کہ "طلاق کے بعد بھی ان کو فائدہ پہنچاتے رہو" تو فوراً اس نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ سوسائٹی اس حکم کو ایک مضحکہ خیز حکم سمجھے گی۔ چنانچہ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آیت کے آخری حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مقصود زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ہے:۔ "تم نے عورت کے مسئلہ میں بہت غیر منصفانہ فیصلے کر رکھے ہیں اور اسی وجہ سے تم کو اس قسم کی جزئی اور معمولی معمولی باتیں اس امید پر بتلائی جاتی ہیں کہ شاید تم میں عقل آ جائے اور تم اُن کے مسئلہ میں صحیح طور پر غور کر کے ان کے ساتھ مناسب سلوک کر سکو۔"

عورت کی منزلی زندگی

عورت کی منزلی زندگی کے دو شعبے کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ازدواج سے پہلے۔ اور

(۲) ازدواج کے بعد۔

ازدواج سے پہلے عورت کی پوزیشن

تعجب ہے کہ اسلامی قوانین کے مطابق ازدواج سے پہلے یعنی باپ کے گھر میں عورت کو جو بلند حیثیت عطا کی گئی ہے وہ آج مغربی ممالک میں تہذیب و تمدن کی اس گرم بازاری کے باوجود مفقود ہے۔ دنیا کی ہر قوم کے نزدیک ایک گھر میں لڑکی کا پیدا ہونا باعثِ مسرت نہیں سمجھا جاتا۔ اب بھی تہذیب حضارت کی عام ترقیوں کے باوجود دنیا میں ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں جو لڑکی کے وجود کو اپنے لئے لعنت سمجھتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ اس مسئلہ میں یہ ہے۔

"اور جب اس کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم و غصہ سے کالا
پڑ جاتا ہے۔ وہ اس خبر کو شرم کے مارے اپنی قوم سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔
اور سوچتا ہے کہ آیا اس ذلت کو برداشت کرلے یا اس لڑکی کو زندہ زمین میں
گاڑ دے، یاد رکھو! ان لوگوں کے یہ فیصلے بہت ہی بُرے ہیں۔"

(پارہ ۱۴ سورہ نحل رکوع، آیت ۵۸ و ۵۹)

اس آیت میں وضاحت کے ساتھ اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ نہ تو لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلہ میں فروتر سمجھنا چاہیئے۔ اور نہ محبّت و شفقت میں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان کوئی امتیاز روا رکھنا چاہیئے۔

ملکیت اور وراثت کے مسئلہ میں لڑکیاں بالعموم بے حق سمجھی جاتی ہیں حتّیٰ کہ آج کل بھی آئین و اصول کی ان تمام تابناکیوں کے باوجود عام رسم و رواج کے ماتحت عملاً لڑکیاں اپنے آپ کو محروم سمجھتی ہیں۔ قرآن کی ہدایت اس کے متعلق یہ ہے:۔

"ماں، باپ اور قریب کے اعزا مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں
کے لئے بھی حصہ ہے اور اسی طرح ماں یا باپ اور قریب کے اعزا مرنے کے بعد جو کچھ
چھوڑ جائیں اس میں سے عورتوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے۔ ایک مقررہ حصہ"

(پارہ ۴ سورہ نسا، رکوع آآیت)

لیکن میراث میں مرد کے مقابلہ میں عورت کا "مقررہ حصہ" کچھ کم رکھا گیا ہے اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کا درجہ کسی نوعیت سے عورت سے بلند ہے۔ قرآن اس چیز کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"مرد عورتوں کے سرپرست ہیں[۵]، اوّل تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض مردوں

---

[۵] یہاں اصل لفظ "قوّام" ہے جس کا ترجمہ بالعموم "حاکم" کیا گیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ "قوّام" میں دراصل کفالت و

کو بعض عورتوں پر فضیلت دی ہے[۵۱] اور دوسرے اس لئے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔"   (پارہ ۵، سورہ نساء، رکوع ۶، آیت ۳۴)

علامہ اسمٰعیل قنوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"اس سے قبل کی آیات میں میراث کا ذکر ہے جس میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں ایک تہائی[۵۲] بتلایا گیا ہے۔ چونکہ میراث کی اس تفریق سے عورتوں کے دماغ میں فطرتاً یہ خیال پیدا ہونا چاہئے تھا کہ ان کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے۔ اس لئے اس آیت کے ذریعہ سے میراث کی زیادتی میں مرد کے استحقاق کا سبب تبلایا گیا ہے۔"[۵۳]

اس آیت میں مرد کے حق وراثت کی زیادتی کا سبب مرد کی سرپرستانہ فضیلت کو قرار دیا ہے۔ اور اس فضیلت کے دو سبب بتلاتے ہیں۔ ایک سبب اتفاقی اور دوسرا سبب واقعی۔

سبب اتفاقی | (۱) "اللہ نے بعض مردوں کو بعض عورتوں پر فضیلت دی ہے۔

یعنی اگرچہ عام مرد عام عورتوں کے مقابلہ میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہیں رکھتے۔ اور فطری نقطہ نظر

پرورش کا مفہوم پنہاں ہے۔ یعنی "قوّام" اُس شخص کو کہا جا سکتا ہے جس کی برتری کا واحد سبب "سرپرستانہ کفالت" ہو۔ اور اس لئے گو "سرپرست" کے لفظ سے بھی "قوّام" کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا مگر تاہم "حاکم" کے مقابلہ میں ذہن کو اصل مفہوم کے زیادہ قریب پہنچا دیتا ہے۔

۵۱ قرآن کی اصل عبارت یہ ہے۔ "بما فضّل اللہ بعضھم علی بعضٍ" یہاں "بَعْضَھُمْ" میں "ھُمْ" کی ضمیر "رجال" کی طرف راجع ہے۔ اور دوسرے "بعضٍ" کے بعد "ھُنّ" کی ضمیر محذوف ہے۔ اگر ان مضمرات کی جگہ اسم ظاہر رکھ دیا جائے تو عبارت یوں ہو جائے گی:۔ "بعض الرِّجال علیٰ بعضِ النساء"

۵۳ قنوی شرح بیضاوی جلد ثالث صفحہ ۲۱۵

۵۲ عورتوں کا حصہ وراثت میں بمقابلہ مرد کے ایک تہائی نہیں بلکہ نصف ہے۔ اور دو صورتوں میں برابر ہے ایک کلالہ سے وراثت لینے میں اور دوسرے باپ اور ماں جب اولاد کے ساتھ ہوں برابر برابر حصہ پاتے ہیں یعنی ایک ایک سدس۔ جامعہ۔

سے دونوں ایک ہی سطح پر کھڑے نظر آتے ہیں لیکن خاص مردوں کا مقابلہ اگر خاص عورتوں سے کیا جائے تو مردوں کو شرف و برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مردوں میں بعض ایسے مکمل ترین انسان پائے گئے ہیں جن کے مقابلہ میں کوئی عورت پیش نہیں کی جا سکتی۔ یا بعض مردوں نے انسانیت کے جس اعلیٰ معیار کو حاصل کر لیا ہے اس تک کوئی عورت نہیں پہنچ سکی ہے۔ اور اس لئے مردوں کی فضیلت کے لئے یہ فخر کچھ کم نہیں ہے کہ ان کی صف میں ایسے ایسے شجاع، غیور اور عادل افراد پیدا ہوئے کہ کوئی ایک عورت بھی ان کی نظیر میں پیش نہیں ہو سکتی۔ تمام انبیائے کرام اور اکثر اولیائے عظام مرد تھے اور اس لئے مرد اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے عورتوں سے زیادہ با شرف ہے۔

لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس فضیلت کا ذکر کر دینے سے قرآن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کی یہ فضیلت عورتوں کے کسی فطری نقص کی بنا پر ہے۔ یعنی اگر عورتوں میں مردوں کے بالمقابل کوئی بلند ترین ہستی پیدا نہیں ہوئی تو اس کے یہ معنی نہ سمجھنا چاہئیں کہ اس کی وجہ ان کی طبعی نا اہلی ہے۔ بلکہ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، اس کا واحد سبب یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی ہمیشہ سے عورت پر کچھ اس درجہ مہربان رہی ہے کہ اس نے کبھی اس کو اتنا دم لینے ہی نہ دیا کہ وہ سر اٹھا کر اپنے دماغ سے کچھ سوچ سکے یا کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر سکے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ نسلاً بعد نسلٍ عورتوں کے اخلاق میں پستی اور ان کے اعمال و افعال میں بے اعتدالی پیدا ہوتی رہی۔ اور اس لئے قرآن نے اس آیت میں مرد کی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے وہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ "واقعہ یوں ہی ہے" نہ اس لحاظ سے کہ "فطرت بھی یہی ہے"۔

میں نے اس سبب کو "سبب اتفاقی" اسی لئے کہا ہے کہ بلا واسطہ میراث کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ضمناً مرد کی ایک خصوصی فضیلت کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

سبب واقعی | (۲) "مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں"۔

یہاں فضیلت کا سبب یہ بتلایا گیا ہے کہ چونکہ مرد پر مہر اور نفقہ وغیرہ بھی فرض ہے اس لئے ان حقوق کی ادائیگی کے اعتبار سے عورت کے مقابلہ میں مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔

حقیقۃً استحقاق وراثت میں مرد کی فضیلت کا واحد سبب صرف یہی ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعی رح اور امام مالک رح اور دیگر ائمہ کبار نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر مرد میں عورت کو نان نفقہ دینے کی صلاحیت باقی نہ رہے یا وہ دانستہ اس کے دینے سے اعراض کرے تو قاضی کو چاہئے کہ اس کا نکاح فسخ کرادے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:۔

"اور مرد کو عورت پر فضیلت اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کو نان نفقہ دیتا ہے۔ اور طلب معاش کی مساعی میں دن رات منہمک رہتا ہے۔" [۹۱]

علامہ رازی فرماتے ہیں:۔

"اور اگرچہ معاشرتی اور مادی انتفاع کے لحاظ سے ازدواج کے بعد مرد و عورت دونوں ایک حیثیت سے منتفع ہوتے ہیں لیکن پھر بھی خدا نے مردوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ عورتوں کو مہر ادا کریں اور ان کے خورونوش وغیرہ کے کفیل ہوں۔ اور اس لئے عورت کے حقوق کی اس زیادتی کے بعد میراث کے مسئلہ میں مرد کے مقابلہ میں جو کمی تھی وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اور مرد کی کوئی فضیلت باقی نہیں رہتی۔" [۹۲]

بہر حال اس آیت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو یہ بتلایا جائے کہ اگر میراث میں اُن کا حصّہ مرد کے مقابلہ میں ایک تہائی رکھا گیا ہے تو یہ مرد کی کسی امتیازی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اصولاً ایسا ہی ہونا چاہئے تھا کیونکہ عورتیں مہر اور نان و نفقہ وغیرہ کی بھی حقدار ہوتی ہیں۔ اور اس لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے اُن کا حصّہ مرد کے برابر ہی ہو جاتا ہے۔

الغرض قرآن کی ان تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ازدواج سے پہلے منزل زندگی میں عورت کا مرتبہ کسی حیثیت سے مرد کے مقابلہ میں گرا ہوا نہیں ہے۔

ازدواج کے بعد عورت کی پوزیشن | ازدواج کے بعد یعنی شوہر کے گھر میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے

۹۱ جلد ثالث صفحہ ۸۳

۹۲ تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۳۱۶

عورت کی پوزیشن جو کچھ ہو سکتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

سورہ بقرہ میں ہے :-

"(۱) اور مردوں پر بھی عورتوں کے لئے وہ تمام باتیں واجب ہیں جو عورتوں پر مردوں کے لئے ہیں۔

(۲) البتہ مردوں کا درجہ کچھ بڑھا ہوا ہے" (پارہ ۲، سورہ بقرہ، رکوع ۲۹ آیت ۲۲۸)

اس آیت کے دو جزو ہیں۔ پہلے جزو کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں :-

"مردوں کے اوپر بھی اپنی بیویوں کے حقوق کی بجا آوری اور ان کی حرمت و عزت کا خیال اسی طرح واجب ہے جس طرح عورتوں کو"

دوسرے جزو کی تفسیر میں تمام مفسرین کی جو رائے ہے وہ بیضاوی کے ان الفاظ سے زیادہ اچھی طرح ظاہر ہو سکتی ہے :-

"یعنی مردوں کے حقوق میں کچھ زیادتی ہے۔ اس لئے کہ عورتوں پر جو حقوق ہیں وہ تو صرف اُن کی ذات سے متعلق ہیں۔ لیکن اس کے خلاف مردوں کے حقوق ان کی جان و مال دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہر اور ادائے نفقہ وغیرہ مرد ہی پر فرض ہے"

اس تفسیر کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں مرد کی جس فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف حقوقِ مہر و کفاف وغیرہ کی بنا پر ہے۔

اب پہلے جزو کی تفسیر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے بموجب زن و شوہر پر باہم دو چیزیں واجب ہیں۔ ایک تو آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ اور دوسرے حقوق کی بجا آوری۔ چونکہ تمام مفسرین کے قول کے مطابق آیت کے دوسرے جزو میں مرد کو جو فضیلت دی گئی ہے اس کا تعلق صرف "حقوق" سے ہے اس لئے ظاہر ہے کہ "حرمت و عزت" میں مرد و عورت دونوں برابر ہو گئے۔ یعنی اب آیت کا مفہوم یہ ہو گیا :- "مردوں اور عورتوں پر فرض ہے کہ وہ آپس میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کا احترام کریں۔ اور اپنے اُن حقوق کو جو دونوں پر برابر ہیں اچھی طرح ادا کرتے رہیں۔ البتہ

نان ونفقہ اور مہر وغیرہ کی وجہ سے مردوں پر عورتوں کے حقوق زیادہ ہیں۔"

تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے:۔" جس طرح میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میری بیوی میری وجہ سے بناؤ سنگار کرے اسی طرح میں یہ بھی اچھا سمجھتا ہوں کہ میں خود بھی اس کی خاطر بنا سنورا رہوں۔ اس لئے کہ خدا نے کہا ہے "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ"[۹۱]

ایک مرتبہ کسی صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ" ہماری بیویوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟" آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔" یہی کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب خود پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، اس کے چہرہ پر کوئی ضرب نہ لگاؤ۔ اُسے بُرا بھلا مت کہو۔ اور خواب گاہ کے علاوہ کبھی اس کو اکیلا نہ چھوڑو (یعنی اگر تم کسی بات پر اس سے بے حد ناراض ہو جاؤ تو زیادہ سے زیادہ یہ کرو کہ بیوی کے ساتھ "اختلاط" نہ کرو۔ لیکن اس کے علاوہ ایسا نہ کرو کہ اُس کو اکیلا چھوڑ کر کہیں اور چلدو[۹۲])"

سورۂ نساء میں ہے:۔

" اور اپنی بیویوں کے ساتھ حسن وخوبی سے زندگی بسر کرو۔ پھر اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو محض اس بنا پر اُن کے ساتھ بدسلوکی سے پیش نہ آؤ (اس لئے کہ) بہت ممکن ہے کہ جس چیز کو تم بُرا سمجھ رہے ہو خدا اسی میں تمہارے لئے کوئی بڑے نفع کی بات رکھ دے۔" (پارہ ۴ سورۂ نساء، رکوع ۳، آیت ۱۹)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر سدی کی سند سے لکھتے ہیں کہ" مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئیں۔ اور اُن کے ساتھ دوستانہ حیثیت سے زندگی گذاریں۔"[۹۳]

سورۂ بقر میں ہے:۔

۹۱ جلد اول صفحہ ۵۳۶

۹۲ ابن کثیر جلد اول صفحہ ۵۳۶

۹۳ جلد ۴ صفحہ ۲۰۰

"اور آپس میں ایک دوسرے پر مہربانی کرنا نہ بھولو، بیشک اللہ اُن تمام چیزوں
کو دیکھتا سنتا ہے جو تم کرتے ہو" (رکوع ۳۱، آیت ۲۳۷)

یہ آیت کس قدر جامع ہے۔ پہلے تو آپس میں لطف و مودت سے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ سوسائٹی کا مذاق بگڑا ہوا تھا، عورتوں کو ذلیل سمجھا جا رہا تھا اس لئے شدید تنبیہ کے طور پر مردوں کو مخاطب کر کے کہا گیا:۔ "دیکھو تم اپنے برتاؤ میں کچھ زیادتی نہ کرنا، یاد رکھو تمھاری ہر ہر حرکت کو خدا دیکھ رہا ہے۔"

چونکہ عورت کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی جا رہی تھیں اُن کو برداشت کرنا رسم و رواج کے ماتحت عورتیں اپنا فرض سمجھتی تھیں اس لئے مرد کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں عورت کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ کیونکہ نہ تو وہاں اُس کو کوئی دیکھنے والا ہوگا اور نہ عورت کسی کے آگے بیٹھ کر اپنا دکھ روئے گی۔

غور کیجئے کہ اس بے انصافی کے دور کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا کہ خدا پکار کر یہ کہہ دے کہ "دیکھو تم اس خیال میں نہ رہنا کہ تمھاری باتیں کوئی دیکھتا سنتا نہیں، بیشک خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔"

سورہ روم میں ہے:۔

"(اور خدا کی حقانیت کے دلائل میں سے) ایک یہ ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس
کی بیویاں بنائیں تاکہ تم اُن کی طرف مائل ہو اور اُن سے محبت کرو[۵] اور تمھارے
درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی" (رکوع ۳، آیت ۲۱)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:۔

"مرد و عورت میں محبت و ہمدردی کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ انسانی معاشرت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے جس کا انحصار باہمی امداد اور تعاون پر ہے۔ اور اس امداد و تعاون کے لئے ضروری ہے کہ

[۵] "لتمیلوا الیھا وتالفوا بھا" بیضاوی

مرد و عورت دونوں آپس میں لطف و مراعات کے ساتھ زندگی بسر کریں "

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن کریم نے متعدد بار مختلف پیرایوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عورت و مرد دونوں فطری اعتبار سے ایک سطح پر کھڑے ہیں لیکن چونکہ عورت کو ہزاروں برس کے تمدن نے پیس رکھا تھا اس لئے زندگی کی بعض ذمہ داریوں کا کفیل مرد کو قرار دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ مردوں کو مناسب ہدایتیں کردیں تاکہ جیسے جیسے عورتوں میں صلاحیت پیدا ہوتی رہے وہ "ہوم رول" کے درجہ سے گذر کر "مکمل آزادی" کے مراتب حاصل کرتی رہیں۔

لیکن منزلی زندگی میں عورت کو جو کچھ پوزیشن حاصل ہے وہ پوری طرح واضح نہ ہوگی اگر یہاں "تعدد ازدواج" پر کسی قدر تفصیلی بحث نہ کرلی جائے اس لئے کہ اس مسئلہ سے عورت کی منزلی زندگی کا بہت گہرا تعلق ہے۔

یہ مسئلہ بھی آج کل بہت دلچسپ بن گیا ہے جس پر عجیب عجیب انداز سے بحثیں کی گئی ہیں، تقشف پرست علما اس کے شدت سے حامی ہیں۔ بعض نوتعلیم یافتہ اس کو بادلِ ناخواستہ مانتے ہیں بعض نے اسلام کے اس حکم کو وحشت و بربریت پر محمول کیا ہے۔ بہرحال ہم یہاں جذباتی اعتبار سے کوئی اظہارِ خیال نہیں کرسکتے۔ ہمیں سکونِ قلب کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کا صحیح مسلک اس کے متعلق کیا ہے۔

تعدد ازدواج کی آیت کے متعلق حضرت ابنِ عباسؓ لکھتے ہیں:۔

"پہلے یتیموں کے تحفظ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی:۔ "یتیموں کو اُن کا مال دیدیا کرو۔ اور ان کے مال میں ناجائز خورد برد کرکے پاک چیز کے عوض میں پلید چیز مت خریدو۔ اور نہ اُن یتیموں کے مال کو اپنے مال میں خلط ملط کرو۔ بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے" اس آیت میں یتیموں کے مال میں بے احتیاطی برتنے پر جو شدید تنبیہ کی گئی تھی اس کی وجہ سے بنی غطفان کے کسی آدمی نے معصیت سے بچنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان یتیموں کو اپنے سے علیحدہ کردے جو اس کی سرپرستی میں تھے اور جن کے کثیر مال کا وہ متولی تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

"اور اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تم یتیموں کے مسئلہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو

دو دو یا تین تین یا چار چار عورتوں تک سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ تم اُن کے درمیان
مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی رہنے دو یا اپنی لونڈی پر اکتفا کرو۔ اور یہی
زیادہ مناسب ہے تاکہ تم کسی پر زیادتی کرنے کے مجرم نہ بنو۔"

(پارہ ۴، سورہ نساء، رکوع ۱ آیت ۴)

اس شانِ نزول کے ساتھ یہ تاریخی صورتِ حالات اور ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ آیت ہجرت رسول کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور تخمینی اعتبار سے اس کا سنہ نزول ۳ھ اور ۴ھ کے درمیان میں ہے۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا بیشتر زمانہ مکہ کے کفار یا مدینہ کے یہود کے ساتھ مسلسل جنگوں میں گذرا۔ چنانچہ اگر اس آیت کا سنہ نزول ۳ھ ہی مان لیا جائے تو اس وقت تک جو جنگیں ہو چکی تھیں اُن کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ پہلی جنگ (سریہ) عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں
۲۔ غزوۂ بدر
۳۔ غزوۂ بنی قینقاع
۴۔ زید ابن حارث کی سرکردگی میں مضافاتِ نجد کی طرف (سریہ)
۵۔ غزوۂ احد

اِن جنگوں میں مسلمانوں کے بہت سے آدمی شہید ہو گئے اور وہی نتیجہ ہوا جو جنگ عظیم کے بعد آج یورپ میں نظر آرہا ہے۔ یعنی عورتوں کی تعداد میں مردوں کی نسبت سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ یہ لاوارث بیوہ عورتیں اور یتیم بچے فطرتاً دوسرے اعزا یا اور لوگوں کی کفالت میں پرورش پانے لگے۔ اب قدرتاً ایک طرف تو یتیموں کے مال میں ناجائز دستبرد ہونا شروع ہوئی اور دوسری طرف نوجوان بیوائیں اور نوعمر یتیم لڑکیاں اپنے کفیلوں کے لئے مستقل "دعوتِ معصیت" بن گئیں۔ قرآن نے اسی خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے مذکورہ بالا آیت کے ذریعہ سے یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنے کے خلاف سخت تنبیہ کر دی۔ لیکن نوجوان لڑکیوں اور بیواؤں کے درمیان میں رہ کر "ترغیباتِ معصیت" سے منحرف رہنا انسانی فطرت سے بہت بعید تھا۔

اس لئے صحابہ کرام نے اس آیت کے نزول کے بعد معصیت سے بچنے کی خاطر یتیموں کی کفالت ہی سے اعراض کرنا چاہا ۔ اب صورت حالات بہت پیچیدہ ہو گئی ۔ ایک طرف نوجوان بیواؤں اور لا وارث نوعمر یتیم لڑکیوں کی اخلاقی حالت خطرہ میں تھی، دوسری طرف صحابہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی تنبیہ سے ڈر کر یتیموں اور بیواؤں کی کفالت سے دستبردار ہونا چاہتے تھے ۔ تیسرے عرب میں یتیم اور بیوہ عورتیں بہت غیر وقیع سمجھی جاتی تھیں اور اُن سے نکاح کرنا معیوب خیال کیا جاتا تھا ۔ ایسے نازک حالات میں عورتوں اور مردوں دونوں کو معصیت کے پھندوں سے بچانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی چارۂ کار ممکن نہ تھا کہ مردوں کو ایک محدود تعداد میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دیدی جائے ۔

چنانچہ تعدد ازدواج کے متعلق اس حکم کے نازل ہونے کے بعد جب صحابہ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے متعلق بعض باتیں دریافت کیں تو ارشاد ہوا :-

" اور یہ لوگ آپ سے عورتوں کے متعلق احکامات دریافت کرتے ہیں ۔ آپ اِن سے کہہ دیجئے کہ خدا تم کو اُن کے متعلق احکامات بتلاتا ہے ۔ لیکن وہ آیات بھی یاد رکھو جو تم کو یتیم عورتوں کے متعلق سنائی گئی ہیں ۔ جن کو تم اُن کے واجبی حقوق نہیں دیتے اور اُن کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو "

(پارہ ۵ سورہ نساء رکوع ۱۹ آیت ۱۲۷)

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لا وارث یتیم عورتوں کے مسئلہ میں عربوں کی ذہنیت کیا تھی ۔ اب اگر اس آیت کو مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ " اسلام نے تعدد ازدواج کا حکم ایک ایسے اُلجھے ہوئے موقعہ پر دیا ہے جب اس کے سوا کوئی اور نجات کا راستہ ممکن ہی نہ تھا ۔

پھر یہ ہو سکتا تھا کہ جب صورتِ حالات بہتر ہو جاتی تو یہ حکم منسوخ کر دیا جاتا ۔ لیکن چونکہ انسانی زندگی میں اس قسم کے مواقع آئندہ بھی پیش آنا ناگزیر تھے اس لئے اس حکم کو ناقابل عمل قرار دینا کسی حیثیت سے قرین مصلحت نہ ہوتا ۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اِن تمام حالات کے ماتحت بھی تعدد ازدواج کے جواز کی اجازت غیر مشروط طور پر نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ جواز کا حکم دینے کے فوراً بعد تنبیہاً یہ کہا گیا ہے:۔

"لیکن اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان مساوات کو قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک سے زیادہ شادی نہ کرو۔ اور یہی زیادہ مناسب ہے تاکہ تم کسی پر زیادتی نہ کر سکو" (پارہ ۴ سورۂ نساء، رکوع ۱ آیت ۴)

اس آیت میں تعدد ازدواج کے لئے "مساوات" کو ضروری قرار دیا ہے جس کے بعد کل آیت کا مطلب یہ ہو جاتا ہے:۔ "تعدد ازدواج اس وقت جائز ہے جبکہ مرد کو اپنی اس قوت پر پورا اعتماد ہو کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے بعد اپنی بیویوں میں مساوات قائم رکھ سکے گا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا مناسب نہیں ہے"

علامہ ابن جریر نے اس آیت کا جو مطلب لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ:۔ "جس طرح اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ تم یتیموں کے مسئلہ میں انصاف نہ کر سکو گے اسی طرح گو ہم نے تم کو چار بیویوں تک نکاح میں لانے کی اجازت دے دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ تم ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں میلانِ طبعی، تعلقاتِ جنسی اور دیگر حقوق وغیرہ میں ان کے درمیان مساوات قائم نہ رکھ سکو گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم ایک بیوی پر قناعت کرو۔ تاکہ تم اپنی بیویوں میں بے انصافی کرنے کے جرم سے بچے رہو۔ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں دس دس عورتوں سے بیک وقت نکاح کر لیا کرتے تھے اس لئے اِس آیت میں عورتوں کے حقوق کو جتلاتے ہوئے اُن کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے" ؎۵۱

بہرحال تعدد ازدواج کی ساری عمارت "مساوات" کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ مساوات قائم رکھنے کا امکان ہمارے اندر کس حد تک ہے۔

؎۵۱ جلد ۴ صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۸

قرآن میں ہے :-

"اور تم اپنی بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم لاکھ اس بات کی خواہش کرو۔ اس لئے تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ۔ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو"

(پارہ ۵ سورہ نساء، رکوع ۱۹ آیت ۱۲۹)

یہاں "مساوات" کے متعلق جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ اس پر ایک لفظ کا اضافہ ممکن نہیں ہے۔ حقیقتہً کئی بیویوں کے درمیان صحیح طور پر مساوات قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہے۔ پھر اگر اس مساوات کو قائم رکھنے کی کوشش کی بھی جائے تو "گھر کی مسرتیں" (Domestic Pleasure) مفقود سی ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی ایک مستقل عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔

حضرت معاذؓ کے متعلق مروی ہے کہ "آپ کی دو بیویاں تھیں۔ جب ایک کے گھر میں رہنے کی باری ہوتی تھی تو دوسری کے گھر میں وضو بھی نہ کرتے تھے۔ پھر یہ دونوں طاعون میں مرگئیں۔ آپ نے ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔"[۹۱]

حضرت معاذؓ کے اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے لئے گھر کی زندگی میں وہ بے تکلفی اور سکونِ قلبی باقی نہ رہا تھا جو بالعموم گھر میں حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس گھر کی چہار دیواری میں بھی آپ ایک تعجب انگیز نظم و نسق کے ماتحت کام کرنے پر مجبور تھے۔

علامہ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں پندرہ بیس صحابہ کے اقوال بسند نقل کئے ہیں جن میں سب اس پر متفق ہیں کہ "کوشش کے بعد اور تمام باتوں میں تو مساوات ہو سکتی ہے لیکن محبت اور "اختلاط" میں مساوات قریب قریب ناممکن ہے۔"[۹۲]

---

۹۱ کشاف جلد اوّل صفحہ ۳۹۰

۹۲ جلد ۵ صفحہ ۱۸۶

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے:۔ "اے خدا اپنے دل پر تو مجھے قابو نہیں ہے۔ لیکن ہاں اس کے سوا اور تمام باتوں میں مجھے امید ہے کہ میں "مساوات" کر سکتا ہوں[۵۱] یعنی یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں خلوص و محبت میں بھی اپنی تمام بیویوں سے "مساوات" برت سکوں۔ لیکن اس کے علاوہ بقیہ دوسرے حقوق کے متعلق میرا خیال ہے کہ غالباً میں اپنی بیویوں کے درمیان "مساوات" قائم رکھ سکوں گا۔

مولٰنا اشرف علی تھانوی نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اس آیت کے ذیل میں تعدد ازدواج کی غیر مشروط حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "یہاں عدل (مساوات) سے عدل فی المحبۃ مراد ہے۔ اور وہ عادتاً قدرت میں نہیں ہے۔ اس لئے اس کی نفی فرمائی۔ پس اُس ہوا پرست کے دعویٰ سے اس کو اصلا مس نہیں[۵۲] ("ہوا پرست" سے مولٰنا نے یہاں ان لوگوں کو مراد لیا ہے جو چار بیویوں کے بجائے صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنے کے قائل ہیں "فتدبّر")

گویا مولٰنا کے خیال کے مطابق اس آیت میں صرف "عدل فی المحبّۃ" کے امکان کو دشوار تبلایا گیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ اُنھوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:۔

"اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے درمیان تمام باتوں میں پوری پوری طرح مساوات قائم نہیں کی جا سکتی۔ پھر اگر ظاہری مساوات اس طرح حاصل بھی ہو جائے کہ مرد ایک ایک رات ہر ایک کے یہاں رہنے لگے تو محبّت، میلانِ طبعی اور "اختلاط جنسی" وغیرہ میں تو مساوات قریب قریب محال ہی ہے"[۵۳]

علامۂ زمخشری لکھتے ہیں:۔

"عورتوں کے درمیان مساوات قائم رکھنا اتنا مشکل کام ہے کہ بعض اوقات اس کے محال

۵۱ کشاف جلد ۵ صفحہ ۱۸۶

۵۲ جلد ثانی صفحہ ۹۲

۵۳ جلد ثالث صفحہ ۲۱۰

ہونے کا شبہ گزرنے لگتا ہے اس لئے کہ واجب تو یہ ہے کہ ان کے درمیان ہر چیز میں مساوات ہو مثلاً نان نفقہ خبرگیری، ملاقات، توجہ، ہمدردی، محبت، دلچسپی اور اس کے علاوہ وہ تمام باتیں جو شمار میں بھی نہیں آسکتیں۔

اس لئے یہ کہہ کر کہ "پس تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ" خدا کی طرف سے ایک قسم کی عتاب آمیز تنبیہہ کی گئی ہے۔" [۹]

ان ائمہ نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ تمام باتوں میں مساوات قائم رکھنا مشکل ہے۔ لیکن محبت اور طبعی میلان میں تو قریب قریب ناممکن ہی ہے۔ مگر مولانا اشرف علی کے مذکورہ بالا استدلال کا مطلب بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ "طبعی میلان" اور محبت میں مساوات قائم رکھنا عادتاً محال ہے اس لئے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ باقی باتوں میں مساوات رکھنا کافی ہے۔

یہ استدلال منطقی اعتبار سے زیادہ بعید از عقل نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

قرآن کی عبارت یہ ہے:۔ "فلا تمیلوا کل المیل" (تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو) اس آیت میں وضاحت کے ساتھ "میل" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جس کے معنی "میلان طبعی" کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر اس کے ساتھ علامہ زمخشری کا یہ قول بھی شامل کر لیا جائے کہ "اس آیت میں (ایک سے زیادہ شادی کرنے والوں کو) خدا کی طرف سے ایک قسم کی عتاب آمیز تنبیہہ کی گئی ہے" تو یہ کہنا کسی صورت سے صحیح قرار نہیں پا سکتا کہ طبعی میلان یا محبت میں مساوات قائم رکھنا ضروری نہیں ہے۔

علاوہ ازیں جس آیت میں تعدد ازدواج کے جواز کا حکم ہے وہاں یہ کہا گیا ہے:۔ "اور زیادہ مناسب تو یہی ہے (کہ تم ایک سے زیادہ شادی نہ کرو) تاکہ تم کسی پر زیادتی کرنے کے مجرم نہ ہو" گویا قرآن اس خطرہ کو

[۹] کشاف جلد اوّل، صفحہ ۳۸۹ و ۳۹۰

اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان پوری پوری "مساوات" محال ہے۔ اس لئے حالات کی پیچیدگی کی بنا پر اجازت تو سلب نہیں کی لیکن تنبیہاً اس بات کو واضح کر دیا کہ جہاں تک ہو سکے اس سے مجتنب ہی رہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی کئی بیویاں ہوں اور اس کا طبعی میلان کسی ایک کی طرف زیادہ ہو تو قیامت کے روز اُس کا ایک شانہ دوسرے شانہ کے مقابلہ میں دبا ہوا ہوگا۔[۵۱]

رسولِ کریم نے اس حدیث کے ذریعہ سے جو وعید فرمائی ہے اُس میں وضاحت کے ساتھ "میلان" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔

پھر اگر میلانِ طبعی یا محبّت میں مساوات قائم رکھنا غیر ضروری ہوتا تو نبی کریم اس چیز کو وضاحت سے ظاہر فرما دیتے۔ لیکن اس کے برعکس خود آپ کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت اس چیز سے ڈرتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام بیویوں کے درمیان ہر چیز کو برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے اور مساوات کو قائم رکھتے تھے۔ لیکن پھر بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اے اللہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کر دیا۔ اب رہا "طبعی میلان" سو اس پر مجھے قابو نہیں۔ مجھے اس میں قابل الزام نہ سمجھ"[۵۲]

غور کیجئے کہ اگر مذکورہ بالا آیت سے "طبعی میلان" کا جواز ثابت ہوتا تو پھر رسول کریم کو "مجھے اس میں قابل الزام نہ سمجھ" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں اگر "مساوات" کے مفہوم سے "میلانِ طبعی" اور تعلقاتِ جنسی کو خارج کر دیا جائے تو آیت کا یہ جزو بے معنیٰ سا ہو جاتا ہے کہ "تم کو چاہئے کہ ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو"

۵۱ ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۲۱۱

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۱۰

زن و شوہر کے تعلقات کی ساری بنیادیں میلان جنسی پر قائم ہوتی ہیں، نان نفقہ کو مناکحت کی اصل غرض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے فقہ میں مہر کو "منافع بُضع" کی قیمت کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں "ادھر میں لٹکتا چھوڑ دینے" کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک طرف میلان جنسی کی بارش ہو اور دوسری غریب کی بات بھی نہ پوچھی جائے یا وہ صرف روٹی کپڑے پر جیئے۔

پھر چونکہ رسول کریم کے اقوال اور نصوص صریحہ کی ہدایات کے ہوتے ہوئے آپ کا ذاتی عمل قابل استناد نہیں ہے اس لئے ان تمام آیات و احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعدد ازدواج کے جواز کے متعلق مندرجہ ذیل فقہی مسائل مستنبط ہو سکتے ہیں۔

(اوّل) ۱۔ اگر مرد کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کو اور اس کے بعد ہر ایک بیوی کی متوقعہ اولاد کو مساوی طور پر اس حیثیت کا نان نفقہ دے سکے جس حیثیت کے معاشرتی حلقہ میں اس کی نشست برخاست ہے۔ اور

۲۔ اگر طبی نقطۂ نظر سے اس کے جسمانی قوی میں اتنی طاقت ہو کہ وہ عمر کے آخری حصہ تک ہر بیوی کے ساتھ ایک حیثیت سے "ترغیبات جنسی" کے بموجب زندگی گذار سکے۔ اور

۳۔ اگر چند ثقہ لوگوں کی رائے میں یا قاضی کے ذاتی استدلال کی بنا پر اس کے روزمرہ کے معاملات اور طبعی افتاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی ذات سے اس بات کی توقع ہو کہ وہ اپنی بیویوں میں "مساوات" قائم رکھ سکے گا۔ تو

اس کے لئے حسب منشا ایک سے لے کر چار بیویوں تک سے بیک وقت نکاح کرنا جائز ہے۔

(دوم) اگر کسی ملک میں لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب برابر ہو۔ یا لڑکیاں لڑکوں سے کم ہوں۔ اور عام معاشرت کی بنا پر ہر لڑکی کے لئے مناسب لڑکا ملنا آسان ہو۔ اور ایک سے زیادہ بیویاں کر لینے سے دوسرے نوجوانوں کا حق سلب ہوتا ہو تو حاکم وقت کو چاہئے کہ تعدد ازدواج پر حسب اقتضائے مصلحت شدید پابندیاں عائد کر دے۔

(سوم) ان تمام شرائط کے پائے جانے کے باوجود بھی ایک سے زیادہ بیویاں کرنا مکروہ ہے۔

ان شرائط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر آپ تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں امعانِ نظر سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورتوں کی دماغی اور ذہنی ترقی اور ان کی معاشرتی حالت کی بلندی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ گذشتہ صفحات میں اس حقیقت پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ عورت ہزاروں برس سے شکستہ حال چلی آرہی تھی جس کی بنا پر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی دماغی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں فطرتاً بہت نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام نے اس بے انصافی کو جو عورت کے ساتھ کی جارہی تھی پوری طرح محسوس کیا اور اس کو دور کرنے کے لئے جو ممکن تدابیر اختیار کی جا سکتی تھیں ان کو پوری قوت کے ساتھ رائج کیا۔ چنانچہ مردوں کے قلوب میں پہلے تو یہ بات راسخ کی کہ وہ عورتوں کے مسئلہ میں بہت احتیاط برتیں، اُن کو برا بھلا نہ کہیں، اُن کو اپنی طرح پڑھائیں لکھائیں، ورثہ اور ملکیت میں اُن کو برابر کا شریک سمجھیں۔ لیکن عورت میں اُس وقت اس امر کی صلاحیت نہ تھی کہ دفعتہً سوسائٹی میں مرد کے دوش بدوش لائی جا سکے یا معاشرتی ذمہ داریوں کی بذاتِ خود کفیل ہو سکے۔ اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسلام نے تعدادِ ازدواج کے توسط سے ذی استطاعت مردوں کی سرکردگی میں عورتوں کو پوری پوری آزادی کے ساتھ اپنی اصلاح کرنے کا موقعہ دیا۔ گویا یہ ایک ٹیوٹوریل سسٹم (Tutorial System) ہے جو عورت کی دماغی اور اخلاقی ترقیوں کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

پھر عورت کو نکاح کے مسئلہ میں کامل اختیار ہے۔ مردوں کو صراحتہً ہدایت کر دی گئی ہے کہ:-

"کہ وہ جبراً عورتوں کے مالک نہ بنیں۔" (سورہ نساء، رکوع ۳، آیت ۱۹)

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی عورت کسی شادی شدہ مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر اُسی وقت راضی ہو سکتی ہے جبکہ سوسائٹی کی حالت خراب ہو، مناسب مردوں کی کمی ہو، یا عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو جائے۔ لیکن اگر یہ صورتیں نہ ہوں۔ یا عورت اپنی گذراوقات کے لئے مرد کی ضرورت محسوس نہ کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کو شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

بہرحال تعدادِ ازدواج عورتوں کے لئے ایک تحفظ (Safeguard) ہے جب تک عورتوں کو اس کی ضرورت ہے اس وقت تک وہ اس کو استعمال کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہیں۔ جس دن وہ اس چیز کو

غیر ضروری سمجھیں گی اسی دن وہ بلا کسی زحمت کے اس سے علیحدہ ہو سکیں گی۔ اور اس طرح گو شرعی اعتبار سے اس کا جواز باقی رہے گا لیکن عملاً یہ چیز مفقود ہو جائے گی۔

غرض اس تمام بحث کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تعدد ازدواج سے عورت کی منزلی زندگی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

جس طرح تعدد ازدواج عورت کی معاشرتی اصلاح کے لئے ایک مفید ترین حکم ہے اسی طرح عورت کی افسوسناک اخلاقی حالت کو دیکھتے ہوئے قرآن نے مرد کو بعض ایسے اختیارات بھی دئے ہیں جو اسکول میں ایک ہوشیار معلم کو اس لئے عطا کئے جاتے ہیں تاکہ طلبا میں علم و عمل کی صحیح اسپرٹ پیدا ہو۔ اور ان میں مستقبل کے بہترین نوجوان بننے کی صلاحیت مفقود نہ ہونے پائے۔

سورہ نسار میں ہے :-

"جو عورتیں ایسی ہوں کہ تمھیں اُن کی بد دماغی کا خوف ہو تو تم اُن کو سمجھاؤ۔ (اور اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو) اُن کی خوابگاہوں میں اُنھیں تنہا چھوڑ دو۔ (اور اگر یہ ترکیب بھی بے سود ثابت ہو تو) اُن کو مارو۔ لیکن اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں تو پھر خواہ مخواہ اُن کے خلاف کوئی حیلہ مت تراشو، بیشک خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے۔" (رکوع ۶، آیت ۳۴)

اس آیت کے شانِ نزول میں علامہ رازی نے لکھا ہے :-

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم یعنی قبیلۂ قریش کے لوگ اپنی عورتوں پر خاصا اثر رکھتے تھے لیکن جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے دیکھا کہ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ پھر جب ہماری عورتوں کا ربط ضبط ان عورتوں سے زیادہ بڑھا تو وہ ہم سے ہر بات پر لڑنے جھگڑنے لگیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے کہا کہ ہماری عورتیں ہمارے ساتھ دریدہ دہنی سے پیش آتی ہیں۔ اس پر ہمیں ان کو مارنے کی اجازت دیدی گئی۔ پھر وہ عورتیں جمع کی گئیں جو اپنے شوہروں کی شاکی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شکایات سن کر ان کے شوہروں کو قابلِ الزام قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ

اپنی بیویوں کو مارتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اچھے نہیں کہے جاسکتے جو مارنے سے اجتناب کرتے ہیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نہ مارنا زیادہ اچھا ہے "۵۷

دیگر مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں اس حدیث کو نقل کیا ہے:۔

ایک مرتبہ سعد ابن ربیع کی بیوی سے اور اُن سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا جس پر سعد ابن ربیع نے اپنی بیوی کے ایک طمانچہ مار دیا۔ بیوی کو یہ بات ناگوار ہوئی چنانچہ وہ اپنے والد کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر گئیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم بھی طمانچہ کے عوض میں اس کے ایک طمانچہ مار دو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

شانِ نزول کے متعلق اِن احادیث کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس امر کی صداقت میں شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ آیت عورتوں کی ان غیر معقول بد دماغیوں اور مجرمانہ بدخلقیوں کی اصلاح کے لئے نازل ہوئی تھیں جو سائٹی کے زہر آلود ماحول کے اثرات سے اُن میں سرایت کر چکی تھیں۔ چنانچہ اگر آپ قرآن کے اِن الفاظ کو قانونی عبارت کی خشکی اور کرختگی میں تبدیل کردیں تو بالکل یہ معلوم ہوگا کہ وزیر تعلیمات نے اسکول کے مدرسین کے نام تمام طلبار کی تہذیب و تادیب کے لئے ہدایات جاری کی ہیں۔

اس آیت میں عورتوں کی تادیب کے تین طریقے ذکر کئے گئے ہیں۔

۱۔ زبانی سمجھانا

۲۔ ناراض ہو کر ان سے " اختلاطِ جنسی " ترک کر دینا

۳۔ ان کو مارنا

پہلی دو صورتیں تو ایسی ہیں جو ہمارے عزیز ترین دوستوں اور قریب ترین اعزا میں بھی عام طور پر

---

۵۷ تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۳۱۸

زیرِ عمل آتی رہتی ہیں۔ دوست سے ناراض ہو کر اس سے شکایت کرنا، کسی بات پر اس کو سمجھانا، زیادہ ناخوش ہونے کی صورت میں اس کے یہاں آنا جانا ترک کر دینا ہماری زندگی کے معمولات ہیں۔ اور اس لئے بیوی کے مسئلہ میں اِن دونوں ہدایات سے زن و شوہر کے اُن مساویانہ تعلقات پر کوئی ضرب نہیں پہنچتی جیسے قرآن نے مختلف مقامات پر خاص اہمیت دی ہے۔

اب اس آیت میں جو چیز قابلِ غور رہ جاتی ہے وہ صرف خدا کا یہ حکم ہے کہ اگر زبانی سمجھانے اور " روٹھنے " کی دونوں ترکیبیں ناکام ثابت ہوں تو پھر " مار " سے کام لو۔ اس کے متعلق یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اوّل تو قرآن کا یہ فیصلہ بالکل اُس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار باقی ہی نہ رہے۔ پھر اس کے باوجود بھی اولیٰ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اس سے اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ شانِ نزول کے متعلق جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے اس میں بوضاحت مذکور ہے۔ اسی بنا پر تمام ائمۂ کبار کا اس پر اتفاق ہے کہ اگرچہ عورت کو مارنا بعض ناگزیر صورتوں میں جائز تبلایا گیا ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ حتی الامکان مارنے سے مجتنب رہے۔

نبی کریم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے متعلق جو ہدایات فرمائی تھیں ان کو اس آیت کی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ ہے :-

" عورتوں کا فرض ہے کہ وہ تمھارے گھر میں کسی ایسے شخص کو قدم نہ رکھنے دیں جس سے تم نفرت کرتے ہو۔ پھر اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ہلکی سی مار مارو "[۵۷]

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے مارنے کا حکم اس شدید غیظ و غضب کی حالت میں دیا ہے جبکہ اشتعالِ طبع کے ماتحت دنیا کے فوجداری قوانین میں قتل تک قابلِ معافی ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں بھی " ہلکی سی مار " کا حکم ہے۔ یعنی ایسی مار جس کا کوئی نشان بدن پر باقی نہ رہے۔

حضرت معاویہ بن حیدۃ القشیری اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۵۷ ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۸۳

نے فرمایا کہ مرد کو چاہئے کہ عورت کے چہرہ پر نہ مارے اور نہ اس کو برا بھلا کہے۔ ؁۹۱

تفسیر کبیر میں ہے کہ کوڑے یا ڈنڈے سے مارنا جائز نہیں ہے۔ اگر چاہے تو رومال کو بل دیکر اس سے مارے۔ لیکن ضربات کی تعداد بہت ہونے کی صورت میں بھی بیس تک نہ پہنچنا چاہئے ؁۹۲

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مسواک سے مار دے۔

غرض مارنے کی جو تشریح نبی کریم نے بیان فرمائی ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کو مارنا بمشکل کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ایک ہلکا سا "ٹھونکا دینا" ہوگا جو بعض اوقات ہم اپنے بے تکلف دوستوں میں بھی روا رکھتے ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جبکہ عورتیں جاہل ہوں اور جاہلانہ حیثیت سے کسی بات پر اڑ جائیں۔ سمجھانے سے بھی باز نہ آئیں اور "روٹھنا" بھی بے کار ثابت ہو۔ اور اس طرح کی "ہلکی سی مار" سے اُن کی اصلاح بھی ممکن ہو۔ لیکن اگر عورت غیور ہو اور مار کی توہین کو برداشت نہ کر سکے، یا اس کی حیثیت عرفی مرد کے مقابلہ میں اتنی پست نہ ہو کہ مرد اس پر ہاتھ اٹھا سکے۔ یا اس کے دلائل جاہلانہ نہ ہوں یا مارنے سے اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو مرد کو مارنے کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت کے لئے حکم ہے کہ۔

"اگر تم کو باہمی مخالفت کا ڈر ہو تو پھر ایک حَکَمْ مرد کے کنبہ سے لو اور ایک حَکَمْ اپنے کنبہ سے، اگر تم دونوں کو بیچ بچاؤ جھگڑا مٹانے کا خیال ہوگا تو یقیناً خدا تمہارے درمیان محبت پیدا کرے گا۔" (سورہ نساء رکوع ۶ آیت ۴۴)

غرض ان تمام امور کو سامنے رکھنے کے بعد یہ امر غیر مشتبہ طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں عورت کو مارنے کا حکم خود عورت کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض ایسی خاص صورتوں میں دیا گیا ہے جب اس کے سوا کوئی اور علاج باقی ہی نہ رہے۔ اور طلاق سے علیحدگی حاصل کر لینا عورت کی معاشرتی بربادی کا باعث

؁۹۱ ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۹۳

؁۹۲ جلد ثالث صفحہ ۳۱۸

ہوتا ہو۔ پھر مارنے کا حکم مرد کے ذاتی جذبات کے مشتعل ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس وقت ہے جبکہ عورت کی بد دماغی اس درجہ مستقل صورت اختیار کرلے کہ گھر کا امن و سکون اس کی وجہ سے تلخ ہو گیا ہو۔ یا وہ بعض ایسی غیر معقول حرکات شروع کر دے جو شرعاً اور اخلاقاً کسی حیثیت سے قابل معافی نہ ہوں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر قرآن کہتا ہے :۔

"لیکن اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں تو پھر خواہ مخواہ ان کے خلاف کوئی حیلہ مت تراشو

بیشک خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے۔" (۴ : ۳۴)

اس آیت کے آخری حصہ میں خدا کی ذات کو "بلند اور ذی عظمت" کہا گیا ہے۔ بہ ظاہر بیان خدا کی اس صفت کا ذکر بے محل سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ قرآن کی اس اسپرٹ پر گہری نظر ڈالیں گے جو عورت کے متعلق تمام متذکرہ مسائل میں شروع سے لے کر آخر تک پائی جاتی ہے اور جس کا اجمالی بیان اس سے قبل کے صفحات میں گذر چکا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس آیت کو "عَلِيًّا كَبِيرًا" (خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے) کے جملے سے ختم کرنا اپنے اندر معانی کا ایک دریا پنہاں رکھتا ہے۔ اس جملے کے مفہوم کو اگر ذرا پھیلا کر بیان کیا جائے تو یہ ہوگا :۔ "خدا نے مردوں کو اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ اگر بعض ناگزیر صورتوں میں طلاق دینے کے بجائے "معمولی سی مار" سے عورتوں کی اصلاح ممکن ہو تو تادیباً ان پر ہاتھ سے یا اسی قسم کی کسی اور نرم سی چیز سے دو تین ایسی ہلکی ضربیں لگا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جس سے نہ تو عورت کے بدن پر کوئی نشان پڑے اور نہ مستقل طور پر اس کے اندرونی اعضا میں کوئی اور تکلیف کھڑی ہو جائے۔ لیکن یاد رکھو کہ اس اجازت کا مقصد صرف عورتوں کی اصلاح ہے اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا اس طرح مردوں کی عظمت و وقار کا سکہ عورتوں پر بٹھلانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ تم دونوں فطری اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہو۔ بیشک برتری اور عظمت صرف خدا ہی کی شان ہو سکتی ہے جس کے سامنے مرد و عورت دونوں ایک حیثیت رکھتے ہیں۔"

زن و شوہر کے تعلقات پر اس اجمالی تبصرہ کے بعد اب یہ دیکھئے کہ تقسیم عمل کے اعتبار سے اسلام نے شوہر کے گھر میں عورت کو کیا خدمات سپرد کی ہیں۔

درمختار میں ہے :-

" اگر عورت گھر کا کام کاج کرنے اور روٹی پکانے سے انکار کردے خواہ کسی خاص سبب کی بنا پر اور خواہ اس وجہ سے کہ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہو اور کام کاج کی عادی نہ ہو تو ایسی صورت میں مرد پر واجب ہوگا کہ وہ اس کے لئے پکا پکایا کھانا فراہم کرے۔ لیکن اگر وہ میکے میں گھر کا معمولی کاروبار کرتی ہو اور پھر بلا سبب شوہر کے گھر میں کام کرنے سے انکار کرے تو شوہر پر اُس کے لئے تیار کھانا منگوانا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں عورت کا اخلاقی فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شوہر کی امداد کرے "[۵۱]

اس کی توضیح میں علامہ شامی لکھتے ہیں :-

" لیکن ایسی صورت میں بھی عورت کو کام کاج کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا "[۵۲]

اسی طرح بچہ کو دودھ پلانا بھی عورت پر فرض نہیں ہے۔ اگر عورت کسی وجہ سے بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کردے تو مرد پر واجب ہوگا کہ وہ اس غرض کے لئے کسی انّا کو ملازم رکھے "[۵۳]

ان احکامات کی روشنی میں عورت کی ازدواجی زندگی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ گویا اسلام نے عورت کو شوہر کے گھر میں جو پوزیشن عطا کی ہے اگر اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں :-

" عورت صحیح معنے میں مرد کی رفیق زندگی بن کر اس کے گھر میں قدم رکھتی ہے۔ مرد پر لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کے خورد و نوش کا انتظام کرے اور اس کی اخلاقی اور تعلیمی اصلاح سے کسی وقت غافل نہ ہو۔ عورت اگر چاہے تو مرد کے گھر کا کاروبار کر سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ نہ چاہے تو مرد اس کو مجبور نہیں کر سکتا۔ مرد پر واجب ہے کہ وہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور کبھی اُس کے ساتھ بدکلامی نہ کرے "

۵۱ جلد دوم باب النفقۃ صفحہ ۷۰۴

۵۲ "

۵۳ درمختار باب النفقۃ صفحہ ۷۳۲

عورت کی سیاسی اور ملّی زندگی

اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں۔ کیونکہ "قانونِ اشتراکِ عمل" کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض کو زیادہ تر گھر کی اندرونی زندگی سے متعلق کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے۔ قرآن نے عورت کو تمام شرعی مسائل میں اجتہاد کا حق دیا ہے۔ معاشرت کے تمام شعبوں میں اس کی شہادت کو مرد کے دوش بدوش قابلِ وقعت سمجھا گیا ہے [۵۱] میدانِ جنگ میں اس کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ بغرض دنیا کے تمام اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں اس کے وجود کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ام ہانی آپ کے پاس تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ "علی ایک ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کو میں امان دے چکی ہوں" آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

"ام ہانی جس کو آپ نے امان دی اس کو ہم نے امان دی۔"

جنگ کے حریفوں کو امان دینا بڑے سیاسی تدبّر کا کام سمجھا جاتا ہے جو اس حدیث کی رو سے عورت کو حاصل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کی سیاسی اہلیت کو ناقابلِ التفات نہیں سمجھا ہے۔

اس کے علاوہ تمام معاشرتی اور سیاسی مجلسوں میں عورت کو شرکت کی عام اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نوجوان لڑکیاں، خانہ نشین خواتین حتیٰ کہ حائضہ عورتیں بھی "خیر و برکت کی مجلسوں" میں شرکت کے لئے علانیہ باہر نکلتی تھیں۔ اور مسلمانوں کے عام جلسوں میں شریک ہوتی تھیں، اس پر حضرت حفصہؓ نے تعجب سے پوچھا! "کیا حائضہ عورتیں بھی جاتی تھیں؟" اس پر آپ نے ان کو یہ جواب دیا کہ "کیوں، اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، کیا

---

[۵۱] عینی جلد دوم صفحہ ۱۳۶

حائضہ عورتیں میدانِ عرفات، مزدلفہ، منا اور اسی قسم کی بیسیوں مشترک مجلسوں میں شریک نہیں ہوتیں؟"[۹۱]

"خیر و برکت کی مجلس" سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی باقاعدہ مذہبی جلسہ ہی ہو بلکہ امام عینی کی تصریح کے بموجب[۹۲] اس میں احادیث کو سننا، بیماری کی عیادت کے لئے جانا اور اسی قسم کے تمام معاشرتی اور اخلاقی فرائض داخل ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عورت نے پوچھا کہ "اگر ہم میں سے کسی کے پاس اوڑھنے کو چادر نہ ہو تو کیا اس میں کچھ حرج ہے کہ ہم ایسی صورت میں باہر نہ نکلیں۔ آپ نے اس کے جواب میں کہا "ایسی عورت کو چاہئے کہ وہ اپنی ہجولی کی چادر اوڑھ لے اس طرح کہ وہ اور اس کی ہجولی دونوں ایک چادر میں ہو جائیں۔ لیکن خیر و برکت کی مجلس میں ضرور آئے اور مسلمانوں کے عام جلسوں میں شریک ہو"[۹۳]

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں عورتوں کے باہر نکلنے پر اصرار کیا گیا ہے۔ یعنی ان کو چاہئے کہ ضرور نکلیں۔ چاہے ایک ایک چادر میں دو دو ہی کیوں نہ ہوں"[۹۴]

یہاں چادر کے لئے حدیث میں "جلباب" کا لفظ آیا ہے جو "ایسی چادر کو کہتے ہیں جس سے عورت کی پشت اور اس کا سینہ چھپ جائے"[۹۵] اس کے اوڑھنے کے بعد منہ اور ہاتھ وغیرہ کھلے رہتے ہیں جن کا کھلا رہنا اسلامی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

یہاں پردہ کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے لیکن میں طوالتِ مضمون کے خوف سے اس پر کوئی تفصیلی بحث نہ کروں گا۔ صرف یہ کہہ دینا غالباً کافی ہوگا کہ امام نووی نے اس قسم کی احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

۹۱ صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۴۷

۹۲ جلد دوم صفحہ ۱۳۵

۹۳ صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۴۷

۹۴ جلد دوم صفحہ ۱۳۵

۹۵ عینی، جلد ۲، صفحہ ۱۳۵

"عیدین وغیرہ میں عورتوں کا نکلنا مستحب ہے۔" امام ترمذی نے ابن مبارک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "آج کل اخلاقی بداعمالی کے خوف سے عورتوں کا باہر نکلنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ لیکن اگر عورت اصرار کرے تو چادر اوڑھ کر بلا زینت باہر جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

بہرحال نبی کریم کے زمانہ میں جو عمل تھا اس کو دیکھتے ہوئے نیز آپ کے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام محدثین اور فقہا اس امر کا صراحتہً اقرار کرتے ہیں کہ عورت کا گھر سے باہر نکلنا، عام جلسوں میں شرکت کرنا اور مریض کی عیادت وغیرہ کے لئے باہر جانا نہ صرف جائز ہے بلکہ استحبابی درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن آج کل اجتہاداً محض اخلاقی بداعمالی کے احتمال سے اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس وقت میرا موضوعِ سخن صرف یہ ہے کہ "قرآن و حدیث نے عورت کو کیا پوزیشن دی ہے" اس لئے ائمہ کا اجتہاد میری بحث کے دائرے سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اسلامی احکامات کا تعلق ہے عورتوں کے باہر نکلنے پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے اور نہ عام لوگوں کے سامنے ان کے منہ اور ہاتھ پیر وغیرہ کا کھولنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ البتہ آج کل کی مغربی دوشیزہ کی طرح زیب و زینت کی تھرکتی ہوئی پتلی بن کر مستقل "دعوت معصیت" بن جانا نہ اسلام کا مقصد ہو سکتا تھا اور نہ کسی اصلاحی نظام کا مقصد یہ ہونا چاہیے۔

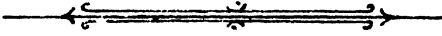
اب اس مقالہ کو اس آیت کے نقل کر دینے کے بعد ختم کرتا ہوں جس میں قرآن نے نہایت غیر مشتبہ الفاظ میں یہ تبلایا ہے کہ دنیا کی معاشرت کا شیرازہ مرد و عورت کے باہمی مساویانہ اتحاد و موانست پر قائم ہے اور اس لئے دونوں کو چاہیئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے کے معین و مددگار بنے رہیں:۔

"اور خدا کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی طرح انسان بنا کر عورتوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو سکو اور پھر مرد و عورت کے درمیان محبت و ہمدردی پیدا کی (تاکہ انسانی معاشرت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے جس کا انحصار باہمی امداد و تعاون پر ہے اور اس امداد و تعاون کے لئے ضروری

ہے کہ مرد و عورت دونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ خلوص و محبت ہو) اور بیشک ان تمام باتوں میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بہت سے دلائل پنہاں ہیں۔"   (پارہ: ۲۱، سورہ روم رکوع ۴، آیت ۲۱)

سید ابو سعید بزمی بھوپالی،

بی۔ اے،



اسلامی جمہوریت اور اشتراکیت[۵۱]

سوشلزم کی تین بنیادی خصوصیات ہیں، آزادی، مساوات اور اخوت، یہ تمام خصوصیات محمد صلعم نے اسلامی اداروں اور سوسائٹی کو عطا کئے۔

ہر مسلمان کو اصولاً مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی اور سے خائف نہیں، اور نہ خدا کے سوا کسی کے حکم کا بندہ ہے۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کا نہ سہارا ہے نہ مدد۔ ایک مسلمان سرِ تسلیم خدا کے سوا کسی دوسرے کے آگے خم نہیں کرتا۔ اِیَّاکَ نَعبُدُ وَاِیَّاکَ نَستَعِین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب عرب کے صحرائی اور ریگستانی باشندے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ عجم و روم کے حشمت ماب حکمرانوں کے پاس بھیجے گئے تو ان ملکوں کی رسم کے مطابق ان بادشاہوں کے سامنے نہ جھکے، ان کے ہیبت ناک جلال اور رتبے ان کو مرعوب نہ کرسکے اور وہ مرعوب کیوں ہوسکتے تھے، انھیں اپنے ضمیر اور ایمان کے سوا کسی اور کا خیال کیوں ہوتا؟ وہ خدا کے سوا بھلا کسی اور سے کیوں ڈرنے والے تھے، وہ ہوا کی طرح آزاد اور بے باک تھے، ان کی پرورش مذہب کے اس گہوارے میں ہوئی تھی جس نے آزادی کا سبق مکمل طور پر پڑھایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر "اللہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں" اور "اللہ کے سوا ان کا کوئی حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا' (پارہ ۷۔ انعام ۶) اور جب "اللہ اپنے آدمیوں کے لئے اپنی رحمت کھولتا ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اپنی رحمت کو روک لیتا ہے تو پھر اس کے بعد کوئی اسے جاری نہیں کرسکتا۔ وہ غالب حکمت والا ہے" (ملائکہ ۳۵۔ پارہ ۲۲)

---

[۵۱] اس مضمون کی تیاری میں جہاں کہیں سواد ملا لے لیا گیا ہے۔ چنانچہ ملک کے ایک ممتاز اہل قلم کے انگریزی مقالے "اسلام اینڈ سوشلزم" سے بڑی حد تک مدد لی گئی ہے۔

جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تمام مسلمان خواہ ایشیا کے ہوں یا یورپ کے یا افریقہ کے، خواہ سیاہ ہوں یا بھورے، سب آپس میں بھائی ہیں، ساتھ ہی ساتھ امیر ہوں یا غریب، بادشاہ ہوں یا رعایا، سرمایہ دار ہوں یا ادنیٰ مزدور، سب مساوی حقوق رکھتے ہیں، اسلام کے زرین اصول لاثانی ہیں اور جب رسول صلعم نے یہ قائم کئے تو یکایک صدیوں کی خانہ جنگیاں دور ہوئیں، اجنبی دوست ہوئے، دوست رشتہ داروں سے بڑھ کر ہو گئے، اور ان اصولوں کی کامیابی دیکھو کہ جب آں حضرت کا وصال ہوا تو خلافت کا طرۂ امتیاز رسول کے محبوب ترین عزیز کے سر نہیں بلکہ ان کے ایک صحابی کے سر رہا۔ چنانچہ عرب کے تمام مسلمان مساوی درجہ ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ بالکل ایک تھے، کسی قسم کی کوئی تفریق نہ تھی، سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا اور نہ مسلمان کبھی امتیازی خصوصیات کو مروج کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے، رنگ و ملت کی تفریق اس طرح جاتی رہی کہ حبش کے اکثر غلام مسلمانوں کے مقتدر رہنما اور اسلام کے تین برگزیدہ صحابی حسن، بلال، اور صہیب تین مختلف جگہوں یعنی بصرہ، حبش اور روم کے باشندے تھے سلمان وصہیب، و بلال سب کے سب غلام رہ چکے تھے لیکن رسول کی بارگاہ میں رو سائے قریش سے کم نہ تھے۔ یہ غلام تھے لیکن ایک بار آں حضرت نے ابوبکرؓ سے کہا کہ اگر تم نے ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا۔ اسی طرح عطار و ابن رباح، مجاہد بن جبیر، نافع مولیٰ ابن عمر اور موسیٰ بن عقبہ بزرگ ترین تابعین میں سمجھے جاتے ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے جلیل القدر لوگ زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، غلاموں نے اسلامی لشکروں کی سپہ سالاری کی اور عرب کے معزز قبیلوں کے فرزندان کی معیت میں محض معمولی سپاہی بن کر رہے، رسول اللہ نے خود اپنے غلام زید بن حارث اور ان کے لڑکے اسامہ بن زید کو جنگی مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور جلیل القدر صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا۔ غلاموں اور معزز خاندانوں کے مابین شادیاں ہوئیں اور ان کی اولاد عزت و احترام کی نظر سے دیکھی گئی، رسول صلعم نے اپنی حقیقی پھوپھی کی لڑکی زینب بنت جحش کو اپنے غلام زید بن حارث سے بیاہا۔ گو آں حضرت غلامی کی بیخ کنی نہ کر سکے لیکن غلاموں کو قعر مذلت اور حقارت سے نکال کر آزادوں کی صف میں لا کر کھڑا کیا اور اپنے پیرووں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے غلاموں کو وہی کھلائیں جو خود کھائیں اور وہی کپڑے پہنائیں جو خود پہنیں، ان سے شادیاں کرنا جائز قرار دیا

اور ان سے جو اولاد ہو ان کو حقوق کی لحاظ سے دوسروں کو برابر رکھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے ۔

تم میں جسے مومنہ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ ان مسلمان لونڈیوں سے نکاح کرے جو تمھارے قبضہ میں ہوں، اللہ تمھارے ایمان کو خوب جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، ان کی آقاؤں کی اجازت سے تم ان سے نکاح کرو۔ اور شرعی طور پر تم ان کی مہر ادا کرو بشرطیکہ وہ پاک دامن ہوں۔

(پارہ ۵ نساء ۴)

اسلام نے جو منصفانہ تعلیم غلاموں کے متعلق دی ہے اس کی نظیر کوئی قوم کسی زمانے میں پیش نہیں کر سکتی، اور اس تاریخی شہادت کو بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ غلاموں نے ہندوستان پر چھیاسی برس تک مسلسل حکومت کی، آٹھ بادشاہوں نے نہایت جاہ و جلال، و بدبہ و حشمت کے ساتھ حکمرانی کی جن میں ایک خاتون سریر آرائے سلطنت رہی، ان میں بعض بہت ہی مہتم بالشان شخصیت والے تھے اور بعض اپنی علمی فضیلت کے لحاظ سے اب تک مشہور ہیں، دہلی کا قطب مینار جس کو ہندوستان کے پہلے غلام بادشاہ نے بنایا آج بھی اپنی خاموش زبان سے متعصب یورپ کے اسلامی غلامی کے متعلق زہر افشاں پروپگنڈا پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے، اسلام نے جو غلاموں کو عزت، دستار، حشمت اور دبدبے دیے، اس کی یادگار میں یہ مینار اب تک استادہ ہے،

گبن کا بیان ہے :-

ایشیا اور افریقہ میں سینکڑوں اور لاکھوں کی تعداد میں جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے وہ ہرگز دباؤ اور جبر سے نہیں بلکہ بطیب خاطر ایک خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے، ایک جملے کے کہہ دینے سے مفتوح ہو یا غلام، قیدی ہو یا مجرم، یکایک فاتح اور آزاد مسلم کے پہلو بہ پہلو آکھڑا ہوتا اور انھیں حقوق کا مستحق ہوتا جو تمام مسلمانوں کو حاصل تھے، اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے، وہ تمام پابندیوں سے بری ہو جاتا، وہ دائمی تجرد کے عہدوں سے آزاد ہو جاتا اور اس کے تمام جذبات جو خانقاہوں میں پڑے رہنے کی باعث مردہ ہو چکے ہوتے مسلمانوں کے جنگی طبل سے پھر زندہ ہو جاتے اور وہ اپنے نئے ماحول میں اپنی ہمت و لیاقت کے لحاظ سے لامحدود طریقہ پر ترقی پذیر ہو سکتا تھا۔ اس مساوات کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام

مسلمان قوم ایک ہی روح اور ایک ہی قالب سمجھی جاتی تھی، شیخ سری سقطی نے جو صوفیائے کرام میں بہت ہی ممتاز درجہ رکھتے ہیں ایک بار فرمایا کہ میں مسلسل تیس برس سے ایک شکریہ کے نامناسب طور پر ادا کرنے کے گناہ سے توبہ مانگ رہا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ "آخر وہ کون سا گناہ ہے" فرمایا کہ ایک دن بغداد کے بازار میں آگ لگ گئی، ایک شخص دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور بولا کہ تمھاری دوکان آگ کی نظر ہوگئی، میں بول اٹھا "الحمدللہ" اب مجھے کسی چیز کی فکر دامن گیر نہ ہوگی" بعدہٗ میں بڑا پشیمان ہوا، میری اس خواہش کے یہ معنی تھے کہ میں دنیاوی جھگڑوں سے آزاد ہوکر اپنے دوسرے برادران ملت سے بہتر حالت میں رہنا چاہتا تھا، تیس برس سے مجھے یہ خوف ہے کہ محض اس خیال کی سزا میں میری بخشش نہ روک دی جائے، میں برابر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ توبہ کرتا ہوں"

مساوات کے تخیل کو آں حضرت صلعم نے ان الفاظ میں پیش کیا:-

"تمام مسلمان قوم ایک جسم ہے، اگر سر میں درد ہو تو تمام جسم میں درد محسوس ہوتا ہے، اسی طرح اگر آنکھ میں درد محسوس ہو تو تمام جسم درد کرتا ہے"

"مسلمان اس تعمیر کے مشابہ ہیں جس کو تمام حصوں سے تقویت اور سہارا پہنچ رہا ہے"

مسلمانوں نے غیر مسلمانوں کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ انسانوں میں کسی قسم کی تفریق کریں، اور جب کبھی انھوں نے عیسائی حکمرانوں کے سفیروں کو اپنے یہاں باریابی کا موقع دیا تو انھوں نے اپنے حضور میں ان کو اپنے رسم کے مطابق سجدہ کرنے سے یہ کہہ کر منع کیا کہ ہم تم ایک ہی خالق کے مخلوق ہیں۔

مسلمانوں کی اخوت نہایت حیرت انگیز تھی، ان میں آپس کی برادرانہ محبت بالکل سگے بھائیوں کی سی تھی، قرآن میں واضح طور پر ذکر ہے کہ اللہ تعالے نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی، ارشاد ہوتا ہے

"اور (خدانے) ان کے دلوں میں محبت ڈال دی، اے محمدؐ! اگر تو ساری دنیا کا مال بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دلوں میں محبت پیدا نہیں کر سکتا تھا، لیکن اللہ نے آپس میں محبت پیدا کردی"

(سورۃ انفال)

محمد صلعم کے ارشادات اس کے متعلق حسب ذیل ہیں :۔

" تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں، ان کو ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا چاہئے، اور نہ انھیں ایک دوسرے کی مدد سے پرہیز کرنا چاہئے اور نہ ایک دوسرے کو نفرت کی نظروں سے دیکھنا چاہئے "

" نیکی کی جگہہ دل ہے اور جس دل میں نیکی ہو وہ ایک مسلمان کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسروں کے لئے حلال نہیں ہو سکتا "

اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، لوگوں نے کہا " ظالم کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے " فرمایا ظالم کو ظلم سے منع کرنا اس کی مدد کرنا ہے "

" جو شخص خدا کی مخلوقات اور اس کے بندے سے محبت نہیں کرتا اللہ اس سے محبت نہیں کرتا "

اللہ کی نظر میں وہی سب سے اچھا ہے جو اپنے دوستوں میں سب سے اچھا ہے اور اللہ کی نظر میں وہی ہمسایہ مقبول ہے جو اپنے ہمسایوں میں مقبول ہے "

" اس شخص کا ایمان پختہ نہیں جو اپنے لئے ایک چیز پسند کرتا ہے لیکن اپنے بھائیوں کے لئے نہیں "

جو شخص مخلوقات پر مہربان ہے اللہ اس پر مہربان ہے، اس لئے روئے زمین کے تمام بنی نوع انسان پر خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مہربان رہو، بُروں پر مہربان ہونا شر سے بچنا ہے "

مسٹر حامد اسنو ام۔ اے۔ نہایت فخر کے ساتھ کہتے ہیں :۔

" اسلام کی سب سے بڑی خوبی اخوت اور مساوات کی تعلیم ہے، اسلام کے دروازے پر پہنچتے ہی قومی نخوت اور معاشرتی افتخار باہر ہی چھوٹ جاتے ہیں، دوسرے مذاہب کی خشک، روکھے پھیکے اور ظاہری نمائشوں میں ہزاروں قسم کے امتیازات ہیں لیکن اسلام میں ادنیٰ اور غریب طبقے کے لوگ سوسائٹی میں ایک ہی قسم کے حقوق رکھتے ہیں، ایک شخص ملازم ہونے کے باوجود اپنے سرمایہ دار آقا کے پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتا ہے، برخلاف اس کے دوسرے مذاہب میں تھوڑی سی فاضل سالانہ آمدنی، تھوڑی سی علمی لیاقت یا تھوڑی سی فوقیت ایک حد فاصل آپس میں قائم کرنے کے لئے کافی ہے جو معاشرت

کے لحاظ سے تکلیف دہ اور روح فرسا ہے' ہم تمام لوگ ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے بندے ہیں، انسانیت کی واحد جماعت کے مختلف افراد ہیں، ہم میں تفریق کیسی ؟ عیسائی مذہب کے پیشوا اپنے منبروں سے تلقین و وعظ سب کچھ کرتے ہیں لیکن ان کے نظام معاشرت میں نظر کچھ اور آتا ہے، مگر اسلام نے محض برادرانہ پیام وسلام کی جو تعلیم دی ہے صرف اسی کے ذریعہ اسلام دنیا کے لئے باعث نجات اور فلاح ہو سکتا ہے اسلام کوئی نئی پابندیاں عاید نہیں کرتا، کوئی نئے انکشافات نہیں کرتا، کوئی مذہبی حکومت جاری نہیں کرتا، اور نہ مذہبی پیشواؤں کا تسلط قائم کرتا ہے بلکہ بکھرے ہوئے قوانین کو یکجا کر دیتا ہے، بگڑے ہوئے نظام معاشرت کو سدھار دیتا ہے اور حکومت کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کر دیتا ہے جن میں صرف بے لوثی اور بے غرضی پائی جاتی ہے، اگر دنیا کے مقتدر سیاست داں، ماہران سائنس اور فلسفی ایک ساتھ بیٹھ کر عقل سلیم، فلسفہ، سائنس اور جذبات کے مطابق کوئی نیا مذہب قائم کرنا چاہیں تو ان کے مذہب کے تمام اصول اسلام کے اصولوں سے ملتے جلتے ہوں گے"

آنحضرت کی قبل عربوں کی حالت

اسلام نے اشتراکیت کے اصولوں کو کس طرح پھیلایا اور ان میں کہاں تک ترقی دی، ان باتوں کو جاننے کے لئے قدیم عربوں کی معاشرتی اور سیاسی حالت سے واقف ہونا ضروری ہے، آنحضرت کی مبعوث ہونے کے قبل جمہوری حکومتوں پر اٹلی اور یونان میں تجربے کئے جا چکے تھے، لیکن عملی سوشلزم پر اب تک کہیں کوئی تجربہ نہ ہوا تھا، عرب میں بدترین قسم کی شخصی حکومت قائم تھی، ہر قبیلہ ایک غیر ذمہ دار سردار کے ماتحت تھا، انفرادیت کا سیلاب ہر طرف نظر آتا تھا، ایسی حالت میں جمہوریت اور اشتراکیت قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، عربوں کے قبیلے کی جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھی، اگر قبیلہ کا کوئی ایک فرد دوسرے قبیلہ والوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے پشت ہا پشت تک رہتے، ایک جان کے بدلے سینکڑوں معصوم جانیں لے کر بھی مطمئن نہ ہوتے، کینہ، عداوت، اور بغض کی آگ قرنوں تک نہ بجھتی، جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ انفرادیت کی لامتناہی قوتیں نہایت ہی خطرناک ہو گئی

تھیں، جوا کھیلنا، شراب پینا اور زنا کرنا عام چیزیں تھیں، کسی قسم کی اخلاقی اور مذہبی پابندیاں نہ تھیں، شادی کے لئے نہ کوئی قانون تھا اور نہ طلاق کے لئے کوئی دباؤ۔ بیٹا باپ کی بیویوں کو وراثت میں حاصل کرتا، ایک شخص ایک یتیم لڑکی سے شادی محض اس کی دولت کی خاطر کرتا اور جب دولت حاصل کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتا، مطلقہ عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ بات اس کے پہلے شوہر کے لئے باعث ننگ سمجھی جاتی تھی، بغض اور کینہ عورتوں میں اس درجہ ہوتا کہ اس وقت تک تخت نہ بیٹھتیں جب تک کہ اپنے دشمنوں کے کلیجے کو دانت سے نہ چبالیتیں یا ان کے خون سے اپنے دوپٹے نہ رنگ لیتیں، غلام جانوروں کی طرح تمام دن کام کرتے اور ان کے ساتھ ہمارے موجودہ قلیوں اور مزدوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا، نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے، انسانوں کی قربانی کرنا کوئی اہم بات نہ تھی، خودکشی ایک معمولی چیز تھی، روزمرہ بات بات پر جھگڑا کرکے قتل و خون کرنا ایک کھیل تھا۔

آنحضرت نے جس حالت میں عربوں کی معاشرتی زندگی پائی اس کی تصویر گبن اس طرح کھینچتا ہے :-

"ایک ایسی قوم کی فطرت جو بنی نوع انسان کے خلاف ہمیشہ برسر پیکار ہو کینہ، عداوت، قتل اور خون ریزی سے اور بھی بے پناہ ہوتی گئی، یورپ کے دستور اساسی میں صلح اور جنگ کا اختیار ایک چھوٹے سے گروہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے لیکن عربوں میں سے ہر فرد اپنے ہم وطن کے سینے میں خنجر پیوست کر دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا اس قوم کی یکسانی محض ان کی زبانوں کی دھندلی سی مشابہت اور ان کے رسم ورواج میں پائی جاتی تھی، ہر قبیلہ میں قاضی کا حکم ایک بے معنی سی چیز سمجھی جاتی تھی، ایام جاہلیت میں محمدؐ کے قبل سترہ سو لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں۔ عداوت کے شعلے پیہم خانہ جنگیوں سے ہمیشہ بھڑکتے رہتے تھے، گذشتہ عداوتوں اور جنگوں کی یاد قصیدوں اور نظموں کے ذریعہ کی جاتی، خانگی زندگی میں ہر شخص خود مختار تھا، اس کی عزت پر ذرا سی آنچ اگر آجاتی تو اپنے مخالفوں سے بدترین قسم کا بدلہ لینے کے لئے ہمہ تن تیار ہو جاتا، اپنی ریش کی بے آبروئی کی خاطر جان گنوانا اور لینا وہ ضروری سمجھتا، توہین انگیز فقرے اور ملامت آمیز حرکتوں کے لئے خون ریزیاں کرنا فرض سمجھتا، مہینوں اور برسوں اس بات کا

مطلوب تھا کہ اپنی توہین اور بے آبروئی کا خونچکاں بدلہ فریق سے لے' بدلے کی نوعیت بھی عجیب تھی جو اس زمانہ کے غیر متمدن قوم کے رواج سے بالکل جداگانہ تھی۔ قتل کا بدلہ یہ ضروری نہ تھا کہ قاتل ہی کا سر ہوتا بلکہ مقتول کے عزیز و اقارب' قاتل کے خاندان کے کسی معصوم کی جان بدلے میں لے لیتے تھے' یا قاتل کے قبیلہ کے معزز ترین شخص کی۔ بدلہ لینے کی کوشش میں اگر ناکامی ہوتی تو انتظامی جذبہ وراثت میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا جاتا۔"

مسٹر گورہم اپنی (Ethics of Great Religions) میں کہتے ہیں۔

عرب میں محمد (صلعم) کی پیدائش کے وقت (۵۷۰ء) مذہبی اور سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی' اس کے آوارہ گرد باشندے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے سمجھے جاتے تھے' بتوں کو پوجتے' ستاروں' پتھروں اور درختوں کو اپنا معبود سمجھتے' وہاں یہودیوں کی بھی کچھ نئی آبادیاں ہو گئی تھیں' جو یروشلم کی تباہی کے بعد یہاں آکر پناہ گزیں ہوئی تھیں' عیسائیوں نے بھی یہاں آکر ملکی باشندوں پر تھوڑا بہت اپنا اثر ڈالا تھا' ان میں مشہور فرقے Nestorians. Marianetas' Euty- chians' Sulellians اور Arians کے تھے' وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا مذہبی اعتقاد کچھ نہ تھا بلکہ انفرادی اور راہبانہ سیرت کی زندگی بسر کرتے اور وحدانیت کی تعلیم دیتے جو Gaseniam. اور عیسائی مذہب کے عناصر سے ملے جلے ہوتے' عربوں کی فطرتی قدامت پسندی کی بنا پر مذہبیت کے اجزا بالکل بکھرنے نہ پائے تھے لیکن اخلاقی پستی اور مذلت ناقابل بیان تھی' اور ہر شخص کی آنکھیں ایک مسیحا کی منتظر تھیں' معاشرتی اور مذہبی انقلاب کے لئے وقت نہایت ہی موزوں تھا' اور اسی حالت میں محمدؐ رحمت بن کر نمودار ہوئے۔"

وقت کا اقتضاء واقعی تھا کیونکہ عربوں کے اخلاقی' معاشرتی' مذہبی اور سیاسی حالات قعر مذلت میں گرے ہوئے تھے' بتوں کے لئے انسانی قربانیاں کرنا' بچیوں کو زندہ دفن کرنا' نابالغ لڑکیوں سے زبردستی شادی کرنا' یتیموں کے مال کو غصب کر لینا' لاتعداد بیویاں اور کنیزیں رکھنا' انتظام کی خاطر قرنوں خوں ریزیاں کرنا' ظلم ناروا کے ساتھ حکومت کرنا۔ انفرادی نخوت' قبائلی تکبر' قومی غرور وغیرہ

سینکڑوں بدترین قسم کے ایسے گناہ تھے جن کو دور کر کے دنیا کی فضا کو پاک اور صاف کرنے کی بے حد ضرورت تھی، چنانچہ اسی حالت میں رب العالمین نے رحمۃ اللعالمین کو بھیجا جن کا نام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اور جنھوں نے اپنے معجزہ نما سوشلزم کے اصولوں سے عرب کی تمام سوسائٹی میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا۔ دنیا کی تاریک فضا روشن ہوئی، ایک ہمہ گیر اصولوں کے مجموعہ سے انسانیت میں نئی روح پیدا ہوئی، اگر عرب کی نئی اور پرشکوہ زندگی سوشلزم کے ذریعہ ہوئی تو تمام دنیا کی زندگی اسلام کے ذریعہ اور سوشلزم اور اسلام کی جس نے تکمیل کی وہ اس کی مسیحائی کا نتیجہ تھا جس نے نہ صرف ایک یا دو جذامیوں کو صحت بخشی بلکہ تمام جسد انی سوسائٹی کو، جس نے نہ صرف چند مردوں کو زندگی عطا کی بلکہ تمام مردہ قوم کو ایک نئی اور روح پرور زندگی عنایت کی، جس نے نہ صرف مافوق الفطرت معجزے دکھلائے بلکہ دنیا میں ایسی عجیب و غریب چیزیں پیش کیں جن کے نشانات اب تک موجود ہیں اور جب تک دنیا آباد ہے موجود رہیں گے، اور جس نے عرب کے ریگستانی صحراؤں ہی پر عارضی طور سے حکومت نہ کی بلکہ اس کی حکومت اس روز افزوں آبادی کے دلوں پر ہے جو اس کا ترانہ اب تک اسی تار پر گاتے ہیں جس سے تمام انسانیت کو اس نے ایک ساتھ منسلک کر دیا ہے:

آنحضرت رحمت بن کر آئے، اللہ تعالےٰ نے فرمایا، وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین، ہم نے تجھ کو اے محمدؐ دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے، چنانچہ محمد صلعم کا مشن شروع سے وحدانیت کا اعلیٰ تخیل پیش کرنا اور انسانیت کو ایک سلک میں منسلک کرنا تھا، وہ ایک عالمگیر اخوت قائم کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اپنے دشمنوں کو فتح مکہ پر جو میگنا کارٹا "عطا کیا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"میں تم سے اسی طرح گفتگو کروں گا جس طرح یوسف نے اپنے بھائیوں سے کی، میں تم کو لعنت ملامت نہ کروں گا، خدا تمھاری خطائیں معاف کر دے گا وہ بڑا ہی رحیم و کریم ہے، جاؤ تم آزاد ہو"

اس چارٹر کی نمایاں خصوصیت اخوت اور مکمل آزادی ہے۔

محمد صلعم نے آخری بار اپنے ہم وطنوں کے سامنے جو تقریر کی، وہ یہ تھی:۔

"لوگو! میری باتیں سنو، شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے"

"عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔"

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔"

"جاہلیت کے تمام سود باطل کر دئے گئے۔"

"عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔"

"مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔"

"اگر کوئی حبشی بنی بریدہ غلام بھی تمھارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔"

"مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی میں برباد ہوئیں۔"

"تمھارے غلام! تمھارے غلام!! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔"

"میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ"

"خبردار، ظلم اور بے انصافی نہ کرو۔"

آنحضرت نے تقریر ختم کرنے کے بعد جب مجمع سے یہ کہا "کیوں، میں نے پیغام خداوندی سنا دیا"؟ ہزاروں آوازیں بلند ہوئیں "بے شک" رسول خدا نے کہا "اے اللہ تو گواہ رہنا۔"

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرض نبوت ادا کر رہے تھے تو ان کے تخت شاہنشاہی کا مسند تکیہ (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ آنحضرت کے قبل کئی مصلحین اور پیغمبر گزر چکے تھے لیکن علمیت کی وہ صفتیں

ان میں ودیعت نہ ہوئی تھیں جو خاص طور پر آنحضرت کے حصے میں آئیں، آنحضرت کے قبل کسی سوشل ریفارمر نے ایسے قوانین نہیں بنائے جو اسلامی قوانین کی طرح خالص جمہوری ہوں اور نہ کسی مصلح نے خواہ وہ مہاتما گوتم بدھ ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اخوت اور مساوات کی تعلیم دینے کے ساتھ اپنے آپ کو معمولی انسان کے بجائے فوق البشر ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ یہ آنحضرت ہی کی خوبی تھی جنھوں نے اپنے پیروؤں پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ، میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں، آنحضرت چاہتے تو اپنے کو خدا نہیں تو خدا کا بیٹا تسلیم کروا سکتے تھے لیکن ان کمزوریوں سے وہ بالاتر تھے، جب محمد صلعم کے اکلوتے اور چہیتے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آفتاب میں گرہن نظر آیا، عاشقان رسول کیا بلکہ ملک کے تمام لوگوں نے یہی سمجھا کہ آفتاب محمدؐ کے لڑکے کی موت کے غم میں سوگوار ہو رہا ہے، لیکن محمدؐ خود آگے بڑھے اور اعلان کیا کہ ابراہیم کی موت اور سورج گرہن میں کوئی تعلق نہیں۔

آنحضرت جب کسی سے کچھ کرنے کے لئے وعدہ کرتے تو معمولی انسانوں کی طرح انشاء اللہ (اگر اللہ کو منظور ہو) کا فقرہ ضرور کہتے، ایک لمحہ کے لئے دنیا کے سب سے بڑے سوشلسٹ نے اپنے پیروؤں کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ان کو معمولی انسان سے بالاتر درجہ دیں، تمام عرب کے "آقا" اپنے لوگوں میں معزز ترین اور محبوب ترین رہنما ہونے کی حیثیت سے بھی وہ محض ایک "جمہوری واعظ" بن کر رہے، ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو خطاب کیا، "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اے ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" آپ نے فرمایا لوگو، پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمھیں گمراہ نہ کر دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول۔ میں پسند نہیں کرتا تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ ایک دفعہ آپ سے ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا اس قدر رعب ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی، چنانچہ محمد صلعم بار بار کہتے کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا اور نہ تشخص پسندی مجھے محبوب ہے، جب آنحضرت سیاسی قوت کے اعلیٰ مدارج پر تھے اس وقت کی حالت گبن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"محمدؐ کی بلند خیالی دیکھو کہ وہ شاہی شان شوکت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے اور پیغمبر خدا

ہونے کے باوجود گھر کے تمام کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے، وہ آگ خود جلاتے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں کو خود درست کرتے، پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتے، گو راہبوں کو جو تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن خود بلا چوں چرا روکھے پھیکے کھانے کھاتے جو ایک معمولی عرب یا سپاہی کو میسّر آسکتے۔ اکثر موقعوں پر صحابیوں کی دعوت نہایت کشادہ پیشانی اور فیاضی سے کرتے مگر ہفتے، ایسے گذر جاتے جب کہ پیغمبر خدا کے یہاں آگ مطلق روشن نہ ہوتی۔"

یہ سادہ زندگی کس نے بسر کی ؟ یہ تمام ادنیٰ کام کس نے اپنے ہاتھوں انجام دیا، اس نے جو تمام عرب کیا بلکہ آج تک دنیا میں معزز ترین اور شریف ترین انسان سمجھا جاتا ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ محمد صلعم کے جمہوری پند و نصائح نے اپنا اثر دکھایا اور ہر شخص اپنی انفرادیت کو اشتراکیت پر قربان کرنے کے لئے پیش پیش تھا۔

محمد صلعم سے قبل دو بڑے زبردست مصلح پیدا ہوئے ہیں، جن میں ایک نے ہندوستان کی ذات پات کی سنگلاخ زمین میں جنم لیا اور دوسرے بنی اسرائیل کے درمیان ظہور پذیر ہوئے، ان کے تیار کردہ قوانین، اور ان کی مخلص اور بے غرض زندگیاں آج کل کی اشتراکیت کے لئے بہترین بنیادی اصول ہو سکتی تھیں بشرطیکہ وہ تجرد کی زندگی بسر نہ کرتے، جس کی وجہ سے سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی حیثیت گری معلوم ہوتی ہے، دوسرے ان کی انتہائی خلوت پسندی اور سوسائٹی سے قطعی علیحدگی نے ان پیروؤں میں رہبانیت کی کھلم کھلا ترغیب دی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں کی زندگی امارت پسندی اور انفرادیت کے خلاف جہاد تھی لیکن اشتراکیت کی عملی دلیل نہ تھی، مگر محمدؐ کی زندگی صریحاً انسانی اور سوشل تھی، جو آج تک تمام لوگوں کے لئے قابل عمل ہے، آپ نے اپنے غلام زید کو متبنیٰ فرمایا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر غمگین ہو رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "ایک دوست اپنے بہترین وفادار دوست کا غم کر رہا ہے۔" آپ نے اپنے اسی غلام کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنا کوئی عیب نہ سمجھا، آپ کو اپنی بیوی خدیجہؓ سے اس قدر سچی اور پرخلوص محبّت تھی کہ ارنلڈ نے صحیح کہا ہے کہ انسانی تاریخ میں کل شادی شدہ زندگی کی حسین ترین تصویروں میں سے ایک

تصویر ہے، ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے والدین اور خصوصاً اپنی ماں سے بے حد محبت تھی آپ کا یہ قول ہے کہ ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے، اور سب سے بالاتر بات یہ تھی کہ تمام لوگوں اور اصحاب سے ان کی یکساں ہمدردی اور اخوت تھی جو موجودہ اشتراکیت کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہیں، یہ تمام باتیں عربوں کے لئے زندہ مثالیں تھیں اور آج بھی تمام دنیا کے لئے مسلمانوں کے لئے ہیں۔

اسلام کے مذہبی قوانین کی بنیاد بھی دنیا کے بزرگ ترین مصلح محمد مصطفٰے صلعم نے ایک طرف تو اجتماعیت پر اور دوسری طرف اخوت اور مساوات پر رکھی جو جمہوریت کے زرین اصول ہیں، چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دن میں پانچ وقت اور ہفتہ میں ایک روز ضرور تمام مسلمان امیر و غریب بلا تفریق رنگ و ملت اور جاہ و مرتبہ ایک ہی بارگاہ میں ایک ہی منتخب کردہ شخص کی اقتدا میں سر نیاز خم کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، پھر سال میں دو موقع (عیدین) ایسے فراہم کئے گئے ہیں جب شہر کے تمام پیروان اسلام ایک واحد مقام پر جمع ہو کر اور گلے مل کر اپنی برادرانہ شفقت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور پھر زندگی میں کم سے کم ایک بار ہر مسلمان پر فرض عائد کیا گیا ہے کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے اجتماع میں ضرور شریک ہو، مکہ معظمہ کا یہ عظیم الشان اجتماع جہاں ایک مرکزی مقام پر دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ شاہ ہوں یا گدا، ایک ہی لباس میں ایک ہی وضع قطع میں نظر آتے ہیں گویا اسلامی سوشلزم کا سالانہ مظاہرہ ہے جو اخوت و مساوات کا عملی نمونہ ہے۔ اس اجتماع میں امیر و غریب، شاہ گدا کا کوئی امتیاز نہیں، چنانچہ ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں اور ہر شخص پر لازم ہے کہ سب لوگوں سے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے مساویانہ برتاؤ رکھے، یہ سالانہ اجتماع محض ظاہری یکسانی اور انسانی مساوات ہی کی بیّن دلیل نہیں بلکہ انسانیت کی یک جہتی اور مقصد کی یکسانی کو بھی ظاہر کرتا ہے، ہزاروں مرد و عورت، ضعیف و جوان، ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے جان و مال کو معرض خطر میں ڈال کر اس مقام پر صرف ایک ہی مقصد، ایک ہی نیت کی تکمیل کے لئے آتے ہیں تاکہ وہ ایک واحد مرکز میں، ایک واحد اجتماع میں کھڑے ہو کر اپنے واحد معبود رب العالمین کی عبادت میں ایک ساتھ سر نیاز خم کریں، چنانچہ لاتعداد انسانوں کا یہ مجمع جب ایک ساتھ دست بدعا ہوتا ہے تو ہر شخص کے دل میں صرف واحد برادرانہ لگاؤ اور روحانی رشتہ کا جذبہ ہی سینہ میں موجزن نہیں ہوتا بلکہ خدا کی ربوبیت اور انسان کی اخوت کا خیال اچھی طرح دل نشین ہو جاتا ہے۔

کسی اور مذہب نے انسانی اخوت کے تخیل کو اس واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے جتنا کہ اسلام نے کیا۔
ہندو مذہب کی طرح اس میں ذات پات کا بکھیڑا مطلق نہ تھا، مغربی عیسائیوں کی طرح دولت اور عہدہ کی پیدائشی تفریق اس میں نہیں پائی جاتی، پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں، اور نہ ان کے کوئی خاص حقوق اور اختیارات ہیں، اور خوبی دیکھو کہ محمد صلعم نے تمام بنی نوع انسان کو آخرت میں نجات کی امید دلائی، کلام مجید میں بار بار ذکر آیا ہے کہ ”خواہ وہ ایمان والے ہوں یا یہود یا نصاری یا آتش پرست جو اللہ اور آخرت پر یقین کرے گا اور عمل صالح کرے گا اس کو اللہ کی طرف سے ضرور بخشائش ہوگی، اسے نہ خوف کرنا چاہیئے اور نہ افسردہ ہونا چاہیئے“ (سورۂ مائدہ) پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

”اے محمدؐ! تو میری طرف سے ان لوگوں سے کہہ اے میرے بندو! گناہ کرکے اپنے آپ پر زیادتیاں کرنے والو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب گناہ بخش دے گا، وہ بخشنے والا مہربان ہے“ (زمر ۴۹ پارہ ۲۴)

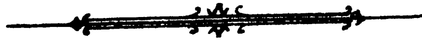
اس نئی اور عجیب مذہبی سوشلزم پر مشہور مورخ گبن اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے:۔

”محمدؐ کے بدترین دشمنوں نے ان کو برا بھلا اس وجہ سے کہا کہ نجات کی امید انھوں نے انھیں یہ کہہ کر دلائی کہ تمام لوگ جو اللہ پر ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے، آخرت کے روز عمدہ صلہ پائیں گے، ایسی عقلیت پسندانہ بے نیازی ایک راسخ العقیدہ شخص کے لئے غیر موزوں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آسمانی پیغمبر اپنے الہامات کی قدر قیمت کو اتنا ارزاں کردے“

آنحضرت کے اس عظیم الشان کارنامے اور ان کے ارفع ترین سوشلزم کی قدر جس کے لحاظ سے تمام بنی نوع انسان دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال کی ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، افسوس ہے کہ مسلمانوں نے نہ کی، مسلمانوں نے اپنے رسول کی تعلیم کے ایک ہی جز یعنی وحدانیت کو ذہن نشین کیا، وہ اپنی قوت اور ذہانت کا کثیر حصہ بحث و تکرار میں صرف کرتے رہے لیکن اپنے پیغمبر کی ان تعلیمات پر زیادہ غور و خوض نہ کیا جس نے انسان اور انسان کے درمیان ساری تفریقیں نیست و نابود کردی تھیں، عرب کے بزرگ ترین سوشلسٹ نے رنگ، ملک، ملت یہاں تک کے اعتقادات کی بھی تفریق مٹادی تھی، اور اشتراکیت کا

پہلو ہر شعبہ مثلاً سیاست، معاشیات، حکومت اور یہاں تک کہ مذہب میں بھی نمایاں کر دیا تھا، مسلمان اگرچہ والہانہ حد تک اپنے اعتقادات کے علمبردار رہے مگر قرآن تعلیم یعنی تمام انسانیت کی قطعی وحدت، کو دل سے بالکل محو کر دیا۔ قرآن نے عیسائیوں اور یہودیوں کو اس خیال پر لعنت کی ہے کہ وہ اپنے کو نجات کے تنہا اجارے دار سمجھتے ہیں لیکن مسلمان اسے بھول گئے۔ قرآن شریف میں ہے:۔ وَقَالُوا لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودًا او نصاریٰ۔ (بقرہ) یہی وطیرہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔

(باقی)



سوانگ

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا - اور نہ نام کے پیچھے 'سنگھ' کی دُم لگا دینے ہی سے بہادری آتی ہے - گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانہ میں راجپوت تھے، اس میں شبہ کی گنجائش نہیں - لیکن اِدھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کے کوئی علامت نہ تھی گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی رجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے - پدر بزرگوار نے کپڑے کی دوکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی - اور گجندر سنگھ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی. قد و قامت میں بھی فرق آتا گیا - بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا - نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا - لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا - وہ ہلکے پھلکے، گورے چٹے، عینک باز، نازک بدن، فیشنیبل بابو تھے. انھیں علمی مشاغل سے خاص دلچسپی تھی -

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اُس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہوگی - گجندر کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اُس میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہ ہوا تھا - اُن کے خسر پنشنر صوبہ دار تھے. سالے شکاری اور کشتی باز - شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آسکا تھا - امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی - لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی، ملازمت کی تلاش تھی - اس لئے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بُلاوا آیا تو اس نے کوئی حیلہ حجت نہ کی - صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی - فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں یہ اُسے خوب معلوم تھا - سمجھا ممکن ہے صوبہ دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیلداری میں نام زد ہو جائے - اِدھر شیام دُلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی - ایک نشانہ سے دو شکار ہو رہے تھے - نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہونچا - اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانہ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو پٹخنی دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا، کہ صوبہ دار صاحب دیو کی طرح آکر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے۔ ارے سنو، تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انھیں لے جاکر ذرا جنگل کی سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وکار کھلاؤ۔ یہاں ٹیشھر ویشھر تو ہے نہیں۔ ان کا جی گھبراتا ہوگا۔ وقت بھی اچھا ہے۔ شام تک لوٹ آؤ گے۔

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی۔ بیچارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ یہ دیہاتی اُجڈ لونڈے اُسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے۔ کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی تو راہ فرار نہ پاکر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے۔ کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔ بولے۔ میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں۔

صوبہ دار صاحب نے فرمایا۔ تم گھوڑے پر سوار ہو لینا۔ یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چُنّو، جاکر بندوق لا۔ میں بھی چلوں گا۔ کئی دن سے باہر نہیں نکلا۔ میرا رائفل بھی لیتے آنا۔

چُنّو اور مُنّو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجندر کی جان سوکھنے لگی۔ پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جانتا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑ رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری دیہاتی گھوڑے یونہی تھان پر بندھے بندھے تڑے ہو جاتے ہیں۔ اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہونچے۔ گھوڑا بھی کھنچ کر آ گیا۔ صوبہ دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لئے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اُس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا، ہنہناتا تھا۔ اُٹھی ہوئی گردن، لال لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی۔ بوٹی بوٹی

پھڑک رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجندر دل میں سہم اٹھا۔ مگر بہادری دکھانے کے لئے گھوڑے کے پاس جا کر اس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکا شہسوار ہے۔ اور بولا۔ جانور تو جاندار ہے۔ مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں۔ ایسا کچھ بہت تھکا نہیں ہوں۔ میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ اس کی مجھے مشق ہے۔

صوبہ دار نے کہا۔ بیٹا جنگل دور ہے۔ تھک جاؤ گے۔ بڑا سیدھا جانور ہے۔ بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔

گجندر نے کہا۔ جی نہیں۔ مجھے بھی یونہی چلنے دیجئے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں۔ آپ بزرگ ہیں۔ سوار ہو جائیں۔

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دور کے بعد پتھریلا راستہ ملا۔ ایک طرف ہرا بھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ دونوں ہی طرف ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبے دار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بار بار پچھڑ جاتا تھا۔ اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے سے تر، ہانپتا ہوا، اپنی حماقت پر پچھتاتا، چلا جاتا تھا۔ یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی بشیام دلاری مہینے دو مہینے میں جاتی ہی۔ مجھے اس وقت کتوں کی طرح دوڑے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی سے یہ حال ہے۔ شکار نظر آگیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی میل دو میل کی دوڑ تو ان کے لئے معمولی بات ہے۔ مگر یہاں تو کچومر نکل جائے گا۔ شاید بیہوش ہو کر گر پڑوں پیر ابھی سے من من بھر کے ہو رہے ہیں۔

یکایک راستے میں سیل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے۔ اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چنتو نے پوچھا۔ کیا ہے جیجا جی۔ رک کیسے گئے؟

گجندر سنگھ نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا۔ کچھ نہیں، اس درخت کا حسن دلاویز دیکھکر دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ اہا! کیا بہار ہے، کیا رونق ہے، کیا شان ہے، گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لئے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو، یا رشیوں کی پاک روحیں سفر جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیے مجھے اس آبِ حیات سے شادکام ہونے دیجئے۔

دونوں نوجوان فرطِ حیرت سے گجندر کا منھ تاکنے لگے۔ اُن کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ حضرت کہہ کیا رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے، جنگلوں میں گھومنے والے، سیل ان کے لئے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے، کتنی ہی بار اس پر چڑھے تھے۔ اس کے نیچے دوڑے تھے۔ اس کے پھولوں کے گیند بنا کر کھیلے تھے۔ ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی۔ حسن پرستی وہ کیا جانیں!

صوبہ دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھکر لوٹ آئے اور بولے۔ کیوں بیٹا، ٹھہر کیوں گئے۔

گجندر نے دست بستہ گذارش کی۔ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکونگا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہوگئی ہے۔ میری روح نغمہ جنت کا مزہ لے رہی ہے۔ آہا! یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے، مجھ میں بھی وہی سرخی ہے، وہی حسن ہے، وہی لطافت ہے، میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں! جنگل کے معصوم جانوروں کا! ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں۔ یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں! نہیں۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں۔ مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں۔ بلکہ میں تو عرض کرونگا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرت کا خزانہ ہے۔ اُس کا خون نہ کیجئے۔ نظارۂ قدرت سے چشمِ باطن کو مسرور کیجئے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں، ایک ایک پتی میں، مسرت کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔ خوں ریزیوں سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجئے۔

اس تصوف آمیز نعت پر نے سبھی کو متاثر کر دیا ۔صوبہ دار صاحب نے چُنّو سے آہستہ سے کہا۔ عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔ چُنّو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ۔ علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا ہے بُرا۔

صوبہ دار نے عارفانہ انداز سے کہا ۔ ہاں بُرا تو ہے ۔ چلو لوٹ چلیں ۔ جب ہر ایک چیز میں اُسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون ۔ اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا ۔

پھر وہ گجندر سے بولے ۔ بھیّا تمھارے اُپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے ۔

گجندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی ۔ اُسی سرور کے عالم میں بولے ۔ ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی ۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا ۔ انگنت جنگلی سور، ہرن، تیندوے، نیل گائیں، گ ہلاک کئے ہوں گے ۔ ایک بار ایک چیتے کو مار ڈالا تھا ۔ مگر آج سے عرفان کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہ رہا ۔

(۲)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی ۔ آٹھ ہی بجے سے گانوں کے عورت مرد، بوڑھے بچے، گاتے بجاتے کبیریں اُڑاتے ہولی کی طرف چلے ۔ صوبہ دار صاحب بھی بال بچوں کو لئے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے ۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گانوں کی ہولی نہ دیکھی تھی ۔ اُس کے شہر میں تو ہر محلّے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کُندے جلا دئے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے ۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی ۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا، آتشبازی چھوٹنے لگی ۔ چھوٹے بڑے سبھی پٹاخے، چھچھوندریاں ہوائیاں، چھوڑنے لگے ۔ گجندر کے سر پر سے کئی چھچھوندریں سنناتی ہوئی نکل گئیں ۔ ہر ایک پٹاخے پر بے چارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اُجڈ دیہاتیوں کو بددعائیں دیتا تھا ۔

یہ کیا بیہودگی ہے! بارود کہیں کپڑے میں لگ جائے، کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ان دہقانیوں کو کیا خبر۔ یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی۔ گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فیٹ اونچے اچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے۔ دل دھک دھک کرنے لگا، گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔ فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لئے اور دس قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

چُنّو نے کہا جیجا جی۔ آپ کیا چھوڑیں گے۔ کیا لاؤں؟

منو بولا۔ ہوائیاں چھوڑیئے جیجا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔

چُنّو۔ ہوائیاں بچّے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے۔ آپ بم گولہ چھوڑیئے بھائی صاحب۔

گجندر۔ بھئی مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں۔ مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی سے آتشبازیاں چھڑا رہے ہیں۔

منو۔ دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیئے۔

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ اُن کی سُرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے، ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں۔ مزے سے ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ گُل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے، اور سب کی نگاہیں اُن کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اُن کا فلسفی دماغ بھی خود نمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لے لی۔ گو ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ۔ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولا چھوٹا۔ آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے۔ یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکا ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ساری فضا متلاطم ہو گئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل شور مچاتی ہوئی بھاگیں

جانوررسیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پاؤں کھ کر بھاگے۔ سرپٹ۔ اور سیدھے گھر پر آکر دم لیا۔ چنتو اور منتو دونوں گھبرا گئے۔ صوبہ دار صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ تینوں آدمی بگٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انھیں بھاگتے دیکھا تو سمجھے کوئی شدید واردات ہوگئی۔ سب کے سب اُن کے پیچھے ہو لئے۔ گانوں میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ مہمان کو ہو کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں۔

ایک لمحہ میں سینکڑوں آدمی صوبہ دار صاحب کے دروازے پر پرسش حال کے لئے جمع ہو گئے۔ گانوں کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابل زیارت اور بدحال ہوتے ہوئے بھی منظور نظر ہوتا ہے۔

صوبہ دار نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔ تم وہاں سے کیوں بھاگ آئے بھیا؟

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا۔ اور جواب بھی ایسا کہ گانوں والوں پر اس کی ضماری کا سکہ بٹھا دے۔

بولا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔

" نہیں کوئی بات ضرور تھی"

" آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اُسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں غلل نہیں ڈالنا چاہتا"

" جب تک بتلا نہ دوگے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی۔ سارا گانوں گھبرایا ہوا ہے"

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا۔ آنکھیں بند کرلیں، جمہائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ میں نے کبھی آتشبازیاں نہیں چھوڑیں۔ ہمیشہ اس کی مذمت کرتا رہا ہوں۔ آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا بس غضب ہی تو ہوگیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہوگئی۔ اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں آپ کے جشن میں نہ شریک ہوسکوں گا۔

صوبہ دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا واں کوئی اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، "و آتی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں۔ تم بھلا کیا سمجھو گے۔ ہم بھی کچھ کچھ ہی سمجھتے ہیں"۔

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی، مگر آتشبازیاں دریا میں ڈال دی گئیں۔ شریر لڑکوں نے کچھ اس لئے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھڑائیں گے۔

شیام دلاری نے تخلیہ میں کہا۔ تم تو واں سے خوب بھاگے۔

گجندر اکڑ کر بولے۔ بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔

"۔ میری تو جان نکل گئی کہ نہیں معلوم کیا ہو گیا۔ تمہارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ٹوکری بھر آتشبازیاں پانی میں پھینک دی گئیں"۔

"۔ یہ تو روپیہ کو آگ میں پھونکنا ہے"۔

"۔ ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لئے تو آتے ہیں۔

"۔ تیوہار میں گاؤ بجاؤ۔ اچھی اچھی چیزیں پکاؤ کھاؤ۔ خیرات کرو۔ عزیزوں سے ملو۔ سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اُڑانے کا نام تیوار نہیں ہے"۔

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازہ پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا۔ یہ دھکا کس نے مارا؟

شیاما نے لاپروائی سے کہا۔ بلی ولی ہوگی۔

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیواڑ پر دھکا پڑا۔ گجندر کو لرزہ آگیا۔ لالٹین لے کر دراز سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ چار پانچ آدمی کرتے پہنے، پگڑیاں باندھے، ڈاڑھیاں لگائے، شانے پر بندوق رکھے کیواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر اُن کی باتیں سننے لگا۔

"۔ دونوں سو گئے ہیں۔ کواڑے توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے"۔

"اور اگر دونوں جاگ گئے؟"

"عورت کیا کر سکتی ہے۔ مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔"

"سنتے ہیں گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے۔"

"کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے۔"

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دُلاری سے بولے۔ یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔

"چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے۔ نہیں میں چلاتی ہوں۔ چور کا دل آدھا۔"

"نا نا، کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ گانوں میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ گھر کے آدمی کیا ہوئے؟"

"بھیا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے۔ اُن کے کانوں پہ توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔"

"اس کمرہ میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہونچے۔ مکان ہے یا قید خانے۔"

"میں تو چلاتی ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں۔ جان تو بچے۔ دیکھو کواڑ ہل رہی ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ یا ایشور، کہاں جاؤں اس مصیبت میں تمہارا ہی بھروسا ہے۔ کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے، نہیں آتا ہی کیوں۔ بس چپّی سادھ لو۔ اگر ہلائیں ڈرائیں تو بھی سانس مت لینا۔"

"مجھ سے تو چپّی سادھ کر پڑے نہ رہا جائے گا۔"

"زیور اُتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تو لیں گے۔"

"زیور تو نہ اُتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"کیوں جان دینے پر تُلی ہوئی ہو؟"

"خوشی سے تو زیور نہ اُتاروں گی۔ زبردستی کی اور بات ہے۔"

"خاموش۔ سنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

باہر سے آواز آئی۔ کواڑ کھول دو۔ نہیں ہم کواڑ توڑ کر اندر آجائیں گے تو ....

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی۔ میری بات مانو شیاما۔ زیور اُتار کر رکھدو۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا۔

باہر سے آواز آئی۔ کیوں شامتیں آئی ہیں۔ بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے ہیں۔ اگر کواڑ نہ کھولے تو خیریت نہیں۔

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا۔ کھول دوں؟

"ہاں بلالو۔ تمھارے بھائی بند ہیں نہ۔ وہ دروازے کو باہر سے ڈھکیلتے ہیں۔ تم اندر سے باہر کو ٹھیلو۔"

"اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے؟ پانچ پانچ جوان ہیں۔"

"وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے۔ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔"

"چنّو دادا ہوتے تو پانچوں کو گراتے۔"

"میں لٹھ باز نہیں ہوں۔"

"تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سبھوں سے سمجھ لوں گی۔"

"تمھیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ ماتھے میرے جائے گی۔"

"میں تو چلاتی ہوں۔"

"تم میری جان لے کر چھوڑو گی۔"

"مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتی ہوں۔"

اُس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھڑ بھڑا کر گھس آئے۔

ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں۔ تم عورت کے سارے گہنے اُتار لو۔

دوسرا بولا۔ اس نے تو آنکھیں بند کرلیں۔ ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی۔

تیسرا۔ یار عورت تو حسین ہے۔

چوتھا۔ سنتی ہے او مہریا۔ زیور دے دے نہیں گلا گھونٹ دوں گا۔

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اُتار دیتی۔

شیام دلاری نے کہا۔ گلا گھونٹ دو چاہے گولی ماردو۔ زیور نہ اُتاروں گی۔

پہلا۔ اسے اٹھائے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے۔

دوسرا۔ بس یہی مناسب ہے۔ کیوں رے چھوکری۔ ہمارے ساتھ چلے گی؟"

شیام دلاری۔ تمہارے منہ میں کالکھ لگا دوں گی۔

تیسرا۔ نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جاکر بیچ ڈالیں گے۔

شیام۔ ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوا دوں گی۔

چوتھا۔ کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی۔ ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے گذرے ہیں۔ کیا رہ جائے گا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھائے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

پانچواں۔ یا تو سارے زیور اُتار کر دیدے۔ یا ہمارے ساتھ چل۔

شیام دلاری۔ کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال اُدھیڑ ڈالیں گے۔

پہلا۔ یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اُٹھائے چلو۔ تب آپ ہی پیروں پڑے گی۔

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پانوں باندھے۔ گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے۔ ہائے! کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک تو پوچھوں نہیں۔

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اُٹھالیا اور لے کر آنگن میں جا پہونچے تو شیام دلاری دروازے پر کھڑی ہوکر بولی۔ انھیں چھوڑ دو تو میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

پہلا۔ پہلے ہی کیوں نہ راضی ہوگئی تھی۔ چلے گی نہ ؟

شیام دلاری۔ چلوں گی، کہتی تو ہوں۔

تیسرا۔ اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں۔

دونوں چوروں نے گجندر کو لاکر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دیے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نہ نظر آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے۔ لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبہ دار صاحب کو جگائیں۔ منھ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چُہل کرتی ہوئی شیام دلاری کے کمرے میں آئیں۔ گجندر کا وہاں پتہ نہ تھا۔

ایک۔ کہاں چلے گئے ؟

شیام دلاری۔ باہر چلے گئے ہوں گے،

دوسری۔ بہت شرمندہ ہوں گے۔

تیسری۔ مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہوگئی تھی۔

گجندر نے بول چال سُنی تو جان میں جان آئی سمجھے شاید گھر میں جاگ ہوگئی۔ لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے۔

ذرا دیکھئے شیاما کہاں ہے۔ میری تو نیند ہی نہ کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔

یکایک انھیں عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا۔

ایک نے کہا۔ واہ جیجا جی۔ دیکھ لی آپ کی بہادری۔

شیام دُلاری - تم سب کی سب شیطان ہو۔

تیسری۔ بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی۔

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنالی۔ بولے۔ تو کیا کرتا تمھارا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر موچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔

سب کی سب گجندر کا منھ دیکھتی رہ گئیں۔



کرگجگ

میرداد خاں تیرہ چودہ برس کی عمر سے بریلی کی چھاؤنی میں ایک رسالدار صاحب کے یہاں نوکر تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی ہوش سے پہلے اس دنیا میں اسے تنہا چھوڑ کر سفر آخرت پر چلے گئے تھے۔ رسالدار صاحب کی پرورش اور مہربانی سے یہ جواں ہونے پر رسالے میں ملازم ہو گیا۔

کوئی چالیس بیالیس برس کی عمر میں میرداد خاں سوار چین کی لڑائی سے بہادری کے دو تمغے۔ بارہ روپیہ مہینہ کی پنشن اور عمر بھر کی کمائی گیارہ سو روپیہ لے کر پھر بریلی واپس پہنچا۔ لیکن بریلی میں نہ کوئی رشتہ دار نہ عزیز۔ اس کا دل نہ لگا۔ اور آخر کار یہ اپنے آبائی مسکن و مولد کھیڑے کو چل کھڑا ہوا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر ایک غریب مسلماں کی لڑکی ہوئی چالیس بیگہ زمین خریدی۔ چھوٹا سا گھر بنایا۔ اور گھر کو آباد کرنے کے لئے شادی کر لی۔

میرداد خاں کا دل اپنے گھر بار اور کسانی میں ایسا لگا کہ اسے سوائے اپنے اکلوتے بیٹے ولی داد کے لاڈ پیار اور اپنی زمین جوتنے اور بونے کے کسی سے کوئی غرض اور سروکار ہی نہ رہا۔

میرداد خاں کی عمر ساٹھ سے اوپر اور ولی داد کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی کہ میرداد کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ میرداد متدین تو ہمیشہ سے تھا ہی اب بڑھاپے میں رفیق زندگی کی جدائی سے اس کا دل اور بھی ٹوٹ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد سے جلد ولی داد کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو کر گھر بار اور اسی بیگہ زمین اسے سونپ دے اور خود اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔



جمعدار فتح نصیب خاں کی یتیم بھانجی سے ولی داد خاں کی منگنی ٹھہری۔ دو ماہ بعد عید کے چاند شادی بھی ہو گئی۔ میرداد خاں زندگی کی تگ و دو سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ مسجد میں نماز کے لئے تو جاتے تھے مگر ان پانچ وقت کے علاوہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتے۔ گھر کے سائبان میں چھپر کے نیچے۔ بھوسے کی کوٹھری کے پاس بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے اور اپنے پوتے کو خدا کے نام۔ روزہ نماز کے احکامات۔ اور قرآن شریف

پڑھایا کرتے۔ ولی داد دن بھر کام کاج میں لگا رہتا۔ پھر شام ہوتے گھر واپس آتا۔ بہو اور پوتا۔ بوڑھے میر داد خاں کی رفاقت ہی میں دن گذارتے۔ میر داد خاں کو اپنی بہو اور پوتے سے بے حد محبت تھی۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ان کی بہو اور پوتا بھی انھیں بے حد ہی چاہتے تھے۔ یہ محبت کی برکتوں سے مالا مال زندگی خوب تھی۔ صبح۔ شام ہوتی رہی۔ مہینے اور سال گذرتے رہے۔ اور یہ محبت بڑھتی گئی۔ لیکن اس چار آدمیوں کے مختصر خاندان میں ولی داد اس نعمت سے محروم تھا۔ اسے ننانوے کے پھیر میں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ بوڑھے باپ کی شفقتوں کا شکریہ ادا کرتا۔ اپنی نیک بخت بیوی کی جانفشانیوں کی قدر کرتا یا اپنے ذہین اور تندرست بیٹے کے کھیلوں میں شریک ہو سکتا۔ اس کی زندگی خشک تھی اور تلخ۔ اسے اپنا بوڑھا باپ ایک بوجھ معلوم ہوتا۔ اسے اپنی بیوی۔ ایک مصیبت نظر آتی۔ اسے اپنا بچہ ازدواجی زندگی کا ناگزیر تتمہ معلوم ہوتا۔

بوڑھے میر داد کی عمر ستر برس سے اوپر ہو گئی۔ ان کے پوتے کی عمر بھی اب آٹھ نو سال کی تھی۔ پیر سال اور خورد سال۔ جواں سال کی کرختگی کو محسوس کرتے لیکن محبت اس کی تلخی کو مٹا دیتی۔

ایک دن ولی داد کی بیوی کو بخار آگیا۔ ولی داد ایک جوڑی بیل خریدنے کے لئے میلے میں گیا ہوا تھا۔ گھر میں روٹی نہ پک سکی۔ دادا اور پوتے نے دودھ پر گذارا کیا۔

رات کو دس بجے ساون کے منہہ میں بھیگتا بھاگتا ولی داد گھر واپس آیا۔ خرید میں ناکامی۔ سفر کی تکان۔ بارش کی تکلیف سے مزاج معمول سے زیادہ خراب ہو رہا تھا۔ کریلے کی تلخی نیم چڑھنے سے اور بڑھ گئی تھی۔ گھر میں گھُسا تو گویا طوفان کی طرح در آیا۔ آتے ہی کھانا مانگا۔ بیوی کو سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ بوڑھا باپ نظر کی کمزوری اور بڑھاپے کی ناتوانی کے باعث چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ بیٹا بچہ تھا۔ کھانے کا بندوبست کون کرتا۔ بھوکے شیر کے آگے پکّی پکائی کون لا رکھتا۔

بھوک میں شیر بپھر گیا۔ بخار میں بے ہوش بیوی کو مارنا شروع کیا۔ ضعیف باپ یہ نہ دیکھ سکا۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔ ولی داد اس بے چاری کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔ اس کی دوا دارو کی فکر تو ہوئی نہیں

اپنے پیٹ کی تنگی سے بے حال ہو گیا۔ بہو اسی حال میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی ابا۔ میں روٹی ڈالتی ہوں ان کا غصہ بھی سچا ہے۔

بیوی کی اطاعت شعاری سے اس کی طرف سے تو غصہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن ناتواں باپ کی مداخلت بُری معلوم ہوئی۔ ولی داد بولا۔ بڈھے چین سے بیٹھا ہے اسی لئے زبان چلتی ہے۔

باپ نے کہا۔ کیا مفت بیٹھا ہوں۔ عمر بھر تلوار چلائی محنت کی یوں بیٹھا ہوں۔

بیٹے نے کہا۔ اچھا عمر بھر تلوار چلائی۔ اب زبان چلاتا ہے۔ نکل میرے گھر سے۔ دیکھوں۔ تیرا زبان چلانا۔

جواں بیٹے نے جوانی کی ترنگ میں بڈھے باپ کی چارپائی اُلٹ دی۔ اور سر پہ کھڑا ہو گیا۔ نکل میرے گھر سے۔ نکل میرے گھر سے چیخنے لگا۔ بہو دوڑی ہوئی آئی۔ اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بڈھا باپ لڑکھڑاتا۔ دھواں دھار برستے مینہہ میں بھیگتا۔ دروازہ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ مگر ولی داد نے ایک نہ سنی۔ اور یہی کہتا رہا کہ بڈھے کو زبان چلانے کا مزا اب معلوم ہوگا۔

بیوی کی خوشامد درآمد سے ولی داد اس بات پر تیار ہو گیا کہ گھوڑی پر باندھنے کا پرانا کمبل بڈھے باپ کو بارش کی اذیت سے بچنے کے لئے دیدے۔ اس نے اپنے بیٹے مہرداد کو آواز دی اور کہا۔ دیکھ کوٹھری میں جو کمبل پڑا ہے وہ اپنے دادا کو دے آ۔

سپوت مہرداد اُٹھا۔ کوٹھری میں سے کمبل نکال لایا اور دالان میں کھڑا ہو کر اسے ٹھیک بیچ سے پھاڑنے لگا۔

ولی داد نے کہا۔ کیا کرتا ہے بے۔ باہر دے کیوں نہیں آتا؟ خوردسال مہرداد نے کہا۔ اس کمبل کے برابر کے دو ٹکڑے کر رہا ہوں۔ کہ جب میں تمھارے برابر ہو جاؤں۔ اور تم دادا کی برابر ہو جاؤ۔ اور میں تمھیں گھر سے نکالوں تو یہ باقی آدھا کمبل تمھارے کام آئے۔ ولی داد یہ سن کر غصے میں آگے بڑھا۔ لیکن خدا جانے دل پر کیا گذری کہ فوراً ہی روتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنے بوڑھے باپ کو گود میں اُٹھا کر گھر میں لے آیا۔ اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر بہت دیر تک زار و قطار روتا رہا۔

تنقید و تبصرہ

اقامۃ الشہود فی رد الیہود | یہ کتاب ایک علمی تحفہ ہے جو عالی جناب حکیم محمد احمد خاں صاحب اپنے سفرِ عراق کی اِمسال ہمارے واسطے لائے۔ اُنھوں نے اپنی علم دوستی سے حضرت مسیح الملک مرحوم کی سنت کو تازہ کر دیا کیونکہ وہ بھی جب سفرِ عراق و مصر سے واپس آئے تھے تو ایک کتاب " الفلاکۃ والمفلوکون " لائے تھے جس کا خلاصہ اسی زمانہ میں رسالہ جامعہ میں شائع کیا گیا تھا۔

اقامۃ الشہود مرزا محمد رضا نو مسلم طہرانی کی تصنیف ہے جو علماء یہود میں ممتاز بلکہ فرید عصر تھے۔ اور بیت المقدس تک کے احبار ان کی علمی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

" کمترین حقیر نقیر از سلسلۂ علماء بنی اسرائیل در میان ایشاں از افاضل و اعیان بودم۔ و یکی علماء بیت المقدس و ارباب فہم آں طائفہ بفضل و تتبع من معترف بودند۔ و در تمام ایام عمر مشغول بہ تحصیل علوم و مطالعہ کتب سماوی و در مقام متابعت رسوم انبیاء سلف و علماء خلف بودم۔ و در اں تجسس و طلب بجز از تمیز میان حق و باطل ادیان، و وصول بطریق حق و ایقان مطلبے و مقصودے نداشتم۔ و پیوستہ ظہور راہ صواب را از مفتح الابواب سائل، و استجابت دعا را از جناب رب الارباب آرزو مند و مائل بودم۔ تا آنکہ توفیق ربانی شامل حال و تائید سبحانی کافلِ احوال و آمال ایں سعادت مآل گردیدہ بہ تشریف شریف دین حنیف محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سرفراز، و بایں عطیۂ عظمیٰ از بکی اماثل و اقرانِ خود ممتاز گردید "

مسلمان ہو جانے کے بعد فاضل موصوف نے علماء یہود کے سامنے دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے خود صحائف بنی اسرائیل سے ۱۲۳۰ھ میں بعہد فتح علی شاہ قاچار یہ کتاب تالیف کی۔ جو دلائل اس میں لکھے ہیں وہ اس قدر مسکت ہیں کہ یہودی علماء سے آج تک ان کے جوابات نہ بن پڑے۔

چونکہ یہ کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی جس سے مسلمان اہل علم بالعموم ناواقف ہیں اس لئے علامہ سید علی بن حسین حسنی طہرانی نے جو زبان مذکور میں مہارت تامہ رکھتے تھے ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا۔ اسی زمانہ کا ایک مطبوعہ نسخہ حکیم صاحب موصوف کے ہاتھ لگا جس کو اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ اس میں جو بحثیں ہیں ان کے مخاطب علمار یہود ہیں اور انھیں کی دینی اور علمی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ علمار اسلام میں سے جن کو یہود کے ساتھ بحث و مباحثہ کا سابقہ پڑے ان کو یہ کتاب ضرور پیش نظر رکھنی چاہئے۔

کتاب الصلوٰۃ | حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے متعلق یہ کتاب لکھی تھی جو ائمہ و علمار اسلام میں آج تک برابر مقبول چلی آتی ہے۔ شیخ علی جواد صاحب۔ بی اے لکچرر مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علی گڈھ نے نہایت عمدگی کے ساتھ اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اور چھوٹی تقطیع پر خوشنما کتابت کے ساتھ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر طبع کرایا ہے۔ شروع میں امام موصوف کی مختصر سوانح عمری بھی لکھ دی ہے۔ کتاب نہایت مفید اور عمدہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔

سیرۃ محمدی | علامہ شیخ محب الدین ابو جعفر احمد بن عبداللہ طبری متوفی ۶۹۴ھ نے سیرۃ کی بہت سی کتابوں کا عصارہ اور جوہر نکال کر ایک مختصر سیرۃ خلاصۃ السیر کے نام سے لکھی تھی۔ مولانا محمد صاحب جوناگڈھی اڈیٹر اخبار محمدی۔ باڑہ ہندوراؤ۔ دہلی نے اس کا سلیس اردو ترجمہ کرکے شائع کیا ہے جو لوگ سیرۃ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں رکھتے ان کو یہ مختصر سیرۃ ضرور پڑھ لینی چاہئے۔ مولانا نے اصل عربی سیرۃ بھی چھاپ دی ہے جس کی قیمت مرفی نسخہ ہے۔ اردو ترجمہ کی ۱۲ر اور دونوں کی ۱۴ر۔

شانِ قرآن | مصر کے مشہور فلسفی فاضل علامہ فرید وجدی کے رسالۃ القرآن کا ترجمہ ہے جس کو مولوی عبدالحلیم صاحب ناظم صدیقی "مولوی فاضل" اڈیٹر رسالہ محدث و مدرس دارالحدیث رحمانیہ۔ دہلی نے صاف اردو میں

ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ تقطیع خورد۔ لکھائی چھپائی اوسط اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ ۵ رہے۔ اس رسالہ میں علامہ موصوف نے قرآن کی مختصر تاریخ لکھی ہے اور اس کے وجوہ اعجاز سے بحث کی ہے۔ اگرچہ اردو زبان میں ان عنوانوں پر اس سے مفصل اور مبسوط کتابیں موجود ہیں جو زیادہ تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ مختصر بھی اپنے معیار سے طلبار کے لئے مفید ہے۔

التنقید السدید علی التفسیر الجدید | یہ تین جزء کا ایک رسالہ ہے جس کو مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن صاحب "مولوی فاضل" صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ نے خواجہ عبد الحیٔ صاحب فاروقی شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تفسیر کی تنقید میں لکھا ہے۔ تنقید اگر اپنے وجدان اور علمی نگاہ سے لکھی جائے تو وہ ایک مفید شے ہے مگر مولانا ابو المآثر نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید بلکہ حنفیت کی حمیت میں لکھا ہے اس وجہ سے ان کی یہ تنقید سراپا تردید ہو گئی ہے۔ اور اس میں تحقیق حق کی کوئی شان باقی نہ رہی۔ خواجہ صاحب کی تفسیر میں غلطیاں نکالی جا سکتی ہیں اور دنیا میں کونسی ایسی تفسیر ہے جس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ کیوں کہ تفسیریں انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں جن میں خطا بھی ہے اور نسیان بھی۔ غلطی بھی ہے اور غلط فہمی بھی مگر مذہبی عصبیت جس کی بنیاد پر یہ نکتہ چینیاں کی گئی ہیں خالص جدل و مکابرہ ہے اور اس سے کوئی نفع مرتب نہیں ہوتا۔

خواجہ صاحب نے "باب الحیل" پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور یہ اعتراضات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ ہر اہل نظر کے نزدیک فقہ کا یہ باب افسوسناک ہے اور اس تقوے کے بالکل منافی جس کے اوپر اسلام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں نہایت وضاحت کے ساتھ ان کے اوپر بحث کر دی ہے جس کا کوئی جواب آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا ابو المآثر نے ان حیلوں کی بھی حمایت کی ہے اور بحث کا رخ بالکل دوسری جانب موڑ دیا ہے یعنی ان حیل کی نوعیت جواز یا عدم جواز کی طرف۔ حالانکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ حیلے اس غرض سے تراشے گئے ہیں کہ شرعی حدود جو کتاب اللہ نے مقرر کئے ہیں ساقط کر دئے جائیں۔ اس لئے یہ بجائے جرائم کے انسداد کے ان کے اضافہ کا موجب ہوتے ہیں اور اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔
خواجہ صاحب نے تقلید کو حرام کہا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا ابو المآثر نے کئی صفحے سیاہ کئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ مرحوم کی کتابوں سے جو کچھ وہ ثابت کرسکے ہیں وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے ۔

"اس شخص کے حق میں حرمت تقلید کا فتوئے صحیح نہیں ہے جس کا اعتقاد ہو کہ حلال اور حرام وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال یا حرام فرمایا ہو۔ لیکن چونکہ وہ بے علم ہے یا مختلف احادیث میں جمع و تطبیق کے طریق سے ناآشنا ہو اور استخراج اور استنباط کا بھی اس کو سلیقہ نہیں اس لئے کسی عالم ربانی کا محض اس اعتبار پر اتباع کرتا ہے کہ وہ غلط نہ کہے گا ۔ اور احادیث کے ماتحت ہی فتویٰ دے گا"

لیکن شاہ صاحب کے اس قول سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جہلار کو علمار سے دین کے مسائل دریافت کر لینا چاہئے ۔ مردہ اماموں کی تقلید کا ثبوت کہاں سے نکلتا ہے جس میں نہ صرف جہلار بلکہ مولانا ابوالمآثر جیسے علمار بھی جو حدیث وفقہ پر وسیع نظر رکھتے ہیں گرفتار ہیں حقیقت یہ ہے کہ ائمہ و علمار سلف کی تصانیف اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں مگر ان کی تقلید یعنی ان کے اقوال کو بلا دلیل تسلیم کر لینا قرآن کی رو سے قطعاً ممنوع ہے تاوقتیکہ ان کی سند نہ دی جائے۔ یہی خود ان مجتہدوں نے بھی کہا ہے کہ ہمارے قول کے مطابق اس وقت تک کسی کو فتوے دینا حرام ہے جب تک اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کہاں سے کہا ۔"

دین اسلام اگر صرف عرب یا عہد رسالت کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمان ہر ملک اور ہر قوم کے لئے ہے تو ہر زماں ہر ملک اور ہر قوم میں مجتہد ہونے بھی لازمی ہیں ۔ گذشتہ مجتہدین صرف اپنے اپنے زمانوں اور اپنے اپنے ماحول کے مجتہد تھے وہ رسول نہ تھے کہ ہر مکاں اور ہر زماں میں ان کا قول دیں مانا جائے ۔

الغرض تقلید جس قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اس کے تنزل کے لئے پھر کسی دوسرے سبب کی مطلقاً ضرورت نہیں رہتی ۔ کیونکہ حریت فکر مسلوب ہونے کے ساتھ زوال لازمی ہے اور یہی مسلمانوں کے معاملہ میں ہوا ہے ۔

یہ تنقید افسوسناک حد تک غلط چھپی ہے ایک ایک صفحہ میں کئی کئی مطبعی غلطیاں ہیں ۔ اور شاید اس کی معنوی غلطیوں کا تقاضا بھی یہی تھا ۔

بیان الفرقان علیٰ علم البیان | تفسیر سورۂ فاتحہ و بقرہ بہ زبان عربی۔ مؤلفہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرت سری مدیر اخبار اہل حدیث۔ حجم ۹۰ صفحے، کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت فی نسخہ ۱۲ / ر۔

مولانا ثناء اللہ صاحب نے تفسیر ثنائی اردو میں لکھی ہے جو ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ دوسری تفسیر ان کی تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن عربی میں ہے جس پر رسالہ جامعہ میں تبصرہ لکھا جا چکا ہے۔ اب انھوں نے تیسری تفسیر مذکورۂ بالا نام سے عربی زبان میں لکھنی شروع کی ہے جس کا یہ ابتدائی حصہ ہمارے پاس بغرض "تقریظ" موصول ہوا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ تفسیریں چار قسم کی ہوتی ہیں۔ تفسیر القرآن بالقرآن [۱] ۔ تفسیر علیٰ طریقۃ المتکلمین [۲] تفسیر علیٰ علم البیان [۳] ۔ اور تفسیر بالروایات [۴] ۔ میں سے پہلی اور دوسری قسم کی تفسیریں تو وہ لکھ چکے ہیں۔ اب یہ تیسری قسم کی لکھ رہے ہیں لہٰذا ہم کو چوتھی قسم کا بھی منتظر رہنا چاہیے کیونکہ روایات تو بوجہ اہل حدیث ہونے کے مولانا کا خاص فن ہیں۔ لیکن یہ تقسیم بہت کچھ محل اعتراض ہوسکتی ہے کیونکہ اہل تصوف اور اہل تاریخ ضرور کہیں گے کہ صوفیانہ اور مورخانہ تفاسیر کو کیوں خارج کر دیا۔ اہل تشیع اپنے ائمہ معصومین کے اقوال سے تفسیر لکھتے ہیں وہ کس ذیل میں جائے گی؟ مصر میں ایک شخص نے معدنیات کی رو سے تفسیر لکھی ہے جس کا نام اسرار النورانیۃ القرانیہ ہے وہ اس میں داخل نہیں ہوسکتی۔ الغرض مولانا کی یہ تقسیم نہ جامع ہے نہ مانع اور نہ اس کی کوئی سند ہے۔

معانی وبیان اولاً تو محض ایک خیالی اور قیاسی فن ہے دوسرے مولانا کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے پھر مجھے حیرت ہے کہ علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کے ہوتے ہوئے جو اس فن کے امام تھے مولانا کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ایسی بے مایہ تفسیر لکھ کر آفتاب کو چراغ دکھانے کی کوشش کریں۔ ان کی تو عربی بھی صحیح نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ وہ "ہندی عربی" کہی جاسکتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

احل اللہ البیع وحرم الربوا فلیف اسواء

یہ فلیف السَّوار کیا ہے؟ یہ کیسا جملہ ہے؟ اور یہ کس قسم کی عربی ہے۔؟

اسی صفحہ میں اس سے بھی زیادہ عجیب ایک اور فقرہ ہے۔ اردو میں "صورت سوال" اس محتاج کو

کہتے ہیں جس کی شکل ہی سے بلا مانگے ہوئے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ سائل ہے۔ مولانا نے سوچا کہ صورت بھی عربی اور سوال بھی عربی پھر کیوں نہ عربی میں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ لایسئلون الناس الحافا کے تحت میں لکھتے ہیں "اما صورۃ السوال میں غیر لفظ" مجھے یقین ہے کہ اس لفظ سے سوائے نوعیت سوال کے مشکل سے کوئی عربی داں اس مفہوم کو سمجھ سکے گا جو مولانا بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تفسیر کی کیفیت یہ ہے کہ آیات کی حقیقت کے اظہار کی طرف انھوں نے اپنی توجہ بہت کم رکھی ہے صرف کہیں کہیں لفظوں کے ترجمے یا معانی وبیاں کے بعض صنائع کی طرف اشارے کر دیتے ہیں۔ چند مثالیں ان کی تفسیر کے ملاحظہ ہوں۔

ذبح بقرہ کے قصہ کے متعلق فقلنا اضربوہ ببعضھا کی تفسیر کرتے ہیں" اضربوا المقتول بحصۃ المقتولۃ" سوال یہ ہے کہ یہ مقتولہ کون ہے؟ اگر اس سے مراد بقرہ ہے تو مذبوحہ لکھنا چاہیے تھا اور اگر کوئی دوسری شے ہے تو اس کی تصریح لازم تھی۔

ہاروت و ماروت کو بجائے مَلَکین کے شیاطین کا بدل قرار دیا ہے۔ اس پر حاشیہ میں ابن جریر اور فتح البیان سے سند نقل کر کے یہ لطیف اشارہ کیا ہے کہ" فافہم" یعنی ہم نے تو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اب تم بھی غور کر کے اسی طرح حقیقت تک پہنچ جاؤ۔ حالانکہ اس تفسیر سے حقیقت سے اس قدر بعد ہو گیا کہ وہ کبھی فہم میں نہیں آسکتی۔ مولانا نے جو کچھ سمجھا ہے وہ صرف ابن جریر وغیرہ کے بیاں کو سمجھا ہے آیت قرآنی کا مفہوم قطعاً ان پر واضح نہیں ہوا۔
اگر ہاروت و ماروت ملکین کے لفظ کا بدل نہ ہوں جو تثنیہ ہے اور شیاطین کا بدل قرار دئے جائیں جو جمع ہے تو یہ ایسی عربی ہوگی جس کو عرب کے بچے بھی نہیں بولیں گے چہ جائیکہ یہ اللہ کا کلام ہو سکے۔ کسی ماقبل تفسیر کی سند لکھ دینے سے کوئی غلط بات صحیح نہیں ہو سکتی۔

ایک تیسری مثال یہ ہے کہ بیوہ عورت کے ساتھ زمانہ عدت میں تصریحاً نکاح کا پیغام قرآن کریم نے ممنوع قرار دیا ہے لیکن تعریض اور کنایہ کی اجازت دی ہے مولانا اس کنایہ کی مثال میں امراؤالقیس کا یہ مصرع کسی قدر تصرف کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"اے مثلک برنوالحلیم صبابتہ" یعنی "عاشق بزرگ لوگ ہیں اس (تجھ) خردسال کے"

غالباً مولانا کا خیال یہ ہے کہ خطبہ نکاح ممنوع ہے نہ کہ اظہار تعشق۔

ان طلقتم النساء مالم تمسوھن کے تحت میں حاشیہ لکھا ہے "کما وقع بینی وبین ولی زوجتی الاولیٰ فطلقت قبل مساسہا رحمھا اللہ علاوہ اس کے یہ عربی خالص ہندی ہے" طلقتہا قبل المساس" چاہیئے تھا۔

یہ کس قدر حیرت ہے کہ مولانا اپنے اس جزی ذاتی واقعہ کو بھی اتنا اہم سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال میں قرآن کے طلبا کو یہ سن کر بصیرت حاصل ہو جائے گی کہ مفسر نے اپنی منکوحہ اولیٰ کو قبل مساس طلاق دیدی تھی۔ دراصل یہ مرض علماء اہل حدیث میں نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مرحوم کی "تقلید" سے پیدا ہوا ہے جو ایک نہایت معمولی حالت سے امارت کے رتبہ کو پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی اقبال مندی کا زینہ سمجھ کر اپنی تصانیف میں دہراتے ہوئے نہیں تھکتے۔ حالانکہ علمی کتب میں ایسی غیر متعلق باتوں کا ذکر کرنا خود پسندی کی دلیل ہے۔

آخر میں میں مولانا سے وہی عرض کرتا ہوں جو حضرت عمرؓ سابقون اولون سے فرمایا کرتے تھے۔ جب وہ فارس وروم کی جنگوں میں شرکت کی اجازت طلب کرتے تو آپ کہتے کہ رسالتمآب کے عہد مبارک میں جو جہاد تم نے کرلئے وہ تمہارے واسطے کافی ہیں اب آرام سے مدینہ میں بیٹھے رہو۔ مولانا نے آریوں۔ عیسائیوں اور مقلدوں کے ساتھ جو عظیم الشان مناظرے کئے اور قادیانیوں کی خیبر شکنی کی جن کے سبب سے وہ آج شیر پنجاب۔ فاتح قادیان اور امیر جماعت اہل حدیث کے خطابات سے پکارے جاتے ہیں ان کے لئے کافی ہیں۔ قرآن کی بھی دو تفسیریں لکھ چکے ہیں۔ اب کیا ضرور ہے کہ تفسیر پر تفسیر لکھتے چلے جائیں اور وہ بھی ایسی کہ لایسمن ولایغنی من جوع۔

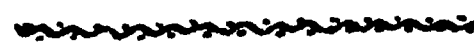
الاصلاح | علامہ عنایت اللہ مشرقی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آج ان کی شہرۂ آفاق کتاب تذکرہ کی بدولت ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جہاں مغربی علوم میں بلند سے بلند پایہ رکھتے ہیں وہاں قرآن فہمی میں بھی اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہے اور قرآن اتارنے والے رب جلیل کا وہ تقویٰ جس نے ان کو دنیا پہ لات مار کر اسلام کے لئے عملی کام کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نہایت غور و فکر کرکے تحریک خاکساراں جاری کی ہے جو نہ صرف یہ کہ کامیابی کے ساتھ

چل رہی ہے بلکہ دن بدن مقبول ہوتی اور ترقی کرتی جاتی ہے اور ہزارہا مسلمان اس تحریک میں جس کی بنیاد بلا امتیاز مذاہب انسانی خدمت اور اطاعت امیر پر رکھی گئی ہے شریک ہوتے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی اہم تحریک کے لئے ایک اخبار کا ہونا لازمی تھا چنانچہ اس کے مرکز لاہور سے یہ ہفتہ وار جریدہ الاصلاح کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کے چند نمبر موصول ہو چکے ہیں۔ یہ اخبار کیا ہے۔ وقت کی ایک صحیح رہنمائی اور قوم کے شکستہ دلوں کے لئے مومیائی۔ بھائیوں کا بھائیوں سے تعلق جوڑ کر سارے مسلمانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں پروتا ہے اور ان کو تشتت۔ تفرق اور بے عملی کے قعر مذلت و نکبت سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں خود علامہ موصوف کے بھی مضامین ہوتے ہیں۔ ایمان اور جوش عمل سے لبریز۔ حقیقت آموز اور ولولہ انگیز۔ ہم کو امید ہے کہ تمام مسلمان اس تحریک اور اس اخبار کی خریداری میں شرکت کریں گے جس سے توقع ہے کہ ہم ایک مرکز پر آ سکیں۔ قیمت سالانہ للعہ ر اور ششماہی دو روپیہ چار آنہ ہے۔

اسی اخبار کے دفتر سے بسلسلۂ تنظیم مساجد "دعوۃ" کے نام سے عید الفطر کا خطبہ موصول ہوا ہے جس میں مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ان کی آئندہ ترقی کے اسباب بتائے گئے ہیں یہ خطبہ کیا ہے بس ؎

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مسجدوں کے پیش نماز صاحبان دفتر اخبار الاصلاح لاہور سے اس کو مفت طلب کر سکتے ہیں۔



رسائل

سالنامہ ادبی دنیا لاہور۔ اڈیٹر۔ منصور احمد۔ صفحات ۲۳۲ علاوہ اشتہارات قیمت عہر۔

اردو رسائل میں یہ رواج اب کچھ مسلم سا ہو گیا ہے کہ سال میں کم از کم ایک خاص نمبر سالنامہ کی صورت میں ضرور شائع کیا جائے۔ بعض رسائل تو محض صفحات کے اضافہ سے اس کی خانہ پری کر دیتے ہیں لیکن بہت کم رسائل ایسے ہیں جو واقعی صوری اور معنوی ہر حیثیت سے سالنامہ کو کامیاب بنانے کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور اس پر کافی خرچ بھی کرتے ہیں۔

"ادبی دنیا" اردو کا ایک پرانا اور مشہور رسالہ ہے جس نے اپنی زندگی کے کئی دور دیکھے لیکن پھر بھی

بنا معیار پست نہونے دیا۔ اس وقت اسی کا سالنامہ بابتہ ۱۹۳۵ء ہمارے پیش نظر ہے جو اشتہارات کے علاوہ بڑے سائز کے ، ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ سالنامے میں متعدد ڈراموں اور افسانوں کے علاوہ چند علمی ۔ تحقیقی ۔ اور تاریخی مضامین بھی ہیں جن میں " نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ " از پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہے ۔ پنڈت جی نے آزاد مرحوم کے ناقدین کے متعلق جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن بہرحال تحقیقی نظر سے آپ کا یہ مضمون پُر از معلومات ہے ۔ " شعرائے ایران و جدید تحریکات " از ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے بھی بہت اچھا مضمون ہے اور ہندوستان کے موجودہ دور میں اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔

" بن رہس " ایک انگریز مصنفہ کے مضمون کا ترجمہ ہے جس سے جنوبی ہند کے ڈرامہ کے قدیم فن " مدرا " پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔

سالنامہ میں ۷ سہ رنگی اور ۱۰ ایک رنگی تصاویر بھی ہیں ۔ نظم کا حصہ بھی کافی بلند ہے بہرحال ادارہ ادبی دنیا کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے ۔

سالنامہ ساقی | دہلی ۔ اڈیٹر شاہد احمد ۔ صفحات ۲۰۲ قیمت عہ ۔

ساقی ' اردو کے ان ادبی رسائل میں ہے جو نئی زمانہ صحیح معیار ادب کو پیش نظر رکھتا ہے اور بڑے سلیقہ سے ترتیب دیا جاتا ہے ۔ اس وقت اس کا سالنامہ ۳۵ء ہمارے سامنے ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں مسرت ہوئی کہ اس کے مضامین میں نسائیت حاوی نہیں ہے بلکہ بڑی خوش مذاقی سے افسانہ ، ڈرامہ ، مذاح اور ادبی و تحقیقی مضامین کا امتزاج کیا گیا ہے اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے ۔ اس کا معیار کافی بلند ہے ۔ آخرالذکر قسم کے مضامین میں محسن کاکوروی کا ایک نظر افروز شاہکار ۔ جاپانی عورت کی زندگی اور اس کا روزنامچہ ' قدیم چینی شاعری ، قدیم ہندی ڈراما ، قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیتیں ۔ افسانہ نویسی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ ریاض خیرآبادی اور ان کے کلام پر بھی ایک مفصل مضمون درج ہے طنزیات میں سید ابوطاہر داؤد کا " پان کار " بہت دلچسپ ہے ۔

ساقی کے خاص قلمی معاونین میں سید وزیر حسن دہلوی کا طرز تحریر مجھے بہت پسند ہے ان کی زبان میں بڑی دلآویز مٹھاس اور انداز بیان میں ایسی سادگی ہے کہ بے اختیار رشک آتا ہے۔ سالنامہ میں آپ کا ایک تخئیلی مضمون "آج میرا بھولنے والا مجھے یاد آگیا" بھی شامل ہے جو آپ کی مذکورہ بالا خصوصیات تحریر کا حامل ہے۔ غرضکہ نظم و نثر دونوں میں ملک کے مشہور اہل قلم حضرات کے نام اس سالنامہ میں نظر آتے ہیں جنھوں نے ناظرین کے لئے پڑھنے کے قابل کافی سامان فراہم کیا ہے۔ ہم اڈیٹر صاحب ساقی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اردو سے شغف رکھنے والے حضرات ان کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔

تعلیم۔ دہلی | اڈیٹر محمد حسین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)۔ چندہ سالانہ عہ

یہ ماہوار رسالہ حال ہی میں دہلی سے جاری ہوا ہے اور جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے تعلیمی مضامین پیش کرنا اس کا خاص مقصد ہے۔ اب تک اردو میں اعلیٰ معیار کے تعلیمی رسائل موجود نہیں ہیں اور یقیناً علم و ادب کی اس صنف میں ابھی بہت کافی گنجائش ہے۔ اس لئے ہم اپنے اس جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ابتدائی دو پرچوں کے مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا کہ تعلیمی مضامین کو دلچسپ بنانے کے لئے انھیں ادبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو مستحسن بھی ہے لیکن خطروں اور لغزشوں کا اندیشہ بھی ہے۔ یقین ہے کہ اڈیٹر صاحب کافی احتیاط سے کام لیں گے اور ناظرین آپ کی ہمت افزائی فرما کر اس کا موقع دیں گے کہ رسالہ زیادہ بہتر کتابت۔ طباعت وغیرہ کے ساتھ شایع ہوسکے۔

حسب ذیل رسائل ہمیں بغرض ریویو موصول ہوئے ہیں جن پر قلت گنجائش کی وجہ سے تبصرہ نہ کیا جا سکا۔ چنانچہ اڈیٹر صاحب "کتاب نما" کی خدمت میں ارسال کر دیئے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ کسی قریبی اشاعت میں مفصل تبصرہ فرمائیں گے۔

مسلم راجپوت سالنامہ ۱۹۳۵ء - امرتسر

شاہجہاں۔ خاص نمبر - دہلی

نخلستان .... ملتان

گنجینہ .... پٹنہ

امداد الغربائے پنجاب ...... لاہور

تنویر ...... ـــ کراچی

بہارستان .... امراؤتی

صنف نازک .... لاہور



فریاد

وہی کہ جس کے لئے نہیں ہے سکوں ذرا بھی دلِ حزیں میں
وہی کہ جس نے ہُوا کیا ہے مری تمنّا کا اک نہیں میں
وہی کہ بھر دی ہے یاس جس نے خیالِ اُمید آفریں میں
اُسی کو دل ڈھونڈھتا ہے اب بھی اُسی کی آنکھوں کو جستجو ہے

~~~~~~~~

وہی کہ جس کی بدولت اب تک فراغ پایا نہ زندگی میں
وہی کہ آیا نہ رحم مجھ پر جسے مری ایسی بے کسی میں
وہی کہ دل پر لگا گیا جو ہزار نشتر ہنسی ہنسی میں
الٰہی میں کیا کروں کہ اب بھی اسی کی اس دل کو آرزو ہے

~~~~~~~~

وہی کہ وابستہ جس کے دامن سے میری ساری مسرتیں تھیں
وہی کہ جس کی کسی زمانے میں دل پہ بے حد عنایتیں تھیں
وہی کہ سرمایہ زندگانی کا جس کی پیاری محبتیں تھیں
نہ اب ادھر التفات اس کا نہ اب وہ پُر لطف گفتگو ہے

~~~~~~~~

وہی کہ جس کی جنوں نوازی نے حوصلوں کو بڑھا دیا تھا
وہی کہ جس کی فسوں طرازی نے دل سے غم کو بھلا دیا تھا
وہی کہ جس نے مری تمنّا کو یاس میں آسرا دیا تھا
~~~~~~~~

خدا ہی جانے کہ کیا ہوا جو پھری ہوئی اس کی اب نظر ہے



وہی کہ جس کی عنایتوں نے مری دعا کو اثر دیا تھا
وہی کہ جس کی نوازشوں نے بلند عزموں کو کر دیا تھا
وہی کہ جس نے دل شکستہ کو جوش و ہمت سے بھر دیا تھا
وہی ہے آماجگاہ جس کے خدنگِ ہجراں کا اب جگر ہے



یہ کیا ہے اے انقلابِ دوراں، یہ کیا ہے اے گردشِ زمانہ
نہ تھی خبر ختم ہونے والا ہے اس طرح سے مرا فسانہ
کہ ہر ورق جس کا اہلِ دل کو ہے ایک عبرت کا تازیانہ
ہنوز اس سے مگر وہ جانِ فسانہ غافل ہے، بے خبر ہے



الٰہی اب بھی کہ میں ہوں بیزار اپنی ناشاد زندگی سے
الٰہی اب بھی کہ کام مجھ کو نہیں رہا ہے ہنسی خوشی سے
الٰہی اب بھی کہ میری حالت نہیں رہی ہے چھپی کسی سے
نہ ہو مرے حالِ زار پہ کچھ ترا کرم تو بڑا ستم ہے

نہ جانیں آ آ کے درد اس دل میں بھر گیا ہے کہاں کہاں کا
نہیں اترنے کی آس کچھ یوں چڑھا ہے دریا غمِ نہاں کا
دہن کو تابِ سخن نہیں ہے، لبوں کو یارا نہیں بیاں کا
زباں پہ قفلِ خاموشی ہے، شکستہ اس راہ میں قلم ہے

وہی کہ جس نے دیا تھا اکثر ہجوم اندوہ میں سہارا
وہی کہ ہونے دیا نہ جس نے ملال سے دل کو پارہ پارہ
وہی کہ تکلیف میرے دل کی کبھی نہ جس کو ہوئی گوارا
وہی ہر اب جس کی کم نگاہی مرے لئے وجہ صد الم ہے

بتاؤ تو کوئی بس خطا پر یہ دل ہے محروم چارہ سازی
کہاں وہ شانِ کرم نمائی، کہاں یہ رنگِ ستم طرازی
بھلا اک آشفتۂ محبت سے یہ تغافل، یہ بے نیازی
کسے خبر تھی کہ منزلِ عشق اس قدر سخت اور کٹھن ہے

~~~~~~~~~~

بس اب تو کچھ رحم ہو خدارا کہ ایسا جینا نہیں گوارا
غمِ محبت نے مار ڈالا نہیں کوئی زیست کا سہارا
جو ناخدا ہی نہ ہو تو کشتی اُمید کی پائے کیا کنارا
مری یہ حالت کہ جوشِ غم میں نہ ہوشِ جاں ہے نہ ہوشِ تن ہے

~~~~~~~~~~

جگر ہے مجروح جانِ غمگیں، تباہ سب دل کی آرزوئیں
گئی ہیں برباد کوششیں سب، ہوئی ہیں بے کار جستجوئیں
یہ سب مصائب، پھر اُس پہ چارہ گروں کی یہ تلخ گفتگوئیں
الٰہی تو جانتا ہے دل پر مرے جو بارِ غم و محن ہے



غزل

میری شہرت فلک پر چار سو ہے ؏ مجھے انسانیت کی جستجو ہے
تیرا ہی درد ہے وہ بھی جو اکثر ؏ ٹپکتا بن کے آنکھوں سے لہو ہے
کسی کی یاد ہے اور دل ہے میرا ؏ زباں ہے اور کسی کی گفتگو ہے
کہاں ہو تم خبر بھی ہے تمھیں کچھ ؏ عدو کی تیغ ہے میرا گلو ہے
طلسم زیست اک عبرت کدہ ہے ؏ نہ دل ہے اور نہ میں ہوں اور نہ تو ہے
لپٹ کر تارِ جاں بولا اجل سے ؏ کہ میں تیرا ہوں اب اور میری تو ہے
کہاں سے لائے وہ زندہ دلی کو ؏ جسے مرنے کی اپنے آرزو ہے
اگر ہو تم ہی تم ہر ایک دل میں ؏ تو پھر کوئی کسی کا کیوں عدو ہے
نہ آئے لوٹ کر یارانِ رفتہ ؏ مجھے ملنے کی اُن سے آرزو ہے

مسل دے دل کو اخگر چٹکیوں سے
جو ترک آرزو کی آرزو ہے

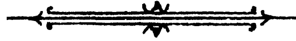


غزل

ہم یہ کہہ سکتے ہیں آسودۂ محفل آئے ۔ جب گئے ہوش میں تھے آئے تو غافل آئے
لو نقاب اُلٹے ہوئے وہ سرِ محفل آئے ۔ تابِ نظارہ ہو جس کو وہ مقابل آئے
سر بکف یوں تو ہزاروں سرِ محفل آئے ۔ اِک ہمیں تھے کہ جو ہاتھوں پہ لئے دل آئے
دل میں کچھ سوچ کے منہ پھیر لیا لیلیٰ نے ۔ ذرے جب اُڑتے ہوئے جانبِ محمل آئے
سرفروشانِ محبت کا بھرم کھل جائے ۔ تیغ لے کر جو ابھی سامنے قاتل آئے
عالمِ آغازِ محبت کا کوئی کیا جانے ۔ کسی بے درد پہ جب پہلے پہل دل آئے
میرے جاتے ہی ہوا حشر میں اک شور بپا ۔ لو وہ تیغِ نگہِ ناز کے بسمل آئے
اک نظر حسنِ دل افروز اگر دیکھ لیا ۔ ہوش میں پھر ترے دیوانے بمشکل آئے
جلوۂ حسن سے ہے اپنی جگہ شرمندہ ۔ سامنے رُخ کے ترے کیا مہِ کامل آئے
جب سفینہ مرا گرداب میں غرقاب ہوا ۔ سینکڑوں بار تھپیڑے سُوئے ساحل آئے
اب تو گھبرا کے یہ کہتا ہے ترا دیوانہ ۔ موت آجائے کسی پر نہ مگر دل آئے
لطف کیا دیدۂ گریاں کی گہرباری کا ۔ خونِ دل بھی اگر اشکوں میں نہ شامل آئے
یوں تو فریاد و فغاں کا نہیں حاصل کوئی ۔ لطف تو جب ہے وہ خود تھامے ہوئے دل آئے
نزع کے وقت وہ افسوس سمجھ ہی نہ سکے ۔ چند فقرے جو زباں پر بھی بمشکل آئے
آپ کی مست نگاہوں نے جو کرنا تھا کیا ۔ ہوش میں دیکھئے کب آپ کا غافل آئے

ہمصفیرانِ چمن بھول نہ جانا ہم کو ٭ جب کہیں تذکرۂ شورِ عنادل آئے
چل کے دو چار قدم اس لئے رُک جاتا ہوں ٭ تاکہ کچھ لطفِ غمِ دُوریٔ منزل آئے

لذّتِ عمر محبت پہ ہے موقوف حمید
زیست بے کار ہے جب تک نہ کہیں دل آئے



غزل

پوچھو نہ مجھ کو درد محبت نے کیا دیا ٭ دنیائے عیش دی کہ دلِ باصفا دیا
مطرب نے آج ایسا بھی نغمہ سنا دیا ٭ دل کو سکونِ خواب سے جس نے جگا دیا
دنیا ہی میرے شوق کی بالکل بدل گئی ٭ وہ آج سن کے حال مرا مسکرا دیا
سرچشمۂ محبتِ جاناں سے اے خدا[۵۱] ٭ قطرہ ہی اک پیا تھا کہ دریا بہا دیا
اس التفات خاص کے قربان جائیے ٭ دیکھا جو اشکبار مجھے مسکرا دیا
کچھ تو سمجھ کے تم نے دلائی تھی دل کو آس ٭ اب کیا ہوا جو تم نے مرا دل بجھا دیا
کعبہ میں چند ایسے بھی اہلِ نظر ملے ٭ مجھ کو جنھوں نے کعبۂ دل کا پتا دیا
کہتے ہیں اپنے فعل کا مجھ کو ہے اختیار ٭ الزام مفت کا یہ مرے سر لگا دیا
تقسیم ہو رہے تھے ازل میں صفاتِ شعر ٭ مجھ کو خدا نے جوہرِ حسن ادا دیا

گم کردہ راہ کوچۂ الفت میں تھا جلیل
صد شکر تو نے راہ پہ اس کو لگا دیا

---

۵۱ "مگر وہ بات کہاں ......" ص ۵

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازو
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

جلیل قدوائی

شذرات

ہم قارئین کرام سے معافی چاہتے ہیں کہ رسالے کی اشاعت میں بے حد تاخیر ہوگئی ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آئندہ پرچے دو دو تین تین ہفتے کے فصل سے شائع ہوں۔ شائد اس طرح اپریل تک رسالہ وقت پر آجائے۔

خالدہ ادیب خانم کو دہلی کے قیام کے زمانے میں قضائے الٰہی سے ایک صدمۂ جانکاہ اٹھانا پڑا موصوفہ کے بھتیجے کمال عاطف بے جو افغانستان میں وزارت خارجہ کے مشیر قانونی تھے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم خالدہ خانم سے ملنے کے لئے ۲۳ر جنوری کو دہلی آئے تھے۔ ۲۴ر کو انھوں نے اور ان کی بیوی نے رات کا کھانا خانم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر انصاری صاحب کے دولتکدے پر کھایا، اور اس کے بعد اس ہوٹل میں جہاں ان کا قیام تھا آرام کرنے چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ہوٹل سے ٹیلیفون آیا کہ کمال عاطف بے کو قلب کی بیماری کا دورہ پڑا اور وہ گذر گئے۔ مرحوم کی بیوی اور خالدہ خانم صاحبہ پر اس ناگہانی حادثے سے جو اثر ہوا اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اپنوں کے صدمے کا کیا ٹھکانا جب غیروں کا یہ حال تھا کہ جو سنتا تھا اسے سکتہ سا ہو جاتا تھا۔ دوسرے روز جنازے میں دہلی کے ہزارہا مسلمان اور بہت سے ہندو اپنے ایک مہمان کو سپرد خاک کرنے اور دو مہمانوں کو پرسہ دینے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ہم ارکان اردو اکادمی اور قارئین جامعہ کی طرف سے بیگم عاطف بے اور خالدہ خانم صاحبہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے اور ان دونوں خواتین اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اس صدمے کی وجہ سے بہ تقاضائے بشریت خالدہ خانم صاحبہ کو اپنا ۲۶ جنوری کا لکچر ملتوی کرنا پڑا اس کے بجائے پنجشنبہ ۳۱ جنوری کو ایک غیر معمولی لکچر ہوا - ان دنوں موصوفہ کے حزن و ملال کی کیفیت اور صحت کی حالت جن لوگوں نے دیکھی ہے وہ اس فرض شناسی اور صبر و استقلال پر ہزار آفریں کہتے ہیں کہ موصوفہ نے نہ صرف اپنے لکچر پورے کئے بلکہ دیکھنے والوں اور سننے والوں کو اپنے رنج کا اور اپنی علالت کا ذرا بھی اندازہ نہ ہونے دیا - دنیا میں کم عورتیں اور کم مرد اس موقع پر وہ کر سکتے تھے جو، خالدہ خانم نے کیا۔ لکچر ہر طرح سے بہت کامیاب رہے - صدارت ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، بھولا بھائی دیسائی، مسز نائڈو، ڈاکٹر بھگوان داس جیسے لوگوں نے کی - حاضرین میں دہلی کے قریب قریب کل تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب و خواتین، مسلمان، ہندو، عیسائی جن میں انگریز اور دوسرے یوروپین بھی نظر آتے تھے، شامل تھے - اسمبلی کے ممبر اور حکومت کے اراکین بھی کثرت سے آتے تھے - ان سب نے نہایت پابندی سے نہایت ذوق شوق سے خالدہ خانم کے کل لکچر سنے اور ہمیں یقین ہے کہ بہتوں نے سنے ہی نہیں بلکہ سمجھے بھی - خدا کرے ان لکچروں کا یہ اثر ہو کہ جو غلط فہمیاں ہندوستان میں ترک جیسی شریف اور بہادر قوم کے متعلق پھیلائی گئی ہیں وہ دور ہو جائیں اور ہندوستان اور ترکی کے درمیان ذہنی اور اخلاقی روابط از سر نو قائم ہو جائیں - امید ہے کہ مکتبہ جامعہ ملیہ کی طرف سے آخر مارچ یا وسط اپریل تک خالدہ خانم کے لکچر کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا اردو ترجمہ بھی چھپ جائے گا -

---

جامعہ کا یوم تاسیس اس سال یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو منایا جائے گا اور اسی کے ساتھ جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد بھی نصب ہوگا - اس مبارک رسم کے انجام دینے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمانرواؤں میں سے ہے، نہ ارکان سلطنت میں، نہ صاحبان دولت میں، نہ ارباب علم میں، نہ رہبران ملک میں، نہ اکابر قوم میں - جو کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ ہو سکتا ہے - یہ اس نژاد نو کا نمائندہ ہے جس سے علامہ اقبال نے جاوید نامے میں خطاب کیا ہے - یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے - ارباب نظر اس

انتخاب کی داد دیں گے اور یہ تسلیم کریں گے کہ یہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہے۔

جامعہ کی عمارت، جتنی اس وقت درکار ہے، چار پانچ لاکھ روپئے میں بن جائے گی۔ اس میں سے والیان ملک کا حصہ چھوڑ کر ڈھائی لاکھ روپیہ ملت اسلامی کے غریبوں اور امیروں کے دست کرم سے مطلوب ہے۔ اکابر قوم اس موقع پر جامعہ کی مدد کے لئے اپیل کر رہے ہیں اور انشاء اللہ قوم ان کی صدا پر لبیک کہے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان لبیک کہنے والوں میں رسالہ جامعہ اور اردو اکادمی کا حلقہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ ہم ادارت جامعہ کی طرف سے سو روپے کی ناچیز رقم کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے سب بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ حسب مقدرت اس کار خیر میں شرکت کریں اور چندے کی رقمیں شیخ الجامعہ صاحب کے نام روانہ فرمائیں، ہمیں نہایت مسرت ہوگی اگر ہمارے حلقے کی طرف سے پانچ ہزار کی رقم ایک سال کے اندر جامعہ کی عمارت کے فنڈ میں دی جا سکے۔ قارئین کرام میں جو صاحب عمارت کے فنڈ میں چندہ بھیجیں یا کسی دفتر کو ادا کریں وہ براہ کرم رسالہ جامعہ کے دفتر میں اس کی اطلاع بھیج دیں تاکہ ان کے اسمائے گرامی شکریے کے ساتھ رسالے میں شائع کئے جا سکیں۔

ہم امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہٗ تعالیٰ کا اپیل اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان غیور لوگوں میں ہیں جنھیں اپنے کام کے لئے بڑے بڑے تاجداروں کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی گوارا نہیں مگر قوم کے کام کے لئے امیر غریب کسی سے سوال کرنے میں عار نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جب ڈاکٹر انصاری جیسا شخص جامعہ ملیہ جیسی تعلیم گاہ کے لئے مدد مانگے تو مسلمانوں کا دریائے فیض جوش میں آکر رہے گا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال

کے

تازہ دیوان

بالِ جبریل

کو دیکھنے کے بعد

اقبال ہمہ آہنگ سرودِ ازلی ہے
دیوان کو تو اس کے ذرا ایک نظر دیکھ

مکرر

اشعار سے آتی ہے صدا اے ملکوتی
اوراق پہ بکھرے ہیں جبریل کے پر دیکھ

مکرر

اسلم جیراجپوری

رجسٹرڈ نمبر   ال - ۱۸۹۲



جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

خطباتِ خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو اُنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دئیے تھے اُردو، انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اپریل ۲ مئی تک شائع ہو جائیں گے۔ اُردو ترجمہ ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے کیا ہے۔ اشاعت سے قبل جو حضرات قیمت بھیج دیں گے اُنھیں محصول ڈاک معاف ہو گا۔

قیمت انگریزی سے؍ اُردو عہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ | مارچ سنہ ۱۹۳۵ع | نمبر ۳

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ترکی اور جنگ آزادی

یہ خالدہ ادیب خانم صاحبہ کے چوتھے توسیعی لکچر کا ایک حصّہ ہے۔
لکچروں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

خواتین اور حضرات!

اگرچہ میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں جنگ وجدل کا خاتمہ ہو جائے مگر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۹۱۸ء میں جب دو کروڑ آدمی قتل ہو چکے تھے، ملک کے ملک اُجڑ چکے تھے، بے شمار مخلوقِ خدا خانماں برباد ی کی مصیبت میں گرفتار تھی غرض دنیا تہ وبالا ہو گئی تھی۔ تمام انسانوں کے دل امن وامان کی آرزو سے معمور تھے۔ فاتح اور مفتوح دونوں خلوص اور جوش سے اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ دنیا میں صلح و آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب دنیا کی سب قومیں عدل وانصاف اور ہمدردی کا ایک نیا دور شروع کرنے پر اس قدر مائل ہوں جتنی اُس زمانے میں تھیں۔

جنگ سے ترکوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا شاید ہی کسی قوم کو پہنچا ہو۔ وہ پورے دس سال سے میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور ادھر خود اُن کے گھر میں خونریزی اور انقلاب کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے مُلک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ صُلح کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ یہ قیمت عارضی صلح سے قبل مغربی مدبّروں کے اعلانات میں معیّن کی جا چکی تھی۔ لائڈ جارج نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلان کیا تھا کہ وہ علاقہ جہاں ترک خود آباد ہیں اور دار السلطنت قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ اُسے اپنے دو تہائی مقبوضات سے

ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ترک اسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ انہیں اپنے گھر میں چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا اور غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل اور نشوونما کا موقع ملے گا۔

پریسیڈنٹ ولسن نے کہا تھا "جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں اُن کی نئی تقسیم ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جائے۔" ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا تھا "ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا۔ اس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں۔ انصاف ایسا ہونا چاہیے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے۔" پرانے مدبروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ نوع انسانی اِن کی آرزومند ہے۔ اِن الفاظ میں جو شیکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کے مقابلے میں ولسن کے چودہ احکام بھی یادگار رہیں گے۔ مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور ولسن اِس سے محروم تھا۔ وہ دُنیا کی بزمِ مشورہ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آ نکلا۔ اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ صُلح کی شرطیں اُنھیں پرانے طرز کے مدبروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حُبّ وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے اُن کے لحاظ سے محبِّ وطن بھی تھے۔ مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آرہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حِس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اُٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نافہم تھے کہ انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبِّ وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اُسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی

امن وامان کی فضا پیدا کرنی چاہیے۔

عارضی صلح کے بعد اتحادیوں کی فوجوں نے استنبول، سلیشیا اور چنک پر قبضہ کرلیا۔ ترکوں کی فوجیں منتشر ہونے لگیں۔ چھ مہینے تک ترک اس دھوکے میں رہے کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا۔

مگر حریفوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی کے پاس فوج نہیں رہی ہے، تمام ملک میں ابتری اور بے بسی کی حالت ہے تو اُن کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ خواہشیں جن کی بنا پر مخفی معاہدے کئے گئے تھے پھر اُبھر آئیں۔ آرنلڈ ٹوائنبی اپنی کتاب "ترکی" میں لکھتا ہے۔ "جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح مغرب کی ریاستیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پا کر ترکی پر ٹوٹ پڑیں۔ کیونکہ ترکی ایک زرخیز ملک ہے اور یورپ کی شہنشاہیت بہت لالچی ہے۔

اندرونی حالت اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی انجمنوں کی رہبری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے لیتی۔ اور قوم کی نمائندگی کرتی اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے کوئی اور پارٹی قائم ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ایک پارٹی کی حکومت میں یہ بھی ایک بڑا عیب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگ اور انقلاب کے زمانے میں بہت کامیاب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی اصلاحات کو بہت جلد عمل میں لا سکے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا پھر مُلک کی سیاسی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ پارٹی اپنے آپ کو کُل قوم کا نمائندہ سمجھتی ہے اور اس کے دشمن بھی یہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر انھیں اس پارٹی سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ کُل قوم سے اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ ایک طرف اتحادی ریاستیں اور دوسری طرف اتحاد و ترقی کے اندرونی دشمن، نوجوان ترکوں کی زیادتیوں کی سزا بے قصور ترکی قوم کو دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ دراصل قصوروار تھے وہ تو

چلے گئے تھے۔ اب صرف وہ لوگ باقی تھے جنھوں نے صرف بعض چیزوں میں جماعت اتحاد و ترقی کا ساتھ دیا تھا اور جن کا وجود ترکی کے لئے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو کبھی نہ کبھی اس جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔

حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔ چونکہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کے برخاست کئے جانے سے کوئی حرج نہیں ہوا۔ مگر سلطان نے نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا۔ اور ملک کی حکومت خود اُس کے اور اُن ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ وہ اپنی مجلسِ وزراء میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بھی رکھتا تھا جن کی قابلیت و حبِ وطن میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مگر جہاں انھوں نے بیرونی حکومتوں کے احکام پر آنکھ بند کر کے عمل کرنے سے انکار کیا وہ فوراً موقوف کر دیئے جاتے تھے۔

ترکی کے حصّے بخرے کرنے کی تجویز

ترکوں کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے سے پہلے اتحادی ترکوں کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مشرقِ ادنیٰ میں ایک یونانی سلطنت قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تھریس۔ سمرنا اور اس کے عقب کا علاقہ شامل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ترکیب سے آبنائے' اتحادیوں کے لئے کھُلا رہے گا اور ترک' بلغاری اور روسی اس کے قریب نہ آنے پائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مشرق میں شمسون سے لے کر بحیرۂ اخضر تک اور بحیرۂ روم سے سلیشیا تک جو بحرِ اسود کے کنارے واقع ہے آرمینیہ کی خود مختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اِس نئی ریاست کے لئے وہ نہ صرف ترکی کا علاقہ بلکہ ایران اور روس کا کچھ حصہ بھی چھیننا چاہتے تھے۔ اِس دوسری تجویز کو عمل میں لانے کی انھیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ترکی آرمینیہ کی مستقل حیثیت کو

پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ نئی تجویز سے اور مشرقی سلطنتوں کے بھڑک جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ کاظم قارا ابکر پندرہ ہزار باقاعدہ ترکی فوج لئے ہوئے موجود تھا اور سرحد پر جو مسلمان قبائل رہتے تھے وہ بھی بڑے جنگجو لوگ تھے۔ اتحادی جہازوں کی توپوں کی زد سے یہ علاقہ باہر تھا۔ البتہ پہلی تجویز یعنی سمرنا کو یونانیوں کے حوالے کر دینا' قابلِ عمل تھی اور اس کے لئے یہ موقع بھی بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ اٹلی جو خود سمرنا کا دعویدار تھا صلح کی کانفرنس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ارنلڈ ٹوائنبی' اتحادیوں کی اس قسم کی حرکتوں کو ایک دوسرے کی جیبیں کترنے سے تعبیر کرتا ہے۔ اتحادیوں نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ نوٹس دیا کہ ہماری فوجیں جہاز سے اتر کر سمرنا میں داخل ہوں گی۔ اس بہانے سے یونانی فوج ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو سمرنا پہنچا دی گئی۔ اس واقعہ نے دم بھر میں کایا پلٹ کر دی۔ ترکوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کرنا روک دیا۔ اور فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آرنلڈ ٹوائنبی جو مورخانہ بے تعصبی اور انصاف پسندی کی وجہ سے نوعِ انسانی کے لئے فخر کا باعث ہے یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے :۔ "۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی جیسے کوہِ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعتہً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونی ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے

یا جلا وطن کر دیئے گئے۔ غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔"

مغربی مسئلہ یونان اور ترکی میں ترکی کی طرف سے جو ردّ عمل ہوا اس کے متعلق یہ بات دنیا کو نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا۔ جن میں کسان، پہاڑی لوگ بلکہ عورتیں تک شامل تھیں۔ استنبول سے فوجی افسر بے اجازت بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا۔ سارے ملک میں احتجاج کے جلسے کئے گئے۔ دو چیزوں نے اس قوتِ جذبات کو کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ ایک تو یہ کہ اوسط طبقے کے ترکوں میں سے ہزارہا آدمی ایسے نکل آئے جنھوں نے نہ صرف اپنی جانوں کو قربان کیا بلکہ تنظیم میں بھی کمال کر دیا۔ دوسرے یہ کہ معدودے چند لیڈر جو انہیں ہاتھ آئے اس مادّی اور اخلاقی قوّت سے کام لینے کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ میں نے یہ حیرت انگیز تاریخی ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس میں حصہ بھی لیا ہے۔ مجھے بڑے سرداروں کی قابلیت اور ان کی خدمات کا دل سے اعتراف ہے مگر میرے نزدیک لڑائی کی جان اور کامیابی کا راز جمہور کا عزم تھا۔ جنھوں نے زندگی سے مایوس ہو کر دل میں سمجھ لیا تھا کہ بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جانے سے بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑ کر مارے جائیں۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم جنگ کے واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

اندرونی قوتیں اور ان کا اتحاد جب لڑائی شروع ہوئی تو اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج ترکی میں موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس مشرق میں کاظم قارا بکر کی پندرہ ہزار باقاعدہ فوج، وسط اناطولیہ میں علی فواد پاشا کی چھوٹی سی جمعیت اور چند اور نیم مسلح دستے تھے جو ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی جو کچھ تھے وہ رضاکار

کے بے قاعدہ جتھے تھے جن کے پاس سامانِ جنگ برائے نام تھا۔

اتحادیوں کو مشرق کی طرف سے زیادہ اندیشہ تھا۔ اس لئے انھوں نے سلطان سے کہہ کر مصطفےٰ کمال پاشا کو وہاں ناظر حربی کی حیثیت سے بھجوایا کہ ترکی فوجوں کو منتشر کر دیں۔ مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے پہلے استنبول میں فوج کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقات اور گفت و شنید کر لی تھی۔

اماسیا کا اقرار نامہ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۹ء کو مصطفےٰ کمال پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا اور رؤف بے نے اماسیا کے مقام پر جمع ہو کر ایک اقرار نامے پر دستخط کئے۔ جسے موجودہ ترکی ریاست کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے:۔ "ملک کی مرکزی حکومت، بیرونی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے۔ ترکی جمہور نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسے غیر ملکوں کے ماتحت رہنا ہرگز منظور نہیں اور وہ ان سے لڑنے کو طیار ہے۔ قوم کی قوت اور جدّ و جہد کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک کانگرس جو تمام قوم کی نمایندہ ہو منعقد کی جائے اور وہ یہ فیصلہ کرے کہ ملک کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

ارضِ رُوم کانگرس ۲۳ر جولائی ۱۹۱۹ء کو پہلی کانگرس مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نمایندہ جماعت منتخب کی جائے جو ضرورت کے وقت اناطولیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ملک کی حفاظت کا سامان کرے۔ اس کانگرس کی ہدایت کے مطابق تمام ترکی فوجیں جو یونانی حملے کی مدافعت کر رہی تھیں اناطولیہ کے مرکز کے ماتحت متحد ہو گئیں اور ایک قومی عہد نامہ طیار کیا جانے لگا جو ساری قوم کے لئے قابلِ قبول ہو۔

سیواس کانگرس ۴ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگرس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اناطولیہ سلطان کی حکومت سے علیحدہ ہو گیا اور اس نے ملکی اور فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ سلطان نے خوف زدہ ہو کر داماد فرید پاشا کی وزارت کو جو اتحادیوں کا آلہ کار سمجھی جاتی تھی معزول کر دیا۔ اور ایک نئی کابینہ مقرر کی جس کے اکثر ارکان قوم پرور پارٹی کے تھے۔ یا اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا بھی حکم دے دیا۔ ملک نے قوم پرور پارٹی کو بہت بڑی تعداد میں منتخب کیا۔ جنوری ۱۹۲۰ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ اس کے لیڈر بالفعل رؤف بے تھے۔ خوش قسمتی سے مصطفےٰ کمال اور دوسرے فوجی سردار اناطولیہ ہی میں رہے۔

پارلیمنٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ قومی معاہدے کو مکمل کر کے شائع کر دیا۔ اس کا مضمون قریب قریب وہی رہا جو پہلی بار ارضِ روم کی کانگریس میں تجویز ہوا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جن پر عارضی صلح کے وقت اتحادیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا وہ ترکی کی حکومت میں رہیں۔ بقیہ علاقے جن پر اس وقت قبضہ کیا گیا تھا (اور جن میں زیادہ تر عربوں کی آبادی تھی) اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں اور اس میں اُن کے باشندوں کو آزادی سے رائے دینے کا حق دیا جائے۔ ترکی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ باسفورس اور دردانیال میں سب قوموں کے تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اس بات کا ذمہ لیں کہ استنبول اور بحیرۂ مارمورہ بیرونی دست اندازی سے محفوظ رہے گا۔ ترکی میں اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمسایہ ملکوں میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہیں۔

ابھی اتحادیوں نے صلح کے شرائط کا جو وہ ترکی کے سامنے پیش کرنے والے تھے عام اعلان نہیں کیا تھا کہ انھیں قومی معاہدے کی اطلاع بھیج دی گئی۔ اب اُن کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ ترکوں کی یہ شرائط جو خود انھوں نے عارضی صلح سے پہلے ترکوں کے سامنے پیش کی تھیں منظور کر لیں اور جنگ ختم کر دیں

یا سینہ زوری سے کام لے کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز پر اڑے رہیں انھوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

۱۶ر مارچ کو اتحادیوں نے وہ معرکے کا حملہ کیا جو دنیا میں مشہور ہو گیا۔ انھوں نے استنبول میں اور فوجیں اتار دیں جو تمام قوم پروروں کے گھروں پر چھاپہ مار کر انھیں اُن کے بستروں سے کھینچ لائیں۔ اس کے بعد وہ پارلیمنٹ پر ٹوٹ پڑیں اور بہت سے قوم پرور ممبر، جن میں رؤف بے بھی شامل تھے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں آدمی جو اتحاد و ترقی کے رکن تھے یا سمجھ لئے گئے تھے، پہلے سے نظر بند تھے۔ اتحادیوں نے مارشل لا جاری کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص کسی قوم پرور کو اپنے گھر میں پناہ دے گا اُسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ عیسائیوں کے جتھے مسلح کر کے اُن سڑکوں پر جو اناطولیہ کو جاتی تھیں متعین کر دیئے گئے کہ قوم پرور بھاگ کر اُس طرف نہ جانے پائیں۔ ترکوں نے بھی فوراً اپنے جتھے بنا لئے اور قوم پروروں کو بھاگنے میں مدد دینے لگے۔ اتحادیوں اور فوجیوں کے قدغن کے باوجود بہت سے لوگ سامانِ جنگ کے ساتھ بچ کر نکل گئے۔

سلطان کی حکومت نے ایک عدالتِ خاص قائم کی۔ جس کی طرف سے اِن قوم پروروں کی جو سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے تھے پہلی فہرست شائع کی گئی۔ اس میں مصطفےٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور ایک عورت کا نام بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان ان لوگوں میں سے کسی شخص کو قتل کرے گا وہ سیدھا مسلمانوں کی جنت میں جائے گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ شیخ الاسلام نے پہلی بار نہ صرف غیر ملکی حکومتوں کا ساتھ دیا بلکہ ظلم و استبداد پر کمر باندھ لی۔

اِس اثنا میں مصطفےٰ کمال پاشا نے جو کچھ دِن پہلے انگورہ پہنچ چکے تھے

یہ اعلان کیا کہ قومی پارلیمنٹ کا اجلاس انگورہ میں ہوگا۔ جمہور کو چاہیے کہ پرانے ممبروں میں سے جو لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکتے یا نہیں ہونا چاہتے اُن کی جگہ دوسرے ممبروں کو منتخب کر کے بھیجیں۔ یہی وہ جماعت تاسیسی تھی جس نے نئی ریاست قائم کی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت جماعت تاسیسی کا اجلاس ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو انگورہ میں ہوا۔ اس نے مُلک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اس کا نام قومی مجلس عالیہ رکھا۔ مشرق میں یہ پہلی جمہوری حکومت تھی جو خود جمہور نے قائم کی۔ مشرق اور مغرب کی کش مکش میں یہ سب سے اچھی مغربی چیز تھی جو مشرق نے اختیار کی۔ تاریخ میں پہلی بار نہایت نازک موقع پر مُلک کی حکومت کا پورا بار اہل اناطولیہ کے کاندھوں پر رکھا گیا۔ جمہور کے نمایندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان لوگوں کا کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان مٹھی بھر شمالی ترکوں کا جنھوں نے تیرھویں صدی میں شمالی سلطنت کی ایسی مضبوط بُنیاد رکھی کہ وہ سات سو سال تک ہلائی نہ ہلی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور انقلاب فرانس کی حکومت میں بہت مشابہت تھی۔ وہ مقننہ اور عاملہ دونوں کے فرائض ساتھ ساتھ انجام دیتی تھی۔ مجلس کا پریسیڈنٹ حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وائس پریسیڈنٹ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی مجلسِ وزرا کا کام کرتی تھی۔ ہر وزیر کا انتخاب مجلس، علیحدہ علیحدہ کرتی تھی۔ اور وہ انفرادی حیثیت سے مجلس کے سامنے جواب دہ تھا۔ اس مجلس کا دستورِ اساسی اس قابل ہے کہ اُس کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی طرزِ حکومت کی مثال، جو حقیقی جمہوریت سے اتنی قریب ہو، مشکل سے ملے گی۔

اپریل سے جون تک اِس حکومت کے لئے سب سے مشکل زمانہ تھا۔ اسے

سارے ملک میں عدالتی اور انتظامی محکمے قائم کرنے تھے۔ اِس کام میں کسی قدر آسانی اِس وجہ سے ہوگئی کہ نوجوان ترکوں نے جو نظم قائم کیا تھا وہ اب تک چل رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی ترتیب میں زیادہ دقت پیش آئی۔ کیونکہ ایسے لوگ جو اس میں حصہ لے سکتے ہوں یا لینا چاہتے ہوں بہت کم تھے۔ مگر سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ وسطِ اناطولیہ کی حفاظت کا دار و مدار بے قاعدہ فوج پر تھا۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس فوج میں بعض لوگ بڑے بلند خیالات کے تھے اور وہی اِس قومی تحریک کے ہراول تھے۔ مگر عام سپاہیوں میں نظم وضبط قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔ اور وہ بعض اوقات اتنی ہی زیادتیاں کر بیٹھتے تھے جتنی یونانیوں کی فوجیں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے اتحادیوں کے روپئے سے غیر ترکی فوجیں بھرتی کی تھیں اور انھیں افواجِ خلافت کے نام سے اناطولیہ میں قوم پروروں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

معاہدۂ سیورے اور بے قاعدہ فوج کا خاتمہ

اِس زمانے میں دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے قومی مجلس عالیہ کی حکومت کی بن آئی۔ اُن میں سے پہلی چیز سیورے کا معاہدہ تھا جس پر دستخط کر کے سلطان کی حکومت نے ترکی قوم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اِس معاہدے کی شرطیں ترکی کے متعلق یہ تھیں کہ سمرنا اور اُس کا عقبی علاقہ اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو دے دیا جائے، مشرق سے لے کر جنوب میں سلیشیا تک جس میں کردوں کا علاقہ شامل تھا آرمینیہ کی ریاست قائم کر دی جائے، بندرگاہیں اتحادیوں کے سپرد کر دی جائیں؛ دردانیال استنبول اور بحیرۂ مارمورہ کے مشرقی اور مغربی ساحل اتحادیوں کے انتظام میں رہیں۔ ترکی کی مالیات بھی اُن کی نگرانی میں دے دی جائے۔ قدیم تجارتی اور عدالتی حقوق صرف فاتح قوموں کے لئے بحال کر دئے جائیں۔ ترکی کو ہوائی یا جنگی جہاز رکھنے کی اجازت

نہ ہو بلکہ صرف پندرہ ہزار بری فوج جس میں فوجی پولیس شامل ہے باقی رہنے دی جائے، اناطولیہ کا بے آب وگیاہ علاقہ جو ترکوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ بھی مغربی ریاستوں کے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے۔

سلطان کا معاہدۂ سیورے پر دستخط کرنا اور پھر غیر ملکی فوجوں کے ساتھ افواجِ خلافت کو ترکی قوم کا خون بہانے کے لئے بھیجنا ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ سلطنت اور خلافت دونوں کے نام سے بیزار ہو گئے۔

اِدھر نئی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج ترتیب دی اور بے قاعدہ جمعیتوں کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ بعض جمعیتوں نے سرکشی اختیار کی اور وہ بھی عین اُس وقت جب یونانیوں کی طرف سے شدت کا حملہ ہو رہا تھا۔ مگر نئی حکومت کی چھوٹی سی فوج نے اِنُونُو کے مقام پر ایک طرف یونانی فوج کو اور دوسری طرف ترکوں کی باغی فوج کو شکست دی۔ اِس فتح سے ترکی قوم کے حوصلے بڑھ گئے اور اسے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا۔ اَب لوگ دل و جان سے نئی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔

اِس زمانے میں لندن میں جو کانفرنسیں اناطولیہ کے مسئلے کے متعلق ہوئیں اُن کا ذکر میں چھوڑتی ہوں۔ یہ اُسی وقت کی جاتی تھیں جب ترکوں کی فتح ہوتی تھی۔ اُن کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانی فوج کو سنبھلنے کی مہلت مِل جائے۔

معرکۂ سقاریہ | ترکوں اور یونانیوں کی فیصلہ کن لڑائی سقاریہ کے مقام پر ہوئی۔ یونانیوں نے اَسکی شہر میں ترکوں کو شکست دینے کے بعد تمام ریلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور انگورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ترکوں کے لئے نازک وقت تھا مگر اُن کی قوم اور قومی مجلس اس امتحان میں پوری اُتری۔

مصطفےٰ کمال پاشا سپہ سالارِ اعظم بنائے گئے اور اُنھیں غیر معمولی اختیارات

دیئے گئے۔ عصمت پاشا محاذِ جنگ کے سپہ سالار، فیضی پاشا اُن کے نائب اور رفعت پاشا وزیرِ جنگ ہوئے۔

ترکوں کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ انھیں مشرق سے سپاہی اور سامانِ جنگ محاذ پر پہنچانا تھا۔ موسم انتہا سے زیادہ خراب تھا۔ راہ میں صحرا اور پہاڑ حائل تھے۔ بار برداری کا ذریعہ اونٹوں، بیل گاڑیوں اور انسانوں کے کندھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو چار سو میل سے زیادہ کی سنگلاخ اور دشوار گذار راہ پیدل طے کرنی پڑی۔ اسلحہ سازی کے عارضی کارخانے قائم ہوگئے۔ اور ریلوں کی بچی کھچی پٹریاں اُکھاڑ کر ہتھیار ڈھالے جانے لگے۔

یونانیوں کے پاس اسّی ہزار تربیت یافتہ فوج، اعلیٰ درجے کا توپ خانہ جس میں دو سو توپیں تھیں، سامانِ جنگ بہ افراط، ریلیں۔ لاریاں اور مغربی ترکی کی عمدہ سڑکیں، ترکوں کی کُل کائنات پچیس ہزار فوج جس کے پاس کچھ نئی کچھ پرانی، کچھ ماؤزر، کچھ مارٹینی بندوقیں، کُل چھ توپیں، بہت تھوڑا سامانِ جنگ اور باقی خدا کا نام۔

ترکوں نے جو شجاعت میدانِ جنگ میں دکھائی زبان میں طاقت نہیں کہ اُسے بیان کر سکے۔ تیئس دن کی لڑائی میں ساڑھے سولہ ہزار ترک کام آئے۔ جن میں افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ترک حملہ کرتے تھے اپنی گنی چنی چھ توپوں کے سہارے پر۔ یونانیوں کا پشت پناہ زبردست توپ خانہ تھا۔ مگر کیا مجال کہ ایک ترک سپاہی بھی میدانِ جنگ سے منہ موڑے۔ کاظم قارابکر پاشا نے میدانِ جنگ سے جو تار مصطفیٰ کمال پاشا کو بھیجا تھا اُس سے ترکی قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ "جب تک پہاڑی کی کسی چوٹی پر ایک ترک سپاہی بھی باقی رہے گا، مقابلہ جاری رہے گا۔" مصطفیٰ کمال پاشا نے اُن دِنوں ایک تقریر کی تھی جس کے چند دلآویز فقرے میں آپ کو سُناتی ہوں:۔

" قومی مجلس کے صدر کی حیثیت سے میں آپ حضرات کے سامنے یہ اعلان

کرتا ہوں کہ ہمارا مقصود جنگ نہیں ہے۔ ہم صلح کے طالب ہیں۔ میرے خیال میں کوئی چیز ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر یونانی فوج یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق چھوڑ دیں گے تو یہ محض اُس کی خام خیالی ہے۔ دشمن ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لئے تلوار اُٹھائی ہے۔ اِس سے بڑھکر اور معقول بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ ہم یونانی فوج کو ڈھکیلتے چلے جائیں گے یہانتک کہ اُس کا ایک سپاہی بھی ہماری زمین پر باقی نہ رہے۔"

ترکوں کو سقاریہ میں فتح حاصل ہوئی۔ کلیئر پرائس نے اپنی کتاب "ترکی کی دوبارہ زندگی" میں اِس فتح کی پوری اہمیت ذیل کے الفاظ میں دِکھائی ہے:۔

"ترکوں کو دریائے سقاریہ کے کنارے جو فتح حاصل ہوئی اُس نے مشرقِ ادنیٰ اور مشرقِ وسطیٰ کا سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ دو سو سال سے مغرب قدیم عثمانی سلطنت کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ مگر سقاریہ کے کنارے اس کا سامنا خود ترکی قوم سے ہوا۔ اِس چٹان سے ٹکرانا تھا کہ دھارے کا رُخ پلٹ گیا۔ مورخوں پر ایک دِن یہ حقیقت کُھل جائے گی کہ سقاریہ کی یہ چھوٹی سی لڑائی ہمارے زمانے کا سب سے زبردست فیصلہ کن معرکہ تھا۔

اِس فتح کی بدولت نئی حکومت کے قدم جم گئے۔ یونانی فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور اتحادیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ فرانس نے صلح کر لی، قومی مجلس عالیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور سلیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ اٹلی نے عدالیہ کو خالی کر دیا۔ سوویٹ روس نے ۱۹۲۰ء میں انگورہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اِس سے ہمیں بہت بڑی مادی اور اخلاقی مدد مِلی کہ لڑائی کے زمانے میں جب ہمیں اپنی ساری قوت مغربی سرحد پر مجتمع کرنی تھی ہم مشرقی سرحد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ایک بڑی وجہ کامیابی کی یہ بھی تھی کہ کاظم قارابکر پاشا نے آرمینیہ کی لڑائی میں اردھان اور قرص لے کر صلح کر لی تھی۔ اِس لئے سقاریہ کی جنگ میں ترکی کو مشرق سے فوجیں اور سامانِ جنگ برابر پہنچتا رہا۔

اِس نازک زمانے میں ہندوستان نے بھی ترکوں سے بڑی ہمدردی کی۔ اور انھیں بہت مدد دی۔ میں اِس معرکے کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے آپ لوگوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی ہوں اور دِلی مسرت کے ساتھ یہ الفاظ کہتی ہوں "بھائیو اور بہنو! میرا شکریہ قبول کیجئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے"!

آخری فتح جنگ سقاریہ کے سال بھر بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوج نے مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں جارحانہ اقدام شروع کیا اور سمرنا کو فتح کرنے سے پہلے اپنا سارا مُلک یونانی فوجوں سے خالی کرالیا۔ مغربی ریاستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوزان میں صلح کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ دنیا نے مان لیا کہ ترکی قوم لڑائی کی آگ میں تپ کر، تلوار کی باڑھ پر چل کر اپنے امتحان میں پوری اُتری۔

لوزان کانفرنس مغربی ریاستوں نے استنبول کی حکومت اور قومی مجلس عالیہ کی حکومت دونوں کو کانفرنس میں مدعو کیا۔ لوزان جانے سے پہلے اِس دوعملی کی گتھی کو سُلجھانا ضروری تھا مجلسِ عالیہ نے ایک طویل اور معرکۃ الآرا اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے منصب الگ الگ کردئیے جائیں۔ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور سُلطان منصبِ حکومت سے معزول کردیا گیا۔ استنبول نئی حکومت کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ (نومبر ۱۹۲۲ء) سلطان وحید الدین نے اتحادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ اور مجلس نے عبدالمجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء میں شروع اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہوگئی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور اتحادیوں کے درمیان جو صلح نامہ ہوا اُس میں ترکوں کے قومی معاہدے کی تمام دفعات تسلیم کرلی گئیں

خواتین اور حضرات!

آپ سب لوگ اور ساری دُنیا بجا طور پر اِن مشاہیر کی قدر کرتی ہے جنھوں نے ترکوں کو اِس جنگ میں کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ مگر آپ کو کیا معلوم، دنیا کیا جانے کہ

اُن ہزاروں گمنام عورتوں اور مردوں نے جو اِس لڑائی میں کام آئے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ میری التجا ہے کہ جب آپ مسجدوں اور مندروں میں جا کر دُعا مانگیں تو اِن لوگوں کو نہ بھولیں۔ شہیدوں کی یہ جماعت، مرد، عورت۔ بوڑھے، جوان، بچے، جنھوں نے اِس کوشش میں جان دی کہ اُن کی قوم امن اور عزت کے ساتھ دنیا میں رہ سکے اِس قابل ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں قیامت تک اُن کے لیئے دُعا کرتی رہیں ؎



مطلعِ اسلام

(ماخوذ از "زوالِ روما" مصنفہ ایڈورڈ گبن)

ٹھیک اُس وقت جب رُومی حکومت، فارس والوں کی جنگ سے تھک کر چور ہو گئی تھی اور کلیسا نسطوریوں اور منوفسیوں کی وجہ سے پریشان تھا، حضرت محمدؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لئے ہوئے روم اور نصرانیت کے کھنڈروں پر اپنا تخت بچھا رہے تھے۔ رسولِ عربی کی قابلیت اور ذہانت، ان کی قوم کے اخلاق و عادات، اور اُن کے مذہب کے جوش و ولولے میں روم کی مشرقی حکومت کے زوال کے اسباب مضمر ہیں۔ اب ہماری آنکھیں حیرت کے ساتھ اس سب سے زیادہ یادگار انقلاب پر گڑی ہوئی ہیں جس نے کرۂ ارض کی قوموں پر ایک بالکل نرالا اور دیرپا نقش چھوڑا ہے۔

مُلکِ عرب کا حال

فارس، شام، مصر اور حبشہ کے درمیان جو خالی جگہ ہے اس میں جزیرہ نمائے عرب ایک وسیع مگر بے قاعدہ مثلث کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ شمالی کونے (بالیس) سے لے کر جو دریائے فرات پر واقع ہے خلیج باب الہند تک جہاں لوبان پیدا ہوتا ہے پندرہ سو میل کا فاصلہ ہے۔ مشرق سے مغرب تک یعنی بصرہ سے سویز تک اور خلیج فارس سے بحیرۂ احمر تک درمیانی چوڑائی اس کی نصف[1] (۲۵۰ میل) سمجھ لیجئے۔ مثلث کے ضلعے تدریجاً بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جنوبی ضلع بحر ہند پر ایک ہزار میل کا محاذ بناتا ہے۔

زمین اور آب و ہوا

جزیرہ نما کا پورا رقبہ جرمنی یا فرانس سے چوگنا ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصے پر جائز طور سے ریگستانی یا کوہستانی علاقہ ہونے کا

---

[1] یہ پیمائش صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ چوڑائی ۹۰۰ میل ہے۔ جنوبی ضلع ۱۲۰۰ میل ہے۔ ۱۲

الزام عائد ہوتا ہے۔

گئے گذرے صحرائے تاتار کو بھی قدرت نے تناور درختوں اور ہری بھری جڑی بوٹیوں سے آراستہ کردیا ہے۔ کوئی راہ رو جو اُدھر جا نکلے اِن سبز قامتوں کی موجودگی سے آرام پاتا ہے اور تنہائی محسوس ہیں کرتا لیکن عرب کا سنسان لق و دق صحرا تو ریت کا ایک ناپیداکنار ہموار میدان ہے۔ جس کو کہیں کہیں نوکیلے عریاں پہاڑ کاٹتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ نہ کہیں سایہ ہے نہ جائے پناہ۔ صفحۂ ریگستان برجِ سرطان کے آفتاب کی تیز اور سیدھی شعاعوں سے جھلستا رہتا ہے۔

خوشگوار ہواؤں کے بدلے آندھیاں چلتی ہیں۔ بالخصوص جنوب و مغرب سے چلنے والی آندھی جو زہریلے کیا بلکہ مہلک بخارات پھیلاتی ہے۔ خاک کے تودے جو اِن ہواؤں کے چلنے سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں سمندر کی اونچی اونچی لہروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کارواں کے کارواں، لشکر کے لشکر اِس طوفانِ گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ پانی جیسی عام فائدے کی چیز بھی اِس قدر کمیاب کہ اُس پر وہاں لوگ جان دیتے اور اکثر لڑ مرتے ہیں۔ لکڑی کی اِس قدر قلت ہے کہ آگ جیسے معمولی عنصر کو محفوظ رکھنے اور ایک سے دوسرے کو پہنچانے کے لئے بھی بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔

جہازرانی کے قابل دریا جو ایک طرف تو زمین کو زرخیز بناتے ہیں اور دوسری طرف ملکی پیداوار کو قریبی ملکوں تک لے جاتے ہیں عرب میں ناپید ہیں۔ چشمے (ندی نالے) جو پہاڑیوں سے بہ کر آتے ہیں۔ پیاسی زمین جذب کر لیتی ہے۔ کمیاب اور سخت تنے والے پودے مثلاً املی، ببول وغیرہ جن کی جڑیں چٹانوں میں سے پھوٹ نکلتی ہیں۔ شبنم کے سہارے پھلتے پھولتے ہیں۔ بارش کے پانی کا تھوڑا سا ذخیرہ حوضوں اور تالابوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ یہ ہے کنوئیں اور چشمے تو وہ تو ریگستان کے پوشیدہ خزانے ہیں۔

خشک اور گرم میدانوں کے طویل سفر کے بعد جب حاجی لوگ وہ پانی پیتے ہیں جو

گندھک آمیز یا شور زمین پر بہ کر آیا ہے تو اُن کی طبیعت بہت مکدر ہوتی ہے۔
یہ عرب کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

تکلیف اٹھانے کے بعد اگر کسی مقام پر معمولی سا آرام بھی مِل جائے تو اُس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سایہ دار کنج۔ ہری بھری چراگاہ یا تازہ پانی کا ایک چشمہ اقامت گزین عربوں کی نوآبادی کو اِس مبارک مقام کی طرف کھینچنے کے لئے کافی ہے جہاں اُن کو اور اُن کے مولیشیوں کو کھانا اور آرام مِل سکے اور اُن کی کھجوروں اور انگوروں کی زراعت سرسبز ہو سکے۔

وہ سطح مرتفع جو بحرِ ہند کے ساحل کے قریب ہے پانی اور لکڑی کی افراط کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ وہاں ہوا نسبتاً معتدل ہے۔ پھل آس پاس کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت لذیذ ہوتے ہیں۔ حیوانات اور انسان بھی وہاں زیادہ ہیں۔ زمین کی زرخیزی دیکھ کر کسان محنت پر آمادہ ہوتا ہے اور خاطر خواہ منافع حاصل کرتا ہے۔ اِس سرزمین کا مخصوص تحفہ بخورات اور قہوہ ہیں جن کی کشش ہر زمانے میں تاجروں کو یہاں لاتی رہی۔ اگر اِس خطے کا بقیہ جزیرہ نما سے مقابلہ کریں تو بے شک یہ الگ تھلگ قطعہ زمین اس کا پورے طور پر مستحق ہے کہ اس کو شاداب کے خطاب سے یاد کیا جائے۔ اِس مُلک کے متعلق تخیّل اور فسانے کی یہ شاندار رنگ آمیزی جو تم دیکھتے ہو تضاد نے تجویز کی ہے اور فاصلہ و مسافت نے اِس کی شکل و صورت بنادی ہے۔

اِس فردوسِ ارضی ہی کے لئے قدرت نے اپنے منتخب عطیے اور حیرت انگیز صنائع محفوظ رکھے تھے۔ تعیش فراوانی اور سادگی کی گوناگون برکتیں یہاں کے رہنے والوں کی قسمت میں لکھی گئیں۔ زمین سونے اور جواہرات سے مالا مال تھی۔ اور بحر و بر دونوں کو خوشبو دار لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی عادت ڈالی گئی تھی۔

عرب کے طبعی حصے

عرب کی تقسیم، ریگستانی، کوہستانی اور شاداب علاقوں میں یونانیوں اور رومیوں میں تو عام ہے۔ لیکن خود عرب اِس

تقسیم سے نابلد ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی مُلک جو زبان اور باشندوں کے لحاظ سے ہمیشہ ایک رہا ہو اپنے قدیم جغرافیہ کی شکل کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ عرب کے ساحلی علاقے بحرین اور عمان، فارس کی حکومت کے مقابل ہیں۔ یمن کا علاقہ شاداب عرب کی حدود یا کم از کم محلِ وقوع کو ظاہر کرتا ہے۔ نجد نام کا خِطّہ اندرونی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ کی ولادت کے شرف نے حجاز کے خطّے کو جو بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع ہے مشہور و معروف کر دیا ہے۔

بدوؤں کے اخلاق و عادات

مردم شماری کا دارومدار گذر اوقات کے سامان کی قلت یا کثرت پر ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ایک چھوٹے سے زرخیز اور صنعتی صوبے کی آبادی اُس وسیع جزیرہ نما کی آبادی سے زیادہ ہو (ابتدائی عہد میں) خلیج فارس، بحر ہند اور بحر احمر کے ساحل پر وحشی لوگ جن کا گذارہ مچھلی پر تھا اپنی خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اِس ابتدائی اور بے سروسامانی کی حالت میں جس کو سماج کہنا سماج کا نام بدنام کرنا ہے۔ اِس بن مانس کو جو نہ صنعت و حرفت سے آگاہ تھا نہ قانون سے واقف۔ جو سمجھ سے عاری اور زبان سے ناآشنا تھا، حیوان مطلق کے گروہ سے علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اِس خاموش تغافل کی حالت میں نسلیں اور مدتیں گذرگئی ہونگی اور اِن رکاوٹوں، حوائج اور مشاغل کی وجہ سے جو اس بے بس وحشی انسان کو تنگنائی ساحلِ بحر میں روکے ہوئے تھے وہ اپنی نسل بڑھانے سے معذور رہا ہوگا۔

لیکن اِس قدیم زمانے کے ابتدائی حصّے ہی میں عربوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنے آپ کو اِس مصیبت کی حالت سے نکال لیا تھا۔ چونکہ کف دست صحرا، شکاری لوگوں کی پرورش نہیں کرسکتا تھا اِس لئے انھوں نے یک لخت ترقی کر کے چرواہوں کی زندگی اختیار کرلی۔ جس میں شکاری کی زندگی سے زیادہ محفوظ اور منفعت بخش سیر حاصل ہے۔

ریگستان کی خانہ بدوش قوموں کا طرزِ زندگی اُس زمانہ سے لے کر اب تک یکساں

چلا آتا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے بدوؤں کی شکل وصورت میں ہم اُن کے اُن آباد و اجداد کے خد و خال کا پتہ لگا سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ یا حضرت رسول خدا کے عہد میں بالکل ایسے ہی خیموں میں رہتے تھے اور اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کو انہی چشموں یا چراگاہوں کی طرف ہنکاتے تھے۔

مفید جانوروں کے قابو میں آجانے سے ہماری محنت کم اور دولت زیادہ ہوجاتی ہے۔ عرب چرواہوں کو بھی ایک وفادار دوست (گھوڑا) اور ایک محنتی نوکر (اونٹ) ہاتھ آگیا تھا۔ علمائے طبیعیات کے قول کے مطابق عرب، گھوڑوں کا اصلی وطن ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اس شریف الطبع جانور کے قد و قامت کے لئے نہ سہی مگر تیزی اور پھُرتی کے لئے بہت سازگار ہے۔ بارب اسپینی اور انگریزی نسل کے گھوڑوں کی خوبی عربی خون کی آمیزش ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

بدو لوگ اس احتیاط کے ساتھ جو توہم کی حد تک پہنچ گئی ہے اپنے خالص نسل کے گھوڑوں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھتے ہیں۔ نر بہت گراں قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں اور مادہ کو تو شاید ہی کبھی جدا کیا جاتا ہو۔ کسی اچھی نسل کے بچھڑے کے پیدا ہونے کو عربی قبائل میں نیک فال سمجھا جاتا تھا۔ اور (اس موقع پر) ایکدوسرے کو مبارکباد دی جاتی تھی۔ گھوڑوں کو عرب اپنے اُن خیموں میں جہاں بال بچے رہتے ہیں اُنس و محبت کے ساتھ سدھاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میں شرافت اور خاندان کے ساتھ الفت کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔ وہ صرف قدم چلنے اور سرپٹ دوڑنے کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ مہمیز اور چابک کے لگاتار غلط استعمال سے اُن کے احساسات کو کند نہیں کیا جاتا۔ اُن کی قوتوں کو بھاگنے اور تعاقب کرنے کے مواقع کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ ہاتھ کی تھپکی یا رکاب کا اشارہ پاتے ہیں تو ہوا کی طرح اُڑنے لگتے ہیں۔ اور اگر اُن کا سوار اُن کی رفتار کی تیزی کی وجہ سے زین سے جُدا ہوجائے تو فوراً رُک جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ پھر اپنی نشست جمالے۔

افریقہ اور عرب کے ریگستان میں اونٹ ایک مقدس اور بیش بہا چیز ہے۔ یہ مضبوط اور صابر بار بردار بغیر کھائے پئے کئی کئی دن تک سفر کرسکتا ہے۔ تازہ پانی کا ذخیرہ ایک بڑی تھیلی میں محفوظ رہتا ہے جو حقیقت میں اس جانور کا جس کے جسم پر محنت ومشقت اور غلامی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں پانچواں پیٹ ہے۔ بڑی نسل کے اونٹ ہزار پونڈ تک بوجھ لے جاسکتے ہیں۔ اور ناقہ جو ہلکا پھلکا اور پھرتیلے بدن کا ہوتا ہے۔ دوڑ میں تیز سے تیز گھوڑی کو مات کرسکتا ہے۔

مُردہ یا زندہ اونٹ کے جسم کا ہر حصہ انسان کے لئے کار آمد ہے۔ اس کا دودھ بکثرت ہوتا ہے اور اُس میں غذائیت ہوتی ہے۔ نوعمر اونٹ کا نرم گوشت بچھڑے کے گوشت کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے پیشاب سے ایک قسم کا قیمتی نمک نکالا جاتا ہے۔ اس کی مینگنیاں، ایندھن کی قلت کو دور کرتی ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بالوں سے جو ہر سال گر کر نئے پیدا ہوتے ہیں بدؤں کے کپڑے، فرش فروش اور خیمے بُنے جاتے ہیں۔

برسات کے موسم میں وہ ریگستان کی کمیاب اور ناکافی گھاس پھوس پر گذارہ کرتے ہیں۔ موسم گرما کی شدت اور سرما کے قحط کے زمانے میں وہ اپنے ڈیرے خیمے ساحل کی طرف یمن کی پہاڑیوں میں یا فرات کے آس پاس لے جاتے ہیں۔ اکثر انھوں نے دریائے نیل کے ساحل یا شام وفلسطین کے دیہات پر پڑنے کا خطرناک اقدام بھی کیا ہے۔

خانہ بدوش عرب کی زندگی خطرہ اور مصیبت کی زندگی ہے۔ اور گو بعض اوقات وہ لوٹ یا تبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کارگیری کا ثمر حاصل کرلے مگر یورپ کا ایک معمولی شہری عرب کے اُس صاحب انتخار امیر سے جو میدانِ جنگ میں ۱۰ ہزار سواروں کی کمان کرتا ہی زیادہ دولت وعیش کا مالک ہے۔

عرب کے شہر | لیکن پھر بھی عربی قبائل اور سِتھیا قوم کے وحشی گروہوں میں ایک خاص

فرق پایا جاتا ہے. کیونکہ عربوں میں سے بہت سے لوگ شہروں میں رہتے تھے اور تجارت و زراعت میں مشغول تھے. اِن شہری عربوں کے وقت اور صنعت کا ایک حصّہ اپنے مویشیوں کے انتظام کی نذر بھی ہوتا تھا۔ وہ صُلح اور جنگ میں اپنے بدوی بھائیوں سے مِلتے جُلتے تھے اور بدوی ان لوگوں کے تعلقات کی وجہ سے اپنی ضروریات کے سامان اور صنعت و حرفت اور علم کی شُد بُد حاصل کرتے تھے.

عرب کے بیالیس شہروں میں سے جن کے نام ابو الفدا نے گنائے ہیں سب سے پرانے اور سب سے زیادہ آباد شہر، عرب کے زرخیز خطّہ یمن میں واقع تھے. صنعا کی مینار یں اور مارب کے حیرت انگیز حوض حمیری بادشاہوں کے بنوائے ہوئے تھے. لیکن اُن کے دُنیاوی جاہ و جلال پر مدینہ و مکہ کی پیغمبرانہ عظمت کی وجہ سے پردہ پڑ گیا۔

مکّہ مکّہ و مدینہ، یہ دونوں شہر بحرِ احمر کے کنارے ایکدوسرے سے ۲۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ موخر الذکر مقدّس شہر، یونانیوں میں مکرّبا کے نام سے مشہور تھا اس کے آخری حرف (با) سے اِس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ جو درحقیقت اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کیا بلحاظ طول و عرض اور کیا بلحاظ مردم شماری مارسیلز سے نہیں بڑھا۔ کِسی پوشیدہ مقصد نے، شاید توہم پرستی نے اِس شہر کے بانیوں کو اِس بنجر زمین کے انتخاب پر آمادہ کیا ہوگا۔

تین خشک پہاڑوں کے دامن میں دو میل لمبے اور ایک میل چوڑے میدان میں انھوں نے اپنے مٹی اور پتھر کے مکانات کھڑے کر دیئے. زمین پتھریلی ہے. زمزم کے مقدس کنوئیں تک کا پانی کڑوا اور کسیلا ہے. چراگاہیں شہر سے فاصلہ پر ہیں۔ انگور تقریباً ستّر میل دور طائف کے باغوں سے یہاں لائے جاتے ہیں۔

مکّہ کے حاکم قبیلہ قریش کا جوش و خروش اور اُن کی شہرت عربی قبائل میں نمایاں تھی. لیکن اُن کی بنجر زمین زراعت کے موافق نہ تھی. اِس لئے اُن کی حالت تجارتی جدّ و جہد کے لئے

سازگار تھی۔ جدّہ کی بندرگاہ کی وجہ سے جو صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے وہ ابی سینیا کے ساتھ آسانی سے تعلقات رکھتے تھے۔ یہی عیسائی حکومت تھی جس نے پہلے پہل حضرت نبی کریمؐ کے اصحاب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ افریقہ کی دولت جزیرہ نما کے اس طرف جرہہ یعنی قطیف تک جاتی تھی جو بحرین کے صوبہ میں ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے لئے مشہور ہے کہ کلدانیہ کے نکالے ہوئے لوگوں نے شور چٹان سے بنایا تھا۔ وہاں سے یہ سامانِ خلیج فارس کے موتیوں کے ساتھ بیڑوں پر فرات کے دہانہ تک پہنچایا جاتا تھا۔

مکہ :- دائیں طرف یمن اور بائیں طرف شام، اِن دونوں کے بیچ میں مکہ تقریباً مساوی فاصلہ پر یعنی ایک مہینہ کی راہ پر واقع ہے۔ اوّل الذکر مکہ کے (تجارتی) کاروانوں کا سرمائی مستقر اور آخر الذکر گرمائی مستقر تھا۔ اِن کاروانوں کی وقت پر آمد ہندوستان کے جہازوں کو بحرِ احمر کے تکلیف دہ سفر کی زحمت سے بچا لیتی تھی۔ صنعاؔ اور ماربؔ کی منڈیوں میں، عمان اور عدن کی بندرگاہوں پر قریش کے اونٹ خوشبودار مصالحوں کے قیمتی سامانِ تجارت سے لادے جاتے تھے۔ اور بصریٰ اور دمشق کے بازاروں سے غلّہ اور مصنوعات خریدا جاتا تھا۔ اس منفعت بخش تبادلہ اجناس کی بدولت مکّہ کی گلیوں میں دولت اور افراط بکھری بکھری پھرتی تھی۔ اور وہاں کے شریف زادے فنونِ جنگ کے شغف کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی اپنا مشغلہ بناتے تھے۔

عربوں کی فوجی آزادی

عربوں کی ازلی آزادی کی اپنے اور پرائے سب قصیدہ خوانی کرتے چلے آئے ہیں اور فنِ مناظرہ کی بدولت تو یہ عجیب واقعہ اسمٰعیل کی اولاد کے حق میں ایک پیشنگوئی اور معجزہ بن گیا ہے۔ بعض مستثنیات جن کو نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ چھپایا جا سکتا ہے، اِس قسم کے طرزِ استدلال کو فضول اور لایعنی بنا دیتے ہیں ولایتِ یمن یکے بعد دیگرے حبشیوں، ایرانیوں، مصری سلاطین اور ترکوں کے ماتحت رہتی چلی آئی ہے؛

حرمین شریفین تو کئی بار ایک سے تیمین ظالم کے سامنے جُھک چکے ہیں۔ عرب کے رومی صوبے میں تو (خصوصیت سے) وہ مخصوص صحرا شامل تھا جس میں اسمٰعیل اور اُن کے فرزندوں نے اپنے بھائیوں کے مقابل خیمے لگائے ہوں گے۔

خیر یہ مستثنیاتِ عارضی یا مقامی حیثیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے عرب بڑے سے بڑے شہنشاہ سے بھی مغلوب نہیں ہوئے۔ سیساطرس ہو یا سائرس۔ پوٓپی ہو یا طریجان کوئی بھی عربوں پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ ترکوں کا موجودہ بادشاہ ایک موہوم اقتدار رکھتا ہو تو رکھتا ہو مگر اُس کا سارا فخر صرف اِس بات تک محدود ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی دوستی کا خواہاں ہے جس کو اشتعال دلانا خطرناک ہے اور جس پر حملہ کرنا بے سود ہے۔

ان کی آزادی کے اسباب نمایاں ہیں اور اُن کے کردار اور اُن کے مُلک کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ ظاہری اسباب اُن کے اور اُن کے مُلک کے حالات میں مضمر ہیں۔ حضرت رسولِ خدا سے صدیوں پہلے جارحانہ اور مُدافعانہ جنگوں کے دَوران میں اُن کی ہیبتناک شجاعت کا سِکّہ اُن کے ہمسایوں کے دِلوں پر جم چکا تھا۔ صبر و استقلال اور پھرتی کی سپاہیانہ صفتیں شبانی زندگی کی منضبط عادتوں کی بدولت غیر محسوس طور پر نشوونما پاتی ہیں۔

بھیڑوں اور اونٹوں کی نگہداشت کا کام قبیلے کی عورتوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جنگجو نوجوان گھوڑے پر سوار اپنے امیر کے عَلم کے زیر سایہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں حاضر رہتا ہے اور کمان۔ نیزہ اور خنجر کے استعمال کی مشق بڑھاتا رہتا ہے۔ اُن کی حریت اور آزادی کی طویل یاد اِس اَمر کی ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ اور آنے والی نسلیں اپنے آپ کو خلفِ صالح ثابت کرنے کے لئے بے چین اور اپنی اِس موروثی خصوصیت کو قائم رکھنے کے لئے جوش و خروش کے ساتھ آمادہ رہتی ہیں۔ مشترک دشمنی کے حملے کے وقت اُن کی خانہ جنگیاں ملتوی ہو جاتی ہیں چنانچہ ترکوں سے ان کی پچھلی جنگ میں کّتے کا کارواں اسّی ہزار اتحادیوں نے لوٹ لیا تھا۔

جب وہ لڑائی کے لئے بڑھتے ہیں تو فتح وظفر کی امید اُن کی نظروں کے سامنے اور بھاگ کر صاف نکل جانے کا یقین اُن کے عقب میں ہوتا ہے۔

ان کے گھوڑے اور اونٹ جو آٹھ دس دن میں پانچ پانچ سو میل کے دھاوے مارتے ہیں فاتح کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ریگستان کے پوشیدہ چشمے اس کی تلاش و جستجو سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک ایسے اوجھل دشمن کے تعاقب میں جو اُس کی کوششوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور مرنے میں ریگستان کے بیچ میں کسی تپتے ہوئے گوشے میں آرام لیتا ہے اس کا ظفریاب لشکر بھوک پیاس اور تکان سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔

بدوؤں کے ہتھیار اور اُن کا ریگستان صرف انھی کی آزادی کا ضامن نہیں بلکہ یہ شاداب عرب کے لئے بھی روک ہیں، جہاں کے باشندے لڑائی سے الگ تھلگ رہنے اور زمین اور آب وہوا کی دی ہوئی نعمتوں کی افراط کی بدولت بزدل ہو گئے ہیں۔

اغسطس[1] (نے جب حملہ کیا ہے تو اُس) کا لشکر بیماری اور تکان کے مارے تتر بتر ہو گیا تھا اور یہ صرف بحری قوت ہی ہے جس کی بدولت کبھی کبھی یمن کو کامیابی کے ساتھ زیر کیا جا سکا ہے۔

جب نبی کریم علیہ وآلہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنا مقدس عَلَم بلند فرمایا تو یہ خطہ حکومتِ فارس کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن پھر بھی سات حمیری شہزادے پہاڑوں میں حکمرانی کرتے تھے اور کسریٰ کے نائب السلطنت کو اپنے دور دراز ملک اور بدقسمت آقا کو بھول جانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جسٹینین کے عہد کے مورخین نے آزاد عربوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جن کو مشرق کی طویل جنگوں کے زمانہ میں تعلق یا مفاد نے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قبیلہ غسان کو شامی علاقہ میں آباد ہونے دیا گیا۔

---

[1] ۲۵ سنہ ق۔م۔ میں جب اغسطس روم کا قیصر تھا تو اُس کے حکم سے ایلیس گیلس حاکم مصر نے عرب پر حملہ کیا۔ پلینی جو قدیم زمانہ کا مشہور ... مورخ ہے لکھتا ہے کہ اُس نے مدینہ کے قریب لنگر انداز کیا اور ایک ہزار میل تک دھاوا مارا۔ مگر بے سود۔ فوج گرم آب و ہوا کی تاب نہ لا سکی اور بیمار پڑ گئی۔

حیرہ کے شہزادوں کو بابل کے کھنڈروں سے تقریباً چار میل جنوب کی طرف ایک شہر بنانے کی اجازت دے دی گئی میدانِ جنگ میں تو یہ لوگ پھرتی اور ہمت سے کام کرتے تھے۔ مگر ان کی دوستی بے بقا، وفاداری ناپائدار اور دشمنی مستعجل تھی۔ اِن خانہ بدوش وحشیوں کو مشتغل کر دینا سہل مگر ان سے ہتھیار رکھوا دینا مشکل تھا۔

جنگ کے دوران میں ملنے جلنے کی وجہ سے انھوں نے روم اور فارس دونوں کی سلطنت کی کمزوری کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

یونانیوں اور رومیوں نے مکّہ سے لے کر فرات تک رہنے والے تمام عربی قبائل کو "سیراسنس" کا مبہم لقب دے رکھا تھا یہ وہ لقب ہے جو عیسائی کی زبان پر خوف اور نفرت کے ساتھ آتا ہے۔

عربوں کی خانگی آزادی اور سیرت خانگی استبداد کے بندے خواہ مخواہ اپنی قومی حریت کی شیخی بگھارتے ہیں۔ مگر عرب سچ مچ شخصی آزادی کا مالک ہے خدا کے دئے ہوئے مخصوص اختیارات کو ہاتھ سے دئے بغیر وہ ایک حد تک سوسائیٹی کی برکات سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے ہر قبیلے میں توہم، احسان یا دولت کی وجہ سے ایک مخصوص خاندان اپنے ہمسروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ ریاست اور امارت ہمیشہ اسی مخصوص نسل میں چلتی رہتی ہے۔ لیکن وراثت کا قانون بے ضابطہ اور غیر معیّن ہوتا ہے۔ اپنے ریش سفید بزرگوں سے جھگڑے چکانے اور اپنی (اعلیٰ) مثال سے بہادروں کی رہنمائی کرنے کے سادہ مگر اہم عہدے کے لئے اپنے شریف اقربا میں سے سب سے زیادہ لائق یا معمّر بزرگ کو چن لیا جاتا ہے۔ ملکہ زینوبیہ کے ہموطنوں نے عقل و فراست والی پرجوش عورتوں کو بھی حکمرانی کرنے کا موقع دیا ہے۔

چند قبیلوں کا ہنگامی طور پر ایک جگہ جمع ہو جانا لشکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ذرا اور گہرا تعلق قائم ہوا تو ایک قوم بن گئی۔ اب ان کا بڑا سردار امیر الامرآء جس کا علم

اُن کے سروں پر لہرا رہا ہے باہر والوں کی نظر میں شاہی خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔
اگر عربی اُمراء اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں تو اُن کو فوراً ہی یہ سزا مل جاتی ہے کہ اُن کی رعایا جو نرم اور پدرانہ سلوک کی عادی ہے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔
اُن کی رُوح آزاد ہے۔ اُن کے قدم غیر مقید۔ ریگستان کھلا ہوا ہے۔ قبائل اور خاندان باہمی اور اختیاری سمجھوتے سے مجتمع رہتے ہیں۔
یمن کے نسبتاً نرم باشندے شاہی شان و شوکت کی تائید تو کرتے تھے لیکن اگر بادشاہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر محل سے نہیں نکل سکتا تھا تو حکومت کی عاملانہ قوت امراء اور قاضیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ ایشیا کے بیچوں بیچ مکہ اور مدینہ کے شہر (یوں سمجھ لیجئے کہ) دولتِ مشترکہ کی شکل یا ہیولیٰ پیش کرتے ہیں۔ حضرت نبی کریم کے دادا اور اُن کے آباؤ اجداد' خارجی اور داخلی معاملات میں مُلک کے حاکم نظر آتے ہیں۔ لیکن ایتھنز کے پیری کلیس اور فلورنس کے میڈی چی کی طرح وہ اپنی عقل اور دیانت کی وجہ سے حکمران تھے۔ اُن کا اثر اُن کے ترکے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہوتا رہا۔ اور امارت رسولِ کریم کے اعمام سے نکل کر قریش کی ایک نوخیز شاخ کے قبضہ میں چلی گئی۔
اہم مواقع پر وہ بزم شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ نوعِ انسانی سے اپنی بات منوانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو قوت کے زور سے اُسے دبایا جائے یا اُس کو ہم خیال بننے کی ترغیب دی جائے۔ قدیم عربوں میں فنِ خطابت کا رواج اور شہرت اِس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن میں جمہوری آزادی موجود تھی۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی آزادی یونان اور روم کی جمہوریتوں کی اس لطیف اور مصنوعی مشینری سے جُدا تھی۔ جس میں ہر رکن' جماعت کے شہری اور مُلکی حقوق میں غیر منقسم حصہ رکھتا تھا۔ عربوں کی نسبتاً زیادہ سادہ ریاست میں قوم بالکل آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ مِلّت کا ہر فرد کسی آقا کی ذلیل اطاعت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ ہمت و شجاعت۔ صبر و استقلال' اِقتدار و

پرہیزگاری کی سخت وترش صفات سے مضبوط رہتا ہے۔ آزادی کی محبت اُس کو خود اختیاری کی عادتوں پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرتی رہتی ہے اور بے عزتی کا خوف اُس کو تکلیف، خطرے اور موت کے ذلیل خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔ اُس کے ارادے کی پختگی اُس کے ظاہری حرکات وسکنات تک سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی گفتگو آہستہ وزن دار اور مختصر ہوتی ہے۔ وہ شاید ہی کبھی کھل کھلا کر ہنستا ہو۔ وہ صرف ایک ہی حرکت کرتا ہے کہ اپنی ڈاڑھی پر جو مردانگی کا قابلِ عزت نشان ہے ہاتھ مارتا ہے۔ اپنی عزت کے احساس نے اُس کو اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ بے تکلف اور اپنے سے بڑے رتبہ والوں کے ساتھ بے خوف ہو کر بات چیت کرنا سکھا دیا ہے۔

عربوں کی آزاد منشی اُن کی فتوحات کے بعد بھی قائم رہی۔ خلفائے سابقین اپنی رعایا کی صاف گوئی اور آزاد بیانی کی قدر کرتے تھے۔ وہ جماعت مسلمین کو اپنا ہمخیال بنانے اور باخبر کرنے کے لئے (اکثر) منبر پر جاتے تھے۔ دارالخلافہ کے دجلے کے کنارے منتقل ہو جانے سے قبل عباسیوں نے ایرانی اور بازنطینی دربار کی متکبرانہ زرق برق رسمیں بھی اختیار نہ کی تھیں۔

مُلکی جنگیں اور ذاتی انتقام

اقوام اور افراد کا مطالعہ کرتے وقت ہم اُن اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جو اُن کو ایک دوسرے کا دوست یا دشمن بنا دیتے ہیں یا اُن کے سماجی کردار کو محدود یا وسیع یا دھیما یا تیز کر دیتے ہیں۔

عرب باقی دُنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "اجنبی" اور "دشمن" کے لفظ کو مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ مُلک کے افلاس نے ایک اصولی قانون بنا دیا ہے جس کو وہ اب تک مانتے ہیں اور اُس پر عمل پیرا ہیں۔ اُن کا گمان ہے کہ جب زمین تقسیم ہو رہی تھی تو سیر حاصل اور زرخیز اقلیمیں نسل انسانی کی دوسری شاخوں کو دے دی گئی تھیں۔ اب نافرمان اسمٰعیل کی اولاد اپنا وہ حصّہ جس سے وہ محروم رکھی گئی تھی واپس لینے کا حق رکھتی ہے خواہ جبر کرنا ہو

یا دھوکے سے۔

پلینی کے بیان کے مطابق عربی قبائل تجارت اور لوٹ مار دونوں کے مساوی طور پر عادی ہیں۔ وہ کارواں جو ریگستان میں سے گذرتے ہیں یا تو لوٹ لئے جاتے ہیں یا اُن سے فدیہ لے لیا جاتا ہے۔ ہمسایہ ممالک کے باشندے یونس اور سیباسطرس کے زمانہ سے اُن کے غارتگرانہ جوش و خروش کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔

جب کوئی بدّو کسی تنہا مسافر کو دور سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو غصے میں بھرا ہوا اُس کی طرف گھوڑا بڑھاتا ہے اور چلا کر کہتا ہے "کپڑے لتے اُتار کر رکھ دو!" تمہاری چچی (یعنی میری بیوی) بے چاری ننگی بیٹھی ہے"۔ اگر وہ فوراً ہی اِس حکم کی تعمیل کر دے تو رحم کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ مزاحمت ظالم کو اور برانگیختہ کرتی ہے۔ جو خون وہ (مسافر) اپنی جائز حفاظت کے لئے بہانا چاہتا ہے۔ اُس کا کفارہ صرف اُس کا خون ہی ہو سکتا ہے۔

کوئی اکا دُکا قزاق یا چند ساتھی تو اپنے اصلی نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن ایک پورے گروہ کی ترکتازیاں جائز اور قابلِ فخر جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ایک ایسی قوم کا مزاج جو نوعِ انسانی کے خلاف یوں آمادۂ جنگ بیٹھی تھی، لوٹ مار، قتل و غارت اور انتقام کی خانہ ساز اجازت سے اور مشتعل ہو گیا۔

یورپ کے قانون اساسی میں آج کل صلح و جنگ کرنے کا اختیار چند گنے چُنے معزز با اختیار آدمیوں کو حاصل ہے۔ اور اِس اختیار کو استعمال کرنے کا حق اور بھی کم لوگوں کو ہے۔ لیکن ہر ایک عرب بے خوف و خطر اور کھلم کھلا اپنے نیزے سے کسی ہم وطن پر حملہ کر سکتا ہے۔

قومی اتحاد، زبان اور اخلاق کی ایک مبہم مشابہت پر مشتمل تھا اور ہر جماعت میں قاضی کا اقتدار اور اثر برائے نام تھا۔

زمانۂ جاہلیت (یعنی نبی کریمؐ کی آمد سے قبل) کی سترہ سَو لڑائیوں کا حال روایتوں میں موجود ہے۔ کسی بد خلق گروہ کی عداوت کی وجہ سے لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ کسی ہٹی ہوئی جنگ کا بیان

نظم یا نثر میں سُنا دینا حریف قبائل کی تولاد کے سینوں میں عداوت کی بجھی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں ہر آدمی یا کم از کم ہر خاندان اپنے مقدمات کا خود ہی جج اور خود ہی بدلہ لینے والا تھا۔

خود داری کا وہ لطیف احساس جو نقصان سے زیادہ ہتک حرمت کو اہمیت دیتا ہے عرب کی لڑائیوں پر مہلک زہر پاشی کرتا ہے۔ ان کی عورتوں اور ڈاڑھیوں کی ہتکِ عزت بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ کسی ناشائستہ فعل یا قابلِ نفرت لفظ کا کفارہ صرف ملزم کے خون ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور اللہ رے اُن کا صبر آزما استقلال کہ مہینوں اور برسوں وہ انتقام کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ جرمانہ یا خونبہا کا رواج ہر زمانہ کے وحشیوں میں رہا ہے مگر عرب میں مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے خواہ خونبہا قبول کرلیں یا قانونِ انتقام پر عمل درآمد کریں۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کی عداوت کا تو یہ حال ہے کہ قاتل کا سر لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ مجرم کے بدلے کسی بے گناہ کو فدیہ قرار دیتے ہیں۔ قاتل کے خاندان کے بہترین اور سربرآوردہ آدمی کو مار کر انتقام کی آگ بجھاتے ہیں۔ اگر وہ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اب اُن سے انتقام لینے کی باری آتی ہے۔ اور اُن کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ اِس خونی قرضہ کا اصل اور سود اِسی طرح جمع ہوتا رہتا ہے۔ فریقین میں سے ہر قبیلے کے افراد عداوت اور بدگمانی میں زندگیاں گذار دیتے ہیں اور بعض اوقات انتقام کے حساب کتاب کو طے کرتے ہوئے نصف صدی گذر جاتی ہے۔

یہ خونی جوش و خروش جس میں رحم اور عفو کا پتہ بھی نہیں چند اصول اخلاق نے پیدا کر دیا ہے۔ اِن اصول کی رو سے یہ ضروری ہے کہ اِن متحارب فریقوں کی عمر۔ قوت۔ تعداد۔ اور ہتھیار میں کچھ مساوات ہو۔

حضرت نبی کریم سے قبل عرب دو ماہ یا شاید چار ماہ کو مقدس سمجھتے تھے اور اِس زمانے میں اُن کی تلوار مذہبی احکام کی رو سے زیر نیام رہتی تھی۔ خارجی اور داخلی کسی قسم کی لڑائی

میں حصہ نہ لیتے تھے۔ یہ عارضی صلح کا زمانہ اُن کی سرکشانہ اور غازیانہ عادات کا مضبوط ثبوت ہے۔

شہری عادات و خصائل

لوٹ مار اور انتقام کا جذبہ، تجارت اور ادبیات کی سکون بخش اثر سے اعتدال پر آگیا تھا۔ یہ تاریک جزیرہ نما چاروں طرف سے عہدِ قدیم کی مہذب ترین اقوام سے گھرا ہوا ہے۔ تاجر، نوعِ انسانی کا ہمدرد ہوتا ہے۔ سالانہ آنے جانے والے (تجارتی) کاروانوں نے علم اور شائستگی کے ابتدائی اصول شہروں اور ریگستان کے خیموں تک میں داخل کر دیئے۔ عربوں کا حسب و نسب کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اُن کی زبان، زبانوں کے اُسی خاندان کی شاخ ہے جس سے عبرانی۔ سریانی اور کلدانی زبانیں نکلی ہیں۔

قبائل کی آزادی کا اثر اُن کی مخصوص بولیوں پر بھی نمایاں تھا۔ لیکن اپنی زبان کے بعد ہر قبیلہ مکے کے خالص اور صاف محاورات کو بجا طور پر ترجیح دیتا تھا۔

یونان کی طرح عرب میں بھی زبان کی تکمیل، اخلاق و آداب کی تہذیب پر سبقت لے گئی تھی۔ ان کی گفتگو میں شہد کے لئے ۸۰ سانپ کے لئے ۲۰۰ شیر کے لئے ۵۰۰ اور تلوار کے ۱۰۰۰ مختلف نام استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ حال اس وقت تھا جب لمبی چوڑی لغت، جاہل قوم کی قوتِ حافظہ کے سپرد تھی۔ حمیریوں کی یادگاروں پر ایک متروک اور مخفی رسم الخط میں کتبے لکھے ہوئے تھے لیکن خطِ کوفی جس پر موجودہ خط کی بنیاد رکھی گئی ہے، فرات کے کنارے ایجاد ہوا تھا۔ اور اس جدید ایجاد کی تعلیم مکے میں ایک اجنبی آدمی نے پھیلائی جو حضرت نبی کریم کی ولادت کے بعد اس شہر میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ فنِ صرف و نحو، عروض و معانی و بیان سے عرب کے آزاد فصحا نابلد تھے۔ لیکن ان کی قوتِ فہم تیز۔ ان کی قوتِ متخیلہ بھرپور اور ان کی عقل و فراست پختہ، جچی تلی تھی۔ اُن کے محنت سے تیار کئے ہوئے خطبے زوردار طریق پر سامعین کے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اُن کے دِل پر اُن کا اچھا خاصا اثر ہوتا تھا۔ ایک نوخیز شاعر کی جدّت اور کمال پر اُس کے اور اُس کے عزیز قبیلوں کے لوگ خوشیاں

مناتے تھے۔ شاندار دعوت کی جاتی تھی جس میں عورتیں اپنی شادی کی سی شان و شوکت کا مظاہرہ اپنے لڑکوں اور شوہروں کے سامنے کرکے دَف بجا بجا کر اپنے قبیلہ کی اِس خوش قسمتی کے گیت گاتی تھیں کہ ایک بہادر پیدا ہو گیا ہے جو اُن کے حقوق کی نگرانی کرے گا اور ایک نقیب نے آواز بلند کی ہے جو اُن کے نام کو حیاتِ جاوداں بخشے گا۔

دور و دراز مقامات پر رہنے والے یا دشمن قبائل ایک سالانہ میلے میں جمع ہوتے تھے جو ابتدائی مسلمانوں کے مذہبی تعصب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ ایک قومی اجتماع تھا جس کے اثر نے اِن وحشی لوگوں کو شائستہ بنانے اور میل جول پیدا کرنے میں ضرور امداد کی ہوگی۔ تیس روز شراب اور غلے ہی کے نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور شاعری کے یعنی دین کے شغل میں گذر جاتے تھے۔ شاعر لوگ دل کھول کر اِس انعامی مقابلے میں حصہ لیتے تھے۔ اور فاتح کا شہ کار اُمرا و رؤسا کے خزانوں میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی زبان میں وہ سات اصل نظمیں پڑھ سکتے ہیں۔ جو سنہری حرفوں سے لکھ کر کعبہ کے معبد میں معلق کر دی گئی تھیں۔ عرب کے شعراء اپنے عہد کے مورخ اور معلمِ اخلاق ہوتے تھے۔ اور اگر ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں کے تعصبات سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف اُن کی صفاتِ حسنہ کو بھی بڑھاتے چڑھاتے تھے۔ سخاوت اور شجاعت کا چولی دامن کا ساتھ اُن کے قصیدوں کا محبوب موضوع ہوتا تھا۔ اور جب وہ کسی بڑے خاندان کی سخت ہجو کرنا چاہتے تھے تو وہ بُرا بھلا کہتے کہتے یہ بیان کرتے تھے اُن کے مَرد دینے کا اور اُن کی عورتیں انکار کرنے کا نام بھی نہیں جانتیں۔

سخاوت کی مثالیں

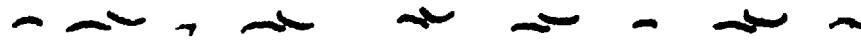
وہی مہمان نوازی جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیم نے کیا تھا اور جس کی تعریف ہومر شاعر نے کی ہے اب بھی عربوں کے خیموں میں موجود ہے۔ خونخوار بدو جس سے سارا ریگستان کانپتا ہے بغیر سوال و جواب یا تامل کے اس اجنبی مسافر کو گلے لگا لیتا ہے جو اُس پر اعتماد کرکے اُس کے خیمے میں داخل ہو جائے۔ اُس کے ساتھ مہربانی اور ادب سے سلوک کیا جاتا ہے اور وہ اپنے میزبان کی

مفلسی یا امیری میں حصّہ دار ہو جاتا ہے اور جب وہ آرام کر چکتا ہے تو شکریے کے ساتھ دعاؤں کے ساتھ اور کبھی کبھی تحفہ تحائف کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی بھائی یا دوست حاجتمند ہو تو دل اور ہاتھ زیادہ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ جو عامۃ النّاس کی تحسین و آفرین کے مستحق ہوتے ہیں بہادرانہ کارنامے وہ ہیں جو تمیز اور تجربے کے تنگ اندازے سے بالا ہوں۔ ایک بحث شروع ہوئی تھی کہ مکّے کے باشندوں میں سب سے زیادہ سخی کہلانے کا مستحق کون ہے۔ یکے بعد دیگرے اُن تین آدمیوں کو آزمایا گیا جو سب سے زیادہ اِس کے مستحق نظر آتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس کو ایک لمبا سفر درپیش تھا اُنھوں نے پاؤں رکاب میں رکھا تھا کہ ایک سائل کی آواز سُنی۔ "اے ابنِ عمِ رسول! میں ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں۔" وہ فوراً اُتر پڑے اور زائر کو اپنا اونٹ معہ قیمتی سازو سامان اور چار ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی کے عطا فرما دیا۔ صرف تلوار بچالی یا تو اِس لئے کہ وہ اصلی فولاد کی تھی یا اِس لئے کہ کسی عزیز کا تحفہ تھی۔

قیسؔ کے غلام نے دوسرے سائل سے کہا کہ میرا آقا خواب راحت میں ہے مگر لو یہ سات ہزار اشرفیوں کی تھیلی ہے (بس اِس وقت ہمارے پاس یہی ہے) اور لو یہ ایک نوشتہ ہے جس کے ذریعے تم کو ایک اونٹ اور غلام مِل جائے گا۔ آقا جب خواب سے بیدار ہوا (تو یہ حال سُن کر) اُس نے وفادار غلام کی تعریف کی اور اُس کو آزاد کر دیا۔ مگر اُس کو یہ نرم سی ملامت بھی کی کہ میری نیند کا خیال کر کے تم نے میری سخاوت پر دھبّہ لگایا ہے۔ اِن بہادروں میں سے تیسرا عرابہ نابینا نماز کے وقت دو غلاموں کے کاندھوں پر سہارا لگائے ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے سائل کا سوال سُن کر کہا "افسوس میرا خزانہ خالی ہے۔ لو تم اِن غلاموں کو فروخت کر ڈالو۔ اگر تم اِن کو قبول نہیں کرتے تو میں اِن سے دست کش ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کر اُس نے نوجوان غلاموں کو علیحدہ کر دیا۔ اور لاٹھی کے سہارے دیوار ٹٹول کر راستہ چلنے لگا۔

حاتم کی سیرت عربی صفات کا مکمل نمونہ ہے۔ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی فصیح البیان شاعر بھی تھا اور کامیاب لٹیرا بھی۔ اس کے مہمان نواز دسترخوان پر چالیس اونٹ کباب کئے جاتے تھے۔ ایک دشمن سائل کی درخواست پر اس نے قیدی اور مالِ غنیمت دونوں واپس کر دئے تھے۔ اس کے ہم وطنوں کی آزادمنشی کے سامنے قانونِ عدل کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ وہ فخر کے ساتھ رحم اور مہربانی کے فطری جذبے سے مغلوب ہو جاتے تھے۔



خِطابت

اور

اُس کی مختصر تاریخ

بسلسلۂ ماسبق

وعظ گوئی خطابت کی ایک قسم وعظ گوئی بھی ہے۔ مذہبی حیثیت سے اِس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اِس لئے کہ واعظ درحقیقت خلیفۃ اللّٰہ اور نائبِ رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے موضوع کا تعلق روحانیات اور نجاتِ ابدی ہی ہوتا ہے۔ وہ سامعین کے ایمانی جذبات کو برانگیختہ کر کے اُن تمام حقوق کو واضح کرتا ہے جو خدا کے اُس پر اور اُس کے خدا پر ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا اور رسول کی طرف ہی کہتا ہے اِس لئے وہ دماغ میں جِلا، جسم میں حرارت اور دِلوں میں عمل کا جوش پیدا کر دیتا ہے۔

مذہب کا اثر اور اُس کی ضرورت دُنیا میں اَب تک جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے ہیں اُن پر اگر ہم نظرِ غائر ڈالیں نیز اُن انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوامِل پوشیدہ ہیں اُن کی بھی جستجو کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اُن حالات کے دَوران میں انسان ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتا ہے۔ اور اُنھیں مخصوص خیالات کا اُس پر غلبہ ہوتا ہے جن سے وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور وہی اُس وقت اُس کے اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مجموعۂ خیالات جو اُس وقت انسان پر حاوی ہوتا ہے اُس کی تعبیر اگر ہو سکتی ہے تو صِرف لفظِ "مذہب" یا "دین" سے۔

اِنسان کے لئے ہمیشہ ایک دین و مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اُس کے دل و دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اُس وقت تک اُس کی

قوائے عمل شَل اور اُس کے اعضاء بے حس وحرکت رہتے ہیں۔ مذہب کو لوگوں کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے اُس کی بنا پر اس کی اہمیت سے کسی سمجھ دار شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دنیا پر جب سے آفتابِ تمدّن نور افگن ہوا ہے اُس وقت سے اَب تک انسان ہمیشہ مذاہب ہی کے آگے سرنگوں رہا ہے۔ اور بانیانِ مذاہب ہی کے لئے اُس نے مختلف زمانوں میں طرح طرح کے بت، ہیاکل اور معابد تعمیر کئے ہیں۔ دُنیا کا ہر وہ تمدّن جو کبھی روئے زمین پر آب و تاب سے جلوہ گر ہوا اُس کے آگے آگے ہمیشہ مذاہب ہی کی مشعلیں رہنمائی کرتی رہی ہیں۔

ہر قوم کے لئے اُس کے عقائد اساسی نعمت ہوتے ہیں۔ اُن کی قدر کرنا اور شورشوں سے اُن کو محفوظ رکھنا اُس قوم کا اوّلین فرض ہوتا ہے۔ اُنھیں معلوم ہے کہ اُن کے زوال کا دن دراصل وہی ہے جب اُن کے عقائد کی بُنیادیں کھوکھلی ہو جائیں اور معتقدات نشانۂ ہدف بن جائیں۔

چونکہ لوگ ہمیشہ اپنے اپنے معتقدات کے پیچھے سرگرداں رہتے ہیں اِس لئے واعظوں کا اُن پر بہت آسانی سے منتر چل جاتا ہے۔ وہ بڑی شان سے اُن کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے قوائے عمل سے حسب موقع اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے ہیں کام لیتے ہیں اور اُن کے خوف زدہ دِلوں کے لئے سامانِ امید فراہم کرتے رہتے ہیں۔ گویا سامعین اُن کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان ہوتے ہیں۔ وہ اُنھیں جدھر چاہتے ہیں گھماتے رہتے ہیں۔

اِتقاء اور پرہیز گاری واعظ کو حقائقِ دینیہ اور احکامِ شرعیہ سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ دین دار اور متقی بھی ہونا چاہئے۔

یونان میں ڈیماستھینز ایک مشہور جادو بیان خطیب گذرا ہے۔ جو فنِ خطابت کے

اسرار ودقائق کا بخوبی ماہر تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے اُس سے دریافت کیا کہ "خطابت میں کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "عمل" لوگوں نے پوچھا "اس کے بعد؟" اُس نے کہا "عمل" انہوں نے پھر یہی سوال کیا کہ "اُس کے بعد؟" اُس نے اِس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ "عمل"۔

دُنیا میں کامیابی جس چیز کا نام ہے وہ دراصل تمام تر نتیجہ ہے اُس کے عمل اور پرہیزگاری کا۔ تاریخ میں صدہا ایسی ہستیاں گذری ہیں جو علم وفضل، عقل و دانائی کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھیں لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے آج مرقعِ عبرت بنی ہوئی ہیں۔

دنیا میں گو صدہا واعظ پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے بہت کم نکلیں گے جو وعظ گوئی کی درحقیقت اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ مقررین اور واعظین کی فہرست میں ایسے لوگ بکثرت نظر آئیں گے جو اپنے مؤثرانہ خطبوں اور اسپیچوں کے ذریعے سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے اور اپنے تقدس سے مرعوب کرکے لوگوں کو اپنے ذاتی اغراض کا شکار بناتے تھے۔ اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے تھے مگر آخر ملمع کہاں تک اصل حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اُنھیں ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

تاریخ میں اِس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے پارساجن کے علم و فضل اور تقدس کی دور دور تک شہرت تھی جب اُن کا جامۂ پارسائی چاک ہوا تو کیا کچھ داغ سیہ کاری دیکھنے میں نہیں آئے۔

عہدِ اکبری کا مشہور عالم قاضی مخدوم الملک جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسند شیخ الاسلامی پر بھی متمکن رہ چکا تھا اور جس کی پابندیِ شریعت کی ایک دُنیا مداح تھی جب اُس کی قلعی کھلی تو دیکھنے والوں نے دیکھا اور سُننے والوں نے

حیرت واستعجاب کے کانوں سے سنا کہ غصب کا سارا مال اس کے یہاں سے برآمد ہوا۔ پھر آخر جو کچھ اس کا حشر ہوا دنیا سے پوشیدہ نہیں۔

روبس پیر ایک زبان آور خطیب تھا جسے انقلاب فرانس کے دور اولین میں ایک خاص زعیمانہ اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اس کی بداخلاقیوں نے اس کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ انقلابات کا جدید دور اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مدت کی دبی ہوئی مخالفتیں ابھریں جو بالآخر اس کے نام و نمود، عزت و اقتدار کو خاک میں ملا کر رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو بات واعظ کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ مسندِ وعظ پر اپنے لئے کوئی جگہ حاصل کرے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے عمل اور کردار کی اصلاح کرے، اپنے ظاہر و باطن کو درست کرے۔ اپنے عزوم، ارادے، عقائد و خیالات میں پختگی پیدا کرے۔ دعوت الی الحق اور اشاعتِ دین میں دنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت، اعزا و اقربا کی ملامت، کسی چیز کی پروا نہ کرے۔ اپنے اندر قوتِ ایمانی پیدا کرے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے کہ جس شخص میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اس کی قوتِ اثر اندازی میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اب تک جو لوگ تاریخی انقلابات کے باعث ہوئے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ صرف چند مسکین ہستیاں نکلیں گی جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط اور مستحکم تھی۔

انسان کی اصلی دین داری کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادے اور اپنی ذات کو معبودِ حقیقی کے ارادے اور اس کی ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے لئے بالکل فنا کر دیتا ہے۔ جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے

تو اُس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اُس کا شیشۂ دِل پاک صاف ہو جاتا ہے اور اُس کے تمام افعال و اعمال کا محور اور مرجع صرف وہی ذات ہوتی ہے جس کی رضاجوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نثار کر دیا ہے۔

عموماً ہر شخص کی زبان، اُس کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ ایک متقی اور خدارسیدہ شخص کی زبان پر وہی الفاظ آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بیچارگی، حمایتِ دینی، اور طاعتِ خداوندی کے مترادف ہوتے ہیں۔

مگر اِس کے برعکس ایک دنیادار اپنی بات چیت اور گفتگو میں انھیں الفاظ کا خوگر ہوتا ہے جن سے دُنیا پرستی، غفلت شعاری، عیش پسندی اور بدکرداری ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ صدہا خطبات جو نہ صرف خطابت و بلاغت کی جان سمجھے جاتے ہیں بلکہ حمیتِ دینی، غیرتِ مذہبی، خداپرستی اور اُس کی رضاجوئی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اُٹھا کر دیکھیے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے کیا اوصاف تھے اور کن باتوں کی وجہ سے مذہب و دین کے مقدس صفحات پر آپ نے عزت و نام پایا ہے۔ بطور نمونہ کے ایک خطبہ درجِ ذیل ہے۔

اتقوا اللہ عباد اللہ! بادروا
[illegible] بالکم باعمالکم وابتاعوا
ما یبقی لکم بما یزول عنکم
وترحلوا فقد جد بکم واستعدوا
للموت فقد اظلکم وکونوا
قوماً صیح بھم فانتبھوا واعلموا
ان الدنیا لیست لکم بدار
فاستبدلوا فان اللہ سبحانہ

بندگانِ خدا! خدا کے عذاب سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو اور اعمالِ خیر کے ساتھ اپنی موت کی طرف عجلت کرو۔ اُس چیز کے عوض میں جو تمھارے پاس سے زائل ہونے والی ہے وہ چیز خریدو جو تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والی ہے۔ تم کوچ کرو اور دیر نہ کرو، موت کے لئے تیار ہو جاؤ جس کا سایہ تم پر چھایا ہوا ہے۔ تم وہ قوم بن جاؤ جو آواز دینے پر بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے اور جان لو کہ تمھارا اصلی گھر دنیا نہیں ہے۔ تم اس کو تبدیل کر ڈالو۔ خداتعالیٰ نے

لم یخلقکم عبثا ولم یترککم سدیٰ -	تم کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے اور تم کو مہمل نہیں بنایا ہے۔
وما بین احدکم وبین الجنّۃ او النّار الّا الموت ان ینزل بہ وانّ غایۃ تنقصھا اللحظۃ وتھدمھا السّاعۃ لجدیرۃ بقصر المدۃ	تمھارے اور جنت یا دوزخ کے مابین، موت کے سوا کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ تمہاری عمر اور بقا کی مسافت جس کو ایک ایک لمحہ فنا کئے ڈالتا ہے، تقلیلِ مدّت کے لائق ہے

....

....

فیا لھا حسرۃ علی کلّ ذی غفلۃ ان یکون عمرہٗ علیہ حجّۃ وان تؤدیہ ایّامہ الی شقوۃ	کس قدر افسوس ہے اُس غافل شخص پر جس کے لئے اُس کی زندگی ایک حجّت و برہان ہے لیکن وہ اپنا زمانہ شقاوت میں گذار رہا ہے۔
نسئل اللّٰہ سبحانہ ان یجعلنا وایّاکم ممّن لا تبطرہ نعمۃ ولا تقصر بہ عن طاعۃ ربّہ غایۃ ولا تحل بہ الموت ندامۃ ولا کآبۃ ؛	ہم خُدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اور تم کو اُن لوگوں میں سے بنا دے جن کی نعمتیں اُنھیں تکبّر اور سرکشی میں مبتلا نہیں کرتیں اور کوئی دنیاوی فائدہ اُنھیں عبادتِ پروردگار سے باز نہیں رکھتا اور نہ اُن کو موت کے بعد ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے؛

(نہج البلاغہ ص۵۶)

تاریخ خطابت | قدیم ترین خطبات کا بیشتر حصّہ جو مدوّن ہو چکا ہے وہ صرف وہ ہے جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ یا دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل یونانیوں کے اندر بہت سے ماہرین خطابت پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنے زورِ بیان سے قوم و ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اسی عہد کی ایک گراں قدر ہستی امام الفلاسفہ ارسطاطالیس ہے جس نے اس فن کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی؛ اس کے اصول و قوانین مرتب کر کے جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبد اللہ بن سینا نے ارسطو کی اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا جو کتاب الخطابہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعدازاں چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن رشد اندلسی نے اس کتاب کا خلاصہ کیا جس کا نام تلخیص الخطابہ ہے۔ اس میں علمی طریقے سے مندرجہ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) خطابی قیاسات کی تعریف جو جلسوں میں تقریر کرتے وقت سود مند ہوتے ہیں۔

(۲) خطابی قیاسات کے اقسام یعنی مشاورہ، مخاصمہ، مشاجرہ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) وہ تدابیر جو قوم کے مائل کرنے اور ابھارنے یا کسی چیز کی تحقیر و تعظیم کرنے میں کارگر ہوتی ہیں۔

(۴) عذر یا عتاب کرنے کا طریقہ۔

(۵) کسی قصّہ یا لیکچر کے بیان کرنے کے وقت مضامین کی تمہید و ترتیب۔

عہد عیسوی | حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور وہ تھا جب خطابت ابتدائی منازل طے کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ آپ کے شاگرد والہیس بطرس، بولیس، وغیرہ خطابت کے بڑے ماہر تھے۔ ان کے خطبات بڑی بڑی مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔

جو اُن کے کمالِ خطابت کی زندہ یادگاریں ہیں۔ مذہبِ عیسوی اُن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

عہدِ اسلامی زمانۂ جاہلیت میں قوتِ خطابت سے جو کام لئے جاتے تھے، اُن کا دائرہ محدود تھا اِس لئے اُس زمانے میں خطابت اور تقریر کو وہ عروج نہ ہوسکا جو شعر و شاعری کو حاصل تھا لیکن زمانۂ اسلام میں یہ حالت بدل گئی سیاسی واقعات اور غزوات وفتوحات نے عرب کی پرجوش طبیعتوں کے لئے بہت سے نئے میدان کھول دیئے جن میں اُن کو زبان آوری کا جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اِس بنا پر اسلام کے بعد اگرچہ عربی شاعری میں زمانۂ جاہلیت کا زور باقی نہیں رہا تاہم اُس کی طاقت، خطابت اور تقریر کی طرف منتقل ہوگئی۔

درحقیقت خطابت اور شاعری کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ اِسی وجہ سے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب ہوتا ہے وہ شاعر بھی ہوتا ہے۔ اور جو شاعر ہوتا ہے وہ خطیب بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ شاعر بن جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت کا میلان خطابت کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ آخر خطیب کے لقب سے مشہور ہوجاتے ہیں۔

علامہ جاحظ نے " الجمع بین الخطابۃ والشعر ومن اشتھر بذٰلک" کا عنوان قائم کرکے اُن تمام ادبا کی ایک مکمل فہرست لکھی ہے جو خطباء بھی تھے اور شعراء بھی[۵]

خطبائے عرب میں بڑی جماعت وہ ہے جس کا دَور عہدِ اسلامی تھا۔ تاہم کچھ ایسے گذرے ہیں جن کا زمانہ اسلام سے قبل تھا۔ جن میں سے سحبان وائل باہلی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا ایک بلند پایہ خطیب اور امام مانا جاتا ہے۔ جس کی خطابت آج تک ضرب المثل ہے۔ کسی اسپیکر کی بہت زیادہ تعریف کرنی

۵؎ کتاب البیان والتبیین جزء اول ص۲۷۔

ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے "ھو اخطب من سحبان وائل"۔

سحبان کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ خطبہ دیتے دیتے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا لیکن نہ دورانِ تقریر میں کہیں ٹھہرتا تھا اور نہ سارے خطبے میں کوئی لفظ دُہراتا تھا۔ لوگ اُس کی خطبہ کو خطبۂ شوہاء کہا کرتے تھے۔

قس بن ساعدہ ایادی نے عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی دونوں پائے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ اُس کو سوقِ عکاظ میں دیکھا کہ سُرخ اونٹ پر بیٹھا ہوا خطبہ دے رہا ہے۔ آپ نے اُس کے خطبہ کو بغور سُنا اور اُس کی بلاغت پر تعجب بھی کیا وہ کہہ رہا تھا:۔

ایّھا النّاس! اجتمعوا، فاسمعوا وعوا۔ من عاش مات ومن مات فات، وکلما ھو اٰتٍ آت۔

لوگو! جمع ہو اور سُنو! اور یاد رکھو، جس کو زندگی عطا ہوئی ہے وہ مرے گا اور جو مرگیا اُس کا قصہ ختم ہوا۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے ہو کر رہے گا

مالی اری النّاس یموتون ولا یرجعون ارضوا فاقاموا، ام حبسوا فناموا۔

مجھے کیا ہوا ہے کہ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ مرتے ہیں اور پھر واپس نہیں ہوتے، کیا وہ پسند کرتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یا روک لئے جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

یا معشر ایاد این ثمود وعاد، واین الاٰباء والاجداد این المعروف الذی لم یشکر والظلم الذی لم ینکر۔ اقسم قسماً باللہ ان للہ دینًا

گروہِ ایاد! کیا ہوئے ثمود و عاد، کہاں گئے آباء و اجداد، وہ احسان کیا ہوا جس کا شکر نہیں ادا کیا گیا اور وہ ظلم کدھر گیا جس کا کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ بیشک خدا کا

آداب اللغۃ العربیہ جزء اول صفحہ ۱۰۰

هُوارضیٰ لہٗ من دینکم ھٰذا۔ ایک دین ہی جس کو وہ تمہارے اِس دین سے زیادہ پسند کرتا ہے ؛
(کتاب البیان والتبیین صـ۱۶۵)

حضرت سہیل بن عمروؓ نہایت پرجوش خطیب تھے۔ حالتِ کفر میں وہ اسلام کی مخالفت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ "اُن کے نیچے کے اگلے دو دانت تڑوا دیجئے تاکہ تقریر کرنے میں اُن کی زبان نہ چلنے پائے" آپ نے فرمایا اگرچہ میں نبی ہوں لیکن میں مثلہ نہیں کرسکتا۔ عمرؓ! اس کو جانے دو، ممکن ہے کہ اُن کی تقریر سے کبھی اسلام کو فائدہ پہنچے۔

چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور رسول خدا صلعم کی وفات کے بعد جب تمام عرب میں اِرتداد کی ہوا چل پڑی تو انھوں نے قریش کے سامنے ایک تقریر کی جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام قبیلہ قریش اسلام پر قائم رہا اور کسی قسم کی بدامنی ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ وہو ہٰذا :۔

ایھا الناس! ان یکن محمدٌ مات فان اللہ حیٌ لم یمت
لوگو! اگر محمد صلعم وفات پا گئے۔ تو خدا زندہ ہے جو نہیں مرا؛

وقد علمتم انی اکثرکم قتبًا فی برٍ وجاریۃً فی بحرٍ فاقرّوا امیرکم وانا ضامنٌ ان لم یتم الامر ان اردھا علیکم ؛
تم جانتے ہو کہ میں بہت زیادہ بری و بحری سفر کیا کرتا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ تم اپنا خلیفہ مقرر کر لو؛ میں ضمانت کرتا ہوں کہ اگر معاملۂ خلافت طے نہ ہوا تو اُس کو میں تم پر لوٹا دوں گا ؛

(کتاب البیان والتبیین صـ۱۷۲)

اہلِ عرب کو فطرتاً زبان کا ذوق تھا اور قدرت نے جذبات اور مدرکات کے اظہار پر اُن کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانے کی بڑی سے بڑی شائستہ اور متمدن قومیں اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھیں۔ اُن کی آتش بیانی لڑائیوں کی آگ بھڑکا دیتی تھی جو صدیوں بجھائے نہیں بجھتی تھی۔ سخن سنجی، سخن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا بازار گرم تھا۔ عرب کا بچہ بچہ ہومر اور شکسپیر ہو رہا تھا۔ اُن کے کسی قبیلہ میں جب کوئی نیا شاعر یا خطیب پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام پہنچتے تھے۔ عورتیں اِس خوشی میں رقص و سرود کے جلسے منعقد کرتی تھیں اور سارے قبیلے میں خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

ٹھیک اُسی زمانے میں جب عرب کی شاعری اور خطابت، بلاغت کی معراج پر پہنچ چکی تھی اور اہلِ عرب اِس ذوق سے مخمور اور اِس نشہ میں سرشار نظر آرہے تھے حجاز کی مقدس سرزمین مکہ سے ایک نئی آواز سُنائی دی جس کو سب نے حیرت و استعجاب کے کانوں سے سُنا۔ یہ داعیِ حق پیغمبرِ اسلام صلعم کی آواز تھی جو ایک ولولہ انگیز اور مغلوب نہ ہونے والی طاقت رکھتی تھی۔ اور بلاغت کے اُس مرتبہ کی مُدعی تھی جو بشری طاقت سے بالاتر ہے۔ سارا عرب مقابلے کے لئے تیار ہوا لیکن اُس عظیم الشّان جبروت اور جلال نے مخالفانہ ہمتوں کو سُست اور ارادوں کو پست کر دیا۔

اَب کیا تھا؟ قوتِ خطابت نے اور زور پکڑا۔ اہلِ عرب کے مذہبی جوش اور اُن کی فطری بے باکی نے اِس قوت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ جذباتِ بہیمیہ کا اظہار موقوف ہو گیا اور اُن کی زبان آوری، دعوتِ الی الحق، حمایتِ دین، ترغیب شجاعت اور تعلیمِ اخلاق میں صرف ہونے لگی۔

خطبائے اسلام اپنی تقریروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے اکثر آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات آیات کے مجموعے سے پورا پورا

خطبہ تیار کر لیتے تھے۔ چنانچہ مصعب بن زبیر نے اہل عراق کو اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی اطاعت پذیری پر آمادہ کرنے کے لئے جو خطبہ دیا تھا درج ذیل ہے:—

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝ طسٓمٓ ۝ تلک اٰیات الکتاب المبین ۝ نتلو علیک من نبأ موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یومنون ۝ ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعاً یستضعف طائفة منھم یذبح ابناءھم ویستحیی نساءھم انہ کان من المفسدین ۝ (واشار بیدہ نحو الشام) ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمة ونجعلھم الوارثین ۝ (واشار بیدہ نحو الحجاز) ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون ۝ (واشار بیدہ نحو العراق)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طسٓمٓ۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں، ہم تم کو موسیٰ اور فرعون کا سچا قصہ سناتے ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔ بے شک فرعون نے دُنیا میں سرکشی کی، اُس نے زمین کے رہنے والوں کے بہت سے گروہ کر دیئے بعض اُن میں سے کمزور تھے جو اپنے لڑکوں کو ذبح کرتے تھے اور اپنی عورتوں کے بارے میں شرم کرتے تھے بے شک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھے (اور اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا) ہم چاہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں کمزور ہیں اور ان کو امام بنادیں اور اُن کو ملک کے وارثین میں سے کریں (اور ہاتھ سے حجاز کی طرف اشارہ کیا) اور ہم ملک میں اُنھیں طاقتور بنادیں اور فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکروں میں سے اُن لوگوں کو دکھادیں جو پرہیز نہیں کرتے ہیں (اور ہاتھ سے عراق کی طرف اشارہ کیا)

(آداب اللغۃ العربیہ جزء اول ص ۱۹۲)

قائد اور سپہ سالار مواقع جنگ پر اپنے خطیبانہ اندازِ بیان میں بہت ہی پرجوش خطبے دیا کرتے تھے، جس میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی کے اصول، دشمن پر حملہ کرنے اور اس سے بچنے کے قواعد پر زور دیا جاتا تھا۔ اور فتح و شکست کے مواقع کو نمایاں کر کے مسلمانوں کے دلوں میں قومی غیرت اور دینی حمیت کے جذبات برانگیختہ کئے جاتے تھے اور انھیں بتایا جاتا تھا کہ بقائے حیات کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان اپنے دشمنوں کی مدافعت کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود سبقت کر کے ان کو فنا کرنے اور شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس موضوع پر ان کے پرجوش خطبے ہی درحقیقت ان کی کامیابی کا اصلی راز ہوتے تھے۔ چنانچہ جنگِ یرموک میں حضرت خالد بن ولید کا خطبہ، جنگ قادسیہ میں حضرت مغیرہ کا خطبہ، غزوۂ فارس میں حضرت خلید بن منذر کا خطبہ، اور فتح اندلس میں حضرت طارق بن زیاد کا خطبہ، مذکورۂ بالا بیان کی زرین مثالیں ہیں، جن کے ساحرانہ اندازِ بیان اور زورِ خطابت پر اگر تبصرہ کیا جاوے تو بڑی بڑی مجلد کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔

روم اور یونان کی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں فنِ خطابت میں بہت کمال رکھتی تھیں۔ اُن میں بہت سے خطبار ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زبان کی طاقت اور زورِ بیان سے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے۔ اُن کے خطبے آج بھی کمالِ خطابت کی بے مثال یادگار ہیں۔

خصوصاً یونان، تہذیب و تمدن، تعلیم و ترقی کے اعتبار سے بہت ہی امتیازی شان رکھتا تھا۔ وہاں اس فن کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ قوم و ملک کی بہتر سے بہتر طریقے پر خدمات انجام دے سکیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف اسی خطۂ ارضی کی یادگار ہے۔

لیکن اہلِ عرب کو یہ خاص فخر و امتیاز حاصل ہے کہ جب ان پر ترقی کا سایہ بھی نہ پڑا تھا اُس وقت بھی زبان آوری اور فصیح البیانی اُن کے قومی خصائص میں داخل سمجھی جاتی تھی۔

اور اُن کے خطیب دُنیا کے بہترین اسپیکر مانے جاتے تھے۔

نوشیرواں نے جب خطبائے عرب کی تعریفیں سنیں تو اُس کو اُن سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے نعمان بن منذر سے کہا "میں خطبائے عرب میں سے کسی ایک سے ملنا چاہتا ہوں!" نعمان نے ہر قبیلے سے دو دو تین تین زبان آور اسپیکر جمع کر کے اُس کی خدمت میں روانہ کئے جن میں قبیلہ بنی تمیم میں سے اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، قبیلہ بنو بکر میں سے حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، قبیلہ بنو عامر میں سے خالد بن جعفر، علقمہ بن علاثہ، عامر بن طفیل وغیرہ جیسے بلند پایہ خطبا شامل تھے۔

اُن میں سے ہر ایک نے نوشیرواں کے سامنے اپنی جادو بیانی اور سحر آفرینی کا ثبوت دیا اور اپنی زبان آوری اور فصیح البیانی پر خراجِ تحسین حاصل کیا جن کو علامہ احمد بن عبد ربہ نے عقد الفرید جزو ثالث میں مفصل بیان کیا ہے۔

ڈیموستھینس، خطبائے یونان کا امام مانا جاتا ہے لیکن اُس کے کُل خطبات "۶۱" سے زیادہ نہ تھے۔ مسلمانوں میں حضرت علی مرتضیٰ کے خطبات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن کو شریف مرتضیٰ نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے جس کا نام "نہج البلاغہ" ہے۔

اِن خطبات میں جہاں ایک طرف سلاست وروانی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف زورِ بیان اور ایسا جوش و اثر پایا جاتا ہے کہ سُننے والوں کے دِل لرز اُٹھتے ہیں۔ پھر زورِ خطابت کا عالم وہاں اور واضح ہو کر نظر آتا ہے جہاں حضرت علیؓ نے قوم کو جنگ پر اُبھارا ہے اور اُن کے دِلوں میں شجاعت و بہادری، اقتحام حرب اور اباءِ نفس کے شریف جذبات برانگیختہ کئے ہیں۔

نمونے کے طور پر آپ کا وہ مختصر خطبہ درج ذیل ہے جو آپ نے جنگ صفین میں اُس وقت دیا تھا جب موقع نہایت نازک تھا۔ سرفرازی و سربلندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا تاریک انجام تقریر کی تاثیر و عدمِ تاثیر پر موقوف تھا۔ وھو ھذا :-

معاشر المسلمين!

استشعروا الخشية وتجلببوا السكينة، وعضوا على النواجذ فانه انبى للسيوف من الهام واكملوا اللامة، وقلقلوا السيوف في اغمادها قبل سلها، والحظوا الخزر واطعنوا الشزر ونافحوا بالظباء.. وصلوا السيوف بالخطاء واعلموا انكم بعين الله ومع ابن عم رسول الله صلعم فعاودوا الكر واستحيوا من الفر، فانه عار في الاعقاب ونار يوم الحساب. وطيبوا عن انفسكم نفسا وامشوا الى الموت مشيا سجحا، وعليكم بهذا السواد الاعظم والرواق المطنب فاضربوا ثبجه. فان الشيطان كامن في كسره۔

مسلمانو!

تم خوفِ خدا کو اپنے لئے شعار بنالو، اور سکینہ و اطمینان اپنی طرف کھینچ لو، اور دانتوں سے دانت ملائے رکھو۔ اس لئے کہ یہ حالت دشمن کی تلواروں کو کھوپڑی پر کارگر ہونے نہیں دیتی اور زرہ کو کامل کر لو، اور تلواروں کو کھینچنے سے پہلے نیاموں میں جنبش دے لو! اور چاروں طرف کنکھیوں سے دیکھتے جاؤ اور دائیں بائیں نیزے بازی کئے جاؤ اور دشمن کو تلوار کی باڑھ پر دھر لو اور تلواروں کو دشمن کے قدموں سے ملائے رکھو۔ تم خوب جان لو کہ تم خدا کی نظروں میں ہو اور ابنِ عم رسول کے ساتھ ہو۔ دوبارہ دشمن پر پلٹ پڑو۔ بھاگنے سے شرم کرو۔ اس لئے کہ بدنامی اس کا انجام ہے اور قیامت کے دن عذابِ جہنم اس کا بدلہ ہے اور اپنے نفس کو اس کی خواہشوں سے خوش کرو۔ اور بطیبِ خاطر موت کی طرف آسانی کے ساتھ چلے چلو، تم اس زبردست جماعت اور طنابوں سے کسے ہوئے خیمے پر ٹوٹ پڑو۔ اور اس کے اندر بیٹھنے والوں پر تلواریں برسا دو۔ اس لئے کہ شیطان اسی اطراف رواق میں چھپا ہوا ہے۔

فلا تقدّم للوثبة يدًا
واخّر للنكوص رجلا
فصمدًا صمدًا حتى ينجلي
لكم عمود الحق وانتم
الاعلون والله معكم
ولن يتركم اعمالكم

جو آگے بڑھنے کے لئے پیش دستی کرتا ہے
پھر واپس ہونے کے لئے پیر پیچھے ہٹاتا ہے
لڑو لڑو یہاں تک کہ قدرتی نشان
تمہارے لئے آشکارا ہو جائے۔ تم ہی کو
غالب رہو گے۔ خدا کی مدد تمہارے ساتھ
ہے۔ وہ تمہارے اعمال کو کم اور ضائع
نہیں کرے گا

(نہج البلاغہ ۷۵)

ویدوں پر ایک سرسری نظر

وید ہندؤوں کی سب سے قدیم مقدس کتاب کا نام ہے۔ جو چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔ (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اتھروید۔

رِگ وید بہ لحاظ مضامین آریہ نسل کے قبائل کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ گو کتابی صورت میں وہ بعد میں آئی ہوگی۔ کیونکہ فن تحریر کی ایجاد رگ وید کے بھجنوں کے منظوم ہونے کے صدیوں بعد ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قدامت کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ ہاسک نے ۷۰۰ ق م اس کی ایک شرح لکھی ہے لیکن تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور جن مورخوں اور سنسکرت دانوں نے جو تاریخیں بتائی ہیں اُن میں سینکڑوں برس کا فرق ہے۔ سب سے زیادہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رگ ویدکا زمانہ ۸۰۰ ق م کے قریب ختم ہوا۔ یہ کتاب دس حصّوں پر منقسم ہے۔ ۲ سے ۷ تک یہ حصّے تو قدیم سمجھے جاتے ہیں لیکن آٹھویں حصّے میں ردّ و بدل ہے۔ اس کی زیادہ حیثیت نہیں۔ نواں، دسواں اور پہلا حصّہ، یہ بہت بعد کے ہیں کیونکہ ان تینوں حصّوں اور خصوصاً دسویں حصّے میں فلسفیانہ مضامین ہیں جو اوروں میں نہیں ہیں جن سے ان کے مؤخر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ خیالات بعد میں پیدا ہونے شروع ہوئے؛

رگ وید کا انداز شاعرانہ ہے اس میں ۱۰۲۸ گیت ہیں۔ اس کتاب کا کوئی خاص مصنف نہیں۔ طرز و انداز کے مختلف ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں ذی فہم دماغوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ کتاب کہاں تصنیف ہوئی۔ تو اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں۔ البتہ اس کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصّے افغانستان، بلوچستان کے علاقے میں لکھے گئے ہیں اور بعض حصّے

بیاس اور سرسوتی کے درمیان۔ کیونکہ ان میں جو موسم کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہ وہیں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض حصّوں میں پنجاب کے میدانوں اور دریاؤں کا ذکر ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ حصّے یہاں بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر یہ یقینی نہیں۔

رگ وید میں جس مذہب کی تعلیم دی گئی ہے وہ فطرت پرستی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ہمارے موجودہ تصوّرات سے مختلف ہے۔ آریہ قوم نے کائنات کی ان تمام قوتوں کو جن سے انسان اور انسانی زندگی کو فیض پہنچتا تھا دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کو مذہبی شعار بنالیا تھا۔ اندر بادلوں پر سوار برق و رعد کا تازیانہ لئے ہوئے آریوں کا محبوب دیوتا تھا۔ وارُن منتر اور اگنی کی پوجا کی جاتی تھی۔ رگ وید کی بھجن ان دیوتاؤں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ داسوں کو شکست دینے میں ان کا ہاتھ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رگ وید کے کسی بھجن میں چار دل ورنوں (ذاتوں) کا حوالہ نہیں ملتا۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قیام پنجاب میں آریوں کا اجتماعی نظام سخت نہیں ہوا تھا۔ غالباً ذات پات کی تفریق بعد میں عمل میں آئی ہے۔

سام وید

وید کا دوسرا حصّہ سام وید ہے۔ یہ رگ وید کا اختصار ہے۔ اس کے اندر زیادہ تر گیت ہیں جو پجاریوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور جن کو پجاری قربانی کے مختلف اوقات پر پڑھا کرتے ہیں۔

یجروید

تیسرا حصّہ یجروید ہے۔ یہ حصّہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس حصّے میں صرف قربانی کے متعلق ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا کہ یہ حصّہ قربانی کے قواعد اور منتروں کا مجموعہ ہے۔ اس میں اور سام وید میں منتر اور منتروں کے ٹکڑے ہیں جو رگ وید سے ماخوذ ہیں اور اس طریقہ پر ان کا سلسلہ رکھا گیا ہے کہ پوجا میں ہر حرکت اور ہر کام کے لئے ایک خاص منتر ہو۔ اور قربانیوں کے لئے بھی جن کی تعداد اس قدر بڑھ گئی تھی کہ متعدد برہمنوں یہاں تک کہ بعض خاص اوقات

میں سترہ برہمنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ برہمن مختلف درجوں کے تھے۔ اور ہر ایک کے فرائض مخصوص اور محدود تھے۔ سام وید کے جملہ منتروں کی تعداد ۱۵۴۹ تھی اور سوائے ۷۵ کے سب رگ وید سے ماخوذ تھے۔ یجر وید کے منتر بھی رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ مگر منتروں کے درمیان نثر کی عبارتیں بھی ہیں جن میں ان برہمنوں کے لئے ہدایتیں درج ہیں جو اس کتاب کو استعمال کرتے ہیں۔

اتھر وید

وید کے چوتھے حصّہ کو اتھر وید کہتے ہیں۔ اس حصّے کا اضافہ عرصہ دراز کے بعد ہوا۔ جس کی صحیح تاریخ کے متعلق کوئی قیاس نہیں ہو سکتا۔ یہ اضافہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ بہ لحاظ مضامین اور تخیل ان دونوں ویدوں میں بہت اختلاف ہے۔ اتھر وید میں رگ وید کے منتر، بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اس کے جدید ترین حصّوں میں سے ہیں۔ بعض بھجنوں میں محاسن شعر و شاعری ضرور ہیں۔ مگر زیادہ تر منتر جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں۔ رگ وید کے درخشاں اور خوش طبع دیوتاؤں کے مقابلہ میں جنھیں رشیوں نے مخاطب کیا ہے اس وید میں سیاہ اور ڈراؤنے بھوت ہیں۔ اس وید میں ہر ایک بُری چیز کو خواہ وہ قحط ہو یا بخار یا خود انسان کے بُرے خصائل ہر ایک کو ایک دیوتا بنا دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو خوش کیا جائے۔ یا جادو سے ان کے اثر کو دور کیا جائے۔ یا دوسروں کو ان کے ذریعے نقصان پہنچایا جائے۔ جس کی وجہ سے پوجا بجائے عبادت کے سحر سے مستبدل ہوئی۔ اور برہمن پجاری سے ساحر بن گئے۔

ویدوں پر اس مختصر تبصرے کے بعد اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ مختلف مذہبی عقائد کے متعلق ان کی کیا رائے ہے۔ اور اس زمانے میں متبعین کو کس چیز پر چلنے کی تلقین کی گئی۔

وید اور پوجا

ویدوں کے مذہب میں بیرونی اثرات سے متاثر ہونے کے قبل بت پرستی کا وجود

نہ تھا۔ اس بارے میں ہندوستان کے آریہ اپنے ایرانی بھائیوں سے پیچھے نہ تھے۔ عالمِ کائنات اُن کا معبد تھا اور وہ انسان کے بنائے ہوئے مکانوں میں اپنے دیوتاؤں کو نہیں بٹھاتے تھے۔ اور اپنے شاعرانہ خیالات میں کبھی اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکل اور خصائل کے ساتھ بیان کرکے خدا کو انسانی شکل وصورت دے دیتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی بُت نہیں بنائے ابتدائی زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی پرستش ہوتی تھی۔ یعنی قدرت کی قوتوں کو بہ حیثیت جداگانہ ہستیوں کے پوجتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس عہد میں فطرت پرستی نہایت ہی مُوثر و دلکش شکلوں میں بڑی اعلیٰ و اکمل شان سے نظر آتی ہے۔ یہ آسمان جو ہمارے سروں پر ایک ہیبتناک جلال وجبروت سے جُھکا ہوا ہے۔ یہ فرحت خیز و رُوح پرور ہوا جو کرۂ ارض کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہ شعلہ فشاں آگ جو ہمارے مطبخوں میں عجیب کیفیت سے جلتی ہے اور ہم کو گرمی و روشنی دیتی ہے۔ یہ نورانی صبح جو کسی حسین اور شرمیلی دُلھن کے مانند ہم کو خوابِ غفلت سے چونکا کر دنیا کے کام کاج میں مشغول کر دیتی ہے' یہی وہ سب دیوتا تھے جن پر قدیم زمانے کے ہندو شیدا ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی پرستش دل سے کرتے تھے۔

وید کے دیوتا

رگ وید کے گیتوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے۔ معمولی دیوتاؤں کو چھوڑ کر رگوید میں تقریباً ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں اس زمانہ میں ۲۰ دیوتاؤں کی زیادہ عبادت کی جاتی ہے۔ بعض اُن میں کے حسب ذیل ہیں:۔

اُن میں سب سے پہلا دیوتا دیائوس ہے۔ اس کا مادّہ دیو ہے جس کے لغوی معنی درخشاں ہونے کے ہیں۔ ایک گرم یا نیم گرم مُلک میں ایک قوم جس میں شاعری ودیعت تھی آسمان کو سوائے نور درخشاں کے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اور پھر درخشاں کہنا تھا کہ چشم زدن میں آسمان بھی ایک دیوتا ہو گیا۔ اور دیوتا بھی ایسا جس کو تمام آریہ اقوام اپنا دیوتا مانتی تھیں۔ یہ

دیوتا، آسمان کا دیوتا تھا۔ اِس کی تعریف میں رگ وید میں متعدد بھجن ہیں۔

حصّہ ہفتم میں جو ایک رشی مسمّیٰ وسشٹھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا کم از کم اِس کے خاندان میں محفوظ تھا وارن کی تعریف میں بہت سے بھجن ہیں۔ مختصر بیانیہ فقروں میں اِس کو مخاطب کیا گیا ہے جن کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اُس دیوتا کی نہ صرف جیتی جاگتی تصویر مع اُس کے جملہ جسمانی خصوصیات کے بن جائے گی بلکہ بہت سے مشاہداتِ قدرت سے بھی اُس کا تعلق معلوم ہو جائے گا جو آسمان کے متعلق ہیں؛ وارن پہلے تو آسمان تھا، پھر آسمان کا دیوتا ہو گیا اور اِس طور پر وہ جملہ کرشمہ ہائے قدرت میں جلوہ گر نظر آنے لگا۔ جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب اُس کی آنکھیں ہیں۔ زمین کی سات ندیاں اُس کی بہنیں ہیں بارش کا بھیجنے والا بھی وہی ہے۔ وارن کی تعریف کے بھجنوں میں سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے وید کے اِس عظیم الشان دیوتا کی خصوصیات ذہن نشین ہو سکیں گی۔ ایک رشی کا گیت ہے:۔

"ایک بھجن گاؤ جس سے شاہ وارن خوش ہو جائے۔ یہ بھجن اُس کی تعریف میں گاؤ جس نے زمین کو اِس طرح پھیلایا ہے جیسے قصّاب گھوڑے کے چمڑے کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وہی جنگلوں میں ٹھنڈی ہوائیں بھیجتا ہے گھوڑے (آفتاب) کو تیزی دیتا ہے۔ گایوں (بادل) کو دودھ دیتا ہے دماغ میں عقل پیدا کرتا ہے اور پانی میں آگ (بجلی) پیدا کرتا ہے۔"

(رگ وید حصّہ پنجم)

انسان کو جب اپنے معاصی پر پشیمانی ہوتی تھی تو وہ وارن ہی سے ترحّم و عفو کا خواستگار ہوتا تھا۔ رگ وید میں کئی توبہ کے بھجن ہیں جو بہت پُر اثر ہیں جن میں کا ایک یہ ہے:۔

"اے وارن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں خانۂ گِلی میں داخل ہوں رحم، اے مہابلی رحم، اگر میں اِدھر اُدھر اِس بادل کی طرح بھٹکوں جسے ہوا

پریشان کرتی ہے تو مجھ پر رحم کر، اے ذاتِ بے لوث میں نے
راہِ راست کو کمزور ہونے کی وجہ سے چھوڑا ہے رحم کر رحم کر، اے وارن
جب ہم آسمانی دیوتاؤں کے دیکھتے ہوئے گناہوں کے مرتکب ہوں اور
تیرے قوانین کی خلاف ورزی کریں تو رحم کو رحم"

اِس دیوتا کی زیادہ دن تک پرستش نہیں ہوئی اور زمانہ مابعد کی افسانیات میں وارن، پانی کا دیوتا ہو گیا۔ اس کی تمام آسمانی صفات غائب ہو گئیں اور اس کی اخلاقی صفات میں سے بھی وہی لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہیں۔ جو ڈرانے والی تھیں یعنی وہ صرف سزا دینے والا خیال کیا جانے لگا اور اس رحیم اور انصاف پسند بادشاہ کو بے رحم اور بد طینت خیال کیا جانے لگا۔ جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ گناہ گاروں پر بھی رحم کرتا ہے۔

اس کے بعد اگنی کا ذکر آتا ہے۔ یہ آگ پاک کرنے والی اور انسان کی محافظ اور دوست ہے۔ اس کے ساتھ ہندی آریاؤں کو بھی وہی محبت ہے جو ایرانیوں کو تھی جو اس کی آتش کے نام سے پرستش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ آگ کا دیوتا ہے اور اس کے سوائے کوئی دیوتا اور ایسا نہیں ہے جو انسان کے ساتھ اس کا مہمان اور دوامی رفیق بن کر رہے۔ اور روز مرہ کے گھر کے کاموں میں اس کی مدد کرے۔

اِن دیوتاؤں کے بعد پرتھوی کا جو زمین کی دیوی ہے ذکر آتا ہے۔ اس کی شان میں اچھے اچھے گیت ہیں۔ پھر اندر کا جو کڑک اور بجلی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے ذکر آنے لگا۔ سورج کے مختلف اوصاف کو مختلف دیوتاؤں کی صورت دی گئی۔ مثلاً قوت، حیات، سور یا سوتری کی شکل دی گئی۔ پھلوں کو پکانے اور زرخیزی کی قوت کو پوشن کی صورت دی گئی۔ اس کی تیز رفتاری کو وشنو کی شکل دی گئی جو آجکل بھی بڑا دیوتا مانا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ شیو بھی اس وقت بڑا دیوتا شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس کا نام رگ وید میں رُدر تھا۔ یہ طوفان کا دیوتا تھا۔ اس کے بعد طلوعِ آفتاب کی دیوی اوشس کا بہت ذکر آتا ہے۔ اس کو انسانی صورت

دی جاتی تھی۔ چنانچہ سورج کو انسان اور وہاؤس اور اندر کو بیل کی شکل دی جاتی ہے۔ رگ وید کے دیوتاؤں میں سب سے بڑی خوبی قوت وجبروت ہے۔ کوئی اخلاقی قوت نہیں، غرض وید کے بھی وہی دیوتا اور دیویاں تھیں جن کو ہمارے اسلاف اور بڑے بوڑھے تین چار ہزار برس ہوئے انڈس کے کنارے پر پوجا کرتے تھے۔ قدرت کے دیوتاؤں کا تصور اور وہ بے ریا اور جوانمردانہ سرگرمی جس سے وہ پوجے جاتے تھے ایک جری اور فاتح قوم کی قوت و بے لوثی کو ثابت کرتا اور ایک گروہ کی ترقی کو جس نے ابھی چند روز گذرے کہ تہذیب میں معقول حد تک پیش قدمی کی تھی، منکشف کرتا ہے،

وید اور وحدانیت

ویدوں میں وحدانیت کی تعلیم اور اُس عہد کے آریوں میں وحدانیت کا احساس تھا یا نہیں۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ جہاں تک ویدوں کا تعلق ہے اُن کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اِن ویدوں میں بہت سے دیوتاؤں کا ذکر ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ متعدد دیوتاؤں کے وجود کی تعلیم موجود ہے۔ متوفی آباؤ اجداد کی پرستش کا بھی ذکر ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پرستی بھی اُس کے خصائص میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے سے یہ خیال بھی رائج تھا کہ خدا عالم کے ہر ذرّے میں موجود ہے۔ جیسے اِس اشلوک سے ظاہر ہوتا ہے

"وہ خدا سمندر جس کی راہیں ہیں وہی پانی کے اِس زمانے میں بھی موجود ہے۔"

اِن خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ہمہ اوست (وحدتِ وجود) کی طرف زمانۂ قدیم سے رجحان تھا۔ اِس کے علاوہ بہت سے ایسے اشلوک ملتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف دیوتا صرف اُس ذاتِ واحد کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ اُس عہد کے آریوں کے جو اعتقادات تھے وہ وحدانیت سے بہت قریب تھے اور اُن کے جانشین یعنی برہمن بھی جن کی قوتِ متخیلہ حد درجہ تیز تھی اس کے قریب قریب پہنچے مگر حقیقت کو معلوم کرنے میں

ناکامیاب رہے، وید کے قدیم شعرا بھی وحدانیت کے قریب قریب پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ جب وہ وارُن کی عبادت کرتے تھے جو گناہوں کی سزا دینے والا اور معاف کرنے والا ہے تو لوگوں سے کہتے تھے "ڈرو اُس سے جس کے ہاتھ میں چاروں پانسے ہیں قبل اس کے کہ وہ اُنھیں پھینکے، اُس شخص کا راستہ سیدھا اور بے خار ہے جو نیک کام کرتا ہے۔" مگر نشانہ ذرا خطا کر گیا اور رسوم نے ارتقاءِ رُوحانی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس عہد کا ایک شاعر ہستی یکتا کی عظمت کی مدح سرائی کرتا ہے مگر جب وہ تناقض کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ کِس دیوتا کے لئے ہم قربانی کریں یعنی اِن دیوتاؤں میں جن کو ہم اپنے دیوتاؤں میں مخاطب کرتے ہیں یہ ہستی یکتا کون ہے جس کے لئے آج ہم قربانی کرتے ہیں، وہ بھجن یہ ہیں :-

۱۔ ابتداء میں سنہرا بچّہ وجود میں آیا، وہ تمام موجودات کا واحد پیدا شدہ مالک تھا، اُس نے زمین اور اِس آسمان کو قائم کیا وہ دیوتا کون ہے جس کے لئے ہم قربانی کریں گے۔"

۲۔ "وہ سانس (حیات) دیتا ہے وہ طاقت دیتا ہے، اُسی کے حکم کی تمام دیوتا عظمت کرتے ہیں۔ اس کا پرتوِ حیات ازلی ہے۔ اُس کا سایہ موت۔ وہ دیوتا کون الخ"

۳۔ "وہ جس کے سبب سے آسمان درخشاں ہے اور زمین مضبوطی سے جمی ہوئی ہے اور وہ جس کے سبب سے آسمان بلکہ اعلیٰ ترین آسمان بھی قائم ہوا وہ جس نے ہوائی فضا کو ناپا وہ دیوتا کون الخ"

مندرجہ بالا نظم سے یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وحدانیت کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے اس احساس میں ناکامیاب رہے اور وحدانیت کے پوری طور پر قائل نہ ہونے پائے۔

وید اور موت اور دیگر رسومات

کسی قوم یا قبیلے کے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہم کو جاننا چاہیئے وہ یہ ہے کہ موت کے متعلق اُن کے کیا معتقدات ہیں اور مُردے کی لاش کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں اور کن رسوم کے ساتھ وہ لاش کو دفن کرتے ہیں۔

رگ وید کے دسویں حصہ میں بہت سے ایسے بھجن ہیں جن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے آریہ ہندو اور اُن کے اسلاف گو زندگی سے محبت رکھتے تھے اور آرزو رکھتے تھے کہ اُن کی اور اُن کی اولاد کی حیات صد سالہ ہو مگر موت سے وہ ڈرتے نہ تھے اور گو وہ مُردوں کا احترام کرتے تھے اور انھیں محبت سے یاد کرتے تھے مگر یاس و نا امیدی کے ساتھ اُن کا ماتم نہیں کرتے تھے. کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ مرنے والا اپنے آبا و اجداد اور بزرگانِ قوم کے ساتھ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی اولاد کے آنے کا منتظر رہتا ہے۔

رگ وید کے دسویں حصے کے مختلف بھجنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً لاش کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ سب سے پہلے وہ لاش کو کسی متبرک مقام پر رکھتے تھے، متوفی کی کمان اُس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اُس کی بیوی اُس کے سر کے قریب بیٹھی ہوتی۔ اور اعزا اور اقربا ایک وسیع حلقے میں کھڑے ہوتے تھے، پجاری لاش سے کچھ دور اِس حلقے میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ یہ پتھر حدِ فاصل تھا جس کے اِس طرف زندہ لوگ نہیں جا سکتے تھے اور عورت سے بھی یہ التجا کی جاتی تھی کہ اس کے آگے نہ آئے۔ اِس کے بعد پجاری مُردے اور ماتم کرنے والوں سے کچھ کہتا، پھر متوفی کا بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار بیوہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

"اُٹھ اے عورت اور عالمِ حیات کو دیکھ، جس کے پاس تو بیٹھی ہے اور جس نے تیرا ہاتھ ایک دن اپنے ہاتھ میں لے کر تجھ سے بیاہ کیا تھا وہ

مر چکا ہے اور اَب تیرا نکاح ٹوٹ چکا۔"

پھر یہی شخص، بے جان ہاتھوں سے کمان لے کر کہتا ہے:۔

"مُردے کے ہاتھ سے میں نے کمان لے لی ہے تاکہ اِس سے ہمیں مدد ملے اور ہمیں قوت و شہرت حاصل ہو، تم یہیں ٹھہرے رہو۔ ہم بہادر لوگ جنگ میں دشمن کو زیر کریں گے۔"

اِس کے بعد تدفین شروع ہوتی ہے۔ یعنی لاش زمین میں رکھ دی جاتی ہے اور اس پہ مٹی ڈھیر کر کے ایک تودہ بنا دیا جاتا ہے جسے موت کا مسکن کہتے تھے۔

مُردوں کو صبر و استقلال کے ساتھ بغیر کسی بیہودہ گریہ وزاری کے رخصت کرنے کی یہ رسم نہایت قدیم تھی۔ مُردوں کو جلانے کی رسم جب جاری ہوئی تو اس کے ساتھ دوسری رسوم کو بھی بدلنے اور دوسری عبارتوں کی تلاش کی ضرورت ہوئی جو سب دسویں حصّے میں موجود ہیں۔ گیرہیاسترا (تمدنی قوانین) میں زمانہ مابعد کی رسوم کو حسب ذیل طریقے پہ بتایا گیا ہے اور یہ رسوم کم ازکم اُن میں اُس وقت تک جاری تھیں جب وہ گنگا اور جمنا کے کناروں پر پہنچے جہاں ویدک تمدن کے بعد برہمنوں کے تمدن کا آغاز ہوتا ہے۔

مکانات سے دور چند خاص ہدایات کے بموجب ایک منتخب مقام پہ تمام اعزہ جمع ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھے کی کھال چتا پر بچھائی جاتی ہے جس پہ قربانی کی گھاس بچھا دی جاتی ہے۔ اور کھال کے اوپر لاش رکھی جاتی ہے اور بیوہ اُس کے سرہانے بیٹھتی ہے اور قربانی کی ضروری اشیاء، متوفی کے جسم پہ ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور مختلف طویل رسموں کے ادا کرنے کے بعد جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسم کے خاکستر ہونے سے کچھ قبل، پجاری کچھ پڑھتا ہے اور لوگ اِس مقام سے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں وہ صاف پانی میں نہاتے ہیں اور صاف کپڑے پہن کر شام تک وہیں رہتے ہیں۔ دس روز کے بعد متوفی کی جمع کی ہوئی ہڈیوں پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور سنگ لوح رکھ دی جاتی ہے۔

حیاتِ مستقبل

ویدک عہد کی آریہ قوم کو حیاتِ مستقبل پر پورا اعتقاد تھا، موت کو وہ ختم کرنے والا کہتے تھے. مگر اِس سے مُراد صِرف دُنیاوی زندگی کے ختم کرنے والے سے تھی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ انسان میں ایک جزو ہے جو نہ پیدا ہوتا ہے نہ مَرتا ہے اور جسمِ خاکی سے الگ ہوکر اپنے اصل مسکن کو چلا جاتا ہے اور ان دوستوں کے ساتھ مِل کر جو پہلے وہاں چلے گئے ہیں حیاتِ ابدی حاصل کرکے شادمانی کی زندگی بسر کرتا ہے. مگر اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زندگی کیسی تھی. وہاں لوگوں کے کیا مشاغل رہتے تھے. تو اِس کا جواب صِرف مبہم تخیلات میں ملتا ہے. جیسے اِس گیت میں۔

"یعنی بابرکت مُردے، دونوں بادشاہوں وارُن اور یاما کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں. اور خوبصورت پتے والے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے مزے مزے کے کھانے کھاتے ہیں. اور سوما پیتے ہیں. "

خدا ترس لوگوں کا تو یہ صلہ تھا کہ وہ نہایت آرام وآسایش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد مزے اُڑاتے ہیں. اَب سوال یہ ہے کہ دوسرے گنہگاروں کا کیا حشر ہوتا ہے اور اِن کے متعلق اُن کا کیا عقیدہ تھا؟ چونکہ گنہگاروں کے حشر کے متعلق آریوں کے خیالات حد درجہ مبہم ہیں اِس لیے اُس کا جواب دینا دشوار ہے، آریوں کی ہر چیز میں دوئی تھی اِس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نیک لوگ نورِ ازلی میں رہتے تھے تو بدکاروں کی جگہ دوامی تاریکی میں تھی۔ اور اِس کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ وارُن کو سزا دینے والا دیوتا بتایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیوتا گنہگاروں کو غار میں ڈال دیتا ہے، مختصر یہ کہ خواہ خدا ترس انسان ہوں یا گنہگار، اُن کے لئے ویدک عہد میں حیات بعد الممات ہے!

~ ~ ~ ~ ~

وید اور ذات پات

ذاتوں کی تقسیم کا زمانہ رگ وید کے بعد کا زمانہ ہے۔ رگ وید کے عہد میں ذاتوں کی تقسیم بالکل نہیں تھی۔ اور منتروں کے ایک ایسے ضخیم مجموعے (رگ وید) میں جس کی تصنیف و تالیف میں ایک مُدت صرف ہوئی ہو اور جمہور کی عادات و روش اور دستور و رواج سے بھرا ہوا ہو ہمیں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اِس عہد کے لوگ موروثی ذاتوں میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور رگ وید کی دس ہزار چاؤں میں برادری کے ذاتی اصول کی نسبت جھوٹ کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے تقسیم ذات کا پتہ چلے۔ اگر اس کا وجود ہوتا تو رگ وید میں اس کا کسی نہ کسی طرح پر اظہار ضرور ہوتا جس میں اس زمانے کے تمدن کا پورا عکس موجود ہے صرف ایک مقام حصہ دہم میں جسے پُرش کا بھجن کہتے ہیں اس کا ذکر ہے۔ مگر یہ بھجن نہایت مبہم اور اس کا مضمون نہایت غیر واضح ہے۔ البتہ یہ ضرور تھا کسی نے پوجا، کسی نے جنگ جدال، کسی نے تجارت وغیرہ اور کسی نے خدمتگذاری ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے بعد میں اسی صورت کو تقسیم ذات کی صورت دے دی گئی۔ اور غالباً یہ وہ وقت تھا جب شام وید، یجروید اور اتھروید اور دیگر مقدس کتابیں مرتب کی گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے منو کے دھرم شاستر میں ان چاروں ذاتوں کے فرائض اور باہمی تعلقات کو حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا گیا ہے:۔

۱۔ برہمنوں کے اس (برھم) نے یہ فرائض قرار دیئے ہیں، ویدوں کا پڑھنا اور پڑھانا، اپنوں اور دوسروں کے لئے قربانی کرنا، خیرات لینا اور دینا۔"

۲۔ چھتریوں کو اس نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کی حفاظت کریں، انعام و اکرام دیں قربانی کریں، وید پڑھیں۔ شہوت پرستی سے پرہیز کریں۔

۳۔ ویش ذات کا کام یہ ہے مویشی کی پرداخت کرنا، انعام دینا۔ قربانی کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، قرض دینا اور کاشت کرنا۔

۴۔ سشُدروں کے لئے برمھ نے صرف ایک فریضہ مقرر کیا ہے یعنی دوسری تینوں ذاتوں کی بلا چون وچرا خدمت گذاری کرنا۔

ویدوں کی اخلاقی تعلیم

ویدوں کے بعض منتروں کے شاندار تناسب اور ٹھیک اُنیسوں صدی کے سے خیالات نے بڑے بڑے (میکس مولر، گریفتھ) مستشرقین کو مبہوت کر دیا ہے جیسے جیسے ویدک تحقیقات میں ترقی ہوگی اور مطلب فہمی کے بہتر طریقے وجود میں آئیں گے، ویدوں کی عظیم الشان روحانی معنویت اور اُن کے اخلاقی مباحث کی بے نظیر کثرت ضرور آشکارا ہوکر رہے گی۔ خود اِن اصحاب کو بھی جو اِس خیال کے مؤید ہیں کہ تدریجی ترقی کا نظریہ دنیائے اخلاق پر حاوی ہے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ویدوں کی تعلیم فی الحقیقت عظیم الشان اور ملہمانہ ہے۔ یہ مقدس کتابیں، صفائے قلب اور قول وفعل میں صداقت اور شرافت پیدا کرنے والے خیالات پر مشتمل ہیں۔ ویدوں میں خدا کو صداقت، انصاف وکرم اور رحم، اِن جملہ صفات کا مخزن خیال کیا گیا ہے اور انسان کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں بار بار اِن اُمور کا خیال رکھے۔ اور پھر اپنے اعمال کو ان کے مطابق بنائے۔ یہاں ہم صرف چند اشلوک درج کرتے ہیں، جن سے ویدوں کی اخلاقی تعلیم کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

۱۔ تمام اشیاء مجھے دوست خیال کریں۔ میں بھی تمام اشیاء کو دوست سمجھوں۔ یجروید

۲۔ آؤ ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں سب مِل کر کھائیں پئیں۔ مِل جل کر بہادرانہ کام کریں۔ اور ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔

۳۔ خواہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر خدا کرے صداقت کا فرشتہ ہمیشہ ہمارا نگہبان ہو۔

۴۔ اے قادرِ مطلق تمام امراض اور ناپاک خیالات کو نکال۔ دشمنی کے تمام

خیالات کو ہم سے دور رکھ۔ رگ وید

۵۔ میں ہر بشر سے محبت کروں خواہ وہ رذیل ہو یا شریف۔ اتھروید

۶۔ ایکدوسرے سے ایسے جوش محبت سے پیش آؤ جیسے ایک گائے اپنے بچھڑے سے۔ ,,

۷۔ اسے بیٹی! اپنے والدین کی مطیع ہو۔ اپنے خاوند سے ہمیشہ لطف آمیز کلمات میں کلام کر۔ ,,

۸۔ بھائی اپنے بھائی سے نفرت نہ کرے۔ بہن، بہن پر نامہربان نہ ہو۔ نیک نیتی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو ہو۔

۹۔ پہلے مہمان کو دے تو۔ اس کی مہمان نوازی کرلو تو خود کھاؤ۔

۱۰۔ طمانچے کا جواب طمانچے سے نہ دو، سراپ کے بدلے سراپ نہ دو، بلکہ طمانچوں اور بددعاؤں کے بدلے دعاؤں کی بوچھار کردو۔ گرنتھ

۱۱۔ روشن اجسام میں امن ہو، بحر، خشکی، تری، دنیائے نباتات وحیوانات میں امن ہو، ہر جگہ شانتی ہی شانتی ہو، ہر جگہ سکون ہی سکون ہو!

یہ ہیں ویدوں کے وہ چند اشلوک جو ہمارے سامنے علم الاخلاق کے اعلےٰ اصول پیش کرتے ہیں۔ نسل انسانی کی تاریخ کے ایک نہایت قدیم باب کے اقتباسات میں اس قسم کے اصولوں کو دیکھ کر کہ جو تم کو بددعا دے اس کو دعا دو، سب سے محبت کرو، ماں باپ کا کہنا مانو، بھائی بہن کی عزت کرو، ایماندار اور راستباز بنو۔ پہلے مہمانوں کو کھلاؤ پھر خود کھاؤ، دنیا میں امن وسکون کے متلاشی بنو، پروفیسر میکس مولر اور گریفتھ جیسے مشاہیر علماء بھی ویدوں کی بلند پایہ معنویت کے مقر ہیں۔

سچّائی کی جھلکی

اشخاص

طاہر	تیس سالہ خوبصورت نوجوان ۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ
زہرہ	طاہر کی نہایت حسین فیشن ایبل پچیس سالہ بیوی ۔
نسیم	طاہر کا ستائیس سالہ نوجوان بھتیجا ۔ اسی کے قدم بقدم
کلّو	مضبوط کاٹھی کا ساٹھ سالہ باورچی ۔
نرگس	نوجوان طرحدار خادمہ ۔

منظر

طاہر کے مکان کا ایک حصّہ

کمرہ نہایت ہی نفاست اور سلیقے کے ساتھ مغربی طرز پر آراستہ کیا گیا ہے ۔ دو دروازے ہیں ۔ ان کے بیچ میں آتشدان ہے ۔ آتشدان پر طاقچہ ۔ مقابل میں ایک بڑی کھڑکی ۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو مسٹر طاہر آتشدان کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں ۔ کلّو میز کے پاس کھڑا ہے ۔ میز پر خالی برتن چنے ہوئے ہیں ۔

کلّو ۔ سرکار وہ چاندی جو چوری ہو گئی تھی میرے خیال میں کسی ملازم ....

طاہر ۔ (غمگین لہجہ میں) اُنھ ! جانے بھی دو کلّو ۔

کلّو ـــ نہیں سرکار.......

طاہر ـــ (بات کاٹ کر اسی لہجہ میں) تم ابّا جان کے پاس بھی رہے ہو نہ ؟

کلّو ـــ جی ہاں سرکار۔

طاہر ـــ اور دادا جان کے پاس بھی ؟

کلّو ـــ جی حضور۔

طاہر ـــ اور میرے.......

کلّو ـــ (جلدی سے) جی نہیں سرکار۔

طاہر ـــ کلّو! میں نے تم کو ہمیشہ خیر خواہ پایا۔ آج کل میں ذرا پریشان ہوں۔

کلّو ـــ (ہمدردانہ لہجہ میں) کیا بات ہے حضور!

طاہر ـــ کلّو آجکل ایک عجیب قسم کا درد میرے ہوتا ہے۔

کلّو ـــ کہاں حضور ؟

طاہر ـــ (ٹھنڈی سانس لے کر) آہ! نہ پوچھو!

کلّو ـــ نہیں سرکار کچھ تو فرمائیے۔

طاہر ـــ کیا بتائیں کلّو۔ تمھاری بیگم صاحبہ کی وجہ سے ناک میں دَم ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمھاری بیگم صاحبہ تمام دن کہاں غائب رہتی ہیں؟ کبھی میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی ہیں۔

کلّو ـــ غریب پرور مجھے کیا معلوم۔ میں تو اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔

طاہر ـــ مجھے خوب معلوم ہے۔ (جیب سے ایک ڈبیہ نکالتے ہوئے) اچھا اب میں ان تمام باتوں کا آج ہی تصفیہ کئے دیتا ہوں۔ یہ ایک چینی دَوا ہے۔ اس کا نام "سچائی کی بھنکی" ہے۔ میرے ایک دوست نے پیکن سے بھیجی ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو کوئی اس کی ایک خوراک استعمال کر لے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ

ایک گھنٹے تک سچ بولے۔

کلو —— تو حضور یہ تو اچھی دوا نہیں ہے۔

طاہر —— چاہے کچھ ہو میں اِس کو آزماؤں گا ضرور۔

کلو —— مگر حضور مجھ پر نہیں۔

طاہر —— نہیں۔ میں اِس کی ایک خوراک تمھاری بیگم صاحبہ کو دوں گا۔ ڈبیہ میں سے ہدایات کے پرچہ کو نکال کر دیکھتے ہوئے) یہ دوا شربت کے ایک گلاس میں دینی چاہیے۔ تو اِس کے ذائقہ کا احساس نہ ہوگا۔ اَب ہم کو سب باتیں معلوم ہوجائیں گی۔ اچھا ذرا شربت انار کی بوتل تو دو (بوتل میں سے تھوڑا سا شربت لے کر اُس میں دوا ڈال کر پھر بوتل میں ڈال دیتا ہے) مگر ہاں دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

کلو —— کہیں ایسا ہو سکتا ہے حضور۔

زہرہ کی آواز سُنائی دیتی ہے

طاہر —— کون زہرہ ؟

کلو —— جی ہاں سرکار بیگم صاحبہ ہی ہیں۔

کلو جاکر دروازہ کھولتا ہے۔ زہرہ داخل ہوتی ہے

زہرہ —— معاف کرنا طاہر بہت دیر ہوگئی۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں دُکان کی اوپری منزل پر تھیں۔ میں لفٹ کے ذریعہ اوپر گئی تو بیچ میں یکایک لفٹ رُک گیا۔ مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا اور لفٹ مین کو بھی بہت زور کی ٹکر ہوئی۔

طاہر —— ارے! زہرہ تم ....

زہرہ —— اَب آپ لکچر بازی فرمائیں گے۔

طاہر —— نہیں فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ذرا سا شربت پی لو۔ تمھارے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی ہے۔ تکان وغیرہ سب رفع ہو جائے گی

زہرہ —— نہیں اب تو تکان نہیں ہے (دستی بیگ میں سے آئینہ نکال کر دیکھتی ہوئی) اور نہ میرا چہرہ زرد ہے۔

طاہر —— نہیں! نہیں! ہے۔ کیسے نہیں۔ دیکھو شربت پی لو۔ تکان رفع ہو جائے گی۔

زہرہ —— لیکن جی نہیں چاہتا۔

طاہر —— نہیں نہیں زہرہ ادھر آؤ۔ کم از کم میرے اصرار ہی سے سہی (شربت سے گلاس بھر کر اور کلّو کی طرف دیکھ کر جو تمام باتیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا) کلّو!

کلّو —— حضور۔

طاہر —— تم جاؤ۔

کلّو سلام کر کے چلا جاتا ہے

زہرہ —— مجھے تمہارے اس کھوسٹ باورچی پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔ تم نے اس سے پوچھا نہیں۔ شاید اس کو معلوم ہو کہ چاندی کیا ہوئی۔

طاہر —— کیسی احمق ہو۔ جس نے لی ہوگی کیا وہ بتا بھی دے گا؟ ادھر آؤ یہ پی لو۔

زہرہ —— خیر اگر تم اصرار کرتے ہو تو پئے لیتی ہوں (گلاس لیتی ہے ویسے ہی کلّو داخل ہوتا ہے)

کلّو —— حضور ٹیلیفون آیا ہے۔

طاہر —— (زہرہ سے) ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔

جاتا ہے۔ جیب سے دستی نکالتے ہوئے ترکیب استعمال دوا کا پرچہ گرا دیتا ہے۔ کلّو بھی ساتھ چلا جاتا ہے۔ زہرہ پرچہ اٹھاتی ہے۔ پڑھتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے،

زہرہ ــــ (خود ہی) "سچائی کی جھنکی" ہوں! یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اِس کے پینے پر اصرار کر رہے تھے۔ (شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) اُفوہ! کس قدر ذلیل حرکت ہے۔ بدگمانی کی بھی انتہا ہو گئی۔ اچھا اب میں ابھی حضرت کو سبق دوں گی۔ (کاغذ کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیتی ہے) اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ اچھا کہیں سے فرضی خطوط ملنے چاہیئیں۔ خوب یاد آیا (طاقچہ تک جاتی ہے) یہ بِل خطوط کا کام اچھی طرح دے سکیں گے۔ ان کو اچھی طرح خوبصورت فیتہ میں باندھنا چاہیئے (بیگ سے فیتہ نکالتی ہے اور بِلوں کو باندھتی ہے پھر شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) لاؤ اِسے پھینک بھی دوں۔ نہیں یہ کسی کو پلانا چاہیئے۔ اچھا تو پہلے اِس بوڑھے کھوسٹ ہی کو کیوں نہ پلاؤں۔

گھنٹی بجاتی ہے۔ کلّو داخل ہوتا ہے

کلّو ــــ کیا حکم ہے حضور؟

زہرہ ــــ یہ لو شربت بچ گیا ہے۔ ابھی پی لو۔

کلّو ــــ مگر غریب پرور مجھے شربت سے نزلہ ہو جاتا ہے۔

زہرہ ــــ نہیں تم کو پینا پڑے گا۔

کلّو ــــ لیکن .... حضور ....

زہرہ ــــ لیکن ویکن کچھ نہیں .... اچھا بیٹھ جاؤ

کلّو بیٹھ جاتا ہے

زہرہ ــــ اپنا منہ کھولو۔

کلّو ــــ لیکن غریب پرور میں ....

زہرہ ــــ (بگڑ کر) تم منہ کھولو (یہ کہہ کر اُس کی ناک پکڑ کر اُس کے منہ میں تھوڑا سا شربت ڈال دیتی ہے) ہاں اب تم جاؤ۔

کلّو جاتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے زہرہ پر گھونٹ تانتا ہی جس کو وہ نہیں دیکھتی ہے اور اپنا منہ آستین سے رگڑتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

زہرہ ــــ (خود ہی) اچھا اب میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور ذرا سا پوڈر لگاؤں تاکہ چہرہ زرد نظر آنے لگے۔

ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نرگس خادمہ داخل ہوتی ہے

نرگس ــــ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی بیگم صاحبہ آئی تھیں (چاروں طرف دیکھتی ہے) کلّو کی طرف سے لاپروا ہو کر شربت کی بوتل اسی طرح چھوڑ گئی ہیں۔ اب اگر ملازم نہ پئیں تو بے وقوف ہیں۔

تھوڑا سا شربت لے کر پیتی ہے۔ اتنے میں طاہر داخل ہوتا ہے۔ نرگس جلدی ہی بوتل میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دروازے سے زہرہ داخل ہوتی ہے۔

طاہر ــــ پیاری تم پھر زرد نظر آ رہی ہو۔ کیا تم نے شربت نہیں پیا۔

زہرہ ــــ (خالی گلاس دیکھ کر) دیکھو نہ اب ختم ہو گیا ہے

نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم ــــ چچی جان تسلیم۔ آداب عرض ہے چچی جان

زہرہ ــــ اہا نسیم! کہو اچھے رہے تمہارے چچا جان آج صبح کہتے تھے کہ کل وہ تم کو سیر کرانے لے گئے تھے۔

طاہر اثبات میں کہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

نسیم ــــ جی ... .. جی ہاں ...... ہاں کل ہی تو۔

طاہر ــــ کیوں نسیم کل شام کو کلب میں کتنی دلچسپی رہی؟

زہرہ ــــ خوب (نسیم سے) کیا تم کو شربت دوں؟

نسیم ــــ ضرور .... شکریہ

طاہر —— (پریشان ہوکر) اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کبھی نہ پیتا۔

زہرہ —— کیوں طاہر کس وجہ سے آخر؟

طاہر —— کچھ نہیں۔ یوں ہی ......

زہرہ —— لیکن ابھی تو تم ہی تعریف کر رہے تھے۔

طاہر —— ہاں لیکن ....

زہرہ —— (گلاس نسیم کو دیتے ہوئے) نسیم یہ لو۔

نسیم —— شکریہ چچی جان (گلاس لے کر پی لیتا ہے)

طاہر —— نسیم تم نے بہت جلدی کی (نسیم کو ٹالنے کی غرض سے) دیکھو نسیم تم ذرا لائبریری میں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

زہرہ —— اس میں جلدی کی کیا بات تھی؟ میرا ارادہ تھا کہ میں کل شام کی دلچسپی کے بارے میں کچھ پوچھتی۔

طاہر —— نہیں پیاری اب اس وقت نہیں

زہرہ —— (طاہر کی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے) کہو نسیم تمہارے چچا جان نے کل تم کو کہاں کہاں پھرایا۔

طاہر نسیم کو اشارہ کرتا ہے

نسیم —— (طاہر سے) چچا جان میں مجبور ہوں مجھے سچ سچ کہنا پڑے گا۔

طاہر —— (الگ) لعنت ہے ایسی دوا پر۔

نسیم —— (زہرہ سے) چچا جان نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ میں ان کے ساتھ تفریح کو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی کے ....

طاہر —— (غصّہ میں) نسیم تم کو غلط واقعات بیان کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ فوراً

کمرے سے نکل جاؤ۔

نسیم —— چچا جان میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ آپ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ بھئی وہ لڑکی ہی ذرا بے ڈھب.....

طاہر غصہ میں آکر نسیم کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیتا ہے

زہرہ —— یہ کیا قصہ ہے ؟

طاہر —— میری خود سمجھ میں نہیں آتا معلوم ہوتا ہے شربت کی تیزی کا اثر دماغ پہ ہو گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ لوگی۔

زہرہ —— یقیناً نہیں۔

ایسا ظاہر کرتی ہے گویا دوا نے اُس پر اپنا اثر کیا

زہرہ —— پیارے طاہر۔

طاہر —— کہو پیاری

زہرہ —— میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے

طاہر —— (الگ) ہوں! دوا نے اثر کیا

زہرہ —— مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا مجھے تمام باتوں کا اقرار کرنا پڑے گا۔

طاہر —— (انجان بن کر) کیا مطلب ؟

زہرہ —— (رازدارانہ طور پر آہستہ سے) پیارے طاہر اپنے پچھلے گناہوں کا اقرار۔

طاہر —— کیا ؟

زہرہ —— میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ مجھے لفٹ میں جھٹکا لگا ....

طاہر —— تو پھر ؟

زہرہ —— اور لفٹ مین سے ٹکر بھی ہوئی ....

طاہر —— ہاں ہاں تو پھر ؟

زہرہ ـــــ تو سب غلط تھا۔ لِفٹ وغیرہ کا کوئی قصّہ پیش نہیں آیا۔
طاہر ـــــ اور نہ اوپری منزل ہی پر گئی تھیں ؟
زہرہ ـــــ ہاں ۔
طاہر ـــــ تو پھر کیوں دیر ہوئی ؟
زہرہ ـــــ میں تم سے اپنی خواہش کے خِلاف کہنے پر مجبور ہو رہی ہوں ۔ ہائے میرے اللہ .... (اپنا سر کھجلاتی ہے)
طاہر ـــــ پیاری مجھ سے سب کہہ دو۔
زہرہ ـــــ میں ممتاز کے پاس گئی تھی۔
طاہر ـــــ (غصّے سے) کون ممتاز ؟ .... وہ آوارہ ، لُچّا ، بدمعاش ... ...
زہرہ ـــــ (بات کاٹ کر) نہیں ممتاز مصور ۔
طاہر ـــــ تم اُس کے اسٹوڈیو (نگار خانے) میں گئی تھیں ؟
زہرہ ـــــ ہاں پیارے طاہر۔ اُس کا بہت اصرار تھا کہ میں اُس کی نئی تصویر کے لئے نمونہ بنوں ۔
طاہر ـــــ (غضبناک ہوکر) اور تم ...... لاحول ولاقوۃ ، لاحول ولاقوۃ ....
زہرہ ـــــ ہاں اُس نے کہا کہ میرے جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ کمر بہت پتلی......
طاہر ـــــ میں اُس بدمعاش کو مار ڈالوں گا۔ (چیخ کر) میں ابھی جاتا ہوں۔

کلّو دروازے سے داخل ہوتا ہے

کلّو ـــــ سرکار ۔
طاہر ـــــ (اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنے مُنہ کو چھپا کر) نکل جاؤ، میرے سامنے سے نکل جاؤ۔
کلّو ـــــ حضور۔ وہ چھپے جو غائب ہوئے تھے ......
زہرہ ـــــ (الگ) کتنی عجیب دوا ہے۔

طاہر ـــــ (آگے بڑھتے ہوئے) تم نہیں جاؤ گے ؟

کلّو ـــــ حضور۔

طاہر کلّو کے پاس تک جاتا ہے لیکن وہ فوراً باہر چلا جاتا ہے

طاہر ـــــ تو یہ قصّے ہیں۔ اور کچھ گُل افشانی فرمائیے۔

زہرہ ـــــ اَب مجھ سے مزید تفصیل نہ پوچھو۔

طاہر ـــــ (چیخ کر) نہیں تمھیں کہنا پڑے گا۔

زہرہ ـــــ نہ پوچھو۔ گذری ہوئی باتوں کو جانے ہی دو۔ ابھی اور کچھ کہوں گی تو نہ معلوم تمہاری کیا کیفیت ہوگی۔

طاہر ـــــ یا میرے خُدا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔

زہرہ ـــــ بہت کچھ۔

کلّو داخل ہوتا ہے

کلّو ـــــ حضور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سب سچ سچ کہنا پڑے گا...... حضور وہ .... شربت کی بوتل جو غائب ہوگئی تھی وہ اور دوسرے کسی ملازم نے نہیں بلکہ میں ....

طاہر ـــــ (ایک چمچہ کھینچکر مارتا ہے) نکل جاؤ۔

کلّو ـــــ بہتر ہے حضور۔

زہرہ ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ اِس بُڈّھے کھوسٹ نے شراب پی ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔

طاہر ـــــ خیر وہ تو وہ مجھے تم پر سب سے زیادہ اعتبار تھا لیکن تم نے ہی مجھے دھوکا دیا۔ سچ ہے دنیا میں کوئی اعتبار کے قابل نہیں۔ معلوم نہیں تم کن کِن لوگوں کے پاس گئی ہو۔

زہرہ —— کیا؟ میں نے تو صرف ایک بے چارے کا نام لیا تھا...... ابھی تک.....

طاہر —— کیا ایک کافی نہیں ہے؟

زہرہ —— ممکن ہے بعض کے لئے کافی ہو لیکن میرے لئے تو نہیں.

طاہر —— للہ۔ تم اپنے عشاق کا ذکر اِس طرح مجھ سے نہ کرو۔ اَی عورت تو نے میرا دِل توڑ دیا۔

زہرہ —— اگر میرے امکان میں ہوتا تو تم سے علیحدگی اختیار کر لیتی۔ لیکن افسوس کہ میں مجبور ہوں۔ (طاقچی تک جا کر کاغذ کا بنڈل لاتی ہے) یہ لو چند خطوط ہیں اِن کو پڑھو۔

طاہر —— ممتاز کے؟

زہرہ —— (لاپروائی سے) ہاں اور دوسروں کے بھی۔

طاہر کاغذات کھینچ کر پڑھنا ہی چاہتا ہے کہ کلو داخل ہوتا ہے

کلو —— حضور۔ میرا قصور معاف کریں۔ میں اِس وقت اُن ہیروں کے بٹنوں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ جو کھوئے گئے تھے۔ حضور وہ میرے ہی پاس تھے لیجئے یہ حاضر ہیں۔ (بٹن میز پر رکھ دیتا ہے)

زہرہ —— وہی غائب شدہ بٹن۔ ....

طاہر —— (کلو سے) چلے جاؤ ورنہ میں ....

میز پر سے چھری اٹھاتا ہے۔

کلو —— بہتر ہے حضور۔

دوڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ طاہر دروازہ میں سٹکنی لگا دیتا ہے۔

طاہر —— اُف! (چھری پھینک دیتا ہے) اُف کیا ہو سکتا ہے؟ آخر ہو کیا سکتا ہی؟

زہرہ —— ہاں ہاں ٹھیک ہی۔ پیارے اِن چیزوں کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

طاہر —— مشیطان ! .....

دروازے تک جاتا ہے۔

زہرہ —— کہاں جا رہے ہو ؟

طاہر —— اپنے مشیر قانونی کے پاس ابھی فوراً طلاق کا انتظام کرتا ہوں۔

زہرہ —— ٹھہرو طاہر ٹھہرو۔ (اپنے جیب سے کاغذ نکالتی ہے) پہلے اسے توپڑھ لو۔

(کاغذ لیتے ہوئے) تحریری اقبال ... (کاغذ کو رکھتے ہوئے) آہ !

یہ ... کیا .... ہے۔

زہرہ —— جب تم ٹیلیفون پر گئے تھے تو یہ تمھاری جیب سے گر گیا تھا۔

طاہر —— تو تم نے شربت ... .

زہرہ —— بے وقوف تو نہیں تھی۔ ہاں کلّو اور نسیم نے ضرور پیا۔

طاہر —— اور تم نے نہیں ؟

زہرہ —— یقیناً نہیں میرے پیارے بے وقوف طاہر۔

طاہر —— اور (کاغذات کو دیکھتے ہوئے) یہ کیا ہیں ؟

زہرہ —— یہ بل ہیں جن میں سے اکثر ابھی ادا نہیں ہوئے ہیں۔

طاہر زہرہ کو سینہ سے لگا لیتا ہے۔ ویسے ہی نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم —— ارے معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا تھا .....

زہرہ —— خیر کوئی بات نہیں۔

نسیم —— میں آپ سے شب گذشتہ کے متعلق اور کچھ کہنے آیا تھا۔

طاہر —— (چلّاکر) تم خاموش نہیں رہوگے !

نسیم —— لیکن میں ....

نرگس داخل ہوتی ہے

نرگس ـــــ سرکار میں کچھ عرض کر سکتی ہوں۔

زہرہ ـــــ ہاں ہاں ضرور لیکن ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

نرگس ـــــ لیکن بیگم صاحبہ مجھے اندر سے کوئی چیز مجبور کر رہی ہے کہ میں کہوں۔

زہرہ اور طاہر دونوں شربت کی بوتل کی طرف دیکھتے ہیں

زہرہ ـــــ (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی استعمال فرمایا ہے۔ (نرگس سے) اچھا نرگس کہو کیا کہتی ہو۔

نرگس ـــــ حضور میں چھوٹے سرکار نسیم میاں کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

نسیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں

زہرہ ـــــ ہاں ہاں کہو۔

نرگس ـــــ حضور روزانہ صبح کو جب میں نسیم میاں کے کمرے میں چھوٹی حاضری لے جاتی ہوں تو ....

کلو کھڑکی کے پاس آکر کہتا ہے :۔

کلو ـــــ حضور میں کھوئی ہوئی چاندی لے آیا ہوں۔

چاندی کی تھیلی میز کے اوپر خالی کر دیتا ہے

پردہ



تنقید و تبصرہ

رباعیات سحابی | مولفہ جناب مولوی علی اوسط صاحب اعظم گڈھی۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج صوبہ متحدہ (ریٹائرڈ)، لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم ۲۴۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ/ر

ملنے کا پتہ :۔ دفتر اخبار سرگذشت۔ علی گڑھ

مولوی علی اوسط صاحب ایک مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں۔ باوجود اعلیٰ عہدوں پر رہنے اور قانونی مصروفیتوں کے بھی ان کا علمی ذوق قائم رہا۔ اور انھوں نے سحابی متوفی سنہ ۱۰۱۰ھ کی رباعیات فراہم کرکے طبع کرائیں۔ متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد نوسو رباعیاں ان کے نزدیک سحابی کی ثابت ہوئیں۔ اور انھیں کو انھوں نے جلی قلم سے لکھوا کر چھپوایا۔

عمر خیام اور سحابی کا مقابلہ کرتے ہوئے قابل مولف نے لکھا ہے کہ "جس زمانے میں حکیم عمر خیام تھے وہ زمانہ مسلمانوں کی سلطنت کے عروج کا تھا۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا تھے۔ لہذا شراب، کباب معشوق کے خیالات دل میں آتے تھے .... سحابی گوشۂ عزلت میں رہتا تھا۔ چالیس برس تک اس نے نجف اشرف کے احاطے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اس غریب نے تو شراب بھی نہ دیکھی ہوگی۔ لہذا اس کی رباعیوں میں اس کا ذکر تک نہیں۔"

دراصل اسی میں عمر خیام کی مقبولیت اور سحابی کی گمنامی کا راز مستتر ہے۔ یعنی شاعری جس قسم کے خیالات چاہتی ہے وہ خیام کے یہاں موجود تھے۔ برخلاف اس کے سحابی نے مذہبی جذبات اور پند و نصائح کو اپنا موضوع بنایا جو کبھی کبھی تو لطف دیتے ہیں۔ لیکن دن رات کا مشغلہ نہیں بن سکتے۔ بے شک سحابی کا انداز بیان صاف اور تشبیہات بھی کہیں کہیں نادر ہیں لیکن جدت اور تنوع نہیں ہے۔ ایک ہی موضوع ہے جس پر اس نے عمر بھر رباعیات کہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام کیوں کر مقبول ہو سکتا تھا۔ مولف کا خیال ہے کہ رباعیاں عمر خیام سے شروع ہوئیں۔ اور سحابی پر ختم ہوگئیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے

خیام سے پہلے ابوسعید ابوالخیر نے رباعیاں لکھی ہیں جو اگرچہ صوفیانہ ہیں مگر زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے سحابی سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کا مجموعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے عرصہ ہوا شائع کیا ہے بہرصورت مولف کی یہ علمی کوشش قابل داد ہے۔

البینات | مولفہ مولوی محمد سلیم صاحب۔ تقطیع خرد۔ ضخامت ۳۰۰ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ دفتر البینات۔ امراؤتی برار۔

اس کتاب میں مولف نے قرآن کی تعلیمات کو چھ مختلف عنوانات، مذہبیات جسمانیات معاشرت، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے تحت میں لکھا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت میں ذیلی عنوانات قائم کرکے ان کے متعلق قرآنی آیات مع سلیس اردو ترجمہ کے درج کردی ہیں اپنی طرف سے بجز اس کے کہ کہیں کہیں چند جملے توضیح کے لئے لکھ دئے ہیں اور کچھ نہیں لکھا ہے ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اور ان کو بہ نسبت تفسیروں اور ترجموں کے قرآن سے زیادہ قریب کرنے والی ہیں۔ ہم کو خوشی ہوتی ہے کہ قرآن کی خالص تعلیم کی طرف اب عام رجحان ہو رہا ہے اور توجہ بڑھ رہی ہے جو ہمارے خیال میں اسلامی روح کی بیداری کی علامت ہے

الخیر الکثیر | حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نایاب تصنیف جو اب تک غیر مطبوع تھی دیوبند کی مجلس علمی کی کوشش سے پہلی بار چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب فلسفہ اسلام اور اسرار شریعت کے متعلق نادر تصنیف ہے۔ اس کو شاہ صاحب موصوف کا ایک بلند پایہ علمی اور دماغی کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ ارکان مجلس علمی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے نہایت کوشش سے متعدد قلمی نسخوں کا مقابلہ کرکے اس کو عمدہ کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر طبع کرایا۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات ہے۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس مدرسہ صدیقیہ۔ پھاٹک حبش خان دہلی۔

خاتم النبیین | مصنفہ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم۔ بزبان فارسی ضخامت ۶ جزو تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت وطباعت اچھی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس صاحب مدرس مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

مولینا انور شاہ صاحب مرحوم نے یہ کتاب قادیانیوں کی تردید میں لکھی ہے جو ختم نبوت کے مسئلے میں قرآن سے مخالفت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس فرقے کی غلطیاں واضح کی ہیں۔ چونکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ باشندگانِ کشمیر وبلوچستان خصوصیت کے ساتھ اس فتنے میں پڑنے سے محفوظ رہیں اس لئے انھوں نے اس کتاب کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ اُن کے آخر عمر کی تصنیف ہے جس کو وہ خود اپنی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی اس لئے ان کے بعد دیوبند کی مجلسِ علمی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ فارسی میں ہے اور اب فارسی کا رواج ہندوستان سے اٹھتا جارہا ہے اس لئے مجلسِ علمی نے اس کے مقدمہ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے وہ عنقریب اس رسالے کی شرح اردو زبان میں شائع کردے گی۔ مجلسِ علمی کا یہ کام قدر کرنے کے قابل ہے۔

نگارستانِ کشمیر | مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی، کتابت وطباعت اچھی کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶ ۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد ادریس میرٹھی۔ مکتبہ شرفیہ۔ دہلی۔

قاضی صاحب موصوف نے اس کتاب میں کشمیر کا جغرافیہ اور آغاز عہد سے لے کر آج تک کی اس کی تاریخ نہایت معتمد ماخذوں سے جو مل سکتے تھے لے کر لکھی ہے۔ وہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں کے علاوہ امراء، شعراء، فضلاء اور صوفیہ وغیرہ کے حالات اور اُن کے کارنامے بھی بیان کئے ہیں جن کے ذیل میں بہت سے علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ قاضی صاحب کا زاویہ نگاہ خالص اسلامی ہے۔ اور تحریر کا انداز کہیں محققانہ ہو

اور کہیں مناظرانہ ۔ مخالفوں کے جوابات خود انھیں کی کتابوں سے دئے ہیں ۔
کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے اور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے ۔

دستور پہلوی | مصنفہ جناب دین محمد صاحب ایم اے ۔ بزبان فارسی ۔ صاف ٹائپ میں اچھے کاغذ اور بڑی تقطیع پر بمبئی میں چھاپی گئی ہے ۔ ضخامت ۲۴۴ صفحے ۔ قیمت فی نسخہ ستے ر

ملنے کا پتہ :۔ دین محمد صاحب بی اے ۔ الریاض ہال بازار ۔ امرت سر ۔ پنجاب ۔

ایران کی قدیمی زبان فرس باستانی کے نام سے مشہور ہے جو ہنخامنشی بادشاہوں کے عہد میں بولی جاتی تھی (۵۵۰ء سے ۳۳۰ ق تک) جس کی یادگار اب سوائے چند پرانے کتبوں کے جو پرسی پولس (تخت جمشید) بہستان (دبے ستون) میں پائے گئے ہیں اور کچھ نہیں ہے ۔ پھر اسکندر مکدونی کی تاخت و تاراج کی وجہ سے ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی ۔ جو تقریباً سو سال تک رہی ۲۲۶ ق ۔م میں اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت کی بنیاد ڈالی جو اسلامی فتوحات یعنی عہد یزدگرد تک رہی ۔ اس دورۂ اشکانی اور عہد ساسانی کی زبان پہلوی کہی جاتی ہے جو رسمی دینی اور ادبی حیثیت سے مستعمل تھی ۔ یہ کتاب اسی زبان کے رسم الخط اور صرف و نحو کے متعلق ہے جو نہایت کدوکاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے ۔ اس کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ یہ ان خواص کے لئے ہے جو ایران کی قدیم لسانی تحقیقات سے ذوق رکھتے ہیں ۔ زردشت کی کتاب اوستا کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ہنخامنشان کے عہد میں اس کے صرف دو ہی نسخے ایران میں تھے جب اسکندر نے استخر (پایۂ تخت) ایران کو جلا دیا تو ایک نسخہ جل گیا دوسرا نسخہ وہ اپنے ساتھ لے گیا ۔ جس میں سے طب ، نجوم فلسفہ ، اور جغرافیہ کے متعلق جو حصہ تھا اس کو یونانی میں منتقل کرا کے بقیہ کو برباد کر دیا ۔ اوستائے قدیم بہت بڑی کتاب تھی جو ۱۰ ۵ فصلوں پر تمام ہوئی تھی ۔ اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق گائے کے بارہ ہزار چرم کے پارچوں پر لکھی جاتی تھی ۔ عہد ساسانی میں جب اولین شہنشاہ نے اس کو فراہم کرانے کی کوشش کی تو موبدوں نے اپنی یادداشتوں سے جو کچھ جمع کیا وہ صرف ۳۴۸ فصلیں

تھیں۔ وہ بھی دستبرد زمانے سے رفتہ رفتہ فنا ہوتی رہیں۔ تاآنکہ اب جو کچھ حصہ اوستا کا رہ گیا ہے وہ دورۂ ساسانی کے اوستا کے چہارم سے زیادہ نہیں ہے۔

مصنف نے پیشدادیوں کے عہد کی بحث کو غالباً اپنے موضوع سے خارج سمجھا مگر ہم اوستا کی طرح اس کتاب میں دساتیر کے متعلق بھی تاریخی بحث دیکھنا چاہتے تھے۔

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں نہ صرف مشرقی اور مغربی علما کی تحقیقات اور ان کی علمی اور تاریخی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ بلکہ بعض موجودہ اہل علم سے بھی استفادہ کیا ہے اس لئے ان کی یہ کتاب تحقیقاتی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ انھوں نے نہ صرف زبان اور اس کے قواعد سے بحث کی ہے بلکہ ایرانی زبان جن خطوط میں لکھی جاتی تھی۔ ان کی تحقیقات بھی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ ہم اس کو اہل علم کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ سمجھتے ہیں۔ (ا۔ ج)

رسائل :-

شاہکار۔ ماہوار | ایڈیٹر پروفیسر تاجور۔ تقطیع ادبی دنیا کے برابر۔ ضخامت ۲ ، صفحے۔
قیمت سالانہ ۸ فی پرچہ ۸ ر مقام اشاعت۔ دفتر شاہکار۔ لاہور

مولانا تاجور بہت کہنہ مشق اخبار نویس ہیں۔ پہلے وہ مخزن کے دورِ ثانی کے ایڈیٹر تھے۔ پھر انھوں نے اپنا رسالہ ادبی دنیا نکالا جس سے اب وہ قطع تعلق کر چکے ہیں۔ لیکن وہ اب تک کامیابی سے جاری ہے۔ اب اپریل سے انھوں نے شاہکار کے نام سے ایک اور شاندار اور بھاری بھرکم رسالہ ملک کے تعلیمی رہنماؤں اور افسرانِ تعلیم کے مشورے سے جاری کیا ہے اس کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبار کو خالص ادبی تعلیم دی جائے۔ زیرِ نظر رسالہ جلد کا پہلا نمبر ہے اس میں شروع میں ہیڈ ماسٹر صاحبان کی خدمت میں ایک درخواست ہے۔ تیسرے صفحے پر 'اداریہ' ہے جس میں جناب مولینا راشد صاحب نے رسالے کے مقاصد پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ افتتاحیہ تکلیف دہ حد تک طویل ہو گیا ہے پھر جناب تاجور صاحب کے شذرات ہیں

اس میں انھوں نے رسالے کا لائحہ عمل یا پروگرام بتایا ہے ۔ اس کے بعد مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کا مذہب اور باطنیت پر ایک علمی مضمون ہے ۔ پھر مولانا عبد اللہ العمادی کی ایک فارسی نظم ہے ، پھر بزم تحقیق کے عنوان سے چند استفسارات اور مولانا احسن مارہروی اور جناب کیفی دہلوی کی جانب سے ان کے جوابات ہیں ۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کے قلم سے بہادر شاہ کی پوتی کی ایک غم انگیز داستان ہے ۔ تعلق نامے پر مقبول احمد صاحب صمدنی مصنف حیات جلیل کا ایک مضمون ہے ۔ بہادر شاہ اور مرزا غالب کے عنوان سے مہیش پرشاد لیکچرر ہندو یونیورسٹی کا ایک دل چسپ مضمون ہے ۔ پھر خیالات کے عنوان کے ماتحت جناب تاجور نے ۔ اصول بیانی و اصول اختیاری ، کیرکٹر ، اور ہندو مسلم اتحاد پر اظہار خیال فرمایا ہے ۔ مشاہیر عالم کے تحت میں مشہور فرانسیسی محب وطن موسیو لو انکارے کے حالات ہیں ۔ غیر معر جرنلسٹ صاحب کا ایک دل چسپ افسانہ ہے ۔ تعلیمات کے زیر عنوان دلی کی تعلیمی کانفرنس اور دوسرے تعلیمی و علمی اجتماعات کی رودادیں اور ان پر اظہار رائے ہے جناب سید حسن برنی صاحب نے چند نادر قلمی مصاحف کے عنوان سے ایک پر از معلومات مضمون لکھا ہے ۔ پھر ریحانہ کے عنوان سے ایک سبق آموز افسانہ ہے ۔ تعلیمی ادارات کے تحت میں تقسیم اسناد کے خطبات کی فہرست اور ان خطبوں پر اظہار رائے ہے ۔ اصطلاحات کے تحت میں عامل اور جوتشی کی خبر لی گئی ہے ۔ سینما کے تحت میں تماشائی صاحب نے صنعت فلم سازی پر خامہ فرسائی کی ہے ۔ شخصیات کے زیر عنوان مولانا ظفر علی ، چودھری ظفر اللہ خاں و یزندر و رنبیر کے حالات ہیں ۔ تنویرات کے تحت میں علمی اور کچھ سیاسی خبریں ہیں ۔ مضامین کے بیچ بیچ میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں اور اکثر بلند معیار ہیں ۔ آخری منزل کے عنوان سے ایک ہندوستانی مصور کی سہ رنگی تصویر بھی ہے اور بہت خوب ہے ۔ رسالے کے بعض عنوانات مستقل ہیں ۔ مثلاً بزم تحقیق خیالات ، مشاہیر عالم ، تعلیمات ، تعلیمی ادارات ، اصلاحات ، شخصیات ، تنویرات ۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ نہایت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے مضامین بھی کہنہ مشق اور مشہور اہل قلم حضرات سے حاصل کئے گئے ہیں مستقل عنوانات کے تحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت خوب ہے ۔ بحیثیت مجموعی یہ رسالہ طلبا اور عوام کے لئے

بہت مفید ہے البتہ اداریہ کے بارے میں اتنی گذارش ہے کہ یہ اس قدر طویل نہ ہونا چاہیئے کہ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتانے لگے۔ مضمون نگاروں سے بھی مضمون مختصر اور دلچسپ لکھوائے جائیں شخصیات کا عنوان بھی ہمارے خیال میں کچھ ایسا موزوں نہیں ہے اس میں کچھ تقلید کی بو آتی ہے۔ ویسے بھی اس میں فائدہ کم ہے۔ خرابیاں زیادہ ٹائٹل ممکن ہے طلبا کے لئے جاذب نظر ہو تاہم بہت شوخ ہے تقطیع کے بارے میں کچھ کہنا شاید بعد از وقت ہو۔

ادب لطیف (ماہوار) | ایڈیٹر چودھری برکت علی بی اے تقطیع بڑی۔ ضخامت ۸۰ صفحات، کتابت وطباعت روشن۔ کاغذ متوسط۔ چندہ سالانہ سے رفی پرچہ ۱۸۔ مقام اشاعت۔ لاہور

یہ پرچہ مارچ کے مہینے سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں نذر اولین کے عنوان سے ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے رسالے کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ادب لطیف کے عنوان سے جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے سابق ایڈیٹر ہزار داستان کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ادب لطیف صحیح معنوں میں کیا چیز ہے اور اس ادب لطیف (رسالے) کو کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون نگاروں میں چند اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاضی عبدالغفار صاحب۔ چودھری فضل حق صاحب ایم ایس سی۔ پروفیسر علم الدین صاحب، ایم اسلم صاحب، شاہد احمد صاحب مسز عبدالقادر صاحبہ وغیرہ۔ رسالے کی ظاہری شان بھی اچھی ہے۔ شروع میں ایک تصویر بھی ہے بحیثیت مجموعی رسالہ ہو نہار معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ایڈیٹر صاحب کی کوشش اسی طرح جاری رہیں تو لاہور کے رسائل میں بہت جلد ایک خاص حیثیت حاصل کرے گا۔

رتن ماہوار | ایڈیٹر شانتی سروپ نشاط۔ سائز بڑا۔ ضخامت ۔۸ صفحات، لکھائی، چھپائی روشن کاغذ اچھا۔ قیمت سالانہ (عام) فی پرچہ ۳ر۔ مقام اشاعت دفتر رسالہ رتن۔ جموں۔

یہ رسالہ بچوں کے لئے ریاست جموں سے نکلتا ہے ۔ ایڈیٹر صاحب اسے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مضامین ، نظموں اور قصوں کے انتخاب میں بچوں کے فائدے کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ انعامی معمے اور دلچسپ لطیفے بھی شائع کئے جاتے ہیں ۔ رسالہ بچوں کے لئے مفید ہے ۔ اگر ایڈیٹر صاحب رسالے کی زبان اور آسان کر دیں اور مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں تو اچھا ہو مثلاً زیر نظر پرچے میں "بچپن" والا مضمون بچوں کے لئے نہ مفید ہے اور نہ اس سے انھیں کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے ۔

سالنامہ پھول باغ (ماہوار) | ایڈیٹر صاحبزادہ کوشان سنگت پوری ، سائز بڑا ۔ ضخامت ۱۸۰ صفحے قیمت سالانہ سے رسالانہ نمبر کی عمر ۔ مقام اشاعت ریاست پٹیالہ ۔

یہ رسالہ نوجوانوں اور طلبائے مدارس کے لئے پٹیالہ سے ماہوار نکلتا ہے ۔ زیر نظر نمبر اس کا سالانہ نمبر ہے ۔ ایڈیٹر صاحب نے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر جمع کئے ہیں رسالے میں مہاراجہ پٹیالہ ۔ افسران ریاست اور چند مضمون نگاروں کی تصویریں بھی ہیں ۔ کتابت طباعت میں ترقی کی گنجائش ہے

اُمہات سالانہ نمبر | مدیرہ قمر النسا بیگم صاحبہ تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت معمولی ۔ قیمت سالانہ ہے رخاص سالانہ نمبر ۸ر ۔ مقام اشاعت بھوپال ۔

یہ بھوپال کے مشہور زنانہ ہفتہ وار رسالے کا سالنامہ ہے ۔ اور محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ مضامین نظمیں افسانے وغیرہ سب مفید اور نتیجہ خیز ہیں ، البتہ کتابت و طباعت میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے ۔ شاید بھوپال میں اس سے بہتر انتظام ممکن نہ ہوگا ۔

اصول تعلیم | مصنفہ خواجہ غلام السیدین صاحب پروفیسر تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ حجم ۴۴۵ صفحے تقطیع ۲۰ × ۲۶ ، کاغذ، کتابت، طباعت اکیڈمی کی اور کتابوں کی طرح نہایت عمدہ۔ قیمت ۶ (چھ روپے)

واحد ایجنٹ :۔ کتابستان ۔ ۱۷ (الف) سٹی روڈ ۔ الہ آباد۔

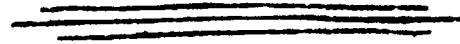
خدا کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد اردو میں ایک اعلیٰ درجے کی کتاب نظر آئی۔ اصول تعلیم ان کتابوں میں سے ہے جنھیں دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ اردو ہندوستان کی اور سب زبانوں پر بڑھ جائے گی اور ایک دن یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ کرے گی

تعلیم کے متعلق اردو میں ابھی تک چند ترجموں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ ہائے صدارت میں جن کا ذکر اصول تعلیم کے فاضل مصنف نے اپنے دیباچے میں کیا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے عملی مسائل کے متعلق مفید معلومات موجود ہے۔ لیکن نظری اور علمی بحث کا کہیں نام بھی نہیں ہے۔ یہی کتاب ہے جس سے ہماری زبان میں علم تعلیم یا فلسفۂ تعلیم کی بنیاد پڑتی ہے اور اگر بنیاد سے عمارت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے تو ہم بے تامل کہیں گے کہ انشاء اللہ ہمارا آیندہ نظریۂ تعلیم نہایت معقول اور مستحکم ہوگا۔

فاضل مصنف نے کتاب کے تین حصے کئے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان تعلیم و تمدن ہے۔ اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم تمدنی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے اور اسے قوم کی 'معاشرت' معیشت اور سیاست سے کیا تعلق ہے۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان 'درسی تعلیم' ہے۔ ذہنی تعلیم کی ماہیت اور حقیقت اس کے وسائل یعنی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی بحث ہے اور اسی کے ساتھ جسمانی تربیت کے مسئلے پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں جس کا عنوان۔ اخلاقی اور معاشری تربیت ہے۔ اخلاق کا مفہوم معین کرکے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا تعلق اور ضبط و تادیب کا جدید نظریہ بیان کیا گیا ہے اور معلم کی شخصیت کو اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر قرار دے کر طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کے اصول قائم کئے گئے ہیں۔ مصنف کی فاضلانہ بحث کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کوئی

مجرد چیز نہیں۔ بلکہ اس کی جڑیں تمدنی اور معاشرتی زندگی میں پیوست ہیں جس سے جدا ہو کر اس کا پنپنا محال ہے۔ اس لئے تعلیم کا حقیقی ذریعہ زندگی کو سمجھنا چاہیئے۔ اور مدرسے کو بھی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنانا چاہیئے۔ تعلیم محض ماحول کے اثرات انفعالی طور پر قبول کرنے کا نام نہیں بلکہ اس ماحول پر اثر بھی ڈالا جاتا ہے یعنی ہر قسم کی تعلیم خواہ وہ اخلاقی ہو یا ذہنی عمل سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی بنا عمل پر ہونی چاہیئے۔ موجودہ زمانے میں دنیا کا تمدن جمہوریت کا رنگ اختیار کر چکا ہے اور ہندوستان پر بھی یہ رنگ چڑھتا جاتا ہے۔ اس لئے تعلیم ابتدا سے جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے تاکہ آیندہ نسل جمہوری معاشرت کے لئے طیار ہو جائے۔

کتاب کے مضامین مصنف کی مہارت فن، وسعت مطالعہ، دقت نظر اور جدت فکر کی شہادت دیتے ہیں۔ اور اس کی صاف، سلیس، شگفتہ عبارت ان کے ذوق ادب اور سلیقۂ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ ہم مصنف کو اور ہندوستانی اکیڈمی کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہیں۔



قطعۂ استقبالیہ!

(مسلم یونیورسٹی کے اس جلسہ میں پڑھا گیا جو سیّد سجاد حیدر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا)

ادیب نکتہ شناس و خطیب خوش تقریر — زباں میں اُن کی حلاوت بیاں میں لذت ہے
فصیح و شستہ و برجستہ ہے سخن اُن کا — نیا خیال ہے، طرزِ ادا میں جدت ہے
وہ جذبِ قلب کی لفظوں میں کھینچ دیں تصویر — کچھ ایسی خامۂ رنگیں پہ اُن کو قدرت ہے
وہ کون؟ خالدہ خانم، کہ جن کا ہر ہر لفظ — ادب کی جان ہے، سرمایۂ فصاحت ہے
جھلک رہی ہے مئے خوشگوار شیشہ میں — یہ حُسن و دل کشی و ندرتِ عبارت ہے
نہیں نگینے یہ الفاظ آبگینے ہیں — حباب میں بھی نہیں اِن میں جو نزاکت ہے
وہ خالدہ جو ہیں ترکی کی زندہ اِک تاریخ — کچھ اپنی قوم سے اِس طرح اُن کو نسبت ہے
بلند فکر، مدبّر، وزیرِ با تدبیر — حیات جن کی اِک عالم کو درسِ حکمت ہے
وطن پرست و رضاکار و پیکرِ اخلاص — کہ جن کے صدق و وفا کی جہاں میں شہرت ہے
اگرچہ اُن کو تعلق ہے صنفِ نازک سے — کئے ہیں کام وہ مردوں کو جن پہ حیرت ہے
وہ قوم ترک مجسم ثبات و استقلال — ہے جس کے سینوں میں جرأت دلوں میں غیرت ہے
جو سر کو بیچ کے لیتی ہے مول آزادی — عزیز ایسی کچھ اِس کو متاعِ حرمت ہے
یہ ایسی قوم کا ہے اِک عزیز سرمایہ — یہ ایسی کان کا اِک لعلِ بیش قیمت ہے

زبانِ حضرتِ سجاد سے سنیں احباب — ادب میں قوم میں اپنی جو اُن کی عزت ہے
میں بے ہنر ہوں کہوں کیا زراہِ استقبال — زباں میں زور نہ میرے قلم میں طاقت ہے
زبانِ حضرتِ غالب سے ہاں مگر یہ کہوں — "وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!!"

نذر خالدہ

(یہ نظم خالدہ خانم صاحبہ کے استقبال کی تقریب میں مسلم یونیورسٹی میں پڑھی گئی تھی)

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج
نورِ عشرت سے منور یہ سیہ خانہ ہے آج
کیف صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہے آج
ہر شجر ساقی ہے اور ہر پھول پیمانہ ہے آج

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس صوم سے آئی نہ تھی

نرگسِ مخمور ہے لذت کشِ خوابِ نشاط
پھوٹ نکلا ہے گلِ دلسریں سے سیلابِ نشاط
اہلِ محفل کے لئے مشکل ہے اب تابِ نشاط
آج پیمانوں سے چھلکے گی مے نابِ نشاط

پر فشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جاں فزا
پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مضطرب رنگیں نوا
ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

ذکر جس بت کا مہ و پرویں کے کاشانے میں ہے
اللہ اللہ آج وہ اپنے صنم خانے میں ہے

خالدہ! تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پرتوِ حسنِ صداقت آشکار
تیرے جلووں کی لطافت سے فرشتے شرمسار

گل پشیماں، قلبِ بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمارِ کوثر و تسنیم ہے

اے مقدس حور اے پروردۂ موجِ نسیم
روحِ عشرت گاہ ساحل جانِ طوفانِ عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

ضعف دکھلایا کبھی گر فطرتِ احرار نے

آگ برسادی ہے تیرے نطقِ گوہر بار نے

رہ چکی ہے ہاتھ میں تیرے وہ تیغِ بے نیام — جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترکِ افتادہ کو تو نے ہی دیا اذنِ خرام — تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام

تو نے جو احساں کئے ہیں ملتِ احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر

ہاں بتادے ہم کو بھی اے روحِ اربابِ نیاز — کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز — چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز

تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ نعمت ہمارے دسترس سے دور ہے

محرمِ درد و مسرت رازدارِ صبح و شام — خامشی محفلِ فطرت ہے تجھ سے ہم کلام
تیری ہستی آسمانِ ترک کا ماہِ تمام — تو محبت ہر نفس تیرا محبت کا پیام

گلشنِ مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو
صبحِ روشن کا پیامِ جانفزا لائی ہے تو

قربتِ گل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ — چاند کی تنویر میں کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہے مے خواروں سے پوچھ — چارہ سازی میں مزا کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ

روح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں — فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خارزارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں — جادۂ منزل پہ گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں

درس ایسا دے کہ دل بیگانۂ منزل نہ ہو
فکرِ لاطائل نہ ہو اندیشۂ باطل نہ ہو

غزل

جو نظر ہے مُدّعا پرداز ہے
پھر بھی اپنا راز اپنا راز ہے

لطف میں اَب جور کا انداز ہے
مژدہ اے دِل ابتدائے ناز ہے

کچھ تو کہئے لَن ترانی ہی سہی
ذرّہ ذرّہ گوش بر آواز ہے

کاروانِ دِل بھی پیچھے رہ گیا
زندگی کِتنی سبک پرواز ہے

اللہ اللہ شورشِ ضبطِ سکوت
ہم زبانِ حالِ دل کا راز ہے

پرتوِ حُسنِ تبسم دیکھنا!
گلستاں دنیائے سوز و ساز ہے

دَرد کا انجام دیکھا چاہئے
ابتدا تو حشر کا آغاز ہے

کون اُٹھا چاہتا ہے بزم سے
رنگِ محفل مائلِ پرواز ہے

ذرّہ ذرّہ آئِنہ ہے حُسن کا
پھر بھی رازِ حُسن اَب تک راز ہے

گفتگو تک راز تھا ایمائے دل
اَب خموشی مُدّعا پرواز ہے

کوکبؔ اپنا رہنما ہی نورِ عشق
ہر شعاعِ دِل پرِ پرواز ہے

شذرات

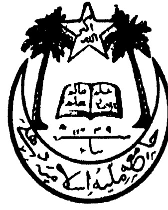
پچھلے پرچے میں ہم تصدق احمد خاں صاحب شروانی مرحوم کی اندوہناک خبر شائع کرچکے ہیں مرحوم کا ماتم سارے ملک میں ہوا۔ اور اب تک ہو رہا ہے۔ جامعہ ملیہ میں اس سانحے کے دوسرے دن تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا جس میں چھوٹے بڑے طلبا اور اساتذہ جمع ہوئے۔ کلام مجید کی تلاوت اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک موثر اور مختصر تقریر کی جس میں خاص طور پر چھوٹے بچوں سے خطاب تھا۔ مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کرکے جناب شیخ الجامعہ نے ان کے خلوص اور جوش، سادگی اور ایثار، حق گوئی اور حق پسندی، بے خوفی اور بہادری کے اوصاف کو نمونے کے طور پر پیش کرکے خدا سے دعا کی کہ جامعہ کے ہر فرد کو ان کی تقلید کی توفیق دے۔ اس کے بعد چھٹی کا اعلان فرمایا۔ اور طلبہ کو ہدایت کی کہ اپنی اقامت گاہوں میں جاکر قرآن مجید کی تلاوت کریں اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں۔

جامعہ کی عمارت کے لئے چندے کا کام شروع ہوگیا ہے تجویز یہ ہے کہ جناب شیخ الجامعہ اور شفیق الرحمن صاحب قدوائی ناظم حلقہ ہمدردان جامعہ۔ ۲۲ اپریل سے صوبہ متحدہ کا دورہ شروع کریں۔ سب سے پہلے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مراد آباد، بریلی، شاہجہاں پور کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد مشرقی اضلاع کی باری آئے گی، ہر ضلعے کے سربرآوردہ اصحاب سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ جس ضلعے میں جامعہ کا وفد جائے وہاں سے کم سے کم ایک ہزار یکمشت اور پچیس روپے ماہوار کی مدد ملے۔ اکثر مقامات سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس سے بہت زیادہ چندہ ہوجائے گا خدا کرے یہ امیدیں برآئیں اور یہ وعدے پورے ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ دہلی شہر جو جامعہ کا گھر ہے اپنی شان کے مطابق جامعہ کی مدد کر رہا ہے۔ یکم مارچ کے جلسے میں دہلی کی طرف سے پچاس ہزار کی مالیت کی جائداد اور اٹھارہ ہزار نقد کے وعدے ہوئے تھے وعدوں کی رقم وصول ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ کم سے کم بارہ ہزار روپے کی مزید امداد کا اہل دہلی نے ذمہ لیا ہے۔ جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں شہر کے تمام معزز تاجر اور محبان ملت شامل ہیں۔ یہ حضرات چندے کی وصولی کا انتظام خود کر رہے ہیں اور انھوں نے جامعہ کے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ آپ باہر کام کیجئے گھر کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔ جزاہم اللہ تعالےٰ۔ اگر ان باہمت اصحاب کی کوشش کامیاب ہوئی اور انشاءاللہ ضرور کامیاب ہوگی تو دہلی کا مجموعی چندہ (پچاس ہزار کی جائداد کو ملاکر) اسی ہزار سے زیادہ ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہندوستان کے دارالسلطنت اور سب سے بڑے اسلامی مرکز کی یہ شاندار مثال اور مقامات کے لوگوں میں بھی فیاضی، علم دوستی اور ملت اسلامی کی محبت اور خدمت کے جذبات کو بیدار کر دے گی، اور جامعہ کا وفد ہر شہر اور ہر قصبے میں کامیاب ہوگا۔

ہم نے جنوری کے پرچے میں رسالہ جامعہ کے قارئین کرام سے اپیل کیا تھا کہ عمارت کے فنڈ میں اپنے حلقے کی طرف سے کم سے کم ایک ہزار روپے کی امداد عطا فرمائیں۔ آج ہم پھر اس کی یاد دہانی کرتے ہیں جامعہ کا ہر شعبہ اس سعی میں سرگرم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس مبارک کام میں حصہ لے۔ رسالہ جامعہ نے آج تک کبھی چندے کا کوئی فنڈ نہیں کھولا، اور یہ چیز اس کے مقاصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن موقع ایسا ہے کہ ہم اس قسم کا اپیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قارئین جامعہ سے التجا ہے کہ جب رسالے کا چندہ بھیجیں تو اس کے ساتھ عمارت کے فنڈ کے لئے بھی تھوڑی بہت رقم روانہ فرمائیں یا جب ان کے شہر میں جامعہ کا وفد پہنچے۔ تو رسالۂ جامعہ کے اپیل کا حوالہ دے کر حسب توفیق چندہ عطا فرمائیں۔

رجسٹرڈ نمبر ال-۱۸۹۲



جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیرِ ادارت

ڈاکٹر سیّد عابد حسین - ایم - اے، پی ایچ - ڈی

قیمت سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

زیر طبع

مُندرجہ ذیل کتابیں زیرِ طبع ہیں۔ عنقریب شائع ہو جائیں گی۔ فوراً فرمائش بھیجیے، تاکہ دوسری اشاعت کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ فرمائش کے ساتھ پیشگی رقم بھیجنے والوں کو محصولڈاک معاف ہوگا بشرطیکہ فرمائش عاؔ سے کم کی نہ ہو۔

۱۔ خطباتِ خالدہ خانم (انگریزی) ۳ر

۲۔ " " (اُردو) مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب عاؔر

۳۔ انقلابِ فرانس مولوی عبد القادر صاحب بی اے (جامعہ) ۱۲ر

۴۔ انجام (ڈراما) پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) ۸ر

۵۔ کِسان: اُس کے افلاس کے وجوہ اور اُن کا علاج ۸ر

۶۔ دو خدائی خدمت گار ڈاکٹر خان اور خان عبد الغفار خاں کے حالاتِ زندگی ۱۲ر

پیامِ تعلیم

طلبہ کے لئے "پیامِ تعلیم" سے زیادہ مفید اُردو کا کوئی رسالہ نہیں۔ رسالہ کیا ایک شفیق اُستاد ہے۔ جغرافیہ، تاریخ، سائنس کے مضامین اور اخلاقی پند و نصائح، کہانیوں، نظموں، معموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ جماعت میں جن مضامین سے لڑکے جی چُراتے ہیں ان کو پیامِ تعلیم میں خوشی سے پڑھتے ہیں۔

"پیامِ تعلیم" اپنے بچوں کے نام کسی اچھے کام کے انعام میں جاری کرائیے۔ عید کے موقع پر یا اُن کی سالگرہ کی تقریب میں اُنھیں دیجئے تو سال بھر وہ آپ کے ممنون رہیں گے۔

چندہ سالانہ عاؔر

مکتبہ جامعہ دہلی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ | اپریل سنہ ۱۹۳۵ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اُردو مثلاً مرزا غالبؔ خواجہ حالیؔ، علامہ شبلی۔ مولانا آزاد۔ مولانا شررؔ علامہ اقبال۔ منشی پریم چند اور اُردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، اعظم گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں شائقین فہرست طلب فرماکر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں۔

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہوسکتا ہے بشرطیکہ

(الف) فرمائش مبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔

(ب) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش مبلغ (صہ) سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی پہنچ جائے محصول ڈاک معاف کیا جائے گا۔ البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں یہ ممکن نہ ہوگا۔

ہندوستان کا تعلیمی نصب العین

(فلسفہ تاریخ و تمدن کی روشنی میں)

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کا تعلیمی نصب العین اس کے تمدن کی تاریخی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کریں ہمیں تعلیم کے متعلق مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دینا چاہیے۔

تعلیم انسان کی فطری قوتوں اور خارجی اثرات کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے وہ نتیجہ سے داخلی اور خارجی دنیا، من تو انسان اور کائنات کے باہمی تاثرات کا انسان کی فطری قوتیں دو قسم کی ہیں۔

۱۔ حیاتی مثلاً ناک، کان، آنکھ ہاتھ، پیر وغیرہ۔ غرض انسان کا پورا جسم۔

۲۔ نفسی جس میں انسان کی تمام ذہنی اور عقلی، معاشی اور سیاسی، جمالی اور اجتماعی، اخلاقی اور مذہبی قوتیں اور اس کے جذبات اور احساسات وغیرہ شامل ہیں

حیاتی اور نفسی قوتیں تعلیمی عمل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ موجود ہوں تو تعلیمی عمل وجود ہی میں نہیں آسکتا۔ اس بنا پر علم النفس سے واقفیت تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان کی بنیادی قوتیں ان کی ترقی و تنزل کے اسباب۔ ان کے باہمی تاثرات کے قوانین۔ ان کی نفسی نشو ونما کی مختلف اہمیت وغیرہ کا صحیح علم حاصل کرسکیں۔ روسو اور پیسٹالوزی کا پیدا کردہ خیال اب ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا

جہاں انسان ان قوتوں کے ذریعے خارجی دنیا کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یعنی اُن کو اپنے نفسی قویٰ کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہاں خارجی قوتیں بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

ان خارجی قوتوں پر ہم تین مختلف عنوانوں کے تحت میں غور کریں گے یعنی

۱۔ تمام کائنات بحیثیت مجموعی۔

۲۔ انسانی تمدن

۳۔ اور ان دونوں کے تحت میں مرتب کردہ ایک مخصوص نظام تعلیم

۱۔ کائنات بحیثیت مجموعی انسانیت کی تعلیم و تربیت میں مصروف عمل رہتی ہے۔ کائنات کا ہر فعل انسانی نفس پر اثر پذیر ہوتا ہے۔ جس سے انسان اپنے آپ کو مطلق آزاد نہیں کرسکتا۔ سیاروں کی گردش، چاند کی چمک آفتاب کا طلوع وغروب۔ زمین کی حرارت و برودت، موسموں کی تبدیلی، فصلوں کی نشوونما، غرض فطرت کی ہر نیرنگی اور ہر تغیر انسان کے جسم اور نفس پر اثر ڈالتا ہے۔

انسانی نفس اُن تاثرات کو ساکت وجامد قبول نہیں کرلیا کرتا بلکہ انھیں اپنے تخلیقی عمل کے تحت میں لاتا ہے۔ اسی لئے مختلف نفوس پر نوعیں فطرت کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں عقلیت پسند طبیعتیں فطرت میں عقل کی کار فرمائی دیکھتی ہیں۔ اور وہ علت ومعلول کا میکانکی سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ثبوتیت صرف تجربے پر اکتفا کرتی ہے اور کسی نفس سے جو خود بھی آزادانہ عمل کرسکے انکار کرتی ہے۔ بخلاف اس کے عینیت تمام فطرت میں صرف مدرک کا جلوہ دیکھتی ہے اور مدرک یعنی خارجی دنیا کو ایک حقیر اور فانی چیز سمجھتی ہے۔

تصور کائنات صرف افراد ہی کا نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اقوام کا بھی ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر قوم کے تمام تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ چیز کسی قوم کے مختلف تمدن کے عناصر میں ایک وحدت اور یگانگت پیدا کرتی ہے۔ وہ تمام قوم کی ذہنی زندگی میں ایک سر رشتہ کا کام دیتی ہے۔ یہ چیز اگر کسی قوم سے جدا کردی جائے تو وہ اس قافلے کی طرح ہوجاتی ہے جس کا کوئی منزل مقصود نہ ہو اور جو صحرا میں آوارہ پھر رہا ہو اور بالآخر اپنی بے راہ روی کے باعث صحرا کے ہلاکت آفریں جھونکوں سے تباہ وبرباد ہوجائے۔

موجودہ جرمن قوم کے تمام ایوان تمدن کی بنیادیں جرمن عینیت پہ استوار ہیں۔ ان کے شعرا ان کے فلاسفہ، ان کے داعیان مذہب باوجود گوناگوں اختلافات کے اس مرکزی چیز پر متفق ہیں۔ اسی طرح اہل یونان وروما، اہل چین وجاپان، اہل عرب و ہند کا ایک مخصوص تصور کائنات رہا ہے۔ جب تک اس تصور میں اتحاد رہا وہ اقوام اپنا ایک مستقل وجود قائم رکھ سکیں۔ لیکن جوں ہی کہ یہ سلسلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا

نہ انتشار و ذلت کے گڑھوں میں جاگریں۔

فطرت کی نیرنگیاں چونکہ مختلف افراد اور اقوام پر مختلف اثرات مترتب کرتی ہیں اس لئے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں یہ تصور کائنات بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دوسری خارجی قوت جو انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیتی ہے وہ انسانی تمدن ہے۔ اس قوت سے انسان مقابلتہً کسی قدر آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کلیتاً نہیں تمدن انسان کے مختلف نفسی قویٰ کے خارجی دنیا میں اظہار کے باعث پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ خود انسانی نفس پر اثر ڈالتا ہے اور اس کی تشکیل میں ممد یا مزاحم ہوتا ہے۔ انسان کے تمام سیاسی، اجتماعی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی نظامات اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ یہ قوتیں انسان میں موجود ہیں۔ انہیں داخلی قوتوں نے ان نظاموں میں خارجی صورت اختیار کرلی ہے جیسے بت۔ نازک و لطیف اشعار، رنگ برنگ کی تصاویر۔ عالی شان عمارتیں، روح پرور موسیقی کہاں ہوتی اگر انسان کا جمالی احساس مختلف طریقوں سے خارجی جلوہ اختیار نہ کرلیتا۔

یہ تمدن کا ورثہ انسان کی تعلیم میں مواد کا کام دیتا ہے جس کے ذریعے انسانی قوتوں کی نشو و نما ہوتی ہے۔ جس طرح تصور کائنات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے تمدن بھی۔ بعض اقوام پر جمالیاتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ تو بعض پر اخلاقی، بعض پر معاشی اور سیاسی تو بعض پر مذہبی۔ اسی لئے دنیا میں تمدنوں کا یہ تنوع ہے۔ یونانی اور اہل ایران ایک جمالیاتی تمدن کے حامل تھے تو انگلستان اور اہل روم ایک سیاسی تمدن کے چینی ایک اخلاقی تمدن کے علمبردار ہیں تو اہل ہند کا مجموعاً ایک مذہبی تمدن ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے عناصر مطلقاً کسی تمدن میں موجود نہیں ہوتے بلکہ اس کا صرف اس قدر مفہوم ہے کہ ایک عنصر دوسرے عناصر پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانی اپنی ہر معاشی، سیاسی اور اجمالی چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اہل یونان اپنی ہر چیز کو حتیٰ کہ مذہب کو بھی ایک جمالی نقطۂ نظر سے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا بھی ایک مذہبی فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل یونان کا خدا کا تخیل بھی ایک متناسب ہم آہنگ اور حسین وجود کا تھا

غرض مختلف قومی خصائص کی بنا پر مختلف تمدن ہوتے ہیں اور انھیں کے سایے میں اس قوم کی تعلیم و تربیت ہونی چاہیئے۔ اگر اس کے خلاف کہا جائے تو اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم آم کا درخت سائبریا کے

برفانی چٹانوں میں اگانا چاہیں جس کے لئے وہ محض ناساز گار ہیں۔

لیکن کسی قوم کا موجودہ تمدن صرف تاریخِ ماضی کا ورثہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ حال کی تمام تحریکوں اور مستقبل کی تمام امیدوں سے متاثر ہوتا ہے

۳۔ کسی قوم کے تصورِ کائنات اور تمدن کی بنیادوں پر اس کا تعلیمی نصب العین تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ نصب العین اب اپنے لئے ایک محدود دائرہ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں وہ اپنی تشکیل چاہتا ہے۔ یہ تعلیمی نصب العین اب بلاواسطہ تعلیمی اداروں کے ذریعے جو نظامِ تعلیم کا اہم جز ہیں کسی قوم کی موجودہ بچوں کی جسمانی اور نفسی تربیت اس کے تمدن کے سلسلے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ بعد میں تمدنی زندگی میں حصہ لے سکیں۔ اس کو ترقی کے منازل پر پہنچا سکیں اور اپنے لئے ایک تصورِ کائنات بنا سکیں۔

یہ ہے ہمارے نزدیک تعلیم کا مقصد جو ساکت وجامد طور پر تاثرات کا قبول کر لینا، معلومات کا فراہم کر لینا نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی فعل ہے۔ اور جو اپنی تخلیق کے لئے خارجی اشیا میں مواد تلاش کرتا ہے۔

اس اصولی بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہم ہندوستان کے بچوں کی تعلیم ان کے اپنے تصورِ کائنات اور قومی تمدن کی بنا پر کرنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان تمام مفید تحریکات سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتے جو ان کے تعلیم و تمدن پر اثر انداز ہوتی ہیں قبل اس کے کہ ہم اس تعلیمی نصب العین کا صاف صاف تعین کریں ہم کو تلاش کرنا چاہئے کہ وہ کون سے تصورِ کائنات ہیں جن پر ہمارے ہندوستانی تمدن کی بنیاد استادہ ہے ہمارے تمدن کے کیا عناصر ہیں، ان کے اوپر کون سا رنگ غالب ہے اس تمدن کے کون سے عناصر بحیثیت مجموعی انسانیت کے ارتقا میں مضر اور مفید ہیں۔

ہندوستان میں چند زبردست قوتیں کارفرما ہیں۔ جو ہندوستان کے تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں اس کا تعلیمی نصب العین متعین کریں گی۔ ان قوتوں کا تاریخی روشنی میں ہم مطالعہ کریں گے۔ ان کے مخصوص خصائص کا ہم ذکر کریں گے۔ ان کے متضاد عناصر کو دیکھیں گے اور ہم اپنے عصر کے لئے ایک تمدن اور تعلیمی نصب العین متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری یہ کوشش اس عقیدے پر مبنی ہے کہ جس طرح ہر قوم کا ایک علیحدہ تمدنی نصب العین ہوتا ہے

اسی طرح ہر عصر کا بھی ایک علیحدہ تمدنی اور تعلیمی نصب العین ہوتا ہے ۔ یہ نصب العین نتیجہ ہوتا ہے ماضی کی روایات حال کی ضروریات اور مستقبل کی امیدوں کا ۔

ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں جو آریاؤں کا تعلیمی نصب العین تھا وہ اب ہمارے لئے کافی نہیں ہے چونکہ وہ نتیجہ تھا حال ضروریات اور مخصوص تخیلات کا ۔ عہد عباسیہ کا تعلیمی نصب العین بھی جو درس نظامی کی شکل میں اب تک ہمارے یہاں موجود ہے ہمارے لئے مفید نہیں ہے ۔ اس وقت ایک خاص طرز کی اسلامی حکومت قائم تھی اور اسلامی علوم اور یونانی علوم و فنون کا امتزاج ہو رہا تھا ۔ یونانی علوم و فنون بہت کچھ غلط ثابت ہو چلے ہیں اور ہم انھیں فرسودہ بنیادوں پر اپنے نظام تعلیم کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ۔

یورپ پر اٹھارویں صدی عیسوی میں عقلیت چھائی ہوئی تھی ۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ ہر مسئلہ کا حل عقل کے ذریعے ڈھونڈا جاتا تھا ۔ اور یقین کیا جاتا تھا کہ عقل تمام عقدہ ہائے کائنات کو سلجھا سکتی ہے ۔ مذہب عقلی استدلال کا نتیجہ تھا ۔ اس بنا پر وہاں کا تمدنی اور اس کے ساتھ تعلیمی نصب العین عقلیت پر رکھا گیا اور صرف عقل کی نشوونما تعلیمی اداروں کا مقصد قرار پایا ۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس دور کی بجائے ایک نامی دور ظہور پذیر ہوا اب صرف عقل کی نشوونما پر بھی زور دیا جانے لگا مختلف صورتوں میں یہ خیال اب تک قائم ہے اس لئے وہی تعلیمی نصب العین گو کہ اس میں بہت کچھ تغیر اور گہرائی پیدا ہوئی چلا جا رہا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں خاص تحریکیں زور پکڑ جاتی ہیں اور انسانی نفس کے خاص عناصر کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کبھی شعوری عناصر کا تو کبھی غیر شعوری کا یعنی کبھی عقل کا تو کبھی مذہب کا ، کبھی اجتماعیت کا ۔ تو کبھی انفرادیت کا ۔ بقول ہیگل ہر اثبات ایک نفی پیدا کرتا ہے ۔ جو خود بخود امتزاج ڈھونڈھتی ہے ۔ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے ۔ بہرصورت فلسفۂ تاریخ اب تک اس کتھی کو کماحقہٗ سلجھانے سے عاجز ہے ۔ انھیں تحریکات کے باعث جہاں تمدنی نصب العین تبدیل ہوتا ہے وہاں تعلیمی بھی ۔

جس طرح دنیا ہر لحظہ تغیر پذیر ہے نظامات تعلیم بھی ۔ اگر کوئی چیز نامی اور زندہ ہے تو یہ ضرور ہوگا ۔ ہمیں سکون اور استقلال کی اس طرح تلاش نہ کرنی چاہیئے ۔ تاہم ایک عرصے کے لئے عام بنیادی خیالات زندگی کے لئے کافی ہوتے ہیں اور انھیں کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیئے ۔

اوپر کہا جاچکا ہے کہ تعلیم کا مقصد انسانی جسم و نفس کا کلی نشوونما ہے۔ ہر وہ تحریک یا اس تحریک کے عناصر جو اس نشوونما میں مدد پہنچائیں تعلیم کے لئے مفید ہیں اور باقی مضر۔ ہر زمانے کی تحریکات سے ہم کو تعلیم کے لئے تعمیری اجزا کو لے لینا چاہیے اور تخریبی کو علیحدہ کر دینا چاہیئے۔

جس طرح ہر اعلیٰ نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص تصورکائنات اور ایک مخصوص تمدن کا تخیل پیش نظر رکھے اس طرح ہر بڑی تحریک کا جو زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے ایک مخصوص نظام تعلیم بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تصور کے مطابق انسانیت کی اسی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی موجودہ عظیم الشان تحریکوں سے ان کے تعلیمی عناصر اور اس کی تعلیمی تحریکوں میں سے اس کے تصورکائنات پیدا کرکے دکھانا ہے تاکہ ہم ایک مشترک ہندوستان کے تعلیمی نصب العین مرتب کر سکیں۔

ہندوستان میں اس وقت چار زبردست تحریکیں جاری ہیں یا بالفاظ دیگر چار اہم قوتیں ہیں جو ہمارے لئے تعلیمی عنصر کا کام دے سکتی ہیں۔ یعنی

۱. ہندویت

۲. اسلام

۳. قومیت اور

۴. انسانیت

ہمیں ان چاروں تحریکوں میں تلاش کرنا ہے کہ ان کے کون سے عناصر شخصیت کے ارتقا میں مفید ہیں اور کون سے مضر

۱. ہندویت۔ ہندویت ہندوستان میں سب سے زیادہ اب تک حاوی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی ہے۔ ہمیں اس وقت اس ہندویت سے بحث نہیں ہے جو وہ گذشتہ زمانے میں رہ چکی ہے بلکہ ہم اسے موجودہ ہندوستان کے ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہندویت کی توضیح کرنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ کوئی خاص مذہب نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سے مذاہب شامل ہیں۔ توحید سے لے کر سینکڑوں بتوں کی پرستش اس میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اس میں نہایت

اعلیٰ فلسفیانہ نظام ہیں وہاں اس میں نہایت لغو قسم کی رسوم بھی شامل ہیں جو فطرت کی توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ اس کی ابتدا آریاؤں نے کی تھی جو فاتحانہ طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جنھوں نے نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ اپنے مذہب کو بھی جو فطرت کی پرستش پر مبنی تھا یہاں رائج کر دیا۔ لیکن خود ان کا مذہب بھی مفتوحین کے عقائد سے اثر قبول کئے بغیر نہ بچ سکا۔ باوجود اس تاثر کے پھر بھی ہندو مذہب جس کو آریا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے ایک اشرافیت مذہب رہا جس نے اپنا سر رشتہ ہمیشہ راجاؤں سے قائم رکھا اس نے اپنی یہ مذہبی اور نسلی اشرافیت اور ذات پات کی قیود برہمنوں کے علیحدہ طبقے کے قیام کی غرض سے قائم رکھیں۔

مابعد الطبیعاتی مسائل سے ہندو قوم کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور ان کے فلسفیانہ نظام عقل کی کوششوں کے بہترین ثمرے ہیں۔ باوجود اس فلسفیانہ شغف کے مذہب ان کی فطرت کا جز رہا۔ وہ مذہب جو عقلیات پر مبنی اور بہت کچھ مابعد الطبیعاتی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔

ان خصائص کے جہاں اچھے نتائج مرتب ہوئے۔ وہاں بہت کچھ مضر بھی۔ مثلاً نسلی، علمی اور مذہبی تفوق کے جذبے نے عوام کو اونچے لوگوں کے طبقے سے بالکل بیگانہ کر دیا۔ اور ذات پات کی تفریق نے جو شروع میں معاشی ضروریات پر مبنی تھی منو کے قوانین کے مطابق ایک مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بدھ مت کی تحریک ایک اعلان بغاوت تھی اشرافیت کے خلاف مگر وہ خود فنا ہو گئی اور اس کے پائدار اثرات نہ رہ سکے۔ بدھ مذہب کی اخلاقی جمہوریت کی بجائے دوبارہ شنکراچاریہ کے فلسفے نے اپنا اثر جما لیا جو اشرافیت کی حمایت میں تھا۔

بدھ مت کے بعد دو تحریکوں کے اثرات ہندویت پر کسی قدر پائدار مترتب ہو سکے یعنی اسلام اور عیسائیت۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندویت کے لاشے میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ وہ قوم جو تمام دنیا سے الگ تھلگ گوشہ نشینی میں زندگی گذار رہی تھی پھر ذہنی غور و فکر کی طرف متوجہ ہوئی توحید کے دھندلے سے خیالات ہندو مت میں مفقود نہ تھے۔ لیکن پہلے وہاں اس خیال نے ایک ہمہ اوست کے عقیدے کی شکل اختیار کر لی تھی ہندو دھرم یا بھگتی کی تحریک جو عقیدۂ توحید پر مبنی ہے اسلام کی مرہون منت ہے۔ اس کے بعد پھر تو بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں جو توحید کے عقیدے پر ہندو مت اور اسلام کو ایک کرنا چاہتی تھیں مثلاً گرو نانک

اور کبیر کی تعلیمات اور جدید زمانے میں رام موہن رائے کی تحریک برہمو سماج کا قیام۔ برہمو سماج پر جس قدر اسلام کے اثرات مترتب ہوئے اسی قدر عیسائیت کے بھی۔ آریہ سماج کی تحریک ہندو دھرم کو دوبارہ اس کی اصلی قدیم حالت میں دیکھنا چاہتی۔ وہ اسلام کے خلاف جس کو وہ خارجی عنصر سمجھتی ہے پیدا ہوئی مگر اپنے احیا کے لئے اس نے اسلام کا نمونہ اپنے سامنے رکھا۔ مثلاً ایک پرمیشور کا تخیل چاہے وہ حقیقی توحید سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ ایک کتاب اور ایک دھرم جو بغیر ذات پات کے ہو قائم کرنے کی کوشش۔

نہ صرف اسلام کا ہندویت کے مذہبی تصورات پر بلکہ بحیثیت مجموعی اس کے تمام تمدن زندگی پر اثر پڑا۔ اسلام کے بعد سب سے زیادہ اثر اس پر مغربیت کا پڑا۔ مغربیت کے دو اہم عناصر تھے۔ ایک عیسائیت دوم وہ تمدن جس نے وطنیت کے تخیل کے زیر سایہ نشو و نما پائی۔ عیسائیت کا اثر اس قدر زیادہ نہیں پڑا۔ جس قدر کہ وطنیت کا۔ اس تخیل کے تحت میں ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو ہندوستان کو مغربی وطنیت کے رنگ میں رنگ دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر کے صرف مستقبل کی طرف دیکھنا چاہتا ہے اور مستقبل کی کامیابی اس کے نزدیک مغرب کی تقلید میں مضمر تھی۔ گو سطحی خیال کا اثر بہت جلدی کم ہو گیا اس کے بعد ایک ایسے خیال نے ہمہ گیر رنگ اختیار کر لیا جو وطنیت کا قائل ہے۔ اس کو اپنے ماضی کی روایات پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو ہندو دھرم اور تہذیب کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ مگر وہ ہندویت جو وطنیت کے تخیل میں مد ہو۔ جس کی وطنیت کے قصر کی تعمیر میں بنیاد کا کام دیں۔ ٹیگور اور گاندھی کے یہی بنیادی خیالات ہیں۔ گو کہ دونوں میں جزوی اختلافات موجود ہیں۔ ٹیگور کی نظریں زیادہ تر مستقبل کی طرف اٹھتی ہیں بہ خلاف گاندھی کے جو بہت حد تک عہد ماضی کو زندہ کرنے کے درپے ہیں۔ ٹیگور ہندوستان کے تمدنی نصب العین کو حال کی تحریکوں سے زیادہ متاثر کرنا چاہتا ہے۔ مگر گاندھی کے نزدیک ہندویت اصلی مطمح نظر اور انسانیت کا تخیل ایک ہی چیز ہے۔

اس مختصر سی تاریخی نظر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ہم ہندویت کو ایک مرکب گوناگوں تحریکوں کا سمجھتے ہیں۔ جس میں کئی ہزار برس کے تاریخی اثرات بھی شامل ہیں اور جدید تحریکات بھی۔ اس میں تعمیری عناصر بھی ہیں اور تخریبی بھی۔

وہ تحریک جو ہندویت کو بعینہٖ آج سے ہزاروں برس پہلے کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے اس بنا پر غلط ہے کہ وہ حال اور مستقبل کی قوتوں سے بیگانہ ہو جانا چاہتی ہے۔ وہ تحریک جو بلا کسی وطنی اور قومی امتیاز کے ایک عام سطحی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس بنا پر غلط ہے کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر دینا چاہتی ہے۔ اور اس تمام تمدن کے قصر کو جو صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہے اور جو ہندوستان کے خاص خصائص کا مظہر ہے برباد کر دینا چاہتی ہے۔

اول الذکر تحریک کے باعث بحیثیت مجموعی انسانیت کے نشو و نما سے ہم محروم ہو جاتے ہیں دوسری تحریک کے باعث ہندو نفس کو اپنے مخصوص اور امتیازی کیفیات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملتا جو انسانیت کے لئے اسی قدر ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک تیسری صورت جو دونوں کے امتزاج پر مبنی ہو صحیح ہو سکتی ہے یعنی ایک ایسا وطنیت کا تخیل جو ہندویت کے ان بہترین اخلاقی اور بحیثیت مجموعی ان تمام اعلیٰ تمدنی روایات پر مبنی ہو جو ہندوستان میں ایک قومیت کے قیام میں مدد ہو سکیں صرف یہی تحریکیں ہمارے موجودہ نصب العین میں ایک زبردست عنصر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔ اسلام :۔ دوسرا اہم عنصر ہندوستان کے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں اسلام ہے۔ وہ اسلام جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں چودہ سو برس کی تاریخ کا۔ دنیا کی ہر تحریک کی طرح اسلام بھی بہت سی تحریکوں سے متاثر ہوا اور مختلف ممالک میں مختلف تحریکوں سے امتزاج کے باعث اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔

اسلام بغاوت ہے بت پرستی اور شرک کے خلاف۔ اس نے صرف ایک خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی اور اس کی مابعد الطبیعاتی تشریحات سے منع کر دیا تھا۔ وہ اخلاقیات کا ایک صاف اور سادہ نظام تھا اور اس کے احکامات کی بنیادیں جمہوریت پر رکھی گئی تھیں۔ یہ اس مذہب کی بنیادیں، ایمان و ایقان، عمل و جد و جہد پر رکھی گئی تھیں۔ فلسفیانہ غور و فکر اور گوشہ نشینی پر نہیں لیکن جونہی کہ اس دین کو ان اقوام نے قبول کیا جن کی سرشت میں فلسفیانہ غور فکر تھا جن کو فطرت

نے ما فوق الطبیعی مسائل پر غور کرنے کے لئے پیدا کیا تھا جن میں مذہبی عنصر کی بجائے عقلی عنصر غالب تھا اسلام میں بھی یہ عناصر شامل ہوگئے۔ ایک طرف یونانی علوم و فنون کے اثر سے عہد عباسیہ میں فلسفیانہ غور و فکر اسلام میں داخل ہوگیا۔ اب صرف خدا پر یقین کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ماہیت اور اس کی صفت کا بھی پتہ چلانا۔ ارسطو کے فلسفے سے جس کو مسلمان غلط سمجھے۔ اسلام میں عقلیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اسلامی علم الکلام کا مقصد عقلی دلائل سے اسلامی احکامات کی حمایت کرنی تھی، اخوان الصفا کی تحریک اس سے بھی زیادہ عقلیت پر مبنی تھی، جن کے نزدیک تمام مذہبی احکامات کے لئے عقل معیار صداقت تھی۔

دوسری نوفلاطونی، ایرانی اور ہندی اثر سے تصوف نے بھی اسلام میں ایک مکمل نظام کی صورت اختیار کرلی۔ قرآن کی تعلیمات میں جس طرح عقلیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے بھی۔ جہاں شعوری طور پر عقلی قوانین کی بنا پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں لاشعوری طور پر کائنات کو محسوس کرنے کا خیال بھی موجود ہے۔ بنیادی خیال سب میں مسئلہ توحید تھا۔ ایک خدائے واحد کا یقین۔ یعنی تمام کائنات کے لئے ایک واحد مقصد اور نصب العین کا خیال۔ چاہے اس کی مابعد الطبیعاتی تشریح انسانی عقل اور روشنی کے مطابق کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی فلسفیانہ تشریح ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی پر منحصر ہے جن کی بنیادوں پر فلسفہ ایک تصور کائنات قائم کرتا ہے۔ جس قدر کہ علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اس تصور میں وسعت اور جامعیت پیدا ہوجاتی ہے بقول کانٹ عقل کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی کی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھے، اور جب تک انسان میں حس موجود ہے وہ اپنی کاوشوں سے باز نہیں آسکتا۔ اسی لئے انسان ہمیشہ اپنی ذہنی تسکین کے لئے فلسفیانہ نظامات بناتا رہا ہے اور بناتا رہے گا۔

اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا عملی نمونہ یعنی رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیتا رہا۔ نہایت متضاد مابعد الطبیعاتی خیالات رکھنے والے ائمہ اسلام مثلاً ابن رشد جو عقلیت پسند تھے اور فلسفۂ ارسطو کے متبع اور امام غزالی جنھوں نے

اسلام کی بنیاد اسی تصوف پر استوار کی ہے امام حنبل جنھیں قرآن کے ظاہری اور لفظی معنی پر ایمان لانے میں حد درجہ غلو تھا حتیٰ کہ خدا کی جسمانیت تک کے قائل تھے اور اخوان الصفا جو عقلیت پسند تھے اور بہت زیادہ تاویل کے قائل تھے۔ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع پر متفق ہیں۔

ہندوستان میں اسلام عقلیت کی تحریکوں سے زیادہ تصوف سے متاثر ہوا۔ جہاں کروڑوں ہندوستان کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں انھوں نے اپنے خیالات بھی اس میں شامل کر لئے۔ اسلام میں بھی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو دونوں مذاہب کو یک جا کرنا چاہتی تھیں جس میں خاص طور پر دکن میں ست نپتھیوں کی تحریک ہے۔ لیکن مذہبی اعتبار سے ہندویت نے اسلام پر بہت ہی تھوڑا اثر کیا۔ بخلاف اس کے ہندویت خود اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ البتہ تمدنی اعتبار سے مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر کافی پڑا ہے۔ شعر و شاعری۔ موسیقی رسم و رواج غرضکہ ہر جگہ اسلام پر ہندویت کا اثر نظر آتا ہے

دوسرا اثر مسلمانان ہند پر اہل مغرب کا ہوا۔ اس تصادم سے مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا ہوا شروع میں تو یہ خیال سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اسلام کو اس کے چودہ سو برس پہلے کے رنگ میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خیال مسلمانوں نے اہل مغرب سے لیا ہے کیونکہ رسول اللہ نے خود ایک عرب قوم کی تعمیر کی تھی مگر اس عہد جدید میں جو چیز حرکت کا باعث ہوئی۔ وہ یقیناً طوفان مغرب ہے۔ سرسید اور ان کے معاون اس خیال کے بانی مبانی ہیں۔ اور اس تحریک کو عموماً علیگڈھ کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں اس کی ترجمانی کی گئی اور بحیثیت مجموعی یہ خیال اب تک مسلمانوں پر حاوی ہے۔

قومیت اور وطنیت کا دوسرا مفہوم یعنی یہ کہ اہل مغرب کی اندھی تقلید کی جائے خوش قسمتی سے مسلمانانِ ہند میں تقریباً کوئی جگہ نہ پا سکا۔ چاہے یہ خیال دوسرے ممالک اسلامیہ پر کتنا ہی مسلط کیوں نہ ہو گیا ہو اس معاملے میں مسلمانان ہند ہندوؤں سے زیادہ صحیح اصولوں پر قائم رہے

تیسرا خیال جو مسلمانان ہند میں پیدا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور روایات پر

قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قوم کی تشکیل میں ممد ہوں ۔ ماضی کو ہم بھلا نہ دیں لیکن مستقبل کی طرف سے چشم پوشی بھی نہ کی جائے ۔

ایک ادارے کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان خیالات کی حامی ہے جس کی تشکیل میں مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں ، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام کا ہاتھ شامل ہے ۔ اور جس کی باگ اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو زمانے کی صحیح ضروریات کا احساس رکھتے ہوئے مسلمانوں کے بہترین رہبر ہیں ۔

غرض وہ اسلام جس کو ہم اپنے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کا اہم جزو سمجھتے ہیں نتیجہ ہے بہت سے تاریخی اثرات کا ۔ گوکہ بنیادی اصول وہی ہیں جو رسول اللہ نے بہ حکم وحی قائم فرمائے تھے ۔

ہمارا نصب العین ہو کہ اسلام اور سب سے زیادہ شخصیت کی نشوونما میں مدد پہنچا سکتا ہو اور اس چیز کی اجتماعی شکل یعنی قومیت کے قیام میں بھی ایک مخصوص قوم کو اس کے مخصوص ماحول کے مطابق نشوونما دیتا ہو ۔

۴ ۔ قومیت : ۔ ہم نے اب تک قومیت کا ضمناً ہندویت اور اسلام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے لیکن اب ہم اس پر ایک مستقل تمدنی تحریک کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں اس کا کس قدر گہرا اثر ہے ۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل کچھ نیا نہیں ہے ۔ عہد قدیم سے ہندوستان کے شعرا فلاسفہ اور شہنشاہ اس کے خواب دیکھتے آئے ہیں ۔ جس میں کبیر ، نانک اور اکبر اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ لیکن جدید زمانے میں جس چیز نے اسے قوت دی وہ مغربی اقوام سے تصادم تھا خاص طور پر انگریزوں سے ۔ ہندوستان میں قومیت کے قیام کے لئے ضروری عناصر میں سے بعض موجود تھے اور بعض مفقود ۔ ان سے بعض ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کی قومیت کے لئے مفید تھیں ۔ مگر اس کے ساتھ بعض ایسی بھی وجود میں آئیں جو مضر تھیں

نسل ، مذہب ، زبان ، تاریخ ، معاشی اور سیاسی مفاد ۔ اور سب سے آخر مگر سب سے اہم تر

باہم متحد ہونے کا جذبہ عموماً قومیت کی تعمیر میں اہم عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف تحریکوں نے مختلف عناصر پر زور دیا۔ چنانچہ مختلف قسم کی تحریکات پیدا ہوئیں جن کا ہم اجمالاً ذکر کر چکے ہیں۔ وہ تحریکیں یہ ہیں

۱۔ قومیت کی وہ تحریک جو بعض مغربی اقوام کی تقلید میں صرف معاشی اور سیاسی مفاد کو قومیت کی بنیاد قرار دینا چاہتی ہے۔

۲۔ قومیت کی وہ تحریک جو اپنی بنیاد صرف تاریخ ماضی پر رکھنا چاہتی ہے۔

۳۔ قومیت کی وہ تحریک جو مستقبل کے مقاصد کو پورا تو کرنا چاہتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ گذشتہ تاریخ کی ان روایات کو لے لینا چاہتی ہے جو صحیح قومیت کی تعمیر میں ممد ہوں۔

ان مختلف تحریکوں کے اثر سے مختلف تعلیمی نصب العین اور ہر نصب العین کے تحت میں الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج دینے میں اس سے زیادہ کچھ مقصد نہ تھا۔ کہ وہ اپنی حکومت کے مشین کے لئے پرزے بہم پہنچائیں۔ لیکن اس انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستانی نوجوان مغربی علوم و فنون سے واقف ہو گئے اور ان میں مغربی انداز پر ہندوستان میں ایک قوم پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انگریزی نظام تعلیم کے تخریبی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف تعمیری پہلو پر نظر ڈالی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ہندوستان میں مغربی وضع کی قومیت کا قیام چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے سرسید کی کوششوں کے باعث رواج پایا۔ سرسید کے پیش نظر تقریباً ایک صحیح تعلیمی نصب العین تھا جو مذہب اور مغربی علوم کے صحیح امتزاج پر مبنی تھا۔ مگر نہ وہ نہ اوران کے بعد آنے والے زمانے کی رو کا مقابلہ کر سکے اور مسلمانوں کی تعلیم بھی صرف اس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم کی اندھی تقلید ہو کر رہ گئی۔

دوم قومیت کی وہ تحریک جو ماضی پر اپنی بنیادیں رکھنا چاہتی ہے اس نظام تعلیم کا باعث ہوئی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اور بڑھا دیا۔ حقیقتاً اس تحریک کو ہم ہندوستانی قومیت کی تحریک کہہ نہیں سکتے۔ مگر لفظ قوم کا ہمارے یہاں استعمال بہت مختلف فیہ ہے اور اب تک یہ لفظ اس معنی کے لئے مخصوص نہیں ہوا ہے جس میں ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قومیت کے عناصر سمجھے جائیں۔

ہندوؤں میں آریہ سماجیوں نے آریہ ورت کے پرانے نظام تعلیم کو زندہ کیا، اور مسلمانوں نے اس نظام تعلیم کا دوبارہ احیا کیا جو ان کے مخصوص تمدن کی پیداوار تھا اور ان کے مخصوص مذہبی ضروریات کو پورا کرتا تھا اس تحریک کو ہم عموماً دیو بندی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ متضاد چیزیں تھیں۔ اس سے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلے اور دوسرے تعلیمی نصب العین کے جو مضر نتائج مرتب ہوئے ان سے ایک نئے اور جامع نصب العین کی طرف توجہ دلائی۔ ایک طرف تو مغرب کی اندھی تقلید کے باعث ہماری نسلیں ہندوستان کی بہترین روایات سے بے پروا ہو گئیں۔ دوسری طرف صرف یکطرفہ مذہبی فرقہ دارانہ تعلیم کے باعث متعصب اور کوتاہ نظر، تیسرا تعلیمی نصب العین ان خامیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ ایک متحدہ تمدنی نصب العین کا مظہر ہے۔ وہاں اس تمدن پر اثر ڈال کر اس کو اور زیادہ موثر بھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے باعث ہندوستان میں مختلف قومی مدارس قائم ہوئے۔ ظاہر ہے ان مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کی بہترین روایات کی حفاظت اور تعلیم ہی چاہیئے۔ لیکن اسی طرح کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان کی قومیت میں مفید ثابت ہوں مضر نہ ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلام کی بنیادی روح اور ارکان ہندوستان کی قومیت میں ممد ہیں مضر نہیں۔ یہ ہندوستان کے قصر قومیت کو اور زیادہ حسین اور دل کش بنانے کا باعث ہوں گے۔ خدائے واحد کا تخیل، جمہوریت اور عالم گیر برادری کا خیال۔ صاف اور سادہ اخلاقی تعلیمات توہم پرستی کی مخالفت اور حقیقت پسندی کا ذوق، نظام اجتماعی وغیرہ۔ اسلام تعلیم کے وہ بے بہا جواہر ہیں۔ جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بہترین عناصر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہندوؤں کی فلسفیانہ نظر ان کے غور و فکر کی گہرائی، ان کی ریاضی۔ ان کا جمالی احساس۔ جس کا اظہار ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بیش بہا اجزا ہیں جن کے بغیر ہمارا آئندہ قومی تمدن محض ایک بے جان چیز ہو گا۔

ایسے قومی مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کو اس طرح تعلیم ہونی چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے

اچھے پہلوؤں سے واقف ہوسکیں۔ قومی تعلیم کے خیال کے ساتھ مشترک زبان کا خیال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اور وہ مشترک زبان صرف وہی ہوسکتی ہے جو کسی قوم کے تمام ارکان کی نہیں تو کم از کم اکثریت کی زبان ضرور ہو۔ ہر قوم اپنے عمیق ترین جذبات اور احساسات کا اظہار صرف اپنی مادری زبان میں کرسکتی ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح کسی قوم کی ذہنی زندگی اس کی اپنی زبان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی ہر قوم اپنا تصور کائنات صرف اپنی زبان میں بدرجہ اتم ظاہر کرسکتی ہے۔ زبان کے متعلق میکانکی نقطۂ نظر غلط ہے۔ زبان ایک نامی چیز ہے جہاں وہ ذہنی زندگی کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ وہاں وہ خود ذہنی زندگی کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کے خیال کے ساتھ قومی زبان کا خیال بھی پیدا ہوا، اور قومی تعلیم صرف قومی زبان یعنی ہندوستانی ہی کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ اس کے ساتھ لازمی ابتدائی جبریہ تعلیم کا پیدا ہوتا ہے۔ قومیت کا صحیح ارتقا ممکن نہیں ہے جب تک کہ کسی قوم کے تمام ارکان بغیر تمیز کے اپنی نشوونما کے موقع نہ پائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر مفت اور عام ابتدائی تعلیم کے نہیں ہوسکتا جو پورے تعلیمی قصر کی بنیاد ہے اور قوم کی تعمیر میں غالباً سب سے اہم ضرورت۔

ہم جب اس قدر متحدہ قومیت پر زور دے رہے ہیں تو اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پھر کیوں تعلیم ایک نہ کردی جائے تاکہ یہ تفریق ہی مٹ جائے۔ لیکن ہمارا مقصد مختلف اقوام کے مخصوص خصائص کو فنا کرنا نہیں ہے بلکہ اُن کے بنیادی امتیازات کو باقی رکھنا ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ متحدہ عمارت کے لئے باعثِ خوش نمائی ہوں۔ ہندو قوم۔ زیادہ تر فلسفہ اور عقلیات سے دلچسپی رکھتی ہے بخلاف اس کے مسلمان ایمان و ایقان سے شخصیت کے یہ دونوں اہم پہلو ہیں۔ اور دونوں اقوام نے اپنے مخصوص رنگ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تلف کرنا گویا کہ انسانیت کی ایک اہم قوت کو نشوونما سے روکنا ہے۔ ہم مشین کی طرح ایک ہی قسم کی اینٹیں بنانا نہیں چاہتے بلکہ شخصیتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو نامی اور زندہ ہوں۔ خدا اپنی خدائی کا مظاہرہ یکسانیت سے زیادہ تنوع میں کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کے باغ میں بہت سے رنگ برنگ کے پھول اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی خوش نمائی اور حسن دوبالا ہو۔ ہندو اور مسلمان باوجود اپنے اختلافات کے ایک اور اعلیٰ مرکز پر متحد ہوسکتے ہیں یعنی یہ کہ دونوں میں ایک۔ مافوق الطبیعی جذبہ پایا جاتا ہے

جو ایک مذہبی شکل اختیار کر لیتا ہے گو کہ ایک تشفی قلب ایمان کے ذریعے چاہتا ہے۔ اور دوسرا فلسفیانہ فکر کے ذریعے سے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی قومیت کے تخیل اور اس کے تحت میں اس کا قومی تعلیم کا نصب العین مندرجہ ذیل عناصر پر استوار ہونا چاہیئے۔

۱۔ اس تصور پر جو کائنات میں ایک مقصد اور وحدت دیکھتا ہے جس کو ہم مذہبی اور مافوق الطبیعی جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستانی تمدن کی بنیادوں پر۔

۳۔ قومیت کے تخیل پر جو ہندویت اور اسلام کو یک جا کر سکے اور اس طرح ہندوستان میں ایک قوم پیدا کر سکے۔

ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے ہم دنیا کے دوسرے تمام تمدنوں کے مفید اثرات ان کے علوم و فنون۔ ان کی صنعت و حرفت وغیرہ لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ہم ان کو اپنالیں جو ہماری تہذیب میں جذب ہو سکیں اور جو ہمارے ارتقا میں ممد ہوں۔ اہل مغرب کے علوم و فنون، ان کی صنعتی و حرفتی ترقی عہد جدید میں مسلم ہے اور ہم اپنی قومیت کی تعمیر میں ان سے بہت کچھ مدد لینا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر سائنس اور صنعت میں ہمیں ان سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور ہمارا نظام تعلیم بغیر ان چیزوں کے بالکل نامکمل رہے گا۔ اور ہمیں کبھی اس قابل نہیں بنا سکے گا کہ ہم دنیا کی تگ و دو میں اپنا وجود قائم رکھ سکیں

چوتھا عنصر ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں انسانیت کا ہے۔ یہ انسانیت کا تخیل بھی مختلف قسم کا ہو سکتا ہے ایک تو ایسا کہ جو صرف معاشی مفاد پر مدنظر ہو۔ مثلاً موجودہ زمانے کی اجتماعیت کی تحریک ایک خالص مادی تحریک ہے۔ کارل مارکس تاریخ کی مادی تاویل کرتا ہے اس کے نزدیک تمام تمدن صرف انسان کے معاشی جدوجہد کی پیداوار ہے۔ مذاہب کے قیام میں وہ سرمایہ داری کا ہاتھ دیکھتا ہے۔ حقیقتاً اس کا نظریہ انسانی نفس کے دوسرے عناصر کی حقیقت نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ جس طرح معاشی جذبہ انسان میں بالذات اپنی جگہ رکھتا ہے اسی طرح جمالی اور مذہبی جذبہ بھی۔ انسانیت کا یہ

یہ تخیل جو گذشتہ تمام تمدن کو برباد کرکے انسان کو صرف پیٹ کا بندہ کردے ہماری قوم کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے۔ جس میں اسلام اور ہندویت مشترک ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم عوام کی اس تباہ حالی اور بربادی کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اور اس فلاکت کے دور کرنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم اجتماعیت کا تمام نظام معاشی قبول کر لینے کے لئے اور اپنے نظام تعلیم میں زراعت اور صنعت و حرفت کو بہت اہمیت دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن تمدن کا وہ نصب العین جو مکمل طور پر مادیت پر مبنی ہو۔ ہمارے تعلیمی نصب العین کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا
دوسرا انسانیت کا نصب العین بھی جو صرف اخلاقیات پر مبنی ہو۔ اور مذہب سے واسطہ نہ رکھے۔
ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہم فطرۃً مجبور ہیں کہ ایک ہستی پر ایمان رکھیں جو ہماری دعاؤں کو سننے والی ہو جس کا باطنی اعتقاد مصیبت کی گھڑیوں میں ہمیں سہارا اور امید دے۔ ہم اپنی قوم کے اس بنیادی خصوصیت کو جسے ہم نہایت عزیز رکھتے ہیں اور جس پر ہمارے تمام تمدن کا قصر استادہ ہے ترک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ ہم بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح بے راہ و منزل ہو جائیں گے۔ اور اپنی زندگی کی اس باطنی قوت کو کھو بیٹھیں گے جو قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

اب صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ایسی انسانیت کے قائل ہوں جو عالم گیر برادری اور ایک واحد ہستی کے تصور پر قائم ہو یہ اسلام کا ہمیشہ سے بنیادی خیال رہا ہے اور ہندویت کا ارتقا بھی اسے اسی طرف لے جا رہا ہے۔

ہم نے اس وقت تک ہندوستان کے نصب العین کا تعین کرنے میں صرف ہندویت اور اسلام کا ذکر کیا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے فرقوں مثلاً سکھ، پارسی یہودی عیسائی بدھ وغیرہ کے بہترین اثرات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ان کا اسی طرح حق وجود تسلیم کرتے ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ وہ بھی ہندوستان کی قومیت کی تشکیل میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ہمارے ہندوستانی قومی تمدن کی تمام بنیادوں پر ہم سے آکر مل سکتے ہیں۔

غرض ہمارے تمدن کی تاریخی روشنی میں ہمارا تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں

ہمارا تعلیمی نصب العین یہ قرار پایا کہ ہم اپنے نوجوان نسلوں کی جسمانی اور نفسی تربیت جس میں معاشی سیاسی، اجتماعی، جمالی، اخلاقی، مذہبی قوی شامل ہیں۔ ان کے تمدن کی بہترین روایات پر اس طرح کریں کہ وہ ایک تمدن قومیت کے قیام کا باعث ہو وہ قومیت جو انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو سکے۔

انسانیت مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عالم ہے بہت سے عالموں میں سے جن کا تصور انسانی عقل کے خلاف نہیں ہے لیکن جن کا احصا اور ادراک انسانی عقل و فکر سے باہر ہے چونکہ عقل اپنی قوتوں میں محدود ہے۔ اس کی رسائی حقیقت کی تلاش میں صرف ایک خاص زینے تک ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد نفس بحیثیت مجموعی جس میں شعوری اور غیر شعوری عناصر دونوں شامل ہیں حقیقت کا بہت حد تک ادراک کرتا ہے کلیتاً تو حقیقت کا ادراک اسی وقت ہوگا جب انسان انسان نہ رہے بلکہ خدا ہو جائے۔

جس طرح تمدن مظہر ہے انسانی نفس کا۔ اس طرح تمام کائنات مظہر ہے ایک نفس واحد کی جو اپنے اظہار کے لئے مختلف جلوے اور مختلف رنگ و بو ڈھونڈھتا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں۔ (غالب)

یہ حسن کی خود بینی نئے اسلوب سے ہر وقت، ہر زمانے اور ہر عصر میں جاری ہے۔ اسی تخلیقی فعل میں مدد پہنچانے کا نام تعلیم ہے۔ اور یہ فعل جس خاص اسلوب اور رنگ سے کسی زمانے اور کسی قوم میں ظاہر ہوتا ہے اس کو سمجھنے کا نام اس زمانے کے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کو سمجھنا ہے۔

کس قدر عظیم الشان اور روح پرور ہے یہ خیال کہ ہم کائنات کی ایک کڑی ہونے کے باعث تمام ابدی سلسلے پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ آرزوؤں کی اس بلندی کے ساتھ ہم اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر طرف نفاق کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ ایک ایک فرقہ اور ایک ایک جماعت میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ہر شخص اور ہر جماعت اپنی بقا اور برتری کی

کوشش میں ہے اور دوسرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے ان واقعات کو ان مایوسانہ نظروں سے دیکھنا۔ حقیقتاً ہمتوں کی پستی ہے۔ یہ زندگی کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں بعض تحریکیں ختم ہو جانے سے پہلے اب گویا سانس توڑ رہی ہیں۔ بعض نئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں جو اپنا حق وجود ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ اکثر جگہ ان میں سخت جنگ چھڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر جگہ ایک امتزاج پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اس لحاظ سے کہ فطرت یہاں تمام دنیا کی نسلی، مذہبی اور مقامی اختلافات کا ایک امتزاج چاہتی ہے سب سے زیادہ کشمکش کا آماجگاہ ہے۔ یہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان آباد ہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو۔ یہاں نہ صرف آریہ اور سامی نسل کے لوگ بستے ہیں بلکہ تقریباً تمام دنیا کی نسلوں کے۔ انسانیت کے ہم آہنگ امتزاج سے فطرت ایک نئی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا کے لئے ایک نمونہ ہو۔

اس عظیم الشان مشن پورا کرنے کے لئے ہم بھیجے گئے ہیں۔ خدا ہم ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو اس وقت سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں اپنا کام کرانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ثابت کریں کہ ہم کس حد تک اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہیں۔

اب رہی یہ کشمکش، یہ جد و جہد، یہ اختلافات، یہ موت کی نہیں زندگی کی دلیل ہیں

اس کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام۔

آزادی

آزادی کا مفہوم آزاد ہونا یعنی پابند نہ ہونا، مجبور نہ ہونا، محکوم نہ ہونا بلکہ مختار، حاکم اور قادر ہونا۔ یہ صفتیں اپنی انتہائی تکمیل کے ساتھ، اپنی مطلق اور غیر اضافی شکل میں، تو صرف اُسی ذاتِ بے ہمتا اور لاثانی میں جمع ہو سکتی ہیں جسے مذہبی عقیدے والے خدا کہتے ہیں۔ لیکن جب مجبور اور معذور افراد نوعِ انسان کے ساتھ آزادی کی صفت کو منسوب کیا جاتا ہے تو اُس وقت آزادی کا جو مفہوم ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے اس میں کم و بیش پابندی کا پایا جانا ناگزیر ہے، ہر چند یہ ممکن ہے کہ مثالی حالات میں ان پابندیوں کا احساس معدوم ہو جائے۔

تصوف اور مذہب کی اصطلاح میں آزادی کی انتہائی معراج یہ سمجھی جاتی ہے کہ جزو، کل میں مل جائے۔ مخلوق، خالق کی مرضی اور مشیت کو اپنی خواہش اور تمنا کے عین مطابق پانے لگے۔ جب تسلیم و رضا کے اس مرتبے پر کوئی شخص پہنچ جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی پابندی اُس کے لئے خارجی پابندی باقی نہیں رہتی بلکہ اُس کی طبیعت اپنے اندرونی میلان سے وہی کام کرنے لگتی ہے جو اُس کے خدا اور رسول کا فرمان ہے یا جب جسم کی قیود اور آلودگیوں سے بے نیاز ہو کر آدمی روحِ کائنات سے ہم کلام بلکہ اُس میں جذب ہو جاتا ہے تو ایسی حالت کو مذہب اور تصوف کی اصطلاح میں آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسی طرح اخلاقیات میں جب ایک شخص اُن پابندیوں کو جو عقل و تمیز، نفسِ لوّامہ یا اجتماعی نفس اُس پر عائد کرتے ہیں پابندی سمجھنا ترک کر دیتا ہے اور بے عقلی، جہالت اور نفسِ امّارہ کی سرکشی پر اس قدر قابو حاصل کر لیتا ہے کہ اُس کے اندر ادنیٰ خواہشات اور اعلیٰ خواہشات کی ہر قسم کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنا اُس کے لئے دشوار نہیں رہتا تو ایسی حالت کو اخلاقی آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں بھی آزادی کا نصب العین اسی نوعیت کا متعین کیا جا سکتا ہے جب افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات ایسے ہو جائیں کہ جماعت کا ہر فرد یہ سمجھنے لگے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ بالکل وہی ہے جو وہ خود کرتا تو ایسی حکومت کو مکمل آزاد حکومت سمجھنا چاہیے۔ ایسی حالت میں حکومت کے احکام خارجی نہیں رہتے۔ ان کی اطاعت مجبوری کی اطاعت نہیں ہوتی سزا کے ڈر سے لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر اپنی ذات کی حکومت ہو جاتی ہے۔ قوانین، اصولِ زندگی کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں جس پر عمل کر کے خوشی اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راجیہ، سوراجیہ ہو جاتا ہے۔ جس وقت یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تب ہی قوائے جسمانی اور دماغی کو تربیت دینے اور مکمل کرنے کا لوگوں کو حوصلہ اور موقع ہوتا ہے۔ علم، ادب اور فنون، ترقی کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن پھولتے پھلتے ہیں۔ مادی۔ اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوتی ہیں۔ ہم آہنگی اور مسرت سے فضائیں معمور ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے اس مفہوم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انسانی ذہن نے اسے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد ہی میں سمجھ لیا ہو گا صحیح نہیں ہے۔ دنیا کے مفکروں اور مصلحوں نے نسل بعد نسل بتدریج اس تخیل کو ترقی دی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اسی طرح اس مطمح نظر کے حاصل کرنے کی کوششیں بھی ناکام اور کامیاب ہو ہو کر رفتہ رفتہ زیادہ صحیح، ہمہ گیر، مضبوط اور مؤثر ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کی جنگ کا محاذ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے۔ کبھی آزادی کا ایک رُخ لوگوں کی نگاہ کے سامنے نمایاں رہا ہے کبھی دوسرا۔ لیکن آزادی کی روح ایک عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ اور اس کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

آزادی کی شکلیں روسو نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "معاہدہ معاشری" کی ابتدا اس جملہ سے کی تھی کہ "انسان آزاد پیدا ہوا لیکن وہ ہر جگہ پابہ زنجیر ہے" تاریخ کے مطالعہ سے روسو کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کے اس مشہور جملے کی تصحیح یوں کریں کہ "انسان، غلام پیدا ہوا لیکن وہ آہستہ آہستہ آزاد ہوتا جا رہا ہے۔" انسان نے آزادی کی منزلِ مقصود کو

جن جن مورچوں سے رفتہ رفتہ تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے اُن میں سے زیادہ اہم کو اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

مدنی آزادی تاریخی اعتبار سے آزادی کے لئے جو انتہائی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی دراز دستیوں سے افراد کو محفوظ کیا جائے اور یہ اس طرح کہ رعایا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ اُن پر حکومت قانون اور دستور کے مطابق کی جائے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہو جائیں اور ہر شخص کو یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ اس کی پابندی کی حد کس قدر ہے۔ منطقی حیثیت سے بھی یوں ہی ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے خلاف کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہوتا تو وہ بالکل اُس کی مرضی اور طبیعت کے تلوّن کا پابند ہوتا ہے اور غلاموں کی طرح اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ہمہ گیر آزادی کی اوّلین شرط ہمہ گیر پابندی ہے۔ اگر اس قسم کی پابندی نہ ہو تو کچھ لوگ آزاد رہیں گے جو چاہیں گے کر سکیں گے اور کچھ پابند ہوں گے اور وہی کر سکیں گے جس کی آزاد لوگ انھیں اجازت دیں گے۔ مگر جب قوانین مقرر ہو جائیں گے اور حکمران بھی اُس کے اسی طرح پابند ہو جائیں گے جیسے محکوم تو من مانی حکومت باقی نہ رہے گی۔ قوانین سے اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور وہ دوسروں کے ساتھ جس قسم کا چاہے اپنی مرضی کے مطابق برتاؤ نہیں کر سکتا لیکن اُسے فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اُس کے خلاف اپنے غیر محدود اختیارات استعمال کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک فرد کو قانون پابند کرتا ہے اسی طرح اُس جماعت کے جملہ افراد کو جس میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، گورے اور کالے، مسلمان اور کافر سبھی شامل ہیں، بلا تفریق مساوی انداز سے پابند کرتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو من مانے احکامات اور زور آور زبردستی سے لوگوں کو نجات مل جاتی ہے۔ معاشری زندگی میں آزادی کی یہی ایک صورت قابلِ عمل ثابت ہوتی ہے۔

انگریزی پارلیمنٹ نے سترھویں صدی میں آزادی کی جنگ اسی مورچے سے شروع کی تھی۔ پٹی شن آف رائٹ اور ہے بیس کارپس ایکٹ اسی مدنی آزادی کے حصول کے ذرائع تھے قانون کی

عملداری قانون کی نگاہ میں مساوات، غیر جانب دار عدالتیں، یہ مطالبے تھے جو اُس وقت پیش کئے گئے تھے۔ حکومت اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو جب چاہے گرفتار اور قید نہیں کرسکتی، نہ سزا دے سکتی ہے نہ اُن کے مال وجائداد پر قبضہ کرسکتی ہے۔ اِس قسم کے تمام کام قانون کے مطابق ہونے چاہئیں۔ عدالت کو حکومت کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ صفائی کی ہر شخص کو سہولت ملنی چاہئے۔ عدالت تک ہر شخص کی رسائی آسان ہونی چاہئے۔ مقدمے کی پیروی اِس قدر گراں نہ ہونی چاہئے کہ نادار لوگ عدالت کے منافع سے محروم رہیں۔ پڑھے لکھے باعزت اور ذی مرتبہ لوگوں کو جاہلوں اور کم حیثیت لوگوں کے مقابلے میں اپنی علمیت، وقار، مذہبی یا نسلی تفوق سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔ یہ مدنی آزادی ہے۔

مالی آزادی اِس سے قریبی طور پر وابستہ مالی آزادی کا مسئلہ ہے جس کو آسانی سے اِس لئے سمجھ سکتے ہیں کہ اِس سے لوگوں کے روزمرہ کے کاروبار پر براہِ راست اثر پڑتا ہے جب حکومت من مانے طریقوں سے محاصل عاید کرتی ہے اور اُس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی تو لوگ عاجز ہوکر انقلاب کے خواہشمند ہوجاتے ہیں۔ انگلستان میں اسٹوارٹ بادشاہوں نے، امریکہ میں جارج سوم نے اور فرانس میں لوئی شانز دہم نے اپنے محاصل کے خراب انتظام سے لوگوں میں بدظنی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کردی۔ رعایا کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اُس وقت تک محاصل عائد کرنے کا حق نہیں ہے جب تک وہ نمایندگی کے حق کو تسلیم نہ کرلے یعنی اُن لوگوں کے نمایندوں سے جن پر محاصل عائد کئے جارہے ہیں اِس بارے میں استصواب نہ کرلے اور اُن کے اعتراضات کا تشفی بخش جواب نہ دے لے۔ یہ مالی آزادی ہے۔

ذاتی آزادی یہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کا امکان اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ دیوں کے بجائے اصول وقوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اُن کی اطاعت، جماعت کے تمام افراد پر لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اِس سے مسئلے کا پورا حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ قوانین موجود ہوں اور حکمران اُن قوانین کی خلاف ورزی بھی نہ کرتے ہوں لیکن پھر بھی (۱) قوانین بنانے والے یا تو ایک مطلق العنان

بادشاہ اور اُس کے تنخواہ دار مشیر ہوں یا اُمراء اور حکام کی ایک مختصر جماعت اِس کام کو انجام دیتی ہو (۳) قوانین بذاتِ خود انصاف اور مساوات پر مبنی نہ ہوں بلکہ اُن سے آبادی کے کچھ حصّے یا اکثر حصّے یا قوانین بنانے والوں کو چھوڑ کر باقی اور تمام لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ایک طرف تو قوانین بنانے والی مناسب ترین جماعت کا تعین کر دیا جائے اور دوسری طرف اِس امر کی صراحت کر دی جائے کہ کن کن صورتوں میں محض قانون کو حکم بنانے سے آزادی کے حصول کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا بلکہ ایسے موقعوں پر خراب اور ظلم پرور قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔ اِس مسئلہ کا اول الذکر حصہ سیاسی آزادی سے متعلق ہے جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ فی الحال اِس مسئلہ کے دوسرے حصّے سے جسے "ذاتی آزادی" کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے بحث کی جاتی ہے۔

اِس ذیل میں بنیادی حیثیت خیال کی آزادی کو حاصل ہے یعنی اپنے ذہن میں ایک رائے قائم کرنے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اپنی اِس ذہنی رائے کی وجہ سے وہ کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس حق سے انکار انتہائی ظلم ہے کیونکہ خیال کا قلعہ تو کم از کم ایسا ہونا چاہئے جو اغیار کی دستبرد سے قطعاً محفوظ ہو۔ لیکن خیال چونکہ معاشرتی روابط کا نتیجہ ہوتا ہے اِس لئے اس کی آزادی اِس وقت تک بے کار ہے جب تک مبادلۂ خیال کی آزادی بھی نصیب نہ ہو۔ اِس لئے تقریر، تحریر، طباعت اور مباحثے کی آزادی بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں مسئلہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے کیونکہ ایک ایسا نقطۂ اتصال بھی ہوتا ہے جہاں قول و فعل کا فرق اِس قدر دھندلا ہو جاتا ہے کہ آزاد تقریر اور لوگوں کو بدامنی اور بغاوت پر اُبھارنا مترادف مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اس کے مقابلے میں آزادی کھڑی ہوتی ہے اور انتخاب نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔ مذہبی آزادی کے مسئلے میں بھی بعض اوقات اِس قسم کی دشواریوں کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بعض مذاہب میں آدم خوری، انسانی قربانی اور جادوگرنیوں کا جلا ڈالنا جائز ہے لیکن کوئی جدید حکومت اِن رواجوں کی کبھی بھی روادار نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان میں تعددِ ازدواج کو برطانوی قانون جائز قرار دیتا ہے لیکن

اگر ہندو اور مسلمان انگلستان میں ایک سے زائد شادی کرنا چاہیں تو شاید نہیں کرسکتے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر مذہبی آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ اِس کے مفہوم پر خارجی اور باطنی دو حیثیتوں سے بحث کی جاسکتی ہے خارجی حیثیت سے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ مذہبی خیالات اور اُن کے اظہار میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔ مزید برآں ہر شخص کو اِس بات کی بھی آزادی ہو کہ جس شکل میں چاہے عبادت کرے۔ لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ اُس کے ایسا کرنے سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچے اور امنِ عامہ میں خلل واقع نہ ہو۔ اِس شرط میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ مذہبی خیالات کے اظہار میں متانت، اعتدال اور ضبط سے کام لیا جائے تاکہ دوسروں کے احساسات کی توہین نہ ہو۔ اِس کے علاوہ مذہبی آزادی اُس وقت تک ناقص سمجھی جائے گی جب تک کسی شخص کو بھی مذہب کی وجہ سے عہدوں یا تعلیمی منافع سے محروم رکھا جائے گا۔ مکمل آزادی کے معنی یہاں بھی مکمل مساوات کے ہیں۔ باطنی طور پر مذہبی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو دوسرے شخص کو تبلیغ کے ذریعے سے اپنا ہم مذہب بنانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن شرط پھر وہی ہے کہ ایسا کرنے سے دوسروں کے مساوی حقوق پامال نہ ہوں اور امنِ عامہ میں خلل واقع نہ ہو۔

معاشرتی آزادی زندگی کے روحانی رُخ کے بعد اَب ہم اُس کے عملی رُخ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی کو اُن رکاوٹوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے جو سوسائٹی کے درجہ بہ درجہ طبقوں میں تقسیم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طبقے کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے اور یہ امتیازات منتقل ہوکر ترکہ اور وراثت کے ذریعہ سے منتقل ہونے لگتے ہیں۔ اوپر کے طبقہ والے نیچے طبقہ والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن سے معاشرتی تعلقات رکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ طبقوں کی اِس تفریق نے ذات پات کی شکل میں ایسی انتہائی صورت اختیار کی ہے کہ نیچی ذات کے لوگوں کا سایہ بھی جس جگہ پڑ جاتا ہے وہ ناپاک سمجھی جاتی ہے۔ نیچی ذات والوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں عبادت کرسکیں۔ اُن کے کنوئیں سے پانی بھر سکیں یا اُن کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر اسکولوں میں تعلیم پاسکیں۔

اونچی ذات کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور شادی بیاہ کے امکانات تو قطعی طور پر بعید از قیاس ہیں۔ انھیں صرف ذلیل ترین پیشوں کے اختیار کرنے کی اجازت ہے اور ترقی کے تمام امکانات اُن کے لئے اور اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے مفقود ہیں۔ یہ تفریق یہاں کے مذہب، رواج اور قانون کے نزدیک بھی جائز ہے یورپ میں بھی اس شدید شکل میں تو نہیں لیکن کم و بیش اسی قسم کے امتیازات مختلف زمانوں میں پائے گئے ہیں جن کے خلاف جدّوجہد کرکے انھیں توڑنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں کی گئی ہیں۔ مثلاً بعض عہدے ہوتے تھے جو صرف موروثی اُمراء اور لاٹ پادریوں کے لئے وقف ہوتے تھے یا بعض پیشے تھے جن کا اجارہ بعض مخصوص جماعتوں کو حاصل تھا یا تعلیم کی سہولتیں تھیں جن سے غیر دولتمند لوگ فطری اہلیت کے باوجود فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

معاشری آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ ان بندشوں کو توڑ کر مساوات قائم کی جائے اور ہر شخص کو ترقی کے لئے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں۔ لیکن اس مسئلہ میں بھی بعض نازک دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ایک طرف انفرادیت کی ترقی کے لئے جماعت بندی کو توڑنا ضروری ہے تو دوسری طرف فرقہ بندی اور جماعت سازی مثلاً ٹریڈ یونین وغیرہ کی مشترکہ کوشش سے افراد کے حقوق کی اس طرح نگہداشت ہوتی ہے اور بعض ایسے دوسرے معاشری منافع پیدا ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس قدر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ معاشری آزادی کا ان حالات میں یہ مقصد ہونا چاہئے کہ ایسی جماعتوں کی رکنیت میں وراثت کے اصول کو جاری نہ ہونے دیا جائے۔ نیز ان جماعتوں میں داخل ہونے کے واسطے مصنوعی پابندیاں حائل نہ کی جائیں یعنی ایسی کوئی دشواری پیدا نہ کی جائے جس کا منشاء یہ ہو کہ برادری میں نئی بھرتی کا سلسلہ مسدود ہو جائے اور جماعت بندی سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں اُن پر صرف ایک محدود حصّہ آبادی کا اجارہ رہے۔

اسی ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جنسی قیود بھی فرقہ بندی کی قیود سے بہت مشابہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے عورتیں طبعاً موزوں نہیں ہوتیں۔ ایسی صورتوں میں

اہلیت کے جو امتحانات ہیں اُن کے فیصلوں کو کافی سمجھنا چاہئے اور عورتوں کو محض عورت ہونے کی وجہ سے آزاد مقابلے میں شرکت سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہے۔

معاشی آزادی معاشرتی آزادی ہی کی ایک شاخ معاشی آزادی بھی ہے۔ لیکن اس کے مسائل اِس قدر پیچیدہ ہیں اور افراد اور جماعت کے حقوق و فرائض یہاں باہم اِس درجہ دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ ایک قطعی رائے کا اظہار بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ معاہدے کی آزادی، اپنے تمام افعال کے لئے افراد کا ذاتی طور پر ذمہ دار ہونا، تجارتی انجمنیں بنانے کی آزادی، آزاد تجارت۔ اُن کے حامیوں اور مخالفوں میں سالہا سال سے مستقل کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اِس گتھی کو سلجھانے کے لئے بھی مساوات کے گُر کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام جماعتی پابندیاں جو مساوی سطح پر لانے کے بعد آزادی کے فوائد حاصل کرنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں، افراد کی اُن تمام غیر محدود آزادیوں سے بہتر ہیں جن کی وجہ سے غیر مساوی اور ناموافق حالات میں وہ اپنے ہاتھ سے اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنے ذاتی اور عارضی فائدے کی خاطر کل جماعت اور خود اپنے مستقل فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آزاد معاہدہ جب ایک بڑے سرمایہ دار اور نادار مزدور یا کسان کے کے درمیان ہوتا ہے تو ایسے معاہدے کو آزاد کے نام سے موسوم کرنا اور اُس کے لئے مزدور کو ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دینا ستم ظریفی ہے۔ بڑا سرمایہ دار انتظار کر سکتا ہے اور مزدور کی خدمات سے مستغنی ہوتا ہے لیکن مزدور کی نگاہ کے سامنے اپنی معصوم اولاد کے فاقہ زدہ چہرے ہوتے ہیں اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو وہ فوراً کام کر کے اُجرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معاہدہ آزاد معاہدہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ اِسی طرح اصولِ انجمن سازی کی اس وجہ سے مخالفت کرنا کہ اِس سے افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے، غلطی ہے۔ انجمن چاہتی ہے کہ آزادی کے ایک خاص معیار کے حصول کے لئے اُس کے ارکانِ مشترکہ کوشش کریں۔ اب اگر اِس کی وجہ سے زندگی کے خود غرضانہ اور ناعاقبت اندیشانہ معیاروں کی قربانی ہوتی ہے تو یہ اعلیٰ آزادی کی خاطر ادنیٰ آزادی کی قربانی ہے جسے جائز سمجھنا چاہیئے۔ مثلاً مزدوروں کے مکانوں کا مسئلہ بیماری اور بڑھاپے کی حالت میں

اُن کی خبر گیری، اُن کے لئے مستقل طور پر مزدوری فراہم کرنے کی ذمہ داری، بچوں کی تعلیم اور اور اُنھیں کھانا کھلانا، بچوں اور عورتوں کی ملازمت کے متعلق خاص قوانین بنانا۔ ان اغراض کی حصول کے لئے جب افراد مشترکہ طور پر انجمن بناکر کوشش کرتے ہیں اور اِس کوشش سے افراد کے انفرادی اختیار کو عارضی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی تلافی، جماعتی اور مستقل فائدوں سے ہوجاتی ہے لیکن یہ ہوسکتا ہے کہ انجمن کے مطالبات حدود سے متجاوز ہو جائیں اور اتنی قربانی طلب کریں کہ جس کے لئے افراد طیار نہ ہوں۔ ایسی صورت میں افراد کی آزادی کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے اِس قسم کی دلیل آزاد تجارت کے خلاف بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔ آزاد تجارت ایسے دو ملکوں کے درمیان تو نہایت موزوں اور مناسب ہے جو صنعتی حیثیت سے مساوی سطح پر ہوں لیکن ایسے دو ملکوں کے درمیان جن میں سے ایک صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو اور دوسرا قدرتی وسائل کے باوجود نہایت پس ماندہ، جب آزاد مقابلہ ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پس ماندہ ملک آزاد تجارت کی حالت میں کبھی اپنی صنعتوں کو ترقی نہیں دے سکتا۔ ایسی حالت میں جماعت کے مستقل مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزاد تجارت سے عارضی کنارہ کشی ضروری ہوجاتی ہے لیکن یہ مسائل اِس کے بعد بھی پوری طرح صاف نہیں ہوتے اور بعض اوقات معاشی آزادی کے نام پر ایک طرف یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ پیشوں، قیمتوں، مزدوروں کی شرائط ملازمت اور آمد و برآمد کے محاصل اور باقی تمام دوسرے معاشی معاہدوں سے ہر قسم کی بیرونی پابندیاں ختم کردی جائیں اور دوسری طرف دعوت دی جاتی ہے کہ ہر جزئی معاشی مشغلے کو حکومت کی نگرانی اور انتظام کے ماتحت لایا جائے اور دونوں نظریوں کے حامی وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ صرف انھی کی تجویزوں سے معاشی آزادی کے امکانات محفوظ کئے جاسکتے ہیں اِس کے متعلق مفصل بحث آئندہ کسی باب میں کی جائے گی۔

خانگی آزادی جماعت میں جتنی انجمنیں بھی پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے زیادہ اہم، ہمہ گیر اور باثر تنظیم خاندانی ادارے کی ہے جس زمانے میں ریاستیں مطلق العنان ہوتی تھیں خاندانی زندگی میں بھی استبدادیت اور مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے جان و مال کا بہت بڑی

حد تک مختارِ کُل ہوتا تھا۔ آزادی کی تحریک نے جب خاندانی محاذ سے حملہ کیا تو اس کے پیشِ نظر تین مقاصد تھے (۱) بیوی کو مساوی طور پر مختار اور ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اُسے جائداد کی ملکیت اپنے طور پر کاروبار کرنے، فریق مقدمہ بننے اور شوہر کے مقابلے میں پوری طرح محفوظ ہونے کے حقوق دئے جائیں (۲) شادی کو جہاں تک قانون کا تعلق ہے دو ہم رتبہ فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ سمجھا جائے (۳) اولاد کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے کچھ تو والدین کو پابند کیا جائے اور کچھ سرکاری طور پر تعلیم اور حفظانِ صحت کے انتظامات کرکے بندوبست کیا جائے خاندانی زندگی کے اوّل الذکر دو مقاصد سے تو مساوات کے اصول کی توسیع ہوتی ہے لیکن تیسرے مقصد کے سمجھنے میں ذرا دشواری معلوم ہوتی ہے۔ اِس مسئلے پر غور اگر اِس نقطۂ نگاہ سے کیا جائے کہ بچوں کے حقوق کی نگہداشت مستقبل کے شہری ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور مساوی مواقع کا انھیں اتنا ہی مستحق سمجھنا چاہیے جتنا کہ موجودہ شہریوں کو اور چونکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اِس لئے اُن کے حقوق کی نگرانی قانون اور حکومت کے ذریعہ سے ضروری ہے تو شاید یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے اور یہاں بھی آزادی کا مفہوم مساوات قائم کرنا ہو جائے۔

مقامی نسلی اور قومی آزادی مختصر ترین جماعتی ادارے یعنی خاندان کے بعد اب ہم بزرگ ترین ادارے یعنی قوم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کا ایک بڑا حصہ اُن مساعی پر مشتمل ہے جن کے ذریعے اقوام نے بصورتِ مجموعی غیروں کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے جد و جہد کی۔ نپولین کی شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی تمام اقوام کی بغاوت، اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش، ترکی کی عیسائی رعایا کی اپنے بیرونی ہم مذہبوں سے امداد طلبی، حبشی اقوام کی غلامی سے رہائی، آئرلینڈ اور ہندوستان کی قومی تحریک، یہ سب اِسی جذبے کے مظاہر ہیں۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت سہل معلوم ہوتا ہے اِن تحریکوں کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ کمزور فریق کو طاقتور فریق کی گرفت سے نکال کر اُسے خود مختار اور ہم رتبہ بنادیا جائے لیکن اس کی اِس سطحی شکل کا جب ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاملہ اتنا صاف نہیں رہتا۔ قومیت کِسے کہتے ہیں اور یہ ریاست سے کس حیثیت سے مختلف ہے؟ کس قسم کا خاص

اتحاد قومیت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے کیا مخصوص حقوق ہیں؟ اگر آئرلینڈ ایک قوم ہے تو کیا السٹر بھی ایک قوم ہے؟ اگر السٹر کو برطانوی اور پروٹسٹنٹ کہہ کر برطانیہ کا جزو بنانے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو السٹر کی نصف کیتھلک آبادی کے حقوق کو پیش نظر رکھا جاتا تھا یا نہیں؟ ان میں سے بعض مسائل کے عملی جوابات تو واقعاتِ تاریخ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کنیڈا کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اور برطانیہ کے رہنے والے دو مختلف عناصر کس طرح کنیڈا میں ایک ساتھ بسنے اور خود مختار طرز کی حکومت پانے کے بعد "عقاید" "زبان" معاشرتی تنظیم اور تاریخی روایات کے اختلاف کے باوجود باہم شیر و شکر ہو کر ایک قوم بن گئے ہیں۔ جرمنی کے ایک قوم ہونے کے دعوے کو بھی تاریخ نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آسٹریا کے وزیر میٹرنک نے اٹلی کے متعلق طنز آمیز طریقہ پر جو یہ فقرہ کہا تھا کہ "اٹلی صرف جغرافیائی اصطلاح ہے" اس کی بھی تاریخ نے تردید کر دی ہے۔ لیکن تاریخ کے نتائج کی پیشین گوئی کس طرح کی جائے۔ اُن تمام لوگوں کے مطالبوں کو جو قومی وحدت کی بنا پر خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں کن شہادتوں کی بنا پر منظور یا مسترد کیا جائے؟ تحریک آزادی کا اوّلین مقصد اس میں شک نہیں قومی خود اختیاری کو تسلیم کرنا ہے لیکن جب تقسیم اور جزوی تقسیم پر نظر کی جاتی ہے اور فرقوں کے اندر فرقے نظر آتے ہیں تو اُس وقت خود اختیاری طرز کی حکومت کے کون سے حدود مقرر کئے جائیں؟ ان پیچیدہ مسائل کو تاریخ کی زندہ مثالیں اور مدبّروں کی عملی بصیرت ہی حل کر سکتی لیکن ایک اصول ہے جسے تجربے کی بنا پر ہر جگہ آزمایا جا سکتا ہے۔ جب ایک کمزور قوم، ایک بڑی اور طاقتور قوم کے ساتھ شامل رہ کر ایک ہی قانون کے ماتحت آزادی کے جملہ حقوق سے مستفید ہو سکتی ہو تو ایسے اتحاد کو دونوں فریقوں کے لئے مناسب سمجھنا چاہئے لیکن جہاں یہ انتظام ناکام رہے، جہاں حکومت مستقل طور پر ہنگامی اور غیر معمولی قوانین بنانے یا اپنے اداروں کی آزادی ختم کرنے پر مجبور ہو تو ایسی صورت میں اس اتحاد کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ صورت جاری رہی تو نہایت آزاد خیال جمہوریت بھی اپنے اصولوں کی بیخ کنی پر مجبور ہو جائے گی اور اپنا اقتدار صرف اپنی آزادی قربان کر کے ہی قائم رکھ سکے گی۔

اِسی قسم کے سوالات نسلی آزادی کے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تجربے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ محض نسل کا اختلاف کسی شخص کو آزادی کا کم یا زیادہ مستحق نہیں بنا دیتا۔ رنگ کے کالے یا گورے ہونے سے حکومت خود اختیاری کی طبعی اہلیت یا نا اہلیت میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔ اِس بُنیاد پر جو امتیازی حقوق لوگوں کو دئے یا جو فرائض عاید کئے جاتے ہیں اُنھیں جس قدر جلد مٹایا اور تمام انسانوں کو مساوی سطح پر لاکر آزادی کے منافع میں برابر کا شریک کیا جائے اتنا ہی مناسب ہے۔

بین الاقوامی آزادی | بین الاقوامی معاملات تحریکِ آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عدمِ مداخلت کے اصول پر عمل کیا جائے اور اس کے لئے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں (۱) آزادی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کے استعمال کی جو ظلم کا سرچشمہ ہے مخالفت کی جائے (۲) اسلحہ اندوزی کی لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ کیونکہ اس سے کبھی تو براہِ راست اور کبھی بالواسطہ نہایت ہشیاری اور چالاکی کے ساتھ آزاد اداروں کو دبایا اور محاصلِ سرکاری کے بیشتر حصّہ کو فوجی مصارف پر صرف کیا جاتا ہے (۳) جس قدر دنیا آزاد ہو رہی ہے اُتنا ہی قوت کا استعمال سہل ہوتا جاتا ہے۔ اگر مقصد دوسری قوم کو فتح کر کے اُس کے جائز حقوق پر تصرف کرنا نہیں ہے تو حملہ کرنا سخت خام خیالی ہے۔

سیاسی آزادی اور عوام کا اقتدارِ اعلیٰ | مندرجہ بالا تمام آزادیوں کے حصول اور قیام کا طریقہ کیا ہو یہ آخری سوال ہے جس سے اب ہمیں بحث کرنی ہے۔ عام طور پر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر عاملہ اور مقننہ کو کُل جماعت کا جواب دہ بنا دیا جائے تو اِس مسئلے کا حل ہو جائے گا اور پیشِ نظر یہ انتظام ہوتا ہے کہ عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو اور ہمہ گیر حق رائے دہندگی کے ذریعے سے وہ اپنے اِس اقتدار سے فائدہ اٹھائیں؛ لیکن اِس جواب سے مسئلے کی تمام دشواریوں کا حل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ عوام اپنے حقوق کی طرف سے لاپروائی برتیں اور انتظام کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا دوسرے ممالک کی تسخیر کا نشہ اُن پر سوار ہو جائے یا اُمرا کی جائداد کی ضبطی یا اسی قسم کے کسی اور مجموعی ظلم پر آمادہ ہو جائیں۔ اِس بات کا بھی آسانی سے امکان ہو سکتا ہے کہ وسیع حق رائے دہندگی کے مقابلے میں محدود حق رائے دہندگی سے عام آزادی کی زیادہ ضمانت ہو اور جماعتی ترقی کے زیادہ بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔

اِن حالات میں عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے نظریے کے لئے وجہ جواز کیا ہے اور اُس کی صحت کے کیا حدود ہیں؟ کیا یہ نظریہ آزادی اور مساوات کے عام اصول پر مبنی ہے یا دوسرے کوئی خیالات اِس کی تائید کے لئے موجود ہیں؟ پھر خیالات اور اداروں کے جدید ارتقا نے پارلیمنٹری حکومت کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ کو لا کھڑا کیا ہے اور اَب ایک نیا سوال یہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کیا واقعی نمایندگی پر منحصر حکومت کے مقابلے میں عام طور پر مقبول اور پسندیدہ ڈکٹیٹر شپ عوام کے اقتدارِ اعلیٰ کے اظہار کا زیادہ مناسب، مؤثر اور مفید ذریعہ ہے؟ اِن سوالات کا قطعی طور پر جواب دینا تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں اختصار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جمہوریت کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرنے پر اکتفا کی جائے گی۔

آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بچوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ سے کھانا کھلا کر خوش رکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اُن میں احساسِ ذمہ داری پیدا کر دیا جائے۔ اُن کی سیرت کی تربیت کی جائے اور اُن کی انفرادیت کو ترقی کا موقع دیا جائے۔ اگر اُنھیں اپنی نجات خود حاصل کرنا ہے تو اُنھیں مشترکہ زندگی کے انتظام کی ذمّہ داری میں شریک ہونا چاہئے۔ انتخاب کنندگان کی جہالت یا غیر ذمّہ داری کے عذر پر حقِ رائے دہندگی کو محدود کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مشق ہی سے آدمی کام کرنا سیکھتا ہے۔ لوگوں میں اگر احساسِ ذمّہ داری پیدا کرنا ہے تو اُن پر بھروسا کر کے اُنھیں ذمّہ داری تفویض کرنا چاہئے۔ ایسا کرنے میں خطرات ضرور ہیں لیکن خطرات اُس وقت اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور صورتِ حال سخت یاس انگیز ہوتی ہے جب عوام کی اکثریت کو حقوق اور ذمّہ داری سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایک شخصِ واحد کو حاکمِ مطلق بنانے میں علاوہ مندرجہ بالا اعتراضات کے ایک دوسرا خطرہ اور بھی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ اِس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنے ذاتی اقتدار کے غیر ضروری استحکام میں مدد نہ لے گا۔ دوسری طرف اُس کے جانشین کا مسئلہ طلب رہ جاتا ہے اِس لئے جمہوری نظام اپنے تمام نقائص کے باوجود بہترین نظام ہے۔ البتہ اُس کی جو نمایاں خرابیاں ہیں اُن کے ازالے کی کوشش ضروری ہے۔ مثلاً

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، عوام کو بعض اہم معاملات میں نمایندے منتخب کرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینا اور بعض دوسرے معاملات میں اس کے برخلاف ماہروں کی رائے پر زیادہ اعتماد کرنا ایسی راہیں ہیں جن کو اختیار کرکے اصلاح کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

آزادی کو جن جن راہوں سے اور جن جن شکلوں میں مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر حاصل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اُنھیں اب ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ تحریک آزادی تمام انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اس کا تعلق افراد سے بھی ہے خاندانوں سے بھی اور ریاست سے بھی۔ اس کا اثر صنعت پر بھی پڑتا ہے اور قانون، مذہب اور اخلاقیات پر بھی۔ اگر گنجایش ہوتی تو اس کا جو اثر ادب اور فنونِ لطیفہ پر ہوتا ہے اُس کے دکھلانے کی بھی کوشش کی جاتی کہ کس طرح تحریک آزادی کے زیر اثر قدامت پرستی، تصنع، عدمِ اخلاص اور مربیوں کے ذوق کی پابندی کے خلاف جنگ اور انفرادیت، واقعیت اور صنّاع و ادیب کی حقیقی روح کو نمایاں کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ غرض جدید دُنیا کی تعمیر میں تحریک آزادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دوسری بات جو اِس ذیل میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ تحریک آزادی کا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے اور ترقی پر ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا تھا، جب تک فرد اور جماعت میں وہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے جس سے جماعت کی ہر پابندی کو فرد ایک خارجی اور بیرونی پابندی نہیں بلکہ اپنے اجتماعی نفس اور ضمیر کی پابندی سے تعبیر کرنے لگے یہ سلسلہ جاری رہے گا تا آنکہ جماعت کی اطاعت اور آزادی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا ؎

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

(پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکچر جو انھوں نے ۱۴ اپریل کو جامعہ کے کالج کے طلبہ کے جلسے میں دیا تھا۔)

برادرانِ جامعہ!

میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ آپ سے چند مسائل پر گفتگو کروں جن میں میرا جی لگا رہتا ہے اور جن پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب کو بھی غور کرتے رہنا چاہئے۔ میرا مقصد لکچر دینا یا نصیحت کرنا نہیں ہے، میں صرف اپنے خیالات بیان کرکے آپ کی رائے لینا اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کہاں تک اتفاق ہے اور یہ اتفاق ہم آہنگی اور اتحادِ عمل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ ہماری چھوٹی سی جماعت کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ ایک انتشار زدہ ملت کے سامنے یک جہتی اور اتحاد کا نمونہ پیش کرے اور اگر ہم سچے دل سے ایسے مسلک کی تلاش میں لگے رہے جو سب کا مسلک بن سکے تو ہم کو ایک بڑی خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم آپس میں آزادی سے اپنے خیالات کا چرچا کریں۔ اور جو کچھ صحیح سمجھیں اُسے فقط زبان سے تسلیم نہ کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو عمل کے ذریعے اُسے آزماتے بھی رہیں۔ اُتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کی تمام بڑی ذہنی اور معاشرتی تحریکوں کا مطالعہ کرتے رہیں اور اُن میں جو کچھ ہمیں قابلِ قدر معلوم ہو اُسے اپنے ذہنی اور اخلاقی سرمایے میں شامل کرتے رہیں۔ میں آج آپ کے سامنے اِس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کی عام روش کو دیکھتے ہوئے ہمیں کون سی روش اختیار کرنی چاہئے اور ہم اِس دولت کو جو مسلمان اور ہندوستانی ہونے کے سبب سے ہمیں ملی ہے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں کہ ہمیں فائدہ بھی ہو اور ہمارا اصل سرمایہ بھی بڑھتا رہے۔

اِس بحث کو میں اسی سوال سے شروع کروں گا جو باہر کے لوگ جامعہ والوں سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ جامعہ کے طالب علم فارغ ہو کر کیا کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ کے لئے اس کا سب سے آسان جواب یہ ہے کہ تعلیم گاہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو نوکریاں دلوائے لیکن اِس جواب سے ہماری ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور آپ کی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک رسم کو جس کی لوگ ناعاقبت اندیشی مگر اطمینان سے پیروی کر رہے تھے غلط اور مضر ٹھہرا کر چھوڑ دیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اِس کی جگہ ایک نیا نظامِ حیات تجویز کریں جو صحیح اور مفید ہو اور کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جسے ہم اپنے دینی، اخلاقی اور سیاسی عقائد سے ہم آہنگ ثابت کر سکیں جو ہمارے علم میں جان ڈالے اور ہماری تعلیم گاہ میں سچائی اور مردم دوستی کی رونق پیدا کرے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ دنیا میں اجنبی بن کر نہ داخل ہوں بلکہ ہر لمحہ محسوس کریں کہ یہ وہی دنیا ہے جس کے لئے آپ جامعہ میں تیار کئے گئے ہیں اور اس میں وہی روش کامیاب ہوگی جس پر چلنا آپ کو جامعہ میں سکھایا گیا تھا۔

لیکن میں محض فرضی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ نیا راستہ تلاش کرنے سے پہلے ہم کو پورا یقین ہو جائے کہ پرانا راستہ ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ راہ رو کے لئے ثابت قدمی شرط ہے، منزل خواہ دور ہو یا قریب، اور تھوڑی تھوڑی دور چل کر واپس آنا بھٹکنے کی سب سے زیادہ قابلِ افسوس کیفیت ہے۔ اِس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ جامعہ کے وجود اور یہاں اپنی موجودگی کو دم بھر کے لئے بھول جایئے اور اپنے ملک کی حالت پر غور کر کے سوچئے کہ آپ کے لئے کسبِ معاش کی کون کون سی صورتیں ہیں، اور اگر کسبِ معاش کے علاوہ آپ اور کوئی حوصلے رکھتے ہیں تو اُن کے پورے ہونے کا کس قدر امکان ہے۔

سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آپ ملازمت کے لئے کوشش کریں۔ ملازمت کا میدان بہت وسیع ہے۔ مگر کسی ایک وقت میں دیکھئے تو اس میں گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اور اِس ذرا سی جگہ میں اتنے لوگ گھس جانے کو تیار کھڑے رہتے ہیں کہ آپ کی باری مشکل سے آنے

کب آئے۔ اگر آپ کی قابلیت، یا آپ کے خاندانی بزرگوں کا اثر، یعنی خوشامد اور جوڑ توڑ کام آیا تو خیر ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اِس طرف رخ ہی نہ کریں۔

نوکری کے لئے کوشش نہ کرنا آجکل کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ بہت سے نوجوان دو چار برس ٹھوکریں کھاکر یا ہوشیار ہوتے تو پہلے ہی سے ارادہ کر لیتے ہیں کہ ہم نوکری نہیں کریں گے۔ وہ تجارت، اخبارنویسی یا کبھی کبھی تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ بعض اپنی قدرتی استعداد اور طبیعت کی مناسبت سے اِن پیشوں میں کامیاب ہوتے ہیں یا کم از کم ٹھکانے سے لگ جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی نکلتے ہیں جنھیں چند سال کے تجربے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بہرحال نوکری سے آج کل اتنے لوگ مایوس ہو رہے ہیں اور ہماری تعلیم گاہیں اس مایوسی اور مصیبت کو بھگتنے کے لئے اتنے نوجوانوں کو تیار کر رہی ہیں کہ اور پیشوں میں بھی کامیاب ہونا خاصا دشوار ہو گیا ہے اور کسبِ معاش کی فکر اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس نے اور کسی فکر کے لئے جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ ہم ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ اِس قومی مصیبت کے اسباب سے واقف نہ ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہم میں کوئی خاص استعداد پیدا نہیں کرتی۔ ہم ہر کام کو اناڑیوں کی طرح شروع کرتے ہیں۔ ہمارا تخیل اِس قدر کمزور اور پست ہے، ہمارا دِل اتنا چھوٹا کہ ہم صرف دوسروں کی نقل کر سکتے ہیں۔ تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور ضد اور حسد میں ایک دوسرے کا کام بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں اصلاح نہ ہوئی تو ہم طرح طرح کی نئی بلاؤں میں گرفتار ہوتے رہیں گے لیکن افراد میں اتنی ہمت، عاقبت اندیشی اور قابلیت نہیں ہے کہ وہ عام روش کے خلاف اصلاح کے خیال سے کوئی نئی وضع اختیار کریں یا کسبِ معاش کے نئے ذریعے دریافت کریں۔ حکومت کو ہماری اِن دشواریوں سے کوئی مطلب نہیں اور ہمارے رہنما اتنے روشن خیال اور دور اندیش نہیں ہیں کہ اصلاح کی ایسی کوئی مہم سر کرنے کا حوصلہ کریں۔

اِس لئے آپ جامعہ میں ہوں یا کہیں اور، اور آپ کو اپنے ذاتی اغراض کے سوا اور کسی مسئلے سے سروکار ہو یا نہ ہو آپ ذرا بھی غور کریں تو ضرور اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کا مستقبل کسی اعتبار سے اُمید افزا

نہیں ہے اور اس وقت کسی طرف سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر آپ ذاتی اغراض کی حد سے گذر کر ملک کی عام حالت پر نظر ڈالیں تو آپ کو اپنی دشواریاں ایک بڑے پیمانے پر دکھائی دیں گی اور وہی حیرانی جو آپ کو اپنے متعلق سوچنے سے پیدا ہوتی ہے آپ کو قوم کے مستقبل پر غور کرتے وقت ستائے گی۔ سب سے زیادہ تکلیف آپ کو غالباً اِس بات سے ہوگی کہ ہم مجبور ہیں یا مجبور بن بیٹھے ہیں۔ تنکے کی طرح ایک دھارے میں بہے چلے جاتے ہیں۔ ہماری نظر میں نہ کوئی ساحل ہے جہاں ہم اپنے لئے ٹھکانا کرنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں، نہ کوئی بے پایاں سمندر جس میں گم ہو جانا ہم اپنی حیات کی تکمیل قرار دے سکیں۔ اِس وقت ہم میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ ہماری زندگی میں کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور کیسی ہونی چاہئیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کا جو حصہ مُلکی معاملات میں پیش پیش رہتا ہے اُس کے نزدیک ترقی اس میں ہے کہ ہمیں حکومت کے اختیارات ملیں۔ ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوں جو ہمیں اِس لائق بنا دیں کہ ہم جاپان، امریکہ اور انگلستان کی صنعت کا مقابلہ کر سکیں۔ ہماری رہائش میں وہ تمام آسانیاں اور روز مرہ زندگی میں وہ تمام دلچسپیاں پیدا ہو جائیں جو مختلف آلات اور مشینوں اور فنونِ لطیفہ کی بدولت یورپ اور امریکہ میں پیدا کر لی گئی ہیں۔

لیکن یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید ہمیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی۔ جب جماعت میں ربط اور اتحاد نہ ہو، افراد میں حکم دینے اور حکم بجا لانے کی استعداد اور عادت نہ ہو، وہ اجتماعی مقاصد کو ذاتی مقاصد نہ جانتے ہوں اور ان کے لئے ایثار کرنے پر تیار نہ رہتے ہوں تو جمہوری حکومت، نعمت ہونے کی بجائے عذاب ہو جاتی ہے۔ ہم میں بے شک وہ اوصاف پیدا کئے جا سکتے ہیں جو جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہیں لیکن ابھی ہم نے اخلاقی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ صرف حقوق اور امتیازات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم میں بہت سے لوگ اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ قوم اور قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ ہماری قوم پرستی اب تک ہماری اغراض کے مجموعے کا نام ہے جو اس وقت بالکل منتشر ہو جاتا ہے جب ہم اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اب بھی دیکھ رہے ہیں کہ جوائنٹ

پارلیمینٹری کمیٹی کی تجاویز نامنظور کرنے میں تو خاصا اتفاق ہے۔ کمیونل اوارڈ پر مسلم اور مستند لیڈر بھی گفتگو کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جب تک کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہم خوشی خوشی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، جب کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

یہی رویہ ہم نے معاشی معاملات میں اختیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی تجارت و صنعت بالکل ہمارے ہاتھ میں آجائے، اور ہمیں آہستہ آہستہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے۔ لیکن سرمایہ دار پیدا ہو جانے اور کاروبار کا پیمانہ بڑھ جانے سے افلاس اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ آپ اس وقت دنیا میں ہر طرف بڑے پیمانے کی صنعت اور بے روزگاری کو پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ نظام سرمایہ داری کی بقا اور بہبود کا اپنا قانون ہوتا ہے، اور ایک مرتبہ اس کے جسم میں جان ڈال دی جائے تو پھر وہ اپنی اغراض اور اپنی سلامتی کے لئے لڑے گا اور ہم ایک اور جنجال میں پھنس جائیں گے۔

برادرانِ جامعہ!

میں یاس مشرب نہیں ہوں، اور آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دنیا سے نرالے نہیں ہیں۔ ہماری جیسی حماقتیں اور بے پروائی دوسری قوموں نے بھی کی ہے، اور ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ جماعتوں کا نقطۂ نظر، افراد کی ذہنیت ایک وقت میں نہیں بدلتی۔ اصلاح کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب ایک ساتھ سدھر جائیں اور سب ایک ارادے اور ایک طریقے سے کسی اصول پر عمل کریں۔ لیکن جماعتیں ترقی اسی وقت کرتی ہیں جب ان کے اندر ایسی چھوٹی جماعتیں قائم ہو جائیں جو اپنے اصول اور عمل کو باقی کے لئے ایک مثال بنائیں جن مسائل پر دوسرے غور نہیں کرتے ان پر غور کریں، جو خطرے دوسروں کو نظر نہیں آتے ان سے سب کو آگاہ کریں اور اصلاح اور ترقی کی نئی تدبیریں کرتے رہیں۔ میرے خیال میں ہماری جامعہ بھی ایسی ہی جماعت ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے، اور ہندوستانی مسلمانوں کے ذریعہ تمام ہندوستانیوں کے لئے یہ خدمت انجام دینے کا ارادہ کرنا چاہئے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم برتری کا دعویٰ کریں یا اپنے آپ کو برگزیدہ ہستیاں سمجھیں۔ جامعہ کی حالت نہایت نازک رہتی ہے۔ مسلمان

انتشار اور پستی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ہر میدان سے اُن کے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اپنی اصل سے جس قدر دور وہ ہیں ہندوستان کی اور کوئی ملت نہیں ہے۔ ہماری سلامتی کی میرے خیال میں اب یہی ایک تدبیر ہے کہ ہم اپنے حوصلوں کو ایڑ لگائیں اور فوری نقصان اٹھا کر بھی اپنا پورا اخلاقی اور دنیاوی سرمایہ قومی زندگی کی تعمیر میں لگا دیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں دنیا اور دنیاوی مفاد کو ٹھکرا کر بالکل اخلاقی اور دینی مقاصد میں محو ہو جانا چاہیئے۔ ہم دنیا کو سمجھے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے اور اس وقت اگر ہم اپنی ملی اور قومی ضروریات اور فرائض کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو ہم دنیا سے بھی جائیں گے اور دین سے بھی ہم کو اس زمانے کی تمام بڑی تحریکوں اور عالمگیر مسائل کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اب آمد و رفت کے ذریعے ایسے ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی حصہ خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر ہمیں دنیا کی عام روش اور دوسرے ملکوں کے تجربے کو سامنے رکھ کر اپنے ملکی مسائل پر غور کرنا چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لئے عزت اور فراغت سے زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم کس طرح سے دنیا میں اپنا اور اپنی قوم کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اس دینی، اخلاقی اور تہذیبی دولت کا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے کس طرح مستحق ثابت کر سکتے ہیں۔

برادرانِ جامعہ!

انسانی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتیں اور تحریکیں برسرِ پیکار رہتی ہیں، اور اس زمانے میں بھی ایک دو رخی جنگ ہے جو دنیا کے ہر گوشے میں جاری ہے اور ہندوستان میں بھی اُس کے لئے میدان تیار ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان اور مشین، پرانی تہذیبی حدود اور مشین پرستی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب اور لامذہبیت ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہیں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت میں پورا اتفاق اور اتحادِ عمل ہے۔ تہذیب اور مذہب مجبور ہو کر ایک دوسرے سے ملے ہیں اور اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اگرچہ دونوں کے علمبرداروں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک اکیلا سلامت نہیں رہ سکتا۔ کامیاب ہوں گے تو دونوں، تباہ ہوں گے تو دونوں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت کے مرکز امریکہ اور روس ہیں، اور اُنھوں نے پرانی یورپی تہذیب پر قریب قریب فتح حاصل کر لی ہے۔ اب ہم

کسی یورپی قوم کو انسانیت اور مذہب کا سچا حامی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی پُشت و پناہ بہت صرف اور محدود حلقے ہیں۔ مشرقی دنیا پر مشین پرستی اور لا مذہبیت کے حملے شروع ہو گئے ہیں اور بہت سی تعلیم گاہوں پر اُنھوں نے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ لیکن ہم وقت پر ہوشیار ہو جائیں تو اب بھی مقابلے کا بہت اچھا موقع ہے۔

سب سے پہلے تو ہمیں چاہئے کہ اپنے حریف کی خصوصیات کا بخوبی مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ مشین پرستی کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ہوئی۔ جب لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ سائنس کی ترقی سے انسان، جو ہمیشہ مجبور سمجھا جاتا، تمام مادّی قوتوں کو اپنے قابو میں کرلے گا اور اصلاح اور ترقی کے لئے عقیدے اور عمل کی درستی سے زیادہ ضروری نئی کلوں کی ایجاد اور کاروبار کی نئی سہولتیں ہیں۔ اِس وقت مشین پرستوں کی زندگی کا معیار کارخانے کا معمول ہے۔ اُن کے اخلاق کا معیار چالاک اور کامیاب تاجر کا طرزِ عمل ہے۔ اُن کے نزدیک حسین وہی چیز ہوتی ہے جو مشین سے بنائی جائے، اور وہی چیز قابلِ قدر ہے جس کی بدولت روپیہ کمایا جاسکے۔ اُنھیں اِس پر افسوس نہیں ہوتا کہ مشین کا رواج ہر قسم کے ہنر کے لئے مہلک ہے۔ کیونکہ وہ انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدنما اور بھونڈی سمجھتے ہیں اور اُنھیں کچھ پروا نہیں ہوتی اگر دولت پیدا کرنے کا خیال کسی قوم پر بھوت کی طرح سوار ہو جائے اور اُس کے افراد کے اور تمام حوصلے مر جائیں۔ اُن کے نقطۂ نظر سے دُنیا کو خوش اور آباد رکھنے کے لئے مشین اور اشتہار کافی ہیں اور جو اُن دونوں کے رموز سے واقف ہو اُسے کوئی اور علم، کوئی اور ہنر، کوئی درحقیقت درکار نہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مشین پرستی کے مسلک میں چند خوبیاں بھی ہیں جو اُسے نہایت دلکش بنا دیتی ہیں۔ انسان، رسم و رواج کا بندہ نہیں رہتا، رہایش میں ہزاروں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دولت اور سامانِ عیش کی افراط ہوتی ہے اور غریب اور کم ترقی یافتہ قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ مشین پرست مُلکوں میں سب خوش، تندرست اور دولتمند ہوتے ہیں۔

مشین پرستی کا دوسرا رُخ موجودہ فلسفۂ اشتراک ہے۔ روس میں جو اشتراکی نظام ۱۹۱۷ کے بعد

قائم ہوا اُس کے خاکے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں بنائے جانے لگے تھے پہلے اُن میں مردم دوستی اور اخلاقی آئین کو زیادہ دخل تھا لیکن بعد کو اشتراکیت کا علوم صحیحہ میں شمار ہونے لگا۔ اور کارل مارکس کی تعلیم میں جو اشتراکیت کا سب سے مکمل اور مؤثر نمونہ ہے علوم صحیحہ کے سوا اور کوئی علم مادّے کے سوا وجود کی کوئی اور شکل، اشتراکیت کے سوا زندگی کا کوئی اور نظام تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اشتراکی فلسفۂ حیات میں مذہب کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اوّل اِس وجہ سے کہ اشتراکیوں کے نزدیک مذہب، سرمایہ داروں کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار رہا ہے، اور اُسی کی بدولت کسان اور مزدور اپنے حق سے محروم اور اپنی غلامی سے مطمئن رکھے گئے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ انسان کا وجود بالکل مادّی ٹھہرایا گیا ہے اور انسان کے تمام عقائد، حوصلے، خیالات، احساسات اور خواہشیں مادّی اثرات اور خارجی تحریکوں کا نتیجہ مانی گئی ہیں۔ ایسے نظریئے یورپ میں بھی پیش کئے گئے، اور وہاں وہ مجموعی طور پر دہریت کہلاتے تھے۔ روس میں یہ نظریوں کی حد سے گذر کر عقائد بن گئے ہیں، ان کی ہر طرح سے تبلیغ کی جاتی ہے، اور وہ ایک مذہب ہے جو تمام اور مذہبوں کے مٹانے کی فکر میں ہے۔ چونکہ باقی دُنیا کے تمدّن اور تہذیب کا انحصار سرمایہ داری اور بڑے پیمانے کی صنعت پر ہے، اور کسان اور مزدور ہر جگہ اپنے حق سے کم و بیش محروم رکھے گئے ہیں، روسی اشتراکیت اپنے حریفوں کی جماعت میں بدنظمی اور فساد پیدا کرتی رہتی ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر اُسے آخر میں اُن پر فتح حاصل ہو۔

تہذیب، انسان کی دلچسپیوں کو اِس قدر بڑھا دیتی ہے کہ دولت جمع کرنا زندگی کا واحد مقصد نہیں بن سکتا۔ لیکن دولت کے بغیر تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ یورپ کی مہذب قومیں امریکی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکیں، اس لئے جنگِ عظیم کے بعد سے امریکہ کی نقل ہونے لگی، صنعتی کامیابی پر اور تمام حوصلے قربان کئے جانے لگے۔ دوسری طرف روسی اشتراک کو زور پکڑتے دیکھ کر سرمایہ دار اور خوش حال طبقوں میں فاشسٹ تحریک کی ابتدا ہوئی جس کا اِس وقت جرمنی اور اطالیہ میں دَور دَورہ ہے۔ اِن دونوں تحریکوں میں وہ ذہنی اور اخلاقی اُمنگیں، نوعِ انسانی اور عقیدے کا وہ احترام جو تہذیب کی جان ہے نظر انداز کیا گیا ہے، انسانوں کو انھوں نے بھی ایک بڑی مشین کے کل پرزے

بنا دیا ہے۔ بس مشین کا نام دوسرا رکھ دیا ہے اِسی بنا پر میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یورپی تہذیب مشین پرستی اور لامذہبیت کا مقابلہ نہیں کرسکی ہے۔

ہندوستان میں مشین پرستی کے رواج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے یہاں جو رہی سہی صنعتیں ہیں وہ تباہ ہوجائیں گی، ہمارے سرمایہ دار اِس فکر میں پڑجائیں گے کہ ہر کام مشین سے کریں، اور اگر وہ اِس میں کامیاب ہوئے تو ہمارے مزدوروں پر ہر پانچ دس سال کے بعد فاقہ کشی کی مصیبتیں نازل ہوا کریں گی۔ اگر زمین کی کاشت مشین سے ہونے لگی، اور کسان کو مقابلے سے محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اور بھی طوفان برپا ہوگا۔ دوسری طرف روسی اشتراکیت کے رواج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم انگلستان کی جگہ روس کے غلام بن جائیں گے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہماری قوم ممکن ہے برسوں تک ایسے چارہ سازوں کا تختۂ مشق بنی رہے جو نہ ہماری سیرت کا خیال کریں گے نہ ہماری روایات اور ہمارے مذہب کا پاس و لحاظ کریں گے اور جو اپنی پیاس بجھانے کے لئے خون کی ندیاں بہائیں گے۔

ان آفتوں سے بچنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ جمہوری حکومت اور صنعتی خودمختاری جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں دونوں ہماری حفاظت کے لئے کام نہ آئیں گی۔

سیاسی آزادی دنیا کے بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر جمہوری طرزِ حکومت جو کسی زمانے میں ہر مرض کا علاج سمجھا جاتا تھا، ہر جگہ بے وقعت ہو رہا ہے۔ معاشی آزادی بھی بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر بڑے پیمانے کی صنعت اتنی مدت سے معاشرت اور تخیل پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے قوموں کو ایسی الجھیڑوں میں پھنسا دیا ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے وہ سب کو اپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔ اشتراکیت کے پہلے مجاہد یہ دعوے کرتے تھے کہ دنیا کی معاشی اور صنعتی کشمکش اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی غائب ہوجائے گی مگر روس کی اشتراکی حکومت ہر طرح کے سرمایہ داری نظام کی نقل کر رہی ہے، اور اس میں ایک یہ شیطانی جذبہ اور ہے کہ ساری دنیا کے معاشی نظام کو درہم برہم کر کے ہر جگہ اتنا فساد برپا کرے کہ مزدور اور کسان، نظامِ حکومت پر قبضہ کرلیں اور سرمایہ داروں کو بے دخل کردیں۔

ہمارے لئے یورپ اور امریکہ کی جمہوریت اور سرمایہ داری، روس کی اشتراکیت اور جنگ جوئی

مطالعہ کے لائق ہیں، تقلید کے لائق نہیں ہیں ہم کو اُن سے سبق لینا ہے اور اُن کی کمی پوری کرنا ہے اپنے ملک میں ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو چُست اور مضبوط ہو۔ اپنے اندر ترقی اور نشو ونما کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی بقا کے لئے کسی دوسرے کو ہلاک کرنے پر مجبور نہ ہو۔ ہمارے مُلک میں نئی تہذیب، نئی سیاسی زندگی، نئی صنعت اور نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ ہم کسی رستے پر اتنی دور نہیں نکل گئے ہیں کہ واپسی میں بہت زیادہ زحمت ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم ایک مذہب کے پیرو ہیں جو ایک نہیں ہزار تہذیبوں کی روح و رواں ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یقین پختہ ہو اور حوصلہ بلند تو ہم اس مہم میں کامیاب ہوں گے اور جہاں اس وقت دوسروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں وہاں شاید دوسروں کی رہبری کریں گے۔

برادرانِ جامعہ!

ہمارا ایک عام عقیدہ ہے کہ مذہب، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اس لئے علم اور مذہب کو جُدا کرنا، سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے بے تعلق سمجھنا، معاشرت اور عادات میں مذہبی آئین کا لحاظ نہ رکھنا بالکل غلط ہے لیکن افسوس ہے ہم اِس صحیح اور مفید عقیدے سے جو نتیجے نکالتے ہیں اُن سے منطق اور مصلحت دونوں کا خون ہوتا ہے، اور ہماری زندگی میں کوئی مذہبی اور روحانی شان پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے شوق میں ہم علم دوستی کے آداب بھول جاتے ہیں۔ ہم ہر چھوٹی بڑی اور اچھی بُری معاشرتی رسم کو شرعی حکم ٹھہرا کر اپنی نشوونما کو روکتے رہے ہیں لیکن اِن مسائل سے یہاں بحث نہیں ہے۔ میں آپ کو خاص طور پر اس نقصان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اِس عقیدے کی غلط تشریح سے ہماری سیاسی حیثیت کو پہنچا ہے۔ کیونکہ ہم ہر مسئلے پر غور کرتے وقت مسلمانوں کے فرائض کو نظر انداز کر کے صرف ان کی فوری اغراض کا خیال کرتے ہیں اور سیاسی اختلافات کو خواہ مخواہ مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ ہمیں بے شک سیاسیات اور مذہب کو جُدا نہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ کبھی نہ کہنا چاہیئے کہ فلاں کام سیاسی ہے، اسے ہم چاہیں کریں یا نہ کریں۔ لیکن فلاں کام دینی ہے اِسے ہم ضرور کریں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ اگر

سیاسی مفاد کے نام سے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی جارہی ہو تو ہم اخلاق کی حمایت کریں، لیکن یہ سمجھ بیٹھنا کہ سیاسیات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، ہندوستان آزاد ہو یا نہ ہو ہندوستانی صنعت اور تجارت ترقی کرے یا نہ کرے ہمیں کوئی مطلب نہیں یہ مصلحت اور میرے خیال میں ہماری مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنے مذہب اور اپنی روایات کی صحیح ترجمانی کریں تو ہم کو قوم پرستوں اور آزادی کے مجاہدوں میں سب سے آگے ہونا چاہیئے۔ ہم کو علوم وفنون، صنعت اور تجارت پر اپنا سکّہ جمانا چاہیئے، اور جن حقوق کے لئے ہم اس وقت ایک نہایت مضحک اور مہمل طریقے پر لڑ رہے ہیں انھیں سیاسی زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر بغیر حجت اور مطالبے کے حاصل کرنا چاہیئے۔ لیکن آزادی کے لئے قربانیاں کرنا، جمہوری حکومت کا ایک سلجھا ہوا نظام قائم کرنا، اور اُسے خود مختاری اور فرماں برداری، آزادی اور ضبطِ نفس، خدمت اور ایثار کی نمایاں مثالیں پیش کر کے مستحکم کرنا درحصل ہمارے فرائض کا صرف ایک حصہ ہے۔ ہمیں اُن معاشرتی اصلاحوں کا ذمہ بھی اپنے سر لینا ہے جس کے بغیر ہماری جماعت روسی اشتراکیت کے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور مذہبیت کی تخلیقی قوت کے اوصاف اور کارنامے دنیا پر ظاہر کر کے لا مذہبیت کے فساد کو دور کرنا ہے۔

برادرانِ جامعہ! ہر کام کے لئے موقع درکار ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل کے لئے ایک میدان چاہیئے۔ دنیا کا ہر مُلک ہمارا مُلک ہے۔ اِس لئے کہ وہ ہمارے خدا کا مُلک ہے۔ مگر کیا اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو ہر جگہ پردیسی بن کر رہنا چاہیئے۔ وہاں کی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا وہاں کی مشکلوں کو اپنی مشکلیں نہ سمجھنا چاہیئے؟ اِس وقت ہندوستان، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور ہریجنوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے، اور سب کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہندوستان کا وہی حصہ اُن کا ہے جس میں اُن کی اکثریت ہے، اور سب جو چاہیں سمجھیں، مسلمان اب تک ہندوستان کو ایک مکمل سیاسی وجود مانتے آئے ہیں اور اِس عقیدے سے اُن کی اپنی تعداد کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم کو شمالی ہندوستان میں ایک متحد مرکزی حکومت قائم کئے ہوئے چند ہی سال گذرے تھے جب تاتاریوں نے

اُکر عالم اسلامی کو تہ و بالا کر دیا۔ ہماری کمزور نوعمر ریاست نے اُن کا بڑی جاں فشانی اور استقلال سے مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو اُن کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہ یقیناً جاں بازی اور حسنِ انتظام کا کرشمہ تھا۔ راجپوتوں کی حکومت کو چند حملوں نے ختم کر دیا۔ مرہٹوں کے حوصلوں کو ایک فیصلہ کن جنگ نے خاک میں ملا دیا۔ انگریز بھی غداری اور دغابازی کا سہارا لئے بغیر میدان میں آنے کی ہمت نہ کر سکے، اور انھیں بھی اگر پچھتر برس تک مسلسل تاتاروں جیسے بے باک دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو خدا جانے اُن کا کیا حشر ہوتا۔ ہم ہندوستان کے لئے غیروں سے لڑے اور اپنے مذہب والوں سے لڑے، ہم نے اُسے فساد سے بچانے کے لئے اپنوں کا خون کیا۔ ہندوستان اگر ہمارا ملک نہیں ہے تو کس کا ہے۔ اس کا حق ہم پر نہیں ہے تو کس پر ہے۔ آپ اپنی تاریخ اور روایات پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج کل آپ اِس مُلک اور اِس مُلک کے دوسرے باشندوں سے کیسی غیریت اور بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ آپ کے اجداد نے کس ہمت اور استقلال سے اندرونی مشکلات اور بیرونی دشمنوں کا سامنا کیا۔ اور اس وقت آپ کس پست ہمتی سے اکثریت اور تحفظِ حقوق کا آسرا ڈھونڈھتے ہیں ہندوستان بے شک اِس اعتبار سے ہمارا مُلک نہیں ہو سکتا کہ ہم بغیر کسی کی شرکت کے اس پر حکومت کریں۔ لیکن اِس اعتبار سے وہ ہمیشہ ہمارا ملک رہے گا کہ اس امن و عافیت اور بہبود کے لئے ہم نے اپنا خون بہایا ہے، ہم نے اُسے مقام پرستی اور تنگ نظری کی قید سے چھڑایا، ہم نے ایسی معاشرت کا نمونہ پیش کیا جس میں ذات اور نسل کا امتیاز نہیں تھا۔ اور ہم نے اُسے ایک آزاد مذہب کا پیغام سنایا۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں میرے نزدیک ضرور اتنا فرق ہے کہ اب ہمیں اتحادِ عمل کا سبق پڑھنا اور پڑھانا ہے اور یہ ہمارے لئے ہر طرح سے مفید ہوگا۔

اِس وقت ہمارا سیاسی اور دینی فرض یہ ہے کہ ہندوستانی اتحاد کا جھنڈا کھڑا کریں۔ اور اتحاد کے ارادے کو اتنی تقویت پہنچائیں کہ وہ ہر ضروری انتظامی تفرق پر غالب رہے۔ دوسرے اگر اس میں کمزوری بھی دکھائیں اور زبان یا نسل یا مصلحت کی آڑ لے کر اپنی اغراض اور اپنی دلچسپیوں، اپنے مقاصد اور حوصلوں کو محدود کرنا چاہیں۔ تب بھی ہمیں اتحاد اور وحدت کے شیدائی بنے رہنا چاہئے۔

سیاسی تفریق زیادہ گہری ہوگئی تو ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری ملت میں بھی انتشار پیدا ہو جائے گا۔ ایک خطے کے مسلمان، دوسرے خطے کے مسلمانوں کو بیگانہ سمجھنے لگیں گے، ہم میں ابھرنے اور ترقی کرنے کا جو مادہ ہے وہ آہستہ آہستہ زائل ہوجائے گا، اور ہم بالکل مقام کے غلام ہو جائیں گے۔ مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق مذہب اور روایات کے رو سے مناسب نہیں ہے، اور جب وہ مصلحت اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہو تب تو اسے کسی حالت میں گوارا نہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی دوسری ملتوں کو یگانگی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آ رہی ہیں، اس وجہ سے وہ وطن پرستی اور قوم پرستی پر زور دیتی ہیں اور اُسے ایک سیاسی مذہب بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہمیں اُن کی مجبوری دیکھ کر اُن پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ وہ بے شک چاہیں تو وطن پرستی کے گیت گائیں اور وطن کو دیوی بنا کر اُس کی پرستش کریں۔ ہماری خداپرستی ہمارے لیے کافی ہے۔

اتحاد کے بعد نظامِ حکومت کا سوال آتا ہے۔ مسلمانوں میں جمہوری حکومت بھی رہی ہے اور خلافت کے نام سے غیر ذمہ دارانہ حکومت بھی ہوئی ہے۔ ہم میں نیک بادشاہ ہوئے ہیں اور ظالم بھی ہوئے ہیں۔ لیکن جو طرزِ حکومت ہمارے دینی اور اخلاقی آئین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ جمہوری حکومت ہے۔ جمہوری حکومت ہزاروں طرح کی ہوتی ہے اور اُس کا نظام قوم کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق بدلا جا سکتا ہے۔ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھے، حکومت کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ جانے، اِس کی کامیابی میں اپنی کامیابی اِس کے عیب میں اپنا عیب دیکھے۔ آپ کے سامنے اِس دعوے کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ اِس وقت ہماری قوم، حکومت کو غیروں کی حکومت سمجھتی ہے۔ اِس جمہوریت سے جس کے حاصل کرنے کی آج کل کوشش کی جا رہی ہے، اِس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے، اور انگریزوں کے طعنے سُن کر بھی ہمارے سیاسی رہنما کوئی دستور اور نظامِ حکومت متفقہ تجویز کے طور پر پیش نہیں کر سکے ہیں۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی تحریک دراصل بے بُنیاد ہے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ملے گی تو کیا کریں گے۔ ہماری سیاسی زندگی میں آزادی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے تنکوں کو۔

اِس سے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا طرزِ عمل سراسر غلط ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے تخیل میں ایک خلو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم مرکزی حکومت میں اختیار چاہتے ہیں جب ہمیں گاؤں میں کوئی اختیار نہیں، ہم قوم کے ارادے اور حوصلے کی قسمیں کھاتے ہیں جب قوم کے بچانوے فی صدی افراد ہماری باتوں کو سنتے نہیں اور سنتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں۔ ہماری سیاسی تحریک میں جان اُس وقت پڑے گی جب وہ کسان اور مزدور کے گھر سے شروع ہو۔ جب اس کے مقاصد قوم کے مشترک مقاصد ہوں، اور فقط ایک تعلیم یافتہ طبقے کی اغراض نہ ہوں لیکن سوا چند سر پھرے نوجوانوں کے ہمارے سیاسی رہنما کسان اور مزدور بلکہ ہر طرح کے غریب آدمی سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور اُن کا یہ خوف بے جا نہیں ہے۔ اوّل تو حکومت برطانیہ اُسی وقت تک چشم پوشی کرتی ہے جب تک آزادی اور اختیاراتِ حکومت کی بحث تعلیم یافتہ طبقے کی دلچسپی ہی رہے۔ کیونکہ مزدور اور کسان تک بات پہنچ گئی تو اس کا کام بگڑ جائے گا، دوسرے یہ کہ ہمارے رہنما اور آزادی کے مجاہد، مزدوروں اور کسانوں کی شرکت سے گھبراتے ہیں، اس لئے کہ پھر وہ بھی اپنا حق مانگیں گے اور اُنھیں اُن کا حق دینے پر کوئی تیار نہیں ہے۔

لیکن ہم بہت دنوں تک کسانوں اور مزدوروں کو اپنی سیاسی معاشرتی تحریکوں سے بے خبر اور بے تعلق رکھ نہیں سکتے۔ ہمیں اُن کے پاس جانا ہوگا اور کچھ کھٹنے لے کر جانا ہوگا آپ جانتے ہیں چند سال ہوئے ایک اشتراکی پارٹی قائم ہوئی تھی جو اس وقت کچھ کانگریس کے ساتھ ہے کچھ اس سے علیحدہ مگر تھوڑے دنوں میں وہ یقیناً ایک جداگانہ حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے رہبر ہمّت نہ ہارے تو اس کا اثر کانگریس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ آج کل ہماری تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر نوجوان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے آپ کو اشتراکی بتائیں گے، اور ان میں سے اکثر مذہب، روایات اور پرانی تہذیب کو مٹانا چاہتے ہوں گے۔ ابھی تک اشتراکی پارٹی اور اشتراکیت پسند نوجوان اپنے عقاید کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ جب کوئی آزمائش کا موقعہ آئے گا یا وہ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو اُن کی بہت بڑی تعداد اشتراکیت سے توبہ کر کے الگ ہو جائے گی، لیکن اِس کا بھی امکان ہے کہ اُن میں

تھوڑے سے جاں باز پیدا ہو جائیں اور اُنھیں ذرا بھی مہلت مل گئی تو وہ ایسی آگ لگا دیں گے جو پھر کسی کے بجھائے نہ بجھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی رہبر اشتراکی پارٹی سے مصالحت کرنے میں ناکامیاب ہوئے ہیں، اور جب تک وہ ہندوستان کے سرمایہ داروں کا سہارا ڈھونڈھتے رہیں گے اُنھیں مصالحت کی اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ اس طرح سے اشتراکی پارٹی اُن لوگوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہے جو کسی قدر محتاط ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں نوجوانوں کو کسی ایسے ڈھرے پر لگانے سے قاصر ہیں جو اشتراکیت کی طرح اُن کے تخیل کو گرویدہ کر سکے، یا جو اُن کے عقائد میں گہرائی پیدا کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح ہمارے سیاسی حوصلوں کی کشتی بغیر ناخدا اور بغیر قطب نما کے چکر کھاتی کناروں سے ٹکراتی چلی جا رہی ہے، اور کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر ٹھہرے گی، ویسے ہی ہماری معاشی اور صنعتی اصلاح بدنظمی اور انتشار کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہوگی۔

اس وقت بہت سے مسلمان نوجوان ہیں جو اشتراکیت کے بہت جوشیلے حامی ہیں، مگر اُن کے خیالات کا اثر ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے مسلمان اشتراکیت کے مسئلے سے نہ واقفیت رکھتے ہیں نہ دلچسپی۔ اس معاملے میں اُن کی غفلت اُن کے اور ہندوستان کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ہوگی جتنی کہ اتحاد اور جمہوریت کے مسائل میں، کیونکہ اُن کی فطرت، سرشت اور عقائد میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اشتراکیت کی تحریک کو لامذہبیت، مشین پرستی اور اخلاقی بے لگامی کی آلائشوں سے پاک کر کے مساوات، انصاف اور حقوق و فرائض کی صحیح تقسیم کا حامل بنائیں۔ اشتراکیت کی تحریک ابتدا میں بس اِس کی ایک کوشش تھی کہ مزدوروں کو وہ تمام حقوق دیے جائیں جو جماعت میں انصاف اور مساوات کے رو سے ہر شخص کے ہونے چاہئیں اور کارخانوں میں اُن پر جو مظالم ہوتے تھے وہ بند ہو جائیں۔ لیکن سرمایہ داری کی اصلاح کا یہ طریقہ بے اثر ثابت ہوا، کیونکہ دوسری طرف سرمایہ داروں کو ہر قسم کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کی فکر کی جا رہی تھی اور صنعتی کاروبار کا پیمانہ بڑھایا جا رہا تھا۔ آخر میں سرمایہ داری کا نظام اس قدر مستحکم ہو گیا کہ وہ ریاستوں کے قابو سے بھی باہر ہو گیا، اور اسی زمانے میں ہزیمت خوردہ اشتراکیت ایک نئے اور جامع

فلسفۂ حیات کی صورت لے کر کارل مارکس کی تعلیم میں نمودار ہوئی۔ کارل مارکس کے فلسفے میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش انسانی زندگی اور تاریخ کا لب لباب ہے۔ اس میں موجودہ عہد کی سرمایہ داری صنعتی ترقی کی منزلِ مقصود قرار دی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ساری دنیا کا صنعتی نظام آخر میں چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے گا تب مزدوروں کو اس کا موقع ملے گا کہ وہ صنعتی دنیا کے ان چند بادشاہوں کو معزول کرکے اُن کی سلطنت پر قبضہ کرلیں اور حکومت جو اُن کا حق ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ کارل مارکس کو یقین تھا کہ اگر مذہب اور مذہبی رہنما ملکیت کے حق کو دینی اور اخلاقی قانون بناکر اہلِ سرمایہ کی مدد نہ کرتے اور مزدوروں اور کسانوں کو جنت اور روحانی تسلیوں کا فریب دے کر قناعت اور بردباری پر آمادہ نہ رکھتے تو وہ ہزاروں برس کی غلامی ہرگز برداشت نہ کرتے۔ اس وجہ سے کارل مارکس نے لامذہبیت کو اپنی اشتراکی تعلیم کا سنگِ بنیاد بنایا اور یہی سبب ہے روسی اشتراکی جو کارل مارکس کی تعلیم کو عینِ حقیقت مانتے ہیں مذہب کے وجود کو مٹانا چاہتے ہیں۔

کارل مارکس کے تقریباً تمام نظریے غلط ثابت کئے جاچکے ہیں اور روس میں بھی اُن پر برائے نام عمل ہو رہا ہے لیکن اب وہ ایک مذہب بن گئے ہیں جس کی نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ تبلیغ کی جاتی ہے، اور دُنیا میں جہاں کہیں بھی افلاس یا بے چینی ہے وہاں یہ مذہب بہت آسانی کے ساتھ پھیل جاتا ہے، ہم اس کا مقابلہ دلیلوں سے نہیں کرسکتے، اگر ہم اس سے نفرت ظاہر کریں گے اور اس کے پیروؤں پر کسی قسم کا جبر کریں گے تو اُن کا عقیدہ اور مضبوط ہوجائے گا۔ اس سے ہم رواداری بھی نہیں برت سکتے، کیونکہ وہ خود رواداری کو غلط سمجھتا ہے اور جس طرح روس میں مذہب نیست و نابود کر دیا گیا ہے ویسے ہی ہندوستان میں بھی فنا کر دیا جائے گا۔ مذہب اشتراک کا توڑ صرف ایسی اصلاحیں ہوسکتی ہیں جو ہمارے ملک کے افلاس کو دور کریں اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے شکایت کا موقع نہ رکھیں۔

صحیح اشتراکیت کے معنی یہ ہیں کہ دولت کی قدر انسان کی قدر سے بڑھنے نہ پائے، اور

افراد کے حقِ ملکیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر جماعت کے بہت بڑے حصّے کو فاقہ کرنے اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اشتراکی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین اور سرمایہ افراد کی جگہ جماعت کی مِلک قرار دیا جائے۔ اور جماعت کے ہر فرد کو اس سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ سرمایے کے استعمال کی ترکیب کیا ہوگی' یہ ہر جماعت کی معاشی حالت پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ہرگز لازمی نہیں ہے کہ اشتراکیت کے اصولوں پر اُسی وقت عمل کیا جائے جب بڑے پیمانے کی صنعت کا رواج ہو جائے۔

اگر ہم امریکہ کی مشین پرستی اور روسی اشتراک کے فریب میں نہ آئے' اگر ہم نے کسان کے سر سے مالگذاری' زمیندار اور سودخوار کا بوجھ ہلکا کر دیا اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دے سکے' اگر ہم نے شہروں میں وہی صنعتیں رائج کر دیں جنھوں نے کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دُنیا میں مشہور کر دیا تھا' اگر ہم نے اپنے تعلیم یافتہ طبقے کو ذہنی غلامی سے آزاد کر لیا تو ہم ہندوستان میں بھی بہت جلد ایک اشتراکی نظام قائم کر سکتے ہیں' اور ممکن ہے ہم انتظامات کی خوبی میں روسی اشتراک سے بازی لے جائیں۔

مشکل صرف یہ ہے کہ اور مُلکوں کی طرح ہندوستان کی اصلاح میں ہم اپنے عقیدے اور ملت کے سوا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے۔

میں نے یہ بحث اس سوال سے شروع کی تھی کہ ہم ان دشواریوں کو جو کسبِ معاش میں پیدا ہو گئی ہیں کس طرح سے دور کر سکتے ہیں۔ یہ مشکل صرف چند افراد کو نہیں پیش آ رہی ہے بلکہ ہماری ملک کے بیشتر نوجوانوں کو' اور ضرورت ایسی تدبیروں کی ہے جو کم از کم چار نسلوں کے لئے فراغت اور عافیت سے زندگی بسر کرنے کا سامان کر دیں' اسی خیال سے میں نے موجودہ زمانے کی عالمگیر تحریکوں پر جن سے ہندوستان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا' نظر ڈالی تھی' اور پھر یہ عرض کیا تھا کہ ہماری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی جب تک ہم مُلک کے اندر پورا اختیار حاصل نہ کر لیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ دُنیا کی اور اپنے ملک کی حالت کو سامنے رکھ کر پھر اس مسئلے پر غور کریں۔

اب تک جو غلطی زیادہ تر نوجوان کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ سوا اُن ملازمتوں کے جہاں ایک خاص ہنر سیکھے بغیر کام نہیں چلتا انھوں نے اپنی اہلیت اور شوق کا بالکل خیال نہیں کیا، اور اس لئے آپ کو سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ آپ کو کس کام کا شوق ہے یا کس کام کو آپ بغیر اپنی طبیعت پر خاص جبر کئے کر سکتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آدمی کا بہت کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس کا تجربے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ یہ تجربہ آپ کو بھی کرنا ہے، مگر اسے اس وقت نہ شروع کیجئے۔ جب آپ تعلیم سے فارغ ہو جائیں بلکہ طالب علمی کے زمانے کو جہاں تک ہو سکے مشق کا زمانہ بنائیے۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی اور قومی ضروریات اور فرائض کو پیش نظر رکھئے طرح طرح کے کاموں میں اپنی استعداد کو آزما کر دیکھئے، ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے جو کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں، اور پھر جب آپ دنیا میں قدم رکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی منزلِ مقصود کدھر ہے

اس وقت آپ کے دین، آپ کی ملت اور قوم کو جس طرح کی خدمت درکار ہے اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے آپ کا لیڈر بننا مفید نہیں ہے، اور یہ اور بھی مضر ہوگا کہ آپ جو کچھ کریں اُسے ایثار یا جہاد سمجھیں۔ آپ جو کام اپنے ذمے لیں وہ آپ کا ذریعہ معاش، آپ کا شوق اور آپ کے وجود کا دنیاوی مقصد ہونا چاہئے، اور ان تینوں نسبتوں سے آپ کو اس سے لگاؤ ہونا چاہیے۔ آپ کے تعلیم پانے کا ہرگز یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ پیشوں کے مدارج قائم کریں، اور پسند پیشوں کے سوا اور سب کو اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھیں، بلکہ آپ کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہئے کہ ناکامیاب قومی لیڈر سے کامیاب گھسیارا بہت زیادہ قابلِ عزت ہوتا ہے۔ اپنا پیشہ منتخب کرتے وقت روشن خیالی، مصلحت، حوصلے سے کام لیجئے۔ جب ایک مرتبہ آپ انتخاب کر لیں تو سمجھ لیجے کہ آپ کی عزت آبرو کامیابی میں ہے۔

پیشے کا انتخاب کرتے وقت آپ کو قومی مفاد کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے صرف اس نیت سے نہیں کہ آپ اپنے دل کو مطمئن رکھ سکیں، بلکہ اس نیت سے بھی کہ اس میں آپ کا اور آپ جیسے بہت سی

افراد کا فائدہ ہے۔ آپ ملازمت کریں تو ایسے اداروں کی کیجئے جو نظامِ حکومت کے کل کے پرزے نہ ہوں، مگر جن کا مقصد قوم کی بہبود ہو جیسے تعلیمی ادارے۔ آپ کو کاروباری زندگی کا شوق ہو تو کوئی ایسا کام پسند کیجئے جس سے ملک کی سچی دولت میں اضافہ ہوتا ہو۔ اِس لئے کہ وہ تجارت جس میں مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی جاتی مگر مال پہنچانے والا منافع میں حصہ دار ہو جاتا ہے، دراصل نقصان دہ ہوتی ہے اور سرمایہ داری کی سب سے مضر خصوصیتوں میں سے ہے سب سے اچھا حوصلہ آپ کے لئے یہ ہوگا کہ آپ شہری زندگی کو چھوڑ کر گاؤں میں اپنا گھر بنائیں، وہاں اپنی روشن خیالی، خود داری اور تعمیری حوصلوں کا دیا جلائیں۔ اگر آپ کوئی ہنر سیکھ چکے ہوں تو ان صنعتوں میں جان ڈالیں جن پر گاؤں کی خوش حالی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اگر کاشتکاری کر سکتے ہوں تو اس میں اصلاح اور جدت کر کے دوسروں کو نئی راہیں بتائیں۔ اِس سلسلے میں آپ ایک طرف زمینداروں کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو لگان وصول کرنے کے ٹھیکے دار نہ سمجھیں بلکہ کاشتکار بن کر زمین پر اپنا حق ثابت کریں۔ دوسری طرف آپ دیہاتی آبادی کو سود خوار کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں جو غالباً اِس زمانے کا سب سے اہم اصلاحی کام ہے اور جو اُسی وقت انجام دیا جا سکتا ہے جب آپ گاؤں میں اپنے قدم جمائیں اور سود خواری کو جڑ سے اکھاڑنے کا تہیہ کر لیں۔ اِس زمانے میں گاؤں اور شہر کا سیاسی رشتہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے اِسے دوبارہ قائم کیجئے۔ جمہوری حکومت کی راہ و رسم سے واقفیت اور لگاؤ پیدا کیجئے، اور اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو مستحکم کیجئے۔

لیکن آپ گاؤں میں ہوں یا شہر میں، آپ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ آپ اپنی کامیابی کے ذریعے سے اِن اخلاقی اوصاف کا چرچا کریں جن پر آپ کی اور آپ کی قوم اور ملت کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس وقت ہمارا سب سے نمایاں عیب ہماری متلون مزاجی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ صبر، محنت اور استقلال کا مادہ پیدا کریں اور اپنی ذات نہیں بلکہ اپنے کام اور اپنی کارگزاری کی بدولت بڑے بننے کا حوصلہ کریں۔ متلون مزاجی کی طرح آرام طلبی اور فضول خرچی بھی مسلمانوں کی سرشت میں داخل ہوگئی ہے جس کے سبب سے سادہ زندگی بلکہ سلامت روی خلافِ تہذیب سمجھی جانے لگی ہے۔ بہت سے نوجوان تعلیم اِسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ

ٹھاٹھ سے رہیں، اور یہ غرض پوری نہ ہو تو ان کے لئے زندگی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ آج کل کی بے روزگاری بڑی حد تک اسی ٹھاٹھ سے رہنے اور روپیہ اڑانے کی ہوس نے پیدا کی ہے۔ کیونکہ بیکاری کا آرام سب کو اچھا لگتا ہے۔ محنت کی جاں فرسا مشقتوں کے چاہنے والے بہت کم ہیں۔ ہماری یہ بری عادتیں دراصل اس طرح پڑی ہیں کہ ہمیں ایک زمانے سے ضبط کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے، اور ہمیں اپنے اوپر بہت کم اختیار رہ گیا ہے۔ ہمارا تخیل ہمیں ایک طرف کھینچتا ہے، تو عقیدہ دوسری طرف، ہمارا کام، محنت کا تقاضا کرتا ہے تو شوق آوارہ گردی اور گپ شپ کا۔ اسی کشمکش میں ہم کو نہ وقت کا خیال رہتا ہے نہ وعدے کا اور وہی کام جو ہم بڑے جوش اور بڑی امیدوں سے شروع کرتے ہیں ہمیں مایوس اور بیزار ہو کر چھوڑنا پڑتا ہے لیکن استقلال، سلامت روی اور ضبط قدرتی صفتیں نہیں ہیں، وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے پیدا کی جاتی ہیں اور آپ کا یہ حوصلہ ہونا چاہئے کہ طالب علمی کے زمانے میں اپنی شخصیت کو ان اوصاف سے آراستہ کریں۔

یہی اوصاف ہیں جو آپ کی اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے علاوہ آپ کو مذہب اور تہذیب کی خاطر مشین پرستی اور لامذہبیت سے لڑنے میں مدد دیں گے۔ وہ قومیں جن کے عقائد اور معیار میں مادی زندگی، انصاف اور مساوات کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی کہ موجودہ زمانے کی مشین پرست اور لامذہب قومیں کرتی ہیں وہ مقابلے میں ضرور شکست کھائیں گی اور ہماری حالت یہی رہی جو اب ہے تو ہم بھی آہستہ آہستہ مشین پرست اور لامذہب ہو جائیں گے، اسی طرح جیسے انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اثر سے ہم یورپ پرست اور لامذہب ہو گئے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک نئے، اور اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے بہترین نظام معاشرت میں روح پھونک سکتا ہے، وہی ایسا مذہب ہے جس کے سائے میں ایک نئی تہذیب پرورش پا سکتی ہے، کیونکہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مشین پرستی کے نظامِ حیات اور اشتراکیت کے بہترین عنصر جذب کر لے اور علم و عقل اور مادی زندگی کا احترام جو حقیقت میں مادیت اور لامذہبیت کا جوہر ہے مسلمانوں کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے قابل قدر صفت یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی تمام ذہنی اور معاشرتی تحریکوں میں توازن اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے اور ایک معاشرتی انقلاب کو جو اب

ٹالے نہیں ٹل سکتا، اور جس کا ہنگامہ قیامت سے کم نہ ہوگا، وہ ارتقاء اور نشو ونما کی صورت دے کر فساد اور خوں ریزی سے پاک کر سکتا ہے۔ اسلام سے ملی اور ملکی زندگی کو یہ فیض پہنچانا مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے، اور آپ کا مستقبل بہت ہی قابلِ رشک ہوگا۔ اگر آپ یہ خدمت انجام دے سکیں ؏

غزلیاتِ جوشش عظیم آبادی

(مرسلۂ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی)

روشن علی جوشش عظیم آبادی بارھویں صدی کے آخر میں پٹنہ کے نادرۂ روزگار شاعر گذرے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کی بلندیِ فکر، ندرتِ تخیل اور مہارتِ عروض کی بہت تعریف کی ہے۔ میر حسن دہلوی لکھتے ہیں:-

"مردیست ساکن عظیم آباد خوش طینت و نیک اعتقاد، شاعرِ شیریں کلام صاحب دیوان، از خاصانِ آں دیار است کلامش شاعرانہ است شخصے می گفت کہ او در تالیف تذکرہ مشغول است" (تذکرہ شعرائے اردو ص۶۵)

گلشنِ بے خار میں ہے:-

"از تازہ خیالانِ عظیم آباد است شعرش صاف و بے غش فکرش دلپذیر و دلکش شیوۂ گزیدہ اش گزیدہ و طرز پسندیدہ اش پسندیدہ درفنِ عروض بسیار مہارتِ دل خواہ داشت۔"

جوشش کے تذکرۂ شعرا کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ دیوان بھی بے حد نایاب ہے۔ خوش قسمتی سے جوشش کا نایاب دیوان صوبہ بہار کے مشہور شاعر اور محدث علامہ شوق نیموی کے کتب خانے میں (علامہ موصوف کے والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا) موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اِس کے سوا دیوانِ جوشش کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۳۸ھ ف کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کا زیادہ حصہ کرم خوردہ ہے۔ ۴۷۲ صفحات میں تمام ہوا ہے آخر میں چند رباعیاں بھی ہیں۔ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی کے زیرِ اہتمام اِس کا انتخاب عنقریب شائع ہوگا۔ چند غزلیں ناظرینِ جامعہ کے لئے ہدیۂ خدمت ہیں:-

غزلیں

تعلقاتِ جہاں سے خبر نہیں رکھتا — ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا
بتوں کے دل میں جگہ کی نہ نالۂ نے نے — ہزار حیف یہ نالہ اثر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کھول روتا ہوں — تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا
نہ ہے نصیب کہ دلدار سے ہم اس دل کو — ہزار کہتے ہیں رکھنے کو پر نہیں رکھتا
دل و جگر کو تو پوچھے ہے کون اے جوشش
حضور اس کے میں اپنی خبر نہیں رکھتا"

اگر منظور ہو اے عشق! دل کو پاک کر دینا — تو اسبابِ تعلق کو جلا کر خاک کر دینا
جنوں! بافہمیدِ معنی میں تجھے گر دستِ قدرت ہو — گریبانِ تعلق بے تامل چاک کر دینا
تجلی تیری یارب برقِ عقل و ہوش ہے لیکن — مجھے تو روشناسِ شعلۂ ادراک کر دینا
یہ مشتِ استخواں باقی ہے اب اے چشمِ خوں گریہ — اسے بھی بحرِ غم کا تو خس و خاشاک کر دینا
اگر جوشش نہ روتا ہو ترے دردِ محبت سے
الٰہی خشک اس کا دیدۂ غمناک کر دینا

یاد کر تیرے لبِ مے گوں کا اے جاناں نمک — ڈال دیتے ہیں مے گلرنگ میں مستاں نمک
کیوں نہ گل کو دیکھ کر گلزار میں آوے ہنسی، — مدتوں کھایا ہے تیرا اے لبِ خنداں نمک
اے مرے کانِ ملاحت کر نہ مرہم کی تلاش — یہ تو وہ داغِ جگر ہے جس کا ہے درماں نمک
آتشِ دوری میں اس مے خوار کے اے سوزِ عشق — بھن چکا ہے چاہتا ہے یہ دلِ بریاں نمک
یہ تو وہ زخمِ جگر ہے آہ جس کو دیکھ کر — مرہمِ زنگار حیراں ہووے اور گریاں نمک
تیرا لب جاں بخش ہے اور وہ مددگارِ حیات — تیرے آگے کب رکھے ہے چشمۂ حیواں نمک
ہونٹھ اب تک چاٹتا ہے دیکھ جوشش زخمِ دل
آہ کیا رکھتا تھا اس کے تیر کا پیکاں نمک

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے
مانندِ شمع حال ہمارا خراب ہے

دل سے ترے جو اشک نہ آوے عجب نہیں
بریاں ہو جب کباب تو کب اس میں آب ہے

دل کس طرح چمن میں لگے آج باغباں
نے ابر تے ہوا ہے نہ جام شراب ہے

غافل کر اس کی سیر تو عبرت کی چشم سے
ہستی بے ثبات خیالات خواب ہے

خالِ سیہ نہ ہووے یہ رخسارِ یار پر
دیوانِ حسن کا نقطۂ انتخاب ہے

عالم خراب ہووے جو وہ بے حجاب ہو
ہے خیر کچھ اسی میں کہ منہ پر نقاب ہے

لذت ہے خاک عشق کی پیری میں ہم دماں
معشوق خوب رو ہے اور عہدِ شباب ہے

اس میکدے میں کون ہو ساقی سے ملتجی
خونِ جگر شراب ہے اور دل کباب ہے

دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں
جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے

شیخ کو کعبے سے جو مقصود ہے
وہ کنشت دل ہی میں موجود ہے

میرے جلنے کی کسی کو کیا خبر
سوزشِ دل آتشِ بے دود ہے

نے حرم سے کام ہے نے دیر سے
سنا نہ دل ہی مرا مسجود ہے

فرق مت کر عاشق و معشوق میں
خود ایاز اور آپ ہی محمود ہے

کیا پری کیا حور کیا جن و بشر
سب میں وہ شاہد مرا مشہود ہے

مشربِ عشاق میں سلے زاہدو!
اس کا جو مخلوق ہے معبود ہے

سنگ و آہن کو یہ کرتی ہے گداز
آہ ہے یا نغمۂ داؤد ہے

کس سے اے جوشش کہوں میں دردِ دل
میرے اس کے بولنا مفقود ہے

روشن ہوا یہ خانۂ دل اس کے نور سے
موسیٰ نہیں غرض نہیں کچھ کوہِ طور سے

آئینِ عاشقی میں ترقی کی آرزو
رہتی ہے میرے عجز کو اس کے غرور سے

اے غافلو یہ زندگی ناپائدار ہے — باور نہ ہو تو پوچھ لو اہلِ قبور سے
نقشِ حصیر اپنے بدن پر ہے پیرہن — سنجاب سے نہ کام نہ مطلب سمور سے
جز اشک کون دھووے مرے منہ سے گردِ غم — غربت زدہ ہوں آتا ہوں میں راہِ دور سے
آپ ہی میں جل بجھوں گا سحر تک برنگِ شمع — مجھ کو اٹھا نہ دیجیو اپنے حضور سے
پھنس جائے گا تو دامِ تعلق میں یک بیک
جوشش نہ تھی امید یہ تیرے شعور سے

اس ادا کا ہوں تیری دیوانہ — دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا
کیوں نہ صد چاک ہووے دل میرا — ہاتھ ڈالے ہے زلف پریشانہ
شعلہ رو تجھ پہ کیوں نہ ہوں صدقے — شمع پر جل مرے ہے پروانہ
ہوں وہ دیوانہ ناصحو جس کو — ننگ ہے چاک جیب سلوانا
یار غیر دل سے اس قدر کا ربط — اور عاشق کو دیکھ شرمانا
آج ہے جاں بلب ترا جوشش
جی میں آوے ترے تو آجانا

افکارِ پریشاں

خدا کی سب سے بڑی طاقت سبک رَو نسیم ہے،
تیز و تند طوفان نہیں!

آفتاب کا لباس نورِ محض ہے،
بدلیاں رنگا رنگ پوشاک پہنتی ہیں۔

اگر ماہتاب کے لئے آنسو بہاتے ہو،
تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے!

اُس کا پیارا چہرہ میرے خواب میں اِس طرح آتا ہے
جیسے رات کی بارش!

ہم نے خواب دیکھا کہ ہم اجنبی ہیں!
ہم جاگ اُٹھے اور دیکھا کہ ایک دوسرے کے پیارے ہیں!

غم میرے دِل میں اِس طرح آرام سے سو رہا ہے،
جیسے شام خاموش درختوں میں۔

اے سمندر تیری گفتگو کیا ہے ؟
دائمی سوال۔
اے آسمان تیرا جواب کیا ہے ؟
دائمی خاموشی۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح کھلنے دو !
اور موت کو خزاں کی پتّیوں کی طرح مُرجھانے دو !

جڑیں شاخیں ہیں، زمین میں پھیلی ہوئی
شاخیں جڑیں ہیں ہَوا میں چھائی ہوئی۔

دنیا آرزو بھرے دِل کے تاروں پر دوڑتی ہے،
اور اِس سے غم کے سُر نکلتے ہیں۔

پانی میں مچھلی خاموش ہے۔
زمین پر جانور شور کرتے ہیں۔
ہوا میں چڑیاں گاتی ہیں۔
لیکن انسان میں،
سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہَوا کا نغمہ
سبھی کچھ ہے !

ننھی کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے اور چلّا اُٹھتی ہے :
"پیاری دُنیا! جلدی سے ختم نہ ہو جانا!"

پانی کی چڑیوں اور موجوں کی طرح
ہم کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں
چڑیاں اُڑ جاتی ہیں، موجیں بڑھ جاتی ہیں،
ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں!

پرندے کی تمنا ہے کہ وہ بادل ہو جائے!
بادل کو حسرت ہے کہ پرندہ نہ ہوا۔!

آج صبح میں کھڑکی میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
دُنیا مسافر کی طرح آتی ہے
ردا روی میں سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے!

خدا بڑی سلطنتوں سے اُکتا جاتا ہے،
لیکن ننھے پھولوں سے نہیں!

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ :
"خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا!"

پتی پھول ہو جاتی ہے جب محبت کرتی ہے!
پھول، پھل ہو جاتا ہے جب عبادت کرتا ہے!

دنیا عاشق کے سامنے لامحدودیت کا نقاب اُٹھا دیتی ہے
اور اتنی مختصر رہ جاتی ہے جیسے ایک گیت یا ابدیت کا ایک بوسہ۔

یہ دُنیا کے آنسو ہیں جو اُس کے تبسم کو رنگین بنائے رکھتے ہیں

میری آرزوئیں نادان ہیں میرے مالک!
وہ تیرے گیت کے بیچ میں فریاد کرنے لگتی ہیں،
تو گائے جا اور مجھے سُننے دے!

خدا ہم سے پھولوں کا شکریہ چاہتا ہے،
زمین اور سورج کا نہیں!

روشنی جو ایک ننگے بچے کی طرح خوش خوش سبز پتّیوں میں کھیلتی ہے
نہیں جانتی کہ انسان جھوٹ بھی بول سکتا ہے!

حُسن! اپنی حقیقت کو محبّت میں تلاش کر!
آئینے کے خوشامدانہ عکس میں مت دیکھ!

اے خدا تیرا شکر!
کہ میں طاقت کی پہیوں میں سے نہیں،
بلکہ اس مخلوق میں سے ہوں جو اس سے کچلے جاتے ہیں!

تمھارا بت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر خاک میں مل گیا اور ثابت کر گیا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی خاک تمھارے بُت سے ارفع ہے!

زندگی ہمیں دی جاتی ہے —
ہم اِسی کو دے کر اِسے حاصل کرتے ہیں!

شیشے کا جھاڑ مٹی کے چراغ کو جھڑکتا ہے کہ مجھے بھائی کہہ کر نہ پُکار۔ چاند نکل آتا ہے اور شیشے کا جھاڑ شرمائی ہوئی مُسکراہٹ سے پُکار اُٹھتا ہے: میرے پیارے بھائی!

میرے دِل اِن سرگوشیوں کو سُن جن کے ذریعے دنیا تجھ سے اظہارِ محبت کر رہی ہے! ...

حیدر علی

تمہید

اٹھارھویں صدی کا نصف آخر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک تیرہ و تار ورق ہے، اس وقت ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک لوٹ مار، غارت گری کا حشر برپا تھا، سیاسی بدنظمیوں، آئے دن کے انقلابات اور جنگ وجدل سے مُلک سے امن وامان اُٹھ گیا تھا۔ فضائے سیاست پر حوادث کی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اسلامی ہند کی عظمت وجبروت افسانہ ہوکر رہ گئی تھی۔ ہندوستان کا عصائے جہاں بانی ایسے ہاتھوں میں آگیا تھا جو اس کے بوجھ سے کانپ رہے تھے سلطنت کی شمع عشرت پسند حکمرانوں کے محلات میں ٹمٹما رہی تھی شیرشاہ سوری اور اکبر کے پرشکوہ زمانے داستانِ پارینہ، شاہ جہاں اور عالم گیر کے قرونِ اقبال خواب وخیال ہوگئے تھے، سلطنتِ مغلیہ کی نبضیں سست پڑ گئی تھیں جنگِ صد سالہ میں فرانس کی حالت ہرچند بہت سقیمہ ہوگئی تھی اور عوام الناس کامیابی سے بالکل مایوس ہوچکے تھے، تاہم حکمران طبقے کے دل میں حبِ وطن کی آتشِ مردہ کا ایک شرارہ باقی تھا، اور بادشاہ کی ذات کو آفتابِ امید خیال کیا جاتا تھا برخلاف اس کے سلطنتِ مغلیہ کی تباہی تدریجی ہوئی مگر قطعی ہوئی صرف یہی نہیں تھا کہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے والے طبقات بالکل فنا ہوگئے ہوں بلکہ یہ مصیبت تھی کہ بیرونی حملہ آوروں کے چلے جانے کے بعد جسم سیاست کے زخموں کا لہو بند کرنے والوں کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ سلطنت کی حالت ایک نعش کی سی تھی۔ ملکیوں اور غیرملکیوں کی لڑائی، چیل کوؤں کی لڑائی تھی جو ایک دوسرے کی نوچ کھسوٹ سے فرصت پاتے ہی اس نعش کی

بوٹیاں نوچنے لگتے تھے۔ یہ نظارہ کیا کم عبرت انگیز اور حسرت خیز تھا کہ ایسی وسیع اور شہرۂ آفاق سلطنت ایک جسمِ مُردہ کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑی ہو اور چیل کوّے اُس کی بوٹیاں نوچنے کے لئے لڑتے ہوں۔ گو یہ ضرور ہوتا تھا کہ کبھی کبھی امید کے کچھ آثار پیدا ہو جاتے تھے اور اتفاقاً کسی حکمران کی غیر معمولی استعداد سے کچھ توانائی بھی عود کر آتی تھی۔ لیکن ازالۂ مرض نہ ہونے کی وجہ سے بہ ہیئتِ مجموعی مستقل حالت نہ سدھرنی تھی نہ سدھری۔ دوسری طرف انگریز سوداگر جو اَب تک چُپ چاپ اپنے بیوپار میں لگے ہوئے تھے جنھیں اہلِ ہند کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی اپنی تجارتی کوٹھیوں سے نکل نکل کر ممالک ہند میں داخل ہونے لگے اور باہمی عداوتوں سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی رہی سہی ریاستوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ لڑائیوں میں قسمت نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا اور آخر کار وہی چند سوداگر جو تجارت کی اجازت کے لئے معمولی حکّام کی دربار داری کیا کرتے تھے کشورِ ہندوستان پر قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگے۔

ایسے نازک دَور میں قدرت نے ہمیں ایک اور سنہری موقع عنایت فرمایا۔ اُس نے ایک اولوالعزم جاں باز سپاہی جس کی رگوں میں سپہگرانہ خون دَوڑ رہا تھا اور جس کے دِل میں اولوالعزمی اور ناموری کے جذبات موجزن تھے میدان میں لا کھڑا کیا۔ جنوبی ہندوستان کے اِس نامور ہیرو نے جسے آج جنوبی ہند کا بچہ بچہ حیدر علی کے نام سے نہیں بلکہ بہادر کے لقب سے یاد کرتا ہے، اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی اور عزم بالجزم سے اپنے آپ کو ایک سپاہی کے درجے سے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنی زبردست قوتِ ارادی، استقلال، جُرأت اور لاثانی حکمتِ عملی سے تاج و تخت حاصل کر لیا۔ اُس کی جنگی تدابیر اور اس کی شمشیر آبدار نے ایک طرف اگر مرہٹوں کے مُلک اور نظام حیدر آباد کے قصرِ شاہی میں زلزلے ڈال دیئے تو دوسری طرف نواب کرناٹک اور انگریزوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ اس نے جنوبی ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کی حشمت و جلال کی یاد تازہ کر دی۔ وہ ایسا زبردست اور عالی دماغ حکمران تھا جس کے

مدمقابل تاریخ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کا بے پناہ عزم و استقلال، اس کے شجاعانہ کارنامے، اس کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری ایسی صفات ہیں جن کی بدولت اس کا نام دنیا میں اس آب و تاب کے ساتھ قائم رہے گا جیسے عالمِ بالا پر نجوم روشن ہیں۔ وہ جنوبی ہندوستان کا بیدار مغز، بالغ نظر اور غیور حکمران تھا۔ اس کی فطرت زندگی کے روشن نقوش کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور وہ اِس فلسفے کی عملی صورت کا قائل تھا کہ زندگی اور عزت کی زندگی صرف بہادروں کا حق ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جنوبی ہند کے اس نامور ہیرو نے ایسے وقت میں جب ریاست میسور کی آزادی معرضِ خطر میں تھی اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا پیغام دیا۔ حیدرعلی مرہٹوں کے خلاف نہ تھا، نظام کی سلطنت اور اقتدار پر رشک نہیں کرتا تھا، فرانسیسیوں کے لئے خطرناک نہ تھا اور اس کے فلسفۂ سیاست میں انگریزوں کے جائز مفاد کے لئے بھی گنجایش تھی۔ اس کا پیغام زندگی کا پیغام تھا اور اُس کا منشا صرف یہ تھا کہ ریاست کے باشندے اپنے گرد و پیش کے حالات کو دیکھیں یکجہتی اور تنظیم کے ساتھ دنیا کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ زندہ ہیں۔ انھیں اپنی ریاست سے محبت ہے۔

حیدرعلی کے ابتدائی حالات

حیدرعلی ۱۷۲۲ء میں بمقام بودی کوٹہ پیدا ہوا، بودی کوٹہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے جو ضلع کولار میں واقع ہے۔ حیدرعلی کے والد شیخ فتح محمد سرا کے صوبے دار تھے اس لئے اس کا عہد طفلی نہایت آرام و آسائش سے گذرا۔ مگر یکا یک زمانے نے پلٹا کھایا اور اُس کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اِس نامور ہیرو کی عمر قریب پانچ ہی سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہئے کہ عین موقع پر اُس کے چچا زاد بھائی حیدر نے اس کی مدد کی اور اس خاندان کو اپنے پاس سرنگاپٹم بلا لیا، حیدر نے اِس زمانے کی طرزِ معاشرت کے مطابق حیدرعلی کی تعلیم و تربیت شروع کر دی اور دستور کے مطابق بجائے کسی مدرسے میں بٹھانے کے اُسے فنونِ جنگ کی تعلیم دی جانے لگی اور چند ہی سال میں یہ یتیم بچہ اس وقت کے فن سپہ گری میں خاص ماہر ہوگیا، جس وقت حیدرعلی

بڑا ہوا تو حیدر صاحب نے اُس کی ملاقات نند راج وزیر میسور سے کرائی۔ اس نے حیدر علی کو فوج کے ایک چھوٹے سے دستے پر مقرر کر کے سرنگاپٹم ہی میں رکھ لیا۔ نند راج کو اس کی کیا خبر تھی کہ یہ بچہ جو ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اپنے عزم و استقلال سے تختِ میسور پر قابض ہو کر کل جنوبی ہندوستان پر حیدری جھنڈا لہرائے گا۔ اور اُس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر فرانس اور انگلستان کی نشونِ قاہرہ تک پہنچے گی اور اس کی تلوار کی جھنکار ہندوستان کی ریاستوں اور سلطنتوں میں تو ایک طرف سات سمندر پار انگلستان کے سربفلک ایوانوں میں زلزلہ ڈال دے گی۔ حیدر علی نے سرنگاپٹم میں وہ سلامت روی اور خود داری اختیار کی کہ ہر شخص اس کا گرویدہ ہو گیا اور وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے تھوڑے ہی دنوں بعد باڈی گارڈ کا افسر مقرر ہو گیا اور اس کے بعد سے حیدر علی نے بہت جلد ترقی کی۔ ۱۷۵۵ء میں ریاست میسور کے علاقہ پائیں گھاٹ میں بغاوت ہوئی۔ وزیر نند راج حیدر علی کو ساتھ لے کر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اِن معرکوں میں حیدر علی سے ایسے ایسے کارنامے عمل میں آئے اور اُس نے اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی، شجاعت اور بسالت کی دھاک کچھ اس طرح دشمنوں کے دلوں پر بٹھا دی کہ وزیر میسور نے اس کو گورنر ڈنڈیگل مقرر کر دیا اور اس کے منصب کو ترقی دے کر چار ہزار سپاہی اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔ نیز اس زمانے کے رواج کے مطابق حیدر علی کو اپنی خاص فوج بھرتی کرنے کا حکم بھی ملا۔ اِس کے بعد وہ مختلف مقامات پر شورشوں کو فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اُس نے نازک موقعوں پر اپنے راجہ اور محسن و مربی وزیر نند راج کی مدد کی اور آخر کار اُن کے دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ حیدر علی کے اِن کارہائے نمایاں کو دیکھ کر راجہ بہت خوش ہوا۔ ۱۷۵۷ء میں اُس کو سپہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی مل گئی اور اُس کو کامل اختیارات دے دئے گئے کہ مرہٹوں سے جس طرح چاہے معاملہ طے کرے۔ اس نے بجائے صلح کرنے کے اُن سے مقابلہ ہی کرنا مناسب سمجھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنے حریفوں پر نمایاں فتح و کامیابی حاصل کر لی۔ راجہ اِن کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے حیدر علی کو "فتح حیدر بہادر" کا خطاب دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حیدر علی نے ایک اور اہم کام انجام دیا جس سے راجہ بہت خوش ہوا

اس نے راجہ کے اشارے پر نہایت آسانی اور لطایف الحیل سے نندراج سے استادِ وزارت لے کر راجہ کے حوالے کردی اور اس کارگذاری کے صلے میں راجہ نے فرزندِ ارجمند کا خطاب حیدر علی کو عطا کیا۔ اسی درمیان میں بسالت جنگ نظام حیدرآباد نے میدان پانی پت میں مرہٹوں کی شکست کا حال سن کر صوبہ سرا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ سرا اس وقت مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس محاصرے نے نہایت طول کھینچا۔ بسالت جنگ نے حیدر علی سے امداد طلب کی۔ چنانچہ حیدر علی اور بسالت جنگ میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات حیدر علی کو ملیں گے، بسالت جنگ دربار دہلی میں صوبہ داری سرا کے لئے حیدر علی کی سفارش کرے گا۔ قلعہ گرم کنڈہ جو اب تک حیدرآباد کے ماتحت رہا تھا آئندہ سے حیدر علی کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ حیدر علی کی جرار فوجوں نے چند ہی دنوں میں ہوسکوٹہ فتح کر لیا اور بموجب معاہدہ ہوسکوٹہ، اس کے مضافات اور قلعہ گرم کنڈہ حیدر علی کو ملا، شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی کے نام فرمان صوبہ داری سرا لے کر آیا اور اس کے ساتھ شہنشاہ کی جانب سے شمشیر مرصع کار، پالکی جواہر نگار اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب عنایت ہوئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے مڑگ سرا، مدگیری، البس نگر اور سرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح تقریباً تمام صوبۂ سرا کا مالک ہو گیا۔

۱۷۶۱ء میں جب فرانسیسیوں کی مدد کے لئے افواج حیدری پانڈیچری گئی ہوئی تھی کھانڈے راؤ راجہ اور رانیوں نے سازش کی کہ نندراج کی طرح حیدر علی کو معزول کر دینا چاہئے۔ چنانچہ دربار پونا کو ایک خط لکھ کر مدد طلب کی گئی۔ میدان خالی پاکر وہاں سے ایک فوج روانہ ہو گئی۔ حیدر علی کو اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ اسے اس وقت معلوم ہوا جب فوج سرنگاپٹن کے قریب آپہنچی۔ حیدر علی نے اپنے دوستوں سے مشورہ کرنے کے بعد رات کو فرار ہونے کا ارادہ کر لیا۔ جس وقت رات زیادہ ہوئی وہ اپنے گھر سے نکلا اور سیدھا دریائے کاویری پر پہنچا۔ ہمت کر کے دریا میں کود پڑا اور پار نکل گیا اور صرف بیس گھنٹے کی عرصے میں بنگلور پہنچ گیا۔ جہاں اس کی فوج کا ایک حصہ موجود تھا۔ ادھر راجہ میسور وزیر کھانڈے راؤ اور مرہٹہ سرداروں نے بنگلور کی طرف کوچ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہاں اس کا محاصرہ کر کے ہم اس کو

گرفتار کر لیں گے۔ حیدر علی بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے قلعہ سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ راجہ کی فوج سخت نقصان اُٹھانے کے بعد منتشر ہو گئی اور جب اِس شکستِ فاش کی خبر سرنگا پٹن پہنچی تو محل میں کہرام مچ گیا محلاتِ حیدری میں میدانِ جنگ کی جو تصویر مصنف محلات حیدری نے کھینچی ہے اُس کا ایک حصّہ مصنّف سلطنت خداداد نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے :-

دونوں مہابھارت دلیں، جیسے ساون بھادوں کے گھنگھور بادل چاروں طرف سے اُٹھتے ہیں، ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دور سے گولیاں اور گولے اولے کی طرح دونوں طرف سے برسنے لگے۔ جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں تب تو تیغ و تبر، خنجر، جمدھر، پستول، طپنچے، بھالے، برچھی بوچھاریں چلتی تھیں اور لہو کی پھوہاریں اُڑتی تھیں۔ ایک لمحہ میں خون کی ندیاں اور نالے بہنے لگے اور ہاتھی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بچھڑے کی مانند نظر آتے۔ فیلوں کے سر حباب کی مانند تیرتے پھرتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت اسفندیار صولت نے راجہ میسور کے لشکر کو ہزیمت دی،

اِس واقعے کی اطلاع جب نند راج کو ہوئی تو اس نے ایساجی سپہ سالار مرہٹہ فوج کو جو اس وقت سرنگ پٹن میں تھا ایک خط لکھا جس میں راجہ اور کھانڈے راؤ کی سازشوں کا پورا حال درج تھا جو اُن دونوں نے نند راج کے ساتھ روا رکھی تھیں اِس خط کو دیکھتے ہی ایساجی نے حیدر علی کو خط لکھا کہ اگر وہ اخراجاتِ جنگ ادا کرے تو مرہٹہ فوج واپس چلی جائے گی۔ حیدر علی نے روپیہ کے عوض بارہ محل کا علاقہ اُنھیں دے دیا اور مرہٹہ فوج واپس چلی گئی۔ اس اثنا میں حیدر علی کی وہ فوج بھی واپس آ گئی تھی جو پانڈی چیری گئی ہوئی تھی۔ اس نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح ہو سکے سرنگ پٹن پر قبضہ کر لے چنانچہ اس نے نند راج سے مشورہ کرنے کے بعد سرنگ پٹن پر حملہ کر دیا اور اسے نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔

دوسرے دن حیدر علی نے راجہ کی نذر کے لئے چند تحائف بھیجے اور باریابی کی اجازت چاہی بعد اجازت منتخب سردار محل کے اندر گئے اور راجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ انتظامِ ریاست حیدر علی کو تفویض کر دے

چنانچہ حیدر علی نے راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ وہ آج سے حکمرانِ میسور ہے۔

حیدر علی نے ۱۷۶۳ء میں صوبہ سرا کے انتظام سے فارغ ہو کر بالاپور خورد اور نندی گڑھ کی طرف توجہ کی۔ یہاں کے راجہ سے ایک سخت مقابلہ ہوا اور آخر کار راجہ نے اپنے آپ کو حیدر علی کے سپرد کر دیا اور نندی پر بدرالزماں خاں کو بطور قلعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ بالاپور اور نندی گڑھ کی فتح سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی سرا میں مقیم تھا کہ بدنور کا ایک جائز وارث آکر طالب داد ہوا اور اس نے نواب سے التجا کی کہ وہ غاصبوں سے اس کی سلطنت چھین کر جائز وارث کے سپرد کر دے۔ نواب نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور بدنور فتح کر کے اس کے جائز وارث کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے منگلور فتح کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور کچھ عرصے میں اس نے منگلور فتح کر لیا۔ وہاں سے واپس ہو رہا تھا کہ اس کے مارنے کے لئے بدنور میں ایک سازش کی گئی مگر نواب کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہو گئی اور اس نے رانی اور اس برہمن کو جو اس سازش میں شریک تھے گرفتار کر کے قتل کرا دیا اور ملک پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی کو یہاں اس قدر خزانہ ملا کہ جس کا اندازہ بارہ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ راجہ علی امیر البحر کی درخواست پر ملیبار کی طرف روانہ ہوا۔ ملیبار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر ایک زرخیز خطہ تھا یہاں مسلمان عرب تاجر کثرت سے آباد تھے مگر وہ اپنے ہمسایوں کی روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ حیدر علی جب ایک جرار لشکر کے ساتھ ملیبار پہنچا ہے تو نائروں نے اس کے مقابلے کے لئے ایک فوج جمع کی۔ کنانور کے قریب ایک ندی کے کنارے جنگ ہوئی جس میں حیدر علی کو فتح حاصل ہوئی۔ یہاں سے حیدر علی کالی کٹ روانہ ہوا اور نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے زامرن نے اپنے محل میں آگ لگا دی اور جل کر مر گیا۔ اس خبر کو سنتے ہی نائروں نے کالی کٹ پر حملہ کیا مگر یہاں بھی انھیں شکست ہوئی۔ اسی اثنا میں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب حیدر نے یہ سوچا کہ اگر ملیبار میں مقیم رہیں گے تو فوج کو سخت نقصان پہنچے گا اس لئے وہ کوئمبٹور کی طرف روانہ ہو گیا، نائروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ایک لشکر جمع کر کے پونانی کے مقام پر حیدر علی کا مقابلہ کیا۔ یہاں مقابلہ سخت ہوا مگر

ایک شدید جنگ کے بعد نائروں کو فاش شکست نصیب ہوئی۔ اسی اثنا میں مرہٹوں نے بدنور پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب حیدر علی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک فوج اُدھر روانہ کی مگر اس فوج کے پہنچنے سے قبل ہی مرہٹے بارش کی کثرت کی وجہ سے واپس جا چکے تھے۔ جس وقت مرہٹوں نے بدنور پر حملہ کیا تھا تو نواب شاہ نور نے اُن کی مدد کی تھی۔ لہٰذا حیدر علی نے اُن کا صفایا کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اس نے شاہ نور پر حملہ کیا اور اس کی افغان فوجوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہاں کے نواب نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جسے نواب حیدر علی نے منظور کر لیا۔"

مرہٹوں کا میسور پر حملہ

ہم پہلے اِس کا ذکر کر چکے ہیں کہ نواب حیدر علی نے الیساجی کو بارہ محل کا علاقہ تفویض کر دیا تھا مگر جب الیساجی بارہ محل پہنچا تو وہاں کے حیدری قلعہ داروں نے قلعہ جات حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس وقت تو الیساجی واپس چلا آیا مگر جب مادھو راؤ پیشوا ہوا اور اُس نے حیدر علی کے روزافزوں اقتدار کا حال سُنا تو اُس نے بارہ محل لینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ ایک لاکھ سوار ۶۰ ہزار پیادے پچاس ہزار تیر انداز اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے شاہ نور، چتلدرگ، سرا اور مدگیری کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ حیدر علی نے جب یہ خبر سُنی تو اُسے فکر ہوئی کہ کس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نے سواروں کے ایک دستہ کو حکم دیا کہ وہ صحرائے ماگڑی میں چھپ کر مرہٹی فوج پر شبخون مارا کریں۔ گری فتح کرنے کے بعد مادھو راؤ قلعہ ماگڑی کی طرف بڑھا یہاں کے حاکم سردار خاں نے نہایت شجاعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر کار اُس کے تمام سپاہی لڑتے لڑتے مر گئے۔ اور وہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اِس عرصے میں حیدری فوج نے جو جنگل میں چھپی ہوئی تھی کئی مرتبہ شبخون مارا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار۔ اس کا ماگڑی پر قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بالاپور، کراپہ، کولار، گرم کنڈہ پر قبضہ کرتا ہوا مادھو سرنگاپٹم کی طرف بڑھا اس نے اپنا صدر مقام چنتامنی کو مقرر کر کے ایک بھاری توپ خانہ اور پچاس ہزار فوج سرنگاپٹم کی طرف

روانہ کی۔ اِدھر حیدر علی پریشان تھا۔ اِسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت حیدری کوئی دم کی مہمان ہے۔ مگر اس نے اپنی خداداد دلیری سے کام لے کر ماگڑی کے جنگل میں اس فوج کا انتظار کیا جب وقت نصف شب گذری تو اس نے اس فوج پر شبخون مارا اور یہ حملہ کچھ اس غضب کا تھا کہ قریب قریب کُل مرہٹے کٹ گئے اور جو بچے بھاگ نکلے۔ دوسری طرف مرہٹی فوج کا ایک چھوٹا دستہ باراحمل پہ چڑھ رہا تھا۔ اس پر بھی حیدری فوج نے شبخون مار کر اُس کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ مادھو راؤ کو جب ان دونوں شکستوں کی خبر پہنچی تو وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ ایک جانب اس کی غیرت قبول نہیں کرتی تھی کہ شکست کھا کر واپس جائے، دوسری طرف فوج کی کمی آگے بڑھنے سے مانع تھی۔ اِس موقع سے حیدر علی نے فائدہ اٹھا کر سات لاکھ روپیہ مادھو راؤ کے پاس بھیجے اور پچاس لاکھ دینے کا وعدہ کیا۔ مادھو راؤ نے اسے ایک خداداد فتح خیال کرتے ہوئے پونا کی طرف کوچ کر دیا۔

(باقی آئندہ)

انوکھا ظلم

(یہ زمانۂ حال کے مشہور ترکی انشا پرداز عمر سیف الدین کا افسانہ ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں خالدہ خانم صاحبہ کی ایک عزیزہ بلقیس خانم صاحبہ نے کیا ہے۔ ہم ان دونوں خواتین کے شکر گذار ہیں کہ ان کی عنایت سے یہ رسالۂ جامعہ کو اشاعت کے لئے حاصل ہوا)

نہیں معلوم کیوں شاید یہ سبب ہو کہ میرے باپ دادا پرانے زمانے میں جاگیر دار تھے، جب کبھی میں بلغاریہ میں گھومتا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آبا و اجداد کے کھیتوں میں گشت لگا رہا ہوں۔ سبز نرسل سے ڈھکی ہوئی چھوٹی نہریں، بے شمار گلاب کے تختے کھیتوں کے گرد کانٹے دار جھاڑیاں، اداس مکان اور ان کی کشادہ برساتیاں، بدوضع گرجا گھر جو بالکل جَو کے کھلیان معلوم ہوتے ہیں، خوگیر کسے ہوئے کرایے کے ٹٹو، غور و فکر میں ڈوبے ہوئے خچر، موٹی سفید بطخیں، غرضکہ ہر چیز حتیٰ کہ میلے کیچڑ میں سنے ہوئے سور۔ سب سے میں خوب مانوس معلوم ہوتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ہمیشہ سے ان موٹی ٹانگوں والی عورتوں سے واقف ہوں جو ندیوں میں کپڑے دھوتی رہتی ہیں، ان بد مزاج لڑکیوں کو جانتا ہوں جو ہر وقت اپنے گھروں کے سامنے موزے بنتی رہتی ہیں، اور ان دیہاتیوں سے بھی خوب شناسائی رکھتا ہوں جو غروب آفتاب کے وقت جب میدان کی جھاڑیوں کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا ہے دفعتہً نمودار ہو کر مجھے سلام کرتے ہیں۔

بلغاریہ میں لیجنا وہ مقام ہے جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ گذشتہ سال میں وہاں کے چشموں میں غسل کرنے کے لئے گیا ہوا تھا اور میرا دوست کوستنانوف میرے ہمراہ تھا شام کے وقت ہم دونوں شہر سے باہر نکل کر ادھر ادھر چہل قدمی کیا کرتے تھے اور ان بادلوں کو دیکھتے تھے جو کوہ "کورا اودا" پر روشن نظر آیا کرتے تھے اور رات کو ہم ڈینی کو کی سرائے میں شراب

پی کر اور تاش کھیل کر گذارتے تھے۔ اِس پرانی سرائے کے زیریں حصے میں ایک قدیم طرز کا بڑا کمرہ تھا ہر اتوار کو مشہور شرابی جو سات سات بوتلیں ایک وقت میں چڑھا جاتے تھے اِس کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور اپنے حقوں اور ناچ کی آواز سے تمام رات ہم کو سونے نہ دیتے تھے۔ ایک روز اتوار کی شام کو رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کوشتانوف سے کہا:۔

"آج رات کو یہ لوگ ہمیں سونے نہ دیں گے۔ پھر ہم کہیں اور ہی کیوں نہ چلیں"

"کہیں اور کہاں؟"

"مثلاً ڈاکسٹر کے ہاں۔ وہ کئی دن سے ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔"

"کسی اور رات کو وہاں چلیں گے"

لیکن آج رات کو کیوں نہ چلو؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "آج رات کو میں تمہارا تعارف ایک پُرانے سیاست دال سے کراؤں گا جو ترکی زبان خوب اچھی بول سکتے ہیں اور جنھوں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں استنبول میں تعلیم پائی ہے۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی غسل کے لئے آئے ہیں۔ لیکن جس قسم کے وہ آدمی ہیں اس کا تمھیں پتہ چل جائے گا۔ بالکل 'بائی گونیو' ہیں (ناول نویس کانسٹنٹین الیکو کا مشہور ہیرو)

شام کے کھانے کے بعد کوشتانوف نے سرائے والے سے دوات قلم منگوایا۔ ایک پرچہ لکھا اور اُسے یہ کہہ کر دیا کہ اسے گوسپوڈن کیپازنی کے پاس لے جاؤ۔

پھر وہ مجھ سے اس شخص کی زندگی کے حالات بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں کیپازین ایک انقلابی تھا بلغاریہ کی آزادی کے بعد وہ وزارت داخلہ میں ایک عہدہ دار کی حیثیت سے مامور ہو گیا۔ پھر نائب وزیر ہوا اور اخیر میں چند مہینوں کے لئے وزیر عدالت ہو گیا۔ اس کی استمبلاف سے بڑی گہری دوستی تھی۔

اُس نے کہا "یہ عجیب حضرت ہیں۔ خیر تمھیں خود معلوم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کو بات کرنے تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تمام وقت خود ہی بولتا رہتا ہے۔ یورپ کے جتنے سیاست داں ہیں سب کو ذلیل سمجھتا ہے۔ بسمارک کا دماغ اس کے نزدیک مغز سے بالکل خالی تھا اور اس بات کی تو وہ قسم کھاتا ہے کہ روس میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سرائے والا آ گیا اور کہنے لگا

"گاسپوڈن آپ کو اور آپ کے دوست کو اپنے کمرے پر بلاتے ہیں۔ انھیں گٹھیا کی شکایت ہے اور خود نیچے اُتر کر نہیں آ سکتے"

"اُن کے کمرے کا کیا نمبر ہے۔"

"ایک"

"کیا وہ اکیلے ہی ہیں"

"جی ہاں"

کوستانوف جلدی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ کر مجھے ایک پتلے زینے سے کھینچتا ہوا اوپر لے گیا کہ

"چلو ایک پرانے زمانے کے آدمی کو بھی دیکھ لو۔"

سرائے کے کمروں میں نمبر ایک کا کمرہ شاید سب کمروں میں بہترین تھا۔ یہ کمرہ سڑک کے رُخ تھا اور اس کے دروازے کے دو پہلو تھے۔ کوستانوف نے دروازے پر اس طرح دستک دی جیسے فوجی مارچ میں 'تکی تک' 'تکی تک تک' 'تک تک' 'تکی تک' 'تکی تک تک' کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

پھر اُس نے دھکا دے کر کواڑ کھولا۔ یہ کمرہ حقیقتاً دوسرے کمروں کے مقابلے میں بہت زیادہ آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے اور شیڈز لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بادشاہ فرڈیننڈ اور بادشاہ بورس کی روغنی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ آیوڈین کی تیز بو ہماری ناک میں گھُسی۔

گرمی کے باوجود کھڑکیاں بند تھیں۔ گاسپوڈن ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ٹانگیں ایک سُرخ کمبل سے ڈھکی ہوئی اور اُس کے سامنے بچھی ہوئی ایک آرام کُرسی پر رکھی ہوئی تھیں اُس کے بال اور داڑھی سپید تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ تھا۔ جب ہم داخل ہوئے تو وہ ہنسا اور چلّا کر کہنے لگا۔

"تم ہو کوستانوف۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ کسانوں کو دھوکا دینے آئے ہو۔"

"نہیں۔ میں غسل کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

"یہ فریب دوسروں کو دینا۔ اگر میں برسر اقتدار ہوتا تو میں تمھیں اور تم جیسوں کو سانس تک نہ لینے دیتا۔ جنیسر بیٹھو......"

ہم نے ایک ایک کرسی لے لی اور اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر کوستانوف سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا:۔

"کیا خبریں ہیں۔ کہو؟"

"خبر کیا ہے کچھ بھی نہیں گاسپوڈن!"

"خبر کیسے نہیں۔ تم جیسے نوآموز کسی بات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

پھر اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نیلی آنکھیں بھورے شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"آپ کون ہیں؟ کیا یہ بھی تمھارے شاگرد ہیں؟"

"نہیں گوسپاڈن یہ بلغاری نہیں ہیں۔"

"پھر یہ کون ہیں"

"ترک"

"ترک؟"

"ہاں"

میرے سر پر کلپاک تھی۔ اس سے اس نے سمجھا کہ کوشتانوف مذاق کر رہا ہے اور ہنسنے لگا۔ لیکن پھر بھی اُسے کچھ تامل ہوا اور جب کوشتانوف نے اُسے یقین دلایا تو اس نے مان لیا۔ میں بھی اس عرصے میں مسکرا رہا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے ہیں" اس نے پوچھا

"یہ غسل کے لئے آئے ہیں اور میرے دوست ہیں۔"

"کیا آپ بھی سوشلسٹ ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورنا شروع کیا۔

"میں نے کہا نہیں" اور کوشتانوف نے بھی میری تائید کی۔

"یہ قوم پرست ہیں گوسپاڈن" کوشتانوف نے کہا

"مجھے زیادہ بے وقوف نہ بناؤ۔ ایک ترک نہ سوشلسٹ ہوسکتا ہے نہ قوم پرست۔"

اب وہ برابر ہنس رہا تھا۔ انسان بھی عجیب ہوتا ہے۔ اگر کسی ترک نے یہ بات کہی ہوتی تو مجھے اس کی شاید پروا نہ ہوتی۔ لیکن جب ایک بلغاری نے یہ بات کہی تو مجھے بری معلوم ہوئی اور اس وجہ سے اور بھی کہ اس میں استہزا کی جھلک تھی۔ میرا چہرہ یقیناً بہت زیادہ سرخ ہو گیا ہوگا۔

"کیوں نہیں ہو سکتے" میں نے کہا "میری طرف دیکھئے میں قوم پرست ہوں۔"

"کیا تم ترک نہیں ہو؟"

"ہاں میں ترک ہوں"

"تو پھر عزیزِ من تم کچھ بھی نہیں ہو سکتے"

"کیوں نہیں ہو سکتا"

کیونکہ عزیزِ من تم ترک ہو۔"

"یہ کیسی عجیب بات ہے"

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ کوشتانوف نے یہ دیکھ کر کہ مجھے برا معلوم ہوا ہی بات کو ٹالنا چاہا۔

"لیکن گاسپوڈن نوجوان ترکوں کے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

مگر بڈھا سیاست داں سر ہلاتا رہا اور اس بات کو اصرار کے ساتھ کہتا رہا۔

" بوڑھے ہوں یا جوان ترک ترک ہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ روئے زمین پر کوئی شخص ترکوں کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھ سکتا۔"

کوستانوف نے کئی مرتبہ احتجاج کرنا چاہا بعض وقت معقولیت کے ساتھ اور بعض وقت ایسے الفاظ میں جن سے کوئی مفہوم پیدا نہ ہوتا تھا۔ اخیر میں کیپازلیف نے کہا

" ترکوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خیال ہے نہ نصب العین۔ ان کے پاس صرف ایک چیز ہے"

ہم دونوں نے پوچھا

" وہ کیا ہے ؟ "

" مذہبی دیوانگی "

" .... "

ہاں مذہبی دیوانگی۔ بلغاریہ میں میں نے ان کی مذہبی دیوانگی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اگر میں آج برسر اقتدار ہوتا تو آج بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ استامبلوف کو اس بات کا یقین تھا کہ میں ایک غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کا شخص ہوں۔ جب ہماری ریاست کی نئی نئی تنظیم ہو رہی تھی اگر میں نہ ہوتا تو بلغاریہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ ترک اس قدر زیادہ تھے .... ہماری تعداد سوبرانیا میں یقیناً نصفا نصف ہوتی اور ایک دن جماعتِ عاملہ میں آدھی تعداد ترکوں کی ہوتی۔ لیکن میں نے...... لیکن میں نے ...."

اس نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹا اور اپنے سینے کو اپنے بال دار ہاتھوں سے ٹھوک کر اور کوستانوف کی طرف اشارہ کرکے کہا

" یہ جاہل ہماری قدر نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ سے حقیقت کا اظہار ہو گا۔"

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ اس نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ اس لئے میں نے پوچھا۔

"جناب گوسپاڈن صاحب کیا آپ ہمیں یہ نہ بتلائیے گا کہ آپ نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اُٹھایا"

"کیوں نہیں بڑی خوشی سے"

"شکریہ" میں نے کہا۔ کوشتانوف کو بھی اشتیاق تھا۔

بُڈھے آدمی نے کمبل کے نیچے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا۔ منہ بنایا۔ جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا۔ ایک ایک موٹا سگریٹ ہم دونوں کو دیا، اور ایک خود سُلگایا۔ قصہ بیان کرتے وقت وہ سر، بازو اور اپنے تمام جسم کو ہلاتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مارتا تھا۔

"بچپنے میں میری اور استمبلوف کی دوستی تھی۔ استنبول میں ہم دونوں ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہوئے تھے۔ جب بلغاریہ کو آزادی ملی تو ہم نے کانگریس کو اور تمام کمیٹیوں کو جمع کیا۔ اس وقت بلغاریہ محض برائے نام ایک ریاست تھی۔ کیونکہ آدھی سے زیادہ آبادی ترک تھی اور یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ سب دوقت آدمی قتل عام کی تجویزوں کو سوچتے تھے اور ان پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک دن استمبولاف نے مجھ سے پوچھا

"ترکوں کے ساتھ ہمیں کیا کرنا چاہئیے"

"میں نے کہا" یہ تو بہت سہل ہے۔ ہم انھیں ترکی واپس بھیج دیں گے"

"کس طرح؟" استمبولاف نے کہا "کیا یہ لوگ اپنا گھر بار اور مکان اپنی خوشی سے آپ ہی چھوڑ دیں گے"

میں نے جواب دیا "ہاں ضرور" لیکن اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ قتل عام ہونا چاہئیے۔ دراصل قتل عام کی جن لوگوں کے لئے ضرورت تھی وہ یونانی تھے کیونکہ بلغاریہ سے انھیں نکالنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اخیر میں یہی کرنا پڑا۔ لیکن ترکوں کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی میں جانتا تھا کہ اُن کا سب سے زیادہ مقدس جذبہ اُن کی مذہبی دیوانگی ہے۔ میری پرورش انھیں کے درمیان ہوئی تھی

میرے پڑوسی سب ترک تھے۔ انھیں کسی سے نفرت نہ تھی۔ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچاتے تھے حتیٰ کہ روسیوں کو بھی نہیں جو اُن کے دشمن تھے۔ اُن کی تمام زندگی، مذہبی دیوانگی کے سیاہ پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ مثلاً انھیں سوروں سے نفرت تھی۔ سور آپ جانتے ہیں بے ضرر جانور ہے۔ لیکن ترک اُن کے جانی دشمن تھے۔ جب کبھی انھیں سور نظر آجاتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے اور اُس سے ایسے بھاگتے گویا کہ شیطان سے بھاگ رہے ہیں۔ جب حکومت اس وقت کے حاکموں کا یعنی ہمارا تقرر کر رہی تھی تو میں نے استمبولاف سے کہا

"میں ایسے حصے میں جاؤں گا جہاں بلغاری بالکل ہی نہیں ہیں اور چند دنوں میں میں سب ترکوں کو بلغاریہ سے باہر نکال دوں گا۔"

"لیکن یورپ والوں کا بھی تو خیال کرو۔" اُس نے کہا اور سر ہلایا۔ اُس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں ترکوں کا قتل عام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "کسی کی نکسیر بھی تو نہ پھوٹے گی۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے"

میں ایک انوکھا ظلم کروں گا"

"کس طرح"

میں نے اُسے نہیں بتلایا۔ میرا ڈیلی اورمن میں تقرر ہو گیا جہاں اگر دوا کے لئے بھی ضرورت ہوتی تو ایک بھی بلغاری دستیاب نہ ہوسکتا۔ میں نے مقدونیہ کے ایک امان دیئے ہوئے خاندان کو شہر میں بسایا۔ میں نے سرکاری بجٹ میں سے خفیہ خدمت کی مد میں اُسے چار لیرا کی رقم دی اور اُن سے پانچ سور خریدوا دیئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا کہ اِن جانوروں کو سڑکوں، باغوں اور کھیتوں میں غذا کی تلاش میں آزاد گھومنے دیں۔

سور تمام شہر میں پھیل گئے۔ اُس وقت ترکوں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اُن کے بڑے بزرگ میرے پاس آئے اور مجھ سے احتجاج کیا۔

"بلغاریوں کے سور آزادی سے سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ وہ پانی کے حوضوں کو خراب کر رہے ہیں اور کھیتوں کو سونگھتے پھرتے ہیں، ہم سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔"

میں نے آزادی پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور میں نے کہا کہ جیسے بکریوں، گایوں، بیلوں اور مرغیوں کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے ویسے ہی سوروں کو بھی ہے اور میں نے اس سوال پر معاملے کو ختم کر دیا کہ

"کیا ہمیں تمھاری بھیڑوں پر کوئی اعتراض ہے؟"

وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ لیکن اس کے بعد سے انھوں نے اُن حوضوں سے پانی لینا بند کر دیا جہاں سور پانی پیتے تھے۔ وہ چراگاہوں میں لنگوٹ باندھ کر پہلے کی طرح نہ ننگے ہو سکتے تھے نہ کشتی لڑ سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی سور گھومتے پھرتے تھے۔ چھ سات مہینوں میں سوروں کا قلیل التعداد گلہ بڑھا اور ہر جگہ پھیل گیا۔ جب ترکوں کو یہ معلوم ہوا کہ اُن سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جو بہت امیر تھے انھوں نے بھی اپنے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا اور اپنی جائداد اور زمین کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔ میں حکومت کے لئے تمام زمین خرید رہا تھا۔ وہ لوگ جو گئے تھے اور جا کر استنبول میں بس گئے تھے وہ واپس آئے اور اپنے عزیز و اقربا کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ کسان بھی ہجرت کرنے لگے اور میں مقدونیہ کے بلغاریوں کو امداد دے کر بلا رہا تھا اور ویران شہروں کو اُن سے بسا رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دو سال کے اختتام پر تمام شہر میں ایک ترک بھی باقی نہیں رہا۔ ہاں تمام ترکوں نے اپنے صدیوں کے گھر بار کو اس طرح خیر باد کہا گویا آگ اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔ حکومت نے میرا طریقہ اُن تمام شہروں میں جاری کیا جہاں بلغاری آبادی نہ تھی۔ یعنی بلغاریہ والوں کا ایک خاندان اور سوروں کا ایک گلہ۔ سال کے اندر اندر اس سے ترکوں کی آبادی اپنی اصل تعداد کے مقابلے میں نصف ہو جاتی تھی۔ میری حکمتِ عملی سے اسٹمبولاف بہت خوش ہوا اور جب کبھی میری اس سے ملاقات ہوتی وہ کہا کرتا کہ تم غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کے آدمی ہو۔ تم بسمارک سے بھی بڑھ کر ہو۔

استمبولات مجھ سے سچ مچ بغلگیر ہوتا تھا اور میرا منہ چومتا تھا۔ ہاں بسمارک الساس لورین کے مسئلے کا ایسا تیر بہدف علاج نہ سوچ سکا۔ زبان کی تعلیم کو روکنا، مدرسوں کو بند کرنا ظالمانہ طریقے ہیں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا کرنا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے اِس کا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات کی جا سکتی تھی جس سے فرانسیسیوں کو غصہ آتا اور اُن کی مذہبی دیوانگی برانگیختہ کی جا سکتی۔ اگر بسمارک نے اس چیز کو ڈھونڈ لیا ہوتا تو سال کے اندر اندر اُس نے اِن صوبوں کو جرمن بنا دیا ہوتا۔

دس سال ہوئے میں سینٹ پیٹرس برگ گیا تھا۔ میں نے سازانوف سے گفتگو کی تمھیں معلوم ہے کہ اِس بے وقوف کو لوگ یورپ میں سیاست داں کہتے ہیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ تم استنبول پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ کیوں۔ اُس نے بِلا کسی تامل کے جواب دیا

"ہاں"

"یہ کام بہت آسان ہے۔"

"کس طرح" سازانوف نے پوچھا

"دنیاوی جنگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا تمھارا خیال ہے۔ ایک بہت ہی سہل طریقہ ہے۔" اُس نے دوبارہ پوچھا "کس طرح"

"تم ترکوں کو استنبول چھوڑنے پر مجبور کر سکتے ہو اور اُن کی جگہ روسی بسا سکتے ہو۔ پچیس سال میں ایک بھی ترک باقی نہ رہے گا اور استنبول روسی شہر ہو جائے گا۔"

"اُس نے تیسری دفعہ پوچھا" لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔"

"بہت سہل ہے" میں نے کہا۔ اور پھر میں نے اُسے بتلایا کہ ترکوں میں کوئی سیاسی خیال نہیں ہے۔ اُنھیں وطن اور ملک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ مذہبی دیوانگی کے ماتحت تمام چیزوں کو سوچتے ہیں۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ اگر ترکوں کے محلہ میں ایک روسی یا بلغاری خاندان کو سوروں کے گلّے کے ساتھ بسا دیا جائے گا تو ترک آوارہ گرد چڑیوں کی طرح گھبرا کر اُڑ جائیں گے۔ گدھے کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ بے شک وہ گدھا تھا۔ کیونکہ وہ اُن لوگوں کی

ذہنیت سے واقف نہ تھا جن کے دارالسلطنت پر وہ قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے طریقے پر ہنسا۔ اور اس نے خیال کیا میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اُسے بعد کو معلوم ہوا کہ میں سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر اعتقاد رکھتا ہوں تو اس نے ہمارے ایلچی سے کہا

"گوسپوڈن کیپا زلیٹ بھی کیسا عجیب آدمی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے بنانے لگا۔"

"ہاں یہ شخص ضرور گدھا تھا۔ یورپ میں خصوصاً روس میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو سیاست سے صحیح طور پر واقفیت رکھتا ہو۔ ہاں سب کے سب گدھے ہیں۔"

عمر رسیدہ سیاست داں ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلاتا رہا اور ہم سے بھی یہی کراتا رہا۔ وہ اپنی پرانی کامیابیوں کی داستان کو ختم نہ کر سکا۔ نصف شب گذر چکی تھی۔ میرے لئے یہی بہت تھا اور کشتانوف یہ محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے اس نے رخصت چاہی اور ہم نے کمرے کو جو سگریٹ کے دھوئیں سے لبریز تھا خیر باد کہا۔ باہر آکر اس نے مجھ سے کہا

"جو کچھ یہ کہتا ہے اس میں سے ہر بات کا تمھیں یقین نہ کرنا چاہیے۔"

"کیوں کیا وہ جھوٹ بول رہا تھا"

"نہیں"

"تو پھر"

"یہ مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس میں سے پانچ فیصدی نکال دو اور باقی پر یقین کر لو۔"

میں اپنے کمرے میں گیا کپڑے اتارے اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند غائب تھی۔ مجھے بخار تھا لیکن میرا بدن گرم نہ تھا۔ میرے تمام جسم پر سرد پسینے کی تہ جمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے کمرے میں گانے اور ناچنے کا شور بلند ہو گیا۔ مرغوں نے اذانیں دیں۔ دن نکلنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ منہ بستر میں دے لیا اور اونگھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے بہادر آباواجداد کو، اپنے جاں باز بھائیوں کو، اپنے پاک باطن اور سادہ لوح ہم قوموں کو گندے سوروں کے گلوں کے

ہ گے آگے پاگلوں کے ایک مجمع کی طرح بھاگتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اُن کے عمامے ہوا میں اُچھل رہے ہیں۔ اُن کے گھوڑے اور گاڑیاں دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اُن کی توپیں اور بندوقیں، اُن کی بیویاں اور بچے ایک ایک کر کے راستے میں گرتے جا رہے ہیں۔

ہاں اُس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی ٭

تنقید و تبصرہ

اُمہات الامہ مصنفہ شمس العلما۔ مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم قیمت فی نسخہ عا ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی

یہ وہ ہنگامہ خیز کتاب ہے جس کے شائع ہونے پر دہلی کے بعض مولویوں نے شورش برپا کرکے دور دور تک پھیلایا اور اس کے مصنف پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے چنانچہ اُن کی زندگی ہی میں جب دہلی میں ندوۃ العلما کا اجلاس ہوا تو مولوی صاحبان نے جمع ہو کر اس کتاب کی تمام جلدوں کو جو ایک صاحب کے پاس امانتاً رکھوا دی گئی تھیں لیکر ڈھیر لگایا اور اس پر مٹی کا تیل ڈالکر آگ سے جلا دیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ بچا ہوا رہ گیا تھا جسے امسال دوبارہ مسٹر شاہد احمد نے جو مصنف کے پوتے ہیں شائع کیا ہے اس میں جو باتیں علماء کے نزدیک قابل اعتراض ہیں ان کو ایک مولوی صاحب نے جن کا نام عبدالغنی تھا کشف الغمہ کے نام سے شائع کیا تھا اس کا جواب علامہ احمد حسن محدث دہلوی صاحب احسن التفاسیر نے لکھا تھا یہ دونوں رسالے بھی اس کتاب کے ساتھ شامل کر دئے گئے ہیں تاکہ لوگ ان وجوہات کو دیکھیں جن کی بنیاد پر کتاب نذر آتش کی گئی تھی۔

یہ کتاب پادری احمد شاہ شائق کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی پر اعتراضات کئے گئے تھے مولانا نذیر احمد نے ان تمام اعتراضات کے نہایت مستند اور دنداں شکن جوابات دئے ہیں میں نے ساری کتاب غور سے پڑھی میرا خیال یہ ہے کہ جس غرض و غایت کیلئے یہ لکھی گئی ہے نہایت مشرح اور مکمل ہے۔ بیشک بعض امور میں علمی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ان اختلافات سے مصنف کا دین و ایمان قطعاً زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ رسول پاک کی مدافعت میں لکھا ہے خلوص نیت سے لکھا ہے۔ علم اور ایمان کی روشنی میں لکھا ہے کہیں ان کی عقیدت سے فتور کا شائبہ نہیں ملتا۔ بیشک چند الفاظ زبان قلم سے ناولانہ رنگ کے نکل گئے ہیں جن سے ان کی طبیعت مالوف تھی مگر ان کی بنا پر یہ کتاب سوختنی نہیں

ہو سکتی اگرچہ ہماری خواہش یہ ضرور ہوتی ہے کہ کاش ان الفاظ سے بھی جو عوام میں ہیجان پیدا کر سکتے ہیں یہ پاک ہوا۔

جن حضرات نے اس کو جلایا یا جلوایا میرا خیال یہ ہے کہ معاصرانہ عداوت یا کچھ اور جذبات اس کے محرک رہے ہوں گے ورنہ اس کتاب سے تو قطعاً مصنف کا کفر والحاد ثابت نہیں کیا جا سکتا زیادہ سے زیادہ بعض الفاظ سے سوء ادب کا الزام لگایا جا سکتا ہے وہ بھی بزعم خود کیونکہ مصنف کا رتبہ ادب اردو میں نہایت بلند مسلم ہو چکا ہے وہ اگر ان الفاظ یا فقرات کو ادب کے خلاف سمجھتے تو میرا یقین ہے کہ ہرگز نہ استعمال کرتے

محمدیہ پاکٹ بک | مؤلفہ منشی محمد عبداللہ صاحب معمار امرتسری تقطیع خورد لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۷۳۶ صفحے مجلد قیمت غیر مجلد عہ ملنے کا پتہ شعبہ تالیف و طبع انجمن اہلحدیث برانڈرتھ روڈ لاہور۔

یہ کتاب مرزائیت کی تردید میں نہایت جامع اور مبسوط لکھی گئی ہے جس میں اس کے تمام اصولی اور فروعی امور زیر بحث لائے گئے ہیں انداز بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ سوائے تسلیم کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا مرزائیوں نے احمدیہ پاکٹ بک شائع کر کے مرزا صاحب کی چند پیشین گوئیوں کا وقوع ثابت کیا تھا لیکن چند پیشین گوئیوں کے صحیح ہو جانے سے کوئی شخص نبی نہیں ثابت ہو سکتا تاوقتیکہ یہ نہ دکھایا جائے کہ اس کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں نکلی اس کتاب میں مؤلف نے مرزا صاحب کی اکثر پیشینگوئیوں کو جو بڑے ادعا کے ساتھ کی گئی تھیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے اور ان کے عدم وقوع کو خود مرزا اور مرزائیوں کی تحریروں سے دکھلا دیا ہے۔ ہندوستان کے اس مدعی نبوت کی پیشینگوئیوں کی حقیقت اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اس کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے واقعی اس کا مؤلف فاضل مرزائیت ہے اگر کوئی یونیورسٹی اس لٹریچر کی مہارت پر ڈگری دیتی تو منشی عبداللہ کو اس کتاب پر ضرور پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

ضروری کہانیاں | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب قیمت ۱۲ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ مکتبہ شرفیہ۔ دہلی

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ہندوستان کے راجاؤں، بادشاہوں اور نوابوں کے ایسے واقعات اور قصص فراہم کیے ہیں جن سے ہندوستانی قوموں میں باہم اتحاد بڑھے، مخالفوں نے ہندوستان کی تاریخ کو جو یہاں کی اقوام میں باہمی منافرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اس قسم کی کتابوں سے اُن کے زہر کا ازالہ ہوسکتا ہے قاضی صاحب کی یہ کوشش بہ نظر خوادہ ہندگی نگاہ میں نہایت مفید ہے۔

سودیشی اردو | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب فی نسخہ ۴ر ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب ایڈیٹر مکتبہ شریفیہ دہلی

اس رسالہ میں قاضی صاحب نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں اور باتیں خالص اردو میں لکھی ہیں اس میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں آئے ہیں عبارت رواں اور صاف ہے جو لوگ خالص اردو کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔

روزنامچہ یا مجنوں کی ڈائری | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت وطباعت اچھی، یہ کتاب "لیلیٰ کے خطوط" کے ساتھ ۲ ؎ میں ملتی ہے ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور۔

دارالادب پنجاب نے ایک خاص نوع کا ادب لطیف پیش کرنا شروع کیا ہے جس میں اخلاقی، مذہبی رسمی اور روایتی قیود سے بے نیاز ہو کر کتاب کے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اور دوران تصنیف میں خیال آفرینی پر کسی قسم کی حد بندی یا رکاوٹ عاید کرنا آزادی تحریر کے منافی سمجھا جاتا ہے اس نوع کا ادب عموماً سماج کے اس دور میں پیدا ہوتا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب امرا اور تعلیم یافتہ جماعت میں تشکیک کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام پرانی قدریں اپنا اثر زائل کر دیتی ہیں اور نئی قدریں ذوق و نشاط عمل پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں مذہب، اخلاق، قانون معاشرت، رسم و رواج، سیاسی تحریکیں سب لغو و مہمل نظر آنے لگتی ہیں حتیٰ کہ خود زندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا، شراب ہوس پرستی اور موسیقی وجہ تخلیق کائنات اور مدار زندگی بن جاتے ہیں خیال کی پختگی اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دور چاہے کتنا ہی بے مغز کیوں

نہ ہو لیکن اس کے بعض ادبی شاہکاروں کی لطافت اور دلچسپی خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتی۔

زیر تنقید کتاب اسی قسم کی تصنیف ہے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے یہ چاہے جس قدر بھی قابل اعتراض ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے یہ اسی قدر کامیاب ہے

"شرح حال" کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک طویل مقالہ بزرگانہ شان کے انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے جس میں انھوں نے اپنی تصنیف کی "معنوی کیفیات" کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کو جو اپنی توجہ اس تصنیف کی محض ادبی خوبیوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں "تحسین ناشناس" سے تعبیر کیا ہے لیکن ان کی اس پیش بندی کے باوجود ہم اُن کی کتاب کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

"مجنوں کی ڈائری" سے اگر "شرح حال" کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے اس سے کسی قسم کی اصلاحی یا تعلیمی خدمت نہیں ہوتی بلکہ اس سے غیر پختہ ذہنوں میں جہاں ابھی تک خدا کا ڈر، شریعت کا احترام اور سماج کے قانون کی عزت باقی ہے، ایک طرح کی غیر ذمہ دارانہ آزادی، مزاجی انتشار اور مایوس کن کیفیت بے عملی اور بے راہ روی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ قاضی صاحب کو اُس چیز کا مطالبہ نہ کرنا چاہیئے جس کے وہ مستحق نہیں ہیں ادبی حیثیت سے ہمیں اعتراف ہے ان کا کارنامہ بڑی حد تک کامیاب ہے لیکن اس دور ابتلا اور آزمائش میں جب کہ ہر نوجوان کے سامنے ایک واضح اور متعین معیار اور مقصد ہونا چاہیئے ان کی کتاب کی تخریبی مساعی کسی نہج سے لائق ستائش نہیں ہو سکتیں ان کے وسیع تجربہ اور بالغ نظری سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ نوجوانوں کے مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی بجائے اُن کی زندگی کے خطرناک راستہ کو سہل اور ہموار کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

"شرح کلام" کے اختتام پر قاضی صاحب نے امید دلائی ہے کہ "داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کی آئندہ اقساط میں پیش کی جائے گی" ہماری تمنا ہے کہ آئندہ جو "داستان" پیش کی جائے وہ ایسی ہو کہ اُس سے زندگی کا ایک صحیح اور تندرست فلسفہ پیدا ہو سکے تاکہ موجودہ دور شک و الحاد اور بے عملی کا خاتمہ ہو اگر قاضی صاحب اس خدمت کے کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی تحریر کے ادبی نقوش کی تعریف

کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف کی "معنوی ماہیت" کی بھی ہر طرف سے خاطر خواہ داد ملے گی آخر میں، ہم قاضی صاحب موصوف سے درخواست کریں گے کہ وہ نوجوانوں کی اُن ذہنی کیفیات کا جن کا تعلق محض شہوانی جذبات سے نہیں ہے ذرا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور اُن "غریب نوجوانوں" کو جنھیں کالجوں میں پیا گھولا اور چھانا جاتا ہے" اپنی دل سوزی ہمدردی اور تعمیری مساعی کا زیادہ مستحق سمجھیں اور ان پر سستی قسم کی پھبتیاں چست کرنے سے جہاں تک ہو سکے اجتناب فرمائیں کیونکہ ان "آبگینوں" کو "ٹھیس" لگانا سماج کے لیے سخت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

لیلیٰ کے خطوط | از قاضی عبدالغفار صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحات کتابت و طباعت اچھی "مجنوں کی ڈائری" کے ساتھ ہے ہیں مل سکتی ہے ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

یہ کتاب ایک ذہین تعلیمیافتہ اور شاید فطرتاً نیک بازاری عورت کے فرضی خطوط ہیں جن کے وسیلے سے اس کے فلسفۂ زندگی اور نفسیاتی کیفیات کے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے موضوع کتاب یعنی ابتدا میں جوانی کی لغزش، تربیت کرنے والوں کی عدم توجہی اور بعد میں معاشی ضرورت سے مجبور ہوکر طبعی تنفر اور بیزاری کے باوجود پیشہ کو جاری رکھنا! اور مناسب موقع ملنے پر اس سے کنارہ کش ہو جانا ہر چند پامال ہو چکا ہے لیکن جس جدت خیال اور ندرت بیان کے ساتھ قاضی عبدالغفار صاحب نے کتاب میں اپنی انفرادیت کو چمکانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ یقیناً مستحق ستائش ہے ادب لطیف کے اس دلکش خزانے میں چند جواہر پارے تو واقعی بہت بیش قیمت ہیں مثلاً ایک خط کی ابتدا ایک ایسے بلیغ استعارے سے ہوتی ہے کہ کل کتاب کا ماحصل چند مختصر الفاظ میں محدود ہو جاتا ہے وہ لکھتی ہے:-

"قدرت کے دو بچوں نے کہا آؤ ایک کشتی بنائیں انھوں نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی محبت سے اس کے تختے جوڑے اس کو اپنے ایک باغ کے خوبصورت تالاب میں ڈال دیا جہاں موسم بہار کی معطر ہوائیں اُس ننھے سفینے کو پانی کی ہلکی لہروں پر جھولا جھلایا کرتی تھیں وہ کشتی کاغذ کی نہ تھی نہ لکڑی کی تھی نہ لوہے کی لیکن کاغذ سے بھی زیادہ نازک تھی مگر اس کے بنانے والے نہ جانتے تھے کہ ایسی کشتیاں

کس قدر نازک ہوتی ہیں شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ ایک چھوٹے سے باغ کے چھوٹے سے تالاب کے بے موج اور بے طوفان پانی کے لیے کشتی کو مضبوط بنانے کی ضرورت نہیں وہ بھول گئے کہ تالاب کی کشتی کو بھی کسی دن طوفان خیز سمندروں اور تیز دریاؤں میں جانا پڑتا ہے. تالاب بھی دریا اور سمندر بن سکتا ہے. وہ خطرات کو بھول گئے, مگر بھول جانے سے خطرات کم نہیں ہو سکتے یہ خدا کا نہ بدلنے والا قانون ہے."

برسات آئی. ایسی برسات آئی کہ چاروں طرف سے نالے چشمے اور دریا اُمنڈ آئے پھولوں کی کیاریوں کو پانی کی چادر نے ڈھانک لیا ...... جب تک اس ننھے سفینہ میں دم تھا اور دم ہی کتنا تھا. اس نے سنبھلنے کی کوشش کی, لیکن کوئی سہارا نہ تھا کشتی والے بیخبر تھے انھوں نے کس محنت سے سفینہ بنایا تھا اور کس بے پروائی سے اس کو بھول گئے, تالاب کے پانی اور برسات کی ہواؤں نے یوں گویا کہ دونوں کی سازش تھی, ایک دو دن اس شکستہ لنگر کشتی کو ادھر ادھر گھسیٹا اور پھر آخری جھٹکا دیکر چھوڑ دیا. ایک طرف کیچڑ میں جہاں مینڈکیں بول رہی ہیں اور جھینگر شور مچا رہے ہیں, درختوں کے گرے ہوئے پتے سڑ رہے ہیں چند گلے ہوئے تختوں کا انبار پڑا ہوا ہے کچھ کیچڑ میں کچھ کیچڑ کے باہر......

"کوئی ان بے خبر کشتی والوں کو بلائے اگر چاہیں تو ان تختوں میں اب بھی اتنی سکت باقی ہے پھر اپنی کشتی بنالیں وہ ایسی مضبوط تو نہ ہوگی جیسی پہلے تھی مگر کسی چھوٹے سے باغیچہ کی نہر میں اب بھی پڑی رہ سکتی ہے, کہیں کوئی ملاح ہے جو اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو جوڑ دے جو اس کشتی کے لیے ایک بادبان اور لنگر کہیں سے لادے."

"میرے مہربان! یہ پہلی جو بیان کی گئی آپ بیتی ہے......"

اسی قسم کے اور بہت سے لطیف ادبی شہ پارے ہیں. کتاب مستحق مطالعہ ہے اور بازاری عورت کے شرمناک عہد زندگی کے اختتام اور نئے عہد پاکبازی کے آغاز پر ختم ہوتی ہے آخری خط میں وہ لکھتی ہے "چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں. اس ویرانے کو آباد ہونے دو مجرموں سے میرے انتقام کا وقت وہ آئے گا جب میں بیوی اور ماں بنکر بغاوت کا علم بلند کروں گی ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں, ذلیل, حقیر, گردن زدنی!"

دلچسپ افسانے | از جناب کوثر چاندپوری تقطیع چھوٹی ضخامت چار سو صفحات کتابت و طباعت روشن کاغذ متوسط قیمت عہ ملنے کا پتہ شمیم اختر بیگم۔ بیگم گنج بھوپال یا مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

یہ جناب کوثر چاندپوری کے پچیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر سماج کی اصلاح کے مقصد سے لکھے گئے ہیں اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں کچھ حسن و عشق کے افسانے بھی ہیں جن میں رومان پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جناب مصنف کی طبیعت مبالغہ کی جانب بھی مائل معلوم ہوتی ہے" انتقام قدرت" میں سورج سنگھ کا کیرکٹر مبالغہ آمیز ہے سورج سنگھ کو اس کے مظالم کی سزا قدرت کی طرف سے یہ ملی ہے کہ اس کا گھر سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود بیوی بچوں سمیت سیلاب کی نذر ہو گیا مگر یہ صورت تو کم و بیش گاؤں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی انھیں کس جرم میں یہ سزا ملی۔ کتاب کے شروع میں جناب مصنف اور جناب قاضی امیرالدین صاحب نائب دیوان ریاست دتیا کی تصویریں بھی ہیں۔

رموز کلام غالب | مرتبہ محمد اسحاق صاحب، حجم ۸۲ صفحات تقطیع چھوٹی۔ کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت ۸ ملنے کا پتہ منیجر صاحب رسالہ ماہ تمام نمبر ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

جناب اسحاق صاحب امرتسری، غالب کے سات اشعار مختلف عنوانات: مایوسی، قسمت، طاعت، آئینہ، شراب، دین و دنیا۔ انسان کی دنیا کے تحت میں تقسیم کر کے اُن کی تشریح کی ہے

ہوش کے ناخن | از جناب میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان تقطیع چھوٹی حجم ۹۴ صفحات، کتابت و طباعت متوسط کاغذ اچھا قیمت دس آنے ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ یہ ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان طمع زر میں کیسا سخت دل اور خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے کیسی کیسی عیاریوں سے کام لیتا ہے اور اگر کوئی ان خرابیوں کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو ماحول اور سوسائٹی اسے بالکل بے بس اور مجبور کر دیتی ہے ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ ہے اور قابل مترجمین نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔

زبان حیدرآباد کی مقامی ہی جس سے ڈراما کا لطف اہل حیدرآباد کے لیے اور بڑھ گیا ہوگا۔ حیدرآباد میں دوبارہ کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی ہو چکا ہی۔

چالیس حدیثیں | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ ضخامت ۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۲؍ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب خواجہ صاحب نے اس کتاب میں بچوں کے لیے مختلف عنوانات مثلاً جسم اور کپڑوں کی صفائی، وقت کی پابندی، استقلال، ماں باپ رشتہ دار وغیرہ عنوانات کے ماتحت قرآن کی آیات اور احادیث جمع کر دی ہیں۔ ساتھ ہی نہایت آسان زبان اور موثر انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہی یہ کتاب بچوں اور بوڑھوں سب کے لیے مفید ہی۔

بچوں کے اسمٰعیل | از جناب سعید انصاری صاحب بی۔ اے (جامعہ) ضخامت ۸۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب سعید انصاری صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں ہندوستان کے مشہور شاعر اسمٰعیل میرٹھی کی اُن نظموں کا انتخاب شائع کیا ہی جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں اور ان کی ریڈروں میں چھپ چکی ہیں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو بچوں کی نظمیں لکھنے میں جو کامیابی ہوئی ہی وہ اب تک بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ سعید صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہی کہ ان نظموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہی انھوں نے اس امر کا التزام کیا ہی کہ سہل اور آسان نظمیں پہلے آئیں اور بعد میں مشکل ہوتی جائیں آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہی۔

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ کا وفد جو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی سرکردگی میں صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا ہے اب تک ہر طرح کامیاب رہا ہے مظفر نگر، سہارن پور، بجنور کا کام ختم ہو چکا ہے اور ان تینوں ضلعوں کے باہمت لوگوں نے جس گرمجوشی، خلوص اور فیاضی سے ہمارے وفد کی امداد کی ہے اُس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان مالی مشکلات کے زمانے میں مسلمانوں کا ہاتھ تنگ ہو، مگر دل تنگ نہیں ہے اور دوسری طرف یہ کہ جامعہ ملیہ نے ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں کو اپنی تعلیمی تحریک کی طرف متوجہ کر لیا ہے اور اب انشاء اللہ اس کی راہ میں وہ دشواریاں جو اب تک تھیں باقی نہیں رہیں گی آئندہ ہفتے میں وفد بریلی، شاہجہاں پور، بدایوں وغیرہ جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ روہیلکھنڈ کے حامیانِ تعلیم اور محبانِ ملت اپنے قومی ادارے کی مدد میں میرٹھ کے باشندوں سے پیچھے نہیں رہیں گے تحمینہ یہ ہے کہ مظفر نگر، سہارن پور، بجنور کے چندے کی مجموعی رقم اُس نصاب سے ڈیوڑھی ہے جو ان اضلاع کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ دیکھنا ہے کہ اور اضلاع صرف اس تناسب کو قائم رکھتے ہیں یا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تجویز ہے کہ آئندہ سال سے جامعہ میں ابتدائی مدارس کے معلموں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے بعض اسلامی انجمنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ جامعہ اپنے یہاں معلموں کی تعلیم کا مدرسہ کھولے، خود جامعہ کے ابتدائی مدرسہ سے ہر سال مدرس ٹریننگ کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں اور اُن کی تعلیم کا خرچ جامعہ کو برداشت کرنا پڑتا ہے اگر وہ اپنے یہاں ٹریننگ کا معقول انتظام کرے تو اس کے مدرسوں اور دوسرے اسلامی مدرسوں کو بڑی سہولت ہو جائے گی اسی خیال سے نی الحال ایک سال کیلئے ٹریننگ کا شعبہ امتحاناً قائم کیا جا رہا ہے اور اس میں بہت تھوڑے سے طلبا داخل کئے جائیں گے، داخلہ کی مفصل شرائط بہت جلد شائع کر دی جائیں گی۔ غالباً اسلامیات، اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کم سے کم

ثانوی دوم (مڈل) تک جاننے کی قید ہوگی ممکن ہو داخلہ کا کوئی امتحان بھی رکھا جائے طلبا کو اصول تعلیم نفسیات اطفال، طریق درس، نظم مدرسہ، حفظان صحت وغیرہ کے علاوہ ان مضامین کی مزید تعلیم بھی دیجائے گی جو انھیں ابتدائی مدرسوں میں پڑھانے ہوں گے۔

کالج کے نصاب تعلیم پر بھی دوبارہ غور کیا جا رہا ہو خیال ہو کہ ثانوی چہارم کے بعد کالج کی چار سال کی تعلیم کا ایک ہی نصاب بنایا جائے اور ایک ہی سند بی۔اے، رکھی جائے ہر سال کے ختم پر امتحان ہوا کرے صرف اس لیے کہ سال بھر کی تعلیم کا نتیجہ معلوم ہوسکے، نصاب میں اختیاری مضامین نہ رکھے جائیں بلکہ ہر طالب علم کے لیے ایک ہی نصاب ہو، جو انگریزی، اردو کے علاوہ اسلامیات اور اجتماعیات پر حاوی ہو، اور جس کے ختم کرنے کے بعد طلبہ صحافت، معلمی اور دوسری معاشرتی، قومی خدمات انجام دے سکیں۔

بی اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر طالب علم سے یہ توقع کیجائے گی کہ ان میں سے کسی کام کی عملی تربیت بھی حاصل کرے اور جب تک جامعہ میں اس کا انتظام نہیں ہو اُس وقت تک کسی دوسرے ادارے میں جا کر اس کی تکمیل کرے۔

امیرِ جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہٗ کے برادر بزرگ نواب ضیا نواز جنگ بہادر نے یکایک بنگلور میں انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ہم جامعہ ملیہ کے طلبا اور اساتذہ اور رسالہ جامعہ کے قارئین کرام کی طرف سے ڈاکٹر صاحب قبلہ اور مرحوم کے کل عزیزوں سے اس صدمۂ جانکاہ میں قلبی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، مرحوم اعلیٰ درجہ کے منتظم اور مدبر، اعلیحضرت خسرو دکن کے معتمد خاص نہایت دیندار خوش خلق اور مہمان نواز بزرگ تھے، جامعہ ملیہ سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور اس کی مدد میں ہر طرح کی سعی فرماتے تھے۔

خداوند تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے (آمین)

رجسٹرڈ نمبر ال-۱۸۹۲



جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیرادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ صہ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸ر

کسان

اُس کے افلاس کے اسباب اور اُن کا علاج

مُصنفہ

چودھری مختار سنگھ صاحب سابق ایم. ایل. اے. ایم. ایل. سی

مترجمہ جناب محمود علی خاں صاحب جامعی

قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کس طرح رفتہ رفتہ اس کو خوش حال سے محتاج کیا گیا؟ کس طرح ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا گیا؟ اور کس طرح ایک صنعتی ملک کو زرعی ملک بنا دیا گیا؟ اب کسان کی حالت اتنی دردناک ہو کہ اسے تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو دو وقت روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کا اصل سبب کیا ہو اور کس طرح کسان پھر خوشحال ہو سکتا ہو۔

ان سب چیزوں کا اگر آپ جواب چاہتے ہیں تو یہ کتاب ملاحظہ کیجئے کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہو. کسان کی خوشحالی ملک کی خوشحالی ہو لہذا جو لوگ موجودہ درد کی دوا چاہتے ہیں انھیں کسان کی طرف توجہ کرنا چاہیئے. یقین ہو کہ اس موضوع پر اردو میں اس سے بہتر کتاب اب تک پیش نہیں کیگئی ہو. کتابت، طباعت، کاغذ اعلیٰ. ضروری ہو کہ ملک کا ہر بہی خواہ اسے بار بار پڑھے اور اس پر عمل کرے تاکہ غریب ہندوستان کے دن پھر جائیں. قیمت ۱۲؍

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

قائم مقام ایڈیٹر:- محمد عاقل ایم - اے

جلد ۲۴	جون ۱۹۳۵ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

محمد مجیب بی - اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

جدید مغربی تمدن کی ماہیت

جدید مغربی تمدن کے جو سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے تین اہم ترین عناصر ہیں یعنی (۱) یونانیت (۲) رومیت اور (۳) عیسائیت ان تینوں اجزاء کے میل سے موجودہ مغربی تمدن وجود میں آیا ہے۔ ان اجزا کا میل عہد جدید کے مختلف ادوار، مختلف اقوام، اور مختلف اشخاص میں بہت ہی مختلف ہے۔ بعض اوقات عیسائیت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو عہد جدید کی یہ تحریکات مذہبی شکل اختیار کر لیتی ہیں مثلاً لوتھر کی تحریک اصلاح۔ لیکن اس تحریک میں یونانیت اور رومیت کے اثرات بھی ضرور پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یونانیت کا اثر زیادہ ہوتا ہے تو بعض تحریکات علمی اور جمالی شکل اختیار کر لیتی ہیں مثلاً یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک۔ بعض اوقات رومیت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے تو بعض تحریکات سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہیں مثلاً میکاولی کے فلسفہ سیاست کے زیر اثر تحریکات۔ لیکن ہر تحریک میں چاہے اسکا مخصوص انداز کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ تینوں عناصر لازماً پائے جاتے ہیں یہی کیفیت اشخاص کی بھی ہے جو خود ایک طرف ان تحریکات کا نتیجہ ہیں اور دوسری طرف خود ان تحریکات پر اپنی ذاتی شخصیت کا زبردست اثر ڈالتے ہیں۔

مختلف اقوام مغرب میں اُن اقوام کی مخصوص خصائص کے باعث انھیں تینوں عناصر نے مختلف اہمیت اختیار کر لی مثلاً فرانسیسی قوم پر ادبی اور جمالی رنگ زیادہ غالب ہونے کے باعث یونانیت کا اثر زیادہ ہوا۔ انگریزوں پر رومیت کا۔ جس کے باعث وہ قانون اور سلطنت کے قیام میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جرمنوں پر عیسائیت کا۔ جہاں سے کہ لوتھر کی عظیم الشان مذہبی تحریک اصلاح شروع ہوئی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان اقوام میں دوسرے عناصر موجود نہیں ہیں۔ دوسرے عناصر بھی ان میں موجود ہیں مگر ان کے قومی خصائص کے باعث ایک عنصر نے ان کی زندگی میں ضرور زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔

تمدن زوال پذیر ہوتا ہے اور قدیم متمدن قوم پر کوئی تازہ دم جاہل قوم آکر قبضہ کرلیتی ہے" یہ ایک واضح ترین دلیل ہے۔ اشپنگلر نے اپنی جدید تصنیف زوال مغرب میں "طاقت" کے اسی عنصر پر پھر زور دیا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے اس اصول کے مطابق وحشی رومیوں نے متمدن یونانیوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن بہت جلد ہی فاتح مفتوح ہوگئے رومی یونانیوں کے سامنے درس تمدن کے لئے زانوئے ادب تہہ کرکے بیٹھ گئے۔ رومیوں نے فلسفہ اور علوم و فنون کا اکتساب یونان سے کیا لیکن چونکہ یہ انکی اصل فطرت کے مطابق نہ تھا اس لئے اس میں وہ کوئی خاص کمال پیدا نہ کرسکے۔ سسرو کے لئے بھی جو رومیوں کا سب سے بڑا فلسفی گذرا ہے علم فلسفہ بالذات کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا اصل میدان سیاست و خطابت تھا۔ جب اسے مجبوراً جمہور کی مخالفت کے باعث سیاست سے کنارہ کشی کرنا پڑتی تو وہ اس وقت اپنے دل کو لذت علم سے تسلی دے لیا کرتا تھا۔

رومیوں کی اصل عظمت اُن کے نظام سلطنت اور قانون میں ہے۔ وہ انتہائی نظم و ترتیب جفاکشی اور داخلی امن کے باعث اس قابل ہوگئے کہ ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالدیں۔ رومی سلطنت کی کامیابی کی اصل وجہ وہ تربیت ہے جو اہل روما کو اوائل زندگی ہی میں اپنے خاندان میں مل جایا کرتی تھی۔ باپ گھر کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا جسے اپنے بچوں کو قتل کرنے کا بھی قانونی استحقاق حاصل تھا۔ خاندانی زندگی کی اس سختی اور اخلاق کی اس پختگی نے اُن کو اس قابل بنادیا کہ وہ اُس زمانہ کی متمدن دنیا پر حکمرانی کرسکیں۔ اہل روم اصول سلطنت اور قانون میں مغربی اقوام کے رہبر ہیں اور جہاں تک سلطنت و قانون کا تعلق ہے یورپ کا جدید ریاستی نظام، روم کے قدیم نظام سلطنت و قانون پر مبنی ہے۔

۳۔ تحریک عیسائیت | تیسرا عنصر جس نے مغربی تمدن کی کایا ہی پلٹ دی عیسائیت ہے۔ یہ ایک مشرقی عنصر تھا جو مغربی زندگی میں جاکر شامل ہوگیا۔ یونانی اور رومی تمدن کی بنیاد دنیاوی زندگی اور اس کی ضروریات پر استوار تھی۔ اُن کے دیوتا بھی دنیاوی صفات رکھتے تھے۔ آپس میں رشک، عداوت، پریم و محبت، جنگ و جدال، اُن کے روزمرہ کے کارنامے تھے۔ روح اور اُس کے ساتھ آخرت کا ایک واضح تخیل اُن کے یہاں مفقود تھا عقل اور قوت کو ابتک مغربی تمدن میں ایک بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

رومی سلطنت کا آخری دور جفاکاریوں اور خون آشامیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر تھی ۔ قوت کے بے پناہ جور اور عقل کی موشگافیوں سے انسانیت عاجز آگئی تھی ۔ وہ پریم و محبت کی متلاشی تھی ۔ اپنے دل کی بے چینیوں کے لئے امن و سکون ڈھونڈھتی تھی ۔ وقت کی ضرورت اور دنیا کی اس پیاس کو عیسائیت نے آکر پورا کیا اور بجھایا ۔ عیسائیت نے قوت کی جگہ محبت کا نصب العین پیش کیا اور عقل کی بجائے ایمان کی تلقین کی، اس دنیاوی سلطنت کی جگہ آخروی بادشاہت کی طرف توجہ دلائی ۔ انسان کی جگہ خدا کو مرکز میں لاکر کھڑا کردیا ۔ عیسائیت نے چونکہ اس زمانہ کی انسانی ضرورتوں کو پورا کیا اس لئے وہ یورپ میں سرعت سے پھیلنا شروع ہوئی ۔ یورپ میں مگر عیسائیت اُس طرح نہ داخل ہوئی جس طرح مسیح علیہ السلام نے اس کی تعلیم دی تھی ۔ اس میں بہت سے خارجی عناصر آکر شامل ہوگئے مثلاً یونان کے چند قبائل کے باعث جنھوں نے سب سے پہلے عیسائیت قبول کی تھی اور جو سورج کی پرستش کیا کرتے تھے بہت سی باتیں عیسائیت میں ایسی داخل ہوگئیں جو اُن کے قدیم مذہبی عقائد سے وابستہ تھیں تثلیث کا خیال انھیں اثرات کا نتیجہ ہے ۔

شروع شروع میں صرف اخلاقی تعلیم جمہور کی ضروریات کے لئے کافی تھی لیکن جب قدرے اطمینان حاصل ہوا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ متمدن لوگوں نے بھی عیسائیت قبول کرلی تو مابعد الطبیعاتی مسائل کا پھر دور دورہ ہوا ۔ کلیسا نے اپنے نظام کو مستقل کرنے کے لئے آتے دو بنیادوں پر استوار کیا ۔ ارسطو کا یونانی فلسفہ اور روم کا نظام شہنشاہیت ۔ کلیسا چونکہ یونان اور روم کا تمدنی وارث تھا اس لئے یہ لازمی امر تھا کہ اُس کے تمدنی ورثہ پر یہ جدید عمارت کھڑی کیجائے ۔ ارسطو کے تمام عقلی فلسفہ کو لے کر اُس نے اس پر ایک ذہنی عمارت تعمیر کی ۔ کلیسا کا ظاہری نظام رومی شہنشاہیت کے طرز کا قائم کیا گیا ۔ یہ دونوں کام سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین نے انجام دیا جو زمانہ متوسط کے کلیسا کے بانی قرار دئے جاسکتے ہیں ۔

باوجود ان تمام یونانی اور رومی اثرات کے عیسائیت کی دو باتیں ضرور قائم رہیں ۔ ایک محبت کا تخیل اور دوم خدائی بادشاہت کا خیال ۔ عیسائیت میں اخروی دنیا کی اہمیت کے باعث اس دنیا کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ گئی ۔ فقر و فاقہ کشی، لذات سے محرومی، اور اس دنیا سے نفرت کلیسا کا جزو ہوگئی ۔ آخرت کے

مسائل کے سامنے اس دنیا کے مسائل کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ کلیسا کے آخری ایام میں مذہب بالآخر ایک فرسودہ چیز ہو کر رہ گئی جس کو انسانی مصائب اور ضروریات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ کلیسا کے دور تسلط میں جو پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا ارسطو کے فلسفہ کو اقتدار کلی حاصل رہا۔ لیکن پھر بھی بعض تحریکات خفیہ طور پر برابر مغربی زندگی میں جاری تھیں جو انفرادی زندگی کی حامل تھیں اور انسان کی بلاواسطہ حقیقت کی پیاس کو تسکین دیا کرتی تھیں۔ یہ تحریک تصوف تھی جو نوفلاطونیت کے جمالی وجدانی رنگ میں بعض جگہ خاموش اپنا کام کر رہی تھی۔

۴۔ عہد جدید۔ کلیسا کی ذہنی اور مذہبی غلامی سے بالآخر یورپ کی اقوام تنگ آ گئیں اور وہاں نیا مذہبی احساس اور نئی ذہنی زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس نئی بیداری میں خارجی اور داخلی اثرات شامل ہیں۔ اپنے مذہبی جنون میں جب مغربی اقوام نے اسلامی اقوام سے جنگہائے صلیب میں مقابلہ کیا تو اُن کو پہلی دفعہ یہ احساس پیدا ہوا کہ دنیا میں ایک قوم اور بھی موجود ہے جو اُن سے زیادہ متمدن اور با اخلاق ہے۔ اہل یورپ مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ لے کر ارض مقدس گئے تھے لیکن جب وہ وہاں سے لوٹے تو ظاہراً نہیں تو باطناً ضرور مسلمانوں کے وسیع اخلاق اور سادہ اور پاک مذہب کے قائل ہو گئے۔ مسلمانوں سے اس تصادم نے یورپ میں ایک نئی مذہبی اصلاح کی روح پھونک دی اور لوتھر کے متعلق اب قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے واقف تھا۔ مرکزی یورپ اور صقلیہ میں مسلمان ایک عرصہ تک حاکم رہے۔ ہسپانیہ کے روشن خیال خلفاء کے تحت میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی۔ فطرت کا آزاد مطالعہ قرآنی تعلیمات کا لازمی نتیجہ تھا جس میں متعدد بار فطرت نوامیس فطرت اور نفس انسانی کے مطالعہ کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی باعث عرب خاص طور پر علوم طبعیہ، ریاضی اور طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اُس میں مہارت پیدا کی۔ عہد متوسط میں یونانی فلسفہ خصوصاً ارسطو کے فلسفہ کو زندہ رکھنے والے مسلمان ہی تھے۔ ارسطو کے فلسفہ کو مسلمان بہت غلط سمجھے تاہم عربوں ہی کی بدولت یہ عہد متوسط میں تباہی سے بچ گیا۔ ہسپانیہ اور صقلیہ کے اسلامی جامعات کے فارغ التحصیل طلبار نے یورپ کی ذہنی زندگی میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا۔ سینکڑوں برس تک ابن سینا اور ابن رشد کی تصانیف مغربی جامعات کے لئے باعث ناز رہیں۔ مغرب نے شروع

میں تو اپنے علم کی پیاس کو عربی، یہودی علوم وفنون اور یونانی علوم کے تراجم سے جو عربی زبان سے کئے گئے تھے بجھانا چاہا۔ لیکن بعد میں اُس نے اپنے تمدن کے اصل سرچشمے یعنی یونان کی طرف توجہ کی اور یہیں سے عہد جدید میں یونانیت کی وہ عظیم الشان تحریک پیدا ہوئی جس کی طرف ہم شروع ہی میں اشارہ کر چکے ہیں۔ پھر جدید سائنٹفک تحریکات، نئی دنیا کے انکشاف وغیرہ نے اہل مغرب کو عقل کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

لیکن یورپ کی نئی زندگی صرف خارجی اثرات ہی کا نتیجہ نہ تھی۔ وہ صرف اہل عرب اور یونان کی نقالی نہ تھی، وہ صرف فطرت اور اُس کے قوانین کی اثر پذیری نہ تھی بلکہ مغربی اقوام اب پختہ تر اور جوان ہو گئی تھی۔ اپنے عہد طفولیت میں انھوں نے کلیسا کی سرپرستی کو تسلیم کر لیا۔ جو کچھ کلیسا نے اُن کو ذہنی اور مذہبی تعلیم دی قبول کیا۔ مغربی اقوام کی مثال بعینہٖ اُس بچے کی سی تھی جو اپنی تمام ضروریات کے لئے اپنے والدین پر بھروسہ کیا کرتا ہے۔ نہ وہ خود بلا واسطہ اشیاء کا علم حاصل کر سکتا ہے اور نہ اپنے افعال کے لئے آزادانہ کوئی راہ نکال سکتا ہے لیکن اپنے عہد شباب میں مغربی اقوام کلیسا کی یہ سرپرستی تسلیم نہیں کر سکتی تھیں بلکہ حقیقت سے بلا واسطہ تعلق پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ علمی دنیا میں خود تحقیقات وجستجو کرنا چاہتی تھیں۔ سیاسی معاملات میں آزادانہ قومیت کی بنیادوں پر ریاستیں قائم کرنا چاہتی تھیں۔ غرض مغرب کی اس بیداری نے تین واضح شکلیں اختیار کرلیں جو باہم ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اوّل مذہبی۔ دوم علمی۔ سوئم سیاسی۔ مذہبی تحریکات نے اصل عیسائیت کو علمی تحریکات نے یونان کو اور سیاسی تحریکات نے روم کو پیش نظر رکھا۔ محبت، عقل اور قوت یورپ کی نئی اقوام کے لئے بہ حیثیت نصب العین کے پیش کئے جانے لگے۔

ہمارا مقصد ان تینوں تحریکات پر تاریخی نظر ڈالنا نہیں ہے اور نہ انھیں تفصیل سے بیان کرنا ہے بلکہ مختصراً یہ بتا دینا ہے کہ یہ متضاد تحریکات نہ تھیں بلکہ ایک ہی کیفیت نفسی کا نتیجہ تھیں۔

۵۔ تحریک قوت | میکاولی انسانی زندگی میں قوت کا حامل تھا۔ وہ جدید مغربی سیاسی تحریکات کا رہبر اوّل ہے۔ میکاولی اٹلی میں پیدا ہوا۔ وہ روم کی گذشتہ عظمت کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ رومن کلیسا

نے اس تمام عظمت کو اس کے خیال میں برباد کر ڈالا تھا۔ اس لئے وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ کلیسا کی طرح عام انسانی حکومت کا قائل نہ تھا بلکہ قومی بنیادوں پر حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک سیاست داں تھا اور سیاست کی اصلی جان قوت کو سمجھتا تھا۔ یہ قوت خواہ کسی طرح حاصل ہو اُس کے نزدیک قابل ستائش تھی۔ حاکم کے لئے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی حکومت کے لئے ہر ذریعہ استعمال کرنا چاہیئے۔ میکاولی معلم اخلاق نہ تھا بلکہ ماہر نفسیات۔ اُس نے نفس انسانی کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ نفس پرستی خود غرضی اور حصول طاقت کا جذبہ ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ اسی نفسیاتی مطالعہ کی بنا پر اُس نے اپنی مشہور کتاب " پرنس " میں وہ تمام اصول بتا دئے جو ایک حاکم کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نفس پرستی اور علیٰحدہ قومی زندگی کی تعلیم بعد کی مغربی اقوام کے لئے مثال کا کام دینے لگی اور تقریباً تمام اقوام کا اُس پر عمل ہو گیا۔ میکاولی کے نزدیک سیاسی ادارے مذہب کے ماتحت نہیں رہ سکتے بلکہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مذہب کو آلہ کار ہونا چاہیئے۔ یہ ایک خالص رومی تصور تھا، جس کو جدید مغربی زندگی میں میکاولی نے دوبارہ زندہ کر دیا۔

۶۔ تحریک عقل | علمی تحریکات کے رہبروں کا امام ارازمس ہے۔ یہ یونانی علوم و فنون کا ماہر تھا۔ اس نے یونانی کتب کے بہت سے تراجم مغربی زبانوں میں کئے۔ اُس کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مغربی اقوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلائے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ مغربی اقوام ایسے تمدن سے واقف نہ ہو جائیں جو خود آزادی دلائے اور عقل پر مبنی ہو۔ اس قسم کا تمدن صرف یونان کا تھا۔ اس تمدن سے واقفیت پیدا کرا کے علمی تحریکات کے رہبر مغربی اقوام کی ذہنی پیاس کو بجھانا چاہتے تھے اور اُس پر ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ یونانی علوم و فنون اور یونانی ادب اور ڈرامہ سے اس زمانہ میں بیحد دلچسپی پیدا ہو گئی۔ زمانہ متوسطہ کی مقفٰے و مسجع عبارت کی جگہ ادب میں آزادانہ اور بے ساختہ طرز ادا کا رواج ہو گیا۔ مذہبی گیتوں اور نظموں کی بجائے فطری مناظر اور انسانی اعمال بھی نظم کئے جانے لگے۔ مصوری و نقاشی پر بھی اس تحریک نے اپنا اثر دکھایا۔ زمانہ متوسطہ میں تمام مصوری کا منتہائے کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی تصاویر کو روحانی جامہ میں زیب قرطاس

کیا جائے۔ مگر اب اس کے پہلو بہ پہلو حسین فطری مناظر اور انسانی افعال کے مرقع بھی کھینچے جانے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا وسیع تر مذہبی تصور آرٹ کے ذریعہ اپنا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب خدا کو محدود صرف ایک ہستی ہی میں نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ فطرت کے ہر منظر اور انسان کے ہر اخلاقی فعل میں اب اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دیتا تھا ؂

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ٭ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہ مذہبی تصور اس زمانہ کی علمی اور ادبی تحریکات سے وابستہ تھا۔ اس لئے اُس میں بہت رواداری تھی وہ عیسیٰ اور موسیٰ کے برابر ارسطو۔ فلاطون اور سقراط کو بھی جگہ دیتا تھا اور ان سب کو خدا کے محبوب اور نیک بندے تصور کرتا تھا۔ لیکن یہ تصور اس زمانہ کی تعلیم یافتہ جماعتوں تک محدود تھا گو عوام میں بھی کسی قدر مذہبی بیداری ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ کلیسا کے قیود اور خشک مذہبیت سے وہ بھی بیزار تھے۔ لیکن وہ صرف ایک ایسے ہی مذہبی تصور سے مطمئن ہو سکتے تھے جو کسی قدر محسوس چیز پر مبنی ہو۔ عوام کی اس مذہبی ضرورت کو لوتھر نے پورا کیا۔ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد کلیسا کی مخالفت اور انجیل کی لفظی پیروی پر رکھی۔

۷۔ تحریک محبت | لوتھر عیسوی محبت کا علمبردار تھا۔ اُس نے حقیقتاً مغرب کے مذہبی تصور کو بالکل ہی بدل دیا۔ جرمن قوم کی زندہ اور نامی روح کی روم کے مردہ نظام کلیسا کے خلاف یہ ایک بغاوت تھی۔ رومن کلیسا کبھی بھی خود کو عہد قدیم کی اصنام پرستی سے آزاد نہ کر سکا تھا۔ اُس کا مذہبی تصور ہمیشہ محسوسات کا پابند رہا۔ یونانی دیوتاؤں کے بجائے عیسائی گرجے مسیح، مریم اور روح القدس کے بتوں سے مزین کر لئے گئے تھے۔ یونانی کلیسا کا تخیل تثلیث پر مبنی تھا جو یونان کا ایک قدیم تصور تھا۔ رومی کلیسا کا نظام فوجی وضع کا مرتب کیا گیا تھا۔ لوتھر نے پہلی مرتبہ عیسائیت کو ان قدیم عناصر سے پاک کیا اور اُس کو ایک خالص روحانی رنگ دیدیا۔ لوتھر نے یہ تعلیم دی کہ انسانی نجات کے لئے کلیسا کا واسطہ ضروری نہیں ہے بلکہ انسان خود بلا واسطہ خدا سے قرب حاصل کر سکتا ہے اس تعلیم میں مسیحی عیسائیت اور تصوف کے عناصر کام کر رہے تھے جس کے تحت میں خود لوتھر کی زندگی کی تشکیل ہوئی تھی۔ لوتھر نے کلیسا کی رہبانیت، اُس کے رہنماؤں کی ظاہری

شان و شوکت، اس کی خشک اور بے روح اخلاقی تعلیم کی مخالفت کی اور اس کے بجائے انسانی ضمیر اور زندگی کی اہمیت پر زور دیا۔ دنیا میں رہ کر اپنے انسانی فرائض کو بحسن و خوبی انجام دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ لوتھر کی تعلیم پر سیاست کا بھی بہت اثر تھا۔ اس نے کلیسا کی عالمگیر حکومت کی مخالفت کی اور اُس کی بجائے اپنے مذہب کو قومی بنیادوں پر قائم کیا۔

وسیع مذہبی تصور، اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور مغربی اقوام کے جذبۂ قومیت کی تائید کی باعث لوتھر کے جدید مذہب کو یورپ کی شمالی اقوام نے قبول کر لیا اور عیسائیت ہمیشہ کے لئے دو زبردست فرقوں میں منقسم ہو گئی۔ لوتھر کی تعلیمات کا اثر اس قدر ہمہ گیر مرتب ہوا کہ اُس کے بعد سے لیکر اس وقت تک شمالی اقوام کی کوئی تحریک خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، فلسفیانہ ہو یا ادبی اس کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکی۔ ہم شمالی مغربی اقوام کے جذبات اور خیالات اور اُن کے خارجی اعمال سے کچھ بھی واقفیت نہیں حاصل کر سکتے جب تک ہم اس زبردست عنصر کو ہمہ وقت اپنے پیش نظر نہ رکھیں جس نے مغربی زندگی میں ایک زبردست انقلاب ہمیشہ کے لئے پیدا کر دیا۔

پہلے عموماً خیال کیا جاتا تھا کہ جرمنی، انگلستان اور فرانس وغیرہ کی علمی اور فلسفیانہ تحریکات وغیرہ مذہب کی مخالفت میں پیدا ہوئیں یا کم از کم اس سے بے تعلق رہیں۔ ڈلتھائی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان تحریکات کی نشو و نما میں بھی مذہبی تصور زبردست کام کرتا رہا اور مغرب کی جدید روح وسیع مذہبی تصور کا نتیجہ ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کی علمی اور فلسفیانہ تحریکات میں بھی یہی مذہبی روح کام کر رہی تھی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس تعلق کو یہاں واضح کریں تاکہ اُس زمانہ کی زبردست شخصیتوں کو سمجھ سکیں جو کہ اُس صدی کی نفسی زندگی کی علمبردار ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے نفسی عوامل

اٹھارہویں صدی کی نفسی زندگی سمجھنے کے لئے ہم کو تین اصطلاحات کے مفہوم کو بہت ہی واضح کر لینا

چاہیئے۔ فطری مذہب۔ انسانیت اور تصوف۔

۸۔ فطری مذہب | فطرت کو لوتھر بھی ادنیٰ خیال کرتا تھا مگر شوپنہار کی طرح نہیں۔ شوپنہار کا خیال تھا کہ فطرت ایک ادنیٰ چیز ہے اور اس سے انسان کو نفرت کرنا چاہیئے لوتھر کے نزدیک بھی وہ ادنیٰ ضرور ہے مگر اس کا استعمال اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ وہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا تھا بلکہ دنیا میں رہ کر نیک اعمال کرنیکی۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں فطرت کا مفہوم بالکل ہی بدل گیا۔ اب وہ ادنیٰ کی بجائے اعلیٰ تصور ہونے لگی۔ روسو کہتا ہے کہ "انسان کو جماعت خراب کر دیتی ہے ورنہ وہ اپنی فطرت سے نیک ہے" روسو کا مقصد یہ تھا کہ جب "انسان کو اس کے خالق نے پیدا کیا تو وہ دراصل نیک تھا لیکن اس کی زندگی میں جو انسان پائے جاتے ہیں وہ بد ہیں"

فطرت کے اس اعلیٰ تخیل کے تحت میں فطری مذہب کا مسئلہ چھڑ گیا۔ مذہب کی اہمیت اور ضرورت پر روسو نے بہت کچھ لکھا۔ اس نے اٹھارھویں صدی کی عقلیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ایمان اور ایقان کی تلقین کی۔ کانٹ نے عقل کی قوت پر تنقید کی اور اس کے حدود متعین کئے تاکہ وہ اعتقاد کے لئے جگہ پیدا کر سکے۔

فطری مذہب کے پیرو مظاہر فطرت کے ذریعہ خدا تک پہونچنا چاہتے تھے وہ نوامیس فطرت میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے بلکہ بعض تو فطرت اور خدا میں بہ مشکل فرق کرتے تھے مثلاً ہیگل۔ فطری مذہب کے قوانین کا علم انسان کو اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح انسان تجربہ کے ذریعہ خارجی فطرت کے قوانین معلوم کر سکتا ہے۔ فطری مذہب کا تخیل کلیتاً عقل پر مبنی ہے۔

فطری مذہب کی تعلیمات نے بہت کچھ رواقیت کے قدیم فلسفہ کے ماتحت نشو و نما پائی ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں رواقیت کے اثرات خاص طور پر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ڈلتھائی کا میلنکتھون کے متعلق جو لوتھر کا ایک زبردست ساتھی تھا خیال ہے کہ اس نے فطری مذہب کا تصور کلیتاً رواقیت سے لیا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں جرمن عقلیئین اور انگریزی الہیئین کے یہاں بھی اس فلسفہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ رواقیت ایک خالص اخلاقی نظام تھا جو انسانی جذبات اور خواہشات

کو پامال کرنا چاہتا تھا اور اسی بنا پر وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا تھا۔ رواقیت کے زیر اثر جدید تحریکات اور قدیم رواقیت میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں ہے البتہ عقل کی اہمیت میں دونوں متفق ہیں۔

عقل کا مفہوم عہد جدید اور عہد قدیم میں مختلف ہے۔ ہر زمانہ کے فلسفیانہ اصطلاحات اس زمانہ کے تمدن سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اس زمانہ کی ذہنی، سیاسی، مذہبی، غرض کہ کل نفسی زندگی کے مظہر ہوتے ہیں۔ عقل کو یونانی میں RATIO کہتے ہیں جس کا صحیح مفہوم کسی زبان کے ترجمہ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ یونانی اصطلاح میں تناسب اور ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ عقل کے جدید مفہوم میں مذہبی عناصر بھی کام کرتے ہیں جو عیسائیت کے باعث جدید فلسفیانہ فکر میں داخل ہوئے ہیں۔ یونان کی قدیم عقلیت میں ان مذہبی عناصر کا وجود تک بھی نہ تھا۔ اسی بنا پر قدیم و جدید عقلیت میں بھی بہت فرق ہے جدید مغربی اقوام کا گذشتہ یونانی اثرات کو قبول کرنا صرف نقالی نہ تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ اُس زمانہ کی اور اپنی نفسی زندگی میں مشابہت پاتے تھے۔ اس لئے اُس طرف رجوع ہوتے تھے۔ جدید مغربی اقوام نے یونانی تمدن سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنی مخصوص نفسی کیفیت کو کبھی ترک نہیں کیا۔ مختصر یہ کہ رواقیت کے زیر اثر اٹھارھویں صدی عیسوی میں مغربی زندگی میں عقلیت کے عناصر شامل ہو گئے اور اُس کے ماتحت فطری مذہب اور مساوات انسانی کے تصورات نے پرورش پائی۔

۹۔ تحریک انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار لاک، روسو، اور کانٹ گذرے ہیں۔ روسو نے جہاں اُس زمانہ کے کلیسا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی وہاں فرانس کی استبدادی حکومت کی بھی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ اپنی مشہور عالم کتاب "معاہدہ عمرانی" میں اس نے انسانیت کا تخیل پیش کیا۔ آزادی اُس کے نزدیک انسان کا فطری حق ہے۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ پابہ زنجیر ہے" اس کی کتاب کا یہ پہلا جملہ ہے جس نے فرانس میں آتش انقلاب بھڑکا دی۔ آزادی، مساوات اور اخوت کے علم کے نیچے بالآخر فرانس کا خونی انقلاب رونما ہوا۔ جس کے ذریعہ استبدادی شخصی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ قدیم شخصی جابرانہ روح گو کہ متعدد مرتبہ اپنا اثر دکھاتی رہی مگر آزادی اور حرّیت کے خیالات بالآخر تمام

یورپ میں پھیل گئے۔ کانٹ بھی انسانیت کی تحریک کا زبردست علمبردار تھا۔ وہ اقوام کی مساوات کا قائل تھا اور اُن کی ایک ریاست عہدی قائم کرنا چاہتا تھا۔ جہاں انصاف اور آزادی کا دور دورہ ہو اور تمام اقوام امن وامان کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔

ان تعلیمات کے زیر اثر یورپ کی تمام شخصی سلطنتوں کا تدریجاً خاتمہ ہوگیا اور قومیت کی بنیادوں پر جدید ریاستیں قائم ہوگئیں۔ زمانہ متوسط کا قدیم نظام جو قوم کی سہ گونہ یعنی جمہور، روسا اور کلیسا کی تقسیم پر مبنی تھا درہم برہم ہوگیا۔ روسا اور اہل کلیسا یا تو فنا کر دئے گئے یا اُن کا اثر بہت ہی کم ہوگیا۔ مذہبی ادارے قومی حکومت کے ماتحت کر دئے گئے اور حکومت جمہور کو جواب دہ قرار دی گئی۔

انسانیت کے متعلق رواقیت کے قدیم عقلی تصور نے اس روح کے پیدا کرنے میں بہت مدد پہونچائی۔ پھر جدید زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات اور جدید نظام معاشی نے جو انفرادیت پر مبنی تھا ان خیالات کو اور بھی ترقی دی۔ دولت اب صرف چند روسا کے پاس ہی نہ تھی بلکہ صنعت وتجارت کے باعث سوسائٹی کے دوسرے افراد بھی امیر ہوگئے۔ دولت کے ساتھ انھوں نے سماجی اور سیاسی حقوق کا بھی مطالبہ کیا اور انسانی حقوق کی تحریکات ہر قوم میں زور پکڑتی گئیں۔

۱۰۔ تحریک تصوف | عہد جدید پر تصوف کے اثرات سب سے زیادہ ہمہ گیر مرتب ہوئے۔ نوفلاطونیت نے جو کلیتاً ایک نظام تصوف ہے مغربی زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کردی۔ رواقیت عقل پر مبنی تھی۔ نوفلاطونیت وجدان پر۔ عقل اور وجدان یہی دونوں عناصر میں جن کے باہمی امتزاج سے اٹھارھویں صدی کی نفسی زندگی کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس میں موخرالذکر عنصر کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اکثر مذہبی تحریکات تصوف کے زیر اثر پیدا ہوئیں۔ ارنسٹ ٹروِلش نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تمدنی روح کے پیدا کرنے میں مذہبی تحریکات کا بہت زیادہ اثر ہے۔ جدید زمانہ کی تمدنی اصلاحات مثلاً "آزادی" "انفرادیت" "ناسوتیت" وغیرہ سب مذہبی روح کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آزادی کا خیال اس طرح شروع ہوا کہ انسانی عقل خود کو زمانہ متوسط کے کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ مذہبی آزادی کے اس تصور نے بعد میں ایک سیاسی صورت اختیار کرلی۔ ہابس مذہبی معاملات میں کلیسا کا مخالف نہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

اس دنیا کے معاملات صرف عقل کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری دنیا کے معاملات کے متعلق عقل کوئی فیصلہ نہیں صادر کر سکتی لیکن یہی مذہبی آزادی کے خیالات فرانس میں پہونچے تو انھوں نے ایک مادی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ والٹیر اور دائرۃ العلوم کے مرتب کرنے والوں کا فلسفہ اسی کا مظہر ہے۔ آزادی کے خیالات نے شروع میں کلیسا کے زیر سایہ تربیت پائی مگر بعد میں یہ خیالات خود کلیسا کے خلاف کام کرنے لگے۔

انگلستان میں اُس زمانے میں ایک اور تحریک جاری تھی جو ہابس کے عقلی فلسفہ کے خلاف تھی۔ اس کے علمبردار شافٹسبری اور کیمبرج کے فلاطونی تھے۔ وہ مذہب کی بنیاد عقل پر نہیں بلکہ دل پر رکھتے تھے۔ شافٹسبری کا مذہبی تصور جمالی تھا۔ اُس کے نزدیک خدا کے زیر اطاعت کائنات کا نظام اسی طرح ہم آہنگ و متناسب ہے جس طرح ایک حسین بت، ایک دلکش نغمہ یا ایک مکمل مرقع ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ عقل انسانی زندگی میں جوش و خلوص پیدا نہیں کر سکتی اور نہ وہ انسان میں نیکی پیدا کر سکتی ہے جو کہ مذہب کی اصل جان ہے۔

۱۱۔ تصوف و سیاست | آزادی کے تصور کے تحت میں انفرادیت کا تصور پیدا ہوا۔ آزادی کی ضرورت اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب کہ فرد کی اس طرح نشو و نما ہو کہ وہ مکمل ہو جائے۔ یہی مفہوم انفرادیت کا ہے۔ روسو نے جو آزادی کی تعلیم دی تھی۔ اس کو لوگوں نے غلط سمجھا۔ آزادی سے اُس کا یہ مفہوم نہ تھا کہ جماعت کے مفاد کو قربان کر کے فرد اپنی نشو و نما کرے حقیقتاً ناممکن ہے۔ اُس کے پیش نظر آزادی کا ہمیشہ ثبوتی پہلو تھا جس میں فرد اور جماعت کا مفاد ہم آہنگ ہے۔

سترھویں صدی میں آزادی اور انفرادیت کے جو خیالات انگلستان میں مروج تھے وہ اٹھارھویں صدی میں فرانس میں پہونچے اور اُنیسویں صدی میں فرانس سے جرمنی میں۔ لیکن ہر قوم نے ان تصورات کو ایک مخصوص قومی رنگ دیدیا۔

یہ آزادی اور انفرادیت کے خیالات نتیجہ تھے تصوف کے جس کی ابتدا لوتھر کے زمانے سے ہو چکی تھی۔ کوئی مذہب بغیر ناسوتیت کے قائم نہیں رہ سکتا۔ مغرب کا انسان بھی خدا کا بلا واسطہ مشاہدہ

کرنا چاہتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے فطرت کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ علوم میں وہ تجربیت کا قائل ہوگیا۔ استقرا کے بجائے استخراج پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ سیاست میں وہ اپنا نظام خود بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے پرانے ریاستی نظام کو مسمار کر ڈالا اور حرّیت و مساوات کی بنا پر نئی قومی سلطنتوں کی تشکیل کی۔ یہ تمام باتیں ایک ہی کیفیت نفسی کے مختلف مظاہر ہیں۔ عیسائیت کا ہمیشہ سے خیال رہا کہ خدا کے متعلق سب کچھ معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں یہ مذہبی تصور بالکل بدل گیا۔ اس کی جگہ یہ خیال رائج ہوگیا کہ انسان اپنے ضمیر اور اعمال کے ذریعہ بلا واسطہ خدا تک پہونچ سکتا ہے۔ تمام زندگی اور تمام کائنات میں خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اُسے کہیں عقل، کہیں فطرت، کہیں جوہر، کہیں روح کل، کے ناموں سے نامزد کیا گیا ہے۔ وحدت الوجود کی تحریک نے اس زمانہ میں بہت اہمیت اختیار کرلی۔ اسپنوزا، گوئٹے، ہیگل وغیرہ سب اسی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ گو کہ اُنھوں نے اظہار خیال کے لئے مختلف فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کیں۔

نوفلاطونیت، تصوف، یا وحدت الوجود کی یہ تحریک عہد قدیم سے برابر چلی آرہی تھی۔ عربوں نے اس چیز کو زندہ رکھا اور بعض اسلامی حکمار کے یہاں اس تحریک نے اسلامی تعلیمات کے تحت میں رہ کر ایک منظم شکل اختیار کرلی تھی۔ عہد متوسط میں بھی یہ دھارا برابر بہتا رہا روی تصوف فرانس کے اعلیٰ طبقوں میں عام طور پر رائج تھا۔ اُندلس کے عربوں اور یہودیوں میں بھی یہ چیز موجود تھی۔ جہاں سے یہ فرانس میں داخل ہوئی۔ فرانس میں یہ کیتھولک کلیسا کے خلاف سمجھی گئی اس لئے اس کی مخالفت کیگئی۔ یہ روح وہاں سے ہالینڈ پہونچی جہاں اصول رواداری کے تحت میں اُس کو نشو و نما پانیکا موقع مل گیا۔ ہالینڈ سے وہ انگلستان گئی جہاں تحریک آزادی کے پیدا کرنیکا باعث ہوئی۔ انگریز مہاجرین اس کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئے نئی دنیا سے یہ آزادی اور سیاسی حقوق کا جامہ پہن کر پھر فرانس واپس آئی جہاں انقلاب فرانس کا باعث ہوئی۔ اس تعلیم کی جان یہ ہے کہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا مقدس ہے اور جلوۂ ازدی کی مظہر ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ؎ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بین
(غالب)

فطرت میں سوائے روح کے کوئی دوسری چیز کارفرما نہیں ہے۔ تمام اشیاء میں 'روح کل' موجود ہے۔ تمام نفسی اور تاریخی زندگی میں خدا ہے۔ انسان چاہے جو کچھ سوچے اور کرے مگر وہ فطرت اور خدائی نظام (قسمت) سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ خدا انقلابات، جنگوں، تباہیوں اور مصیبتوں کے ذریعہ انسان کو حقیقی صداقت تک پہنچا تا ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا۔ (غالب)

تاریخ کا صحیح مطالعہ انسان کو خدا تک پہونچا دیتا ہے۔ انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ بربادیاں انسان کی بہ حیثیت مجموعی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ تعمیر کے لئے تخریب شرط اولین ہے ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آں تعمیر را ویراں کنند۔ (رومیؒ)

ہم آہنگ و دلکش موسیقی کے لئے مدھم اور زوردار سروں کی ضرورت ہے۔ سیاہ رات کی ہیبت ناکی صبح کی دلفریبی کے لئے شرط لازمی ہے۔

اسپنوزا کے فلسفہ وحدت الوجود میں تصوف کا اثر واضح طور پر نمایاں ہے۔ اُس کے یہاں فطرت سے مفہوم تصوف کا 'جوہر' اور 'حقیقت' ہے۔ فطرت اُس کے یہاں عقل کی طرح صاف اور واضح نہیں ہے بلکہ زندہ اور نامی ہے۔

۱۲۔ تصوف و فلسفہ تاریخ | فلسفہ تاریخ کی بنیادیں بھی تصوف پر استوار ہیں۔ ہرڈر کے "فلسفہ انسانیت پر خیالات" میں بھی یہی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس فلسفہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ انسان اہلیت میں تمام نظام کائنات سے مربوط ہے۔ ہرڈر کے خیالات پر یونانی تصوف کا اثر پڑا ہے اور یونانیوں نے یہ خیالات اہل ایران سے لئے تھے۔ انسان کی جسمانی اور نفسانی عناصر، کائنات کے عناصر سے مشابہ ہیں۔ اس لئے انسانیت کا اصل ارتقا یہی ہوگا کہ انفرادی انسانی عناصر کل نظام کائنات کے عناصر میں کلیتاً شامل ہو جائیں۔

نظریہ ارتقا جس نے بہ ظاہر مذہب عیسوی کی بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں وہ بھی عمیق مذہبی تصور پر قائم ہے۔ اس نظریہ میں مابعد الطبعیاتی عوامل بھی کام کر رہے ہیں۔ رجائیت اور امید کا خیال نظریہ ارتقا کی جان ہے۔ ادنیٰ مادہ سے ترقی کرتا ہوا انسان اعلیٰ مدارج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ارتقا چونکہ اعلیٰ منازل کی طرف ہے اس لئے یہ صرف ایک مکمل ہستی یعنی خدا ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کا دوسرا بنیادی مسئلہ نیکی اور بدی کا ہے۔ تعمیر و تخریب کو ایک منضبط نظام میں پیش کرنے کی کوشش اس عہد کے اکثر فلاسفہ نے کی ہے۔ بالآخر ہیگل نے اس کو ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں پیش کیا اور اُس کو اپنے فلسفہ کے تین تصورات سے حل کرنے کی کوشش کی۔ ہیگل کے نظریہ کے مطابق دنیا میں ہر چیز کا ایک "وجود" ہوتا ہے جو لازماً ایک اپنا "وجود مخالف" پیدا کرلیتا ہے "وجود" اور "وجود مخالف" دونوں پہ حاوی ہوکر "وجود ترتیبی" بالآخر ان میں ہم آہنگی پیدا کردیتا ہے۔

غرضیکہ اٹھارھویں صدی کے مذہبی تصور میں عقل اور وجدان کے عناصر ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ اس تصور کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ عام طور پر اقوام میں ایک اجتماعی احساس پیدا ہوگیا۔ جذباتی عناصر زندگی پر حاوی ہوگئے۔ فطری مذہب کا یہ تصور صرف ذہنی تفکرات کا نتیجہ نہ تھا اور نہ روایت کی اندھی تقلید تھی بلکہ حقیقت اعلیٰ کا احساس اُس زمانہ کی زندگی کا جزو اعظم ہوگیا تھا۔

۱۴۔ تصوف و نظریہ علم | نظریہ علم و تصوف میں بھی قریب کا تعلق پایا جاتا ہے۔ مغرب کے علوم جدیدہ میں نظریہ علم کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ فلسفیانہ نظام سے پہلے نظریہ علم کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کا بحث یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس اور خارجی اشیاء کا کس حدتک علم ہو سکتا ہے۔ علم کی ماہیت اصلی کیا ہے۔ نفس بالذات کیا چیز ہے۔ پھر نفس انسانی کی ایک زبردست قوت یعنی عقل کس حدتک اشیاء کی حقیقت معلوم کر سکتی ہے۔ کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں کس حدتک عقل کو دسترس حاصل ہے۔ وہ کہاں عاجز ہے۔ انھیں مسائل سے جرمنی کے مشہور ترین فلسفی کانٹ نے اپنی کتاب "تنقید عقل" میں بحث کی ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ عقل صرف ایک حدتک انسان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مابعد الطبعیاتی مسائل مثلاً سزا و جزا، بقائے روح اور خدا کی

مسائل کے متعلق وہ کوئی حتمی فیصلہ پیش نہیں کر سکتی۔ یہ مسائل عقل کے حدود سے باہر ہیں اور یہاں صرف ایمان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نظریہ علم سب سے پہلے نفس کے وجود اور اس کی ماہیت سے بحث کرتا ہے۔ جس طرح کہ فلسفہ جدیدہ کے بانی ڈیکارٹ نے کیا تھا۔ ڈیکارٹ کا خیال ہے کہ انسان ہر چیز پر شک کر سکتا ہے لیکن اس پر شک نہیں کر سکتا کہ وہ خود شک کر رہا ہے۔ خود پر شک کرنے سے خود نفس انسانی کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ لیکن شک کرنا نفس انسانی کا صرف عقلی پہلو ہے۔ انسانی نفس کے عقلی پہلو سے نظریہ علم بحث کرتا ہے۔ مگر نفس انسانی کے دیگر پہلو بھی ہیں مثلاً جذبہ، حس، خواہش وغیرہ۔ نفس انسانی بہ حیثیت مجموعی بھی عمل کرتا ہے۔ انسانی نفس کے اس مجموعی فعل سے تصوف بحث کرتا ہے۔ اس جامع فعل میں انسان کا علم، اس کے جذبات اور حسیات وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ فلسفہ صرف عقل اور اُن علوم سے بحث کرتا ہے جس میں عقل کی دسترس ہو برخلاف اس کے تصوف نفس انسان کی مجموعی کیفیت سے۔ اسی باعث وہ تمام علوم کے لیے بنیاد کا کام دیتا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں میڈم دی گایان ایک زبردست صوفی گذری ہے۔ اس کا قول ہے کہ اس کی روح ایک آئینہ کے مانند ہے جس میں حقیقت کا جلوہ صاف دکھائی دے سکتا ہے۔ اس فعل کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً ''داخلی روشنی''، ''مقدس روح''، ''محبت''، ''جذبہ'' ''احساس''، ''وجدان'' وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی کا یہ مجموعی فعل غیر منقسم ہے جس میں علم، محبت، ارادہ اور جذبہ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہیں۔ جس طرح کہ خوشبو پھولوں میں بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح اس خدائی روشنی اور ایزدی محبت سے تمام انسانیت معمور ہے۔ یہی فعل تمام گہرے علم کی بنیاد ہے اور اسی پر مذہبی فکر استادہ ہے۔ ماٹیبرانش کی عقل، اسپینوزا کی ذہنی محبت، کانٹ کا مافوق الطبعی ادراک، روسو کا جذبہ سب اسی بنیادی فعل کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان اصطلاحات میں کچھ فرق نہیں ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی اصل ضرور تصوف کے اسی بنیادی فعل ''وجدان'' پر استادہ ہے۔ نیکی کا تصور لازمی طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ زندگی کے تمام شعبے نفس انسانی کے

اس بنیادی فعل میں آکر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں مذہب اور اخلاق، نظریہ اور عمل، ایک دوسرے سے متحد ہوتے ہیں اسی باعث حقیقت اعلیٰ کے حصول میں نفس انسانی کی تمام قوتوں کا باہم مربوط ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ لیکن نفس انسانی میں ہمیشہ یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ کائنات کے عقلی حل کی طرف مائل ہو۔ یہی کیفیت ڈیکارٹ کی ہوئی۔ سقراط اور افلاطون عہد قدیم میں عقلیت کی طرف مائل ہوئے۔ یہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے اور مذہبی وجدان پر ختم۔ لیکن غیر شعوری طور پر مذہبی احساس ضرور کام کرتا رہتا ہے۔ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ "ہر فرد، بلا واسطہ خدا سے تعلق رکھتا ہے"۔ مالیبرانش کا قول ہے کہ تمام اشیاء کا وجود خدا میں ہے۔ غرض کہ ہم نے دیکھا کہ مغربی ذہن صدیوں تک نظریہ علم کے خشک مباحث میں بیکار مصروف نہ رہا بلکہ وہ اپنے نفس اور خارجی دنیا کی جستجو میں حقیقت اعلیٰ کی تلاش کرتا رہا اور ہنوز کر رہا ہے۔

۱۴۔ تصوف، علم الاخلاق | تصوف اور اس نظریہ اخلاق میں جو عینیت پر مبنی ہے بہت گہرا تعلق ہے نفس انسانی کی اصلیت اور سادگی کو ترک کر دینے سے ہر قسم کی بدی پیدا ہوتی ہے۔ نفس انسانی کا اپنی اصلیت پر برقرار رہنا ہی اصل نیکی ہے۔ مختلف احساسات انسانی روح کو برباد کر ڈالتے ہیں لیکن انسانی روح میں خدا کے وجود کا احساس دوسرے تمام احساسات پر غالب آ جائے تو وہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ دوزخ اور جنت کی امید میں نیکی کے خیال کو میڈیم دی گایان نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ صرف خدا کی محبت اصل چیز ہے۔ خدا اگر تکلیف بھی پہونچائے تو اس سے محبت کرنا چاہئیے۔ رکابی کا پانی جس طرح اپنے ارد گرد کے پانی کے قطروں کو کھینچ لیتا ہے اسی طرح خدا کی محبت اہل علم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ علماء کو علم کی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس طرح خدا کی ایک صفت کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ علم روح انسانی کو ایک اندرونی تسکین دیتا ہے۔ اہل علم کو مادّی قیود سے اپنی آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روحانیت کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔ انسان کو اپنی آزادی کا صحیح احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ جان بوجھ کر خود کو خدا کی مرضی کے حوالہ کر دے اور اس طرح خود اپنی فطرت اصلی کو پائے۔ قوانین آزادی درحقیقت تمام دنیا میں جاری ہیں۔ روحانی آزادی میں انسان دنیا کی تمام چیزوں کو

حقیر اور ادنی خیال کرتا ہے۔ گناہوں میں اس کے لیے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ نفس انسانی کو حقیقت اعلیٰ کی بلندیوں تک پہونچا دینا ایک نہایت ہی انفرادیت پسند اخلاقی تعلیم ہے۔ لیکن انسان جب خدا کے ساتھ نظام کائنات میں شریک ہو جاتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس نظام کائنات کی دوسرے ارکین کا بھی خیال رکھے۔ چنانچہ اجتماعیت کا خیال خود بخود پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اس تعلیم کی بنا پر انسان کو کلیسا کے خیال کے مطابق بد نہیں خیال کیا جا سکتا بلکہ انسان اور اس کی نیکی کی قوتوں پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ شافٹسبری ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جزا اور سزا کا ہمیشہ ذکر انسان کو ذلیل کرتا ہے۔

خوشی جو اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہے خارجی اشیاء کا حصول نہیں ہے بلکہ نفس کی داخلی ہم آہنگی کا نام ہے۔ وہ ہم آہنگی جو اصلیت سے تعلق کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کے باعث اپنی اور غیر کی محبت ہم معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ قسمت پر یقین ہے یعنی یہ کہ نظام کائنات کی زنجیریں باہم ازل سے مربوط ہیں۔ قسمت پر اعتقاد کے باعث دنیا میں عظیم الشان ہستیاں پیدا ہوئی ہیں لوتھر قسمت کا بہت قائل تھا۔

۱۵۔ تصوف و مذہب | صوفیا کا یہ گروہ اُس زمانہ کے کلیسا کا سخت مخالف تھا اور اُس پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کلیسا کو مذہب کی حقیقت کا بالکل علم نہیں ہے وہ عیسائیت کے مفہوم تک سے ناآشنا ہے لیکن اس گروہ کے اثرات اعلیٰ طبقوں ہی تک رہے کیونکہ عوام الناس کے ذہن کی رسائی ان تعلیمات تک نہ ہو سکتی تھی سب سے پہلے روسو نے یہ مسائل جمہور کے سامنے چھیڑ دیئے۔

روسو ایک جذباتی انسان تھا اور اُس میں عمیق مذہبی احساس پایا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کی زندگی کے تضاد کو جو عقلیت اور تصوف کے باعث پیدا ہو گیا تھا اُس نے شدت سے محسوس کیا اور جمہور کو اس طرف توجہ دلائی۔ اس زمانہ کے دو متضاد پہلو مادی اور روحانی تھے۔ ایک طرف تو اس صدی میں تجربیت اور علوم عقلیہ کا دور دورہ تھا دوسری طرف عینیت اور تصوف پر مبنی اخلاقی نصب العین کا اثر بھی موجود تھا۔ اس زمانہ کا انسان اس کشمکش میں مبتلا تھا۔ روسو کے نزدیک اس تضاد کو دور کرنا اخلاق اور تعلیم کا فریضہ قرار پایا۔

اُس زمانہ کا عام تمدن انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا ۔ کلیسا کی زندگی بہت تنگ ہوگئی تھی جو اخلاقی ضروریات کے لئے ناکافی تھی ۔ نیچریت اور مادیت انسانیت کو ہلاکت کے قریب لئے جارہی تھی ۔ ایسے پرآشوب زمانہ میں انسان کو صرف تعلیم ہی کے ذریعہ ہلاکت سے بچایا جا سکتا تھا ۔ تعلیم کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بالارادہ بچوں اور نوجوانوں کو ایک تمدنی مقصد کے لئے تیار کرے ۔ اسی باعث روسو کی توجہ تعلیم کی طرف ہوئی اور اُس نے اپنی کتاب "ایمل" مرتب کی جس میں جماعت سے علیحدہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا تخیل پیش کیا گیا ہے ۔ تعلیمی دنیا میں اس کتاب نے اُسی طرح انقلاب پیدا کردیا جس طرح "معاہدہ عمرانی" نے سیاسی دنیا میں کردیا تھا ۔ جماعت چونکہ انسان کو خراب کردیتی ہے اس لئے صحیح تربیت کے لئے اُس سے علیحدگی ضروری ہے ۔ پھر تعلیم ایک فطری نامی فعل ہے لاک کے تعلیمی نظریہ کے مطابق اشیاء کا علم نفس انسانی میں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا بلکہ انسان کے جسمانی ذہنی اور اخلاقی قویٰ کی فطری نشوونما کا نام تعلیم ہے ۔ روسو کے نزدیک تعلیم ایک ثبوتی نہیں بلکہ منفی فعل ہے یعنی خراب اثرات سے بچوں اور نوجوانوں کو محفوظ رکھنا تعلیم کا اوّل ترین فریضہ ہے ۔ روسو کی جوانی جنیف میں گذری جو اُس زمانہ میں مذہبی صوفیانہ تحریکات کا مرکز تھا ۔ روسو کو یہ باتیں خاندانی ورثہ میں ملی تھیں ۔ روسو میں جو خوبی کی تنقید بلندی تخیل ، محبت ، درد کا احساس وغیرہ پایا جاتا ہے یہ سب اسی شدید مذہبی احساس کا نتیجہ ہے ۔ وہ اس زمانہ کے تمدن کا ناقد تھا اور اس سے بہتر وہ کوئی دوسرا فریضہ اخلاقی ادا بھی نہیں کر سکتا تھا ۔

مغربی تمدنی تحریکات کے اس سرسری مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جدید مغربی تمدن صرف ذہن پر مبنی ہے کس قدر سطحی خیال ہے ۔ یہ سطحی خیال بدقسمتی سے عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے جو مشرق و مغرب کی مفاہمت میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔ افراد اور جماعتیں مغرب میں بھی ضرور مادہ پرست اور متشکک گذری ہیں لیکن مغرب کی ہمہ گیر عظیم الشان تحریکات کی اصل بنا ہمیشہ مذہبی ہی رہا ۔ کوئی پانی کا دھارا جب تک اُس کا تعلق اپنے سرچشمہ حقیقی سے نہ ہو صحیح معنوں میں طاقتور نہیں ہو سکتا ۔ اسی طرح کوئی انسانی تحریک جب تک اُس کا تعلق انسانی زندگی کی اصل ایزدی بنیادوں سے نہ ہو مؤثر نہیں ہو سکتی ۔

ہندی کے منتخب دوہے

(۱)

آسکر وائلڈ کا ایک مقولہ ہے کہ "انسان جس بدترین گناہ کا سزاوار ہو سکتا ہے وہ بیوقوفی ہے" کئی مشرقی زبانوں میں یہ مقولہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ "بیوقوف دوست سے عاقل دشمن بہتر ہے" واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بیوقوفوں کی کثرت نے عاقل کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ عاقل ان بیوقوفوں کا نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں، نہ ان سے بدلے لے سکتے ہیں اور نہ انھیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر سکتے ہیں مجبوراً بھگتتے ہیں اور ان کے کرتوتوں سے جو رنج پہنچتا ہے اسے دور یا کم کرنے کے لئے نظم و نثر میں بیوقوفوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا ان پر نظری نقطہ نظر سے تنقید کرتے ہیں۔

اسی قسم کے دو تنقیدی دوہے سن لیجئے۔

ज्ञानी से ज्ञानी लड़े ज्ञान सवाया होय ।
ज्ञानी से मूरख लड़े तुर्त लड़ाई होय ॥

ज्ञान (گیان) - علم　　ज्ञानी (گیانی) - عالم، عقلمند
मूरख (مورکھ) - بیوقوف　　तुर्त (ترت) - فوراً

گیانی سے گیانی لڑے گیان سیوایا ہوئے
گیانی سے مورکھ لڑے ترت لڑائی ہوئے

"جب کسی عالم کی بحث کسی عقلمند سے ہوتی ہے تو دونوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر جب عالم اور بیوقوف میں بحث ہوتی ہے تو فوراً لڑائی ہو جاتی ہے۔"

دوہے کا یہ ٹکڑا "گیان سیوایا ہوئے" بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ دو عاقلوں کے درمیان جب کبھی بحث ہوتی ہے تو ہمیشہ طرفین ہی کا فائدہ نہیں بلکہ عاقل سامعین کا بھی ہوتا ہے۔

(۲)

قرونِ وسطیٰ کے مشہور درویش کبیر صاحب سچ کہتے ہیں کہ "بیوقوفوں کے منہ لگنا ہی بے کار ہے" اس معمولی نصیحت کو پُراثر بنانے کے لئے دیکھئے کبیر نے کیسی عمدہ تشبیہ دی ہے۔

मूरख से कहिये कहा कहत कबीर लजाय।
अंधे आगे नाचते कला अकारत जाय॥

मूरख (مُورکھ) - بیوقوف लजाय (لجائے) - شرم آئے

कला (کلا) - فن ۔ کمال अकारत (اکارت) - بیکار

مورکھ سے کہئے کہا؟ کہت کبیر لجائے

اندھے آگے ناچتے کلا اکارت جائے (کبیر)

"بیوقوف سے انسان کہے تو کیا کہے؟ اے کبیر کچھ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اندھوں کے آگے ناچنے سے فن رقاصی بیکار جاتا ہے۔"

اُردو میں ایک مثل مشہور ہے کہ "اندھے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے" کبیر صاحب کی تشبیہ اُردو کی ضرب المثل سے بدرجہا بہتر ہے کیونکہ اندھوں کے آگے رونے سے اندھوں کو بھی یقیناً رونے کا احساس ہوتا ہے۔ رونے میں آواز کی قدرتی تبدیلی یا ہچکیوں ہی سے نابینا اشخاص بآسانی رونے کا احساس کر سکتے ہیں مگر رقاصی کے کمال کو وہ کسی طرح محسوس نہیں کر سکتے لہذا "اندھے آگے ناچتے کلا اکارت جائے" میں جو بلاغت ہے وہ اُردو ضرب المثل میں کہاں؟

(۳)

ہندی شاعری کے مخصوص انداز سوال و جواب میں ایک ہندی شاعر شرافت کا معیار قائم کرتا ہے تمثیل کے پردے میں نہ صرف انسانی فطرت کی یہ خوبی ظاہر کی گئی ہے بلکہ شاعرانہ انداز میں ایک درسِ اخلاق دیا گیا ہے اور انسانیت کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

जल काठ बोरै नहीं कहो कहां की प्रीति।

अपनो सींचा जान कें यही बड़ित की रीति ॥

बोरे (بورے) ۔ ڈبوے	काठ (کاٹھ) ۔ لکڑی
रीति (ریت) ۔ طریقہ	प्रीत (پریت) ۔ محبت

جل کاٹھے بورے نہیں کہو، کہاں کی پریت
اپنو، سینچو جان کے یہی بڑن کی ریت

" پانی لکڑی کو ڈبوتا نہیں ہے! بتاؤ یہ کہاں کی محبت ہے؟ اپنا ہی سینچا ہوا جان کر (پانی لکڑی کو نہیں ڈبوتا) یہی بڑے آدمیوں کا شعار ہے "

نازک خیالی اور معنی آفرینی تو کمال کی ہے مگر شاعری کے پردے میں جس عمدگی سے نصیحت کی گئی ہے وہ کمال ہے ۔ ایک ہی دوہے میں ایک بیان واقعہ (جل کاٹھے بورے نہیں) ایک سوال (کہو کہاں کی پریت) ایک شاعرانہ توجیہہ (اپنو سینچو جان کے) اور ایک نصیحت (یہی بڑن کی ریت) جس پر لطف طور پر جمع کئے گئے ہیں وہ داد کے مستحق ہیں -

(۴)

دنیا کا حقیقی دستور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مساوی حالات اور یکساں صورتوں میں بھی انسان کا رویہ بالکل مختلف رہتا ہے ۔ عزیز داری کا خیال، پیر و مرشد کا پاس، حکام بالا کی چاپلوسی، امیروں کی خوشامد، تمغوں اور انعاموں کی ہوس سے متاثر ہو کر انسان اوروں کی قدر کرتا ہے اور ہر شخص کی قدر و منزلت اس کے رنگ و روپ، خاندان و قومیت، ملت و مذہب، تعلقات اور اثرات کے مطابق ہوتی ہے ۔ کوئی مشہور عالم فلسفی یا مدبر کسی علمی انجمن یا جلسے میں تقریر کرنیوالا ہوتا ہے تو لوگ سینکڑوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں ۔ یہ علم کی قدردانی یا علم پروری نہیں ہے بلکہ محض ایک مشہور ہستی کو دیکھنے کا شوق، محض ایک نیکنام یا بدنام آدمی کو سن لینے کی تمنا تاکہ بعد میں یار دوستوں کی صحبت میں شناساوں کی محفل میں یہ کہنے کو ہوسکے کہ ہم نے فلاں فلسفی کو علمی مسائل کی تشریح و توضیح کرتے سنا ہے ۔ کوئی مشہور شاعر کسی شاعرے میں نظمیں پڑھنے والا ہے تو مشاعرہ بھرا رہتا ہے مگر شرکت کی غرض ادبی ذوق یا شعر و شاعری کا مذاق، یا زبان

سے دلچسپی نہیں بلکہ ''سیر و تفریح'' ''مشہور شعرا کو سننے کی تمنا' انھیں دیکھ لینے کی آرزو۔ اس وقت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے جبکہ ہوا و ہوس کے ساتھ ساتھ غرض و مصلحت بھی نہاں ہوں۔ حاکم وقت کی تقریر ہو' لاٹ صاحب تقریر کرنے والے ہوں' محکمہ کا اعلیٰ ترین افسر گل افشانی کرنے والا ہو' مقتدر اعلیٰ ''اسپیچ'' دینے والا ہو تو پھر کیا ہے۔ وقت سے پہلے ہی ''ہال'' ہو کہ ''پنڈال'' غرضمندوں کا ہجوم ہوتا ہے' مصلحتی کارکنوں کا انبوہ کثیر ہوتا ہے' واعظ یا مقرر کی معمولی سے معمولی تقریر پر داد دی جاتی ہے۔ اس کی ثنا خوانی ہوتی ہے اور تالیوں کی آواز سے فضا گونج جاتی ہے۔

یہ تملقی طرز عمل دنیا میں عوام و خواص کا ہے مگر سچے علم دوست اور حقیقی ادب شناس اُن کی داد نہیں دیتے جو صرف مشہور ہو یا خاندانی رئیس ہو یا امیر ہو یا حاکم وقت ہو یا مقتدر اعلیٰ ہو۔ وہ اس کی ثنا خوانی نہیں کرتے جو غرضمندوں کی احتیاج پوری کر سکتا ہو۔ بلکہ وہ اسی کا دل بڑھاتے اور اسی کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جو تحسین کا مستحق ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مشہور ہے کہ گمنام' نیک نام ہے کہ بدنام' کسی بڑے خاندان کا فرد ہے یا معمولی گھرانے کا' حاکم وقت کا عزیز ہے یا کسی مفلوک الحال' ستم رسیدہ' بے بس و لاچار' مظلوم و محکوم کا۔ ان کی دانست میں تعریف و توصیف کا معیار صرف ایک ہی ہے یعنی ''ذاتی جوہر''۔ شخصی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا' مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے توصیف یا تنقیص کرنا ذاتیات کی بنا پر قدر یا تحقیر کرنا انھیں نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نیک نفس' شریف الطبع' علم دوست' باذاق' حقیقی نقاد دنیا کے ہر ملک میں بہت کم ہیں مگر انسانوں کو عبرت دلانے کے لئے دیکھئے گوسائیں تلسی داس جی نے کیسا انمول دوہا کہا ہے اور کیسی لاجواب تشبیہ دی ہے:-

उत्तम और चंडाल घर एक दीप उजयार।
तुलसी मते पतंग के सभी जोत एकसार॥

उत्तम (اُتم) - اعلیٰ　　　दीप (دیپ) - دیا - چراغ

मते (متے) - محویت' شوق　पतंग (پتنگ) پروانہ　जोत (جوت) - روشنی　एकसार ایکسار' یکساں

اُتم اور چنڈال گھر ایک دیپ اُجیار
تلسی متے پتنگ کے سبھی جوت یکسار (تُلسی)

"اعلیٰ اور ادنیٰ کے گھر ایک ہی چراغ کا اُجالا رہتا ہے ۔ اے تلسی! پروانے کی محویت کیلئے سبھی روشنی یکساں ہوتی ہے" پروانہ نور کا شیدائی ہے، روشنی پر مرتا ہے، جہاں روشنی ہوتی ہی پہنچتا ہے، تصدق ہوتا ہے، جلتا ہے، مرتا ہے ۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ روشنی کس کے گھر ہے؟ اعلیٰ کے گھر یا ادنیٰ کے گھر، امیر کے گھر یا غریب کے گھر، رئیس کی محفل میں یا فقیر کی جھونپڑی میں!

کس قدر نصیحت خیز، سبق آموز اور عبرت انگیز دوہا ہے! اگر کوئی ہندی بھاشا کی (بہترین نظموں اور اشعار کی) ست سئی مرتب کرے تو یہ دوہا زرین حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہوگا ۔

(۵)

جب کبھی شاعری میں متضاد خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور اُن سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے تو شعر بڑا لطف دیتا ہے ۔ اُردو میں غالب اس قسم کی شاعری کے بہترین استاد ہیں ۔ متضاد خصوصیات سے نتیجہ اخذ کرنے سے میرا کیا مطلب ہے وہ ان دو اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے:۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے ٭ بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے غالب
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ٭ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں غالب

ان اشعار میں شاعرانہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے علاوہ حقائقِ زندگی اور فلسفۂ حیات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں ۔ اسی طرح ہندی کے ایک دوہے میں متضاد خصوصیات بیان کرکے جو درسِ اخلاق دیا گیا ہے وہ داد کے قابل ہے ۔

दया धर्म हिरदे बसे बोले अमृत बैन।
तेई ऊंचे जानिये जिनके नीचे नैन॥

दया (دَیا) ۔ رحم   धर्म (دھرم) ۔ ایمان
अमृत (امرت) ۔ میٹھی   बैन (بین) ۔ بات   हिरदय (ہردے) ۔ دل

دَیا دہرم ہردے بسے بولے امرت بین
تیٔ اونچے جانیے جن کے نیچے نین

" رحم اور ایمان (جس کے) دل میں بسے ہوں اور (جو) میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہو (اور جس کی) آنکھیں (حیادار اور غیرت مند یا شرمیلی ہونے کی وجہ سے) نیچی ہوں اسی کو اونچا (اعلیٰ یا شریف) سمجھیے۔"

(۶)

مارواڑ کے ایک نامعلوم شاعر کا دوہا ہے :۔

सज्जन ऐसा कीजिये ढाल सरीखा होय।
सुख में तो पाछे रहे दुख में आगे होय॥

سجن ایسا کیجئے ڈھال سریکھا ہوے
سکھ میں تو پاچھے رہے دُکھ میں آگے ہوے

" ایسے انسان کو اپنا دوست بنانا چاہیے جو مثل ڈھال کے ہو۔ سکھ میں تو پیچھے رہے مگر دکھ میں آگے ہو جائے" تمثیل کی خوبی نے جو لطف پیدا کر دیا وہ ظاہر ہے۔ نصیحت کی خوبی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

(۷)

عہد جہانگیری میں عبدالرحیم خانخاناں پر عتاب شاہی ہوا تھا اور عین کبیر سنی میں زمانہ کی ناموافقت نے انھیں کئی سالوں تک چین نہ لینے دیا۔ مگر دربار اکبری کے اس انمول جوہر نے اپنی آن بان ہر طرح قائم رکھی اور زمانے کے تھپیڑوں کو صبر و تحمل سے سہنے میں اپنی خودداری کا بہترین ثبوت دیا۔ اس دوہے میں خانخاناں نے ایک نتیجہ خیز آپ بیتی ایک نہایت موزوں مثال دے کر سنائی ہے :۔

दुरदिन परे रहीम कहि दुरथल जैयत भाग।
ठाढ़े हूजत घूर पर जब घर लागत आग॥

दुरदिन (دُردِن) ۔ بُرے دن   दुरथल (دُرتھل) ۔ بُرا مقام

دُردِن پرے رحیم کہہ، دُرتھل جیٔت بھاگ

ٹھاڑے ہوجت گھورپر جب گھر لاگت آگ

"اے رحیم اگر بُرے دن آئیں (اور بُرا وقت پڑے) تو برے مقام پر ہی بھاگ جا (برے بھلے ہی گذر کرلے) جب گھر کو آگ لگتی ہے تو لوگ (مجبوراً) گھورے پر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

(۸)

غالب کا ایک شعر ہے :-

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا ٭ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"آدمی اور انسان میں غالب نے جو تفریق کی ہے وہ محض ایک شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ صداقت اور حقیقت پر مبنی ہے تاہم ثبوت پیش کرنے میں کسی قدر دشواری ضرور ہوتی ہے۔ کم از کم غالب نے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا اور نہ انسان و آدمی میں امتیاز کے لئے معیار مقرر کرنے کی کوشش کی مگر دیکھئے رسندھ نامی ہندی شاعر نے اس دوہے میں انسانوں کی امتیازی خصوصیت کو کن چبھتے ہوئے الفاظ میں بیان کیا ہے :-

पसु पच्छी हू जानहीं अपनी अपनी पीर।
तब सुजान जानों तुम्हें जब जानो पर पीर॥

पसु (پسو) جانور - جاندار پच्छी (پچھی) - پرندہ

पीर (پیر) - درد पर पीर (پر پیر) دوسرے کا درد सुजान (سجان) انسان

پسو پچھی ہو جانہیں اپنی اپنی پیر
تب سجان جانوں تمہیں جب جانو پر پیر۔

"(نہ صرف آدمی بلکہ) مویشی اور پرندے بھی اپنے اپنے درد کو محسوس کرتے ہیں (اگر تم نے اپنے درد کو محسوس کیا تو کیا کمال ہے) انسان تو میں تمہیں اس وقت سمجھوں جبکہ تم دوسروں کے درد کو محسوس کرو۔"

ہمدردی کو "آدمی" اور "انسان" کی امتیازی خصوصیت قرار دیکر اور جانوروں اور پرندوں کی مثال سے رسندھ نے بڑا اچھوتا خیال باندھا ہے۔ دوہا کیا ہے انسانیت کی بہترین تمثیل، بے غرضانہ محبت

کی اعلیٰ ترین تعلیم اور ہمدردی کی سب سے زیادہ موثر مثال ہے۔ یہ اس پایہ کا دوہا ہے کہ اگر اسے ہندی کے بہترین سو دوہوں میں شمار کیا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ رسندھ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ایک دوہا کافی ہے۔

(عاشقانہ جذبات اور عشقیہ دوہے)

(۹)

ہندی کے ایک غیر معروف مسلمان شاعر شاہ عبدالعلیم آسی کا ایک دوہا ہے۔

काजर दूं तो किरकिराय सुरमा दियान जाय ।
जिन नैनन मां पिय बसे दूजा कौन समाय ॥

کاجر دوں تو کرکرائے سرما دیا نہ جائے
جن نینن ماں پیا بسیں دوجا کون سمائے

"کاجل لگاؤں تو کرکرا (معلوم ہوتا ہے) اور سرمہ لگایا نہیں جاتا۔ جن آنکھوں میں پیا ہوں (عاشق کا تصور ہو) دوسرا کون سما سکتا ہے؟"

(۱۰)

آسی سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے ہندی شاعری کے مسلم الثبوت استاد عبدالرحیم خانخاناں نے آنکھوں میں حسنِ یار کے سمانے کے متعلق کیسا انمول دوہا کہا ہے۔

प्रीतम छब नैनन बसी पर छब कहां समाय ।
भरी सराय रहीम लखि आप पथिक फिर जाय ॥

प्रीतम	(پریتم) معشوق	छब	(چھب) حسن
पर	(پر) دوسرا۔ غیر	लखि	(لکھ) دیکھ
	(پتھک) مسافر		

پریتم چھب نینن بسی، پر چھپ کہاں سمائے
بھری سرائے رحیم لکھ، آپ پتھک پھر جائے

"معشوق کا حُسن آنکھوں میں سمایا ہوا ہے، غیروں کا حُسن (اب) کہاں سما سکتا ہے؟ اے رحیم سرائے کو بھرا دیکھ کر مسافر خود ہی واپس چلا جاتا ہے" سرائے جب بھری ہوتی ہے اور قدم جمانے کا بھی امکان نہیں ہوتا تو مسافر خود ہی لوٹ جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے عشق میں رحیم کو محو دیکھ کر حسینانِ جہاں میں سے کوئی بھی ان پر ملتفت نہیں ہوتا۔

"آپ پتھک پھر جائے" اس دوہے کی جان ہے۔ عالم محویت کا یہ بے نظیر منظر خود شاعر کے عشق و وفا کی بہترین تعریف و توصیف بھی ہے انتہائی عشق کے اظہار کا یہ بلیغ طریقہ داد طلب ہے۔

(۱۱)

ہندی کے ایک اور مسلمان شاعر سید غلام نبی رسلین بلگرامی آنکھوں کی تعریف میں کہتے ہیں :۔

रे मन रीत विचित्र यह तियनैनन के चेत ।
विष काजर निज खाय के जियग्रौरनकेलेत ॥

रीत (ریت)۔ طریقہ विचित्र (وچتر)۔ رنگ برنگ (یہاں بمعنی عجیب) तिय (تیا)۔ عورت
चेत (چیت)۔ نگاہ विष (وش)۔ زہر निज (نج)۔ خود जिय (جیا)۔ جان

رے من ریت وچتر یہہ تیا نینن کے چیت
وش کاجر نج کھائے کے جیا اورن کی لیت

"اے دل عورت کی آنکھوں کا یہ عجیب طریق ہے کہ خود کاجل کا زہر کھا کر دوسروں کی جان لیتی ہے۔" مطلب یہ کہ یوں بھی عورت کی آنکھوں کا حُسن بہت دلفریب ہوتا ہے مگر ان میں جب کاجل لگایا جاتا ہے تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور انھیں جو دیکھ لیتا ہے ان آنکھوں پہ فریفتہ ہو کر مرمٹتا ہے —— خود زہر کھا کر دوسروں کی جان لینا بالکل نیا تخیل ہے۔

(۱۲)

जो मैं होती बादली आभे जाय अडंत।

पंथ बहंता साजनां ऊपर छाह करंत॥

جو میں ہوتی بادلی آبھے جائے اڑنت
پنتھ بہنتا ساجناں اوپر چھاہ کرنت

"اگر میں بادل ہوتی تو آسمان پر جا کر (مرے) پا پیادہ مسافر شوہر پر سایہ فگن ہوتی" درد ہجر میں بھی اپنے درد سے زیادہ پریتم کے آرام و آسائش کا خیال صرف نیک نفس عورتوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ مارواڑ کا دوہا ہے اور بہت پاکیزہ ہے۔

(۱۳)

مسلمانوں میں سب سے پہلے امیر خسرو نے ہندی میں شعر کہنا شروع کیا۔ دیکھئے بارھویں صدی عیسوی کی زبان بھی کیسی سادہ ہو سکتی تھی۔ خسرو کا ایک دوہا ہے :-

जाओ वेद घर आपने तुम क्या जानो सार।

आशिक़ चंगे कि न किये सु बिन देखे दीदार॥

جاؤ وید گھر آپنے تم کیا جانو سار
عاشق چنگے کن کئے سو بن دیکھے دیدار

"اے وید (حکیم) اپنے گھر جاؤ تم (میری) تکلیف کیا پہچان سکو گے؟ بغیر (معشوق کا) دیدار دیکھے مجھے کون اچھا کر سکتا ہے؟

بعینہٖ اسی مطلب کو خسرو نے ایک فارسی شعر میں بھی ادا کیا ہے :-

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

(۱۴)

ایک اور موقعہ پر خسرو نے یہ دوہا کتنا پیارا کہا ہے ۔ یہ خیال رکھئے کہ یہ آج سے تقریباً ساڑے چھ سو سال پہلے کا شعر ہے جبکہ ہندی شاعری کا عالم طفولیت تھا :۔

गोरी सोवे सेज पर मुख पर डारे केस।
चल खसरो घर आपने सांझ भई चहुं देस॥

سेज (سیج) ۔ بستر   केस (کیس) ۔ بال

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں دیس   (امیر خسرو)

" ایک گوری لڑکی منہ پر سیاہ بال ڈالے ہوئے سو رہی ہے ۔ خسرو اپنے گھر چل چو طرف اندھیرا ہو گیا ۔ (اس منظر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا اب چل بیٹھنے ہی میں بھلائی ہے)"

(۱۵)

امیر خسرو کا یہ دوہا بھی بہت مقبول ہوا :۔

प्रेम न जाने कैसी मसजिद कैसा ठाकुरद्वारा।
हम तो उहीं सीस नवावें जित थे अपना प्यारा॥

(سیس) ۔ سر   (ٹھاکر دوارا) ۔ بت خانہ

پریم نہ جانے کیسی مسجد کیسا ٹھاکر دوارا
ہم تو اُنھیں سیس نوائیں جت تھے اپنا پیارا   (امیر خسرو)

" محبت نہیں جانتی کہ کیسی مسجد اور کیسا بت خانہ (محبت میں انسان ان میں امتیاز نہیں کرتا اور نہ ان ظاہری چیزوں کی پروا کرتا ہے) ہم تو اسی طرف سر خم کر دیتے ہیں جہاں اپنا پیارا ہو " اسی مطلب کو خسرو نے اس فارسی شعر میں ادا کیا ہے :۔

بندۂ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست   ؎   ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست   (امیر خسرو)

(۱۶)

ہندی بھاشا میں یوں تو برہ کے دوہے ایک سے ایک بہتر ہیں مگر جس نزاکت اور خوبی سے اس دوہے میں درد ہجر کا اظہار کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ لفظوں کی صوتیاتی مناسبت اور درد بھرے الفاظ نے اس دوہے کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہ دوہا بھی ایک مسلمان ہندی شاعر شاہ عبدالعلیم آسی کا ہے :-

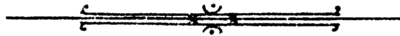
ओस ओस सब कोई कहें आंसू कहे न कोय
मोहि बिरहिन के सोग में रैन रही है रोय

रैन (رین) رات — (موہی برہن) ۔ مجھ مفارقت زدہ मोही बिरहिन

اوس اوس سب کوئی کہیں آنسو کہے نہ کوئے
موہی برہن کے سوگ میں رین رہی ہے روئے

"سب (لوگ شبنم کو دیکھ کر) اوس اوس (ہی) کہتے ہیں۔ آنسو کوئی نہیں کہتا۔ (میں تو سمجھتی ہوں کہ) مجھ مفارقت زدہ کے سوگ میں رات رو رہی ہے"

نہایت لطیف اور درد انگیز دوہا ہے جسے اگر راگ میں گایا جائے تو ناممکن ہے کہ سامعین متاثر نہ ہوں ؛ ۔



محکومیت نسواں

دعویٰ: عورت اور مرد کے حقوق میں مساوات ہونی چاہئے | عورت اور مرد کے موجودہ معاشرتی تعلقات اس اصول پر قائم ہیں کہ مرد قانوناً عورت پر مسلط رہے۔ مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ قانوناً ایک جنس کا دوسری جنس کے زیر حکومت ہونا ہرگز درست نہیں۔ اور دونوں جنسوں میں پوری مساوات قائم ہونی چاہئے۔ یہاں تک کہ مرد کو عورت پر نہ تو کوئی قدرت یا اختیار حاصل ہو نہ عورت کی بابتہ قانون میں کوئی نااہلیت فرض کی جائے۔ عورتوں کی موجودہ محکومیت بجائے خود بھی قابل نفرین ہے اور موجودہ زمانہ میں نوعِ انسان کی فلاح میں بہت کچھ مخل ہے۔ میں شروع سے اسی رائے پر قائم ہوں۔ بلکہ جہاں تک میں اس پر غور کرتا ہوں اور اپنے تجربہ کی بنا پر رائے قائم کرنا چاہتا ہوں میرا یہ عقیدہ اور بھی مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ جن دلائل کی بنا پر میں نے اپنی رائے قائم کی ہے وہ اس رسالہ میں وضاحت کے ساتھ پیش کروں گا۔

بارِ ثبوت | ظاہر ہے کہ اس دعوے کی حمایت آسان نہیں۔ کیونکہ دنیا میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے میں جو عذرات پیش کئے جاتے ہیں وہ عقلی دلیلوں پر نہیں بلکہ پرانی عادتوں اور دیرینہ جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ لوگ جذبات کے آگے عقل سے کام لینا نہیں چاہتے۔ بلکہ جب انکو قائل کیجئے تو اور بھی جہالت اور ضد سے کام لینے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے رسم و رواج کے خلاف جب کوئی بات زبان سے نکلتی ہے تو اس سے لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال ہوتا ہے۔ کوئی یہ غور نہیں کرتا کہ ہزاروں پرانے رواج ایسے ہیں جنھیں ہم خود چھوڑ چکے ہیں۔ بلکہ میرا قول تو یہ ہے کہ جو رواجات اب منسوخ مانے جاتے ہیں بعض ان سے بھی زیادہ وحشیانہ رواج ابھی تک باقی ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ انھیں ترک کیا جائے۔ دنیا میں دشواری اُسی کے لئے ہے جو کسی عام رواج کے خلاف زبان کھولنا چاہے۔ عورتوں کی محکومیت ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ اور ایک پرانے دستور کے طور پر دنیا بھر میں قائم ہے۔ یہی بات ہو کہ لوگ

اس صورت حال کو بالکل معمولی اور فطری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ آزادی اور انصاف اچھی چیزیں ہیں۔ اور قانون میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت یا کسی پر کوئی جبر نہ ہونا چاہئے۔ بجز اس کے کہ وہ رعایت یا جبر خود عامۃ الناس کی بہبودی اور انصاف کے لئے ہو۔ لیکن جب کبھی عورتوں کی محکومیت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو میرے ہم خیال لوگوں کے مقابلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ اپنا قول تم ثابت کرو۔ حالانکہ ہمارا قول تو اسی بات سے ثابت ہے کہ سب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کی برابری کے لائق نہیں ہیں اور مردوں کو ان پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اُنھیں چاہئے کہ اپنا قول وہ ثابت کریں۔ بار ثبوت میرے ہم خیالوں کے ذمہ نہیں ہے۔ میں اُن کے دلائل کا جواب تو دونگا مگر اس بنا پر نہیں کہ اس کے خلاف ثابت کرنا میرا فرض ہے۔

فطرت انسانی اور عورت کی محکومیت

اس مسئلہ پر بحث کرنے کی جو دشواریاں میں نے بیان کیں اس سے ان لوگوں کا گلہ مقصود نہیں جو کسی رواج کو محض اس وجہ سے اچھا کہتے ہیں کہ اس پر ساری دنیا کاربند ہے۔ وہ لوگ تو ایسے رواجوں کو جبلت اور فطرت کے مطابق بتاتے ہیں۔ اور کچھ اسی مسئلہ پر منحصر نہیں بلکہ جس غیر معقول بات کو درست قرار دینا چاہتے ہیں اُسے عام طور پر انسان کی طبیعت اور فطرت کا مقتضا بتانے لگتے ہیں۔ بلکہ اُسے خدا کا حکم قرار دیکر خدا کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ اب میں تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتا ہوں کہ اپنے دعوے کے ثبوت کا بار مجھ ہی پر ہے۔ بلکہ یہاں تک کہے دیتا ہوں کہ اگر میں یہ نہ دکھا سکوں کہ عورت کی محکومیت اخلاقِ بشری اور فطرت انسانی کے بدترین پہلوؤں سے پیدا ہوئی ہے تو میرا کل دعوے باطل قرار دیدیا جائے۔ اور میں اس دلیل کے آگے خاموش ہو جاؤں گا کہ عورت کا محکوم ہی رہنا مناسب ہے، کیونکہ دنیا کا رواج ہی یہی ہے۔

عورت کی محکومیت دستور غلامی کی یادگار ہے

واضح رہے کہ تاریخی حیثیت سے عورت پر مرد کا قانونی اقتدار کچھ اس بنا پر جائز نہیں رکھا گیا تھا کہ لوگوں نے پہلے اپنے تجربہ سے عورت کی نااہلیت دریافت کرلی ہو یا نوع انسان کی بہبودی کا نصب العین پیش نظر رکھنے کے بعد پھر عورت کو محکوم بنانا طے کیا ہو۔ اختیارات کی تقسیم میں سوسائٹی کو یہ سوجھا ہی نہیں کہ دونوں جنسوں کے افراد ایک دوسرے

کے دوش بدوش بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ مرد اتفاق سے قوی تر ہستی رکھتا تھا اور اُس کی طاقت کو عورت کی طرح معاشرت نے بھی تسلیم کر لیا۔ مرد کی قوت آزمائی کے ہر موقع پر جائز سمجھے جانے کا راز صرف اسی قدر ہے۔ کیا عجب ہے کہ کسی عہد ماضی میں حالات گردوپیش کے لحاظ سے یہ صورت مناسب بھی قرار دی جا سکتی ہو۔ لیکن وہ زمانہ بھی آ ہی گیا کہ انسان کی نظر اس نکتہ پر پڑی کہ زبردست کو قانوناً یا اخلاقاً بھی زبردست ہی بنا رہنے دینا درست نہیں۔ جب کبھی عورت کے ساتھ غیر مساویانہ برتاؤ شروع کیا گیا تھا اُس وقت تک کسی قسم کی دنیاوی مصلحتوں پر غور کرنے کی نوبت نوع انسان کو آئی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ توانا مرد کے نزدیک ناتوان عورت کی وقعت جو کچھ بھی ہو سکتی تھی تو صرف اس لحاظ سے کہ وہ مرد کے لئے کس حد تک کارآمد ہو سکتی تھی۔ دنیا میں قوانین اور نظام معاشرت کی تدوین شروع ہی اس طرح ہوئی کہ جیسے حالات پائے گئے ویسے ہی مان بھی لئے گئے۔ اور وہی حالات ضابطہ بن گئے۔ گویا ہر امر واقعی حق پر مبنی تھا۔ اسی کو رواج کا قانون کی شکل اختیار کرنا کہتے ہیں۔ معاشری دنیا میں اصلاح بعد کی چیز ہے۔ جو عدل اور مساوات کے خیال کی ترقی کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی ہے۔ دستورِ غلامی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ پرانے زمانہ میں عورتوں کے علاوہ دنیا کی مردانہ آبادی کا بھی اکثر حصہ غلامی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ یعنی عورتیں سب غلامی میں تھیں۔ اور مردوں میں بھی اکثر کسی نہ کسی کے مطیع ہوتے تھے۔ جوں جوں آزاد خیال لوگوں کی جرأت بڑھتی گئی غلامی کا رواج کسی نہ کسی معنی میں کم ہوتا گیا۔ حتےٰ کہ یورپ کی عیسائی قوموں میں مردوں کی غلامی معدوم ہو گئی اور عورتوں کی غلامی رفتہ رفتہ کم ہو کر ایک معتدل صورت کی حلقہ بگوشی رہ گئی جسے محض محکومیت کہہ سکتے ہیں۔ غرضکہ یہ محکومیت کسی نئے رواج کے طور پر نہیں ہے۔ جس کی ابتدا اب کی جاری ہو اور جس کی بنا حضوریات معاشرت یا انصاف کے رو سے قائم ہو رہی ہو۔ ہے یہ وہی غلامی جو اگلے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ اس کی شدت اگلی سی نہیں رہی لیکن اس سے اب بھی زمانۂ جاہلیت کی بو آتی ہے۔ اور اس دستور کی زاید از زائد خوبی بس یہی ہے کہ یہ اب تک باقی ہے۔

زبردست کے آگے مذہب اور اخلاق کوئی چیز نہیں

ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ نئے زمانہ کے لوگوں کو کوئی اندازہ نہیں ہے کہ پرانے زمانوں میں انسانی معاشرت کا کیا حال تھا۔ جن لوگوں نے دنیا

کا سفر کرکے ادنیٰ اقوام کے حالات دیکھے ہیں یا جو تاریخ عالم کا صحیح مطالعہ کر چکے ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ معاشرتی دنیا کا ابتدائی قانون یہی تھا کہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" اس اصول کو برا سمجھنا کیسا لوگ اپنی معاشرت کے اس کلیہ پر علی الاعلان ناز کرتے تھے ۔ اور یہ کچھ ان کی بے حیائی یا حماقت نہ تھی ۔ بلکہ اس کے اعلان میں اُن لوگوں کو کوئی اخلاقی قباحت ہی نظر نہیں آتی تھی ۔ ظلم و تعدی جبر و تشدد یہی اُن کے لئے تمغہائے امتیاز تھے بلکہ اس زمانہ میں پرستش بھی ظالم اور زور آور ہی کی ہوتی تھی ۔ ادنیٰ ہستیاں مانی بھی نہ جاتی تھیں ۔ اور اگر مانی جاتی تھیں تو فقط اُس حد تک جہاں تک کہ بڑی ہستیوں کو اُن سے فائدہ پہونچ سکتا تھا ۔ اسی ضمن میں اعلیٰ نے ادنیٰ سے محض اپنے مفاد کے لئے وعدے کرنا شروع کئے ۔ اور ایفائے وعدہ کی ضرورت اگر انھیں محسوس ہوئی تو محض اپنے فائدے کے خیال سے ۔ چنانچہ آقاؤں کے مقابلہ میں غلاموں کے حقوق اس لئے ماننے جانے لگے کہ اس سے خود آقاؤں کا بھلا ہوتا تھا ۔ اور رفتہ رفتہ معاشرت غلاموں کے حقوق تسلیم کرنے لگی ۔ یہودیوں کے قوانین میں غلاموں کے حقوق کافی تسلیم کئے گئے ہیں اور یونان کے بعض مدرسین اخلاق نے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے صدیوں پیشتر غلاموں کے بعض حقوق کا اعتراف کیا ہے ۔ اہل روما میں بھی ان حقوق کا تصور رفتہ رفتہ آیا اور ترقی پذیر ہوا ۔ بالآخر دین عیسوی نے مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلانے کا دعویٰ کیا ۔

لیکن حضرت انسان بھلا ایسی بدعت ماننے والے کیا تھے ؟ بہرکیف مسیحیت ناکام رہی ۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہ تھی کہ مسیحیت کا اثر اور اقتدار کم تھا ۔ یورپ میں مسیحیت کا یہ اثر تھا کہ مذہب کے نام پر لاکھوں نے گلے کٹوائے بڑے بڑے تاجدار اپنے تخت و تاج سے محض ارباب مذہب کے ادنیٰ اشارہ پر محروم کردئے گئے ۔ بڑے بڑے ضدی اور خود سر فرمانروا اپنی محبوب ترین ازواج سے مسیحیت کے محض ایک فتوے پر جدا ہوگئے ۔ لیکن مسیحیت اگر ناکام رہی تو اسی بارہ میں ۔ بادشاہوں کی باہمی خونریز نبرد آزمائیاں مسیحیت کے روکے نہ رکیں ۔ جب تک ایک فریق نے اپنی خونخوارانہ فوقیت دوسرے فریق پر ثابت نہ کردی جنگ و جدال کا خاتمہ نہ ہو سکا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے با اثر اور با اقتدار لوگ جو ادنیٰ رعایا اور محکوم طبقوں پر آئے دن ستم توڑا کرتے تھے ، اُن کا تشدد اور ظلم اُس وقت تک کم نہیں ہوا جب تک کہ اُن کی سرکوبی کے لئے کوئی زبردست طاقت پیدا نہیں ہوئی ۔ زبردست اپنے ظلم سے اُس وقت تک باز نہیں آتا جب تک کہ خود اُس پر اس سے بڑھ کر ظلم کرنے

والانہ پیدا ہوجائے۔ بادشاہوں میں آپس کی جنگ اُس وقت تک نہیں رُکتی جب تک ان میں سے کوئی ایک غالب نہ آجائے۔ پرانے زمانہ میں جب سارا یورپ باہمی نزاعات میں مبتلا تھا ہر جگہ یہی دیکھنے میں آتا تھا۔ اسی طرح خود مختار شہر اور قصبے آئے دن شریف لٹیروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اور جب تک وہاں کے دولتمند شہریوں اور عام باشندوں نے خود اپنی حفاظت کی قابلیت نہیں پیدا کی انھیں اس قسم کی تباہیوں سے نجات نہیں ملی۔ یہی حال مفلس کاشتکاروں کا تھا جو اُس زمانہ کے جاگیرداروں کے بے پناہ ظلم وستم سے تباہ رہا کرتے تھے اُنھیں بھی اگر پناہ ملی تو اُسی وقت جب اُنھوں نے ثابت کردیا کہ وہ اپنی حفاظت خود کرسکتے ہیں۔ غرضکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مظلوموں میں موثر انتقام کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اور وہ خود قوی بننے پر مجبور نہیں ہوگئے اُس وقت تک ان کی شنوائی نہیں نہ تھی۔

رواج ظلم کو جائز کئے ہوئے ہے۔ باوجود موجودہ زمانہ کی ترقی کے نہ معلوم کتنے رواج اب بھی باقی ہیں جن کی بنا درحقیقت زبردستی کے اُصول پر ہے۔ ان رواجوں کی ظاہری شکل بدلی ہوئی ہے لیکن ان کی ابتدا زبردستی ہی سے ہوئی تھی۔ چونکہ لوگ اُن باتوں کے شدت سے عادی ہورہے ہیں اس لئے اس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ البتہ اگر اس قسم کی کوئی نئی بات آج شروع کی جائے تو وہ اس قدر بیہودہ سمجھی جائے گی کہ لوگ اُسے ہرگز نہ مانیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ انسان نے اپنے ہم جنسوں کو قابل انتقال جائداد کی طرح مدتوں استعمال کیا ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ انگریز قوم بھی غلامی کو قانوناً جائز سمجھتی تھی۔ اور یہ بھی حال ہی کی بات ہے کہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں بردہ فروشی اور غلاموں کا پالنا عین قانون تھا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں بھی بجز اُن لوگوں کے جن کی ذاتی منفعت اُس رواج سے وابستہ تھی کوئی فرد (کم از کم انگلستان میں) ایسا نہ تھا جو غلامی کے رواج کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھتا۔ اور اس جذبہ نفرت کی ابتدا کو بھی مدتیں گذر چکی تھیں جس کے باوجود اس رواج کا سدباب آسانی سے ممکن نہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر شخصی حکومتوں کا حال ہے جن کی ابتدا مسلمہ طور پر اسی زبردستی کے اصول سے ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی یورپ کے مختلف گوشوں میں مطلق العنان بادشاہ

اب تک نظر آتے ہیں[۵]۔ اور جن ممالک میں دستوری حکومت قائم ہو چکی ہے وہاں بھی مطلق العنانی کے حامی ان ممالک کے بااثر طبقوں میں سب کہیں پائے جاتے ہیں۔ غرضکہ ایسے رواج جن کی بنا جور وجبر پر ہے انھیں لوگ گوارہ کئے ہوئے ہیں۔ اور نہ معلوم کب تک گوارہ کرتے رہیں گے۔ اُن کے لئے کسی چیز کا رواج کی شکل میں ہونا اوس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ اور یہی وجہ ایسے رواجوں کے دیرپا ہونے کی ہے۔

مردوں کا اقتدار ایک عالمگیر مسئلہ ہے

خواہ وہ پرانے زمانہ کی شخصی حکومت ہو یا غلامی کا رواج لیکن ان چیزوں کی تہہ میں بجز ذاتی اقتدار کی بقا کی خواہش اور معدودے چند کی خود پسندی کے اور کیا چیز مضمر ہے؟ یہ اس قسم کی خود غرضی ہے کہ جن پر نہ تو کبھی پردہ ڈالنے کی ضرورت ہوئی نہ صدیوں تک کسی نے کوئی اعتراض کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر حاوی رہنے کی جو ہوس ہے یہ ویسی ہی ہوس ہے یا نہیں جس کی مثال شخصی حکومتوں میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ اور جو جواز غلامی کے زمانہ میں آقاؤں کو دامنگیر تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ مردوں کا اقتدار عورتوں پر اور بھی دیرپا ثابت ہوگا۔ کیونکہ تمام دنیا کی جنس ذکور کے اثرات کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے بادشاہ یا آقا کا حلقہ اثر ظاہر ہے کہ کس قدر محدود ہے۔ یہ ایک ایسا عالمگیر سوال ہے جس سے تمامی جنس ذکور کا مفاد متعلق ہے۔ اس امر میں قریب قریب دنیا بھر کے مرد ایک دوسرے کے اگر شریک حال نہیں تو ہم خیال ضرور ہیں۔ بادشاہوں کو تو بعض اوقات شورش اور بغاوتوں کا بھی کھٹکا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بے بس طبقہ اناث سے اس کا بھی خوف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زن و مرد ہر صورت میں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح متعلق اور وابستہ ہیں کہ کوئی مظلومہ اپنی مظلوم بہنوں سے کافی طور پر مانوس ہونے اور اتحاد عمل کرنے کا موقع نہیں پاتی۔

زبردست دوسرے کے حقوق تسلیم نہیں کرتا۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شخصی حکومتوں کو سراہنا یا دستور غلامی کی حمایت کرنا تو اس وجہ سے ناروا ہے کہ ان چیزوں کی بنا فقط ہوا و ہوس پر ہے۔ لیکن مرد کا عورت

---

[۵] جنگ عظیم سے قبل ہی یورپ میں یہ صورت حال ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مطلق العنانی دوسری صورتوں میں اب بھی باقی ہے۔ بلکہ بہت کچھ کارفرما ہے۔ مترجم

پر حاوی ہونا بالکل دوسری چیز ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی بات ہے اور بالکل جائز بلکہ مناسب ہے۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ صاحب اقتدار کو اپنا اقتدار ہمیشہ قدرتی ہی نظر آتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان صرف دو طبقوں میں تقسیم تھے۔ یعنی ایک طبقہ آقاؤں کا تھا دوسرا غلاموں کا۔ قلیل التعداد آقاؤں کا طبقہ کثیر التعداد غلاموں پر حکومت کرتا تھا اور یہی صورت حال بالکل قدرتی سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ ارسطو کے سے عقلا بھی اس صورت کے قدرتی ہونے میں کوئی شک نہیں رکھتے تھے۔ اور غلامی کے جواز کی وہی دلیلیں پیش کی جاتی تھیں جو آج عورتوں کو محکوم رکھنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ خیر ارسطو کا زمانہ پھر بھی پرانا زمانہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقوں کو دیکھئے جہاں ابتک اُسی قسم کی ذہنیت باقی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ گوری اقوام کو کالے آدمیوں پر حکومت کرنے کا قدرتی حق حاصل ہے وہاں لوگوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اُن کا قول اب بھی یہی ہے کہ کالے لوگ قدرتاً محکوم پیدا ہوئے ہیں۔ گویا اُن میں آزادی کی صلاحیت ہی نہیں۔ اسی قسم کے دلائل مطلق العنان حکمراں اپنے اقتدار کو جائز قرار دینے کے لئے ہمیشہ سے پیش کرتے آئے ہیں۔ فاتح اقوام نے مفتوحوں کے مقابلہ میں ہمیشہ یہی کہا کہ ہماری تلوار کے آگے تمہارا سر خم کئے رہنا ہی قرین انصاف ہے اور یہی مقتضائے فطرت ہے۔ یورپ کے دور وسطیٰ میں طاقتور جاگیردار ادنیٰ طبقوں پر اسی خیال کی بموجب حکومت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ محکوم بھی جب کبھی بغاوت کرتے تھے تو یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم اپنے حقوق مانگتے ہیں وہ اسی کو غنیمت جانتے تھے کہ ان ظالم جاگیرداروں کے اختیار محدود ہو جائیں۔ غرضکہ عورتوں کی محکومیت ایک ایسے دیرینہ اور عالمگیر رواج پر مبنی ہے کہ اُنکی موجودہ حالت کے علاوہ عورتوں کی کوئی اور حالت گویا کسی کے سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ اور لوگ اسی کو قدرتی حالت خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو خواب میں بھی نہیں دیکھنا چاہتے کہ عورتیں پارلیمنٹ میں جاکر بیٹھیں یا عام طور پر میدان جنگ میں فوجی کاموں کی انجام دہی کے لئے مقرر ہوں۔ اگرچہ عورتوں کے سپاہیانہ کارنامے اکثر اقوام میں ابتک سراہے جاتے ہیں، بلکہ اسپارٹا میں صنف نازک نے جو مردانگی کے جوہر دکھائے اس سے افلاطون تو یہاں تک متاثر ہوا کہ اس نے عورتوں اور مردوں کو اپنے نظام سیاست میں ہم پلہ مان لیا۔

عورتیں حقوق مانگنے سے بھی مجبور ہیں اور پھر بھی کوشاں ہیں | کہا جاتا ہے کہ عورتیں تو خود اپنی نااہلیت اور کمزوریاں تسلیم کرتی ہیں اور انھیں کوئی وجہ شکایت نہیں محسوس ہوتی۔ اس کے جواب میں اس بات کا اظہار بہت شد و مد سے کر دینا چاہیئے کہ اول تو سب عورتیں ایسی نہیں ہیں جو اپنی یا اپنے جنس کی نااہلیت کا اقرار کرتی ہوں۔ بہت سی عورتیں موجود ہیں جو نہایت شاکی ہیں۔ اور باقی عورتیں یعنی جو شاکی نہیں ہیں اگر ان کی عادت یہ نہ ڈالی گئی ہوتی کہ وہ شکوہ زبان پر نہ لائیں تو وہ بھی یقیناً شاکی ہوتیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی محکوم طبقہ سے آزادی کی آواز ہم آہنگی سے یکایک نہیں بلند ہوتی۔ ان میں بہرکیف اب یہ روح پیدا ہوگئی ہے کہ اگر انھیں تقریر کا موقع نہیں ملتا تو اپنے جذبات کا اظہار تحریر سے کرتی ہیں۔ اُن میں تعلیم کی خواہش روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بلکہ انگلستان میں سیاسی حقوق مثلاً حق رائے دہندگی کیلئے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ میں مختلف مقامات پر انجمنیں قائم ہیں جو حقوق نسواں پر طرح طرح سے زور دے رہی ہیں۔ جو عورتیں بے زبان ہیں وہ بھی جب عاجز آ جاتی ہیں تو اُن کی زبان سے "اُف" ضرور نکل جاتی ہے۔ کونسا گھرانا ہے جس میں عورتیں اپنے شوہروں سے وقتاً فوقتاً اُن رواجوں کے متعلق شاکی نہوئی ہوں جو ان کو اب کسی طرح گوارہ نہیں ہیں۔ ان رواجوں کی بدولت بعض اوقات اُنکو دم مارنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان سخت رسوم کی کوئی باقاعدہ مخالفت کریں تو انھیں خوف ہے کہ اُن رسوم پر اور بھی سختی سے عمل ہونے لگے گا۔ مثلاً جو لوگ اپنی عورتوں کو تھوڑی دیر کے لئے تفریح کی اجازت دیدیتے ہیں وہ انھیں بالکل ہی مقفل کر دیں۔ اور اپنے رواجی اختیارات کو بدترین صورتوں سے کام میں لانا شروع کر دیں۔ عورتوں کی حفاظت کے لئے جو برائے نام قوانین بنائے گئے ہیں وہ عورتوں کی رسائی سے باہر ہیں۔ اور اگر کوئی عورت اُن قوانین سے کام لیتی بھی ہے تو یہ اُس کا بدترین قصور سمجھا جاتا ہے۔ جب مظلوم عورت کو بالآخر اپنے اُسی ظالم شوہر کے قبضہ میں جانا پڑتا ہے جس کے انتقام کی اکثر کوئی حد نہیں ہوتی تو اس کے لئے دو ہی باتیں ہیں یا تو وہ اپنے ظالم شوہر کے انتقام کا شکار بنے یا پیشتر سے بھی زیادہ مطیع اور محکوم بن کر اپنے مالک کو خوش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے۔

عورت کی دلکشی کا راز | یہ ایک عجیب بات کہی جاتی ہے کہ بحالت موجودہ عورتوں کے حقوق محفوظ کر دیے

گئے ہیں جنھیں وہ قانوناً حاصل کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں پھر سب عورتیں وہ تمام حقوق کیوں نہیں حاصل کر لیتیں ؟ صورت تو یہ ہے کہ ہر عورت اپنے شریک زندگی سے اس قدر دبی ہوئی ہے کہ اپنے ادنیٰ حقوق بھی خوف کی وجہ سے نہیں مانگتی۔ کیونکہ اگر وہ ان ادنیٰ حقوق پر ضد کرتی ہے تو مرد دوسری حیثیتوں سے اُس پر جبر کر سکتا ہے۔ اس بیچاری کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ ان معمولی حقوق سے بھی دستکش ہو جائے اور اپنے شوہر کے دست کرم ہی سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھے۔ مردوں کا قانوناً غیر محدود طریقہ پر قوی اور ذی اقتدار ہونا ہی تو غضب ہے کہ عورتیں متحد ہو کر کوئی شورش بھی برپا نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ نہ تو اُن میں حقوق شناسی کی روح پیدا ہوتی ہے نہ حقوق تلف کرنے والوں کو اُن سے کوئی خوف لاحق ہوتا ہے۔ اُنکی تربیت بچپن سے یونہی ہوئی ہے کہ وہ صبر و ضبط کی عادی بنیں اور اپنے کو غلامی کے لئے تیار کریں۔ اون کے لئے خوبی یہ ہے کہ مردوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنے کو جہاں تک ہو سکے دلکش بنائیں کیونکہ مرد عورت کو فقط اپنی لونڈی ہی نہیں بنانا چاہتا بلکہ منہ لگی لونڈی بنانا چاہتا ہے۔ اور مرد کے لئے کوئی عورت دلکش ہو ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ وہ اُس کی کفش برداری کے لئے تیار نہ رہے۔ اس خاص قسم کی دلکشی میں بھی بہت درجے ہیں اور گویا ایک حد مقرر ہے جس سے کم "دلکش" ہونا آپس کے نفاق کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی محکوم اپنے حاکم سے اتنا قریب نہیں رہتا جتنا کہ عورت مرد سے۔ یہی وہ مخلوق ہے جسے ہر آن اپنے آقا کی بے پایاں خدمات پوری کرنا ہوتی ہیں۔ مرد عورت کے دل و دماغ پر بھی اپنا قبضہ چاہتا ہے، اور جس قدر منفعت اس قبضہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں حاصل کر سکتا۔ آقا لونی الجملہ اپنے غلاموں پر اپنا تسلط سزا کا خوف دلا کر یا مذہبی احکام سے ڈرا کر قائم رکھتا ہے۔ لیکن مرد نے عورت پر اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کے وسیع ترین ذرائع بھی اختیار کئے ہیں۔ صنف نازک کے ایک ایک فرد کو ایسی تربیت دیجاتی ہے کہ وہ بہترین محکوم بنے۔ یعنی بجائے اپنے ارادہ اور اپنی میلان طبع سے کام لینے کے دوسرے کے اشاروں پر چلنا بچپن سے سیکھے۔ اُس کے آگے جو دستور اخلاق پیش کیا جاتا ہے وہ یہی بتاتا ہے کہ عورت کو مرد کے تابع فرمان رہنا چاہئے۔ کیونکہ عورت ایثار ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ تربیت ہے جو عورت کے حسن جنسی کا ایک اہم جزو قرار پا گئی ہے۔ اوّل تو عورت کا مرد کی طرف

جنسی میلان، دوسرے زوجہ کا اپنے تمامی حوائج کے لئے شوہر کا محتاج ہونا اور تیسرے یہ امر کہ اگر خود وہ کوئی چیز حاصل کرنا چاہے تو بغیر شوہر کی مرضی اور ذریعہ کے نہ حاصل کرسکے۔ یہ تینوں باتیں خود بتہ دیتی ہیں کہ عورت کی تربیت اور اس کی سیرت کی پرداخت اسی بات کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے کہ وہ ہر طرح مرد کے لئے دلکش بنے۔ اگر اسی نصب العین کے لحاظ سے پرانے زمانے کے ہر ہر غلام کی تربیت ہوا کرتی یا دوسرے محکوم طبقوں میں اسی شدت کے ساتھ حاکموں کی پرستش کرنا ہر فرد کو سکھایا جاتا، اور حاکم و محکوم کا تعلق اسی قدر گہرا ہوا کرتا جس سے ہر آن تربیت متاثر ہوا کرتی تو بلا شبہہ پرانے زمانہ کی غلامانہ محکومیت بھی آج تک اسی طرح موجود ہوتی۔ اور بجز معدودے چند ضمیر پرست افراد کے ساری دنیا آج بھی اس کو جائز بلکہ مستحسن قرار دے رہی ہوتی۔

محکومیت کا دستور دنیا سے اٹھ رہا ہے یہ امور ثابت کرتے ہیں کہ یہ رواج خواہ کتنا ہی عام کیوں نہ ہو، نہ تو اس کی موافقت میں کوئی قیاس قائم کرنا چاہیئے، نہ اس رواج کی بنا پر دل میں کبھی تعصب کو جگہ دینا چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اور انسان کی معاشرتی ترقیوں کی رفتار دیکھتے ہوئے لامحالہ یہی رائے قائم ہوتی ہے کہ دوسرے مذموم رواجوں کی طرح عورتوں کی محکومیت کا دستور بھی رفتہ رفتہ مٹتا جائے گا۔ یہ چیز باقی رہنے والی نہیں ہے۔

دور جدید کا نقطۂ نظر موجودہ دور میں دنیا کا نصب العین یہ ہے کہ انسان جس چیز میں اپنی بہبودی پائے اُسے اختیار کرنے میں اس کے لئے کوئی پرانا دستور یا رواج مانع نہ ہونا چاہیئے۔ اس کو پوری آزادی حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ جس امر کو چاہے اختیار کرے خواہ مخالف اُسے کچھ ہی کہیں۔ وہ زمانہ گیا کہ ہر شخص جس حیثیت کے لوگوں میں پیدا ہوتا تھا اسی حیثیت پر ہمیشہ قائم رکھا جاتا تھا اور اگر وہ اپنی حالت بدلنا چاہتا تھا تو اس کو سزا کا مستوجب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے نئے خیالات اس زمانہ کے خواص سے ہیں جن کی بنا پر ترقی یافتہ ممالک میں روزمرہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ ہر شخص اپنے فعل کا مختار سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص آزادی عمل کو اپنا پیدائشی حق گردانتا ہے۔ اگر دنیائے عمل میں اس حق کو آپ تسلیم نہ کیجیئے گا تو زمانہ کی رفتار اور دنیا کا دستور زندگی خود بتا دے گا کہ کونسا اصول باقی رہنے کے

لائق ہے اور کونسا فقط مٹ جانے کے لئے باقی ہے۔ پرانے زمانہ میں معاشرت دوسرے ہی اُصول پر قائم تھی۔ جیسے آدمیوں میں کوئی کالا پیدا ہوتا ہے کوئی گورا اسی طرح یورپ کے جملہ ممالک میں محکوم اور رذیل طبقہ کے لوگ پیدائشی غلام اور کمینے سمجھے جاتے تھے اور جو آزاد ہوتا تھا وہ شہریت کے پیدائشی حقوق رکھتا تھا۔ کسی کی ذاتی حیثیت کچھ نہ تھی۔ غرضکہ آزادوں اور محکوموں کی یہ تفریق قانون کے ذریعہ سے باقی رکھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض صورتوں میں مختلف پیشے خاص خاص خاندانوں اور گروہوں کے ساتھ مخصوص کر دئے گئے تھے۔ یورپ میں پندرھویں صدی کے آخر تک عام طور پر یہی حالت باقی رہی۔ اب وہی یورپ ہے جس کے نظام معاشرت کے اُصول بالکل دوسرے ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پیشے اور اپنے مشاغل میں آزاد ہے۔ اب ایک ایسی انفرادیت کا دور دورہ ہے جو ایک ہزار سال کے مسلسل تجربوں کے بعد رونما ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر فرد ہر کام کے لئے یکساں موزوں سمجھا جانے لگا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا پیشہ اور مشغلہ انتخاب کرنے کا پورا موقع دیدیا گیا ہے۔ جو جس کام کا اہل ہے وہ خود اُس کام کو ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنھیں انجام دینے کی اہلیت عورتوں میں نہیں ہے؟ مگر کبھی اس پر غور نہیں کیا گیا کہ آخر عورتوں کی اس نا اہلیت کا سبب کیا ہے؟ ابتدائے آفرینش سے عورتوں کے لئے دنیاوی مشاغل کی تقریباً تمام راہیں بند رکھی گئی ہیں مگر باوجودیکہ اُن کو ہر طرح اُبھرنے سے روکا جاتا ہے پھر بھی بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی موجود ہیں جو بعض مردوں کے مقابلہ میں بہت سے کام نہایت خوبی سے انجام دے سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اُن کے ساتھ تعصب نہ برتا جائے اور اُنھیں برابر کا موقع دیا جائے۔ ہر ترقی پسند گروہ کا نظام عمل تو یہ ہونا چاہیئے کہ اُس کا جو فرد جس کام کی زیادہ لیاقت رکھتا ہو وہ اس کام میں لگا دیا جائے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ہم ایک ناشدنی اور ناکارہ مرد کو ایک لائق اور عقلمند عورت پر محض اس وجہ سے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ مرد ہے۔ حق تلفی سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ہمارے کتنے معاشری نقصانات ہو رہے ہیں جو ہماری تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ہم کو محسوس بھی نہیں ہوتے۔ اس ابلہ پروری اور متعصبانہ ناقدری سے ایک طرف تو کاہلی اور سستی کو فروغ ہو رہا ہے اور دوسری طرف

ہماری صنعت اور دستکاری وغیرہ میں بلکہ ہر قسم کی عملی راہوں میں ہم اس قدر ترقی نہیں کرسکتے جتنی کہ دراصل ممکن ہے۔

عورتوں کی حالت پر حیرت بھی نہیں! ترقی یافتہ ملکوں میں اب عورت کی معاشری کم حیثیتی ہی ایک چیز رہ گئی ہے جس میں قانون اور رواج دونوں کا برتاؤ فقط اس متعصبانہ لحاظ پر مبنی ہے کہ عورت عورت کیوں پیدا ہوئی! باقی اُمور میں اب پیدائش کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ البتہ بعض مہذب ممالک میں ایک استثنائی صورت اور چلی آتی ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص شاہی خاندان سے نہ ہو وہ بادشاہ نہیں ہوسکتا۔ ورنہ ہر پیشہ اور ہر منصب ہر ایک کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ صرف اہلیت کی شرط ہے۔ تخت شاہی کا ہر شخص کی رسائی سے بالاتر ہونا پھر بھی ایک غیر معمولی استثنائی صورت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس رواج کے جواز کو بہت سی مجبوریوں اور معذوریوں پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن عورتوں کی مردودیت کا سا اہم مسئلہ جس کا تعلق دنیا کی نصف آبادی سے ہے ذرا بھی قابل لحاظ نہیں سمجھا جاتا، نہ اُن کی موجودہ حالت کو حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے!

ایام جاہلیت کی ایک یادگار غرضکہ اس آزادی کے دور میں عورتوں کی محکومیت ہی ایام جاہلیت کی ایک اکیلی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ نئی روشنی کے ارباب حل وعقد نے جو اصول قواعد معاشری بہبودی کے لئے تسلیم کئے ہیں اُن سے مستثنیٰ ہونا کیا عورتوں ہی کے حصہ میں آیا ہے؟ نئی دنیا آج جن ترقیوں پر ناز کررہی ہے اگر عورتوں کی موجودہ پستی کو منجملہ اُس قسم کی لغو اور غیر منصفانہ رسوم کے نہیں خیال کرتی جن کے نیست ونابود کردینے کے لئے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا، تو بہرکیف ہر روشن ضمیر صاحب نظر کے لئے یہ مسئلہ کافی توجہ کے لائق ہے۔

نوع انسان کی ترقی کے ساتھ حقوق نسواں کی ترقی ہر صاحب فہم سے کم ازکم مطالبہ تو ضرور کیا جاسکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر ایک غائر نظر ڈالے۔ اور اس امر سے قطع نظر کرکے کہ موجودہ زمانہ میں عام رائے اس مسئلہ میں کیا ہے اور صورت موجودہ کس امر کی مقتضی ہے، اس سوال کو محض نوع انسان کی بہبودی اور انصاف کے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ اس مسئلہ پر جو بحث ہو وہ محض لفظی اور سطحی نہ ہو۔ کیونکہ

سرسری اعتراضات اور مبہم دلیلوں سے کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ سوال یہ درپیش ہے کہ جب صرف دو راہیں سامنے ہوں تو عقلاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس راہ کا تجربہ ہو چکا ہے وہ اس راہ سے لازمی طور پر اچھی ہی ہے جس کا تجربہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اگر کہا جائے کہ عورتوں کی مساوات ایک ایسی چیز ہے جس کا ہم کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور ابھی تک یہ محض ایک نظری اور قیاسی چیز ہے تو واضح رہے کہ اس کے خلاف یعنی مردوں کی موافقت میں جو رائے ظاہر کی جائے گی وہ بھی قیاسی ہی ہوگی۔ کیونکہ تجربہ نے اب تک جس بات کی تصدیق کی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ کل نوع انسان موجودہ موافق و ناموافق حالات کے ہوتے ہوئے بھی اب تک باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور ترقی کی خوگر تھی۔ تجربہ اس کی بابتہ ابھی تک یہ نہیں کہتا کہ اگر عورتوں کو مساوی حقوق دیدیئے گئے ہوتے تو ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی یا نہ ہوتی۔ البتہ تجربہ یہ ضرور کہتا ہے کہ نوع انسان کی ترقی کے ہر ہر قدم پر صنف نسواں کی معاشری حیثیت نے بھی ترقی کی ہے۔ بلکہ مؤرخین اور فلاسفہ تو یہاں تک دعوے رکھتے ہیں کہ اگر کسی قوم یا کسی دور کی تہذیب اور ترقی کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس قوم اور اس زمانہ کی عورتوں کی معاشری حیثیت ہم کو بتادو اور ہم تمھیں اس تہذیب اور ترقی کا صحیح اندازہ بتادیں گے۔ نوع انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ زن و مرد میں مساوات بڑھتی آئی ہے۔ اور اس بنا پر یہ رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ بالآخر عورت کو پوری مساوات حاصل ہو کر رہے گی۔

کیا عورت کی موجودہ حیثیت فطرت نے مقرر کی ہے ؟

ایک حجت یہ ہے کہ جس جنس کی جو فطرت ہے اسی کے لحاظ سے اس کے مشاغل بھی مقرر ہیں اور معاشری حیثیت بھی۔ یعنی جو جس لائق ہے فطرت نے اس کے لئے معاشری دنیا میں مناسب جگہ بھی وضع کر دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مرد جب اور جہاں کہیں پائے گئے زبردست پائے گئے۔ لہٰذا ان حالات میں کسی جنس کی حقیقی فطرت کے بارہ میں کوئی رائے قائم ہی نہیں کی جاسکتی۔ اگر عورت کبھی موجودہ معاشری حالات سے علیحدہ پائی گئی ہوتی تب اس کی بے لوث فطرت اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوئی ہوتی۔ صدیوں کی روایات غلامی اور بچپن کی ناقص تربیت نے عورت کی سرشت کو جس قدر مسخ کیا ہے اس کی مثال ارذل ترین غلاموں اور پست ترین مفتوح قوموں کے عادات و اطوار کے مطالعہ سے بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ درخت کی ایک شاخ کی ایک باڑھ کو طرح طرح سے

روک دیئے اور دوسری شاخ کو پھیلنے اور بڑھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیجئے اور پھر کہئے کہ جس شاخ کی جو فطرت ہے وہ اُس حد کو پہونچ رہی ہے' یا یہ کہ بغیر اس تدبیر کے درخت باقی نہیں رہ سکتا تو یہ استدلال کیسے کام دے سکتا ہے ؟

لوگوں کا دھیان اس طرف بالکل نہیں ہے کہ انسان کی سیرت پر کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشری زندگی پر نہ کسی کی غائر نظر پڑتی ہے نہ کوئی مدلل رائے قائم ہونے پاتی ہے۔ عورتیں خود چونکہ سیاست کی طرف سے بے پروا بنائی گئی ہیں اس لئے عام رائے یہ ہوگئی ہے کہ وہ رفاہ عام کے مسائل سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور تنگ نظر مشہور کی جاتی ہیں۔

عورت اور مرد میں کس قسم کا اصلی فرق ہے

زن و مرد میں قدرتی فرق کیا ہے ؟ یہ ایک زبردست علمی سوال ہے جو دونوں جنسوں کے مزاج اور طبیعت کے مطالعہ اور امتحان سے حل ہو سکتا ہے۔ اس بارہ میں عوام بہت سی باتیں پہلے سے فرض کئے ہوئے ہیں تحقیق کا مادہ اُن میں نہیں ہے۔ نہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کی سیرت پر درحقیقت کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور کیونکر پڑتا ہے۔ اور کسی جنس کی اصلی فطرت یا دو جنسوں کا فطری فرق واقعی کس طرح دریافت کیا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ فرق دماغی ہو یا اخلاقی لیکن جو بھی فرق پایا جاتا ہے وہ ہمیشہ سے اُسی طرح پایا جا رہا ہے جیسے کوئی قدرتی فرق پایا جاتا ہو۔ اب قدرتی اور مصنوعی میں وجہ تمیز بہت کم باقی رہتی ہے۔ خاصکر جہاں تک کہ عورت کی ناا ہلیت کا سوال ہے یہ تمیز کرنا ہی بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ عورت اگر نوع انسان کا جزو ہے تو اُس کا شمار ذی عقل ہستیوں میں ضرور ہے۔ جو چیزیں مرد کی سیرت پر اثر ڈالتی ہیں وہ اُس کی سیرت پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اگر تربیت کے تمام اُصول پوری طرح دریافت ہو جائیں تب بھی بحالت موجودہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ مرد اور عورت میں اخلاق اور عقل کے لحاظ سے جو فرق پایا جاتا ہے وہ کس حد تک حقیقی اور واقعی ہے اور کس قدر مصنوعی۔ عورت کی سیرت پر خاص قسم کے اثرات ہمیشہ سے ڈالے جاتے رہے۔ اور مردوں کی توقعات ایک خاص صورت سے قائم ہوتی چلی آتی ہیں۔ قیاس آرائی کی تو بات ہی دوسری ہے۔ لیکن تجربہ کا ابھی تک کوئی موقع نہیں آیا جس کی بنا پر کوئی ایک بات پورے طور پر طے ہو سکے۔ لیکن تجسس کے ساتھ حالات کا مطالعہ کیجئے

تو تجربہ یہی ثابت کرتا ہے کہ عورتیں ترقی کی صلاحیت سے قدرتاً محروم نہیں ہیں۔ جب کبھی اُنھیں موقع ملیگا وہ ضرور اپنی اہلیت میں ترقی کریں گی۔

عورت کی بابتہ مردوں کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے

سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ مرد و زن کے اصلی فرق پر کچھ بھی روشنی ڈال سکے۔ جسمانی فرق تو طبیبوں اور سائنس دانوں کو ضرور معلوم ہیں لیکن مزاج شناسی دوسری ہی چیز ہے۔ ان سائنس دانوں سے بڑھ کر مزاجوں کے مبصر تو جاہلوں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اتنا مزاج داں کوئی نہیں ہوسکتا جو دونوں کے مزاج میں حقیقی اور پیدائشی فرق صاف طور پر بتا سکے۔ یا دعوے سے یہی کہدے کہ عورت کا مزاج مرد کے مزاج سے واقعی مختلف ہے۔ عورت کو لوگوں نے احمق پایا اور احمق سمجھ لیا۔ عورت اگر احمق ہے تو اُس سے واقف ہونا بہت آسان ہے کیونکہ حماقت دنیا میں ایک ہی طرح کی ہوا کرتی ہے۔ احمق شخص کے خیالات اور جذبات اس طبقہ اور اُس صحبت کے خیالات اور جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ اگر کسی احمق شخص کے خیالات اور جذبات کا اندازہ کرنا ہو تو اُس کے ہمنشینوں کے خیالات اور جذبات معلوم کرلیجئے اور پھر آپ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عقلاً آزاد ہیں اور اون کے جذبات وغیرہ اُنہی کی سرشت سے پیدا ہیں اون کی صورت دوسری ہے۔ بہت سے مرد مدعی ہیں کہ وہ عورت کی رگ رگ ریشہ سے واقف ہیں اور عورت کے مزاج کی تہہ تک پہونچ چکے ہیں۔ لیکن اون کا یہ دعوے محض سطحی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خاصکر چند عورتوں کی طبیعت کا اندازہ کچھ نہ کچھ رکھتا ہو۔ لیکن واضح رہے کہ بحالات موجودہ عورت سے بڑھ کر اپنی حالت کا چھپانے والا بھی کوئی نہ ملیگا۔ اور عورت کی طبیعت کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جنھیں اگر وہ چاہے بھی تو ظاہر نہ کرسکے گی۔ فی الجملہ مردوں کو اس مطالعہ کا موقع اپنے گھر میں ملتا ہے۔ اور گھر کی چند مثالوں سے وہ دنیا بھر کی عورتوں پر قیاس دوڑانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ اندازہ کرنے کا موقع یوں بھی لائق اعتبار نہیں کہ آدمی عموماً کبھی کوئی قیاس قائم کرتا ہے تو وہ محبت اور یگانگت ورنہ نفرت اور عداوت کے جذبات دل میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور مرد کی جو شان رعونت عورت کے مقابلہ میں ہے اُس سے اُس کی کوئی منصفانہ رائے قائم ہونا مشکل ہے۔ محبت اور نفرت یہ دونوں چیزیں انسان کو اندھا بنائے رکھتی ہیں۔ دنیا میں کتنے مرد ہیں جن کے دل

جنسی تعصب سے خالی ہیں؟ باپ اپنے بیٹے کی سیرت سے اتنی آسانی کے ساتھ نہیں واقف ہو سکتا جتنی آسانی سے کہ ایک برابر کا دوست اپنے دوست کی سیرت سے واقف ہو سکتا ہے۔ حالانکہ باپ اور دوست میں فرق یہی ہے کہ باپ بیٹے پر حاوی ہوتا ہے اور دوست برابری کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے مزاج سے واقف ہو گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہر عورت کے مزاج سے واقف ہو گیا پھر ہر طبقہ کی عورتیں یکساں نہیں ہوتیں نہ ہر ملک کی عورتوں کی طبیعت ایک سی ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سب یکساں بھی ہوں تو وہ ایک ہی زمانہ کی ہوں گی۔ ماضی اور مستقبل کی عورتوں پر قیاس کیا معنی؟ غرضکہ فی الجملہ اُن کی سرشت کی بابت کوئی مختتم رائے قائم کر لینا ایک لغو بات ہے۔ اور جب تک عورتیں اپنی کہانی خود کہنے کی اہل نہ بنیں ہم کو محض اپنے قیاس پر بھروسہ کر کے مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔

عورتوں کے اقوال آزادانہ نہیں ہیں۔

ابھی تک تو عورتیں زبان بندی کے مزے لے رہی ہیں۔ مجمع عام میں منہ کھولنا کیسا بعض مضامین پر قلم فرسائی تک اُن کے لئے معیوب ہے۔ اگر عورت نسوانی دنیا کے معاملہ پر کچھ لکھ کر شائع کرتی ہے تو وہ بھی غیر مستحسن قرار پاتا ہے۔ اور کسی بن بیاہی کے ادبی میدان میں رونما ہونے کا منشا یہ سمجھا جاتا ہے کہ اوسے شوہر کی تلاش کا یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے۔ پھر مرد اس کے خیالات کو عجیب دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے لڑکیوں کی خامہ فرسائی اور بھی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ لکھنے والیاں لکھتی تو ہیں مگر چھپ چھپ کر۔ اور جو لکھتی ہیں اُس میں آپ بیتی کا شائبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ بلکہ وہ زیادہ تر نقالی ہوتی ہے یا اپنے طبقہ کے عام خیالات کا خاکہ اُڑانا ہوتا ہے۔ ہم کو انتظار اُس وقت کا ہے جب اُن کا قلم معاشری دباؤ سے آزاد ہو جائے۔ اس سے پہلے ان کے شائع کئے ہوئے اقوال بھروسہ کے لائق نہیں ہوں گے۔

عورتوں کا اپنی نا اہلیت تسلیم کرنا کوئی دلیل نہیں

اب یہ اعتراض ہوگا کہ جب مرد اُن کی سرشت سے واقف ہی نہیں ہیں تو اُن کی خامیوں کا بھی پورا اندازہ نہیں رکھتے لہذا اُن کو برابر کا شریک بنانا ایک مخدوش بات ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک عورتوں کو مساوات دی گئی انھوں نے خود کو اُس کا

اہل ثابت کیا۔ اور اب وہ بقیہ اُمور میں بھی موقع پانے کی ضرور اہل ہیں۔ جہاں تک عملی ضروریات متعلق ہیں لو اُنکی معاشری مساوات مد نظر ہے اُنکی سرشت کی علمی تحقیقات سر دست غیر ضروری ہے تا وقتیکہ آزادانہ تجربہ اور مشاقی کی کوشش کے بعد وہ خود اپنی نااہلیت کی قائل نہو جائیں اُن کو خود انکی رائے کے بموجب نااہل مان لینا درست نہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی فلاح اور بہبودی اور اپنی صلاحیت کی بابت بغیر آزادی حاصل کئے ہوئے کوئی شخص خود بھی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتا۔ پھر دوسروں کا کوئی مختتم رائے قائم کر لینا یہ بہت زیادتی ہے۔

عورتوں کو بلا رورعایت مقابلہ کرنا ہوگا

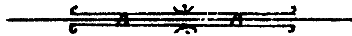
کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ مساوات حاصل کرنے کے بعد اگر کوئی مشغلہ عورتوں کی فطرت کے واقعی خلاف پڑے گا تو لامحالہ وہ اُس سے الگ ہو جائیں گی۔ جو چیز عورتیں فطرتاً قبول نہیں کر سکتیں اُن سے اُنھیں روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر مشغلہ میں اُنھیں مردوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ منشا تو کسی کا نہیں کہ اُن کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے یا اُنھیں فائدہ پہونچانے کے لئے مردوں کی صنعت اور تجارت پر کوئی محصول لگا دیا جائے! تجارت اور کاروباری دنیا کا یہ اصول اُن کے سامنے بھی ہے کہ جو جس چیز کا زیادہ اہل ہے۔ وہ اس میں ترقی کریگا۔ اگر اس اُصول کی بنا پر عورتوں کو فائدہ پہونچ جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ اور اگر آزادانہ مقابلہ میں مرد ہی بازی لے جائیں تو عورتوں کو کوئی وجہ شکایت نہیں۔ انصاف سب کی زبان بند کر دیگا۔ جو جس کام کا اہل ہوگا اُسی میں مشغول رہیگا جس کا نتیجہ نوع انسان کی بہبودی ہے۔

یہ اندیشہ کہ عورتیں شادی سے گریز کرنے لگیں گی۔

مردوں کی رائے یہ فرض کر لی گئی ہے کہ عورت قدرتاً زوجہ اور ماں بننے کے لئے ہے۔ "فرض" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ اگر مردوں کے افعال اور معاشرت کے موجودہ نظام پر نظر رکھ کر رائے قائم کیجئے تو کم از کم اس زمانہ میں مردوں کی رائے کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم میں کہتا ہوں کہ اگر عورتوں پر سے ہر قسم کی قید اُٹھا دی جائے تو بہت سی ایسی عورتیں پیدا ہو جائیں گی جو ثابت کر دیں گی کہ اونکی فطرت پر یہ الزام نہ صرف غلط ہے بلکہ صورت حال اس الزام کے بالکل منافی ہے۔ اگر مردوں کی رائے فی الواقع یہی ہے تو کاش مجھے ایک شخص

بھی ایسا مل جائے جو بالاعلان یہ دعوے کرے کہ "معاشرت کا مقتضا ہی یہ ہے کہ عورت شادی کرے اور بچے جنا کرے۔ لیکن کوئی عورت جب تک مجبور نہوگی ایسا کرنے پر تیار نہوگی۔ لہٰذا عورت کو اس پر مجبور کرنا ضروری ہے"۔ جب یہ دعوے ان الفاظ کے ذریعہ سے معین ہوگیا تو اس کا مقابلہ جنوبی کارولینا اور لوئسیانا کے غلام نواز آقاؤں کے استدلال سے کیجئے جو کہتے ہیں کہ "کپاس اور شکر کی کاشت ضروری چیز ہے۔ گوری قوم کے لوگ یہ کاشت نہیں کرسکتے اور سیاہ فام لوگ اُس شرح اُجرت پر کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے جو ہم دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا سیاہ فاموں کو کام پر مجبور کرنا ضروری ہے"۔ جن لوگوں کی رائے حقیقتاً یہی ہے کہ عورت شادی پر مجبور نہوگی تا وقتیکہ دوسرے مشاغل سے وہ محروم نہ کردی جائے تو وہ لوگ گویا تسلیم کر رہے ہیں کہ عورت کی بیاہی زندگی واقعی کوئی ایسی چیز نہیں جسے وہ اپنے دل سے پسند کرتی ہو۔ یعنی وہ اس کے لئے ایک کرب کی حالت ہے جس سے اُس کے بھاگنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے۔ خود اسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو دراصل خوف محض اس بات کا نہیں کہ عورتیں شادی سے انکار کریں گی۔ بلکہ خدشہ یہ ہے کہ جب وہ شادی کریں گی تو بغیر برابری کے دعوے کے نہ کریں گی۔ میرے خیال میں اول تو مردوں کو عورتوں کے شادی سے گریز کرنے کا فی الواقع کوئی خدشہ نہیں اور یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں۔ اگر انھیں خطرہ ہے تو اپنے اختیارات کے زائل ہونے کا ہے۔ جب تک عورت کے لئے شادی کرنا اپنے مرد کی غلامی میں دینے کے مرادف ہے اُس وقت تک اگر عورتیں شادی سے بھاگیں بھی تو اس کا الزام انصافاً مردوں کے تحکم پسندی پر ہے نہ کہ عورتوں کی آزادمزاجی پر۔ ان حالات میں اگر مردوں کو یہ اندیشہ بالفرض لاحق بھی ہو تو میرے خیال میں اس کا لاحق رہنا ہی اچھا ہے۔ کیونکہ عورتوں کے لئے اگر دنیاوی مشاغل کی راہیں کھل جائیں اور انھیں مساوات کا درجہ حاصل ہو جائے تو ان کے لئے اس سے بڑھ کر حماقت بھی نہیں کہ وہ زمانہ موجودہ کی سی محکوم زوجہ بنکر اپنی عزت کو بٹہ لگائیں اور مرد کی غلامی کریں۔ اگر شادی سے عورت کی محکومیت نہ لازم آئیگی تو عورت کو شادی سے نفرت کی کوئی وجہ بھی نہ ہوگی۔ مردوں کے نزدیک اگر قوانین ازدواج کا دار و مدار مرد کی مطلق العنانی پر رکھنا درست ہی ہے تو واقعی مردوں کے لئے اس سے بڑھ کر مفید مطلب کچھ نہیں ہوسکتا کہ

عورت کو ہر طرف سے گھیر کر شادی پر مجبور کیا جایا کرے ۔ ظاہر ہے کہ اُس غریب کے لئے اگر یہی ایک رستہ رہیگا تو اور کسی طرف قدم بڑھانے کی کوشش ہی نہ کریگی ۔ لیکن مردوں کی اگر یہ خواہش جائز ہے تو اب تک عورتوں کو جو تعلیم دی گئی اور جو کچھ آزادی سکھائی گئی یہ بھی بہت بُرا ہوا اُنھیں تو سوائے خانہ داری اور خانہ نشینی سیکھنے کے کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ جو کچھ اب تک ہوا وہی مردوں کیلئے کافی وبال جان ہے !



بازپرس

کئی سال ہوئے میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ کہاں سے آ رہا تھا۔ کہاں جا رہا تھا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں میں دوسرے درجہ میں تھا۔ سفر بہت دیر سے جاری تھا اور ابھی کچھ اور فاصلہ باقی تھا کہ ایک شام غیر متوقع طور پر ہماری گاڑی کو اسٹیشن کی ایک بغلی لائن پر ڈال دیا گیا گارڈ نے دروازے کھولے اور ہم سے کہا کہ اب آگے نہیں جا سکتے آپ لوگوں کو اتر جانا چاہیئے۔ مسافر بہت سے تھے ہر طبقہ اور نوعیت کے۔ تیسرا درجہ بھی تھا دوسرا بھی اور پہلا بھی۔ بڑے آدمیوں کے لئے کئی سلون بھی لگے تھے۔ کچھ وزیر تھے۔ کچھ جج جو دورہ کر رہے تھے۔ کچھ کمپنیوں کے ڈائرکٹر، کچھ ممتاز تاجر، کچھ اونچے خاندانوں کے بیکار نوجوان جو سیر و تفریح کے لئے نکلے تھے۔ ایک لاٹ پادری تھے۔ کئی معزز خواتین تھیں اور ایک نواب اور اُن کی بیگم صاحبہ اپنے تمام مصاحبوں اور ملازموں وغیرہ کے ساتھ۔ ان معزز مسافروں کے ڈبے مخصوص تھے اور ان میں سے ہر ایک اتنی جگہ پر قبضہ کئے ہوئے تھا جو بیس معمولی آدمیوں کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ میں کئی دن سے عیش کے ان تمام سامانوں کو جو ان بڑے مسافروں کو ہر طرح کی بے آرامی سے بچانے کے لئے فراہم کئے گئے تھے دیکھ دیکھ کر تفریح حاصل کر رہا تھا۔ موٹے نرم نرم تکئے، گرم لبادے، مٹھائیوں اور پھلوں کی ٹوکریاں، وقت گذاری کے لئے ناول اور رسالے موجود تھے۔ ان کے ذرا سے اشارہ پر ٹکٹ چیکر اور اسٹیشن ماسٹر ہمہ تن توجہ نظر آتے تھے۔ میرے درجہ کے لوگ متفرق قسم کے تھے۔ کچھ کاروباری تھے۔ کچھ وکیل۔ کچھ ادیب۔ کچھ آرٹسٹ۔ کچھ سیاح جو یا تو تفریحاً یا اس لئے گھوم رہے تھے کہ اُن کے پاس کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا۔ تیسرے درجہ میں کاریگر اور مزدور تھے جو روزگار کی تلاش میں نکلے تھے۔ عورتیں تھیں جنھیں اپنے شوہروں کی تلاش تھی یا ملازمت کی تلاش۔ فقیر تھے جنھوں نے فاقہ سے تنگ آکر دنیا کے ایک حصہ کو چھوڑا تھا لیکن جنھیں یہ خبر نہ تھی کہ جہاں کہیں بھی جائیں گے فاقہ سایہ کی طرح اُن کے پیچھے لگا رہے گا۔ یہ سب ایک ساتھ کاندھے سے کاندھا جوڑے بیٹھے تھے۔ جو کچھ روکھا سوکھا ساتھ تھا

یا تو اُسے کھا لیتے تھے یا اسٹیشن پر جو چیزیں میسر آسکتی تھیں اُن سے پیٹ بھر لیتے تھے۔ جیسی چوپایوں کی زندگی ہوتی ہے اور جتنا اُن کا خیال رکھا جاتا ہے بس اتنا ہی اُن کا بھی رکھا جا رہا تھا۔

تاہم اُن کی کھڑکیوں سے گانے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن باوجود ہر قسم کی آسائشوں اور سہولتوں کے اونچے درجوں میں جو اعلیٰ طبقہ کے لوگ تھے اُن کے چہروں سے افسردگی ظاہر ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے غریب ہم سفروں کے مقابلہ میں وہ بہت کم لطف اُٹھا رہے ہیں۔ غریب لوگ سخت جان تھے۔ ہچکولوں اور دھکوں کی اُنھیں بہت کم پروا ہوتی تھی۔ یہ خوش مزاج بھی زیادہ تھے اور باہم دگر مہربان بھی۔ جہاں کہیں بھی رہ گئے تھے زندگی کو اُنھوں نے اپنے لئے سخت پایا تھا اور چونکہ اپنی تمنّاؤں کے مطابق چیزیں کبھی میسر نہ آسکی تھیں اس لئے ان کی عادتیں بگڑنے نہ پائی تھیں۔ وہ خودغرض کم تھے اور دوسروں کا خیال زیادہ رکھتے تھے۔

ہم میں سے بیشتر لوگوں کو اس اطلاع کے دفعتہً ملنے سے کہ فی الحال ہمارا سفر ختم ہوگیا ہے ناگواری ہوئی۔ معزز لوگ بڑے غصہ سے باہر نکلے۔ اُنھوں نے اپنے ملازموں کو آوازدی اُن کے ملازموں نے یا تو اُن کی آواز سنی نہیں یا ہنستے ہوئے اُن کے پاس سے گذر گئے۔ ٹکٹ چیکر ادب و تمیز بھول گئے۔ پلیٹ فارم پر سب طبقوں کے آدمی یکبارگی ایک سطح پر آگئے۔ ایک بیگم صاحب سے جو اس بات پر حیرت زدہ کھڑی تھیں کہ اُن کی خادمہ اُنھیں چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اب اپنا بیگ اُنھیں کو اُٹھانا پڑے گا ایک بہکارن شانہ رگڑتی ہوئی گذر گئی۔ امرا عوام میں اسی طرح دھکّے کھاتے پھر رہے تھے گویا وہ بھی ایک معمولی فانی انسان ہیں۔ اُنھوں نے زور زور سے مطالبہ شروع کیا کہ ہم اسٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔ وزیر صاحب اس توقف پر سخت برافروختہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس تاخیر سے ایک اہم معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا اور دھمکی دے رہے تھے کہ یہ امر میرے محکمہ کی ناخوشنودی کا باعث ہوگا جس کا خمیازہ کمپنی کو بھگتنا پڑیگا۔ ایک امیر لڑکا جسے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کی اطلاع ابھی ملی تھی اپنے ترکہ پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ ایک محترم خاتون نے اپنی دانست میں اپنی بیٹی کے لئے ایک نہایت مناسب بر حاصل کیا تھا۔ اب چونکہ اُن کا کام ختم ہوگیا تھا اس لئے اس موسم کی تمام ہنگامہ خیز تقریبوں کی تھکن اُتارنے کے لئے وہ صحت بخش

چشموں پر غسل کے لئے جا رہی تھیں۔ لیکن اس معاملہ میں غیر متوقع طور پر ایک دشواری پیدا ہو گئی تھی اور اگر وہاں کے ازالہ کے لئے جلد تریب ہی موجود نہ ہوئیں تو نتائج کے خراب صورت اختیار کرنے کا اندیشہ تھا۔ ایک ساہوکار نے کہا کہ ایک بڑی کوٹھی کا کاروبار بالکل بیٹھ جائے گا اگر مقررہ دن پر میں وہاں نہ پہنچ سکوں گا۔ نجات صرف میرے ہاتھ میں ہے۔ ایک مختار کے ہینڈ بیگ میں ایسی شہادت تھی جس سے ایک قدیم خاندان کے خطاب اور زمینوں کی وراثت کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ ایک سن رسیدہ شوہر اپنی نوجوان بیوی کی طرف سے جسے وہ گھر چھوڑ آیا تھا مایوس ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک دستاویز مرتب کی تھی جس کی رو سے اگر اُس کے مرنے کے بعد وہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے گی تو اُسے اپنے تمام ترکہ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ دستاویز ڈسک میں پڑی رہ گئی تھی اور اس پر دستخط نہ ہو سکے تھے۔ لاٹ پادری اُس مشاورتی جلسہ میں شرکت کے لئے جا رہے تھے جہاں اس مسئلہ کے متعلق فیصلہ ہونے والا تھا کہ آیا قربان گاہ میں موم بتیوں کی جگہ گیس کی روشنی سے کام لیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ قربان گاہ کی بتیوں میں رحمت و برکت پہلے ہی سے پائی جاتی ہے لیکن گیس کو بابرکت قرار دینا مشتبہ تھا۔ اسقف اعظم کی رائے یہ تھی کہ اگر گیس کی نلکیوں کو موم بتیوں کی شکل دے دی جائے تو یہ مشکل حل ہو جائے۔ لیکن اُنھیں خدشہ یہ تھا کہ اگر اپنی موجودگی سے اُنھوں نے اعتدال کی فضا پیدا نہ کی تو اکثریت جلد بازی سے نامناسب فیصلہ کر بیٹھے گی۔ یہ تمام لوگ نہایت سادہ لوحی اور صاف گوئی سے اپنی پریشانیوں کو بیان کر رہے تھے اور جو بات حق تھی اُس کا اظہار بے باکی سے کیا جا رہا تھا۔ البتہ ماتمی لباس میں ملبوس ایک ممتاز خاتون جس کے نرم دل چہرے سے حزن و ملال کی کیفیت ٹپک رہی تھی راضی بہ رضا اور اُمید سے معمور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا شوہر اسی اسٹیشن پر زیادہ عرصہ نہیں ہوا روک لیا گیا تھا۔ اُسے یہ خیال ہو رہا تھا کہ ممکن ہے یہاں اس کی دوبارہ ملاقات ہو جائے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سب کی شکایتوں کو اطمینان اور لاپروائی سے سنا۔ جن کی آوازیں بہت بلند تھیں اُنھیں اُس نے سمجھایا کہ اس قدر اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وزیر سے اُس نے کہا کہ حکومت تمھاری عدم موجودگی میں بھی چلتی رہیگی۔ تمھارے پیش نظر ریاست کی بھلائی اتنی نہ تھی جتنی خود اپنی پارٹی کی

کامیابی۔ اس سلسلہ میں تم اپنے لئے سَر کا خطاب بھی حاصل کرنا چاہتے تھے جو یہاں تمھارے بالکل کام نہ آئے گا۔ نوجوان سے اُس نے کہا کہ تمھارا دوسرا بھائی موجود ہے جو تمھاری بجائے جایداد کا مالک ہوگا اور کاشتکاروں کو اس تبدیلی سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ محترم خاتون سے اُس نے کہا کہ تمھاری لڑکی تمھاری مرضی کی بجائے اب خود اپنی مرضی سے شادی کرلیگی اور پہلے سے زیادہ خوش رہیگی۔ ساہوکار سے کہا کہ کوٹھی کا پہلے ہی سے دیوالہ نکل چکا ہے۔ جتنی زیادہ دیر وہ قائم رہتی اُتنے ہی زیادہ معصوم لوگ اُس کی وجہ سے تباہ ہوتے۔ وکیل سے کہا کہ تم جس لڑکے کو نوابی دلانا چاہتے ہو وہ مدرسہ میں محنت سے پڑھ رہا ہے اور چند دنوں میں نہایت مفید آدمی بن جائے گا۔ اگر بڑی جایداد اُس کے ہاتھ لگتی تو وہ نکما اور بدمعاش ہوجاتا۔ سن رسیدہ آدمی سے کہا کہ تمھیں خوش ہونا چاہئے کہ جس مصیبت میں گرفتار تھے اُس سے جلد چھٹکارا ملا۔ تمھاری بیوی ایک دوامی تباہی سے شادی کرلیگی اور تمھارا ترکہ اس کے لئے اور زیادہ مصیبت کا باعث ہوگا۔ لاٹ پادری کی پریشانی کی اسٹیشن ماسٹر نے تعریف کی۔ مومبتی کے مسئلہ کا جو حل آپ نے تجویز کیا ہے وہ واقعی نہایت معقول ہے لیکن اس مسئلہ کی وجہ سے پادریوں کو ایک بے فضول موضوع پر جھگڑا کرنیکا موقع ملا ہوا ہے۔ اگر آپ کی تجویز اختیار کرلی جاتی تو وہ کسی اور جھگڑے میں پڑتے جس کا نتیجہ زیادہ ضرر رساں ہوتا۔

وزیر نے بگڑ کر دریافت کیا "تو کیا اس تمام گفتگو سے تمھارا مطلب یہ ہے کہ تم اب ہمیں آگے بھیجنا ہی نہیں چاہتے؟"

اسٹیشن ماسٹر نے ایک عجیب انداز سے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "گھبرائیے نہیں۔ رفتہ رفتہ آپ کو سب باتیں خود ہی معلوم ہو جائیں گی؟"

میں نے دیکھا کہ وہ اُس خاتون کی طرف جو ماتمی لباس پہنے تھی نرمی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے۔ اور ہر چند اُس نے الفاظ کے ذریعہ سے کوئی امید نہیں دلائی لیکن وہ رنجیدگی کے ساتھ مسکرایا اور تھوڑی دیر کے لئے ابتدائی کیفیت زہر خند اُس کے چہرے سے بالکل زائل ہوگئی۔

اسی اثنا میں عوام پلیٹ فارم پر ادھر ادھر کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور اپنے معزز ساتھیوں

کی پریشانی سے بدظنیتی سے نہیں بلکہ معصومیت کے ساتھ تفریح حاصل کر رہے تھے۔ ہر چند ایک بڑا سانحہ پیش آیا تھا۔ لیکن زمانہ کے اونچ نیچ کا انھیں اس قدر تجربہ تھا کہ قسمت کو جو کچھ اُن کے لئے منظور تھا اس کے لئے وہ بالکل تیار تھے۔ جس جگہ وہ جا رہے تھے وہاں کسی بہشت کے ملنے کی انھیں کوئی توقع نہ تھی۔ ان کے لئے ایک جگہ ویسی ہی اچھی تھی جیسی دوسری۔ اُن کے پاس سوائے اُن کپڑوں کے جنھیں وہ پہنے کھڑے تھے اور اُس معمولی مہارت کے جو اپنے مختلف پیشوں میں انھیں حاصل تھی اور کوئی چیز اپنی نہ تھی۔ آدمی جہاں بھی ہوں گے وہاں انھیں موچیوں، درزیوں، لوہاروں اور بڑھیوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ بھی نہ ہوگا تو جو کام ملے گا وہی کریں گے۔

فوراً ہی ایک گھنٹی بجی۔ ایک دروازہ دفعتہً کھلا اور ہمیں وٹینگ روم میں جانے کا حکم دیا گیا جہاں ہم سے کہا گیا کہ آپ کا سامان سفر دیکھا جائے گا۔ یہ ایک بڑا خالی کمرہ تھا جیسے بڑے اسٹیشنوں پر تیسرے درجہ کے وٹینگ روم عموماً ہوا کرتے ہیں۔ ایک کٹہرہ سامنے لگا تھا جس کے پیچھے مویشیوں کی طرح ہم سب بند کر دیئے گئے۔ ہمارے مقابل ایک بڑی میز تھی جس پر صندوق، بیگ اور دستی صندوق رکھے تھے ان کے پیچھے کچھ افسر قطار باندھے کھڑے تھے۔ اُن کی وردیاں سادہ تھیں۔ ٹوپیوں پر سادہ سنہری لیس لگی تھی۔ اُن کا لہجہ خشک اور تحکمانہ تھا جو اُن مسافروں کے لئے جن کے ساتھ ہمیشہ ادب و تمیز سے بات کی جاتی تھی سخت ناگوار تھا۔ ان کی پشت پر ایک پردہ تھا جو کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا اور چھت کی نصف اونچائی تک بلند تھا۔ اس کے عقب میں بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا دفتر ہے ہم میں سے ہر شخص تجسس کی نظر سے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا سامان بھی محفوظ ہے یا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہم ان میں سے کسی چیز کو بھی شناخت نہ کر سکتے تھے۔ بنڈل تو بہت سے تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ان ہی مسافروں کے ہیں جو اس گاڑی سے آئے ہیں ان کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا پہلا دوسرا اور تیسرا۔ لیکن تناسب اُلٹا ہو گیا تھا۔ اس میں سے بیشتر پر اُن مسافروں کا لیبل لگا تھا جنھوں نے تیسرے درجہ کے بےلوث اور تکلیف دہ ڈبوں میں سفر کیا تھا اور جن کے پاس سوائے اس سامان کے جو وہ اپنے ہاتھ میں لئے تھے اور کچھ نہ تھا۔ جہاں دوسرے درجہ اور کچھ اس سے بلند درجے

کے مسافروں کا سامان ہونا چاہیئے تھا وہاں سامان کا ایک متوسط سا انبار لگا تھا۔ لیکن ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنے صندوقوں کی شکل نہ پہچان سکتا تھا۔ رہے عالی مرتبت امرا اور معزز بیگمیں سو وہ بے شمار اشیاء جو اُن کے ڈبوں میں اُن کی کہ کر رکھی گئی تھیں اُن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ شال اور لبادے تختوں پہ پڑے تھے اور بس۔ اس پر ایک بڑا شور و غوغا ہوا۔ لیکن افسر اس کے عادی معلوم ہوتے تھے اور اُنھوں نے اس کی بالکل پروانہ کی۔ اسٹیشن ماسٹر نے جو ابھی تک ہماری نگرانی پر مقرر تھا مختصر طور پہ کہا کہ سیلونوں کا سامان دوسری ریل گاڑی پر روانہ کیا جائے گا۔ ان کے سابق مالکوں کو اب ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اب یہ ان کے دوستوں کو دے دیا جائے گا۔

سابق مالک ؟ تو کیا اب ہم حقیقی مالک نہ رہے تھے ؟ میرا ذاتی نقصان تو زیادہ نہ تھا۔ پھر مجھے اس کی تلافی کی بھی توقع تھی کیونکہ میں اپنا نام ایک عجیب سے صندوق پر لکھا ہوا دیکھ رہا تھا جو میز پر میرے سامنے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ میری طبیعت جستجو پسند واقع ہوئی ہے اس لئے اس تجربہ کی ندرت نے میری دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن بقیہ لوگوں کی سراسیمگی ناقابل بیان تھی۔ وزیر کو خیال ہوا کہ وہ بالشوکوں کے درمیان پہنچ گیا ہے جو ملکیت ذاتی کے قائل نہیں ہیں اور جماعتی زندگی کی ابتدائی شرائط پر تقریر کرنے ہی والا تھا کہ " خاموش ! خاموش !! " کی صدا بلند ہوئی اور تیسرے درجے کے مسافروں کو آگے بڑھنے کے لئے کہا گیا تاکہ اُن کا سامان کھولا جا سکے ہر آدمی کے سامان پر نہایت اہتمام سے یادداشت کی پرچی لگی ہوئی تھی۔ ڈھکنے خود بخود ایک دم کھل گئے۔ اندر دیکھا تو کپڑے، جوتے پہننے کا اور سامان، روپیہ زیور وغیرہ تو نظر نہ آیا۔ البتہ زندگی میں جو جو کام اُنھوں نے کئے تھے اُن کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ایک آمد و خرچ کے حساب کا رجسٹر بھی رکھا تھا جس میں اُن ایام کی تعداد درج تھی جن میں وہ مصروف محنت رہے۔ اُن کھیتوں کے نمبر اور رقبہ وغیرہ تھا جن میں اُنھوں نے ہل چلایا تھا، سینچائی اور زراعت کی تھی جن فصلوں کو کاٹا تھا جن دیواروں کی تعمیر کی تھی، جن دھاتوں کو کھود کر نکالا اور پگھلایا تھا اور اُن کی انسانوں کے لئے مفید اشیاء بنائی تھیں، جس چمڑے کی دباغت کی تھی جن کپڑوں کو سیا تھا۔ ان سب کا نہایت ٹھیک ٹھیک اندراج تھا۔ اور آمدنی کے صفحہ پر وہ اجرتیں

اور اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء کے وہ حصّے لکھے ہوئے تھے جو انھیں ملے۔ ان کے آمد و خرچ کے رجسٹر میں اُن چیزوں کے علاوہ جس پر لفظ "کام" کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے، اُن کے دوسرے اعمال و افعال کا بھی اندراج تھا مثلاً والدین اور بیوی بچوں سے محبت، خلوص و ایثار، خیر خیرات، پاکبازی، سچائی اور دیانت یا پھر وہ بدنما فہرست تھی جس میں گناہوں، گالیوں، شراب خواری، ظلم و بے رحمی اور دوسرے خراب اعمال کا اندراج کیا گیا تھا۔ لیکن ان اعمال کے متعلق مفصل تحقیقات حاکم بالادست کی عدالت کے لئے محفوظ کر دی گئی تھی۔ ابتدائی تحقیقات صرف اس بات تک محدود رکھی گئی تھی کہ ایک شخص نے عام منفعت کے لئے کیا کام کیا ہے۔ کس قدر اُس نے خدمت کی۔ اور جماعت نے اس کے معاوضہ میں اُسے کیا دیا۔ جب تک اس امتحان میں ایک شخص قابل اطمینان طریقہ پر کامیاب نہ ہوتا تھا اُسے آگے بڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اکثر فردوں کے حساب میں بقایا جماعت کے ذمہ نکلتا تھا۔ معاملہ اس قدر صاف تھا کہ جانچ کا کام بہت جلد ختم ہو گیا اور وہ اور ان کا سامان عدالت بالادست کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے صندوق خالی تھے جنھوں نے عمر بھر کوئی مفید کام نہ کیا تھا اور پوری زندگی چوری یا خیرات پر بسر کی تھی۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اسوقت تک علیحدہ کھڑے رہیں جب تک اور باقی ماندہ لوگوں کا مسئلہ طے نہ ہو جائے۔

اس کے بعد سیلونوں کے مسافروں کی باری آئی۔ ان میں اکثر جن کے پاس دکھلانے کو کچھ بھی نہیں تھا ایک ساتھ بلائے گئے اور اُن سے دریافت کیا گیا کہ انھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔ ایک خوش پوشاک امیر نے سب کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمام تحقیقات ہمارے لیے ایک معمہ ہے۔ میں اور میرے رفیق دولتمند گھروں میں پیدا ہوئے اور ہم نے زندگی میں داخل ہو کر اپنے آپ کو ہر قسم کی جاہ و ثروت کا مالک پایا۔ ہمیں کبھی نہیں بتایا گیا کہ ہم سے کسی دماغی یا جسمانی یا کسی قسم کی محنت کی توقع کی جاتی ہے۔ غریبوں کے لئے کام کرنا تو بلاشبہہ مناسب تھا کیونکہ کام کئے بغیر وہ دیانت داری سے زندگی نہ گذار سکتے تھے۔ لیکن ہم تو اپنا وقت تفریحوں میں جو عموماً بے ضرر ہوتی تھیں صرف کرتے تھے۔ جس قدر چیزیں ہمارے صرف میں آتی تھیں اُن کے ہم دام ادا کرتے تھے۔ ہم نے کبھی کوئی چیز نہیں چرائی۔ کبھی فریب و تہمت سے کسی چیز پر

قبضہ نہیں کیا ۔ ہم نے خداوند یسوع مسیح کے دسوں احکامات کی جب سے ہمارے اندر اُن کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوئی پوری پابندی کی ۔ مقرر نے کہا کہ کم از کم اپنے متعلق میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کسی ایک حکم کی بھی سرتابی نہیں کی اور مجھے یقین ہے کہ یہی بات میرے ہمراہیوں کی بابت بھی کہی جا سکتی ہے ۔ ہم سب شریف تھے لوگ ہماری تعریف کرتے تھے اور ہماری نیک چلنی سے سبق حاصل کرتے تھے ۔ ہم سے یہ دریافت کرنا کہ ہمارے اعمال کیا ہیں عقل و انصاف دونوں کے خلاف ہے ۔

افسر اعلیٰ نے جواب دیا "حضرات ! اس قسم کی باتیں ہم نے اکثر سُنی ہیں ۔ لیکن جواب کی اس یکسانیت سے ہماری حیرت کی تازگی میں ابھی تک کمی واقع نہیں ہوئی ہے ۔ آپ لوگ ایسی دنیا میں تھے جہاں زندگی کی پہلی شرط محنت و عمل ہے ۔ کسی شخص کو اُس وقت تک ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں آسکتا جب تک اُس کے حاصل کرنے کے لئے محنت نہ کی جائے ۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ کھانے کے مستحق ہیں جو محنت نہیں کرتے انھیں فاقہ کرنا چاہئے ۔ زندگی کی ممکن صورتیں صرف تین ہو سکتی ہیں :۔ محنت ، چوری یا خیرات ۔ جن لوگوں نے زندگی گذارنے کے لئے پہلی صورت اختیار نہیں کی اُنھوں نے لازماً بقیہ دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ۔ اپنے آپ کو آپ چاہے کتنا ہی ارفع و بلند کیوں نہ سمجھیں لیکن یہاں سے آپ اُس وقت تک نہیں گذر سکتے جب تک اپنی پیدا کی ہوئی کوئی چیز پیش نہ کریں آپ کو آپ کی اُجرت پہلے ہی مل چکی تھی اور اُجرت بھی کمائی سے زیادہ جس کا آپ سب کو خود اعتراف ہے ۔ اب بتلائیے آپ کے پاس دکھلانے کے لئے کچھ ہے ؟

" اجرت " مقرر نے کہا " ہم کسی کے تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں ۔ ہمیں کسی قسم کی کوئی اجرت کبھی نہیں ملی ۔ جو کچھ ہم نے خرچ کیا وہ ہمارا تھا ۔ احکام ہمیں صرف یہ ملے تھے کہ ہمیں برائی سے پرہیز کرنا چاہئے چنانچہ ہم نے بُرائی نہیں کی ۔ میں عدالت بالادست سے اپیل کرتا ہوں "۔

لیکن اپیل منظور نہیں کی گئی ۔ تمام اُن لوگوں کے لئے جن کے صندوق خالی تھے اُن کے جاہ و منصب کا خیال کئے بغیر اور بلا اس بات کا لحاظ کئے ہوئے کہ آپس میں انھیں ایک دوسرے کی سیرت کتنی پاکیزہ نظر آتی ہے صرف ایک قطعی جواب تھا " داخلہ اُس وقت تک بند ہے جب تک آپ اس سے بہتر

سامان نہیں دکھلا سکیں گے" تمام وہ لوگ جو اس حالت میں مبتلا تھے۔ ان میں نواب بھی تھے اور بیگم بھی سب کو چوروں کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیگم نے کہا کہ میری دعوتیں تو اس موسم میں سب سے بہتر رہیں اور چونکہ یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی کہ ان میں شریک ہونے سے لوگوں کو سخت کوفت ہوتی تھی تو تھوڑی دیر کے لئے اس بات کے متعلق شبہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے ان کے سبب سے اس قسم کی تفریحی تقریبوں کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوئی ہو اور اس طرح نادانستگی میں بھلائی کا ایک پہلو پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن اس کی بھی کوئی شہادت فراہم نہ ہو سکی۔ دنیا ان تقریبوں میں اس لئے شریک ہوتی رہی کہ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور بیگم اور اس کے تمام مہمانوں سے جماعت کو کوئی نفع نہ پہنچ سکا۔ سیلونوں کے اکثر مسافروں کے معاملات کا یوں تصفیہ ہوا۔ وزیر، لاٹ پادری، وکیل ساہوکار اور دوسرے لوگ جن کے پاس ہر چند کوئی مادی خدمت تو دکھلانے کے لئے نہ تھی لیکن پھر بھی چونکہ اپنے مختلف پیشوں میں یہ محنت کے ساتھ مصروف رہے تھے اس لئے ان کا معاملہ عدالت بالادست کو منتقل کیا گیا۔

اس کے بعد ہماری باری آئی یعنی دوسرے درجے والوں کی اور ہم لوگ بہت متفرق قسم کے تھے۔ مصروف تو ہم سب رہے تھے جیسا اُن بیشمار اشیاء سے ظاہر تھا جن پر ہمارے نام لکھے ہوئے تھے آجروں کے ساتھ اُن کی مصنوعات تھیں، مختاروں کے ساتھ اُن کے مقدمے تھے۔ ڈاکٹروں اور پادریوں کے ساتھ وہ اجسام اور روحیں تھیں جنھیں اُنھوں نے بچایا یا کھویا مصنفوں کے ساتھ ان کی کتابیں تھیں صناعوں اور بت سازوں کے ساتھ اُن کی تصویریں اور مجسمے تھے۔ لیکن جو کچھ ہم نے پیدا کیا تھا اُس کی جانچ سختی کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ ایک طرف تو اُن اُجرتوں کو رکھا جاتا تھا جو ہمیں ملیں اور دوسری طرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ ہماری محنت سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہنچا اور ہر چند ہمارا سامان سامنے رکھا ہوا بہت وسیع نظر آتا تھا۔ لیکن جانچنے سے معلوم ہوا کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو اجرت اپنے واقعی استحقاق کی نسبت بہت زیادہ ملی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے پیرس کی نمائش کا ایک بڑا کمرہ یاد آ گیا جہاں ایک محنتی آدمی نے انگریزی ادب کی موجودہ حالت دکھانے کے لئے ایک سال میں جس قدر کتابیں رسالے اور اخبارات شایع ہوئے تھے اُن

سب کی ایک ایک جلد جمع کر رکھی تھی۔ اس سے کتابوں کا ایک انبار لگ گیا تھا جو لوگوں کے مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن فائدہ کی اعتبار سے کتابوں کی اہمیت کا اظہار پورے اعداد میں نہیں بلکہ اعشاریوں میں کیا جا سکتا تھا اور مستقل قدر و قیمت کے اعتبار سے تو یہ تمام انبار صفر سے بس کچھ یونہی ایک ادنےٰ ترین کسر کے برابر یا دہ تھا۔ ہم میں سے کچھ جو بہ ظاہر خاصے معزز معلوم ہوتے تھے فوراً چوروں کے زمرہ میں شامل کر دیئے گئے مثلاً صراف اور دلال جن کا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ روپیہ ایک سے لے کر دوسرے کو دے دیں اور درمیان میں کچھ رقم خود ہضم کر لیں۔ پادری جنھوں نے وہ اخلاقی تعلیمیں دیں جن پر خود عمل نہ کرتے تھے۔ خوش بیان مقرر جنھوں نے ایسی تقریریں کیں جنھیں وہ جانتے تھے کہ محض ابلہ فریبی ہے۔ فلسفی جنھوں نے نظام کائنات کے متعلق مکڑی کی طرح عجیب عجیب جالے بنا ڈالے۔ ممتاز وکلا جنھوں نے قانونی موشگافیوں میں انصاف کا خون کر ڈالا۔ مصنف جنھوں نے ایسے موضوع پر کتابیں لکھیں جن کی نسبت ان کا منبع علم بس اسقدر تھا کہ دوسروں کو گمراہ کر سکیں۔ سامان تعیش کے فروخت کرنے والے جن کے مال سے انسانی صحت و توانائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ طبیب اور دوا فروش جنھوں نے اُن چیزوں سے واقفیت کا دہوکہ دیا جن کی بابت وہ خوب جانتے تھے، کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ سب کے سب اپنے صندوقوں کی مخالف شہادت کے بعد غیر مقبول گروہ میں دھکیل دیئے گئے۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کا حساب نسبتاً بہتر تھا جنھوں نے کم از کم حقیقی قدر و قیمت کی چیزیں تو پیدا کی تھیں۔ لیکن اُجرت کے مسئلہ پر یہ بھی خارج کئے گئے۔ جن اچھے لوگوں نے انکسار سے کام لیا وہ نقصان میں رہے اور جو لے اصولے اور بہ ظاہر مرد معقول معلوم ہوئے اُن کی خوب عزت و توقیر ہوئی اور وہ مالدار ہو گئے۔ وہ منظر سخت دردناک تھا اور اسے دیکھ کر ہم میں سے اکثر کو تعجب بھی ہوا جب ہمیں دکھلایا گیا کہ ہم نے کس قدر دغا بازی سے کام کیا تھا۔ اپنی شکر میں کتنی ریت، اپنے دودھ میں کتنا پانی ملایا اور اپنے بڑھئی اور راج کے کام میں لفظاً اور استعارۃً کتنا فریب کیا تھا۔ کس طرح تمام کاموں میں ہم اچھی چیز بنانے کا کم اور نفع کا زیادہ خیال کرتے تھے کس طرح ہم محض اس لئے کہ پبلک جھوٹ سے خوش ہوتی اور سچ کو گراں اور تکلیف دہ پاتی تھی ہم اپنے آپ کو دروغ بیانی اور ریاکاری کے لئے فروخت کیا کرتے تھے۔

ہم میں سے بعض لوگوں کی بد معاملگی جنھوں نے سستا خریدا اور مہنگا بیچا۔ جھوٹے وزن اور پیمانے استعمال کئے۔ روئی کو اون، سن کو ریشم، ٹین کو چاندی کہکر بیچا، بالکل واضح اور ظاہر تھی۔ ان سب کی جانچ پڑتال جلد ہی ہوگئی اور انھیں اپنے رفیقوں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ صرف اُن ہی لوگوں کو سرٹیفکٹ دیا گیا جن کی مجموعی خدمات اُس معاوضے سے زیادہ تھیں جو انھیں ملا تھا۔ جب میرا صندوق کھولا گیا تو میں نے دیکھا کہ ہر چند میری اُجرت کم تھی لیکن میرا کام اُس سے بھی زیادہ کم تھا مگر مجھے سند مل گئی جسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔

اسی وقت ایک ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریل میں لائن پر آئی اور آدھے گھنٹے ٹھیر کر روانہ ہونے والی تھی۔ جن لوگوں کو خارج کر دیا گیا تھا اُن سے کہا گیا کہ وہ اس گاڑی پر اُس جگہ بھیج دیئے جائیں گے جہاں وہ ابتداءً جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھیں اس خبر سے بڑی تسکین ہوئی۔ لیکن روانگی سے بیشتر اُن سے کچھ سوال اور کئے گئے اور کچھ ایسی تبدیلیاں کی گئیں جن سے اُن کی مستقبل کی زندگی اثر پذیر ہوسکتی تھی۔ اُن سے پوچھا گیا کہ تم ایسے نکمے کیسے ہوگئے۔ انھوں نے جواب بہت سے دیئے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے سب یکساں تھے۔ حالات اُن کے خلاف تھے تمام خرابیاں حالات کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ اُن کی تربیت ناقص ہوئی۔ وہ ایسے ماحول میں تھے جہاں اس سے بہتر وہ کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ امیر لوگوں نے اپنے ابتدائی جواب کو دوہرایا کہ ہم سے کبھی کسی نے نہیں کہا کہ تم سے بھی کام کی توقع کی جاتی ہے۔ ہماری تمام احتیاجات کی تکمیل کا انتظام تھا۔ ایسی حالت میں جب ہمیں کام کی طرف مایل کرنے کے لئے کوئی محرک موجود نہ تھا یہ توقع کرنا کہ ہم از خود کام کریں گے سخت ناانصافی ہے۔ اگر ہم غریب پیدا ہوتے تو معاملہ سب ٹھیک رہتا وہو کہ باز تاجروں نے کہا کہ ایک دوکاندار کا پہلا فرض تمام رائج الوقت اصول تجارت کے مطابق یہ تھا کہ وہ روپیہ پیدا کرے اور اپنی حالت کو بہتر بناتا رہے۔ اشیاء کی اچھائی اور برائی کو جانچنا خریداروں کا کام تھا۔ دوکانداروں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی اشیاء مہنگے سے مہنگے داموں فروخت کریں۔ اس موضوع پر جتنے مستند لکھنے والے ہیں سب کا یہی اعتقاد تھا اور اسی کی وہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ مقرروں، واعظوں، اخبار نویسوں، ناول نگاروں وغیرہ وغیرہ نے جن کی تعداد کثیر تھی کہا کہ ہم عوام کے اُن گروہوں سے اپیل کرتے تھے جو ہماری باتیں سننے آتے تھے یا ہماری کتابیں خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ "جس چیز کی طلب ہو وہ مہیا کرو" یہ

اصول تمام اصولوں سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے دنیا کو وہی دیا جس کی اُسے طلب تھی اور جسے وہ پسند کرتی تھی ہم نے اپنی پوری اہلیت اور طاقت اسی کوشش میں صرف کر دی اب ہمیں یہ الزام دینا کہ ہم دنیا کی رائے پر کیوں چلے بہت سخت ہے۔ چوروں اور بدمعاشوں نے کہا کہ ہم دنیا میں بغیر اپنے ایما اور مرضی کے پیدا ہوئے۔ ہم نے کبھی اس کی تمنا نہیں کی تھی۔ اس میں شک نہیں جب ہمیں موقع ملتا تھا۔ تفریح کیا کرتے تھے لیکن زندگی کو بصورت مجموعی ہم اپنے لئے ایک وبال سمجھتے تھے اور اس سے نجات پانے کے لئے ہم بہ خوشی تیار تھے۔ لیکن جب زندہ رکھے جاتے تھے تو زندہ رہتے تھے اور جہاں تک ہماری عقل و فہم کی رسائی تھی ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں دنیا کی اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا اگر وہ ہمیں مل سکیں ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا کسی اور شخص کو ہو سکتا ہے۔ ہمیں چور کہا جاتا تھا۔ قانون اور زبان دولتمند لوگوں نے بنائی تھیں جو ہمارے فطری دشمن تھے۔ اگر جماعت نے ہمیں ایمانداری سے زندگی گذارنے کے وسائل فراہم کئے ہوتے تو ہمارے لئے ایماندار بننا سہل ہوتا۔ جماعت نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا ہم جماعت کے لئے کیوں کچھ کرتے ؟

یوں یہ ناکام لوگ اپنے اپنے مختلف انداز میں مدافعت کرتے رہے۔ سب کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ انھیں ایک موقع اور دیا جائے گا اور یہ دیکھ کر میری تفریح ہوئی کہ ہرچند کچھ لوگوں نے بہانہ کیا تھا کہ ہم پیدا ہونا نہ چاہتے تھے اور اگر ہمیں انتخاب کا موقع دیا جاتا تو ہم پیدا نہ ہوتے لیکن جب واپس بھیجے جانے لگے تو کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ جس بات کی اُنھوں نے خواہش کی وہ صرف اس قدر تھی کہ انھیں نئی حیثیت دی جائے اور غیر موافق اثرات سے آزاد کیا جائے۔ مجھے توقع یہ تھی کہ ان غیر موافق اثرات کے ضمن میں وہ اپنی طبیعت کے نقایص کا بھی تذکرہ کریں گے۔ میری ذاتی رائے یہ تھی کہ آدمیوں کی نصف بداعمالیوں کا سبب سیرت کی موروثی خرابیاں ہوتی ہیں جنھیں لوگ دنیا میں اپنے ساتھ لاتے ہیں اخلاقی جرأت، سلامت روی اور عملی استعداد کو جس قدر "عطیہ فطرت و حالات" کہنا ٹھیک ہے اسی قدر اتفاق و خوبی قسمت سے منسوب کرنا بھی درست ہے۔ تمام دوسری تبدیلیوں کے مقابلہ میں طبیعت کی تبدیلی کے نتیجہ خیز ثابت ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ لیکن اُن لوگوں کو اپنی طبیعت سے کوئی

شکایت نہ تھی وہ صرف اپنے ماحول میں تبدیلی چاہتے تھے ۔ یہ تبدیلیاں فوراً کردی گئیں ۔ بیگم کو ایک مزدور کے جھونپڑے میں زندگی شروع کرنے کے لئے بھیجا گیا اور دیہاتی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تاکہ اس میں ایک اچھی خادمہ بننے کی صلاحیت پیدا ہوسکے ۔ معزز شریف آدمی کو ہل چلانے کا کام سپرد کیا گیا ۔ مصنف اور واعظ کو کاریگر بنایا گیا اور بڑھئی اور لوہار کے ساتھ کام کرنے کے لئے لگا دیا گیا ۔ ایک فلسفی جو دولتمند اور تندرست تھا اور اس لئے اس بات پر اصرار کیا کرتا تھا کہ دنیا کو جس قدر اچھا ہونا چاہئے اتنی ہی اچھی ہے ۔ اس سے زیادہ اچھے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اُسے اندھا اور مفلوج بناکر بھیجا گیا تاکہ وہ ان نئے حالات میں زندگی کے فلسفہ پر غور کرسکے چور اور دھوکہ باز جو یہ بہانہ کرتے تھے کہ اُن کی بُرائیاں غربت کی وجہ سے ہیں انھیں موقع دیا گیا کہ وہ جب دنیا میں پہنچیں تو اپنے آپ کو محلوں میں تعیشات کی آغوش میں پائیں ۔ جام فراموشی سب کو پلادیا گیا ۔ ماضی مٹ گیا ۔ سب لوگ ریل گاڑی میں جلدی جلدی بٹھائے گئے ۔ انجن نے سیٹی دی اور ریل انھیں لے کر روانہ ہوگئی ۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا " چند سال بعد یہ لوگ پھر یہاں آئیں گے اور اسی قصہ کو پھر دوہرائیں گے ۔ یہی لوگ بیسیوں دفعہ میرے پاس آچکے ہیں ۔ انھیں آزمائش کے لئے مختلف مواقع دئیے جاچکے ہیں اور ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں کرسکے ہیں اور جب آتے ہیں حالات و واقعات کی شکایت کرتے ہیں ۔ میں اپنی طرف سے تو اس جھگڑے کو بالکل ختم کردینا چاہتا ہوں "

میں نے دریافت کیا " یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا "

اُس نے کہا " اسے میں نہیں بتلا سکتا ۔ یہاں سے کوئی شخص گذرنے نہیں پاتا جب تک وہ یہ ثابت نہ کردے کہ اس کی زندگی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے ۔ جو بہت زیادہ خراب ہیں انھیں میں نے مینڈھے اور بطخ بنتے دیکھا ہے تاکہ ان پر چربی چڑھا کر چڑھا کر بعد میں کھایا جائے اور اس طرح مفید بنایا جائے ۔ کچھ گدھے بنادئیے جاتے ہیں تاکہ سامان ڈھوتے [illegible] مار کھاتے [illegible] اور سینکڑوں نسلوں تک اپنے ہی قسم کے گدھے پیدا کرتے رہیں ۔ تمام زندہ مخلوق آخر میں وہی صورت اختیار کرلیتی ہے جو اُس کی سیرت کے مطابق ہوتی ہے "

گاڑی نگاہ سے اوجھل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک دوسری گھنٹی بجی۔ منظر بالکل اس طرح بدلا جیسے تھیٹر میں بدلتا ہے۔ پردہ ہٹا یا گیا اور ہم میں سے جو باقی رہ گئے تھے اُنھوں نے اپنے آپ کو چار تین صورت آدمیوں کے سامنے پایا جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کالجوں میں ممتحنین کا بورڈ ہوتا ہے۔ ہمیں ایک ایک کرکے باری باری سے بلایا گیا۔ جو کام پہلی دفعہ جانچا جا چکا تھا اُسے دوبارہ دیکھا گیا اور اس کی نوعیت کا مقابلہ صانع کی اہلیت اور قابلیت سے یہ معلوم کرنے کے لئے کیا گیا کہ کس حد تک اس نے کام کو اپنی پوری قوت سے کیا ہے۔ آیا جیسا وہ کرسکتا تھا یا کرنا جانتا تھا اُس سے خراب کیا ہے یا بہتر۔ پھر اس کے علاوہ دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ بُرائیوں، گناہوں، خود غرضیوں، بدمزاجیوں کا موازنہ فرض شناسی، محبت، مروت، مہربانی اور خیرات کے اُن اعمال وافعال سے کیا جا رہا تھا جن سے اس کے احباب کی خوشیوں میں اضافہ اور رنجوں میں کمی ہوئی۔ آخرالذکر کو میں نے دیکھا کہ اُن کے مالک فراموش کرچکے تھے اور تعجب سے دیکھ رہے تھے اور اپنے کو مستحق نہ سمجھ کر اُن کے قبول کرنے سے انکار کرنا چاہتے تھے۔ پھر نوعیت اور خوبی کے لحاظ سے مادی اور اخلاقی کاموں کے مختلف مدارج تھے۔ بالکل بے کار تو کوئی چیز نہ تھی لیکن کوئی چیز بھی حتیٰ کہ بڑے سے بڑے صناع اور پیر طریقت کی کارگذاریاں بھی تکمیل مطلق کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے نتیجہ لئے عمل پر ابتدائی جاہلانہ کوششوں سے انتہا کے اُن آخری نمونوں تک جنھیں ہم اپنی اعلیٰ ترین کامیابی باور کرتے تھے نظر ڈال رہا تھا۔ اس بات کا پتہ چلانا سہل تھا کہ کتنے نقائص ہماری قدرتی خامیوں کی وجہ سے تھے اور کتنے خودسری، زعم باطل اور سہل انگاری کی بنا پر۔ کچھ آمیزش کمینے پن کی بھی تھی۔ کچھ نفع کا لالچ، تعریف، شہرت اور دولت کی خواہش بھی تھی اُن حالتوں میں جہاں تکمیل کا کوئی موقع نہ تھا کچھ نادانی کا جذبہ تسکین بھی تھا۔ اور بعض نہایت خوبصورت اشیا محض ان اسباب کی وجہ سے داغدار نظر آتی تھیں۔

یہ بات اس قدر واضح اور صاف تھی کہ ایک مخلص اور وضیع صورت شخص نے جس کا کام جانچنے سے ہم میں سے اکثر کے مقابلہ میں بہتر ثابت ہوا تھا تاثر کی حالت میں چلا کر کہا "جہاں تک میرا تعلق ہے ممتحنین کو زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں ہی مجھے اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے،

لیکن کبھی بھی مجھ سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔ میں نے کوشش جاری رکھی۔ اپنی موٹی موٹی خرابیوں کو رفع کیا لیکن جتنا میں آگے بڑھتا رہا اور زیادہ بہتر طریقہ پر کام کو انجام دیتا رہا اتنا ہی میرا علم اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرتا رہا۔ اور جتنے میرے زندگی کے ایام بڑھتے رہے میری خامیاں مجھ پر زیادہ بدبختی کے ساتھ ظاہر ہوتی رہیں۔ اگر مجھے آخر میں کمال حاصل بھی ہو جاتا تو بھی ماضی کی یاد کو تو میں اپنے دل سے نہ مٹا سکتا تھا نوجوانی کی خطائیں میرے خلاف برابر شہادت دیتی رہتیں اور مجھے مطعون کرتیں۔ اسی بنا پر مجھے اپنی ذات سے نفرت ہے۔ میرا کوئی ہنر ایسا نہیں ہے جس کے معاوضہ میں مجھے رعایت کی توقع ہو۔ میں نے آخر وقت تک محنت کی ہے، لیکن اس علم کے ساتھ کہ میں جو بہترین چیز بھی پیش کرنا چاہوں گا وہ قبول کئے جانے کے لائق نہ ہوگی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا اور مجھے اس بات پر اعتقاد تھا کہ ایک اعلیٰ روح جو خطا اور عیب سے پاک تھی میری خاطر میرا کام انجام دے چکی ہے اور اس کا کام مکمل تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں اپنے ذاتی حساب کے سب مطالبے ترک کر دوں تو جو کچھ وہ دوسری روح کر گئی ہے اس کے واسطے سے میرا شمار بھی مقبول لوگوں میں ہو جائے گا۔ مجھے اعتماد تھا کہ یہ سچ ہے اور یہی میرا واحد سہارا تھا۔ جو اچھے اعمال مجھ سے منسوب کئے گئے ہیں اُن میں اچھا دراصل کوئی بھی نہیں ہے۔ ایک بھی بالکل ویسا نہیں ہے جیسا اُسے ہونا چاہئے تھا۔"

وہ یہ سب باتیں خلوص کے ساتھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ وہ کہتا تھا بلا شبہ صحیح تھا اس کے لئے بھی صحیح تھا اور تمام دوسرے آدمیوں کے لئے بھی۔ لیکن اس سپردگی میں بھی ایک شائبہ اُس آمیزش کا پایا جاتا تھا جس کا وہ اعتراف کر رہا تھا۔ وہ مناظر تھا اور اُس کی تمام عمر اسی قسم کی بحثوں میں صرف ہوئی تھی اور اس عقیدہ کی حمایت سے ہی اُسے شہرت حاصل ہوئی تھی۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتا تھا لیکن اس بات کو ابھی تک نہ بھول سکا تھا کہ وہ خود ہی اس عقیدہ کا علمبردار بھی ہے۔

ممتحن نے مہربانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ لیکن اس طرح جواب دیا "ہم ناممکنات کی توقع نہیں کرتے اور جو کام تمہاری طاقت سے زیادہ تھا اُس کے نہ کرنے پر تمہیں الزام نہ دیں گے۔ کام کو تکمیل کے ساتھ وہی انجام دے سکتے ہیں جو خود مکمل ہوتے ہیں۔ انسان عاجز اور جاہل پیدا ہوتا ہے۔ وہ دنیا میں خوشگوار چیزیں دیکھ سکے

حاصل کرنے کا رجحان لے کر آتا ہے لیکن جتنی چیزیں خوشگوار ہوتی ہیں وہ ہمیشہ اچھی نہیں ہوتیں ۔ انسان جیسے اور سبق سیکھتا ہے ایسے ہی زندہ رہنے کے طریقوں کو بھی سیکھتا ہے ۔ ابتدا میں وہ ایک بھی نیک عمل نہیں کر سکتا ۔ لیکن تعلیم اور مشق سے وہ ترقی کرتا ہے جو بہترین لوگ ہوتے ہیں وہ بھی درجہ کمال تک نہیں پہنچ پاتے ۔ ان کی رسائی بھی محدود ہوتی ہے ۔ لیکن ہم ایک نقاش کی تنقیص اس کی ابتدائی تصویروں کو دیکھ کر اگر وہ تصویریں اتنی ہی اچھی ہوتی ہیں جتنی کہ اس کے ہم عمر لوگوں سے توقع کی جاتی ہے نہیں کرتے ۔ ہر صناع آہستہ آہستہ مہارت پیدا کرتا ہے ابتدا خراب ہوتی ہے اور اس پر اسے اختیار نہیں ہوتا ۔ یہی حال زندگی کا ہے ۔ چلنا گر کر ہی سیکھا جاتا ہے ۔ زندہ رہنا بھی گمراہی اور اس کے نتائج برداشت کر کے سیکھا جاتا ہے ۔ ایک شخص کے خلاف ہم اس کی نوجوانی کے گناہوں کا اندراج نہیں کرتے اگر وہ ایمانداری سے ترقی کی کوشش کو جاری رکھتا ہے ۔ ضبط نفس کا اتنا مطالبہ ہم بچے سے نہیں کرتے جتنا جوان آدمی سے کرتے ہیں ۔ سب لوگوں سے ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ ایک ہی طرح کی عادتیں حاصل کریں ۔ کچھ لوگوں کی تعلیم اچھی ہوتی ہے بعض کی بری ہوتی ہے بعض کی بالکل نہیں ہوتی ۔ کچھ لوگ فطرتاً نیک سرشت ہوتے ہیں کچھ بدسرشت ۔ کوئی بھی مکمل طریقہ پر احکام کی بجا آوری نہیں کر سکتا ۔ اس لئے ناکام رہنا کوئی جرم نہیں ہے خطاؤں میں انھیں چیزوں کا شمار کیا جاتا ہے جو ارادتاً ، کاہلی ، خود غرضی اور جان بوجھ کر نیکی کی جگہ بدی کو اختیار کر کے کی جائیں ۔ ہر شخص کے متعلق فیصلہ اس کی استعداد کے مطابق کیا جاتا ہے ۔"

میری بڑی تفریح ہوئی جب میں نے دیکھا کہ لاٹ پادری ممتحن کی اس گفتگو سے بڑے خوش نظر آ رہے تھے ۔ ایک آدمی کی بخشش میں اعمال نیک کا جو حصہ ہے اس کے متعلق وہ اسی معزز آدمی سے خود بھی بحث کر چکے تھے ۔ ممتحن نے اپنے تبصرہ میں ہر چند ان کی طرفداری تو نہ کی تھی لیکن ان کے مخالف کا بہر حال قلع قمع کر دیا تھا ۔ لاٹ پادری نے بحث کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس میں معلوم ہوتا ہے کہ بڑی بے توجہی اور لاپرواہی سے کام لیا تھا کیونکہ ہر چند ان کی کتابیں بہت ضخیم تھیں اور کئی جلدوں میں تھیں لیکن پھر بھی ان کا وزن بہت کم تھا ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں چند اچھے کام نہ کئے ہوتے مثلاً کالج میں اپنی بیوہ ماں کو اپنے خرچ کے بار سے بچانے کے لئے فاقے نہ کئے ہوتے تو میرا یہ

خیال ہے یہ دنیا میں دوبارہ گرجا کے منشی بناکر بھیجے جاتے۔

اس تمام دوران میں میرے دل میں چند سوالات پیدا ہو رہے تھے جن کا جواب میں دریافت کرنا چاہتا تھا اور بولنے کی بار بار ہمت کر رہا تھا۔ میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ "فطری شرست" سے متعلق کیا مراد تھی۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ ایک شخص تو فطرتاً ولی اور پیرو مرشد بننے کی اہلیت لے کر پیدا ہوتا ہے اور دوسرا انقاس یا ماہر موسیقی کی۔ نیز یہ کہ جس شخص میں طبعاً جتنی اہلیت نشوونما کی ہوتی ہے اتنی ہی وہ ترقی کرتا ہے۔ پھر یہ کہ کاہلی، خودسری، خودغرضی وغیرہ وغیرہ بھی کیا فطرتاً سرشت میں داخل ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو ——— لیکن اسی وقت گھنٹی بجی اور میرا نام پکارا گیا۔ میں کون تھا اس کے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ہر شخص کا حلیہ، اس کی تاریخ، مختصر یا طویل اور جو کچھ اس نے کہا اور کیا علانیت کے سامنے اس قدر واضح شکل میں موجود ہوتا تھا کہ کسی سے زبردستی اقرار کرانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فہرست سامنے رکھی تھی اور اس کے ایک تکلیف دہ حد تک طویل خانہ میں نہایت بے دردانہ غیر جانب داری کے ساتھ میرے تمام برے اعمال درج کئے ہوئے تھے۔ جو چند اچھے اعمال تھے ان میں ذاتی غرض کی آمیزش تھی جس سے بہترین اعمال بھی داغدار ہو گئے تھے۔ کام کے نمونوں میں کتابوں اور دوسری تحریروں کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ انھیں جانچنے کے لئے پھیلایا گیا صفحات پر ایک سیال شے ڈالی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے غلط بیانات تھے وہ یک قلم محو ہو گئے اور جتنے آدھے صحیح اور آدھے غلط تھے ان کے نقوش غلط بیانی کی نسبت سے دھندلے ہو گئے۔ افسوس! باب کے باب اس طرح غائب ہو گئے۔ اوراق بالکل سادہ ہو گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمپوزیٹروں نے ان پر چھاپنے کے لئے کبھی ٹائپ کو ترتیب ہی نہ دیا تھا جن پیراگرافوں پر میں اپنے دل میں ناز کیا کرتا تھا وہ پھیکے اور ناقابل مطالعہ ہو گئے۔ لیکن عبارت کے کچھ ٹکڑے طویل فاصلوں پر کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے۔ یہ وہ تھے جن پر میں نے بہت کم محنت کی تھی اور جنھیں میں تقریباً بھلا چکا تھا یا وہ تھے جن کو ہفتہ وار اخباروں نے خصوصیت کے ساتھ ملامت کیلئے منتخب کیا تھا جہالت، تعصب، لاپروائی، عدم استقامت (جو ہرچند قابل گرفت تھی لیکن انتہائی حد تک قابل گرفت نہ تھی) ——— سب ہی میں پانی کی آمیزش یعنی معمولی غیر اہم، تمیں اور پامال جذبات ——— بس یہی

میرے بدترین گناہ تھے اور مجھے یہ معلوم کر کے ایک ناقابل بیان اطمینان ہوا۔ اگر نالایق مطلق کا الزام مجھ پر عاید کیا جاتا تو جس شدت کے ساتھ ذلت کا احساس اُس وقت مجھ پر طاری تھا اُس کی بنا پر میں فوراً جرم کا اقرار کر لیتا۔ لیکن معاملات جتنے ہونے چاہئیں تھے اُتنے خراب نہ تھے۔ میں دل میں خوش ہو رہا تھا کہ جب اجرت کا سوال آئے گا تو نفایا میرے حق میں نکلے گا۔ اتنے سالوں کی محنت اور ناشتہ کے پاس سے صرف فلاں فلاں چیک —— کم از کم اس جگہ میں محفوظ تھا اور مجھے پوری اُمید تھی کہ یہاں سے ضرور بچ نکلوں گا۔ مستحن اپنے انداز و طریقہ سے خوش طینت معلوم ہوتا تھا۔ ایک نقاد جو میری سزا سننے کا منتظر تھا تلخ کامی کے ساتھ مایوس ہو چکا تھا کہ یکبارگی عدالت کی ایک دیوار بالکل شفاف ہو گئی اور جانوروں کا ایک غیر مختتم انبوہ نظر آنے لگا۔ یہ خاکی اور آبی دونوں قسم کے تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب وہ جانور تھے جنھیں میں نے اپنے زمانہ حیات میں اپنی ناکارہ لاش کو برقرار رکھنے کے لیے ہضم کیا تھا وہ قطار در قطار کھڑے تھے۔ اُن کے چہروں سے سنجیدگی اور ملامت ظاہر ہو رہی تھی بیل، بچھڑے، بھیڑ بکرے، ہرن، خرگوش، پیرو، بطخ، چوزے، تیتر، مرغے، بٹیر، حتے کہ چنڈول گوریا اور کلچڑی بھی جنھیں میں نے بچپن میں مار کر ہنڈکلیا پکائی تھی —— ہر ایک اپنے قاتل کے خلاف شہادت دینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ دریا اور سمندر سے رہو، بام، سنگھاڑا، ڈولی، سول، لونچی، موری، مہاشیر، جھینگا وغیرہ آئی تھیں۔ یہ سب جانور لاکھوں کی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ ان سب کو میں نے کھایا تھا۔ اجرت پر گفتگو کرنے کا اب کیا موقع رہا تھا۔ یہی میری اجرت تھی۔ اتنی بڑی لاگت لگا کر میرا وجود قائم رکھا گیا تھا۔ ایک بارہ سنگھے نے سب کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا "ہم سب کو اس بالانوش کا دوزخ بھرنے کے لئے قربان کیا گیا تاکہ وہ کا غذوں کے اُن نخشے مُردوں کو سجھ سکے جو اس کی کل کائنات ہیں۔ اپنی زندگی ہمیں عزیز تھی۔ مرغزاروں اور چراگاہوں میں، ہوا اور پانی میں، ہم معصوم اور بے ضرر طریقہ پر گھومتے پھرتے تھے۔ خوشگوار دھوپ سے، آسمانی نور اور چمکدار لہروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہماری قیمت زیادہ نہ تھی نہ ہمیں اس بات کا گھمنڈ ہے کہ ہماری جنس اعلیٰ تھی۔ اگر یہ شخص جو یہاں جواب دینے کے لئے کھڑا ہے اس بات کو ثابت کر دے

کہ کائنات میں اس کی قیمت اُن تمام مخلوقات کے برابر تھی جو اس کے زندہ رکھنے کے لئے قربان کی گئیں تو ہم اپنی فریاد واپس لے لیں گے۔ اس قسم کا اعلان ہو جائے۔ ہم اپنی تعداد کو دیکھیں گے اور اس فیصلہ پر تعجب کریں گے اور اپنی شکایت واپس لے لیں گے۔ لیکن ہم اپنی طرف سے اتنی بات ضرور آزادی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اسے اور اس کے ہم جنسوں کو دیکھا ہے اور ہماری فہم اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ انسان کی افضلیت اور برتری کا کیا سبب ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ سب سے زیادہ مکار، سب سے زیادہ تباہ کار اور بدقسمتی سے گوشت خوار جانوروں میں سب سے زیادہ زندہ رہنے والا حیوان ہے۔ اسے جان لینے میں لطف آتا ہے۔ جب اُس کی اشتہا سیر ہو جاتی ہے اس وقت بھی یہ تفریحاً ہمیں مارتا رہتا ہے۔"

بیل، بھیڑ، چڑیا اور مچھلی سب نے اپنی اپنی زبان میں اس تقریر پر اظہار پسندیدگی کیا۔ میری حالت یہ تھی کہ گونگا اور مجرم بنا کھڑا تھا۔ سوائے ایک جواب کے اور دوسرا کیا ہو سکتا تھا۔ اگر عدالت کی کرسی پر میں ہوتا تو مجھے بھی فیصلہ میں تامل نہ ہوتا۔ مہلک سزا کا اعلان ہونے ہی والا تھا کہ تمام منظر دھندلا ہو گیا، ایک ناقابل فہم شور سنائی دیا۔ حالت میں تبدیلی ہوئی۔ قدموں کی چاپ اور بہت سی آوازیں سنائی دیں میری آنکھ کھل گئی۔ میں ریل کے ڈبہ میں تھا۔ دروازہ کھلا۔ قلی سامان نکالنے کیلئے داخل ہوئے لوگ پلیٹ فارم پر تھے۔ ابتداً جس جگہ جانیکا ہمارا ارادہ تھا ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ گاڑیاں اور تانگے انتظار کر رہے تھے۔ چپراسی نواب اور بیگم کی امداد کے لئے بڑھے۔ اسٹیشن ماسٹر ہاتھ میں ٹوپی لئے مؤدبانہ سلام کر رہے تھے۔ وزیر کا معتمد خاص اپنے معزز سردار کے خیر مقدم کے لئے موجود تھا اور یہ سوچ کر کہ ڈاک کے مطالعہ کے لئے وزیر کس درجہ مضطرب ہو گا ڈاک کا سرخ ڈبہ اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ اپنی گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے نواب نے لاٹ پادری سے مصافحہ کیا اور کہا "کل ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ آپ سے اس کی تعبیر پوچھنا چاہتا ہوں۔"

لاٹ پادری نے کہا "میں بہت بہت معافی چاہتا ہوں کہ اس اعزاز کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ کانفرنس میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔ لیکن حضور والا کے لئے اور میرے لئے دنیا کے حقائق کو اتنی اہمیت حاصل کہ ہمیں خیال کی ان عجوبہ آفرینیوں پر غور کرنے کی کہاں مہلت و فرصت ہے۔" کو

جرمنی میں عسکری قوت کا احیاء

۱۹۱۸ء کی التوائے جنگ سے جرمنی کی عسکری قوت کو شدید نقصان پہنچا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اب دوبارہ یہ کبھی نہ سنبھل سکے گی۔ فوجیں جب اپنے فلاکت زدہ ملکوں کو واپس آئیں۔ اور دیکھا کہ ان کے ہموطنوں کے دلوں سے لڑائی کے تمام فریب زائل ہو چکے ہیں تو ان کی ہمتیں اور بھی پست ہوگئیں پھر ایک طرف سیاسی اختلافات اور بدامنی نے دوسری طرف مالی اور صنعتی دشواریوں نے رہی سہی امیدوں کو بھی ختم کردیا۔ اس کے بعد معاہدہ ورسائی ہوا۔ اس کی شرائط کی رو سے آئندہ کے لئے جرمنی فوج کی تعداد صرف ایک لاکھ مقرر کی گئی۔ اور ان کو بارہ سال کی طویل مدت کے لئے پابند کیا گیا اس کے علاوہ اور دوسری سخت شرائط[۱] کے ذریعہ سے اس نئی فوج کی جنگی قوت کو بہت محدود کردیا گیا۔ سخت قسم کے انتہاپسندوں کو چھوڑ کر باقی سب نے اس تخفیف کو نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن اندرونی فسادات کی وجہ سے انھیں یہ سب کچھ گوارا کرنا پڑا۔

مگر اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے۔ انھوں نے جرمنی کے دل میں ایک طرف تو اپنی گذشتہ ذلتوں کے احساس کو تیز کردیا۔ اور دوسری طرف مستقبل کے متعلق بہت سے پرفریب اور خوش آیند منصوبوں

۱؎ فوجی طاقت کا تعین مندرجہ ذیل ترتیب پر کیا گیا:- ۷ پیادہ فوج کی ڈویژنیں اور تین رسالوں کی یا ۶۳ بٹالین۔ ۶۹ سکواڈرن۔ ۶۵ گھوڑوں کے اور ۷ ٹرکوں کے توپ خانے۔ اور کچھ مشین کا کام جاننے والی فوج۔

ہوابازوں، گیس اندازوں، ریل بنانے والوں، بھاری توپ خانے اور ٹینکوں کے دستوں کے رکھنے کی سخت ممانعت کردی گئی۔ ہتھیاروں اور گولی بارود کے ذخیروں کی تعداد کا تعین بھی سختی کے ساتھ کردیا گیا۔

کی پرورش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی میں عسکری احیار کی خواہش روز بروز ترقی کرتی رہی۔ معاہدہ کے مطابق ملک کے اسلحہ میں تخفیف کے لئے دولِ متحدہ نے جس نگرانی کے کمیشن کا تقرر کیا تھا۔ اور جو برلن میں مقیم تھا اس کے خلاف ایک شدید قومی نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اس بات کے باور کرنے کے لئے قوی دلائل موجود ہیں کہ جرمنی کے اربابِ حل وعقد نے ابتدا ہی سے اس کمیشن کی راہ میں دشواریاں حائل کرنا شروع کیں اور ورسائی کی پابندیوں کے خلاف حیلہ جوئی سے کام لینا تو روز کا مشغلہ ہوگیا تھا۔ ہتھیاروں اور ہوائی بیڑہ کے معاملہ میں تو کمیشن کو بیوقوف بنانے کا موقع نہ تھا۔ لیکن فوج کی تعداد اور عسکری روح کے متعلق جو قوانین بنائے گئے تھے اُن کا نفاذ ممکن نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی عسکری خصوصیات فنا نہ ہوسکیں بلکہ محض تھوڑے عرصہ کے لئے دب گئیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ قیصر کے زمانہ کی قدیم کرنگیز اکادمی یعنی فوجی تعلیم گاہ بھی ایک منتشر اور پُر فریب طریقہ پر محفوظ رکھی گئی۔ ہرنوسک نے پُرانی رجمنٹوں کے ان سابق سپاہیوں کی جو رضاکارانہ حیثیت سے اپنی انجمنیں بنانا چاہتے تھے خوب حوصلہ افزائی کی۔ ان طریقوں سے جرمنی کی فوجی روایات کو مذہبی احترام کے ساتھ قائم رکھا گیا۔

جنگ کے بعد جرمن افواج کی شکل جس طرح تبدیل ہوئی اس کا مطالعہ دو پہلوؤں سے کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو ان پبلک اعلانات سے جن سے سرکاری پالیسی کا اظہار ہوتا تھا اور دوسرے اُن پوشیدہ کارروائیوں کے جن کے ذریعہ سے نئی فوج کی فنی اہلیت اور تنظیم میں سہولت اور رفتہ رفتہ تکمیل ہوتی رہی۔ پہلا پہلو حقیقتاً زیادہ اہم تھا کیونکہ اس سے کل قوم میں ایک عسکری روح پیدا ہوگئی اور یہی وہ چیز ہے جو اس وقت کی فوجی تیاریوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ مختصراً یہ کہنا کافی ہے کہ جرمنی کی نئی نسل کے دل و دماغ میں یہ بات نہایت راسخ طور پر جانشین کردی گئی ہے کہ جرمنی کے لئے جنگ کی فتوحات مذہبی فرزمندی کا مرتبہ رکھتی ہیں اور جرمنوں کی شہامت اور دلیری کو ایک آسمانی رحمت و برکت سے تعبیر کرنا ہر لحاظ سے صحیح و درست ہے۔

لیکن ابتدا میں ان جذبات کے اظہار میں ضبط اور اعتدال سے کام لیا گیا اور یہ چیز ۱۹۱۹ء کی جرمن فوج کی تخلیق میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ سپاہیوں نے اس وقت جو کچھ بھی کیا اس کو اگر ہر

حیثیت سے پسندیدہ نہیں تو کم از کم ہمدردی کے ساتھ تعریف کا مستحق ضرور خیال کیا جا سکتا ہے۔ نئی جرمن فوج کی تخلیق کے لئے سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں جنرل والتھر کا تقرر کیا گیا۔ ان کو اس نئی فوج کا کمانڈر بنایا گیا جس سے جدید رائخشیر (یعنی مستقل فوج) کا آغاز ہوا برلن کے قریب ڈوبرٹیز کے پڑاؤ میں جنرل والتھر نے اپنا کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ طویل مدت کی ملازمت والے رنگروٹ بھرتی کئے جانے لگے جن میں سے ہر ایک اپنی جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے چیدہ اور منتخب تھا۔ ان لوگوں کی امداد سے رائن ہارڈ نے نہایت جلد ایک عمدہ اور ہر اعتبار سے اہل فوج کی بنیاد ڈالنا شروع کی۔ آج بھی جرمنی میں ایسے بوڑھے سپاہی پائے جاتے ہیں جو فخریہ یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بھی ڈوبرٹیز کے بریگیڈ میں کام کیا ہے۔ لیکن نئی فوج کی تنظیم سے زیادہ اہم وہ روح تھی جس سے ہر سپاہی معمور معلوم ہوتا تھا اور اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ یہ بات ہے کہ اس وقت کے حالات کے اقتضاء کو صحیح طور پر سمجھ کر رائن ہارڈ نے مصلحت اندیشی سے فوج کو اس طرح تنظیم دی کہ اس کے دل میں تمام متحدہ جرمن قوم کی طرف سے ایک جذبہ وفاداری پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد سے جرمنی کی مستقل فوج کی وابستگی کسی خاص ریاست سے زیادہ نہ رہی بلکہ وہ جرمنی کی فوج ہو گئی اور مرکزی حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے لگی۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں رائن ہارڈ نے اپنی کمانڈ جنرل وان سیکٹ کو سپرد کی جو ایک اچھا سپاہی تھا اور بہت اعلیٰ انتظامی قابلیت رکھتا تھا۔ رائن ہارڈ ہر چند پرشیا کا رہنے والا نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی تمام قوت سپاہیوں کی ان خصوصیات کو اُبھارنے میں صرف کی جو پرشیا کی فوج میں خاص طور پر پائی جاتی تھیں اور جن کی وجہ سے جرمن فوج تمام یورپ والوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ سیکٹ نے بھی اپنا کام جاری رکھا تا آنکہ جنوری ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر گیزلر وزیر مدافعت نے یہ اعلان کیا کہ جرمنی کی نئی فوج مکمل ہو گئی ہے۔ وان سیکٹ نے اس میں اتنا اضافہ اور کیا کہ "آج جرمنی کی عسکری تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہے" دشواریوں کے باوجود سیکٹ کی تعمیر کی ہوئی فوج نہایت نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سے جرمن مستقل فوج کی اعلیٰ اہلیت میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ لوگ

اس قدر کثیر تعداد میں بھرتی کے خواہش مند رہتے تھے کہ افسروں نے چن چن کر آدمیوں کا انتخاب کیا چنانچہ اس وقت فوج میں قوم کے بہترین افراد پائے جاتے ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت سیکٹ کی فوج کی یہ تھی کہ وہ صاف اور واضح طور پر وقتی سیاسی مسائل سے علیحدہ رہتی تھی۔ اس میں اس حد تک حزم و احتیاط سے کام لیا گیا تھا کہ ۱۹۲۳ء کی ابتدا میں جو سیاسی انتشار کی کیفیت تھی اس وقت بھی فوج قطعاً غیر جانب دار رہی۔

دس سال تک جرمنی کی مستقل فوج نے اپنا کام جاری رکھا۔ اور اپنی تربیت کو مکمل کرتی رہی اور اس دوہرے مقصد کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی جس کو سیکٹ نے پہلے ہی سے سمجھ لیا تھا۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ یہ فوج منتخب سپاہیوں کی ایک جماعت ہو اور اپنی اہلیت پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے سے بہت زیادہ تعداد کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کر سکے۔ دوسرا مقصد اس کا یہ تھا کہ ایسے مشکل وقت میں جب قوم کو ایک بڑی فوج کو بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئے یہ فوج رہنماؤں اور کمانڈروں کی فوج کا کام دے۔ جتنا وقت گذرتا رہا اتنی ہی اس کی تعلیم بہتر ہوتی رہی۔ جن اسلحہ اور مشینوں کا استعمال ممنوع تھا۔ مثلاً گیس ٹینک۔ ہوائی بیڑہ وغیرہ ان کی ذہنی تصویر ذہن میں قائم کر لی گئی اور جب کبھی ممکن ہوا ان کے نقلی اور نمائشی نمونے بنا لئے گئے۔ جرمنی کے مفکرین نے مستقبل کی جنگ کے متعلق مطالعہ شروع کیا اور اس سلسلہ میں ان تمام اصلاحوں اور نئے ہتھیاروں کو معلوم کیا جو ان قوموں میں رائج تھے جو معاہدہ کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہ تھیں۔

فوج سے باہر بھی جرمنی کے لوگ عسکری حوصلوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ جاپان سویٹ روس اور اٹلی کی طرح جرمنی میں بھی نئی نسل کی تعلیم کی طرف بہت توجہ کی جانے لگی۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کی ذہنیت بدلنے کے لئے یہی ذریعہ سب سے زیادہ موثر ہے۔ اس لئے جرمنی میں بھی نوجوانوں کے سنگھٹن کو بہت اہمیت دی گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ یہ "معاشرتی ارتقا" کا اچھا ذریعہ ہے اور اس کے وسیلہ سے بالشوزم کو روکا جا سکے گا۔ لیکن آبادی کی اکثریت نے اس کو عسکری اور قومی احیاء کی شاہراہ سمجھ کر اختیار کیا۔ ایک جرمن مصنف اس تحریک کے متعلق اپنی

رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ " یہ معاہدہ ورسائی کی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرنے کے لئے پہلی کوشش ہے " یہ خیال تیزی سے پھیلتا رہا اور ۱۹۳۲ء میں قوم پر اس طرح حاوی ہوگیا کہ پریذیڈنٹ کو ایک اعلان شائع کرنا پڑا جس سے ایک بورڈ کا تقرر کیا گیا کہ وہ " جسمانی ورزش کے طریقوں کا ایک معیار اور نصاب مقرر کرے تاکہ جرمنی کے نوجوانوں کی جسمانی تربیت کی نگرانی مجموعی طور پر کی جاسکے۔ پریسیڈنٹ نے کہا " جرمنی کے نوجوان ہماری نسلوں کے مستقبل کے مالک ہیں۔ ان کے جسم کی سختی 'ضبط' 'تنظیم' 'باقاعدگی' 'باہمی رفاقت' 'قوم کی خاطر ایثار کے لئے آمادگی۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی تربیت کی ذمہ داری حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے " اس اعلان سے جرمنی کے اس حصہ آبادی کو بہت اطمینان ہوا' جو سیاسی رجحانات اور موجودہ نااتفاقیوں سے بیزار ہو کر ہمہ گیر لازمی فوجی خدمت کو ہی قوم کے تمام معاشری اور دوسرے امراض کا واحد علاج سمجھنے لگا تھا۔

نوجوانوں کی تربیت کا یہ تخیل نیا نہیں ہے۔ فلسفیوں نے ہمیشہ جستجو کی ہے کہ جنگ کے دوران میں جو اعلیٰ اخلاقی صفات بروئے کار آتی ہیں انھیں زمانہ امن میں بھی پیدا کریں اور جاری رکھیں۔ اور عموماً مشترکہ معاشری خدمت کو کسی نہ کسی شکل میں اس غرض کے لئے منتخب کیا ہے لیکن اس مقصد کیلئے جو سپاہیانہ تعلیم ہوتی ہے اس میں اور خالص عسکری تربیت میں جو فرق ہے وہ جرمنی میں برابر دھندلا ہوتا گیا۔ یہاں کے بچوں کی تمام ورزشوں اور مدافعت کے کھیلوں میں جو فوجی میلان پایا جاتا ہے وہ چھپائے نہیں چھپتا اگرچہ معاہدہ ورسائی کی خاطر اس کو پوشیدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ جرمنی میں نوجوانوں کو اس طرح تربیت دینے کے لئے جیسے بوائے اسکاؤٹوں کو تمام دنیا میں دیجاتی ہے بے شمار انجمنیں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں خاص طور پر نمایاں وہ انجمن تھی جسے بالدورون شیراک نے قائم کیا تھا۔ یہ شخص ایک پرجوش آدمی تھا جو اپنی مادر وطن کے احیاء کا خواہشمند تھا۔ یہ تمام انجمنیں بڑھتی اور ترقی کرتی رہیں تاآنکہ نازیوں کے زمانہ میں انھیں متحد کرکے ہٹلر جوگنڈ کا نام دیدیا گیا۔ نوجوانوں کی تربیت کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ وہ مدافعتی کھیلوں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یہ کھیل متعدد اعتبارات سے بالکل ان ورزشوں سے مشابہ ہیں جو سپاہیوں کو کرائی جاتی ہیں۔ ان

مدافعتی کھیلوں کا رواج رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ جہاں کہیں بھی نوجوان ورزش کے لئے جمع ہوتے تھے وہاں ان کی ضرور مشق کرتے تھے۔

دوسرا قدم جو اسی سمت میں اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ تمام ہائی اسکولوں میں " مدافعت کا علم " نصاب میں داخل کر دیا گیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دوران میں یہ خرابی ظاہر ہوئی تھی کہ مدبر اور سپاہی باہم ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے اور اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں کہ جنگ کے مشترکہ کام میں ان کے اپنے اپنے فرائض کیا ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں سپاہیوں اور سیاسی لیڈروں میں اس قسم کی عدم مفاہمت اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور جرمنی کی شکست کا ایک بڑا سبب اس بات کو بھی قرار دیا جاتا ہے۔ نصاب میں اس نئے مضمون کے داخل کرنے سے یہ امید کی گئی کہ اس خرابی کا ازالہ ہو سکے گا۔ جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے اس نصاب پر اعتراض کرنے کا کسی کو کوئی موقع نہیں ہے مگر اس کا اعتراف جرمنوں کو بھی ہے کہ معاہدہ ورسائی کے فقرہ نمبر ۱۷۷ کی اس سے خلاف ورزی ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ مضمون محض سیاسی اور نظری حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے اور اس میں کسی فوجی مشق کے کرانے کی اجازت نہیں ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ نصاب میں اس بات کی گنجائش ہے کہ اگر برنسوک کے پروفیسر بانزے جیسے انتہا پسند آدمی چاہیں تو وہ تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے معاہدہ کے فقرہ نمبر ۱۷۷ کی پابندیوں سے متجاوز ہو سکتے ہیں۔ یہ چیزیں ممکن ہے واقعی مستثنیٰ کئے جانے کے لائق ہوں لیکن سائنس کی تعلیم کا جو عام رجحان ہے اور ورزش، پریڈ اور تقریروں سے جس طرح جرمنی کے نوجوانوں کو علی الاعلان جنگ کی طرف مائل کیا جاتا ہے اُس سے کسی شخص کے دل میں بھی یہ اثر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ جرمنی کے نوجوانوں کی تربیت امن پسند ماحول میں کی جا رہی ہے۔ پھر جب اس لٹریچر پر نظر ڈالی جاتی ہے جو شروع سے آخر تک خالص عسکری روح سے لبریز نظر آتا ہے تو اس قسم کی رائے میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے۔

اس دوران میں مستقل فوج کی کمی تعداد کی طرف سے جو بے اطمینانی کی کیفیت باوثوق حلقوں میں پائی جاتی تھی وہ برابر بڑھتی رہی اور جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے بارے میں جو مباحثے ہوتے تھے اُن سے اسے

اور ترقی ہوتی رہی۔ ۲۷-۱۹۲۶ء میں فرانس کی طرف سے ایم۔ برائینڈ نے مدافعت کے معاملات میں جرمنی کے مرتبے کے متعلق جو اعلانات کئے اُن سے جرمنوں کی بے صبری کو کچھ تسکین ہوئی لیکن بعد کی مایوسیوں سے مجبور ہو کر جرمنی نے جو طریقے اختیار کئے اُن کی صرف ایک ہی تعبیر ممکن تھی اور وہ یہ کہ جرمنی دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنے عسکری مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مدافعت کے لئے نوجوانوں کی تربیت کا اصول تسلیم کرانے کے بعد اس بات کا مطالبہ کہ تمام بالغوں کو عام طور پر فوجی تعلیم کی ازسرنو اجازت دی جائے کچھ بہت بڑا مطالبہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر یہ مطالبہ یکبارگی نہیں کیا گیا بلکہ ابتداءً صرف یہ کہا گیا کہ چونکہ فاتح اقوام معاہدہ ورسائی کے مطابق اسلحہ کی تخفیف کے لئے تیار نہیں ہیں اس لئے جرمنی کو بھی زیادہ فوج رکھنے کی اجازت ملنی چاہیئے۔ اس غرض کے لئے تعداد کا تعین اس طرح کیا گیا کہ مستقل فوج میں ایک لاکھ سپاہیوں کی جگہ تین لاکھ سپاہی بھرتی کرنے کی اجازت مانگی گئی۔ ملازمت کی شرائط کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا اور نہ مجوزہ تنظیم کے متعلق کچھ کہا گیا جسے فوجی نقطہ نگاہ سے ایک سخت فرد گذاشت سمجھنا چاہیئے۔

جرمنی کے پیش نظر جو مسئلہ تھا اُس کا حل آسان نہ تھا کیونکہ جنگ سے پہلے فوج کا جو انتظام تھا اس میں دو سال تک فوج میں رہ کر ملازمت کرنا پڑتی تھی اور بھرتی تمام قوم کے لئے لازمی تھی۔ یہ چیز اس وقت کچھ تو غیر ملکی مخالفت اور کچھ مالی دشواریوں کی وجہ سے خارج از بحث سمجھی جاتی تھی۔ تاہم ایک ایسی کثیر جماعت بھی تھی جس کا خیال تھا کہ بے روزگاروں کی جو کثیر جماعت جرمنی میں پائی جاتی ہے اُسے آسانی سے فوج میں بھرتی کیا جا سکتا ہے اس کی تائید میں ایک مزید دلیل یہ لائی جاتی تھی کہ ان لوگوں کو اخلاقی اور جسمانی خرابیوں سے صرف فوجی تعلیم کے وسیلہ سے ہی بچایا جا سکتا ہے۔ کچھ عرصہ یہ چیز جاری رہی۔ لیکن بعد میں تقریروں اور تحریروں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا جس میں یہ کہا گیا فوجی تعلیم کے ازسرنو جاری کئے جانے کا نہایت شد و مد سے مطالبہ کیا جانے لگا۔ اس ضمن میں پرانے تجربات اور شہادات کے حوالے دئے گئے۔ کیا ۱۸۱۳ء میں اسی چیز سے جرمنی کو نجات حاصل نہ ہوئی تھی؟ کیا ۱۸۷۰ء کی فتح کا سہرا اسی کے سر نہ تھا؟ فوجی طاقت ہی وہ ذریعہ ہے جس سے جرمن قوم دوبارہ دوسری اقوام میں اپنا کھویا ہوا مرتبہ اور

دنیا کی نگاہ میں عزت و وقار حاصل کر سکتی ہے۔

آخر میں جرمنی نے اس حق کا مطالبہ کیا کہ اُسے جو رعایتیں ملی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُسے موقع دیا جائے کہ وہ اپنی مستقل فوج کی تعداد میں اضافہ کر سکے اور شرط صرف یہ ہو کہ جس قدر نئی فوج بھرتی ہو وہ سب قلیل مدت کے لئے ہو اس کے مقابلہ میں جرمنی اس بات کا اعتراف کرنے کے لئے آمادہ تھی کہ "وزنی" اسلحہ کی جو پابندیاں اُس پر عاید کی گئی ہیں اُنھیں گوارا کرتی رہے۔ نیز یہ کہ طویل مدت کی جو مستقل فوج ہے اس کی تعداد میں کچھ کمی کر دی جائے۔ اسی لئے کف ہاسر کی فوجی انجمن کا افتتاح کرتے ہوئے جب ۵ ؍جنوری سنہ ۱۹۳۲ء کو برلن میں پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے اپنی تقریر کے دوران میں مندرجہ ذیل باتیں کہیں تو کسی کو تعجب نہ ہوا :-

"میں ایک دفعہ پھر اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم صرف اتنی ضمانت امن چاہتے ہیں جتنی اور دوسرے ملکوں کو حاصل ہے میرے نزدیک ہمہ گیر فوجی خدمت کا نصب العین ہماری قوم کا ایک نہایت مستحسن مقصد ہے مگر چونکہ مختلف حالات میں مختلف کارروائیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے موجودہ حالات میں جو چیز میرے پیش نظر ہے وہ ایک بے قاعدہ فوج ہے لیکن آپ کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ ہماری مستقبل کی مدافعتی فوج کی ظاہری شکل چاہے کچھ ہی ہو لیکن اس کی روح وہی رہے گی جو ہمیشہ ہماری فوج میں پائی گئی ہے اور آج بھی پائی جاتی ہے۔ ہماری فوجی روایات نہ تعداد کی پابند ہیں نہ ظاہری شکل و صورت کی"۔

اس تقریر کے مطالعہ کے بعد کسی شخص کو بھی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ "بے قاعدہ فوج" کی اصطلاح محض سابق اتحادی حکومتوں، انجمن اقوام اور تمام دنیا کی حامی امن آبادی کی اشک شوئی کے لئے استعمال کی گئی تھی ورنہ یہ مجوزہ بے قاعدہ فوج اپنے نظم و ڈسپلن کے اعتبار سے کسی حیثیت سے مستقل فوج سے کم نہ ہو سکتی تھی۔

وان ہنڈنبرگ نے اپنی اسکیم پیش کرتے وقت جو باتیں کہی وہ وہی تھی جو اس سے پہلے متعدد بار کہی جا چکی تھی یہاں تک کہ جون سنہ ۱۹۳۱ء میں بھی وان سیکٹ نے میونک میں طلباء کے ایک اجتماع کے سامنے نہایت واضح الفاظ میں مستقبل کی جرمن فوج کے متعلق اپنا تخیل اس طرح پیش کیا تھا :-

"ہماری مستقبل کی فوج کی ظاہری شکل کے متعلق کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں ہمہ گیر لازمی خدمت کے اصول پر ضرور عمل کیا جائے گا۔ اس طریقہ خدمت کے علاوہ کوئی دوسری صورت اختیار ہی نہیں کی جاسکتی پہلے ہمیں ایک فوج تیار کرنا چاہیے اگر ضرورت ہو تو مختصر لیکن نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس کے ساتھ وہ دوسری منتظم جماعت ہوگی جو بے قاعدہ فوج سے مشابہ ہوگی۔"

اگست ۱۹۳۲ء میں وان شلیشر نے حکومت فرانس کو اسلحہ کی ساوات پر ایک تحریری یادداشت اسی مضمون کی لکھی تھی۔ افواج کی دو نمایاں قسموں میں تقسیم سیکٹ کے لئے عرصہ سے ایک محبوب موضوع گفتگو تھی۔ افواج کی ترقی کے بارے میں اس کا جو نظریہ تھا اس کی بنا پر وہ یہ ضروری سمجھتا تھا کہ ایک طرف تو اُن اعلیٰ تربیت یافتہ طویل مدت کی افواج کو ترقی دی جائے جو جنگ کے تمام سائنٹیفک طریقوں سے واقف ہوں اور زیادہ سے زیادہ جسمانی محنت برداشت کر سکیں اور دوسری طرف وہ ایک عوام کی فوج رکھنا چاہتا تھا جو فوری اطلاع پر جمع ہو سکے اور میدان جنگ میں کم محنت اور مہارت کے کاموں کو آسانی سے انجام دے سکے۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ تربیت کی مدت اور نوعیت میں اُن غیر مساوی کاموں کے اعتبار سے تفریق کی جاسکے جن کی بجا آوری ایک جدید فوج کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن بے قاعدہ فوج کے تخیل کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس موضوع پر جرمنی میں بہت کچھ لکھا گیا کہ ایک بے قاعدہ فوج اپنا کام ٹھیک طریقہ پر انجام دینے سے قاصر رہے گی۔ اس کے ثبوت میں ۱۷۹۲ء کے انقلابی دور سے ۱۹۱۸ء تک جتنی تاریخی شہادتیں فراہم ہوسکتی تھیں پیش کی گئیں۔

طویل مدت کی ایک مختصر فوج کی ضرورت پر اس وجہ سے بہت زور دیا جاتا تھا کہ اس سے قلیل مدت کی فوج کی جو خامیاں ہیں وہ رفع ہوسکیں گی نیز جدید جنگ کے جن مشاغل میں نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کی ضرورت ہے وہ فراہم ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ یہ مطالبات تھے کہ فوجی تعلیم گاہ کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اسلحہ جات ممنوعہ پر جو پابندی عاید ہے اُسے اُٹھایا جائے۔ اپنے حدود پر قلعہ سازی کی آزادی اور رائن لینڈ کے غیر فوجی علاقہ کی منسوخی حاصل کی جائے۔ ایک لاکھ کی ایک مستقل فوج اور تین لاکھ کی ایک بے قاعدہ فوج کا متوازی قیام فوجی افسروں کے نزدیک ضروری اور ممکن العمل تھا پھر نئی مسلح فوجوں کی امداد اور تکمیل کیلئے

مزدوروں کی ایک قومی فوج کا قیام بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں سابق اتحادی حکومتوں نے جو اعلان کیا اُس سے جرمنی کو مساوی مرتبہ اور اپنی مستقل فوج میں اضافہ کا حق حاصل ہو گیا اور اسے جرمنی نے فوجی توسیع کے لئے ایک پروانہ سمجھا۔ سابق اتحادیوں کی یہ سخت غلطی تھی انھیں معاملہ کا تصفیہ اُسی موقع پر کر دینا چاہئے۔ جرمن سیاست نے تیزی سے رنگ بدلنا شروع کیا۔ سیاسی شکایات کو معاشری اور معاشی بے چینی تقویت پہنچا رہی تھی۔ جرمنی کی حالت بہت خطرناک تھی اور وہاں ہر انفرادی مسئلہ نہایت آسانی سے قومی مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

یہ صورت تھی جب ۱۹۳۳ء میں نازیوں نے اچانک حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ہٹلر کے آتے ہی جرمنی کے مسئلہ مدافعت نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ مجلس قانون ساز کے انتخاب کے بعد جو سیاسی ہلچل پیدا ہوئی اُس نے معاملہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ نازی تحریک کے سیاہ قمیص والے رضا کاروں کی موجودگی میں کسی حریف فوج کو قائم کرنا گویا اُن کی توہین تھی۔ اسی طرح بھورے قمیص والے رضا کاروں کو بھی اُن کی تعداد اور زیادہ کو دیکھتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی جماعت جرمنی کی نئی قومی فوج بن جائیں گی۔ بھورے قمیص والوں کے رہنماؤں کے نزدیک تو یہ ایک طے شدہ مسئلہ تھا جس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن مستقل فوج کے ارباب حل و عقد کے نزدیک یہ تجویز قابل قبول نہ تھی۔ اُن کی فوج میں نہایت اعلیٰ قسم کے آدمی تھے اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں میں بھی وہی زہر پھیلے جو بھورے قمیص والی جماعتوں میں خوب ترقی پا چکا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ان آوارہ منش بے روزگار لوگوں کے مقابلہ میں جو سیاسی جوش کی بنا پر گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں کھیت اور فیکٹری کے مزدوروں کو بھرتی کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جرمنی کے فوجی اخباروں نے "انقلاب" کی خوب تعریف کی اور ایسا کرنے کے لئے وہ مجبور تھے کیونکہ نئی حکومت نے قومی وقار اور دنیا کی اقوام میں جرمنی کے مرتبہ کو بلند کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ پھر ہٹلر کی حکومت نے اپنے جرمن پریسیڈنٹ کی قیادت میں مستقل فوج اور تمام عسکری طبقہ کو اپنی دوستی اور ہمدردی کا پورا پورا یقین

بھی دلایا تھا۔ لیکن جرمنی فوج کا افسر بہت زیادہ فرقہ پرست واقع ہوا ہے۔ اس لئے وزیر مدافعت جنرل وان بلومبرگ کے اعلانات اعتماد کے باوجود مستقل فوج کے دل میں بھورے قمیص والے رضاکاروں کی طرف سے عام طور پر جو بے اعتمادی پائی جاتی تھی وہ رفع نہیں ہوئی۔ اس مسئلہ کے متعلق علانیہ طور پر ہرچند بہت کم اظہار رائے کیا گیا اور اخباروں نے تو اس کے متعلق بالکل ہی کبھی اشارہ نہیں کیا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ نازیوں اور نیم عسکری جماعت کے عروج کی وجہ سے جن کی وجہ سے ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا تھا جرمنی میں بے قاعدہ فوج کا تخیل زوال پذیر ہوگیا۔

۱۹۳۳ء میں جرمنی انجمن اقوام سے علیحدہ ہوگئی۔ اس کے بعد سے جرمنی میں عسکری احیار کی تجاویز کے متعلق جو تھوڑا بہت تذبذب باقی تھا وہ بھی جاتا رہا بلکہ جنیوا کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد تو جرمنی کے لئے بہت آسان ہوگیا کہ وہ اپنی عسکری ترقی کے لئے پوری کوشش کرے ۱۸۰۷ء تا ۱۸۱۳ء کے کامیاب تجربہ کی پیروی کرنے میں اب تو کوئی رکاوٹ بھی حایل نہ تھی۔ اگر تھوڑا خوف تھا تو اس قدر کہ اگر زیادہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھایا گیا تو ممکن ہے مغربی یورپ کو یہ چیز ناگوار خاطر ہو اس لئے ابتدا میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ مستقل فوج سے مشابہ ایک فوج کو منظم کیا جائے اور وسیع تر فوجی خدمت کو دوبارہ رائج کیا جائے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی گئیں کہ ایک پیشہ ور سپاہی اپنے پیشہ اور قوم دونوں کی عزت کا مستحق نہیں ہے۔ تنخواہ دار سپاہی کی حیثیت بالکل ایک جلاد کی سی ہوتی ہے۔ وہی مصنف جو فریڈرک کی تنخواہ دار فوج کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے اب "کرایہ کی" فوج کا مذاق اڑانے لگے۔ ہمہ گیر خدمت کے دوبارہ جاری کرنے کا مطالبہ نہایت زور شور سے کیا جانے لگا۔ فوجی اخبار ایک نئی فوج کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگے۔ قدیم عسکری نظام کے احیار نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کرلی۔

بے قاعدہ فوج کا تخیل جب ختم ہوگیا تو تین لاکھ آدمیوں کی فوج کا مطالبہ ان شرائط پر کیا جانے لگا جنھیں جرمنی کا دعوے تھے کہ فرانس منظور کرچکا ہے۔ اس بات میں کس قدر کامیابی ہوئی اس کا علی الاعلان اظہار کبھی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اپریل ۱۹۳۴ء میں رنگروٹوں کے پہلا گروہ کا انتخاب

کیا گیا تاکہ مستقل فوج کی تعداد ۳ تین لاکھ تک پہنچایا جا سکے۔ باقاعدہ فوج میں ملازم رہنے کی مدت اٹھارہ مہینہ طے پائی لیکن نئی حکومت کے آیندہ عزایم کے متعلق کوئی واضح بیان شایع نہیں کیا گیا۔ فی الحال یہ امر کہ مستقل فوج میں کسی قسم کی تخفیف کی جائے گی یا اسے تربیت دینے والے دستوں میں منقسم کردیا جائے گا بالکل مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

لیکن مستقل فوج کی توسیع سے بھورے قمیص والے رضاکاروں میں جو اس بات پر بے چینی تھی کہ انھیں اس نئی فوج میں کیوں بھرتی نہیں کیا گیا وہ انتہا کو پہنچ گئی۔ اور ہٹلر کے خلاف سازش کا یہی ایک بڑا سبب ہوا۔ یہ سازش ناکام رہی اور ۳۰ جون کو اس کے سب رہنما گولی سے اڑادیئے گئے۔ اس کے بعد سے بھورے قمیص والی انجمنوں کو اجازت نہ رہی کہ وہ "سیاسی فوج" کی حیثیت سے کام کریں۔

ہٹلر کی حکومت میں ابتدا سے ہی مستقل فوج کو وسعت دینے کا رجحان پایا جاتا تھا۔ جرمنی میں ہر ورسائی کا معاہدہ ہی عسکری اصلاح کے حامیوں کا نشانہ ملامت نہ تھا بلکہ مختلف دوسری غیر اہم سمتوں سے قدیم شہنشاہی عسکری نظام کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں کی جانے لگی تھیں۔ تمغوں، نشانوں، جھنڈیوں طرّوں اور خطابات کو پھر پہلے جیسا رواج ہوا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دستور ویمر کی دفعہ نمبر ۱۵۷ کی منسوخی کو بھی سمجھنا چاہیئے جس کی بنیاد پر فوجی عدالتوں کی تمام اپیلیں براہ راست پریسیڈنٹ کے پاس جانے لگیں اور اس طرح قانون قبل از جنگ کی طرف واپسی ہوئی اور فوجی عدالتیں دوبارہ سول عدالتوں کی محکوم نہ رہیں۔

اسی قسم کی مزید ترقیوں کو ظاہر کرنے کے لئے شہادتوں کی کمی نہیں ہے۔ سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء کی بجٹ میں مدافعت کے خرچ کا تخمینہ نوے کروڑ مارکس (یعنی ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ) کیا گیا تھا۔ بحری بیڑہ کو اس رقم میں سے ۲۴ کروڑ مارکس دیئے گئے تھے، مستقل فوج کو ۵۰ کروڑ (یعنی سنہ ۱۹۳۳ء کے مقابلہ میں ۴۵ فی صدی کا اضافہ)۔ وزیر فضا کو دوسرے ذرایع سے ۴ کروڑ کی رقم دی گئی (یعنی سنہ ۱۹۳۳ء کے مقابلہ میں ۱۷۰ فی صدی اضافہ کیا گیا)۔ ان کے علاوہ دوسرے اور مدات تھے (مثلاً پولس، طوفانی افواج

دفاعی کمبل وغیرہ) جن کو عسا ۔۔ تھا غالباً غلط نہیں ہے۔ ان کا مجموعی تخمینہ ۸۵ ہم لرڈ تھا۔ ان مختلف مدات کا جب زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بحری محکمہ نئی تعمیر پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہتا تھا، بری محکمہ اپنی اہلیت میں اضافہ اور اسلحہ جات ممنوعہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور وزیر فضا ایک بڑی قومی ہوائی سروس کو تنظیم دینا چاہتا تھا۔

ہٹلر کی حکومت کا ایک اور نیا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قومی خدمت کے سلسلہ میں کسی نہ کسی قسم کی محنت کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ خالص عسکری نقطۂ نگاہ سے ممکن ہے اس کی اہمیت کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ جرمنوں کے ذہن میں اس کا ایک دوہرا مفہوم پایا جاتا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو اس سے کاہلی کی ان ۔۔ ت کی اصلاح منظور تھی جو لازمی فوجی خدمت کے ختم ہو جانے اور بے روزگاری کے اضافہ سے جرمنی میں پیدا ہو گئی تھیں۔ دوسرے اس کی بنیاد پر جنگ کی حالت میں نہایت سہولت سے صنعتی مزدوروں کی بھرتی کی جا سکتی تھی۔ اول الذکر مقصد سے ہر شخص کو ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے۔ اسی طرح دوسرے مقصد پر بھی اُن کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے جو امریکہ فرانس اور اٹلی نے اپنے ممالک میں اسی مقصد کے لئے جائز رکھی ہیں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب ان مختلف چیزوں پر ایک بڑی تحریک کے منتشر اجزا کی حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی طرف سے ضرور بدظنی پیدا ہوتی ہے۔

ابتدا میں فوج میں جو نئی بھرتی کی گئی تھی اُن کی تعلیم نہایت پوشیدہ طریقوں پر کی جا رہی تھی۔ ان آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ تربیت پانے والے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور نہیں کام کرتے ہوئے دیکھنے کی کسی ایسے شخص کو اجازت نہ تھی جس کے متعلق ذرا سا بھی یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ یہ جرمنی یا نازیوں کا مخالف ہے۔

جرمنی کے عسکری احیا کے متعلق مندرجہ بالا اور ان کے علاوہ دوسری اسی قسم کی شہادتوں کی موجودگی میں مسٹر ونسٹن چرچل کے اس سوال کے جواب میں کہ آیا برطانیہ کی مدافعتی کارروائیاں کافی ہیں یا نہیں اگر مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں ۲۸ نومبر کو اپنا مشہور عام بیان دیا تو اس پر تعجب کی کوئی وجہ

نہیں ہے۔ اس بیان میں جرمنی کی فوجی تیاریوں کا حال بالکل اسی انداز میں مختصر طور پر بیان کیا گیا تھا جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس بیان کو جسے حکومت برطانیہ کا نہایت مدبرانہ تبصرہ سمجھنا چاہئے شائع کرنے سے پہلے برطانوی سفیر نے اسے ہٹلر کے سامنے پیش کیا تھا اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ہٹلر نے اسے دیکھا تو نہایت برہمی کا اظہار کیا۔ اس بیان کے بعد برطانوی حکومت کی طرف سے ایک وائٹ پیپر شائع ہوا اور پھر دارالعوام میں مدافعت کے خرچ کا نیا تخمینہ پیش کیا گیا اور جرمنی کو ایک ایسے سمجھوتے کی دعوت دی گئی جس میں "تمام مغربی حکومتیں شریک ہوکر اس کا عہد کریں کہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گی۔

۱۹۳۴ء میں سیاہ قمیص والے رضاکاروں کی باری آئی۔ ان کے تمام منصب چھین لئے گئے۔ ان کی قوت بالکل کمزور کردی گئی اور ان میں جو اچھے عناصر تھے انھیں مستقل فوج میں شامل کرلیا گیا مستقل فوج کی قیادت اب ہٹلر کے ہاتھ میں تھی اس لئے جرمنی کی قسمت کا فیصلہ بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ میں تھا۔ جرمنی کے لئے اب وقت آگیا تھا کہ اپنے مقاصد کا علی الاعلان اظہار کردے عسکری طاقت کے احیاء کے متعلق اپنے آیندہ عزائم کو چھپانا اب بے کار ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ جو مرتبہ بین الاقوامی معاملات میں دوسری دول کو حاصل ہے وہی جرمنی کو بھی دیا جائے۔ فرانس کی مجلس قانون ساز میں دو سالہ جبریہ خدمت کی قرارداد پر مباحثہ اور فیصلہ ہوجانے کے بعد ہٹلر نے اعلان کیا کہ جرمنی نے یکم مارچ سے ہوائی فوج کی بھرتی شروع کردی ہے۔ اس اعلان کے بعد ۱۶ مارچ کو ایک دوسرا اعلان شائع کیا گیا کہ چونکہ وہ دول جنھوں نے ۱۹۱۹ء میں معاہدہ ورسائی کی بنیاد پر جرمنی کے اسلحہ میں تخفیف کرائی تھی خود اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں اس لئے جرمنی بھی جبریہ بھرتی دوبارہ جاری کرنے کیلئے مجبور ہے اور ۵ لاکھ کی فوج تیار کرنا چاہتی ہے جو ۳۶ ڈویژنوں کی بارہ افواج میں منقسم کی جائیگی۔

یہ سب تو جرمنی کی بری افواج کے بارے میں لکھا گیا۔ اب ہوائی فوج کا حال سنیے۔ چونکہ ورسائی کے معاہدہ کی رو سے جرمنی کو فوجی ہوائی جہاز رکھنے کی اجازت نہ تھی اس لئے جرمنی کی جدید ہوائی فوج کے متعلق کوئی مسلسل داستان ترتی بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ کام انتہائی رازداری کے ساتھ انجام کو پہنچایا گیا۔

لیکن یہ بات ہر شخص تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے کہ اس قسم کی تیاری گذشتہ متعدد سالوں سے جاری تھی۔ جرمنی کی حکومت اور وہاں کے جہاز بنانے والے صناعوں نے جتنے جہاز پچھلے چند سالوں میں بنائے ہیں اور ۱۶ مارچ کو برلن میں ہوائی جہازوں کی جو پریڈ ہوئی اُن کی ظاہری شکل اس بات کی ایک بہت بڑی شہادت ہیں کہ جرمنی نے اپنی اہمیت کو کس حد تک ترقی دے لی ہے۔ اس ضمن میں جرمنی کے ان بے شمار ہوائی کلبوں اور اسکولوں کی طرف توجہ منعطف کرنا بھی بے محل نہ ہوگا جن کی تنظیم بالکل نیم عسکری معلوم ہوتی ہے۔ ان کے ممبر وردیاں پہنتے ہیں اور فوجی خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔ جرمنی میں غیر ملکی گاہکوں کو لڑائی میں کام آنے والے ہوائی انجن فروخت کئے گئے اور اسی قسم کے انجن جرمنی نے خود باہر سے خریدے۔ تمام جرمنی میں ہوائی دفتروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس کی نوعیت بالکل فوجی ہے۔ علاوہ ازیں تمام ملک میں ہوائی مدافعت کے جوش کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے اور اس سلسلہ میں ہوائی جنگ میں جو مدافعتی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اُن کی جزئی تفصیلات کی لوگوں کو تعلیم دی جا رہی ہے۔

اس موضوع پر جرمنی حکومت کے سرکاری بیانات شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جنرل گورنگ نے وزیر فضا نے ایک فرانسیسی صحافی سے انٹرویو کے دوران میں کہا تھا۔

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں زمین اور پانی کی طرح ہوا میں بھی کمترین مدافعتی اسلحہ کی ضرورت ہے۔ میں ایسے ہوائی جہازوں کا ایک مختصر بیڑہ چاہتا ہوں جو اتنے ہلکے ہوں کہ بم اندازی ان سے ممکن ہی نہ ہو۔ اگر ضرورت ہو تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ ہمیں صرف کم ایندھن والے ہوائی جہاز رکھنے کی اجازت دی جائے تاکہ ہم زیادہ فاصلہ تک اڑ ہی نہ سکیں۔ یہ چھوٹے تعقب کرنے والے جہاز جو حملہ کے لئے بیکار ہوں گے ہمیں حملہ کرنے والوں سے محفوظ رکھ سکیں گے۔" آرنولڈ بوئلک مشہور جرمن ہواباز کی یادگار میں جو تقریب منائی گئی اُس میں بھی جنرل گورنگ نے اپنے اسی مطالبہ کو پھر دوہرایا جس کی بابت اُس نے کہا یہ تو قبول ہی کر لینا چاہیئے۔ گورنگ کا مطالبہ بظاہر کس قدر معتدل اور معصوم معلوم ہوتا ہے! مگر جنرل نیسل نے فرانس میں ۱۹۲۸ء میں ہی لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ جرمنی کی بری افواج کو اُن کے افسروں کی طرف سے جو ہدایات دی گئیں اُن میں یہ بات فرض کر لی گئی ہے کہ جنگ کی حالت

میں ہوائی بیڑہ بھی فوج کی امداد کے لئے موجود ہوگا۔ نیل کے بیان کے بموجب افواج کو پہلے سے ہی ہوائی جنگ کے مختلف قسم کے جہازوں مثلاً خبر گیری کرنے والے، بم انداز وغیرہ کے نام اور صحیح تعداد سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۴ء میں جنرل آرمن گاڑنے ریویو ڈو مونڈ یز میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جرمنی کا شمار ان اقوام میں کرنا چاہیے جو مستقبل میں بہت بڑی ہوائی فوج کی مالک ہوں گی۔ اس نے بیان کیا کہ جرمنی کی ہوائی فوج کے پاس اس وقت بھی سو مشینیں موجود ہیں۔ ۲۸ نومبر ۱۹۳۴ء کو مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ جرمنی کے پاس چھ سو سے ایک ہزار تک اڑنے والے ہوائی جہاز ہیں۔

اب آئیے اس مسئلہ کا ایک دوسرے پہلو سے مطالعہ کریں۔ ورسائی کے معاہدہ نے جرمنی کو ہوائی فوج کے معاملہ میں سب سے زیادہ پابند کیا تھا۔ صلح کے بعد جتنے جہاز بچ گئے تھے وہ سب تباہ کر دیئے گئے تھے۔ جرمنی کو اپنی مدافعت کے لئے جن افواج کے رکھنے کی اجازت دی گئی تھی ان میں ہوائی فوج شامل نہ تھی۔ ان پابندیوں کے باوجود جب جرمنی نے نئے غیر فوجی ہوائی جہاز بنانا شروع کئے تو اس کی راہ میں مزید دشواریاں پیدا کی گئیں جن میں سب سے زیادہ سخت یہ تھی کہ آئندہ سے نئے ڈزائنوں کو بھی آزادی کا اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ سفیروں کی کاؤنسل نے یہ شرائط ۱۹۲۲ء میں جرمن حکومت کے سامنے رکھے اور ۱۹۲۶ء تک ان پر سختی سے پابندی کرائی گئی۔ اس کے بعد جب یہ محسوس کیا گیا کہ اب حالت ناقابل عمل ہوتی جارہی ہے تو ایک نیا معاہدہ کیا گیا جس سے جرمنی کو ہوائی جہاز رانی اور ہوائی بیڑے کی تعمیر کی اجازت مل گئی۔ لیکن اس بات کی پوری احتیاط کی گئی کہ جرمنی کے سول ہوائی جہاز، ہوا بازی کے اسکول اور کلب فوجی اغراض کے لئے استعمال نہ کئے جاسکیں۔ جرمنی کی ہوا بازی پر ۱۹۲۲ء میں جو پابندیاں عاید کی گئیں اُن سے جرمن قوم کے دل میں ظاہر ہے سخت تلخی اور ناگواری پیدا ہوئی۔ لیکن اس کا جواب دینے کی اس میں بالکل طاقت نہ تھی مجبوراً انھوں نے اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے دوسرے طریقے سوچے۔ ان میں سے ایک طریقہ تو ہوائی تیراکی اور ہوائی بادبانی کی مشق کا تھا اور دوسرا چھوٹے ہلکے ہوائی جہازوں کی ترقی اور ان کے رواج کا۔ ان دونوں میں اپنے شوق تکمیل اور اختراع پسندی کی بنا پر انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی۔

ہوائی تیراکی جرمنی میں ۱۹۰۶ء سے رائج ہے جب ہرلیلین تھیلڈ نے جو بعد کو تجربہ کرتے ہوئے ہلاک ہوا پہلے پہل تیرنے والی ہوائی کشتی کا استعمال کیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں ہوائی تیراکی کو لوگوں نے شوقیہ اختیار کرنا شروع کیا اور اس وقت سے اس کا رواج نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ہوائی جہازوں سے بھی جن میں انجن نہیں ہوتے تفریحی شغلہ کے طور پر جہازرانی کی جاتی ہے[۵]۔ یہ تحریکیں تمام جرمنی میں پھیل گئی ہیں حتیٰ کہ آج ہوائی تیراکی اور ہوائی بادبانی کے بے شمار کلب تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگ ان کی نہایت جوش کے ساتھ امداد کرتے ہیں۔ خالص فوجی نقطہ نگاہ سے اس قسم کی تفریحوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ جو ہوا باز ہوائی تیراکی اور ہوائی بادبانی میں مشق حاصل کر لیتے ہیں وہ مشین کے ذریعہ ہوائی جہازرانی کو نہایت جلدی اور آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ درحقیقت کہا یہ جاتا ہے کہ بعض ماہر ہوائی تیراکوں کو معمولی ہوا باز بنانے کے لیے صرف ایک گھنٹہ کی تعلیم کافی ہوتی ہے۔ غرضکہ مندرجہ بالا بیان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہوائی جہازی اور بلا انجن ہوائی جہازوں کے رواج سے جرمنی میں ایک "فضائی ذہنیت" پیدا ہو گئی ہے اور ایسی جماعت تیار ہو رہی ہے جسے جنگ کے وقت نہایت آسانی سے جنگی ہوا بازی کے کام سکھائے جا سکتے ہیں۔

پابندیوں کی کمی اور خلاف ورزیوں پر ۱۹۲۰ء سے جرمن اخباروں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے غیر منصفانہ معاہدہ اور سابق دشمن اقوام کے حسد و کینہ کے خلاف ایک زبردست پروپگنڈا شروع کیا اور کہا کہ ان کی وجہ سے جرمنی کی قوت مدافعت بالکل سلب ہو گئی ہے۔ پھر ان صناعوں کی خوب تعریفیں کی گئیں جنھوں نے ہوائی جہازوں کے بنانے میں بڑی ہمت اور حوصلہ سے کام لیا تھا۔ جرمنی کی ہوائی بندرگاہوں کے قیام سے ہوائی آمد و رفت اور تجارتی پرواز میں جو ترقی ہوئی تھی اسے سراہا گیا اور جرمن ہوا بازوں کی مہارت کی خوب مدح سرائی کی گئی۔ پھر فرانس، اٹلی، پولینڈ اور زیکوسلوواکیا

---

[۵] اس قسم کی ہوائی جہازرانی کا انحصار ہوا کے اُن دھاروں پر ہوتا ہے جو اوپر کے رخ بہتے ہیں۔ عموماً سورج کی گرمی اور طوفان کی آمد کے وقت ہوا میں اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔

میں ہوائی بیڑہ کی تعمیر کے لئے جو سرگرمی سے کوشش کی جارہی تھی اس کی مفصل اطلاعیں حاصل کی گئیں اور اُن کی بنیاد پر جرمنی کے ہوائی بیڑہ کی تعمیر کے لئے پروپگنڈا اور زیادہ زور و شور کے ساتھ کئے جانے لگا۔

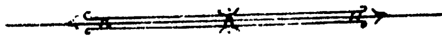
اسی دوران میں تجارتی ہوا بازی کو خوب ترقی ہوتی رہی۔ اس ترقی کا ایک سبب ممکن ہے یہ ہو کہ بحری جہازوں کی ضبطی اور نوآبادیوں کے نقصان کی وجہ سے جرمنی کو اپنی بحری قوت کی ترقی کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی اور اب اُسے اپنے حوصلوں کے لئے میدان صرف ہوائی ترقی میں نظر آتا تھا۔ اس کا سبب جو کچھ بھی ہو لیکن جرمنی نے ہوائی سروسوں کے قائم کرنے میں جس بلند خیالی اور اعلیٰ حوصلگی سے کام لیا ہے وہ یقیناً لائق تعریف ہے۔ جرمنی کی تجارتی ہوائی لائنیں صرف اپنے ملک کے رقبہ کے اندر محدود نہیں ہیں بلکہ تمام ہمسایہ ممالک میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سوویٹ روس سے اس کے جو تعلقات ہوائی لائنوں کے ذریعہ سے قائم ہیں وہ بہت وسیع اور مکمل ہیں بسنہ ۱۹۳۳ء میں ڈوئش لفتھانسا جو جرمنی کی سب سے بڑی ہوائی کمپنی ہے ۵۴ سروسوں کو چلا رہی تھی جس میں سے سات سرویس صرف ڈاک اور کرایہ پر سامان منتقل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ لفتھانسا کے جہاز روزمرہ ۴۴ ہزار میل کا سفر کرتے تھے۔ اس وقت جرمنی میں بارہ بڑی ہوائی بندرگاہیں پائی جاتی ہیں اور یہ سب جدید نمونہ پر بنائی گئی ہیں اور ان کے انتظام و انصرام میں خاص اہلیت و قابلیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ۶۵ جگہیں ہوائی جہازوں کے اُترنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان میں بحیرہ شمالی اور بحیرہ بالٹک کے سمندری ہوائی جہازوں کے اسٹیشن بھی شامل ہیں۔ ان سروسوں میں جس قسم کی مشینیں استعمال کی جاتی ہیں اُن کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کیونکہ ان میں یقینی طور پر ایسے نمونوں کی مشینیں بھی ہیں جو تعمیر کے طریقوں میں ذرا سی تبدیلی کرنے سے آسانی کے ساتھ جنگ کے اغراض کے لئے بھی مفید بنائی جا سکتی ہیں۔ مسافروں کے وزنی جہازوں کے ضمن میں سب سے پہلے تو جنکرس جے نمبر ۳۸ کا تذکرہ ضروری ہے۔ پھر ایک چھوٹا دو انجنوں والا نمونہ ہے جس میں ۲ مسافر ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چار سو میل تک سفر کر سکتے ہیں۔ پھر ایک تین انجن والے مانوپلین کا

نمونہ ہے جس کی رفتار ایک سو ستر میل فی گھنٹہ، بلند پروازی ۱۹ ہزار فیٹ اور قوت سفر پانچ سو میل ہے۔ پھر جدید اتیج۔ ای۔ نمبر ۷ کا نمونہ ہے جس کی رفتار ۲۰۳ میل، بلند پروازی ۱۹ ہزار فیٹ ہے اور چھ آدمی اس میں سفر کرسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاک کے کئی تیز رفتار نمونے ہیں جو طویل سفر پر ۱۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاسکتے ہیں ان آخر الذکر نمونوں میں بعض ایسے ہیں جو اپنی خصوصیات میں بم باز ہوائی جہازوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ جرمنی نے اپنا سب کام اس دور اندیشی کے ساتھ کیا ہے کہ سول ہوائی جہازوں کو نہایت تیزی اور آسانی سے نظام میں بلا کسی غیر معمولی ابتری کے پیدا کئے ہوئے فوجی ہوائی جہازوں میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ ایک بڑی فوج بنانے میں ابھی غالباً چند سال صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

جرمنی کی ان تیاریوں کو دیکھنے کے بعد اب سوال یہ باقی رہا کہ عسکری قوت کے اس احیاء سے جرمنی کا منشا کیا ہے۔ جرمنوں کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ جنگ میں اپنی طرف سے پیش قدمی وہ اُس وقت تک نہیں کریں گے جب تک یا تو ایسا کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں گے یا اس کے لئے پوری طرح تیار نہ ہوں گے۔ ان میں خواہش تکمیل اور کام کو اصول اور طریقہ سے کرنے کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ جرمن سپاہی کے دل میں ٹھوس طاقت اور کثیر تعداد کا احترام اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر یقینی خطروں میں جیسے موجودہ حالات میں جنگ ہے کبھی نہ ڈالے گا۔ وہ اس وقت جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں پا رہا ہے۔ سرکاری اعلانات اور فوجی مظاہروں میں جو آج کل بعد پایا جاتا ہے وہ اس کا صاف ثبوت ہے کہ جرمنی اس وقت بات کو ٹالنا چاہتا ہے۔

موجودہ مسائل کے حل میں اگر جرمنی کی فوجی دنیا کی تصانیف کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے تو یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ جرمنی کے با اثر فوجی حلقوں کی ذہنیت میں جنگ کے متعلق کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جرمنوں کے دل میں طبعاً، روایتاً اور مشق کی بنا پر قوت پر اس قدر شدید اعتقاد ہے کہ اس میں کوئی فوری تغیر کا امکان ہی نہیں ہے۔ جرمنی کے وہ مصنف جنھیں فن جنگ سے واقفیت ہے جدید جنگ کے حالات کے

مطالعہ کے بعد بھی اُسی فلسفہ قوت پر قائم ہیں جس کی تعلیم کلاز وٹز، موٹلکے اور شلیفین کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ وہ ابھی تک کلاز وٹز کے ان بیانوں کو جو اُس نے "قوم کی فوجی تیاری" اور "اقتدار کی شرائط" کے موضوع پر دیئے تھے یہ ثابت کرنے کے لئے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ فوجی جنگ عظیم ہی وہ شاہراہ ہے جس سے جنگ میں فتح اور اقوام کے باہمی تصادم میں کامیابی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ بات اگر جرمنی اور فرانس کے مابین جنگ ہو شاید ایک حد تک صحیح ثابت ہو مگر جرمنی اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہے۔ بہر حال اس خیال کو اہمیت اس حیثیت سے حاصل ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنوں کے دل میں ابھی تک اُن مسلح افواج کا اعتقاد باقی ہے جن کی وجہ سے انیسویں صدی میں اُس نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور اپنے اقتدار کو نہایت تیزی سے ترقی دی۔ لیکن جنگ عظیم کے تجربہ سے سبق حاصل کر کے آئندہ کے لئے وہ ایک ایسی فوج بنانا چاہتے ہیں جو جدید سائنس وایجاد کے اختراع کئے ہوئے تمام اسلحہ جات سے آراستہ ہو۔ اُن کی خواہش ہے کہ ان کی فوج کے پاس گیس، ٹینک، ہوائی جہاز۔ اور تمام وہ دوسری سہولتیں ہوں جن سے فوجی ہتھیاروں کی قوت بڑھتی ہے۔ ان ہتھیاروں کے پیچھے فتح و تسخیر کا قومی جذبہ کام کر رہا ہے۔ قسمت اور تقدیر اس وقت جرمنی میں جن پالیسیوں اور اعمال کی تشکیل کر رہی ہیں ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فتح و تسخیر کا یہ جذبہ چند سالوں سے جرمنی میں اپنا کام کر رہا ہے۔ اسی کے زیر اثر ہتھیار بنائے جا رہے ہیں۔ حالات کے اس ارتقا سے یورپ کا امن خطرے میں ہے یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تعلق عسکری مسائل سے نہیں ہے اس لئے یہاں خارج از بحث ہے۔ ٭



تنقید و تبصرہ

کتب :-

حیات مسعودی | ازجناب مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی بی اے ڈپٹی کلکٹر۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ نفیس۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

سپہ سالار حضرت مسعود غازی شہید جو عوام میں بالے میاں کے نام سے مشہور ہیں ہندوستان خصوصاً یوپی میں بہت احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اُن کا عُرس یا میلہ یوپی کے اکثر شہروں میں ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں ان کے کرامات و خوارق کی عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ جو اکثر حقیقت سے خالی یا مبالغہ آمیز ہیں۔ اسی لئے بعض لوگ ان بے سروپا روایتوں ہی کو نہیں خود حضرت سالار غازی کے وجود کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے اُردو کی دو ایک کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں لیکن وہ بھی اسی قسم کے افسانوں سے پُر ہیں بڑی مشکل یہ ہے کہ صحیح حالات کی جستجو کے لئے کوئی مستند ماخذ بھی نہیں ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے۔ ایسی حالت میں جناب محمد عباس خاں شروانی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے بڑی جدوجہد اور عرق ریزی کے بعد اس سلسلے پر بہت اچھی معلومات فراہم کردی ہیں کتاب کے شروع میں مقدمہ و تمہید کے بعد جناب مولف نے اُن ماخذوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جن سے اس کتاب کا مصالحہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے چار ماخذ بتائے ہیں۔ (۱) عام کتب تاریخ و سیر (۲) سپہ سالار مسعود غازی کی مخصوص تاریخ یعنی مرأت مسعودی (۳) کتبہ جات سنگی و مسی (۴) مقامی روایات۔

جناب مولف نے اپنے ماخذوں سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کوشش کے مقابلے میں انھیں کامیابی بہت کم حاصل ہوئی۔ جس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے۔ اکثر مقامات پر انھیں ظن و تخمین اور قیاس آرائی سے کام لینا پڑا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں بہت سے تحقیق طلب تاریخی امور پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے بحیثیت مجموعی کتاب تاریخ کے طالب علم کے لئے مفید ہے۔ کتاب میں جناب مولف کی اور درگاہ کی مختلف عمارتوں کے متعدد فوٹو بھی ہیں ؎

~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~

صحیفۂ ادب | از جناب شیخ عبدالرحمٰن طارق صاحب منشی فاضل تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحے طباعت وکتابت اور کاغذ اوسط درجے کا قیمت عہ مجلد وسطلا ۸ر ملنے کا پتہ دارالتالیف ہندیکی دروازہ لاہور۔

شیخ عبدالرحمٰن طارق صاحب نے لاہور میں دارالتالیف ہند کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اور اس ادارے کی طرف سے انھوں نے خود اپنی پہلی تصنیف شائع کی ہے۔ کتاب کے شروع میں لاہور کے چند مشہور لوگوں کی تقریظیں ہیں پھر جناب شاداں بلگرامی کا دیباچہ ہے پھر جناب مصنف کا عرض حال ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کی کس مپرسی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس زبان کی طرف سے بے توجہی پر رنج وغم کے آنسو بہائے ہیں واعظوں اور اڈیٹروں کی بھی خبر لی ہے اسی ضمن میں انھوں نے دارالتالیف ہند کے قیام کا ذکر کیا اور اپنی تصنیف کو ناظرین سے روشناس کرایا ہے۔ اس تمام تحریر میں "ادعا" کا رنگ نمایاں معلوم ہوتا ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اسے اُنھوں نے دو بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے شعر وشاعری پر بحث کی ہے اور اس کے لوازم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسرے باب میں مرزا غالب کی شاعری پر تفصیلی بحث ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد عنوان تعین کئے ہیں۔ مثلاً عشقیہ، صوفیانہ، بہاریہ، فلسفیانہ، اخلاقیات وغیرہ، اور ہر ایک عنوان کے تحت اشعار نقل کرکے اُن کی تشریح کی ہے اشعار کی مزید وضاحت کے لئے مشرق ومغرب کے شعرا و علمائے فن کے مثالیہ اشعار اور اقوال بھی نقل کئے ہیں کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور اس خیال سے کہ مصنف کی پہلی کوشش ہے۔ قابل ستائش ہے۔

سلسبیل | یہ جناب آل احمد صدیقی سرور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے شروع میں فردوس نظر کے نام سے سفر کشمیر کے تاثرات ہیں سرور صاحب خود اس کے متعلق فرماتے ہیں۔" ۔۔۔۔۔ اگرچہ تماشا کامیاب تھا لیکن تمنا بے قرار ہی رہی صفحات آیندہ میں یہی بے قراری جابجا منتشر ہے۔" دوسرے باب میں نقش ہائے رنگ رنگ کے زیر عنوان۔ اس سفر کے بعد کی نظمیں ہیں تیسرے باب میں لالۂ صحرا کے عنوان سے شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم کا پردرد مرثیہ ہے۔ چوتھے باب میں غزلیں اور متفرق اشعار ہیں۔

جناب سرور نوجوان اور ہونہار شاعر ہیں کلام میں ایک خاص رنگ اور کیف ہے۔ بعض بعض نظمیں بہت پرزور ہیں اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ۔

حضرت رشید احمد صدیقی کا تعارف اور خود جناب سرور کی تمہید بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بہت نفیس ہے شروع میں حضرت سرور کا فوٹو بھی ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

روح الاسلام | از جناب عبیداللہ خاں صاحب قدسی ایچ پی ایچ اے پرشین پروفیسر سناتن دھرم انٹر کالج بیاور۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ مولوی فضل اللہ خاں بیاور (راجپوتانہ)۔

یہ کتاب انگریزی پڑھنے والے طالب علموں میں صحیح دینی واسلامی جذبہ پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مولف نے کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اعتقادات، تصوف، شہدا، اخلاق۔

جناب مولف نے آخری تین باب محنت اور توجہ سے لکھے ہیں عبارت آسان اور طرز بیان سلجھا ہوا اور موثر ہے۔ البتہ اعتقادات کے بیان میں آسانی اور شگفتگی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لئے طلبا مشکل ہی سے اس کے پڑھنے کی طرف مائل ہوں گے۔ بحیثیت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

مصری افسانے | ازجناب قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اوسط قیمت ۸/ ملنے کا پتہ نیرنگ خیال بک ڈپو لاہور۔

یہ کتاب مصر کے مشہور انشا پرداز مصطفےٰ لطفی منفلوطی کے پانچ اخلاقی افسانوں کا ترجمہ ہے۔ مصطفےٰ لطفی منفلوطی کی انشا پردازی و نثر نگاری نے مصر میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے اس کی کتابیں مصر ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا کے عربی جاننے والے طبقے میں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ قدیم مشرقی طرز واخلاق کا حامی ہے اور جدید مغربی تمدن کا سخت مخالف ہے اس نے اپنی تحریر سے ہمیشہ اصلاح اخلاق اور مغربی تہذیب کے نقائص وعیوب نمایاں کرنے کا کام لیا ہے اس کے افسانے یا ناول طبعزاد یا ترجمے سب میں یہ مقصد مشترک ہے اس کے قلم میں جذبات نگاری کی قدرت کے ساتھ بلا کی تیزی، حدت اور شدت ہے جس کا اندازہ اس کے افسانوں کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے جناب مترجم نے ترجمہ بھی بہت صاف وسلیس اور شگفتہ انداز میں کیا ہے۔

کائنات قبل اسلام | جلد اول ازجناب مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب مولوی ضخامت ۵۰ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ معمولی قیمت ۵/ ملنے کا پتہ گولڈن پریس۔ کانپور

جناب مولوی صاحب نے اسلام سے پہلے کی دنیا کے حالات کا خاکہ کھینچا ہے۔ اور مختلف ممالک کی قدیم مذہبی وتمدنی حالت دکھائی ہے۔

رسائل:-

مولوی دہلی رسول نمبر | رسالہ مولوی کا رسول نمبر اس مرتبہ خاص طور سے شاندار ہے۔ اچھے مضمون اچھی نظمیں تقریباً ۳۰ تصویریں۔ ضخامت ۱۷۰ صفحات بڑی تقطیع اور باریک کتابت اور قابل تعجب یہ امر ہے کہ یہ ضخیم نمبر بھی ایک روپیہ سالانہ چندہ میں ملتا ہے۔

شذرات

پچھلے مہینہ میں ہم نے لکھا تھا کہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب جامعہ کی عمارتوں کے لئے چندہ فراہم کرنے کے واسطے روہیلکھنڈ کے مشرقی اضلاع کا دورہ کریں گے۔ ابھی اس ارادے کے پورا کرنے کا وقت نہ آیا تھا کہ کوئٹہ کی تباہی کی اطلاعیں آنے لگیں۔ یہ سانحہ جس قدر دردناک اور حسرت انگیز ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمدردی و انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس وقت ہر قسم کے دوسرے چندے بند کر کے کوئٹہ کے مصیبت زدہ بھائیوں کی یکسوئی کے ساتھ امداد کی جائے اُن کے گھر برباد ہو گئے ہیں۔ ہزاروں عورتیں بیوہ، بچے یتیم اور بوڑھے بے اولاد ہو گئے ہیں۔ سینکڑوں کے جسم زخموں سے چور اور ہزاروں کے دل فگار ہیں۔ لاکھوں روپیہ کی پونجی غارت ہوئی ہے اور ہزاروں کے روزگار مارے گئے ہیں۔ ان ستم زدہ عزیزوں کے سوا ہمارے ذہن میں اس وقت کوئی دوسرا خیال نہ آنا چاہیئے۔ باقی تمام کام رک سکتے ہیں لیکن یہ کام ہماری اولین توجہ کا مستحق ہے۔



جامعہ نے اپنے آیندہ تعلیمی سال سے فیصلہ کیا ہے کہ دس یتیم اور لاوارث بچوں کی مکمل تعلیم وتربیت کا بندوبست کرے۔ ایسے بچوں کے لئے جو انتظامات فی الحال موجود ہیں وہ پوری طرح قابل اطمینان نہیں ہے۔ ان میں سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ بچہ ہر وقت اپنی یتیمی سے باخبر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی نشو و نما پر اچھا اثر نہیں پڑتا اور اس کی سیرت میں محرومیوں کے احساس کی تیزی سے نقایص کے پیدا ہو جانے کا برابر احتمال رہتا ہے۔ جامعہ کے وسائل چونکہ محدود ہیں اس لئے دس طالبعلموں سے زیادہ کا انتظام اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔ ان دس طالب علموں میں پانچ کوئٹہ کے یتیم اور لاوارث بچے ہوں گے۔ ان سب کے لئے ہر طرح کی سہولت بہم کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ ان میں سے ہر بچہ کسی ایک استاد سے خاص طور پر وابستہ کر دیا جائے گا تاکہ بیرونی سرپرست کی حیثیت سے دارالاقامہ

میں وہ اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں اور چھٹیوں کے زمانہ میں جب دوسرے مقیم طلبار اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں یہ بچے بھی اپنے سرپرست کے پاس رہ سکیں۔

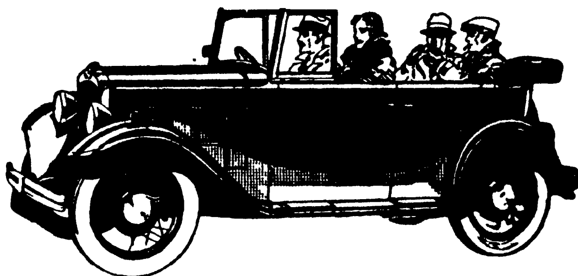


جامعہ کی تعطیلات شروع ہوگئی ہیں۔ کچھ بورڈنگ بدلے جارہے ہیں اور ان میں طلبار کی آسائش اور تفریح کے انتظامات کئے جارہے ہیں۔ گذشتہ سال نئے طلبار کی صحیح تعداد کا چونکہ ابتدا سے علم نہ تھا اس لئے ان کے قیام وتعلیم کا زاید بندوبست نہ کیا جاسکا تھا اور جس قدر رعایت ممکن تھی اس کے بعد داخلہ کی بہت سی درخواستیں نامنظور کرنا پڑی تھیں جس کی وجہ سے بعض صورتوں میں والدین اور سرپرستوں کو بڑی زحمت برداشت کرنا پڑی تھی۔ لہٰذا اس سال جو لوگ اپنے بچے یا خود اپنا داخلہ یقینی کرانا چاہتے ہیں انھیں پہلے سے درخواست بھیج دینا چاہیئے تاکہ اس عرصہ میں ان کے لئے بندوبست کیا جاسکے اور عین وقت پر یہاں آنے سے انھیں مایوسی نہ ہو۔ تعطیلات کلاں کے بعد جامعہ یکم اگست سے کھل رہا ہے۔ درخواستیں مہتمم صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پتہ سے روانہ کرنا چاہئیں۔



Austin

GRAND CAR
WITH
A GREAT TRADITION



The new Austins are now available. These new models with sturdy Cross-braced frames particularly meet the more rigorous conditions in this Country. In addition, every model throughout the range is fitted with Synchromesh gears, direction indicators as standard—50 models covering the whole field of motoring requirements, now have these valuable refinements added to their already World-famed dependability and economy.

USED CARS TAKEN IN PART EXCHANGE

SPECIAL

HOME DELIVERY SCHEME.

Write for Particulars

PEAREY LAL & SONS, LIMITED,

DELHI. RAWALPINDI.

PEAREY LAL & SONS (LAHORE), Ltd.,

LAHORE.

جسٹرڈ نمبر ال-۱۸۹۲



جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ؛ ڈی

قیمت سالانہ صہ مطبع جامعہ دہلی فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ

جامعہ

قائم مقام ایڈیٹر:- محمد عاقل - ایم اے

جلد ۲۴ | جولائی ۱۹۳۵ء | نمبر ۷

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا)

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

اوکاسا OKASA

دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

۱ اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

۲ اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

۳ اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں

۴ اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں پھر عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے۔　　　　آزمائش کیلئے ۳۰ ٹکیاں چار روپے (للعہ)

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی گولیاں استعمال کی جائیں۔ اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں

اوکاسا کمپنی برلن انڈیا (لمیٹڈ) نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس ۲۹۶ بمبئی

حکومت ہند کا مجوزہ دستور

سنہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے ذریعے سے جو اصلاحات ہندوستان کے دستور اساسی میں پارلیمنٹ نے کی تھیں وہ عارضی اور تجربہ کے لئے تھیں اور پارلیمنٹ نے یہ پیشگی فیصلہ کیا تھا کہ دس سال بعد تمام مسئلہ پر از سر نو غور کیا جائے گا اور اس عرصہ میں اصلاحی تجاویز کے عملی تجربہ سے جو خرابیاں اور نقائص ظاہر ہوں گے ان میں ترمیم اور تنسیخ کی جائیگی۔ ہندوستانی قوم پرستوں کو یہ اصلاحی تجاویز ابتدا ہی سے ناپسند تھیں۔ انھوں نے ان کے خلاف طرح طرح سے احتجاج کئے اور چاہا کہ مقررہ مدت سے پہلے ہی ان میں ان کی مرضی کے مطابق ردو بدل ہو جائے۔ لیکن باوجود شورش و ہنگامہ کے اس چیز کی طرف دھیان نہیں دیا گیا گو حکومت ہند اور صوبجاتی حکومتوں کی طرف سے کچھ سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیاں اصلاحات کے متعلق رپورٹیں وغیرہ تیار کرتی رہیں۔ جب مقررہ مدت کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو بہت سی کمیٹیاں اور شاہی کمیشن بیٹھنا شروع ہوئے، بٹلر کی ریاستوں کی کمیٹی، سائمن کمیشن اور اس کی متعلقہ کمیٹیاں، بری اور امدادی افواج کی کمیٹی، وغیرہ لیکن چونکہ ان کے تقرر سے ہندوستانیوں کا اطمینان نہیں ہوا اور انہیں خود اپنی قسمت کے فیصلہ کے کاموں میں شریک نہیں کیا گیا اس لئے ملک میں ہنگامہ برپا رہا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر مسٹر سائمن دستوری کمیشن کے صدر نے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سے کہا کہ مناسب یہ ہے کہ ملک معظم کی حکومت کے نمایندوں اور برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمایندوں کی ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا جائے تاکہ پارلیمنٹ کے سامنے ایسی تجاویز پیش کی جاسکیں جو عام طور پر اکثریت کے لئے قابل قبول ہوں۔

۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ء کو لارڈ اروِن نے جو اُس وقت وئسرائے تھے اور ۱۸ر دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کو وزیر ہند نے واضح اور صاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان کی دستوری ترقی کا مقصد نو آبادی طرز کی حکومت ہے اور یہ بات ملک معظم کے سنہ ۱۹۱۷ء کے اعلان میں مضمر ہے۔ گول میز کانفرنس اور ان اعلانات

سے ملک میں نسبتاً بہتر فضا پیدا ہو گئی ۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا اور جس دن پورے مندوبین کا پہلا اجلاس ہوا ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں نے کل ہندوستان کے وفاق یعنی آل انڈیا فیڈریشن میں شریک ہونے کے لئے آمادگی کا اظہار کر دیا ۔ اس کانفرنس کی کارروائی نامکمل رہی اور اس کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا لیکن اس کے اختتام پر وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے حکومت برطانیہ کی پالیسی کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ۔

" ملک معظم کی حکومت کی رائے یہ ہے کہ حکومت ہند کی ذمہ داری مرکزی اور صوبہ جاتی جماعت ہائے قانون ساز کو صرف ایسی شرائط کے ساتھ پوری طرح سپرد کر دی جائے جنھیں زمانۂ انتقال حکومت میں بعض مطالبات اور دوسرے مخصوص حالات کی ضمانت کے لئے ناگزیر سمجھا جائے ۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی سیاسی آزادیوں اور حقوق کی ضمانت بھی ضروری ہے ۔

" زمانہ انتقال حکومت میں جن محافظتی قوانین کی ضرورت ہے ان میں ملک معظم کی حکومت اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھے گی کہ محفوظ اختیارات کو اس نہج سے قانون میں درج اور بعد میں نافذ کیا جائے کہ جس سے نئے دستور کے ذریعہ سے مکمل ذمہ داری کی طرف ہندوستان کی جو ترقی ہو اس پر کوئی خراب اثر نہ پڑ سکے ۔"

قومی حکومت کی طرف سے اسی بات کو دوبارہ دوسری گول میز کانفرنس میں دوہرایا گیا ۔

اپریل ۱۹۳۳ء میں وائٹ پیپر شائع ہوا جس میں دستوری اصلاحات کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی تجاویز درج تھیں ۔ اس پر غور کرنے کے لئے برطانیہ کی پارلیمنٹ نے ایوان عوام اور ایوان امرا کی ایک مشترکہ کمیٹی بنائی جس نے برطانوی ہند کے مندوبوں کو بھی اپنے مشوروں میں شریک کیا ۔ جب ان مندوبوں نے دیکھا کہ پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی میں رجعت اور ردعمل کی طرف رجحان زیادہ ہے تو انھوں نے ایک میمورنڈم پیش کیا جو نہایت اعتدال اور معقولیت پر مبنی تھا اور ہندوستان کے کمترین مطالبہ کا اظہار کرتا تھا ۔ لیکن مشترکہ کمیٹی نے اس کی تجاویز کو بھی مسترد کر دیا ۔

یہ مختصر تاریخ ہے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ کی اور دستور ہند کے اس مسودہ قانون کی جواب

دارالعوام سے گذر کر دارالامرا میں منظوری کے لئے پہنچ گیا ہے۔

اس تمام روداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال کے اصلاحی تجربوں پر غور کرنے کے لئے چھ سات سال سے زیادہ صرف کئے جا چکے ہیں اور معلوم نہیں ابھی کتنی مدت اور اس کام کے لئے صرف کی جائے گی اور حال یہ ہے کہ جن تجاویز کو آخری طور پر اختیار کر کے قانونی جامہ پہنایا جا رہا ہے انھیں قبول کرنے کے لئے ملک میں کوئی طبقہ تیار نہیں ہے۔ کانگریس کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ تو نو آبادی طرز کی حکومت لینے پر بھی آمادہ نہیں ہے مگر آزاد، اعتدال پسند، ہندو فرقہ پرست، مسلم فرقہ پرست، ریاستیں غرض کوئی بھی اس دستور سے خوش نہیں ہے۔

حکومت برطانیہ کے مدبروں نے دستور اساسی کیلئے گذشتہ چھ سات سال میں جتنی کوششیں کی ہیں اُن سب میں خوف اور گھبراہٹ کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں پر اعتماد کرنا نہیں چاہتے۔ انھیں ڈر ہے کہ اگر ان کو ذرا سا بھی اقتدار دیا گیا تو پھر ہمارے اقتدار کا خاتمہ ہے اس لئے ایک مرتبہ جس چیز کو ایک ہاتھ سے دیتے ہیں دوسرے ہاتھ سے فوراً اُسے واپس لے لیتے ہیں اگر ایک ہاتھ سے ذرا سا سہارا دیتے ہیں تو دوسرے ہاتھ سے نیچے ڈھکیل دیتے ہیں۔ بعض نہایت معقول، اعتدال پسند وسیع اور مستند لوگوں کا خیال ہے کہ نئے دستور کا مسودہ تو موجودہ دستور سے بھی خراب ہے اور اس نئے دستور سے تو پرانے دستور پر قائم رہنا ہی بہتر ہے۔

آیئے ذرا دیکھیں کہ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی سفارشات اور گورنمنٹ آف انڈیا بل میں ایسے کیا نقائص پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے سر فیروز سیٹھنا، سر چمن لال سیتلواڈ اور سر کاؤس جی جہانگیر جیسے اعتدال پسند نائٹ بھی اس کے مخالف نظر آرہے ہیں۔

سب سے پہلی بات جو اس ضمن میں قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری رپورٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا بل کو "اکثریت کی وہ عام مقبولیت" حاصل نہیں ہے جس کے لئے گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ کسی ایسی حکومت کے دستور کے لئے جو خود مختار ہونے کا حوصلہ رکھتی ہے پہلی شرط یہ ہے کہ سیاسی احساس رکھنے والی آبادی کے ایک کثیر حصہ کی اُس سے تشفی ہوتی ہو اور عوام کے نمائندوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا ہو۔

کمیٹی نے دستور بناتے وقت کسی ہندوستانی سیاسی جماعت کے مشورہ کو حتیٰ کہ برطانوی ہند کے مندوبین کے میمورنڈم کو بھی جو حد درجہ اعتدال پر مبنی تھا اور ہندوستان کے کمترین مطالبہ کو ظاہر کرتا تھا قبول نہیں کیا۔ ان حالات میں جو دستور بنے گا وہ ہندوستان کا اپنا بنایا ہوا نہ ہوگا بلکہ غیروں کا مسلط کیا ہوا ہوگا اور اس لئے اصول خود اختیاری کے منافی ہوگا۔

دوسری بات جس کے لئے ہندوستان کی طرف سے پیہم مطالبہ تھا اور جس کا آخر وسیرائے اور وزیر ہند نے وعدہ بھی کر لیا تھا وہ یہ تھی کہ دستور میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے کہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کا مقصد نوآبادی طرز کی حکومت ہے۔ اس بات کو قصداً مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے نظر انداز کیا جس سے کمیٹی کی نیت کی طرف سے سخت بدگمانی پیدا ہوگئی اور بعد کی اشک شوئی سے اس کی تلافی نہ ہوسکی۔

تیسری بات جو اس سلسلہ میں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اس بات کا کوئی تعین نہیں کیا کہ کتنی مدت میں ہندوستان میں نوآبادی طرز کی حکومت کے قائم ہو جانے کا امکان ہے۔ تحفظات کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کیا یہ ابدی اور اٹل ہیں یا کبھی ان کے ختم ہونے کا بھی وقت آئے گا اور اس بات کا کون فیصلہ کرے گا کہ اب ان تحفظات کو ختم ہو جانا چاہیئے۔

مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنے قول کے مطابق چار بنیادی اصولوں پر اپنے مجوزہ دستور کی بنیاد رکھی ہے:-

(۱) خود دستور کے اندر نشوونما کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔

(۲) صوبوں میں عاملہ کو مضبوط ہونا چاہیئے۔

(۳) انتظام وعملہ کو متدین اور اعلیٰ اہلیت کا ہونا چاہیئے۔

(۴) متصادم اغراض ومفاد میں توازن قائم رکھنے کے لئے ایک غیر جانبدار حاکم کو برسر اقتدار ہونا چاہیئے۔

پہلا اصول خاص طور پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ "خود دستور کے اندر نشوونما اور ترقی کے عناصر موجود ہونا چاہیں" یہ بات نہایت مناسب ہے اور ہر شخص اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ

ترقی کے اس بیج کو جو نشو و نما پاکر ایک تناور درخت بن جائیگا پارلیمنٹری کمیٹی نے اپنی رپورٹ کے کس حصہ میں دبا کر رکھا ہے اور اس سے کمل ذمہ دار اور نو آبادی طرز کی حکومت کیسے پیدا ہوگی۔ کمیٹی بظاہر صرف غیر تحریری روایتوں (کنونشنس) پر بھروسہ کرنا چاہتی ہے۔ لیکن یہ غیر تحریری روایتیں تصادم کے امکانات کو تو شاید رفع کر سکتی ہیں اور ایک حد معین تک ترقی کا بھی سبب ہو سکتی ہیں مگر ان سے کمل ذمہ دار اور نو آبادیوں کے مرتبہ کی حکومت پیدا نہیں ہو سکتی۔ مانٹیگو چیمس فورڈ کے دستور میں ایک مقررہ میعاد گذرنے کے بعد تحقیقات اور اس کی بنیاد پر تبدیلی اور اصلاح کی سفارش کی گنجایش تھی مگر مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے اس میعادی تحقیقات کے امکان کو بھی ختم کر دیا۔ اُن کے یہاں ایک سفارش البتہ اس نوعیت کی ہے جس میں درج ہے کہ اگر ہندوستان کی کوئی مجلس مقننہ دستور میں ترمیم کی کسی قرارداد کو منظور کرے اور گورنر جنرل یا گورنر کے حضور میں تحریری عرضداشت پیش کرے کہ ملک معظم ازراہ لطف و کرم پارلیمنٹ کو اس امر سے مطلع فرمائیں تو یہ قرارداد پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے سامنے اُس مجوزہ فیصلہ کے ساتھ جو ملک معظم کی حکومت اس مسئلہ کے بارے میں کرنا چاہتی ہو پیش کی جائے گی۔ یہ سفارش جس قدر ناکافی ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے ہندوستان کی مجبوری اور بے چارگی میں کمی واقع نہیں ہوتی اور خود دستور کے اندر نشو و نما کا امکان پیدا نہیں ہوتا۔

کمیٹی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ صوبوں میں عاملہ کو مضبوط ہونا چاہئے۔ یہ اگر مان بھی لیا جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس مضبوطی کو حاصل کرنے کے لئے گورنر کو وہ تمام مخصوص اور امتیازی اختیارات سونپ دئے جائیں جن کی مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی نے سفارش کی ہے۔

کمیٹی کا تیسرا اصول یہ ہے کہ ایک متدین اور اعلیٰ اہلیت رکھنے والا عملہ حکومت کے لئے وہی کام کرتا ہے جو ریڑھ کی ہڈی انسانی جسم کے لئے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اعلیٰ ملازموں کو ایسے حقوق دے دئیے جائیں جو مجوزہ دستور نے انھیں دئیے ہیں۔ ان کے مرتبہ اور مراعات کا فیصلہ کرنے کے لئے دو چیزوں کا خیال رکھنا ضروری ہے اول تو وزرا اور ان کے مابین جو تعلقات ہوں ان میں صحیح فرق مراتب کا خیال رکھا جائے اور دوسرے ہندوستانی رعایا کی معاشی اہلیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ کسی حکومت کو حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا پر ناقابل برداشت محاصل کا بار ڈال کر اعلیٰ اہلیت کے افسر مقرر کرے۔ ایسی صورت میں اعلیٰ اہلیت کو

قربان کیا جا سکتا ہے۔

کمیٹی کا آخری اصول کہ انصاف کی ترازو کے پلوں کو برابر رکھنے کے لئے ایک غیر جانب دار شخص کو برسر اقتدار رہنا چاہیئے اُس وقت تک تو اہم سمجھا جا سکتا ہے جب تک ہندوستان کے مختلف فرقوں اور مرکز و صوبوں کے درمیان تصادم پایا جائے۔ لیکن جب ہندوستانی اور برطانوی اغراض میں تصادم ہو اس وقت کمیٹی کے منتخب کئے ہوئے اشخاص پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ گورنر کے امتیازی اختیارات پر پابندی عاید کرنے والی کوئی اور جماعت ہو جس پر عام طور پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

اب ذرا آئیے اور زیادہ تفصیل کے ساتھ مشترکہ کمیٹی کی سفارشات اور گورنمنٹ آف انڈیا کے مسودہ قانون پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ کس حد تک یہ موجودہ دستور سے بہتر ہیں یا اس سے بھی خراب اور بدتر ہیں۔

نئے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس سے صوبوں کو خودمختاری مل جائیگی اس ضمن میں سب سے پہلے صوبجاتی خودمختاری کے مفہوم کی وضاحت کر دینا چاہیئے۔ مختلف آدمیوں کے ذہن میں اس کے مختلف مفاہیم ہیں۔ لیکن جب ہندوستانی رائے عامہ کے ایک حصہ نے اس کا مطالبہ یہ سمجھ کر کیا تھا کہ یہ نوآبادی طرز کی حکومت کی جانب دوسرا قدم ہے تو وہ اس کا مفہوم ایسی حکومت سمجھتے تھے جس میں صوبہ کی حکومت عوام کی منتخب کی ہوئی مجلس مقننہ کو جواب دہ ہوگی اور برطانوی پارلیمنٹ کا اقتدار ختم ہو جائے گا۔ لیکن مشترکہ کمیٹی کے نزدیک صوبہ جاتی خودمختاری کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ ان کے نزدیک صوبہ کے تمام اختیارات کا منبع و مرکز عوام کی منتخب کی ہوئی مجلس مقننہ نہیں ہے اور صوبہ کی مجلس عاملہ کا تمام معاملات میں مجلس مقننہ کو جواب دہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس خودمختاری میں گورنر اور مقننہ دونوں شریک ہوں گے!

جہاں عوام کی حکومتیں پائی جاتی ہیں وہاں جماعت عاملہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ عوام صرف مجلس مقننہ کا انتخاب کرتے ہیں اور عاملہ کو اس کا جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عوام مقننہ اور عاملہ دونوں کا علیحدہ علیحدہ انتخاب کرتے ہیں اور عاملہ مقننہ سے آزاد رہ کر بھی اپنے اختیارات کو استعمال کر سکتی ہیں اور مقننہ اپنے فرائض قانون سازی کو پورا کرتی رہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ صوبوں میں ان دو قسموں کی عاملہ میں سے کس قسم کو منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ صوبہ جاتی حکومتوں میں عوام کی منتخب کی ہوئی عاملہ جو مقننہ سے آزاد رہ کر اپنا کام کرتی ہے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ مشترکہ کمیٹی نے ایک قسم کی پارلیمنٹری حکومت یعنی مقننہ کو جواب دہ عاملہ بنانے کی کوشش کی ہے۔

اس فرق کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ غور اور مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ گورنروں کو جو اختیارات کمیٹی نے دیئے ہیں بعض دوسرے ملکوں میں بھی عاملہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان ممالک میں عاملہ کو عوام منتخب کرتے ہیں تو اس مشابہت سے کمیٹی کی تجاویز کے لئے وجہ جواز پیدا نہیں ہوتی اور یہاں کی حکومت مختار کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہو جاتی۔ اس لئے اگر کمیٹی صوبہ جاتی خود مختاری دینے کا دعوے کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عاملہ کو مقننہ کا جواب دہ بنا رہی ہے گویا پارلیمنٹری طرز کی خود مختاری قائم کر رہی ہے۔

پارلیمنٹری طرز کی خود مختاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مقننہ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے اور اس کا اظہار مندرجہ ذیل چار اہم طریقوں پر ہوتا ہے:۔

(۱) قانون سازی میں

(۲) محاصل اور خرچ کی نگرانی میں

(۳) انتظام مملکت میں۔ اور سب سے بڑھ کر

(۴) عاملہ کو مقرر اور برطرف کرنے میں

مؤخر الذکر سے مراد یہ ہے کہ کوئی عاملہ اس وقت تک برسر اقتدار نہیں رہ سکتی جب تک اُسے مقننہ کی اکثریت کی تائید حاصل نہ ہو۔ آیئے دیکھیں کہ صوبوں کو جو خود اختیاری دی گئی ہے اُس میں یہ چیز کہاں تک حاصل ہوئی ہے۔

(۱) سب سے پہلے قانون سازی سے ابتدا کیجئے۔ اس میں صوبہ کی مجلس مقننہ کے چار اور مد مقابل نظر آتے ہیں جنھیں صوبہ کے لئے اسی طرح قانون بنانے کا حق حاصل ہوگا جیسا خود صوبہ کی مقننہ کو۔ ان میں سے ایک برطانوی پارلیمنٹ ہے جو حق رائے دہندگی، حلقہ ہائے انتخاب اور طریقہ ہائے انتخاب کے تمام مسائل

کے متعلق خود قانون بنائے گی ۔ اس معاملہ میں گویا ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کو بدستور قائم رکھا گیا ہے ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رجعت پسند بات یہ ہے کہ آیندہ دارالامرا میں ہندوستان کے متعلق جو مسودہ قانون ان کی منظوری کے لئے پیش ہوگا ۔ اور جسے دارالعوام منظور کرچکا ہوگا اُس کی آخری منظوری میں یہ نہ صرف تاخیر کرسکیں گے بلکہ اپنی طرف سے دارالعوام کی تجاویز کو مسترد بھی کرسکیں گے ۔

اس کے بعد دوسرا سدِ مقابل گورنر ہوگا جسے "گورنر کے قوانین" بنانے کا اختیار ہوگا اور ان پر صوبہ کی مقننہ کو ترمیم و تنسیخ تو کجا بحث و مباحثہ کا بھی حق اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک گورنر خاص طور پر اس بات کی اجازت نہ دے ۔ اس کے علاوہ گورنر کو ہنگامی قوانین بنانے کا ہر وقت اختیار ہوگا اور یہ ایک دفعہ چھ مہینہ تک جاری رہنے کے بعد دوبارہ چھ مہینہ کے لئے جاری کئے جاسکتے ہیں ۔ ایسے محکموں میں جو وزراء کی ماتحتی میں ہوں گے ہنگامی قوانین مقننہ کے مجتمع ہونے کے صرف چودہ دن بعد تک جاری رہیں گے ۔ لیکن ایسے محکموں میں ایک دوسرے طریقہ پر ہنگامی قوانین زیادہ عرصہ تک جاری رکھے جاسکتے ہیں ۔ گورنر پر سال میں صرف ایک مرتبہ مقننہ کو جمع کرنے کی پابندی عاید کی گئی ہے ۔ اس لئے اگر گورنر اور وزرا چاہیں گے تو محض ہنگامی قوانین کے ذریعہ سے ایک سال تک حکومت کرسکیں گے ۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا ہمیشہ کیا بھی جائے گا ۔ لیکن دستور میں اس قسم کا اختیار اُنھیں حاصل ہے ۔ پھر کمیٹی نے اپنی سفارشات کے ذریعہ سے گورنروں کو منتقل شدہ محکموں کے لئے بھی قانون بنانے کا حق دے دیا ہے جو موجودہ دستور میں اُنھیں حاصل نہیں ہے ۔ اس وقت گورنر صرف اپنی منظوری نہ دے کر ان محکموں کے قوانین کو مسترد کرسکتا ہے لیکن نئے دستور میں وہ قوانین کو مسترد بھی کرسکے گا اور اپنے طرف سے بھی بنا سکے گا ۔ اس لئے اگر وزرا چاہیں گے تو گورنر کی وساطت سے مقننہ کی مرضی کے خلاف قانون بنوا سکیں گے ۔

مجلس مقننہ کا تیسرا سدِ مقابل گورنر جنرل ہے ۔ مشترکہ کمیٹی نے گورنر کو تو مخصوص اختیارات دئے ہی تھے کہ وہ امن و امان قائم رکھے ، اقلیتوں کے حقوق اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد کی نگہداشت کرے لیکن صرف گورنر کے مخصوص اختیارات سے کمیٹی کا اطمینان نہیں ہوا اس لئے اُس نے گورنر جنرل کو بھی اس کام میں شریک کیا ہے ۔ اگر گورنر جنرل کو خیال ہو کہ گورنر ان معاملات میں اپنے فرایض کو ٹھیک طریقہ پر انجام

نہیں دے رہا ہے تو اُسے صوبہ کے معاملات میں مداخلت اور قانون سازی کا اختیار حاصل ہے اور اس طرح وہ اپنی مخصوص ذمہ داریوں کی بجا آوری کے سلسلہ میں جس محکمہ کے لئے چاہے قانون بنا سکتا ہے۔

پھر گورنر جنرل کو دستور میں ایک اور اہم حق یہ حاصل ہے کہ وہ مرکزی اور صوبہ جاتی محکموں کی تقسیم میں جب چاہے ردو بدل کر سکتا ہے۔ صوبہ جاتی حکومتوں کو اختیارات تفویض کرنے کے بعد جو اختیارات باقی بچتے ہیں وہ گورنر جنرل کو مل جاتے ہیں۔ اس لئے بعض اہم مسائل کے متعلق وہ جب چاہے اس بات کا اعلان کر سکتا ہے کہ فلاں محکمہ یا مسئلہ صوبہ جاتی حکومت سے متعلق نہیں ہے بلکہ مرکزی حکومت سے متعلق ہے۔ اس کے علاوہ گورنر جنرل کو حق حاصل ہوگا کہ جب یکساں قوانین صوبوں اور مرکز میں بنائے جائیں تو مرکزی قانون کو صوبہ کے قوانین کے مقابلہ میں مرجح قرار دے۔

صوبہ کی مقننہ کا چوتھا مدمقابل مرکزی یعنی وفاقی مقننہ ہوگی۔ بعض معاملات میں صوبہ اور مرکز دونوں کو قانون بنانے کا حق حاصل ہوگا اور مرکزی قانون کو صوبہ کے قانون پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ صوبہ کی مقننہ پانچ قانون ساز جماعتوں میں سے ایک ہوگی اور جن معاملات میں قانون بنائے گی بھی ان میں گورنر کی خوشنودی مزاج کی پابند ہوگی۔ کیونکہ اگر گورنر کو اس کا کام پسند نہ آئے تو وہ اعلان کر سکتا ہے کہ دستور پر عمل ناممکن ہو گیا ہے اس لئے مقننہ برطرف کی جاتی ہے اور اس کے بعد اپنے آپ قانون بنا کر حکومت چلا سکتا ہے۔ اس معاملہ میں بھی مشترکہ کمیٹی کی مجوزہ تجاویز موجودہ دستور سے زیادہ خراب ہیں۔ کیونکہ موجودہ دستور میں اس قسم کی کارروائی کو صرف اس وقت جائز رکھا گیا ہے جب دستور پر عمل کلیتہً ناممکن ہو جائے۔ لیکن کمیٹی کی مجوزہ تجاویز میں جزی طور پر ناقابل عمل ہونے کی صورت میں بھی یہی کارروائی اختیار کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ قانون بناتے وقت مجلس مقننہ پر برابر یہ ہیبت سوار رہیگی کہ کہیں گورنر کے پاس سے یہ پیغام نہ آجائے کہ اس قانون سے امن و عدالت، اقلیتوں کے حقوق اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے لہٰذا اس پر غور و مباحثہ ترک کیا جائے۔

پھر بقیہ میدانوں میں جہاں مقننہ نسبتاً آزاد رکھی گئی ہے وہاں بھی اور مختلف پابندیاں

پائی جاتی ہیں۔ پولس ایکٹ میں کوئی ترمیم یا تنسیخ گورنر کی پیشگی منظوری کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ پھر جس قانون کو چاہے گورنر اپنی ترمیموں کے ساتھ مقننہ میں دوبارہ غور کے لئے واپس کر سکتا ہے۔ غرضکہ گورنر کی حیثیت نئے دستور میں ایک مطلق العنان بادشاہ جیسی ہوگی۔

(۲) اب آئیے صوبہ جاتی خود مختاری کے دوسرے پہلو یعنی آمدنی و خرچ کے مسئلہ کو دیکھیں پہلے محاصل عاید کرنے والے قوانین کو لیجئے۔ گورنر کو ہمیشہ اختیار ہوگا کہ "گورنر کے قوانین" کے ذریعہ سے صوبہ پر نئے محاصل عاید کر سکے۔ پھر گورنر اپنے ہنگامی قوانین کے ذریعہ سے بھی وقتی طور پر محاصل عاید کر سکتا ہے۔ گورنر جنرل بھی اپنے ہنگامی قوانین اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنا سکتا ہے۔ غرضکہ محصول عاید کرنے میں بھی صوبہ کی مقننہ خود مختار نہیں ہے بلکہ اس کی تین اور مد مقابل ہیں۔

خرچ کی منظوری کا اختیار بھی مقننہ کو بلا شرکت غیرے حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ بعض بڑے بڑے اخراجات پر مقننہ کی رائے لینا ضروری نہ سمجھی جائے گی۔ آمدنی کو اخراجات کی مختلف مدوں میں تقسیم کرنے کے تناسب کون مقرر کرے گا اس مسئلہ پر وضاحت کے ساتھ کمیٹی نے بحث نہیں کی ہے لیکن یہ نتیجہ اخذ کرنا غالباً صحیح ہے کہ اس بات کا تعین گورنر ہی کرے گا کہ کتنے اخراجات کے لئے مقننہ کی منظوری لی جائے اور کتنے کے لئے نہ لی جائے۔ پھر جن اخراجات کو مقننہ نامنظور کرے گی انہیں دوبارہ منظور کرنے کا اختیار بھی گورنر کو حاصل ہوگا۔ چنانچہ جو اخراجات منظور کئے جائیں گے وہ تین قسم کے ہوں گے اول ایسے جن کی مقننہ نے منظوری دی دوسرے ایسے جنھیں مقننہ نے نامنظور کیا لیکن گورنر نے منظور کیا اور تیسرے ایسے جو مقننہ کی اظہار رائے کے لئے پیش ہی نہیں کئے گئے اور گورنر نے بہ اختیار خود انہیں منظور کر دیا۔

(۳) انتظام مملکت کے روزمرہ کے مسائل میں بھی مقننہ کی رائے آخری تسلیم نہیں کی جائے گی۔ ایسے معاملات میں جہاں گورنر کو اپنی مخصوص ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہوگا وہ خود اپنی طرف سے کاروبار چلانے کے لئے قاعدے مقرر کر دے گا۔ ان مخصوص ذمہ داریوں میں اقلیتوں کے حقوق اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد اور امن و قانون شامل ہوں گے۔ قدرتی طور پر ان مسائل کے متعلق مقننہ میں جو بحث بھی کی جائیگی

اُس میں گورنر کے بنائے ہوئے قاعدوں کی پابندی کرنا ہوگی۔ اور مقننہ ان مسائل کے بارے میں جن نتائج پر پہنچے گی اُن پر عملدرآمد ممکن نہ ہوسکے گا۔ پھر اقلیت اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مسائل ایسے نہیں ہیں جو صرف چند محکموں تک محدود رہیں گے بلکہ کسی محکمہ میں پیدا ہوسکتے ہیں اس لئے ملازموں کا مقننہ کے زیر اثر ہونا لازمی نہ رہے گا۔ اگر مقننہ اپنا اثر قائم کرنے پر مصر ہوگی تو دستور کو جزئی طور پر ناقابل عمل قرار دیکر مقننہ کو برطرف کردیا جائے گا اور گورنر وزراء کے ساتھ مل کر حکومت کا کام چلاتے رہیں گے۔

(۴) اب پارلیمنٹری طرز کی حکومت کے آخری اختیار کو لیجئے۔ یہاں ہندوستانی دستور کا دوسرے خودمختار دستوروں سے اختلاف پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے۔ انگلستان میں مقننہ دارالعوام کیبنٹ کو بناتی، قائم رکھتی اور برطرف کردیتی ہے کوئی وزارت اس وقت تک حکومت نہیں کرسکتی جب تک اُسے اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو۔ جب کبھی اکثریت اس کی طرفدار نہیں رہتی وزارت یا تو مستعفی ہوجاتی ہے یا مقننہ کا انتخاب دوبارہ کراتی ہے تاکہ نئے انتخاب میں اُسے اکثریت حاصل ہوسکے۔ اگر نئے انتخاب میں اکثریت حاصل ہوجائے تو فبہا ورنہ اُسے استعفا دینا پڑتا ہے۔ دوسری خصوصیت انگلستان کی وزارت کی یہ ہے کہ اُس کے تمام اراکین میں یکجہتی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وزارت یکجائی طور پر ہر محکمہ کے معاملات کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وزراء کا تقرر ملک معظم کرتے ہیں لیکن یہ تقرر وزیر اعظم کی سفارش پر ہوتا ہے جو خود مقننہ میں جو جماعت اکثریت رکھتی ہے اُس کا رہنما ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مجوزہ دستور میں گورنر پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے وہ چاہے تو یکجائی طور پر وزراء کا تقرر کرسکتا ہے اور چاہے تو فرداً فرداً۔ اگر وہ نہ چاہے تو وزیر اعظم کے تقرر کی بھی اُس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ وہ چاہے تو عاملہ کے ہر جلسہ کی صدارت کرسکتا ہے۔ انگلستان کا بادشاہ اور نوآبادیوں کا گورنر عاملہ سے بالا اور ارفع ہوتا ہے لیکن ہندوستان کا گورنر اُس کا ایک جزو ہوگا۔ وزراء کا کام مشورہ اور امداد دینا ہے۔ لیکن گورنر اُن کا مشورہ ماننے کے لئے پابند نہ ہوگا۔ وزراء کی بات نہ مانی جائے تو وہ استعفےٰ دے سکتے ہیں گورنر ان کی جگہ دوسرے وزراء کا تقرر کردے گا۔ اگر دوسری وزارت میں شریک ہونے کے لئے کوئی تیار نہ ہو تو وہ مقننہ کو برطرف کردے گا۔ اس کے بعد نیا انتخاب کیا جاسکتا ہے

اگر نئے انتخاب سے بھی مقننہ کی وہی صورت رہے اور مطیع و فرمانبردار وزرا دستیاب نہ ہوں تو اس میں گورنر کی پوری جیت ہے۔ وہ پرانے وزرا کو واپس نہ بلائے گا بلکہ وہ وزرا اور مقننہ دونوں کا خاتمہ کر دیگا اور تمام اختیارات پر خود قابض ہو جائے گا۔ دستور کی اس تباہی کا سبب صرف یہ ہوگا کہ گورنر اور وزرا میں اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مقننہ کو حکومت کے بنانے یا نہ بنانے کا اختیار نہ ہوگا۔ حکومت کا ایک بڑا اور معتدد حصہ یعنی گورنر اور اعلیٰ عہدہ دار مقننہ کی نگرانی کا اثر قبول کرنے کے لئے مجبور نہ ہوں گے۔ مقننہ اگر کسی وزارت کی حمایت کرے گی تو اس سے اس کی زندگی میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ وزارت اور خود مقننہ دونوں کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

پھر گورنر کو اختیار ہوگا جب چاہے مقننہ کا اجلاس منعقد، ملتوی اور ختم کر دے اور وہی اپنے اختیار تمیزی سے اس بات کا بھی فیصلہ کرے گا کہ مقننہ کا اجلاس کس مقام پر ہونا چاہیئے یغرض گورنر مقننہ کا مالک ہوگا۔ وزرا کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ کمیٹی نے ان پر اتنا اعتبار بھی نہیں کیا کہ انھیں مشورہ دینے کا حق ہی حاصل ہو جاتا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ پتہ چلا کہ مجوزہ تجاویز سے صوبہ جاتی خود مختاری کا گراں بہا تحفہ کسے عنایت فرمایا گیا ہے ذرا مشکل ہے۔ مقننہ کو تو اس سے خود مختاری ملے گی نہیں کیونکہ ایسے کسی معاملہ میں جس میں گورنر سے اس کا اختلاف ہوگا اس کا فیصلہ آخری نہ مانا جائے گا۔ دستور کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جب کبھی گورنر اور مقننہ میں اختلاف ہو قصور ہمیشہ مقننہ کا ہوگا۔ تو پھر کیا خود مختاری گورنر کو ملے گی ؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے کیونکہ گورنر بجائے خود آخری حاکم نہیں ہے بلکہ اپنی تمام مخصوص ذمہ داریوں، اختیارات اور فیصلہ ہائے تمیزی میں وہ گورنر جنرل اور اس کی معرفت وزیر ہند کو جواب دہ ہے۔ پھر کیا گورنر جنرل کو یہ خود مختاری ملی ہے ؟ اسے بھی نہیں کیونکہ اسے تمام ایسے معاملات میں جہاں یہ اپنے خاص اختیارات استعمال کرے گا وزیر ہند کے احکام کی تعمیل کرنا ہوگی نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ جاتی خود مختاری وزیر ہند اور برطانوی کیبنٹ کو عنایت فرمائی گئی ہے۔ لیکن انھیں تو پارلیمنٹ کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے خود مختاری پہلے سے ہی حاصل تھی۔ پھر

مشترکہ کمیٹی نے خواہ مخواہ انھیں کیوں زیر بار احسان کیا!

ممکن ہے اس تمام بیان کو مبالغہ پر محمول کیا جائے۔ آئیے دو ٹھوس مثالیں لے کر دیکھیں کہ ہمارا بیان کہاں تک صحیح ہے۔ فرض کیجئے ایک وزارت عوام کے اس قدیم مطالبہ کے پورا کرنے کا تہیہ کرتی ہے کہ جماعت عاملہ کے ذمہ عدالت کا کام سپرد نہ ہونا چاہیئے۔ لیکن اپنے اس فیصلہ پر عمل وہ گورنر کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے امن و قانون اور اعلیٰ عہدہ داروں کے مفاد پر اثر پڑتا ہے جو خاص طور پر گورنر کی نگرانی میں دیئے گئے ہیں۔ گورنر وزرا کا فیصلہ قبول کرنے کے لئے پابند نہ ہوگا اور مقننہ میں اس مسئلہ پر بحث و مباحثہ کو جب چاہے بند کر سکے گا۔ دوسری مثال لیجئے۔ ہندوستانی رائے عامہ نے ہمیشہ ذمہ دار اور بے ضرر سیاسی رہنماؤں کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی والوں کا لگا رہنا ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے فرض کیجئے کہ ایک وزیر اس برائی (؟) کو ختم کر دینے کی ہمت کرتا ہے۔ اُسے فوراً گورنر کے مخصوص اختیارات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ نئے دستور کے مطابق انسپکٹر جنرل آف پولیس گورنر کی اجازت کے بغیر وزیر کو ان رپورٹوں کے دکھلانے سے بھی انکار کر سکتا ہے جو اس قسم کے سی۔ آئی۔ ڈی والے دیتے ہیں۔ مقننہ کا وزیر کی حمایت میں ہونا وزیر کے کچھ کام نہ آئے گا۔ اگر انھوں نے کچھ اکڑ دکھائی تو اس سے نہ صرف وزیر صاحب کی وزارت چھن جائیگی بلکہ غریب مقننہ کو بھی یہ اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔

صوبہ جاتی خود مختاری کی اس طویل بحث کے بعد کہ یہی فی الحقیقت مشترکہ کمیٹی کا سب سے بڑا کارنامہ بیان کیا جاتا ہے اب آئیے اس کی دوسری سفارشات کا بھی مطالعہ کریں۔

مشترکہ کمیٹی نے ہندوستانیوں کے اس دعوے کو تسلیم کیا کہ مرکزی ذمہ داری کے بغیر صوبہ جاتی خود مختاری مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے انھوں نے مرکز میں بھی ایسے وزرا کا تقرر کرنا منظور کیا جو مقننہ کو جواب دہ ہوں گے لیکن ایک ہاتھ سے جو کچھ دیا تھا وہ مندرجہ ذیل طریقہ پر دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیا:۔

(۱) مرکزی مقننہ کو وفاقی طرز کا بنایا۔ اس وفاق میں برطانوی ہندوستان اور دیسی ریاستیں

دونوں کو شامل کیا ۔ ریاست کے نمایندوں کی تعداد کا تناسب ایک تہائی رکھا۔ طریقہ انتخاب بالواسطہ تجویز کیا یعنی صوبوں کی مجالس مقننہ وفاقی مجلس کے لئے نمایندے منتخب کرکے بھیجیں اور ریاست کے حکمراں اپنے نمایندے نامزد کریں ۔ یہ تمام تجاویز مجوزہ دستور کو موجودہ دستور سے بھی زیادہ خراب بنا دیتی ہیں ۔ اگر وفاق صرف برطانوی صوبوں کا ہوتا اور طریقہ انتخاب بلا واسطہ ہوتا تو صورت حال بہتر ہوتی ۔ لیکن بالواسطہ انتخاب سے ترقی پسند جماعتوں کو آسانی سے مرکزی مجلس میں اکثریت نہ حاصل ہوسکے گی ۔ پھر ریاستوں کے نامزد کئے ہوئے ایک تہائی قدامت پسند اراکین ہمیشہ حکومت کا ساتھ دے کر ترقی کی مخالفت کیا کریں گے ۔

(۲) تمام محکمے وزرا کو سپرد نہیں کئے گئے ہیں بلکہ ایک طرح کی دوعملی قائم کردی گئی ہے ۔ جو محکمہ وایسرائے اور اس کے مشیروں کو سپرد کئے گئے ہیں اُن کے متعلق فیصلہ کرتے وقت وزرا کی کونسل کو مشورہ میں شریک نہ کیا جائے گا بلکہ اپنی ذاتی مرضی سے وایسرائے جس طرح چاہے فیصلہ کرسکے گا ۔

(۳) پھر جو محکمے وزرا کو سپرد بھی کئے گئے ہیں ان میں تحفظات اور وایسرائے کے مخصوص اختیارات اور ذمہ داریوں کی وجہ سے وزیروں کے اختیارات بہت محدود ہوگئے ہیں ۔

(۴) فوج اور مدافعت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم تھا کیونکہ ان پر اختیار ملے بغیر خود مختاری کی تمام گفتگوئیں محض دھوکہ اور فریب ہیں ۔ لیکن مدافعت، غیر ملکی تعلقات اور فوج کے مسائل وایسرائے کی نگرانی میں رکھے گئے ہیں جن پر وزرا اور مقننہ کو کوئی موثر اختیار حاصل نہیں ہوگا ۔

(۵) اس کے بعد اہم چیز مالیات ہے ۔ مالیات میں محاصل عاید کرنے اور خرچ منظور کرنے کے اختیارات صرف جزئی طور پر وزرا کو دئے گئے ہیں اور وایسرائے کو اپنے مشیر مال کی معرفت مداخلت کا بہت بڑا اختیار حاصل ہے ۔ محاصل درآمد و برآمد کے ذریعہ سے اپنی صنعتی و تجارتی تامین کی جو آزادی ہندوستان کو حاصل ہوگئی تھی وہ بھی واپس لے لی گئی ہے کیونکہ مشترکہ کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ " برطانوی تجارت کے خلاف جب کوئی تعزیری قانون بنایا جائے " تو وایسرائے کو مداخلت کرنے کا حق حاصل ہے ۔ یہ چیز بہت مبہم ہے اور اس کی توضیح ، تعبیر میں وسعت کی بہت گنجایش ہے ۔

(۶) ہندوستانی مدت سے اس بات کا مطالبہ کر رہے تھے کہ ساحلی جہاز رانی صرف ہندوستانیوں کے لئے مخصوص کر دی جائے اور غیر ملکیوں کو اس میں مقابلہ کا موقع نہ دیا جائے۔ اس قسم کا ایک مسودہ قانون موسوم بہ "حاجی بل" گزشتہ مجلس مقننہ میں پیش بھی کیا گیا تھا جو مجلس کے جلد برطرف ہو جانے کی وجہ سے منظور ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ مگر کمیٹی نے یہ کہہ کر کہ چونکہ ہندوستانی کمپنیوں کو برطانوی سمندروں میں جہاز رانی سے کوئی نہیں روکتا اس لئے انھیں بھی برطانیہ کو اپنے ساحلوں میں جہاز رانی سے نہ روکنا چاہیے۔ نامنظور کر دیا اس دلیل کی ستم ظریفی اور منافقت محتاج وضاحت نہیں۔ ایک بالشتئے سے کہا جاتا ہے کہ تمھیں دیو اپنے سے کشتی لڑنے کی اجازت دیتا ہے تم اُس سے کشتی لڑنے میں کیوں تامل کرتے ہو۔

(۷) پہلی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی طرف سے برابر اس امر کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ بنیادی یا "کلیدی" اور نوخیز صنعتوں کو صرف ملکیوں کے لئے محدود کر دیا جائے۔ اکثر ممالک اسی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ ہمیں بھی ملکیوں اور غیر ملکیوں میں امتیاز کرنے کا حق ملنا چاہیے۔ خود برطانیہ کے دستور میں اس قسم کی امتیازی کارروائیاں پائی جاتی ہیں اور نوآبادیوں میں نقل سکونت، حق انتخاب، تجارت کی اجازت اور ملکیت کا حق حاصل کرنے کے معاملوں میں برطانوی اور نوآبادیوں کی رعایا کے مابین امتیازی سلوک کو جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ حق بھی ہندوستانیوں کو نہیں دیا گیا بلکہ اس قسم کے جو حقوق موجودہ دستور میں ملے تھے وہ بھی مشترکہ کمیٹی نے چھین لئے۔

(۸) دارالامرائے گورنمنٹ آف انڈیا بل میں جو حال ہی میں ترمیم کی ہے اُس سے مرکزی مقننہ کے ایوان اعلیٰ میں بلاواسطہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں پر بڑا اکرم فرمایا گیا ہے۔ لیکن عوام کی نمایندگی کے فرائض عموماً ایوان ادنیٰ انجام دیتا ہے۔ اس لئے ضرورت اسی میں بلاواسطہ انتخاب کے جاری کرنے کی تھی۔ ایوان اعلیٰ کے لئے یہ چیز اتنی ضروری نہ تھی۔ پھر جس جماعت کو بلاواسطہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے اس کی نوعیت و ساخت کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ایوان اعلیٰ میں کل نشستیں ۲۶۰ ہوں گی۔ ان میں ۱۵۶ برطانوی ہند کے نمایندے ہوں گے اور ۱۰۴ ریاستوں کے۔ برطانوی ہند کے جو ۱۵۶ نمایندے ہوں گے ان میں سے ۲۲ الکٹورل کالج

سے منتخب کئے جائیں گے ۔ اس کے معنی ہوئے کہ ۲۶۰ کی مجلس مقننہ میں صرف ۱۲۸ بلاواسطہ منتخب کئے جائیں گے گویا منتخب شدہ جماعت ہمیشہ اقلیت میں رہے گی ۔ پھر جو لوگ بلاواسطہ منتخب ہوں گے انھیں بھی ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی میں سے صرف ایک لاکھ امیر آدمی منتخب کریں گے ۔ یہ سب کم و بیش قدامت پسند اور رجعت پسند ہوں گے لیکن ان میں سے ۱۰۰ کے متعلق تو پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ برابر حکومت کا ساتھ دیں گے ۔ پھر یہ ایوان اعلیٰ قوت و اقتدار میں کسی حیثیت سے ایوان ادنیٰ سے کم نہ ہوگا ۔ ایسی صورت میں لارڈ زیٹ لینڈ صاحب کی یہ نگاہ لطف و کرم بد نصیب ہندوستانیوں کے لئے اور بھی زیادہ بلاخیز ثابت ہوگی ۔

غرضکہ مندرجہ بالا اور دوسرے اسی قسم کے نقائص کی وجہ سے مشترکہ پارلیمنٹری کمیٹی کی سفارشات اور اس کی بنیاد پر تیار کیا ہوا گورنمنٹ آف انڈیا بل ہندوستانیوں کی اکثریت کے لئے ناقابل قبول ہیں ۔



محکومیتِ نسواں



عورتوں کے متعلق قوانین ایک عرصہ کے غور کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ سوسائٹی نے عورت کی زندگی کا نصب العین محض ازدواج اور ازدواجی زندگی تک محدود کر رکھا ہے۔ عورت کی تعلیم و تربیت میں تمام تر یہی مطمح نظر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ گویا بیاہی زندگی کو دلکش بنانے کی کوشش عورت کے لئے اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے طبقۂ نسواں کی کسی دوسری قسم کی بہبودی لائق التفات بھی نہیں۔ اور اس ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی غیر منصفانہ روش اختیار کرنا گویا جائز ہے۔

شوہر یا "مالک" اگلے زمانہ میں عورتیں یا تو زبردستی اور ظلم سے مردوں کے ہاتھ آتی تھیں یا ماں باپ سے خریدی جاتی تھیں۔ تاریخ یورپ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا تھا بیچ ڈالتا تھا اور اُس کی مرضی کی کچھ پروا نہیں کرتا تھا۔ البتہ مذہب عیسوی نے آکر ازدواج کے لئے ایجاب و قبول کا طریقہ رائج کیا۔ لیکن ترقی کے اس زینہ پر پہنچنے کے بعد بھی عورت کا نکاح قبولتے وقت "ہاں" کہنا یہ محض ایک رسمی بات تھی۔ خود لڑکی کی اتنی مجال کب تھی کہ اپنے والدین کی مرضی کے خلاف "نہیں" بھی کہہ سکتی؟ اگر واقعی کوئی عورت بضد ہو کر شادی سے انکار چاہتی تو اس کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا۔ بجز اس کے کہ کسی کلیسا میں داخل ہو کر راہبانہ زندگی بسر کرنے کا حلف لے لیتی۔ دینِ مسیح کے پھیلنے سے پیشتر عورت کے مقابلہ میں مرد مالک الکل کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورت کے مقابلہ میں مرد کے لئے نہ کوئی تعزیر تھی نہ کوئی قانون۔ مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا۔ لیکن عورت کو کسی حالت میں مرد سے علیحدگی کا اختیار نہ تھا۔ انگلستان کے پرانے قوانین میں مرد کو عورت کا "مالک" کہا جاتا تھا بلکہ حقیقتاً وہ اس کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں "بغاوتِ ادنیٰ" کہلاتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں عورت کو زندہ جلا دینے کا حکم تھا جو بغاوت کی سزا سے بھی زیادہ ہے۔ اور اب تک انگریزی قوانین میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں

عورت گویا مرد کی زرخرید مانی جاتی ہے ۔ اب بھی گرجا میں نکاح کے وقت اُس سے تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا ہے ۔ اور عمر بھر قانون کے رو سے وہ اپنا عہد پورا کرنے پر مجبور ہوتی رہتی ہے ۔ شوہر کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی ۔ اگر چاہے بھی تو اپنے لئے کوئی جائداد نہیں پیدا کر سکتی اور اگر پیدا کرتی ہے تو وہ سب خود بخود شوہر کی ملک ہو جاتی ہے[۵۱] ۔ اس بارہ میں انگلستان کا قانون عورت کی حیثیت اتنی بھی نہیں باقی رہنے دیتا[۵۲] جو اکثر ممالک میں غلاموں کی تھی ۔ مثلاً قانون روما کے رو سے بعض صورتیں ایسی تھیں جن میں قانون غلاموں کی جائداد پر تصرف کو (یعنی جو آقا نے غلام کو بخش دی ہو) آقا کے لئے حرام قرار دیتا تھا ۔ لیکن انگلستان کی عورتیں ان سے بھی بدتر ہیں ۔ اگرچہ ہمارے قانون میں زن و شوہر "ایک جان دو قالب" کہلاتے ہیں مگر اس لئے کہ عورت کی جائداد شوہر کی جائداد کے مرادف مانی جائے ۔ نہ اس لئے کہ کبھی عورت بھی مرد کی جائداد پر تصرف کر سکے ۔ البتہ اس "ایک جان دو قالب" کے اصول پر مرد اپنی عورت کے افعال و کردار کا دوسروں کے مقابلہ میں ذمہ دار ہے مگر یہ اسی طرح جیسے کوئی آقا اپنے غلام کے افعال کا یا کوئی شخص اپنے مویشیوں کے حرکات و سکنات کا ذمہ دار ہوتا ہے ۔ غرضکہ اس قانونی نظریہ سے مستفید ہے تو مرد نہ کہ عورت ۔ علاوہ شادی کے معنیٰ یہ ہیں کہ عورت خود کو مرد کی غلامی میں دیدے ۔ جہاں تک قانون اور رواج کا تعلق ہے بیاہی سے بن بیاہی اور بیوہ ہر طرح اچھی ہے ۔

محکوم بیوی سے اچھا برتاؤ چنداں لائق تعریف نہیں	میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ لوگ عورتوں کو غلاموں سے بہتر نہیں سمجھتے ۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر لوگ اپنی زوجہ کو لونڈیوں سے بدرجہا زیادہ آزاد اور باحیثیت بنا کر رکھتے ہیں

---

۵۱ ہندوؤں میں بھی اکثر صورتوں میں شوہر اپنی زوجہ کی جائداد کا مالک مانا جاتا ہے ۔ اور مسلمانوں میں اگرچہ قانوناً یہ امر تسلیم نہیں کیا گیا ہے لیکن ہندوستان بھر میں عملدرآمد فی الجملہ اسی اصول پر ہے ۔ دیگر اقوام میں حالت اس سے بہتر نہیں ہے ۔ (مترجم)

۵۲ زمانہ حال میں انگلستان کے قانون میں چند ترمیمات ہوئی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں جن سے عورتوں کے حقوق جائداد میں مستقل تر ہوتے جاتے ہیں ۔ (مترجم)

اور ممکن ہے کہ اُن پر کبھی کوئی تشدد نہ کرتے ہوں۔ بہت سے مرد تو ایسے ہیں جو واقعی زن مرید ہیں۔ اور اپنی بیوی کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ مگر یہ ویسی صورت ہے جیسے کوئی آقا باوجود اپنے وسیع اختیارات کے اپنے غلاموں سے شفقت کا برتاؤ کرتا رہے اور اپنی حکومت جتانا مناسب نہ سمجھے۔ تاہم غلام غلام ہی ہے اور آقا پھر آقا ہے!۔

بعض باتوں میں زوجہ لونڈی سے بھی بدتر ہے

سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ کم از کم سبھی ممالک میں لونڈیوں کو اتنا اختیار ضرور دیا گیا تھا بلکہ اُن کا اخلاقی فرض بھی یہ تھا کہ آقا اگر ان سے مباشرت کرنا چاہے تو وہ انکار کریں آقا انھیں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ کیا اندھیر ہے کہ اپنی زوجہ پر اس قسم کا جبر بھی ہر طرح جائز ہے؟! ہر شوہر کو اختیار دیدیا گیا ہے کہ جب چاہے بغیر زوجہ کی مرضی کے اُس غریب کو اپنی رکیک تریں حیوانی خواہش رفع کرنے کا آلہ بنالے۔ اس سے بڑھکر توہین آمیز جبر کیا ہو سکتا ہے؟ جب کوئی عورت اپنے شوہر کے کسی ظلم سے تنگ آکر اس سے بھاگنا چاہتی ہے تو قانون طرح طرح سے اس کو شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ اولاد اگر ہو تو وہ معمولاً باپ کی ہے نہ کہ ماں کی۔ اگرچہ ماں کے مقابلہ میں باپ جو شفقت اولاد کے ساتھ کر سکتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ انگلستان کا قانون اب تک یہی ہے کہ شوہر خواہ کتنا ہی جابر و ظالم کیوں نہو جب تک اُس کے ظلم کے ثبوت کے ساتھ اُس کی زناکاری کا ثبوت بھی نہ دیا جائے وہ بیچاری طلاق بھی نہیں مانگ سکتی۔ اور مرد اگر عورت کو صرف زناکار ثابت کردے تو اُسے بآسانی طلاق کی ڈگری مل سکتی ہے۔ اگر کوئی عورت شوہر کو چھوڑ کر جانا چاہے تو اپنے گھر کا ایک حبہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔ مرد چاہے تو اُسے زبردستی پکڑ لائے یا عدالت کے ذریعہ سے پکڑ بلائے[۱] یعنی تاوقتیکہ عدالت دونوں میں قانونی مفارقت نہ کرائے عورت شوہر کے ساتھ رہنے سے قانوناً انکار نہیں کر سکتی۔

---

[۱] لیکن اب یہ قانون نہیں رہا۔ برطانوی ہندوستان میں بھی اب عورت کو شوہر کے ساتھ رہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عام طور پر عملدرآمد جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ اکثر ہندوستانی ریاستوں میں البتہ اب بھی تقریباً یہی قانون باقی ہے۔ (مترجم)

غلام اور بیوی کے قانونی حقوق کا مقابلہ

مردوں کے اس غیر معمولی اقتدار نے عورتوں کو ازحد پست بنا رکھا ہے۔ ہر چیز مردوں کے قابو میں ہے اور ذرا ذرا سی بات کے لئے عورت مرد کی محتاج ہے اور اسی پر اس کو بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے لازمی طور پر اس کی خواہش بلکہ خدا سے دعا یہی ہوتی ہے کہ شوہر اچھا ملے جو اسے چاہے اور اس کو ہمیشہ اپنی محبوبہ بنائے رکھے۔ لطف یہ ہے کہ اتنے بڑے مسئلہ کے پیش نظر ہونے کے باوجود اس بیچاری کو شوہر کے انتخاب کا فی الجملہ ایک ہی موقع ملتا ہے۔ اور جب بعد کو اسے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب غلط تھا تو اس محکومیت کی بدولت قدرتی طور پر اس کے دل میں ایک جدید انتخاب کی آرزو پیدا ہوتی ہے کہ کاش وہ کسی بہتر حاکم کی محکوم بنکر رہتی اور اس شخص کی اسیر دام نہ رہتی جو ظالم ثابت ہوا۔ اس صورت حال کے دکھانے سے میرا منشا یہ ہرگز نہیں کہ عورتوں کو آئے دن شوہر بدلنے کی اجازت دیدی جائے۔ میرا منشا صرف اس قدر ہے کہ جس طبقہ کے لئے بجز غلامی اور محکومیت میں زندگی بسر کرنے کے دنیا میں کوئی چارہ کار نہیں ہے اس طبقہ کے افراد کو فقط اپنے آقا کے انتخاب کا حق دیا بھی گیا تو کیا؟ اپنا بر خود تلاش کرنے کا اختیار ان حالات میں اگر دیا گیا ہے تو وہ کوئی آزادی نہیں ہے۔ بے شک عورت اور غلام میں اتنا ہی فرق ہے کہ یہ اپنا مالک خود منتخب کر سکتی ہے اور غلام کو یہ اختیار نہیں۔ لیکن دور غلامی کی تاریخ میں ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ ظلم و تعدی ثابت کرنے کی صورت میں غلام اپنے آقا کو قانوناً مجبور کر سکتا تھا کہ وہ اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کردے۔ مگر عورت کے لئے سخت سے سخت ظلم کی شکایت بھی طلاق پانے کے لئے کافی نہیں تاوقتیکہ وہ شوہر کی زناکاری بھی ثابت نہ کرے۔

عورتوں اور غلاموں کی دنا شعاری کی تشریح

میں کوئی مبالغہ کرنا نہیں چاہتا اور نہ مبالغہ کی کوئی حاجت ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ قانون نے عورت کو جس قدر ذلیل بنا رکھا ہے عملی زندگی میں دراصل وہ اتنی ذلیل نہیں وجہ یہ ہے کہ مرد کا مفاد عورت کی ذات سے اس قدر وابستہ ہے کہ وہ عورت کو خود بھی زیادہ نہیں دبا سکتا۔ یہ عورت کی بہت بڑی خوش نصیبی ہے کہ مرد اپنے تمامی قانونی اختیارات اس کے خلاف نہیں استعمال کرنے پاتا لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ وہ مرد کے جذبات اور محسوسات ہیں جو عورت کو مہلت زیست عطا کئے ہوئے ہیں! موجودہ طرز معاشرت کی حمایت کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ مرد و زن میں اگر مساوات نہیں تو نہ سہی مگر عورت کے

حقوق کم ہیں تو اس کی سے ایسے بے پایاں فوائد حاصل ہیں کہ اس صورت حال کو انگیز کرنا چاہئے۔ مگر کسی قسم کے جبر وظلم کو قانوناً جائز رکھنے کی ضرورت جتانے سے خواہ وہ ضرورت فی نفسہٖ ثابت ہو یا نہ ہو مگر آدمی کی حریت پسندی کے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ دنیا میں ظلم کا قانونی جواز ہی نمو و آزادی کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ مطلق العنانی اگر دنیائے سیاست میں کوئی بری چیز ہے تو اس کا وجود خانگی دنیا میں بھی اسی قدر برا ہے۔ اور دونوں سے ایک ہی قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ لوگ مرد اور عورت کی باہمی محبت کی طرف اشارہ کرکے خانگی ظلم کی حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مرد ظالم اور حکومت پسند سہی پھر بھی عورتیں اپنے شوہروں پر جان فدا کئے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی بات پرانے زمانہ کے غلاموں پر بھی صادق آتی ہے۔ روما اور یونان کے غلام بھی اپنی جان قربان کر دیتے تھے لیکن اپنی وفاداری پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ نہ اُن سے بڑھ کر کوئی مظلوم تھا نہ اُن سے بڑھ کر جاں نثار۔ لیکن اس وفاداری اور خلوص کے زندہ نمونے باقی رکھنے کے لئے اُس جابرانہ قانون غلامی کو باقی رکھنا کبھی قرین عقل نہیں سمجھا گیا۔ بے شک دنیا کا یہی دستور ہے کہ آزاد آدمی اُتنا وفادار نہیں ہو سکتا جتنا کہ ادنیٰ غلام۔ جنس وفا ظلم ہی سے پیدا ہے۔ اور وہ اس طور پر کہ جو شخص ظلم کر سکتا ہو اور پھر بھی ظلم سے باز رہتا ہے تو اس سے اظہار تشکر انسان کا خاصہ ہے۔ یہی اظہار تشکر جاں نثاری کی حد تک پہونچ سکتا ہے جو گویا وفاداری کی انتہا ہے۔

مرد کی مہربانی اُس کے اقتدار کو جائز نہیں بناتی

اب اُن لوگوں سے بڑھ کر لائق شکر گذاری اور قابل تعریف کون ہو سکتا ہے جس کا یہ حال تھا کہ اگر چاہتے تو ایک پل میں ہزاروں لاکھوں انسانی ہستیوں کو بلا خوف باز پرس نیست و نابود کر دیتے مگر پھر بھی وہ ایسی حرکتوں سے باز رہے؟ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کسی انسان کا اس حد تک با اختیار ہو جانا اصولاً قابل ستائش یا قابل برداشت ہے؟ اسی طرح مرد اگر عورت کے مقابلہ میں اپنے سارے اختیارات کام میں نہ لائے تو وہ اپنی بساط کے لحاظ سے قابل ستائش ضرور ہے۔ لیکن اس کا اس قدر با اختیار ہونا ہی ایک مخدوش بات ہے۔

مرد کو تشدد سے کہاں تک روکا گیا ہے

اکثر دیکھا گیا ہے کہ رواج غلامی، سیاسی مطلق العنانی، اور خانگی خود رائی ان سب کی حمایت جب کبھی کی جاتی ہے تو صرف بہترین مثالیں پیش کرکے کی جاتی ہے۔ اس سے کس کو

انکار ہے کہ ان صورتوں میں بھی شریف انسانوں کی شرافت اپنا جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ لیکن اگر دنیا میں سب لوگ شریف ہی ہوا کریں تو ہر چیز اچھی ہو جائے۔ قانون اور قاعدے اچھوں کی روک کے لئے نہیں بنائے جاتے بلکہ بُرے لوگوں سے ڈر کر بنائے جاتے ہیں اور اُنہی کے لئے ہوتے ہیں۔ زن و مرد کے تعلقات کے سے عالمگیر مسائل بھی محض اچھی مثالوں اور جزئی واقعات کو پیش کر کے حل نہیں کئے جا سکتے۔ دنیا کے ہر مرد کی نیک دلی اور رحم پر کون بھروسہ کر سکتا ہے؟ یہ کہنا مقصود نہیں کہ دنیا کی عورتوں اور مردوں کو رواداری اور خلوص کی تعلیم بے کار ہے یا تضیع اوقات کے مرادف ہے۔ کہنا یہ ہے کہ نہ ہم محض اس تعلیم پر بھروسہ کر سکتے ہیں نہ یہ تعلیم ہر فرد بشر کو دے سکتے ہیں۔ ابتک جو تدابیر مرد و زن کے حقوق کی حفاظت کے لئے قانون اور رواج نے کی ہیں محض یکطرفہ ہیں۔ بُری عورتوں کے لئے ہر طرح کی تعزیر موجودہ نظام قوانین میں موجود ہے لیکن بُرے مردوں کی روک ٹوک کا اہتمام قانون سازوں کے نزدیک چنداں ضروری نہیں۔ بُرے سے بُرے مرد کی ماتحتی میں بھی کوئی نہ کوئی بدنصیب عورت ضرور دیدی گئی ہے جو اگر چاہے تو بعض صورتوں میں بلاخوف تعزیر اُسے موت کے گھاٹ اُتار کر اپنے اختیارات کا ثبوت دے سکتا ہے۔ کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ادنیٰ طبقوں میں مرد کا اپنی عورت کو مارنا اور گالیاں دینا کوئی غیر معمولی بات سمجھا جاتا ہو۔ یہ نتیجہ بس اسی خیال کا ہے کہ عورت ایک شئے محض ہے جو مرد کے حوالہ کر دی گئی ہے اور اُسے وہ جس طرح چاہے استعمال کرے۔ ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ اپنی زوجہ کو مارنا کوئی قانونی جرم نہ تھا۔ اور اب بھی کم از کم رواج کی رو سے شوہر اپنی زوجہ کے ساتھ بہت کچھ ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جو کسی اور کے ساتھ اگر کرے تو نہایت مطعون ہو۔ حال میں اگر قانون نے اس بارے میں کچھ ترقی کی ہے تو اس قدر کہ مرد اگر اپنی عورت پر تشدد کرتا ہے تو اُسے سزا دیجاتی ہے لیکن ایسی سزا سے کیا فائدہ کہ سزا کے بعد اگر وہ چاہے تو اپنی سزا کا بھی عوض اس مظلومہ سے لے لے؟ جب تک ایسی سزاؤں کے بعد اُس مظلومہ کو علیحدگی کا قانونی حق نہ دیدیا جائے ایسی سزائیں دراصل عورت کیلئے اور بھی زحمت کا باعث ثابت ہوں گی۔

شریف مرد، یا درندے بشکل انسان؟

کوئی غور تو کرے کہ دنیا میں ایسے مردوں کی تعداد کتنی ہوگی جنھیں ہم وحشی درندوں سے بہتر نہیں خیال کر سکتے ہیں؟ اور موجودہ قوانین ازدواج کی بدولت ان درندوں کو

اپنے شکار پر قابو حاصل کرنے میں کتنی آسانیاں ہیں ؟ ان حالات پر اگر صحیح طریقہ سے غور کیجئے تو واقعی کلیجہ منہ کو آتا ہے ۔ جس قسم کے لوگوں کو "شیطان مجسم" کہہ سکتے ہیں ممکن ہے کہ تعداد میں وہ اُتنے ہی نہوں جتنے کہ دنیا کے فرشتہ خصال لوگ ۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسے لوگوں کی کمی ہرگز نہیں جنھیں درندہ کہنا حقیقتاً بالکل بجا ہو ۔ اور انہی میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں غیر متعلق لوگ تہذیب کا پتلا باور کرتے ہیں یہ وہی ہیں جن سے بڑھکر قانون کا احترام بظاہر کوئی نہیں جانتا ۔ اور جو اپنے ماتحتوں اور محکوموں کے علاوہ ہر ایک کے لئے خوش خلقی کا مجسم نمونہ ہیں اور شرافت کے پتلے بنے ہوئے ہیں ۔ ان دورُخے شریفوں کا حال اُن مظلوموں کے دلوں سے پوچھیئے جن کی زندگی کا دارومدار اُن کے چشم کرم پر ہے اور جن کی زندگی ان بدنفس موذیوں نے حرام کر رکھی ہے !

مساوات حقوق کی ضامن ہے | مرد جو اب تک ہر شعبۂ زندگی میں برسر اقتدار رہے ہیں اُنھوں نے کم از کم سیاسی دنیا میں اپنے آپ کو بے پایاں اقتدار کا اہل نہیں ثابت کیا اور اپنی نااہلیت کو صدیوں کے مباحثہ اور مجادلہ کے بعد تسلیم کر لیا ۔ ان مباحثوں میں جو دلائل پیش کئے جاچکے ہیں وہ اُن کی نوک زباں پر ہیں اور اب قلم بند بھی ہوچکے ہیں اب جو بات پیش نظر ہے وہ یہ کہ جو اختیارات مردوں کو حاصل رہے ہیں وہ کچھ اس بنا پر اُنھیں نہیں ملے تھے کہ اُنھوں نے خود کو سلیم الطبع اور حلیم ثابت کیا تھا ۔ اور نہ وہ تمام اختیارات اُن کے لئے اس بنا پر چھوڑے جاسکتے ہیں کہ اُن کی مطلق العنانی سے خانگی معاملات میں کسی خاص بہبودی کی توقع ہوسکتی ہے ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا میں رذیل شخص اپنی شرارت اپنے غصہ اور اپنی خودغرضی کا اظہار اگر کرتا ہے تو اکثر اُسی کے مقابلہ میں جسے وہ اپنے سے کمتر اور کمزور سمجھتا ہے ۔ اس قسم کی بری خصلتوں کی جڑ دراصل حکومت پسندی کا جذبہ ہے جو بغیر حاکم اور محکوم کا تعلق پیدا ہوئے رونما نہیں ہوسکتا ۔ اور مساوات ہی وہ چیز ہے جس سے بدنفسوں کی بدنفسی دبی رہ سکتی ہے ۔ جو شخص اپنے برابر والوں سے درشتی سے پیش آتا ہو تو سمجھ لیجئے کہ اُس کو ہمیشہ ادنیٰ ہی سے سابقہ رہا ہے اور اسی وجہ سے وہ بدتمیز ہوگیا ہے ۔ ایسا آدمی برابر والوں کی صحبت سے بھاگتا ہے کیونکہ برابر والے اُس کو راضی نہیں رکھ سکتے ۔ وہ صرف اُنہی لوگوں سے خوش رہ سکتا ہے جنھیں وہ ہمیشہ سے عاجزی کرنے اور سہنے کا عادی ہے ۔

آدمی کیونکر اقتدار پسند یا ظالم بن جاتا ہے

لوگ کہتے ہیں کہ اچھے گھرانے درحقیقت ہمدردی اور شفقت کی درسگاہیں ہیں۔ جہاں محبت ایثار و انکسار کی عملی تعلیم ہوتی ہے۔ لیکن جہاں اس لاجواب ایثار و انکسار کی تعلیم ہوتی ہے وہاں افسر خاندان کو سب سے بڑھکر خود رائی اور دوسروں کی ناواجب ایثار پسندی کا بھی ذوق پیدا ہو جاتا ہے جو انکی زندگی بھر باقی رہتا ہے۔ اور اکثر رفتہ رفتہ ہوس کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ انسان کے بُرے ارادے جب ہی تک دبے رہتے ہیں جب تک اُن کے دبانے کے لئے کوئی بات موجود ہو۔ اکثر بلا ارادہ بھی ہر شخص دوسرے کو دبانے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر یہ اُسی وقت تک جب تک دوسرا دبتا رہے۔ جب انسان کی فطرت ہی یہ واقع ہوئی ہے تو مرد اپنی عورت کو جو ہر وقت اس کی ہمدم و دمساز ہے کہاں تک نہ دبائے گا؟۔ برابر والوں کی صحبت میں خواہ اُس کی خود غرضی اور سیرت کی خرابیاں پوشیدہ رہیں لیکن کمزور اور محروم الحقوق عورتوں کے مقابلہ میں مرد کی بدمزاجیاں رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ بہت سے لوگ بعض صورتوں میں کہنے لگتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے یا اُس کے والدین نے پہلے سے شوہر کی طبیعت کا اندازہ کیوں نہ کر لیا کہ وہ بعد کو ظالم ثابت ہوا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ لڑکی اور لڑکی والوں کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ پہلے سے کسی مرد کی طبیعت کا صحیح امتحان کر لیا کریں۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ شادی سے پہلے مرد کی طبیعت کا حال ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ اور بعض اوقات شادی سے مرد کی شخصیت ہی بدل جاتی ہے یعنی نیکدل ظالم ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے قانونی اختیارات پر ناز کرنے لگتا ہے۔ جب اُسے غصہ آتا ہے تو وہ سب کچھ کر بیٹھتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی بہت سی حرکتیں اگر ثابت بھی ہوئیں تو قانون کی حد کے اندر ہی رہینگی۔ اور اکثر عورتیں اپنے شوہروں کی بہت کچھ بھلی بُری اس لئے اُٹھا لیتی ہیں کہ وہ خود سمجھتی ہیں کہ دنیا میں وہ غلامی ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں۔

قانون سازوں کو کیا کرنا چاہیئے

غرضکہ انسان اس قدر کم ظرف واقع ہوا ہے کہ وہ بے پایاں اختیارات کا اہل نہیں۔ اگر کوئی مرد زیادتی کر سکے مگر نہ کرے تو بیشک اس کی شرافت ہے۔ لیکن قانون سازوں کے لئے شرافت یہ ہے کہ وہ حتی الامکان "زیادتی" ہی کو ناممکن بنا دیں۔

عذاب جان عورتیں اور ان کا انتقام

میں جانتا ہوں کہ اس تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں اگر عورت چاہے تو ظالم شوہر سے کسی نہ کسی طرح ضرور بدلہ لے سکتی ہے۔ اگر شوہر کو دق کرنا مقصود ہو تو اُسے

دق بھی کرسکتی ہے بلکہ شوہر کے لئے عذاب جان بن سکتی ہے۔ لیکن انتقام تو وہ چیز ہے کہ ظلم کو دور کرنے کے بجائے ظلم در ظلم پیدا کر دیتا ہے۔ دوسرے یہ تو صرف ضدی اور غصہ ور عورتوں کے لئے ہوسکتا ہے جن کے متعلق مجھے بھی یقین ہے کہ اگر انھیں کچھ اختیارات حاصل ہوں گے تو وہ ان کو بہت بری طرح استعمال کرینگی۔ نیک بیبیاں اس بدنما ہتھیار سے کبھی کام نہیں لے سکتیں۔ لیکن بفرض محال کوئی عورت اگر اپنے اس آخری حربے سے کام بھی لے تو فرمائے کہ بالآخر پالا کس کے ہاتھ رہیگا ؟

محبت اور حریت | میں مانتا ہوں کہ دنیا میں محبت وہ چیز ہے جو پتھر کو موم بنا دیتی ہے۔ زن و شوہر میں محبت یوں بڑھتی ہے کہ مدتوں دونوں ساتھ رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ اور بالآخر دونوں کا مفاد زندگی ایک ہوجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عورت مرد پر حاوی ہوجاتی ہے مگر افسوس کہ پھر بھی وہ آزاد نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ سیاسی محکومیت ہو یا خانگی لیکن اس میں شک نہیں کہ محکوم کو چاہے جتنے اختیارات دیدیجئے بلکہ خود اس کے کہنے پر چلنے لگئے لیکن آزادی چیز ہی اور ہے۔ ممکن ہے کہ کسی حرم سلطانی میں کوئی لونڈی ہو جس کی خدمت کے لئے سینکڑوں لونڈیاں مقرر ہوں اور وہ سب پر حکومت کرتی ہو۔ لیکن بہتر تو یہی ہے کہ نہ اُس کی ماتحتی میں کوئی لونڈی ہو نہ وہ کسی کی لونڈی ہو۔ ایسے اختیارات کبھی آزادی کا بدل نہیں ہوسکتے۔ یہ وہ اختیارات ہیں کہ جو خود اُس کے حقوق سے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ اُسے بخشے گئے ہیں اور اخلاقاً اس کے لئے مضر ہیں۔ کیونکہ اُس نے خود کو مٹا کر یہ جزئی راحت حاصل کی ہے۔ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو بالکل اپنا فرمانبردار بنا لیا تو یہ بھی کچھ اچھا نہوا۔ کیونکہ وہ اگر اپنے اثر سے شوہر کو راہ راست پر لگا سکتی ہے تو اُسے گمراہ بھی کرسکتی ہے۔ بحالات موجودہ اس کی تربیت اس قدر محدود اور تنگ نظری کے ساتھ ہوئی ہے کہ بجز خانگی معاملات کے کسی معاملہ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ رائے قائم کرنا اور ضمیر سے صحیح طریقہ پر کام لینا اُس کے لئے بہت دشوار ہے۔ ان حالات میں اگر اس نے اپنے شوہر کے غیر خانگی معاملات میں زیادہ دخل دیا تو یہ بھی خرابی ہی کی نشانی ہے۔

مرد افسر خاندان | لوگ کہتے ہیں کہ جس طرح ہر قوم میں ایک بادشاہ یا سردار ہوا کرتا ہے اسی طرح ہر گھرانے میں ایک افسر خاندان ہونا چاہیئے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ مرد اگر با اختیار نہو تو وہ افسر خاندان کیسے

بن سکتا ہے۔ اور خاندان کا انتظام کیسے ٹھیک رہ سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر گھرانے میں ایک "کرتا" یا افسر ہوا کرے۔ مختلف قسم کی تجارتوں میں برابر دیکھا جاتا ہے کہ کئی کئی آدمی برابر کے شراکت دار ہوتے ہیں۔ نہ اُن میں کوئی افسر ہوتا ہے نہ ماتحت اور سب مل کر شراکت کا کام اور انتظام کامیابی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ یہی صورت ہر خاندان میں پیدا ہو سکتی ہے۔ دوسرا امر یہ ہے کہ اگر خاندان میں افسر خاندان ہونا بھی ہے تو اس کو خاندان والوں پر اس قدر بے پایاں قانونی اختیارات کبھی نہیں حاصل ہوتے جتنے کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں حاصل ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہمیشہ مرد ہی افسر خاندان اور مالک الکل ہوا کرے؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مرد و زن گھرانے کے فرائض آپس میں بانٹ لیں؟ یہ صورت تو بحالت موجودہ بھی بہت سے گھرانوں میں کامیاب نظر آتی ہے۔ اختیارات کی کمی بیشی پر ازدواجی اور خانگی زندگی کا دارومدار اصولاً ضروری نہیں۔ دنیا میں بہت سے خاندان ایسے ملیں گے جن میں عورتیں اپنے مردوں سے کہیں زیادہ لائق اور منتظم واقع ہوتی ہیں۔ اس لئے میرا مطلب یہ ہے کہ جو جس کام کا زیادہ اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام ہونا چاہئے۔ فقط مرد بن جانے سے اہلیت نہیں آجاتی۔

<u>نکاح میں معاہدہ کی تجویز</u> میں یہ مانتا ہوں کہ انتظامی معاملات میں ایسے اُمور آپڑتے ہیں جن میں دو شخصوں کی رائے ایک نہیں ہو سکتی نہ کوئی باہمی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ اور خانگی اُمور میں تو ہر لحظہ ایسے ہی مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ایسے معاملات کو تو ہمیشہ ایک ہی شخص کی رائے پر چھوڑ دینا چاہئے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسے فیصلوں کا حق ہر گھر میں فقط مرد ہی کو حاصل رہے۔ اس کا قدرتی حل تو یہ ہے کہ اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے عورت اور مرد ملکر تقسیم کار کریں اور اپنی اپنی جگہ دونوں خودمختار رہیں۔ بے جا دخل در معقولات کوئی نہ کرے۔ اصولی معاملات میں صلاح و مشورہ بُری چیز نہیں۔ لیکن اگر عورت کے لئے جس امر میں مرد کی رضامندی شرط ہے وہاں مرد کو عورت کی رضامندی حاصل کرنا بھی ضروری ہونا چاہئے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن میں قانون کو دخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن فریقین اگر چاہیں تو نکاح سے پہلے جیسے مالی معاملات کی بابت اکثر سمجھوتا کر لیتے ہیں ان اُمور کی بابت بھی معاہدہ کر سکتے ہیں۔ باہمی مروت جس طرح اور بہت سے معاہدوں کی ضامن ہوتی ہے اس قسم کے معاہدوں کو بھی قائم رکھ سکتی ہے۔ ناچاقی کی تو بات ہی اور ہے جو اگر پیدا ہونا ہے تو

دوسری باتوں کے بجائے ان معاہدوں سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپس کی رضا جوئی کا لحاظ ہوتا ہے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اس کا تجربہ ہیا ہی زندگی میں برابر ہو رہا ہے۔ اور اسی سے یقین ہوتا ہے کہ فریقین کی استعداد اور لیاقت کے لحاظ سے دنیاوی امور کی باہمی تقسیم کی بابت آپس کا سمجھوتہ ہمیشہ ممکن رہیگا۔ اور جس طرح تجارتی شراکتوں میں آپس کے معاہدہ یا سمجھوتے کی بنا پر کامیابی سے کام چلتا رہتا ہے خانگی زندگی میں بھی سب کام چل سکتا ہے۔

باہمی سمجھوتہ اور اتفاق | ممکن ہے یہ کہا جائے کہ موجودہ حالات میں باہمی سمجھوتا اس لئے آسان ہوتا ہے کہ ایک فریق دب جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ دونوں اپنے اپنے قانونی حقوق کے حدود کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ مبادا اگر عدالت تک جانے کی نوبت آئی تو معلوم ہے کہ قانوناً ایک کے حقوق زیادہ ہیں اور دوسرے کے کم۔ لیکن میں یہ کہوں گا باہمی سمجھوتے کی تمامتر یہی وجہ نہیں ہوتی کہ عورت قانون سے خائف ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عورت سمجھوتے پہ راضی ہو جایا کرتی اور مرد راضی نہوا کرتے لیکن پایا یہ جاتا ہے کہ جو لوگ خاصکر بدخو نہیں ہیں ان میں زن وشوکی زندگی عملی سمجھوتے کی حیرت انگیز نظیر ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ مرد کے لئے اُس سمجھوتے پر قائم رہنے کے لئے کوئی نمایاں مجبوری نہیں ہوتی۔ دونوں کے قدرتی اغراض خود ہی ہر فریق کو اس عملی معاہدہ کی پابندی پر مجبور کرتے ہیں اور آپس کی رضامندی اور اتفاق میں کوئی فرق نہیں پیدا ہونے پاتا۔ میں مانتا ہوں کہ زن وشو میں مساوات قائم کرنے کے لئے جن اصول پر عمل کرنا ضروری ہے اُن میں بھی اس کا لحاظ ضروری ہوگا کہ کونسا فریق کس کام کا زیادہ اہل ہے۔ اور اس کا لحاظ کرنے میں بعض اوقات مرد کی افضلیت قدرتاً قابل لحاظ ہوگی۔ مثلاً اکثر صورتوں میں شوہر عمر اور تجربہ میں زوجہ سے زیادہ ہوگا۔ لیکن یہ فرق زیادہ سن آنے پر بالکل غیر اہم ہو جائے گا۔ اور مرد کو محض مرد ہونے کی بنا پر افضل نہ سمجھا جائے گا۔ مگر جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے یہ تو کسی طرح جائز ہی نہیں ہو سکتا کہ ترازو کا کوئی پلہ بھاری کر دیا جائے۔ سیاسی دنیا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جو حکومت آزادی کے اصول پر چلتی ہے اُسے مساوات ملحوظ رکھنا پڑتی ہے۔ جہاں تک اختیارات بخشنے کا تعلق ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک گروہ تو بالکل خودسر اور مطلق العنان بنا دیا جائے اور دوسرا محکوم مطلق۔ اور

پھر یہ بھروسہ کیا جائے کہ حاکم گروہ ہمیشہ مہربان اور روا داری سے پیش آئے گا۔ اول تو وہ آزادی کوئی آزادی ہی نہیں جس کے سلب ہو جانے کا ہر آن دھڑکا لگا رہے۔ اور نہ وہ حقوق کوئی حقوق ہیں جو آن واحد میں بغیر کسی مشورہ یا اطلاع کے ضبط کئے جا سکیں۔ اور موجودہ حالات میں تو حقوق کا وجود ہی خارج از بحث ہے کہ جو کچھ اختیارات ہیں سب مرد کو حاصل ہیں۔ عورت کو نہ صرف یہ کہ کوئی اختیار نہیں بلکہ سخت سے سخت ظلم برداشت کرنے پر بھی اُس کے لئے اخلاقاً اور شرعاً شوہر کی اطاعت فرض خیال کی جاتی ہے!

عورتوں میں "ایثار کا مادہ"

بعض لوگ جب ضد پر آجاتے ہیں تو یہاں تک کہنے لگتے ہیں کہ مرد تو پھر بھی عورت کے ساتھ مروت کرجاتا ہے۔ اگر عورتوں کو کچھ بھی حقوق دیدئے گئے تو بس پھر وہ اپنے ہی حقوق کا راگ گائینگی۔ دوسرے کے حقوق کچھ بھی نہ مانینگی۔ لہذا عورتوں کو سب باتوں میں دبائے رکھنا چاہئے ورنہ پھر یہ کسی بات میں کسی سے دبنے والی نہیں ہیں۔ پُرانے لوگوں کا یہی قول تھا اور انھیں اس کے اعلان میں شرم بھی نہیں آتی تھی۔ اگر عورتوں کا واقعی یہی حال ہے تو یہ مردوں ہی کے برتاؤ کا نتیجہ ہے۔ اُن کے اس حال پر ہنستے ہوئے مردوں کو شرم آنی چاہئے۔ لیکن زمانہ کے لوگ جو سمجھدار ہیں وہ اب صاف صاف یوں نہیں کہتے بلکہ یہی مطلب یوں ادا کرتے ہیں کہ عورتوں میں قدرتاً ایثار کا مادہ زیادہ ہے۔ اور اگر انھیں برابر کے حقوق دیدئے جائیں گے تو ان کی سیرت کی یہ خوبی جاتی رہیگی۔ ان کی خصلت برعکس ہو جائے گی۔

اول تو میں اس بات کو تفصیل کے ساتھ دُہرانا نہیں چاہتا کہ یہ غیر معمولی ایثار عورتوں میں تربیت سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسی طرح پیدا ہوا ہے جیسے مردوں میں خود پرستی اور خود غرضی۔ میں کہتا ہوں کہ عورتوں میں اگر ایثار کی صفت قدرتی ہے تو مساوی حقوق ملنے پر یہ صفت ان میں اور بھی اصلیت کی شان کے ساتھ نمودار ہوگی۔ کیونکہ پھر یہ ایثار کی مجبوری سے نہ ہوگا نہ مرد کی خود غرضیوں کا نتیجہ شمار کیا جائیگا۔ اور ایثار اگر اچھی چیز ہے تو مردوں کو چاہئے کہ خود بھی کچھ ایثار سیکھیں۔ بلکہ اس کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ وہ عورتوں کے حقوق اگر زیادہ نہیں تو مساوی ہی تسلیم کرلیں۔ عورتوں کے حقوق کی کمی نے ابتک اُنکو خود پرستی اور خود غرضی کی تعلیم دی۔ یہاں تک کہ فلسفہ اور مذہب سے بجائے اس کے کہ ایسی ناجائز تعلیم کو

سو کئے کا کام لیا جاتا اس تعلیم کو فروغ دینے کا کام لیا گیا - اگرچہ مسیحیت دنیا میں پیغام مساوات لے کر آئی تھی لیکن یہ اُمید نہیں ہوسکتی کہ اس سے درس مساوات کا کام کبھی بھی لیا جائے گا۔ اور اب سوائے اس کے کہ لوگوں کو مساوات کا احساس عملاً پیدا کرایا جائے اس خود پرستی اور خود غرضی کے مٹنے کی کچھ اُمید نہیں ہوسکتی ۔

بوالہوس عورتیں | دنیا میں ایسی عورتیں یقیناً ہیں جن کو چاہے جتنے حقوق دیدیجئے اور اُن کے ساتھ چاہے جس قدر مساوات برتئے وہ راضی نہیں ہوسکتیں ۔ ایسی عورتوں کا بن بیاہا رہنا ہی بہتر ہے ۔ بلکہ جو لوگ ایسی عورتوں کے دام میں آگئے ہوں اُن کے لئے طلاق کا قانون واقعی آیۂ رحمت ہوگا ۔ مگر موجودہ غیر مساویانہ قوانین کے ہوتے ہوئے ایسی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوسکتا ہے ۔ کمی نہیں ہوسکتی ۔ مرد ایسی عورت کے مقابلہ میں اپنے پورے اختیارات استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے ۔ جس کا آخری نتیجہ عورت کے لئے تباہی ہے ۔ اور اگر اس نے رواداری برتی تو پھر عورت کی دست درازی کی کوئی انتہا نہیں رہتی ۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے قانونی حقوق تو کچھ بھی نہیں ہیں ۔ یوں اُس کو جو کچھ ملجائے غنیمت ہے ۔

عورت کی آزادی کا اثر عام اخلاق پر اور انصاف کا نظریہ | زن و شو کے حقوق کی مساوات سے صرف یہی مقصد نہ پورا ہوگا کہ دونوں کی زندگی عیش و مسرت سے گذریگی ۔ بلکہ اس سے نوع انسان کے لئے یہ دنیا ایک دائمی مدرسۂ اخلاق بنجائیگی ۔ ممکن ہے کہ اس حقیقت کو لوگ مدتوں تسلیم نہ کریں مگر واقعہ یہی ہے کہ اخلاقی احساس کی درستی فقط ہم پلہ اشخاص کی صحبت اختیار کرلے سے ہوسکتی ہے ۔ نوع انسان کی اخلاقی تربیت میں اب تک قوت و اقتدار کا قانون بہت بڑی حد تک شامل رہا ہے ۔ ادنیٰ اقوام میں دیکھئے کہ برابر کی حیثیت رکھنے والوں سے لوگ اپنا کوئی اہم واسطہ نہیں قائم کرتے ۔ بلکہ اگر کوئی واسطہ رکھتے ہیں تو صرف عداوت کا ۔ ایسی سوسائٹی میں ہر شخص دوسرے کے مقابلہ میں یا تو اعلیٰ ہے یا ادنیٰ ۔ گویا سوسائٹی ایک زینہ ہے کہ جس کے کوئی دو قدمچے ایک سطح پر ہو ہی نہیں سکتے ۔ سارے اصول اخلاق اس ایک امر پر مبنی ہیں کہ ایک حاکم ہے تو دوسرا محکوم ۔ ورنہ ایک دوسرے کا دشمن ہے یا رقیب ۔ گو مجھے اس سے انکار نہیں کہ حاکم اور محکوم ہونا ضروریات حیات انسانی سے ہے ۔ لیکن میں یہی کہوں گا کہ شائستہ معاشرت کو مساوات کے اصول پر مبنی ہونا چاہئے ۔ دنیا میں ہم اطاعت، شجاعت، فیاضی سب کا دور دورہ دیکھ چکے ۔ لیکن اس زمانہ میں ہم عدل و انصاف کا

چرچا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب وہ حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ عملی خوبیوں کی بنا انصاف اور صرف انصاف قرار پائیگا۔ اور انصاف کے ساتھ ہمیں ہمدردی کی صفت بھی اختیار کرنا ہوگی۔ یہ کچھ نئی بات نہیں ہے کہ دنیا کی نظر آج اپنے مستقبل پر بالکل نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں چند ہی مخصوص لوگ ہوا کرتے ہیں جو گذشتہ حالات پر غور کرکے مستقبل پر بھی نظر دوڑاتے رہتے ہیں۔

برابری کا دعویٰ کیا اثر رکھتا ہے

انسان کے لئے یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ برابر والوں میں رہ کر زندگی بسر کرسکے صحبت وہی اچھی جس میں برابر کے لوگ شریک ہوں۔ اگر کسی موقع پر میں آپ کی مدد یا آپ کی رہبری کروں تو کل آپ برابری کے دعویٰ کے ساتھ میری مدد اور رہبری کرسکیں۔ اس برابری کا احساس پیدا کرنے کے لئے دنیا میں بہت کم مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اب تک دنیا کی تربیت گاہ مساوات کے اصول سے بہت بیگانہ رہی ہے۔ خاندانی زندگی کو دیکھئے تو خاندان اگر ایک طرف اطاعت اور ایثار پسندی کی درسگاہ ہے تو دوسری طرف انانیت اور خود رائی کی۔ خواہ اس کے ارکان آپس میں کتنی ہی محبت اور شفقت کا برتاؤ رکھتے ہوں لیکن اُن میں مساوات کا کوئی جذبہ نہیں پیدا ہونے پاتا۔ آزاد اور خود مختار قوموں میں "شہریت" بے شک ایک ایسی چیز ہے جو مساوات کے اصول پر قائم کی جاتی ہے۔ لیکن شہریت کا اثر لوگوں کی خانگی زندگی اور عادات و اطوار پر بہت گہرا نہیں ہے۔ اور روزمرہ کے محسوسات انسانی سے اس کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر خاندانی زندگی بھی مساوات کے اصول پر مرتب کیجائے تو پھر خاندان سے بڑھ کر حریت پسندی کی درسگاہ کوئی نہو۔ اور اُس کی عملی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ ارکان خاندان میں حکومت کی جگہ مساوات کو دیدیجائے۔ پھر آپس کے اختلاط سے جو قدرتی ہمدردی پیدا ہوگی وہ انسان کے لائق ایک چیز ہوگی۔ ایسی مساوات اور ہمدردی سب سے پہلے والدین کے باہمی برتاؤ سے ظاہر ہونی چاہئے تاکہ خاندان کے بچے اُن کی تقلید کریں اور اُن اوصاف کے گرویدہ بنیں۔ انسان کو دنیا میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے اُسے وہ پہلے اپنے ہی گھر سے سیکھتا ہے۔ جو شخص اوائل زندگی سے یا تو محکوم بنا رہا ہو یا حاکم اور جس نے اپنے گھر میں بھی مساوات کا برتاؤ نہ دیکھا ہو اُس میں حقیقی آزادی کا جذبہ پیدا ہونا ہی مشکل ہے۔ اور ان حالات میں پرورش پانے کے بعد بھی اگر کوئی خود کو "آزادی پسند" کہتا ہے تو یہ اُسی معنے میں آزادی پسند ہوگا جس معنی میں قدیم عہد علی زمانہ کے جاگیردار اور زمیندار اپنے کو آزادی پسند کہتے تھے۔

حالانکہ جو آزادی وہ اپنے لئے پسند کرتے تھے ایک لمحہ کو بھی دوسروں کے لئے گوارا نہیں کرسکتے تھے۔ وہ درحقیقت اُن کی انانیت تھی جو اُنھیں دوسروں سے مغلوب ہونے کا تصور بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔

شرارت کا قانونی سدباب ہونا چاہئے

موجودہ غیر مساویانہ توانین کے ہوتے ہوئے بھی دنیا میں (اور خاصکر انگلستان کے اعلیٰ طبقہ میں) ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنی بیاہی زندگی میں مساوات کا اصول صحیح طور پر برتتے ہیں۔ واقعی اگر ایسے لوگ موجود نہوں جن کا معیار اخلاق زمانہ کے قوانین سے اعلیٰ وارفع ہو تو پھر قانون میں اصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنی قابل رشک زندگی پر ادنیٰ انسانوں کی زندگی کو قیاس نہ کریں جن کی تعداد دنیا میں زیادہ ہے۔ اُنھیں لازم ہے کہ ایسی اصلاحات کی عملی حمایت کریں جن سے شریروں کی شرارت کا سدباب ہوسکے۔ اور صنف نازک جابرانہ توانین کی گرفت سے آزاد ہوجائے۔ اُنھیں فطرتِ انسانی کی اس حقیقت پر نظر رکھنا چاہئے کہ جو شخص بااختیار بننے کا اہل نہیں ہوتا وہی سب سے زیادہ بااختیار بننا چاہتا ہے۔ اور جو اختیارات اُسے حاصل ہوتے ہیں انھیں استعمال کئے بغیر اُسے چین نہیں آتا۔ اُس کے قلب کی تسکین اس احساس کو زندہ کئے بغیر نہیں ہوتی کہ میں فی الواقع صاحب اختیار ہوں ادنیٰ طبقوں میں ان قانونی اختیارات کے استعمال کرنے والے بکثرت ہوتے ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھئے تو ان کی عورتوں کی زندگی غلامی کی زندگی سے بھی بدتر ہے۔ ان بندیوں کی فرمانبرداری ضرب المثل ہے۔ مگر اسی فرمانبرداری نے شوہروں کا دماغ خراب کردیا ہے۔ یہاں تک کہ شوہر اپنی زوجہ کی جو توہین چاہتا ہے۔ اور یہ جائز بھی سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ زوجہ کے مقابلہ میں اُس کی فرعونیت اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ جس قدر حقارت کا برتاؤ وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ روا رکھتا ہے شاید اتنی حقارت سے دوسری عورت کو دیکھنا وہ خود بھی گوارا نہیں کرتا۔

مذہبی احکام کا عذر

اکثر لوگ جب استدلال سے ہارنے لگتے ہیں تو مذہب کی آڑ پکڑ کر زبان بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے مقابلہ میں بھی کہا جائے کہ مذہب نے عورت کے لئے شوہر کی اطاعت فرض کردی ہے اور اس کے لئے کوئی چون وچرا کی گنجائش نہیں۔ اتنا تو میں خود مانے لیتا ہوں کہ کلیسا کے احکام عورتوں پر یہ فرض ضرور عاید کرتے ہیں لیکن مسیحیت کے احکام سے ایسے کسی فرض کا عاید ہونا اخذ ہوسکتا ہے

یہ میں نہیں مانتا۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ پال نے کہا ہے کہ "اے عورتوں! اپنے شوہروں کی اطاعت کرو" مگر یہ بھی تو سینٹ پال ہی نے کہا ہے کہ "اے غلاموں اپنے آقاؤں کی اطاعت کرو"۔ ان اقوال سے یہ کیا لازم آتا ہے کہ سینٹ پال کسی رواج کو مٹانے یا قائم کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ اُن کا مقصد تو محض مسیحیت کی اشاعت تھا۔ اور وہ زمانہ کے رنگ کے خلاف دنیا کو کسی اور بات پر اُبھارتے تو اُن کا اصلی مقصد بھی فوت ہو جاتا۔ اُنھوں نے تو اُس زمانہ کی مطلق العنان فوجی حکومت کو بھی یہ کہہ کر تسلیم کر لیا کہ جس کسی کو قوت اور اقتدار حاصل ہے وہ سب خدا ہی کی طرف سے ہے۔ اب اس کو چاہے سیاسی حکومت کی "مسیحی" شکل قرار دے لیجئے۔ لیکن اُن کا حکم تو یہی تھا کہ اُس کی بھی اطاعت کئے جاؤ۔ اور اس سے یہ سمجھنا کہ مسیحیت کسی خاص طرز حکومت کو یا زمانہ کے رواج کو تغیر سے محفوظ کرنے آئی تھی دراصل مسیحیت کا درجہ گھٹا کر اُسے مسلمانوں یا برہمنوں کے مذہب کے ہم پلہ بنا دینا ہے۔ اگر مسیحیت کی یہی شان ہوتی تو وہ اُن اقوام کا مذہب بنکر نہ رہ سکتی جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی پر ہیں۔ اسلام اور مذہب ہنود میں یہی بات ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کی اُن قوموں کے مذاہب بنکر باقی ہیں جن کی حیات اگر جمود محض سے تعبیر نہیں ہو سکتی تو تنزلِ دوامی کے مُرادف ضرور ہے۔ تاریخ مسیحیت کے ہر دور میں ایسے لوگ بکثرت ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے مسیحیت کو بھی ہمیشہ اسی قسم کا ایک استبداد پسند مذہب بنا کر دکھانا چاہا۔ ایسے لوگوں کا مقصد زندگی ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ ہم ایک طرح کے مسیحی مسلمان بنکر رہ جائیں اور انجیل کا کام قرآن سے لینے لگیں اور ہر قسم کی اصلاح اور ترقی کو ممنوع خیال کرنے لگیں۔ اس قماش[۵] کے لوگ پرانے زمانہ میں بہت بااثر ہوا کرتے تھے۔ اور جو لوگ اُن کی مخالفت کرتے تھے اُنھیں بڑی بڑی سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھی۔ لیکن اُن کی مخالفت بہر کیف جاری رکھی گئی۔ اگر نہ جاری رکھی گئی ہوتی تو ہم موجودہ ترقی نہ حاصل کر سکے ہوتے۔ اور آئندہ بھی بغیر ایسے لوگوں کی مخالفت کے ترقی کی اُمید نہیں ہو سکتی۔

---

[۵] ہمیں یہ دیکھ کر سخت تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ یورپ کے آزاد خیال سے آزاد خیال آدمیوں کے ذہن بھی جب وہ محکوم اقوام کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں تعصب اور تنگ خیالی سے

عورت کی جائداد اور انگلستان کا قانون

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کے بعد اس بحث کی ضرورت نہیں کہ آیا عورت کی جائداد عقد کے بعد کس حد تک مرد کی جائداد کے مرادف سمجھی جانا چاہئے۔ انگلستان کے قوانین کی رو سے جائداد کے معاملات میں کنواری عورت بیاہی سے اچھی ہے کہ وہ اپنی جائداد پر اختیار رکھتی ہے۔ اکثر لوگ اس خیال سے لرزتے ہیں کہ زن و شو کی جائدادیں الگ الگ ہوا کریں۔ یہ اُن کے نزدیک زن و شو کی مشترکہ زندگی کے نصب العین کے بالکل خلاف ہے۔ میں خود اس خیال کا آدمی ہوں کہ اگر دو شخصوں میں

پاک نہیں ہوتے۔ ل کو ایک لامذہب شخص کہا جاتا ہے۔ اُس کے فلسفیانہ اجتہاد اور بے نظیر قوت استدلال کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ لیکن اوپر کی عبارت پڑھنے کے بعد ہم یہ کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں کہ ذہنی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچ کے بعد بھی آدمی جذبات کا ہی غلام رہتا ہے۔ اوپر کی عبارت کسی عالم اور فلسفی کی لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے کم حیثیت مقرر کی معلوم ہوتی ہے جو اپنے جاہل سامعین کے تعصبات کو برانگیختہ کرکے اپنی دلیل منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ تاریخ مذاہب و اقوام میں ل کی نظر بالکل وسیع نہیں معلوم ہوتی۔ اس نشۂ غرور نے کہ وہ ایک حکمراں قوم کا فرد ہے اس کی قوت شعور و تمیز کو سلب کر لیا ہے محکوم اقوام کی ہر چیز اور ہر اصول زندگی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مشرقی اقوام کے حالات اور مذاہب کے مطالعہ کے لئے اُس کے ماخذ وہ مسیحی مبلغین اور سیاسی مصنفین ہیں جن میں سے اکثر اپنی روزی کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے ہم وطنوں کو اہل مشرق کے مذاہب کے نقائص دکھا کر اُن کو تبلیغ مسیحیت کا حامی بنائے رکھیں۔

جن لوگوں نے قرآن و تاریخ کا مطالعہ ایمانداری سے کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام سے زیادہ حریت پرور مذہب دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ جنوری ۳۵ء کے رسالہ جامعہ میں اسلام اور عورت پر ایک مبسوط مضمون شایع ہوچکا ہے۔ ہم اس سلسلہ میں قارئین کی توجہ خاص طور پر اس مضمون کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اتنا اتحاد ہوجائے کہ دونوں آپس میں اپنے پرائے کی تمیز بالکل اُٹھادیں تو واقعی یہ بات قابل رشک ہوگی۔ لیکن اگر صورت یہ ہو کہ آپ تو میری چیز کو اپنی چیز سمجھیں مگر میں آپ کی چیز کو اپنی چیز نہ سمجھ سکوں ظاہر ہے کہ یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ بلکہ اگر ایسے اتحاد میں ہمیشہ میرا ہی فائدہ رہا کرے تب بھی میں یہی کہونگا کہ میں اس سے باز آیا۔ میں تو انصاف چاہتا ہوں!

امریکہ میں جائداد کا مسئلہ | اس قسم کے غیر منصفانہ برتاؤ کو جو جائداد کے بارہ میں عورتوں کے ساتھ جائز رکھا جاتا ہے میرے خیال میں فوراً موقوف کرنا چاہیئے۔ اور یہ ایک سہل سی بات ہے جو بغیر ہوئے رہ بھی نہیں سکتی ہے[۱۰] جمہوریہ امریکہ کی بعض ریاستوں نے عورتوں کے مالی حقوق کو اپنے نظام اساسی میں تسلیم کرکے اُنھیں کم ازکم زندگی کی ایک راہ میں آزاد کردیا ہے۔ اب وہاں کم ازکم اتنا تو ہوگیا کہ جو لوگ امیر لڑکیوں کے ساتھ محض اُن کی دولت کے لالچ میں شادی کرکے مال و متاع اپنے قبضہ میں کرلیا کرتے تھے۔ اُن کے حوصلے پست ہوجائیں گے۔

عورتیں اور فکر معاش | جن گھرانوں میں گھر بار کا خرچ کسی جائداد کی آمدنی سے نہیں بلکہ محنت کی کمائی سے چلا کرتا ہے وہاں نظام معاشرت یوں قائم ہے کہ مرد کماتا ہے اور عورت گھر کا دھندا کرتی ہے اور بچوں کی پرورش اور ان کی ابتدائی تربیت میں اپنی جان کھپاتی ہے۔ میرے نزدیک یہ تقسیم کار عام طور پر کچھ غیر مناسب نہیں۔ سچ پوچھئے۔ تو اس میں بھی مرد ہی مزے میں رہتا ہے۔ کیونکہ اگر اُس مصیبت کو بھی پیش نظر رکھئے جو عورت کو ایام حمل اور بچوں کی نگہداشت میں ہوتی ہے بلکہ خاندان کی راحت کے لئے گھر بھر کا انتظام کرنے اور جز رسی کے ساتھ شوہر کی کمائی خرچ کرنے اور اُسے پس انداز کرنے میں برداشت کرنا پڑتی ہے۔ تب اندازہ ہوگا کہ عورت پر کیا کچھ نہیں گذرتی۔ میں اس کا قائل نہیں کہ عورت کو گھر کا کام چھوڑ کر کمانے پر مجبور کیا جائے۔ کیونکہ خاندان کو جو نفع وہ اپنے حسن انتظام اور کفایت شعاری سے پہنچاسکتی ہے غالباً اُسقدر نفع وہ اپنی کمائی سے نہیں پہنچاسکتی موجودہ حالات میں جو مرد اپنی عورتوں کو تلاش معاش پر مجبور کرتے ہیں وہ درحقیقت انصاف نہیں کرتے۔ بلکہ بالحساب ظلم

---

[۱۰] برطانیہ میں ۱۹۲۵ء سے عورتوں کو ترکہ مردوں کے مساوی ملنے لگا ہے۔ — مترجم

کرتے ہیں۔ غرضکہ میں اس چیز کو عام رواج کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتا کہ سب بیاہی عورتیں مردوں کی طرح فکر معاش میں مبتلا ہو جائیں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ کم از کم جس عورت کے پاس ذاتی مستقل جائداد نہ ہو اُسے کمانے کی استعداد پیدا کرنا چاہیے۔ جس کے بغیر وہ خودداری اور عزت کی زندگی اپنے شوہر کے گھر میں بسر نہیں کر سکتی۔ اگر شادی کو ایک آزادانہ اور مساویانہ معاہدہ کے طور پر مان لیا جائے تو نہ اطاعتِ غلامانہ کا سوال باقی رہتا ہے نہ شادی کسی فتنہ و فساد کا سبب ہو سکتی ہے۔ صورت حال وہ پیدا ہو جانی چاہیئے کہ نہ تو عورت تمامتر شوہر کی محتاج ہو۔ نہ اُس کی اس قدر پابند ہو کہ اگر وہ اخلاقاً اپنے شوہر سے علیحدہ ہو کر رہنے کی مستحق قرار پائے تو (خواہ طلاق لے یا نہ لے) اُس سے علیحدہ رہ کر زندہ رہ سکے۔ عورت کے شادی پر آمادہ ہونے کے یہ معنیٰ ہونا چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ وہ کوئی اور پیشہ اختیار کرتی اُس نے خانہ داری اور بچوں کی نگہداشت وغیرہ کا پیشہ اختیار کر لیا اور جب تک اُس کی ضرورت اس پیشہ میں رہیگی وہ دوسرا پیشہ نکرے گی۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے پر بھی گھر بار سنبھالنے والی عورتیں ایسے پیشوں سے محروم رہیں گی جو بغیر گھر چھوڑے ہوئے نہیں کئے جا سکتے۔ میرا منشاء عورتوں کو گھر کے باہر گھسیٹنا نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ عورتیں محض عورت ہونے کی بنا پر کسی جائز پیشہ سے روکی نہ جائیں۔ اُنھیں ہر قسم کے کاروبار میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہونچانا چاہیئے۔ اور شادی کے باوجود بھی اُن میں اس کی صلاحیت موجود رہنی چاہیئے کہ وہ جب چاہیں کسی مناسب پیشہ میں لگ جائیں۔ ان کے لئے کوئی رکاوٹ نہ رہے۔ یہ تو وہ امور ہیں جن میں لامحالہ قانون سازی سے بھی مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ جب رائے عامہ ان اصول کو تسلیم کرے گی تو اس اصلاح کے لئے خود بخود مواقع پیدا ہونے لگیں گے اور طبقۂ نسواں کے لئے بہت سی راہیں کھل جائیں گی۔ پھر حسب ضرورت قانون سازی سے بھی کام لیا جا سکتا ہے۔



ہندوستانی کارخانوں کے مزدور

(ذیل میں پروفیسر احمد مختار ایم ۔اے ۔پی ۔ایچ ۔ڈی کی اس تحریری شہادت کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جو انھوں نے مزدوروں کے شاہی کمیشن کے سامنے پیش کی تھی ۔)

مزدوروں کی بھرتی ہمارے کارخانوں کے مزدوروں کا آبائی پیشہ کھیتی ہے ۔ بے گھرے مزدور، بیوی بچوں کو ساتھ رکھتے ہیں لیکن گھر والوں کے بال بچے وطن میں ہی رہتے ہیں ۔ مزدور اُن کے گذارے کے لئے پابندی سے اپنی آمدنی کا کچھ نہ کچھ حصہ بھیجتا رہتا ہے اور اپنے گاؤں میں کبھی کبھی سال کے کچھ دن گذارنے ضرور جاتا ہے ۔ کارخانے کی یکساں محنت سے جب تھک کر اُکتا جاتا ہے تو کھلے کھلے کھیتوں میں کسانی کام کرنے سے اُس کی تفریح ہوتی ہے ۔

مزدوروں کو یا تو اُن کے ہم پیشہ مزدوروں کی معرفت یا میر مستری ٹھیکیداروں کے ذریعہ سے یا براہ راست بھرتی کیا جاتا ہے ۔ شمالی ہندوستان میں عموماً ہم پیشہ مزدوروں کی اطلاع پر اُن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں ۔ بمبئی اور احمد آباد میں یہ کام مستری کو سپرد کیا جاتا ہے ۔ احاطۂ مدراس میں " سردار " کو نگراں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور وہی مزدوروں کو جگہیں تیتاً مہیا کرتا ہے اور کارخانے کے اوقات میں اُن کے کام کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔

جب کوئی موقع ملتا ہے مزدور عموماً اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ چنانچہ آبادی کی زیادتی کی وجہ کر کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کے مختلف صنعتی علاقوں میں جاتے رہتے ہیں ۔ صوبہ جات متحدہ کے مزدور، پنجاب، بنگال، آسام، بمبئی وغیرہ جاتے ہیں ۔ دستی پارچہ بافی کی صنعت کو مشین کے بنے ہوئے کپڑے سے بہت نقصان پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے جلاہے جن کا آبائی پیشہ کپڑا بننا تھا روئی کے کارخانوں میں ملازم ہو گئے ہیں بمبئی میں جو لوگ " ریشمی بھیا " کہلاتے ہیں وہ صوبہ جات متحدہ کے ہندو ہوتے ہیں ۔ ماہر کاریگر پنجاب سے، پٹھان ترمنخواہ سرحد سے بنتے ہیں ۔ الہٰ آباد اور اس کے آس پاس کے ضلعوں سے بہت سے مزدور کلکتہ اور

صوبہ جات متوسط تک جاتے ہیں۔ ہندوستان میں صنعتی مزدوروں کی تعداد میں اضافہ کے بہت امکانات ہیں۔ جب اصول کفایت کو پیش نظر رکھکر زراعت و تجارت کی نئی تنظیم کی جائے گی تو بہت سے آدمی ان پیشوں میں غیر ضروری ثابت ہوں گے اور یہ لوگ صنعتوں میں بھرتی کئے جا سکیں گے۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔ اگر فیکٹری کی زندگی میں تھوڑی سی اصلاح ہو جائے تو وہ بھی آسانی سے کارخانوں میں ملازم رکھے جا سکتے ہیں۔ فقیر، ملّا، سادھو اور دوسرے آدمیوں کو بھی ملک کی ایک مفید آبادی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ بلا شبہ صحیح ہے کہ جہالت، افلاس، عدم تنظیم، بیرونی معاملات سے ناواقفیت، خاندان سے گہرے تعلق اور وطن سے محبت کی بنا پر ہمارا کثیر طبقہ آبادی جو مواقع آتے فی الحال حاصل ہیں اُن سے پورا فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ لیکن پھر بھی لوگ کم و بیش ایک جگہ سے دوسری جگہ روزگار کی تلاش میں نکلتے ہیں اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذات پات کا فرق مٹ جانے کے ڈر سے لوگ گھر سے باہر قدم نہیں دھرتے۔

ہمارے مزدوروں کو ابتدائی زندگی سے ایک خاص کام سے لگ کر روزی کمانا نہیں سکھلایا جاتا۔ وہ مستقل طور پر کسی ایک پیشہ سے وابستہ نہیں ہوتے۔ اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ فیکٹری کی زندگی انھیں ویران نظر آتی ہے۔ انھیں نہ پنشن ملنے کی امید ہوتی ہے نہ پراویڈنٹ فنڈ کے منافع کی۔ وہ جتنا کماتے ہیں اُتنا ہی روزانہ خرچ کر ڈالتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو اُن کے بال بچے مصیبت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مزدوروں کی کثیر تعداد کے لئے روزگار غیر متیقن ہوتا ہے۔ اُن کی ملازمت کا تسلسل ایک دن میں بھی ختم ہو سکتا ہے اور برسوں تک بھی جاری رہ سکتا ہے۔ مزدوروں کا مستقل ہونا دو باتوں پر منحصر ہوتا ہے اوّل تو اس بات پر کہ انھیں بھرتی کس علاقہ سے کیا گیا ہے اور دوسرے اس پر کہ کارخانے کی زندگی کیسی ہے، آرام کی یا تکلیف کی۔ اگر کارخانہ دیہی علاقے میں ہوتا ہے جہاں کا ماحول صاف ستھرا اور دلکش ہے تو مزدوروں میں جلد جلد تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوجن پور (پنجاب) کے ایک کارخانے میں ۲۶-۱۹۲۵ء میں مزدوروں کی اوسط غیر حاضری فی مہینہ فی شخص صرف نصف دن تھی۔ کٹائی کے زمانہ میں یعنی مئی میں یہ اوسط زیادہ ہو گیا تھا یعنی ایک دن فی مزدور۔ جون جولائی میں یہ کم ہو گیا تھا البتہ اگست ستمبر میں جب ملیریا کا زور ہوا یہ اوسط

۱½ ہوگیا تھا۔ ایک دوسرے کارخانے میں قریب کے دیہاتوں سے مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور اس میں غیر حاضری کا اوسط فی ماہ صرف ½ ہوتا تھا۔ کٹائی اور ملیریا کے موسم میں اس اوسط میں اضافہ ہو جایا کرتا تھا لیکن بہت کم۔

جب کارخانے کی زندگی اچھی نہیں ہوتی اور مزدور کچھ تو مقامی ہوتے ہیں اور کچھ بیرونی تو اس وقت غیر حاضری کی اوسط مدت بڑھ جاتی ہے۔ پنجاب کے روئی کے کارخانوں میں جہاں زیادہ تر صوبجات متحدہ کے مزدور کام کرتے ہیں یہ اوسط سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ امرتسر کے ایک روئی کے کارخانے میں ہر روز دس فی صدی مزدور غیر حاضر رہتے ہیں۔ سوجن پور کے کارخانے میں ایک مزدور کی مدت ملازمت ۷ سال ہوتی ہے۔ ضلع لاہور کے ایک کارخانہ میں مزدوروں کی اکثریت کئی سال سے وہیں مقیم ہے۔ راولپنڈی کے قریب کی ایک فیکٹری میں ملازمت کی اوسط مدت چار سال ہے۔ لیکن شہری علاقوں میں مزدوروں کی لوٹا پھیری بہت زیادہ ہے۔ امرتسر کے ایک کارخانے میں ملازمت کی مدت کا اوسط صرف ڈیڑھ سال ہے اور پاس کے ایک دوسرے کارخانے میں اس سے بھی کم یعنی صرف دس مہینے۔

مزدوروں کی اس خانہ بدوشی کے کئی اسباب ہیں:-

(۱) رہنے کے لئے برا اور غیر تندرست انتظام۔

(۲) کٹائی کے زمانے میں مزدوروں کا کام چھوڑ کر چلا جانا۔

(۳) بے ترتیب بھرتی اور ایک دم برطرفی۔

(۴) کام کے گھنٹوں کی زیادتی اور کارخانہ کی زندگی کی ناموافقت۔

(۵) مزدوروں کی مذموم عادات۔

ابھی تک ہندوستان میں کوئی ایسا قاعدہ رائج نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک علاقہ کے زاید از ضرورت مزدوروں کو دوسرے علاقے میں جہاں اُن کی طلب زیادہ ہو منتقل کیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض علاقوں میں جس وقت مزدوروں کی کثرت ہوتی ہے عین اُسی وقت دوسرے علاقوں میں اُن کی قلت ہوتی ہے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ہر قسمت میں صنعتی مزدوروں کے دفتر قائم کرے اور انھیں صوبہ کے صنعتی

مزدوروں کے محکمے سے وابستہ کردے اور قسمتوں کے دفاتر صوبہ کے محکمے کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رہیں۔

نگرانی کا انتظام | منیجر کارخانے کے ہر شخص کو کام سپرد کرتا ہے۔ اس لئے اُس میں انتظام کرنے کی پوری اہلیت ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسے منیجر صرف بڑے کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ ورنہ چھوٹے کارخانوں میں حکم اور تابعداری کے علاوہ منیجر اور مزدوروں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

ہندوستان میں نگرانی کرنے والے عملے کے انتخاب میں کئی دشواریاں ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں میں ہندوستانی مشکل سے ہی اعلیٰ عہدوں پر پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں کہیں کارخانوں میں یورپین ملازم ہیں وہاں ہندوستانیوں کی ترقی بہت محدود ہوتی ہے۔ ریلوے ورکشاپ میں نسلی امتیاز انتہائی بری شکل میں نظر آتا ہے حالانکہ وہاں تو کم از کم ہندوستانی اور یورپین کو برابر کا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا۔ مثال کے طور پر ایک ریلوے ورکشاپ میں یورپین اُمیدواروں کو چودہ آنے سے لے کر ڈیڑھ روپیہ تک یومیہ اجرت ملتی ہے۔ اُن کے ساتھی ہندوستانی امیدواروں کو اس کے برخلاف صرف ۸ آنے سے لے کر ایک روپیہ تک ملتا ہے۔

کچھ کارخانوں میں ہندوستانی بھرتی ہی نہیں ہوسکتے۔ اس قسم کے نسلی امتیاز کو جلد ختم ہو جانا چاہیئے اور جو اس قسم کے امتیازات روا رکھتے ہیں ان کا کوئی مال حکومت کو نہ خریدنا چاہیئے۔

اعلیٰ افسروں اور ان کے ماتحتوں کے تعلقات بظاہر خوشگوار معلوم ہوتے ہیں گو بُرے برتاؤ کی شکایتیں بھی اکثر سننے میں آتی ہیں۔ ان لوگوں کو اکثر اپنی افسری شان کا گھمنڈ ہوتا ہے اور بعض اسٹرائکوں کا سبب یہی گھمنڈ ہوا ہے۔ اس کی اصلاح اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ افسر صنعتی کاروبار میں مزدوروں کی اہمیت برابر کی نہ سمجھیں اور اُن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ نہ کرنے لگیں۔ یہ بات مالکوں اور مزدوروں کی پنچایت بنا کر حاصل کی جاسکتی ہے۔

مزدوروں کو مستری یا سردار کی معرفت بھرتی کرنے کے طریقے میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ یہ لوگ مزدوروں کو ایک خاص اُجرت دلانے کا وعدہ کرتے ہیں اور بعد میں اُن کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر برابر ماہوار اپنا حق و انعام وصول کرتے رہتے ہیں صنعتی مزدوروں کے دفتر قائم کر کے اس خراب طریقے سے نجات

حاصل کی جاسکتی ہے۔

چھوٹے کارخانوں میں حاضری کے رجسٹر باقاعدگی کے ساتھ نہیں رکھے جاتے۔ مزدوری ادا کرنے کا کام ایک منشی کے سپرد ہوتا ہے جسے رشوت اور بے عنوانی کا خوب موقع رہتا ہے۔ جو کارخانے چھوٹے ہوتے ہیں اُن میں البتہ منیجر خود اُجرت تقسیم کرتا ہے۔

بعض کارخانوں میں (مثلاً دری کے) ٹھیکیدار، درمیانی آدمی کے فرائض انجام دیتا ہے اور اس کی وجہ سے بچوں اور عورتوں سے کم معاوضہ پر بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

رہنے کا انتظام | رہنے کا انتظام ہر جگہ مختلف ہے۔ کہیں کارخانے کے مالکوں کی طرف سے ہے کہیں حکومت کی طرف سے اور کہیں مالکان مکان کی طرف سے، کہیں گاؤں میں کارخانے کے قریب مزدور اپنے مکانوں میں رہتے ہیں۔ کہیں رہنے کے لئے مکان بنانے کے واسطے مزدوروں کو روپیہ قرض دیا جاتا ہے۔ لیکن ایسی مثالیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ عام طور پر مکانوں میں گنجائش مزدوروں کے مطلب کے موافق نہیں ہوتی اور اکثر دیکھا یہ گیا ہے کہ مزدور اپنے مکانوں کے کچھ حصہ کو دوستوں اور جان پہچان والے آدمیوں کو شکمی کرایہ پر اُٹھا دیتے ہیں۔ اس سے مکان گنجائش سے زیادہ آباد ہو جاتے ہیں اور تندرستی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

مزدوروں کو، کارخانہ کے مالکوں کی زمیندارانہ ذہنیت کی خاص شکایت رہتی ہے۔ ایسے واقعات دیکھنے میں آئے ہیں جس میں اسٹرائک کی حالت میں مزدوروں کو گھروں سے نکال دیا گیا اور وہ بالکل خانماں برباد ہوگئے۔

عموماً مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر مزدوروں کے مکان بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہوتے ہیں:-

(۱) ہوا کا خراب انتظام یا عدم انتظام۔ خراب ہوا سے طاقت حیات کم ہوتی ہے اور امراض کے امکانات قوی ہوتے ہیں۔ ان دونوں سے جسمانی اور دماغی اہلیت کار کم ہوتی ہے۔

(۲) کمرے کی لمبائی چوڑائی مختصر ہوتی ہے اور ان میں عموماً ضرورت سے زیادہ آدمی رہتے ہیں۔ مزدور ان میں بھیڑ بکری کی طرح بھرے رہتے ہیں۔

(۳) مزدوروں کی غیر تندرست عادات جس کا خاص سبب اُن کی جہالت اور افلاس ہے۔

(۴) شہر کے جن محلوں میں مزدوروں کے مکانات ہوتے ہیں وہ گندے ہوتے ہیں اور رات کے وقت اُن میں گائے بھینس باندھی جاتی ہیں۔

(۵) ان مکانات میں صحن نہیں ہوتے اس لئے خلوت کا امکان نہیں ہوتا۔

(۶) عموماً مزدوروں کے مکانوں کا فرش ناہموار ہوتا ہے جس پر سیمنٹ کا پلاستر نہیں کیا جاتا شہروں کے مکانات کی پوتائی کبھی نہیں کی جاتی۔

(۷) عموماً غسلخانے اور پیشاب خانے مہیا نہیں کئے جاتے۔ بعض وقت پیخانے غائب ہوتے ہیں اور جہاں کہیں ہوتے ہیں وہاں اُن کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ روشنی کا انتظام خراب ہوتا ہے صاف پانی آسانی سے مہیا نہیں ہو سکتا۔ کنوؤں سے جہاں کہیں پانی بھرا جاتا ہے انھیں صاف حالت میں نہیں رکھا جاتا۔ میونسپلٹی بھی مزدوروں کی ضروریات کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

(۸) مکانوں کی زاید از گنجائش آبادی سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

تندرستی | جہاں کہیں صفائی کا معقول انتظام نہیں ہوتا وہاں ہر عمر کے لوگوں میں شرح اموات زیادہ ہوتی ہے۔ طبی تحقیقات پر کام کرنے والوں کی کانفرنس نے سنہ ۱۹۲۶ء میں ایک قرارداد منظور کی تھی جس کا مطالعہ اس سلسلہ میں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اس کانفرنس کی یہ قطعی رائے ہے کہ ایسے امراض سے جن کا روکنا ممکن ہے، ہر سال اوسطاً پچاس ساٹھ لاکھ آدمی مر جاتے ہیں اور جو مبتلا ہو کر صحت پا جاتے ہیں اُن کے ہر سال اوسطاً دو تین ہفتہ ضرور ضایع ہو جاتے ہیں ہندوستان میں ہر شخص امراض اور غذا کی خرابی سے اوسطاً بیس فیصدی نقصان اٹھاتا ہے۔ ایسے بچوں کی پیداوار کا اوسط جو جوان ہو کر کھاتے کماتے ہیں ہندوستان میں پچاس فی صدی ہے حالانکہ اس اوسط کو نہایت آسانی سے اسّی اور نوّے فیصدی کیا جا سکتا ہے"۔

پیدائش اور اموات دونوں کی شرحیں زیادہ ہیں۔ اس کا سبب زیادہ تر غذا، جسمانی طاقت اور مکانوں کی خرابی ہے۔ گھر کا ماحول بہت تاریک اور غم آلود ہوتا ہے اور اس کے اثرات میں جو کسر رہ جاتی ہے وہ کارخانے کی خراب زندگی سے پوری ہو جاتی ہے۔ کارخانوں میں مندرجہ ذیل بدنما پہلو نظر آتے ہیں:۔

(۱) خراب صفائی ۔ چھوٹے کارخانوں کے مالک مکانوں پر سالانہ سفیدی کرانے میں بخل سے کام لیتے ہیں کارخانہ کے احاطہ میں ملبہ اور کوڑا اکٹھا ہوتا رہتا ہے ۔ نالیوں کو تیزی سے پانی بہاکر صاف نہیں کیا جاتا ۔ پیخانوں کا انتظام کافی نہیں ہوتا ۔ پینے کے لئے اچھے پانی کی رسد ناکافی ہوتی ہے ۔

(۲) ہوا کا خراب انتظام خاص کر بنولہ نکالنے والے کارخانوں میں

(۳) روئی کے کارخانوں میں مصنوعی نمی پہنچانے کے انتظام پر پورا قابو نہیں رکھا جاتا ۔

(۴) کام کے اوقات طویل ہوتے ہیں ۔

کچھ کارخانوں کے مالکان' طبی امداد کا بندوبست رکھتے ہیں جس سے مزدوروں کو فائدہ پہنچتا ہے ۔ مزدور حکیم کے علاج کو ڈاکٹری علاج پر ترجیح دیتے ہیں ۔ ہر کارخانے کو جو ۵۰ یا زائد مزدوروں کو بھرتی کرتا ہو ایک طبیب یا ڈاکٹر کو بھی ملازم رکھنا چاہئے ۔ لیڈی ڈاکٹروں کا انتظام بھی معقول نہیں ہے اور جو ہے اس سے مزدوروں کو فائدہ نہیں پہنچتا ۔ حاملہ ماؤں اور نوزائیدہ بچوں کی نگہداشت کا بھی پورا بندوبست ہونا چاہئے ۔ دیسی دائیاں بہت گندی اور اصول صحت سے ناواقف ہوتی ہیں ۔ اُن کی مناسب تعلیم بھی ضروری ہے ۔

ہیضہ' ملیریا' انفلوئنزا' پلیگ اور تپ دق سے بھی مزدوروں کی بہت سی جانیں تلف ہوتی ہیں بیماری کے لئے بیمہ مزدوروں کے لئے لازمی کر دینا چاہئے ۔

مزدوروں کی بہلائی کے دوسرے کام

مزدوروں کی حالت سدھارنے کے لئے چند کارخانوں میں بہت ہی ابتدائی قسم کے کام شروع کئے گئے ہیں ۔ لیکن جہاں کہیں بھی یہ کام کئے جاتے ہیں وہ فرض کی حیثیت سے نہیں بلکہ خیرات کے طور پر کئے جاتے ہیں ۔ ایسے کارخانے بہت کم ہیں جو مزدوروں کی تعلیمی اور تفریحی رجحانات کو پورا کرتے ہوں ۔ کچھ کارخانوں میں دوائیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں ۔ اس کے علاوہ ہم آہنگی اور اتحاد عمل کو پیدا کرنے کے بھی کوشش کی جاتی ہے ۔ اس کام کے لئے مالکوں اور مزدوروں کی ایسی پنچایتی کمیٹی بنانا بہت موزوں ہے جس میں دونوں کے نمائندے ایک دوسرے کی بات سن اور سمجھ سکیں اور مشترکہ اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے بحث و مباحثہ کر سکیں ۔

ایک کامیاب اور دور اندیش صنعتی نظام میں ایسے لوگوں کا موجود ہونا بہت ضروری ہے جو مزدوروں

کی بھلائی کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خدمات بڑے کارخانوں کو تنہا اور چھوٹے کارخانے والوں کو ملکر حاصل کرنا چاہیں۔ بھلائی کا کام مندرجہ ذیل اصولوں کے ماتحت ہونا چاہیئے:۔

(۱) کھانے کی دوکانیں۔ کھانا مزدوروں کو اسی قیمت پر ملنا چاہیئے جتنی اُس کی طیاری میں لاگت لگی ہو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کے لئے علیحدہ کمرے ہونا چاہییں اور اُس میں آرام و آسائش کا پورا اہتمام ہونا چاہیئے۔

(۲) کارخانوں اور مزدوروں کے گھروں میں پوری صفائی ہونا چاہیئے۔ سینما، میجک لنٹرن کے ذریعہ سے تندرستی، غذا اور صفائی کے متعلق سبق دینا چاہیئے۔

(۳) مزدوروں کا طبی معائنہ ہونا چاہیئے۔ طبیب اور ماہرانِ دنداں لازمی طور پر کارخانوں میں رکھے جائیں۔ ابتدائی طبی امداد اور تندرستی کے اصول کی تعلیم کے لئے جماعتیں کھولی جائیں۔

(۴) مزدوروں کو بھرتی کرتے وقت قوت تمیز سے کام لیا جائے تاکہ بعد کو انھیں ایک دم برطرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مدارس شبینہ قائم کرکے بھلائی کے کاموں کو وسعت دی جاسکتی ہے۔ مدارس یکشنبہ، نیم اوقات کے مدارس اور مزدوروں کے بچوں کے لئے مدرسے کھولے جاسکتے ہیں۔ امداد باہمی کو بھی امداد باہمی کی دوکانیں اور امداد باہمی کے قرضوں کی انجمنیں قائم کرکے پھیلایا جاسکتا ہے۔

محافظت | کارخانوں میں ہنگامی واردات بھی ہوتی رہتی ہیں جن کے اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سیسے کے زہر کا اثر۔ جن صنعتوں میں اس کا امکان ہو وہاں میعادی طبی معائنہ لازمی قرار دیا جائے

(۲) مشین کا کھلا ہوا ہونا۔ چھوٹے کارخانوں میں گریوں اور فیتوں کے گرد باڑ نہیں لگائی جاتی یا باڑ ایسی لگائی جاتی ہے جس سے بچاؤ کی جگہ الجھاؤ پیدا ہونے کا زیادہ اندیشہ رہتا ہے۔

(۳) سیکھے ہوئے مزدوروں کی جگہ بے سیکھے مزدور رکھ لئے جاتے ہیں جس سے واردات لازماً بڑھ جاتی ہیں۔

(۴) مزدور کی غفلت اور لاپرواہی۔ بہت سے ایسی ہنگامی واردات کا جن کی رپورٹیں ہوتی رہتی ہیں مزدوروں کی مناسب نگرانی رکھنے سے سدباب کیا جاسکتا ہے۔ غفلت ولاپرواہی کا سبب یا تو مزدور کی ناواقفیت

ہوتی ہے یا ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے کا شوق ۔ اس لئے سیفٹی فرسٹ کی تدابیر کارخانوں کے لئے بہت ضروری ہیں ۔

مزدوروں کو معاوضہ | قانون معاوضۂ مزدوران کا فائدہ مزدوروں کو اُسی وقت پہنچتا ہے جب اس قانون کے ماتحت جو کمشنر نگرانی کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں وہ اپنے وسیع اختیارات کو فیاضی اور وسعت خیال سے استعمال کرتے ہیں اس ضمن میں جو رپورٹیں نکلی ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کمشنروں کی طرف سے معائنہ نہ ہوتا تو بہت سے معاملات دبا دئے جاتے ۔ مزدور نادار اور جاہل ہوتے ہیں اور بعض وقت آجر اُنھیں قصداً دھوکا دیتے ہیں اس لئے کمشنروں کو اپنا کام مستعدی سے کرنا چاہئے ۔

ہرجانہ سے بچنے کے لئے طرح طرح کے عذر پیش کئے جاتے ہیں اور جب ہرجانہ دیا جاتا ہے تو وہ معاملہ کی اہمیت کے لحاظ سے بہت کم ہوتا ہے ۔ چھوٹے کارخانوں کے مالک اس قسم کے بہانے زیادہ کرتے ہیں ۔

ماہر مزدور بھی قانون معاوضہ سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے اور غیر ماہر مزدوروں کو تو محض اس کا برائے نام ایک خیالی تصور ہوتا ہے ۔ سالانہ رپورٹوں سے خصوصیت کے ساتھ یہ بات ظاہر ہوتی ہے اس لئے اس قانون کے منافع کو پوری طرح شہرت دینے کی بہت ضرورت ہے ۔

ایسی مثالوں کا بھی پتہ چلا ہے جن میں فوت شدہ مزدور کے کسی رشتہ دار کا پتہ نہیں چل سکا ۔ اس لئے اپنے قریبی رشتہ داروں کا نام درج کرانا ہر مزدور کے لئے لازمی قرار دے دیا جائے ۔ مزدور بہت نادار ہوتے ہیں ۔ وہ وکیل کا محنتانہ اس امید پر ابتدا میں ادا نہیں کرسکتے کہ بعد میں ہرجانہ وصول ہونے کی صورت میں اس سے بہت زیادہ واپس مل جائے گا ۔ پھر اُسے اپنا دعوے ثابت کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے ۔ اس کے ساتھی برطرفی کے ڈر سے اُس کی امداد نہیں کرتے ۔ اس لئے سرکاری وکیلوں کو مزدوروں کے معاوضہ کے مقدمات کی پیروی مفت کرنا چاہئے ۔

کام کے اوقات | چھوٹے کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے ۔ عام طور پر بڑے اور اچھے انتظام والے کارخانے قانون کی حدود کے اندر رہنا چاہتے ہیں ۔ فصلی کارخانے، جہاں تک ہوسکتا ہے، اوقات اور بچوں کو ملازم رکھنے والے قوانین کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں ۔

بنولے نکالنے والے کارخانے خصوصیت کے ساتھ قانون کی خلاف ورزی کرنے میں بڑے دلیر ہوتے ہیں بہت سے کارخانے اتوار اور دوسری تعطیلوں کے دنوں میں بھی کام کرتے رہتے ہیں۔ مقامی حکومتوں نے ایسے کاموں کو جن میں مسلسل پیداوار حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے قانون کے عمل سے مستثنیٰ کر دیا ہے لیکن مزدور کو چھ دن کا ہفتہ ضرور ملنا چاہئے، چاہے کارخانہ میں ساتوں دن برابر کام ہوتا رہے۔

کام کے گھنٹوں میں کمی ہو جانے کا یہ لازمی نتیجہ نہیں ہے کہ پیداوار فی کس میں بھی کمی ہو جائے۔ برخلاف اس کے اس کمی سے پیداوار میں اضافہ کا بھی امکان ہے۔ اگر نگرانی معقول ہو تو کام کے گھنٹوں کی کمی کی وجہ سے مزدوروں کی کاہلی اور مٹر گشتی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

اُجرتیں | مزدوروں کو اُجرتیں عموماً نقدی کی شکل میں دی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی کارخانوں میں جنسی شکلوں میں بھی خاصی ادائیگی کی جاتی ہے۔ کبھی کبھی مکانات بھی مفت یا کم کرایہ پر مہیا کئے جاتے ہیں۔ کبھی غلہ بازار کے بھاؤ کے مقابلے میں سستے داموں پر دیا جاتا ہے۔

کئی کارخانوں میں مزدور مقررہ اوقات سے زیادہ کام کرتے ہیں۔ زاید از وقت کام کی اُجرتوں کے نرخ معمولی نرخوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ بہت سے کارخانوں میں زاید از وقت کام کی کوئی مزدوری نہیں دی جاتی ضلع گرداسپور (پنجاب) کے ایک ضلع میں زاید از وقت کام کرنے والے مزدوروں کو جس قدر زیادہ وہ پہلے دن کام کرتے ہیں اسی کے حساب سے دوسرے دن قبل از وقت کام چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت ہوتی ہے۔

واقعی یا من مانے قصوروں پر جرمانے عاید کئے جاتے ہیں۔ قصور عموماً مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:۔

(۱) بلا اطلاع کی غیر حاضری

(۲) کارخانے میں دیر سے حاضری

(۳) گستاخی اور نافرمانی وغیرہ وغیرہ

کسی قسم کی باقاعدہ تحقیقات نہیں کی جاتی اور اکثر حالتوں میں جرمانوں کو آمدنی کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے لیکن ہونا یہ چاہئے کہ ان جرمانوں کو مزدوروں پر ہی صرف کیا جائے۔ جرمانے صرف شاذ و نادر حالتوں میں ہونا چاہئیں اور قانوناً اُن کی مجموعی رقم ایک مہینہ میں ایک دن کی اُجرت سے زیادہ نہ ہونا چاہئے۔

اُجرتیں روزانہ، ہفتہ وار، نصف ماہی یا ماہانہ ادا کی جاتی ہیں۔ عموماً اُجرتیں ماہوار دی جاتی ہیں اور ایک یا دو ہفتہ کی تنخواہ کا بقایا رکھا جاتا ہے۔ ایسے مزدوروں کو جن کی تنخواہ پچاس یا اس سے کم ہے ادائیگی ہفتہ وار ہونا چاہئے جن اُجرتوں کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا اُنھیں آمدنی میں کبھی شامل نہ کرنا چاہئے۔ اُنھیں مزدوروں کی تعلیمی اور معاشرتی کاموں پر صرف کرنا چاہئے۔ آج کل مزدوروں کو ایک مقررہ میعاد ملازمت کے بعد استحقاقی رخصت پوری تنخواہ پر شاذو نادر ہی دی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہونا چاہئے بلکہ انھیں ایک مہینہ کی رخصت آدھی تنخواہ پر یا پندرہ دن کی پوری تنخواہ پر ہر سال ملنا چاہئے۔

اکثر چھوٹی صنعتوں میں کم معاوضہ پر بہت زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ ایسے کارخانوں کے لئے قانون بن جانا چاہئے کہ ایک مقررہ رقم سے کم تنخواہ کسی حال میں نہ دیں گے۔

مزدور اکثر مقروض رہتے ہیں۔ پنجاب میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ ۲۲ فی صدی مزدور مقروض ہیں۔ امرت سر کے دو کارخانوں میں یہ تناسب ۹۰ فی صدی معلوم ہوا۔ شولا پور میں جو تحقیقات کی گئی اس میں ۶۳ فی صدی خاندانوں نے قرض پر سود دینا ظاہر کیا۔ شرح سود بھی بہت زیادہ گراں ہوتی ہے۔ اکثر صورتوں میں یہ ایک آنہ فی روپیہ فی ہفتہ ہوتی ہے اس لئے حکومت کی طرف سے شرح سود کا تعین بہت ضروری ہے۔

مزدوروں کی صنعتی اہلیت کار | مزدوروں پر جو اثر کارخانہ کی زندگی کا پڑتا ہے۔ اس کا براہ راست بیان کرنا دشوار ہے البتہ اس کے بالواسطہ اثرات بیان کئے جاسکتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں میں نے ۲۳۸ مزدوروں کا قد اور وزن معلوم کیا تھا۔ اُن میں سے ۱۴۹ پانچ سال سے ملازم تھے اور ۲۰۰ تین سال سے زیادہ کر پنجاب کی جیلوں کے ۵۹۴ قیدیوں کا بھی میں نے قد اور وزن معلوم کیا تھا۔ مزدوروں کا اوسط وزن ۱۱۵٫۳ پونڈ معلوم ہوا اور قیدیوں کا ۱۲۶٫۳ پونڈ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کارخانے کے ایک اوسط مزدور سے تو ایک اوسط قیدی بھی بہتر حالت میں ہے!

کارخانوں کی غیر تندرست زندگی کا اثر ہمارے مزدوروں کی اہلیت کارکردگی پر بہت بُرا پڑتا ہے۔ اگر کام کے گھنٹے معقولیت کے ساتھ کم کردئے جائیں اور رہنے کے مکانوں کی صفائی اور دلکشی کا بندوبست ہو جائے اور معاشری اور تعلیمی ماحول پیدا کر دیا جائے تو حالات میں بہت کافی اصلاح ہو جائے۔

شراب اور افیون گانجے کے استعمال سے بھی مزدوروں کی اہلیت کار گھٹ جاتی ہے اور یہ چیزیں بھی خبرگیری اور تعلیم سے رفع کی جاسکتی ہیں۔

مزدوروں کا اشتراک عمل | کارخانوں کے مالکوں کی تنظیم مزدوروں سے بدرجہا بہتر ہے۔ بعض اوقات یہ لوگ مزدوروں کے خلاف ملکر کام کرتے ہیں ۱۹۲۷ء میں امرت سر کے ایک کارخانے کے مالک نے اقرار کیا کہ ۱۰ میل کے فاصلہ پر جو دوسرا کارخانہ ہے اُس سے جو مزدور علیحدہ کیا جاتا ہے اُسے میں اپنے یہاں ملازم نہیں رکھتا۔ پنجاب میں یہی دو کارخانے ایسے ہیں جن میں ایک ہی قسم کا مال طیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے برطرف کئے ہوئے ملازم کے لئے زندگی کی کوئی صورت سوائے اس کے نظر نہیں آتی کہ وہ کم اُجرت پر کوئی دوسرا کام شروع کرے۔

ٹریڈ یونین کی ترقی سے مزدوروں کی حالت ضرور زیادہ مستحکم ہوجائے گی۔ اس وقت تو کارخانہ کے مالک عموماً ٹریڈ یونین سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے ممبروں کو طرح طرح سے پریشان کرتے ہیں حکومت کے کارخانوں میں بھی یہی کیفیت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ٹریڈ یونین کے قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے مثلاً ایک ترمیم یہ ضروری ہے کہ ٹریڈ یونین کے افسران کے انتخاب کے وقت یہ پابندی نہ ہو کہ مزدوروں کی ان انجمنوں میں کم از کم نصف افسران اسی صنعت کے ملازم ہوں گے جس کے لئے کہ ٹریڈ یونین قائم کی جارہی ہے کیونکہ مزدوروں کی عام جہالت کی وجہ سے اس قسم کے لوگ مزدوروں کے حقوق کی ٹھیک طریقہ پر نمائندگی نہیں کرسکیں گے۔

صنعتی فسادات | ہڑتالوں کے اسباب معاشی بھی ہوتے ہیں اور غیر معاشی بھی۔ مزدوروں کو بعض ہڑتالوں سے فائدہ ہوا ہے اور بعض سے نقصان۔ چھوٹے کارخانوں میں مزدوروں کو اپنے مطالبات پیش کرنے کا بہت کم موقع دیا جاتا ہے گو بڑے کارخانوں میں اب اس کے امکانات پیدا ہوتے جارہے ہیں۔

صنعتی فسادات کے قانون میں متعدد خامیاں ہیں۔ مثلاً عام منفعت کی صنعتوں کے مزدوروں پر غیر مناسب پابندیاں عاید کردی گئی ہیں اور اُن کے ساتھ کوئی خاص رعایت ملحوظ نہیں رکھی جاتی۔ ہمدردی کی ہڑتالوں کا بھی اس قانون سے سد باب ہوگیا ہے۔

مالک اور ملازم کے باہمی تعلقات دری کے کارخانوں میں، دری بننے والوں کو سو دو سو روپیہ پیشگی دیدئے جاتے ہیں اس کے معاوضہ میں وہ اپنے مزدور ساتھ لاتے ہیں جو عموماً چھوٹے بچے ہوتے ہیں اور انھیں جو جی میں آتا ہے وہ اُجرت دیتے ہیں۔ پیشگی رقوم جو انھیں اس طرح ملتی ہیں اُن کو یہ لوگ فضول خرچی میں صرف کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں اس قرض کے بار سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتے۔ ایسی پیشگی رقوم کے طریقے جن میں محنت رہن رکھی جائے بالکل بند کر دینے چاہئیں۔

لاہور کے ایک کارخانے میں ہر مزدور انفرادی تحریری معاہدوں کے بعد ملازم رکھے جاتے ہیں جن سے عام طور پر وہ پانچ سال تک کام کرنے کے لئے پابند ہو جاتے ہیں مگر مالک جب چاہے انھیں تین مہینہ کا نوٹس دیکر علیحدہ کر سکتا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں مزدور دھوکا نہ دے جائے اُسے نقد کی صورت میں ضمانت ادا کرنا ہوتی ہے جو یا تو ایک دم لے لی جاتی ہے یا رفتہ رفتہ ماہواری تنخواہ سے ایک سال کی مدت میں کاٹ لی جاتی ہے ضمانت کی رقم تین مہینہ کی تنخواہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ معاہدہ قانوناً جائز ہے یا نہیں لیکن عدالت میں اس قسم کے معاہدوں کے پیش کرنے کی اجازت نہ ہونا چاہیئے۔

کارخانہ کے قانون پر عملدرآمد کارخانہ کے قانون پر پورے طریقہ پر عملدرآمد نہیں ہوتا۔ بہت سے ایسے کارخانے ہیں جن میں مشین اور تیل بھاپ بجلی کی طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ صرف صوبہ پنجاب میں تقریباً ۲۲۵ و ۲ مزدور ایسے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اور ان میں سے پندرہ فیصدی ۹ سے ۱۲ برس تک کی عمر کے بچے ہیں ان کارخانوں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے۔ صفائی کا خراب انتظام، کچے فرش اور گندے صحن سب کا صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ مزدوروں اور امیدواروں سے کام بھی بہت زیادہ لیا جاتا ہے اور انھیں ہفتہ وار چھٹی بھی آرام کے لئے نہیں دی جاتی۔ دوسرے صوبوں میں دری اور بغیر رجسٹری کرائے ہوئے چمڑے کے کارخانوں کی حالت بھی ایسی ہی خراب ہے۔ چمڑے کی دباغت کے کارخانوں کے احاطے بڑے گندے اور غلیظ ہوتے ہیں۔ ہوا کا انتظام بہت ناقص ہوتا ہے اور کام کے کمروں کی تاریکی سے ڈر لگتا ہے۔ کام کے گھنٹوں کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ مزدور اپنے مالکوں کے غلام ہوتے ہیں اور دن رات میں کسی وقت بھی انھیں کام پر بلایا جا سکتا ہے سیالکوٹ کے ورزشی سامان بنانے والے کارخانوں کی بھی جہاں

تک بچوں کو ملازم رکھنے اور کام کے گھنٹوں کا تعلق ہے بالکل یہی حالت ہے۔

عام طور پر کارخانہ کا مالک اپنی حسب مرضی کام کرنا چاہتا ہے اور جب برطانوی ہند میں کام چلتا نہیں دیکھتا تو ریاستوں میں چلا جاتا ہے جہاں کارخانہ کے قانون پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوتا۔ اس لئے کارخانہ کے قانون کو تمام ہندوستان پر حاوی ہونا چاہئے۔

بہت کم جاہل مزدوروں کو کارخانہ کے قانون کا علم ہوتا ہے۔ اس قانون کے ترجموں کو نوٹس بورڈ پر چپکا دینے سے کام نہیں چلتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قانون کے فوائد، پوری طرح مزدوروں کے ذہن نشین کرادئے جائیں۔

کام کے اوقات، آرام کے وقفے، تعطیلیں، صفائی کا انتظام، مشین کی محافظت سب کارخانہ کے قانون پر معقول طریقہ پر عملدرآمد کرنے سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس قانون پر عملدرآمد ٹھیک طریقہ پر نہیں ہورہا ہے۔ معائنہ کی تعداد بہت کم ہے اور اس کے لئے عملہ کافی نہیں ہے اور بعض کارخانے کے مالک انسپکٹروں سے زیادہ چالاک ہوتے ہیں اور انھیں خوب دہوکہ دیتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ صحیح قسم کے معائنہ کرنے والوں کو خاصی تعداد میں بھرتی کیا جائے۔

کارخانوں کے متعلق معلومات بھی پوری طرح فراہم نہیں ہیں۔ اس لئے اُجرت شماری اور اخراجات زندگی کی پیمائش کے کام بھی شروع ہونے چاہئیں۔ بمبئی کے دفتر مزدوران کی طرف سے جو معلومات شائع ہوئی ہیں وہ بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔



دوڑ

(ذیل کا مضمون ہنگری کے مشہور ناول نگار فرانس ہربیگ کے ایک "افسانہ کا ترجمہ ہے۔ مدیر)

وہ بڑا جہاز کس تیزی سے بڑھا چلا جاتا ہے۔ پیچھے پیچھے سفید جھاگ کی دم سی ہے جو جگ مگ جگ مگ ہوتی ہے۔ نیا جہاز ہے اور یہ سفر اس کا پہلا سفر ہے۔ بالکل اوپر کپتان کے کمرہ میں جو چاروں طرف شیشوں سے بند ہے کوئی پانچ چھ جاپانی بحری افسر کھڑے ہیں! جیبوں میں ہاتھ، ساکت جیسے تصویریں۔ سامنے ایک سفید جہاز اس تیزی سے جا رہا ہے جیسے کوئی ہرن جس کے پیچھے بھیڑیا چیتا ہو۔ ان افسروں کی نگاہیں اسی سفید جہاز کے چکنے چکنے خوبصورت (HULL) پر جمی ہوئی ہیں۔ آج صبح سویرے سے یہ نیا جہاز اس سفید جہاز کے پیچھے پیچھے ہے۔ اس جہاز کا نام ہے کیلی ڈونیا اور یہ یورپ کا سب سے تیز جہاز ہے، طلوع آفتاب کے وقت سے جاپانی برابر یورپیوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اور اپنے انجن میں اتنا ایندھن جھوکے جاتے ہیں کہ ڈر ہے کہ پھٹ نہ جائے۔ اگر کوئی صورت نکل سکتی کہ یہ جہاز اپنی رفتار کو دوگنا کر سکے تو اس کے لئے ان کا ہر ملاح اپنی عمر کا ایک ایک سال خوشی سے دے دیتا!

دوسرے درجہ کے سامنے والے عرشہ پر دو مسافر ایک کونے میں ہوا سے بچے بیٹھے ہیں۔ انہیں اس دوڑ کی ذرا خبر نہیں جس سے ملاحوں کے اعصاب مارے تناؤ کے ٹوٹے جاتے ہیں اور جس نے جہاز کو اس سرے سے اس سرے تک ہلا رکھا ہے۔ ایک حبشی ہے، دوسرا ہندی۔ سیاہ آدمی کلیسائے روم کا ایک پادری ہے اور جزائر سینڈوچ میں مشن کے کام میں شرکت کے لئے جا رہا ہے۔ گندمی رنگ والا مسافر انگلستان کے کسی دارالفنون میں پڑھتا تھا اب اپنے وطن کو لوٹ رہا ہے۔ دونوں بیٹھے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ یورپ میں جو جو بیتی ہے اس پر گفتگو ہے۔

سیاہ رنگ پادری نے پوچھا، "ہاں، تو آپ نے ان کے دارالفنون میں طالب علمی ختم کیوں کر دی؟"

"وہاں رہنے اور طلب علم جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نہ تھا"

"کیا آپ نے سب کچھ سیکھ لیا، جان لیا" حبشی نے پوچھا۔

"میں نے کسی ایک شعبۂ علم پر ساری توجہ صرف نہیں کی۔ میں تو اصل میں یورپی تہذیب کی روح کو سمجھنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ کیا چیز ہے جس نے ان سفید رنگ لوگوں میں وہ احساس فوقیت پیدا کر دیا ہے جس سے ہماری طبیعت چڑتی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے میں اس مرکزی' بلکہ اس بنیادی تصور کا پتہ چلانا چاہتا تھا جس پر ان کی ساری تہذیب بنی ہے۔"

"یعنی آپ روح مغرب کا پتہ چلانا چاہتے تھے۔ پھر کچھ پتہ ملا؟"

"صحیح تو کچھ نہ ملا!"

"دیکھئے، اگر ایک (DREDGING) مشین کے سمندر میں چلانے سے کچھ اوپر نہ آئے تو اس کے یہ معنی تو نہ ہوں گے کہ سمندر کے تہ ہی نہیں۔"

"اچھا، تو کیا آپ کے خیال میں یورپ کی روح اتنی گہری ہے جتنی کہ سمندر کی تہ؟ میرا تو گمان ہے کہ یورپ کے، جدید یورپ کے، روح ہے ہی نہیں۔ مجھے تو سوائے مقطوع اعضا اور منتشر ٹکڑوں کے کچھ بھی نہ ملا۔ جیسے کسی نے مردہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہوں۔ میں اپنے سے پوچھا کرتا تھا کہ آیا کبھی بھی یورپ کی عظمت کی وجہ میری سمجھ میں آئیگی۔ یا کہیں ایسا تو نہیں کہ خود ہماری نظر مینڈک کی طرح محدود ہو اور اس وجہ سے یورپ بڑا معلوم ہوتا ہو؟ اگر یورپ سے مراد ہیں سب یورپ والے تو میرے تو یورپ کا وجود ہی نہیں اس لئے کہ مجھے تو کوئی ایسی مخلوق وہاں ملی نہیں جو اس بر اعظم کا جزو بن گئی ہو جس پر وہ بستی ہے۔ اگر آج ہمارے جدید ایشیائی یا منگولوں کے غول یورپ پر چڑھائی کر دیں تو مجھے ذرا شبہ نہیں کہ سفید نسل کے آدھے آدمی نہایت جوش و خروش سے ان کا خیر مقدم کریں گے۔ اس لئے کہ یہ آپس میں اتنا لڑتے ہیں کہ اب موت یہ جہنم سے بھی زیادہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔"

"مگر ان کا علم۔ یورپ کے پاس جو علم ہے تم اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہو؟"

"ہاں بیشک۔ وہ بہت کچھ جانتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اتنا جانتے ہیں کہ انسانی اعصاب

اتنے کا تحمل نہیں کر سکتے۔ مگر ان کا علم بھی کیا ہے؟ ٹکڑوں اور پرزوں کا مجموعہ۔ بلا شبہ ٹکڑے بھی نہایت عظیم الشان ہیں، مگر ہیں پھر منتشر ٹکڑے، تہذیب و تمدن سے من حیث الکل جدا۔ الگ الگ اپنا وجود رکھتے ہیں، جیسے کوئی پالتو بلی جنگل میں پہنچکر بھٹکی بھٹکی پھرے۔ مغربی علم کو اب تمدن و تہذیب سے تقریباً کسی طرح کا واسطہ نہیں رہا ہے۔ ان کے عالموں کی نظر سے علم کا اصلی مقصد اوجھل ہے۔"

"اور یہ اصلی مقصد ہے کیا؟"

"صرف ایک، یعنی انسانی زندگی کا سہارا بننا۔ اب ذرا دیکھئے۔ یہ سفید لوگ صنعت کے باب میں اپنی ذکاوت پر کیسے نازاں ہیں۔ ہاں کسی چیز پر اتنا فخر نہیں کرتے۔ لیکن ان کی مشینیں آدمی ہی پر ضرب لگاتی ہیں۔ امن کے زمانہ میں آدمیوں کو بیکار رکھتی ہیں اور جنگ میں حیرت خیز قوت کے ساتھ انسانی زندگی کی تباہی کا سامان کرتی ہیں۔"

"ہاں مشین۔ مگر یورپ کے پاس تو مشین کے علاوہ اور بہت کچھ ہے۔ اس کے پاس خیالات و تصورات ہیں، جذبات ہیں، اس کے پاس مذہب ہے، آرٹ ہے۔"

"جناب والا ــ ذرا ٹھہرئیے۔ میں جب پورٹسمتھ سے جہاز پر بیٹھا ہوں تو انگلستان کے تمام اخبار ہوائی حملہ کے خطرہ کے بیان سے بھرے پڑے تھے۔ شہر کے سارے بسنے والے، مرد، عورت، بچے، بڑے سب کے سب سوتے سوتے میں مارے جا سکتے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کے ذہن پر آج یہ خطرہ مستولی ہے۔ لیکن یہ کسی کو نہیں سوجھتی کہ شاید مسیح کا دین محبت اس اجتماعی قتل و خونریزی کو روک سکے۔ اور رہا آرٹ۔ سو آرٹ زندگی کا زیور ہے۔ اور جب زندگی ہی میں کوئی معنی و مقصد باقی نہ رہے تو بھلا آپ ہی فرمائیے کہ اس کے زیور سے فائدہ۔ یورپی آرٹ تو ایک مردہ جسم کا زیور ہے اور بس۔"

"پھر آخر تمھارے خیال میں ہونے والا کیا ہے؟"

"سفید نسل کے لوگ بھٹک کر ایک اندھی گلی میں جا پہنچے ہیں۔ مڑنا یہ چاہتے نہیں۔ کہ انسانیت کبھی پیچھے نہیں مڑتی۔ لہٰذا اب کوئی صورت باقی نہیں، بس یہ اپنا کام کر چکے۔"

"تمھیں ان پر رحم نہیں آتا؟"

ہندی نے اپنے مونڈھے ہلائے۔ اور بولا: "آج تو یہ لوگ انسانی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ مگر آپ کہئے، آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میں ایک سچی پادری ہوں اور مداخلت الہٰی پر یقین رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ سفید لوگ خدا کے منتخب لوگ ہیں۔ خدا نے انھیں دوسری نسلوں سے زیادہ ذکی اور مخترع قوت ذہنی بخشی ہے اور زیادہ قوی قوت ارادی تاکہ وہ دنیا میں اپنے کام کو پورا کر سکیں۔"

"اور ان کا یہ کام کیا ہے؟ شاید یہی کہ آپ کے بے زبان بھائیوں یعنی رنگین نسلوں کے آدمیوں کی رہبری کرنا، انھیں کام دینا، خیالات دینا، محبت دینا؟ ہاں تو کیا کہنا، اس کام کو تو سفید نسل والوں نے نہایت شاندار طریق پر انجام کو پہنچایا ہے۔ انھوں نے ہماری قدیم سلطنتیں تباہ کر دیں، اور ہمارے قدیم تمدن کو برباد کر دیا۔ ان سفید لوگوں کے اعمال نے جو خون اور جو آنسو بہائے ہیں وہ سب یکجا کئے جا سکیں تو اس میں تمام یورپ ڈوب سکتا ہے۔"

حبشی پادری کچھ دیر بالکل چپ رہا اور پھر بولا۔ "لکھا ہے کہ حکومت خداوندی تم سے چھین لی جائیگی اور کفار کو دی جائیگی کہ وہ اس کے پھل پائیں۔"

ہندی نے پوچھا۔ "یہ کیسی حکمت ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمھارے خدا نے اپنی محبوب قوم کے انتخاب میں ایسی غلطی کی ہو؟"

"وہ تو انسانوں کو اپنے اعمال کا اختیار دیتا ہے اور جس طرح وہ اپنے اس اختیار کو صحیح یا غلط استعمال کرتے ہیں اسی طرح انھیں جزا اور سزا دیتا ہے۔"

"لیکن اگر وہ پہلے سے جانتا تھا کہ کیا ہوگا تو پھر ——" "ہاں۔ اسے تو پہلے سے یہ بھی معلوم تھا کہ بہار کے پھول خزاں میں مرجھا جائیں گے۔ پھر بھی اس نے بہار کو پھولوں سے سجایا۔ کہ یہی پھولنے اور مرجھانے کا عمل ہی تو زندگی ہے۔"

ہندی نے کہا: "ٹھیک ہے۔ اگر تمھارا خدا سفید انسان کو بھی مرجھا دے تو میں سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

بات چیت یہاں تک پہنچی تھی کہ جاپانی جہاز کی سیٹیاں فتمندی کی خوشی میں بجنے لگیں۔ ایک ایک

انچ کرکے یہ جہاز دوڑ میں کمی ڈونیا کو دبانے لگا اور بالآخر اس سے آگے نکل گیا۔ ہر ہر لحظہ شکست خوردہ سفید جہاز پیچھے ہوتا جاتا تھا۔ شام کے دھندلکے میں یہ چھوٹا ہوتے ہوتے مشکل سے دکھائی دے رہا تھا۔ جاپانی بحری افسر اپنے کپتان کے گرد جمع تھے اور ان کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ایک تبسم تھا جس میں کچھ حقارت کی بھی آمیزش تھی۔



ادبیات کا مستقبل

(ذیل میں انگلستان کے نہایت ممتاز نوجوان شاعر ڈے لیوس کی ایک تقریر کے حصے ترجمہ کر کے پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے ریڈیو پر کی تھی اور بعد کو رسالہ LISTENER میں شایع ہوئی تھی۔ مدیر)

ادبیات کے مستقبل پر نظر کرنی ہے تو دماغ سے یہ غلط خیال نکال دینا چاہئے کہ زندگی اور ادب کوئی الگ الگ عالم ہیں یا ادب چاند کی طرح ایک مردہ جسم ہے جو محض اس لئے نظر آتا ہے کہ سورج کی کرنیں اس پر پڑتی ہیں، بس زندگی کے لئے ایک آئینۂ خود نمائی۔ نہیں۔ زندگی اور ادب میں اس سے بہت زیادہ گہرا تعلق ہے۔ زندگی پروٹیس کی طرح دم بدم متغیر رہتی ہے اور لحظہ بہ لحظہ اپنی شکل تبدیل کرتی رہتی ہے۔ ادب اس پروٹیس سے زور آزمائی کرتا ہے اس وقت تک کہ اسے کسی ایک شکل میں گانٹھ نہ لے اور اسی اپنا راز بتانے پر مجبور نہ کرے۔ لیکن پروٹیس پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر نئے سرے سے وہی قصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کا پتہ پہلے سے لگا لینا کہ اس مرتبہ زندگی کیا شکل اختیار کریگی اگر ممکن ہے تو اسی کے لئے جو اس کی موجودہ شکل پر پوری طرح حاوی ہو۔ لہٰذا اگر ادب کے متعلق پیش گوئی کرنی ہے تو پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس وقت زندگی ادبیات پر کس کس طرح اثر انداز ہے۔

ان اثرات میں سے اس وقت میں تین کا ذکر کرتا ہوں یعنی سیاسیات، نفسیات اور اختراعات حکمی۔ سیاسیات کے معنی ہیں، یا کم از کم ہونے چاہئیں، مل جل کر رہنے سہنے کا علم۔ اب آپ پوچھیں گے کہ اس علم کو آخر غریب مصنف سے کیا سروکار جو اپنے چھوٹے سے کمرہ یا دیہاتی گھر میں بیٹھا خوش خوش کچھ گھسیٹ رہا ہے۔ اس بیچارہ کے دروازہ پر تو بھوک کا بھیڑیا اتنی دفعہ آچکا ہے کہ اب یہ اسے پالتو جانور سمجھنے لگے تو بیجا نہیں، اسے کیا مطلب کہ سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں یا اجتماعی زندگی برباد۔" سو جناب یقین فرمائیے کہ مصنف کوئی عزلت نشیں کیکڑا نہیں ہوتا نہ یہ کسی ایسے جزیرہ میں بستا ہے جہاں وقت کوئی چیز نہیں اور پکے پکے میں آکر منہ میں ٹپک جاتے ہیں! یہ ضرور سچ ہے کہ ایک حد تک یہ انفرادیت پسند ہوتا ہے

لیکن ساتھ ہی شروع سے یہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کا ترجمان بھی رہا ہے۔ جب کوئی جماعت زوال آمادہ ہو یا کسی حیات بخش تغیر کی تکالیف سے گذر رہی ہو تو اس کا ترجمان بہ حیثیت فرد کے تو جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ کرتا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ اسے کچھ اور زیادہ بے چینی بھی محسوس ہوتی رہی ایسے وقتوں میں جب مل جلکر رہنا سہنا دشوار اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے تو مصنف سیاسیات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ کوئی اور راہ ہی اسے نہیں دکھائی دیتی سوائے اس کے کہ بیچارہ پاگل ہو جائے۔ ہاں کوئی راہ نہیں دکھائی دیتی جس پر چلکر یہ اپنی جماعتی ذمہ داری سے سبکدوش ہو سکے۔ چنانچہ بہت سے حساس مصنفوں نے یہی راہ اختیار کی ہے۔

کہتے ہیں کہ ہمارے دور کا غالب رنگ سیاسی ہے۔ بیشک، میرے ساتھ کے لکھنے والوں میں جتنی دلچسپی سیاسیات سے ہے شاید انقلاب فرانس کے بعد سے انگریزی مصنفوں میں کبھی نہیں رہی۔ یہ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی پرانی ساخت نئے تغیرات کا ساتھ نہیں دے سکتی اور یہ انھیں یقین نہیں آتا کہ اس میں ضروری تبدیلیاں کرنا بس اہل سیاست ہی کا کام ہے۔ ان لوگوں نے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کی مثال سے بھی ایک سبق سیکھا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جنگ کے بعد لارنس نے اپنے گرد ایک گروہ جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ انتشار اور تنہائی کے شدید احساس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا، لیکن اگرچہ لارنس بڑا آدمی تھا اور اس کی ذات میں بہت کشش تھی مگر وہ ناکام رہا۔ اس سے ہم لوگ متنبہ ہو گئے کہ کوئی گروہ جو کسی فرد کے گرد جمع ہو آج کل کامیاب نہیں ہو سکتا۔ واقعات عالم کا دباؤ اتنا سخت ہے کہ وہ مرکزی شخصیت سے جلد یا دیر نہ اٹھ سکے گا اور اس وقت یہ چھوٹا سا گروہ مجبوراً منتشر ہو جائیگا۔

یہی وجہ ہے کہ نوجوان لکھنے والے جان بوجھ کر یا بے جانے کسی ایسی عالمی تحریک سے وابستہ ہوتے جاتے ہیں جس کی بنا کسی خاص فرد پر نہ ہو بلکہ عامۃ الناس پر ہو مثلاً اشتراکی یا فاشستی تحریک سے۔ اور چاہے لوگ اصل معاملہ پر پردہ ڈالنے کی کتنی ہی کوشش کریں یہ مسلم ہے کہ یہ تحریکیں آخر کار جماعتی طبقوں کے باہمی تصادم سے متعلق ہیں۔ اس لئے ہم ادبیات کے متعلق یہی پیشین گوئی تو یہ کر سکتے ہیں کہ اگر اور جب بھی ان طبقات کا اختلاف زیادہ بڑھا اور ظاہر ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ لکھنے والے یا ادھر ہونگے یا ادھر۔ اور جہاں یہ ہوا ادبیات کے غرض و غایت کا ایک نیا تصور فروغ پائے گا۔ ادبیات کو افراد کے

باہمی تعلقات سے زیادہ طبقوں اور جماعتوں کے روابط و تعلقات سے سروکار ہو جائے گا' ادب سے عمل کی تنقید کی جگہ عمل کے لئے رہنمائی کا کام زیادہ لیا جانے لگیگا۔ اور کشمکش حیات میں ادب بالارادہ کسی ایک فریق کا ساتھ دیگا۔ یعنی ادب سبق سکھائیگا اور تلقین کرے گا۔

شاید آپ یہ پڑھکر بگڑتے ہوں گے کہ یہ سب کچھ غیر متعلق باتیں ہیں۔ تہذیب و تمدن تو حیات قومی کا پھول ہے' اس کی جنگ آزمائیوں کا ہتھیار نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مذہب خیال یہ بھی ہے اور اس کا مرکز کیمبرج ہے' کہ جس طرح بھی بن پڑے قومی تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنا چاہئے۔ مگر ذرا ایک لمحہ کے لئے سوچئے تو سہی۔ زندہ جسم کو مرجانے کے بعد بھی ایک سائنس داں دل کو نکال کر یا تھوڑا سا چمڑا کاٹ کر انھیں بہت دیر تک زندہ رکھ سکتا ہے لیکن ان کی زندگی بے معنی زندگی ہے۔ اسی طرح میرا خیال ہے کہ اگر کسی تہذیب و تمدن کو جسم اجتماعی کی بربادی کے بعد بھی مصنوعی طور پر زندہ رکھا جائے تو اس میں بھی کوئی معنی و مقصد نہ ہوگا۔

جی نہیں۔ جنھیں ادب اور سیاسیات کا تعلق ناپسند ہے ان کے لئے بس ایک ہی اور چیز رہ جاتی ہے یعنی نفسیات۔ فرائڈ نے انسان کو اپنی غیر شعوری زندگی کی طرف متوجہ کرکے ایک ایسے عمل کا آغاز کیا ہے جس کے نتائج شاید اتنے ہی اہم ثابت ہوں جتنے کہ انقلاب صنعتی کے یا اکتشاف امریکہ کے۔ عین اس وقت جب فرائڈ اپنے اس عظیم الشان کام کی ابتدا کر رہا تھا مصنف جماعتی زندگی کے انتشار کو محسوس کرکے اپنے آخری قلعہ میں پناہ گزیں ہونا چاہتا تھا یعنی خود اپنی ذات میں۔ ادب کی نظر اندر کی طرف کو ہو چلی تھی یعنی مختلف افراد کے باہمی تعلق و تصادم کی جگہ ادب کو ذہن انسانی کی اندرونی کشاکش سے زیادہ لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسی قسم کے لکھنے والوں کی آج نوجوان مصنفوں میں سب سے زیادہ قدر ہے مثلاً ممالک یورپ میں رلکے' کافکا' پروست اور انگلستان میں جائس اور ایلیٹ۔ ان کے بعد والے جو ہیں وہ بھی ادہر ہیں کبھی ادہر۔ کبھی سیاسی ہمدردیاں اپنی طرف کھینچتی ہیں کبھی غیر شعوری زندگی کی خدمت کی خواہش اپنی طرف۔ بہت سے ہیں' مثلاً اوڈن (AUDEN)' جو کچھ دن سیاست سے تعلق رکھکر بالآخر نفسیات کی طرف آگئے ہیں۔ اور چونکہ فرائڈ نے فرد پر نفسی زندگی کے باب میں بہت زور دیا ہے اس لئے

سچ پوچھیے تو آج کل لبرل فلسفہ کا سب سے بڑا معین رہی ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ لبرل فلسفہ زندگی جو کچھ عرصہ سے بے پتہ ہے اور جسے لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاسی میدان جنگ میں کام آچکا وہ شاید ادب اور نفسیات کے اسی تعاون سے پھر حیات نو حاصل کرلے .... اور سچی بات تو یہ ہے کہ ادب بغیر آقا کے زیادہ دن تک خوش نہیں رہتا .... اس وقت بھی وہ فیصلہ کرنے کی فکر میں ہے کہ کس آقا کی خدمت کرے، انقلابی تحریک کی یا فرائڈ کے لبرل فلسفہ کی۔

لیکن ایک تیسرا عنصر ہے جس نے اس فیصلہ کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ پہلے جو میدان خالص ادب کا سمجھا جاتا تھا اس میں اب اختراعات حکیمیہ مداخلت کر رہی ہیں۔ اور شخصی طور پر میں اسے اچھا سمجھتا ہوں کہ ہم طباعت کی موجودہ بے پناہ طوفان سے نفرت کریں تو بجا ہے .... لیکن ادب کی اس غیر ضروری فراوانی میں یہ ضرور ہے کہ سنجیدہ اور محض تفریحی تحریروں میں امتیاز با سانی ہو جاتا ہے۔ تفریحی تحریر کی جگہ میں سمجھتا ہوں کہ اختراعات اس وقت بھی لیتی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ بہر حال تفریحی تحریریں اثر رکھتی ہیں وہ یا تو اس لئے کہ حقیقت سے ان کی مطابقت ایسی شدید ہوتی ہے کہ اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں یا پھر وہ ہمیں ایسی دنیا دکھاتی ہیں جو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ اور یہ کام سینما اور لاسلکی اس وقت بھی بہت بہتر انجام دے سکتے ہیں۔ جب دوربینی کے آلات ذرا زیادہ مکمل ہو جائیں گے اور ٹاکیز کی طرح الڈس ھکسلے کے خیال کے بموجب (FEELIES) کا رواج ہو جائے گا تو پھر حقیقت سے مطابقت کے اعتبار سے یہ ہمارے حقیقت نگاروں کے بڑے سے بڑے حوصلہ سے آگے ہوں گی اور بعید از حقیقت مناظر پیش کرنے میں بھی ہماری تفریحی تحریروں سے کہیں زیادہ بعید از حقیقت چیزیں پیش کر سکیں گی۔ میں تو اس دن کا بھی تصور کر سکتا ہوں جب ہم کسی مشین پر ایک کتاب رکھ دیا کریں گے جیسے اب گراموفون میں رکارڈ رکھتے ہیں اور اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس کا جیتا جاگتا منظر ہمارے سامنے آجایا کرے گا۔ اپنے گھروں میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہم ان اشخاص کو دیکھ اور سونگھ سکیں گے جن کی تصویر مصنف نے پیش کی ہے۔ لیکن اسے ادب کہہ سکیں گے یا نہیں اور اس میں ہمارا جو حصہ ہوگا اس پر 'پڑھنے' کا اطلاق ہو سکیگا یا نہیں یہ میرے تخیل سے پرے کی بات ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مکی اختراعات عنقریب ادب کو مجبور کرنے والی ہیں کہ وہ اپنے اصلی کام کے متعلق فیصلہ کرے۔ وہ کیا کام ہے جو چھپے ہوئے الفاظ سے بہ نسبت دوسرے ذرایع کے بہتر طریق پر لیا جاسکتا ہے۔ میرا گمان ہے کہ پہلا مورچہ جو ادب اپنے حریفوں کے سپرد کردے گا وہ تو حقیقت نگاری ہے .... سچ پوچھو تو مجھے تو شبہ ہے کہ ناول نگاری کی عمر اور سو برس کی بھی باقی ہے یا نہیں۔

میں سمجھتا ہوں، چاہے یہ اچنبھے ہی کی بات کیوں نہ ہو، کہ ادبیات میں جس چیز میں باقی رہنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے وہ شعر ہے۔ شعر اور پریوں کی کہانیاں جو ادب کی سب سے سادہ شکلیں ہیں۔ شاعری کچھ تو استادوں کی مدد سے اور خاصکر اپنے توازن و ترنم کے باعث قلب انسانی کی ان گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے جہاں اور کسی چیز کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ پریوں کی کہانیاں یعنی تمثیلی قصے، اس لئے باقی رہیں گے کہ یہ تعلیم کا بے مثل ذریعہ ہیں۔ پروپگنڈا، وعظ حکمی کتابیں صرف ذہن شعوری پر اثر ڈال سکتی ہیں۔ تمثیلی قصے کہانیاں، چونکہ یہ نہایت ابتدائی قسم کے ہوتے ہیں، چونکہ سب کے لئے ہوتے ہیں، چونکہ ان میں دلیل و برہان سے کام نہیں لیا جاتا، اس لئے یہ ہماری عقل کے قلعوں کے پاس سے چپکے سے آگے نکل جاتے اور ہمارے ذہن غیر شعوری سے براہ راست تعلق پیدا کر لیتے ہیں .... لیکن شاعری اور ان افسانوں کو اپنی اصلی سادگی کو قایم رکھ کر ظاہری وسطحی نفاست میں بہت کچھ اضافہ کرنا ہوگا۔ اس لئے کہ جدید انسان کا پیچیدہ ذہن آرٹ کے اصلی سادہ معنی سے اپنے کو اسی وقت متاثر ہونے دیتا ہے جب اس میں بظاہر قدرت و نفاست موجود ہو۔

تصنیف و تحریر کا مستقبل تمام تر جماعت کے مستقبل پر منحصر ہے۔ لیکن ظن غالب یہ ہے کہ کوئی نظام اجتماعی بھی بروئے کار آئے ادب کی حیثیت روز بروز زندگی کے رہبر کی ہوتی جائے گی۔ ادب اور اخلاق میں جو عارضی مغائرت ہے وہ ختم ہو جائے گی .... میرا خیال ہے کہ ادبیات میں انقلاب شروع ہو چکا ہے۔ لیکن میرا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جماعتی زندگی کا انقلاب ادبی انقلاب سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اگر یہ نہ ہوا تو وہ بے سود ہوگا اور بے معنی۔ اور اگر کسی کو انقلاب کا لفظ

نہ بجاتا ہوا ان کے لئے اس قول پر یہ تحریر ختم کرتا ہوں :-

ارتقا، ایک رقص ہے، اور انقلابات اس میں بمنزلہ قدم - پو -



دنیا کی رفتار

غیر ممالک

جاپان جاپان کا عروج تاریخ عالم میں بیسویں صدی کا غالباً سب سے مہتم بالشان واقعہ شمار کیا جائیگا۔ چالیس سال میں اس نے چار جنگیں کیں اور چاروں میں کامیاب ہوا۔ ۱۸۹۴ء میں چین سے، ۱۹۰۴ء میں روس سے، ۱۹۱۴ء میں جرمنی سے اور ۱۹۳۱ء میں پھر چین سے۔ اس کی ظفر مند فوجوں نے ابھی شکست کا منہ نہیں دیکھا ہے اور ان کی جانبازی نے اس چھوٹے سے دور افتادہ جزیرہ کو دنیا کی سب سے بڑی قوتوں میں شامل کر دیا ہے اور دوسری قوتیں اس کی ترقی کی رفتار سے سخت تردد میں ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اوروں کی طرح جاپان بھی بہت سخت اندرونی مسائل سے دوچار ہے۔ معاشی اس کی زرعی کساد بازاری کا ذکر کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ چاول اور ریشم کا کام کرنے والے بہت برے حال میں ہیں۔ طبقات معاشی کی کشاکش کے آثار بھی کبھی کبھی ظاہر ہوتے ہیں۔ سیاسی تشدد اور حریت دشمنی کے مظاہر سے بھی جاپانی زندگی پاک نہیں، مگر ہر سیاح جو حال میں جاپان گیا ہے۔ یہی کہتا ہے کہ جاپانی قوم میں باوجود ان داخلی مشکلات کے ایک غیر معمولی قوت اور ولولہ پیدا ہے، جو اسے برابر آگے بڑھا رہا ہے۔ منچوریا میں جو ہوا اور چین میں جو ہو رہا ہے وہ اسی حوصلہ مندی کے خارجی مظاہر ہیں اور قرائن یہ ہیں کہ یہ مظاہر ایک سلسلہ کی ابتدائی کڑیاں ہیں۔

جاپان فی الحال اس حقیقت کو دنیا سے تسلیم کرانا چاہتا ہے کہ مشرقی ایشیا کا علاقہ اپنی مخصوص مسائل رکھتا ہے اور اس علاقہ میں بس ایک قوت ہے جو انھیں حل کر سکتی ہے اور وہ جاپان ہے۔ اندرون ملک میں ضبط و نظم ہے، باہر موثر طور پر کام کرنے کے لئے تجارتی اور فوجی قوت موجود ہے، اور ایک

با اثر فوجی جماعت ہے جو اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے درپے ہے اور جسے قوم کے نوجوانوں کی دلی حمایت حاصل ہے ۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے شروع میں جاپانی قوت کے مسئلہ پر بحری نقطۂ نظر سے غور کیا گیا ہے ۔ اس کا اصلی محاذ بحری محاذ سمجھا گیا ہے اور انگلستان اور امریکہ کی متحدہ قوت اس کی حریف ۔ مگر اب جاپان نے سمندر سے رخ ہٹا کر براعظم ایشیا کی طرف توجہ کی ہے ۔ اور غالب گمان ہے کہ اگلے بیس تیس سال کی سیاست میں اسی عنصر سے جاپانی رویہ کی تعیین ہوگی ۔ اور اس زمانہ میں جاپان کے لئے چین اور منگولیا کے مسائل کو اور روس اور منچوکو کے ساتھ تعلقات کو خاص اہمیت حاصل ہوگی ۔ ان مسائل کو خاطر خواہ طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جاپان کو بحری محاذ پر پورا اطمینان ہو اور بظاہر جاپانیوں کا خیال ہے کہ وہ اس طرف سے مطمئن ہو سکتے ہیں ، ۱۹۲۲ء میں واشنگٹن کے بحری معاہدہ کے وقت جو دول باہم ملکر جاپان کی حریف بن سکتی تھیں وہ اب غالباً نہ مل سکیں اور جاپانیوں کا اندازہ ہے کہ مشرقی ایشیا میں انگلستان اور امریکہ کا اتحاد عمل اس قدر بعید ہو گیا ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ مگر پھر بھی یہ واشنگٹن کے معاہدہ کی مقرر کردہ نسبت ۵ : ۵ : ۳ جس میں امریکہ اور انگلستان کے پانچ پانچ کے مقابلہ میں اس کی قوت تین ہونی چاہیے مسترد کر رہا ہے اور باوجودیکہ امریکہ کو دو بڑے ساحلوں کی حفاظت کرنی پڑتی ہے اور برطانوی بیڑہ کو غیر معمولی فاصلوں پر اپنی سلطنت کے مفاد کی حفاظت کا فرض انجام دینا ہوتا ہے لیکن جاپان قومی خودداری کے چلتے ہوئے نقرے کی آڑ میں دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت سے مساوات کا طالب ہے اور اس سے کم درجہ پر کسی طرح راضی نہیں ۔ غرض جاپان نے بحری محاذ پر اپنے کو بالکل محفوظ کر لیا ہے ، اور جب انگلستان اور امریکہ کے اتحاد کی طرف سے اس نے یوں یکسوئی کر لی ہے تو دو ... دول مغرب کے اپنے خلاف ملنے کا تو اسے کیا اندیشہ ہوگا ۔ منچوریا میں جمعیتہ اقوام کی مداخلت سے اس امکانی اتحاد کی حقیقت تو دنیا پر آشکار ہو ہی چکی ہے ۔

جاپان کے نزدیک اصلی مسئلہ روس کا ہے اور اس کے بعد چین کا ۔ منچوکو کی نئی ریاست کے قیام کی اصلی وجہ یہی ہے کہ جاپانی جنرل اسٹاف کے نزدیک اس وقت مفاد قومی کے تحفظ کے لئے شمالی

مشرقی ایشیا کا تمام علاقہ وہی اہمیت رکھتا ہے جو ۱۹۰۵ء میں جزیرہ نمائے کوریا کو حاصل تھی۔ یعنی فوجی قوتوں کے ترقی اور فن جنگ کے جدید تغیرات نیز ذرائع نقل وحمل کی ترقیوں کے پیش نظر جنرل اسٹاف کے نزدیک جاپان کی مشرقی سرحد منگولیا سے پرے سمجھنی چاہیئے۔

جاپان کی بڑھتی ہوئی قوت کے سامنے چین کی بنیادی دشواری یہ ہے کہ ادہر دنیا نئے تصورات کا جولانگاہ بن گئی ہے جو قومی اعمال کے لئے محرکات کا کام دیتے ہیں اُدہر یہ سب سے قدیم متمدن قوم اپنے صدیوں کے حاصل کردہ محاسن ومعائب کو یک بیک چھوڑ نہیں سکتی۔ جاپان کے سپاہی حب وطن کے نشہ میں سرشار اور اپنی ریاست کو تمام محاسن اخلاق کا جامع جانکر دنیا فتح کرنے نکلتے ہیں اِدھر یہ غیر معمولی طور پر متمدن لوگ فی الجملہ قومیت اور حب وطن کے اس تصور تک سے یک قلم نا آشنا ہیں جس نے یورپی قوام اور ان کے دیس میں جاپان کو دوسروں کے حقوق تلف کرنے تک پر آمادہ کر دیا ہے۔ اپنے وطن سے محبت یوں تو چینیوں میں بھی کسی اور سے کم نہیں، لیکن یہ محبت انھیں جارحانہ سیاسی اعمال کے لئے آمادہ نہیں کرسکتی۔ یہ ریاست اور وطن کو ایک چیز نہیں جانتے۔ ان کے خیال میں تو ریاست ایک مصیبت ہے جس سے بچنے کی تدبیر کرتے رہنا چاہیئے، اور اس کی مداخلت سے اپنے خاندان کو جیسے تیسے محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اب دور جدید کی ضرورتیں ان چینیوں کو مجبور کر رہی ہیں کہ یہ بھی ریاست کو اپنے قومی مفاد کا حامل سمجھیں اور یہ خیال تیزی سے ترقی بھی کر رہا ہے۔ لیکن دوسروں میں تو یہ جنون کی حد تک ترقی پا چکا ہے۔ اور شاید چینی ریاست جب تک اپنی اس کمزوری کو رفع کر پائے ممکن ہے کہ اپنی خودمختاری ہاتھ سے کھو چکی ہو۔

چین کی دوسری مشکل معاشی ہے۔ ملک کی معاشی حالت اس وقت جتنی بری ہے شاید کبھی پہلے نہ تھی عالمی کساد بازاری کے اثرات چین میں ۱۹۳۲ء سے ظاہر ہونے شروع ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں ان کا اثر بہت بڑھ گیا۔ اور سال کے آخر میں حکومت نانکنگ کی مالی حالت بہت ہی تشویشناک ہوگئی تھی۔ یہ حکومت شنگھائی کے ساہوکارہ سے برابر قرض لے کر اپنا کام چلا رہی تھی۔ شنگھائی کے ساہوکارہ میں اس وقت زبردست تھا۔ اس لئے کہ ملک میں بدامنی کے باعث اور سرمایہ لگانے کے مواقع مفقود ہونے کی وجہ سے سارا

سرمایہ شنگھائی میں جمع ہوگیا تھا اس لئے حکومت کو بھی یہاں آسانی سے قرض مل جاتا تھا۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں شنگھائی سے چاندی نہایت وسیع پیمانہ پر باہر جانا شروع ہوئی اور یہ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ اس منڈی سے حکومت کی ضرورتیں پوری نہ ہو سکیں گی۔ اس سے پہلے چین میں باہر سے چاندی آیا کرتی تھی لیکن اب چونکہ چین میں جو باہر کا مال جاتا ہے اس کے مقابلہ میں چینی مال کم باہر جارہا ہے یعنی چونکہ توازن تجارت چین کے خلاف ہے اس لئے اس کمی کی تلافی چاندی ہی باہر بھیج بھیج کر ہوتی رہیگی اور اس سے اندیشہ ہے کہ چینی زر رائج کی بنیادیں بالکل کھوکلی نہ ہو جائیں۔

ان حالات میں غریب چین جاپان کا مقابلہ کیسے کرے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ چین اپنے طاقتور "دوستوں" میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں لاکھڑا کرتا تھا۔ مگر اب بظاہر جاپان کے لئے میدان صاف ہے۔ لہذا چین کو اکیلے جاپان سے اپنا معاملہ سدھارنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی مداخلت کی توقع چھوڑ کر چینی حکومت برابر جاپان سے تصفیہ کی کوشش کررہی ہے۔ اپنے وفادار سپہ سالاروں کو جاپان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہی برطرف کیا جاتا ہے، محاصل تجارتی میں ترمیمیں کرکے جاپان کے لئے رعایت کی صورتیں نکالی جاتی ہیں، چینی جہاز سازی کے مرکزوں میں جاپانی استاد کام کر رہے ہیں، اور لوگ تو یہ تک کہہ رہے ہیں کہ جنرل چیانگ کائی شیک چین کو جاپان کے ہاتھ بیچے دے رہا ہے۔ لیکن خود قوم پرست چینی اپنی مجبوری کو سمجھ کر جنرل شیک پر ایسا شبہ نہیں کرسکتے۔ وہ جانتے ہیں کہ روز بد کو جتنا ٹالا جاسکے ٹالنا چاہئے۔ ممکن ہے اس زمانہ میں بین الاقوامی سیاست میں کوئی ایسی تبدیلی رونما ہو کہ دوسری دول جاپان کو روکنے کے قابل ہو جائیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ یہ کمزور کی سیاست ہے جو واقعات کا مقابلہ احتمالات سے کرنا چاہتی ہے۔

چین کے معاملہ میں اس وقت اگر کوئی مداخلت کے لئے آمادہ معلوم ہوتا ہے تو وہ روس ہے۔ لیکن روسی مداخلت کے معنی چینی نظام ہیئت اور چینی معاشرت کی درہمی برہمی ہے۔ اس لئے چینیوں کا سواد اعظم اور موجودہ چینی حکومت اس مداخلت کے مخالف ہیں۔ لیکن آج نہیں تو کل یہ چین کے معاملہ میں روس اور جاپان کا تصادم ناگزیر ہے۔ کمزور اور لاچار کے طاقتور ہمسایوں میں ہمیشہ چشمک رہتی ہے۔ چنانچہ روس اور

جاپان میں بھی تعلقات برابر کشیدہ رہتے ہیں۔ کبھی زیادہ کبھی کم۔ اور دونوں طرف سے برابر آمادگی جنگ کا اظہار بھی ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اصل صورت حال یہ ہے کہ روس اپنی اندرونی معشیت کو منظم کرنے میں اس قدر منہمک ہے کہ باہر کے جھگڑوں سے اپنا دامن حتی الوسع بچانا چاہتا ہے۔ چنانچہ باوجود تیز تیز تقریروں کے جاپان کے ساتھ رعایتیں ہوتی رہتی ہیں۔

سب سے پیچیدہ معاملہ چینی مشرقی ریلوے کا تھا۔ روس نے جب ۱۸۹۶ء میں منچوریا پر اپنا تسلط قایم کرنے کی ٹھانی تھی تو اس منصوبہ کا آغاز اسی ریل کے اقرارنامہ سے کیا تھا۔ مگر ۱۹۰۵ء میں جاپان سے شکست کھانے کے بعد روس کا اثر اس علاقہ میں گھٹنا شروع ہوا اور اب ۲۳ مارچ ۱۹۳۵ء کو روس نے اس ریل کا بیعنامہ ریاست منچوکو کے نام لکھ کر اس علاقہ میں جاپان کے تسلط کو عملاً تسلیم کر لیا ہے بقول لٹوینوف، وزیر خارجہ روس "یہ بیعنامہ مشرق بعید کے دشوار ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ کا حل ہے اور روسی جاپانی تعلقات کے نشوونما میں ایک قابل لحاظ مثبت عنصر"۔ اسی سلسلہ میں لٹوینوف نے دو چیزوں کا اور بھی ذکر کیا تھا۔ ایک تو جنگ سے اجتناب کے اس معاہدہ کا جس کی تجویز روس نے ۱۹۳۱ء میں کی تھی لیکن جس پر جاپان نے ہنوز کوئی توجہ نہ کی، دوسرے منچوریا اور سائبیریا کی سرحدوں پر سے فوجیں ہٹا لینے اور قلعے تعمیر نہ کرنے کی تجویز کا کوئی سال بھر سے زیادہ ہوا جاپان کی طرف سے کی گئی تھی مگر جس پر روس نے اب تک گفتگو کرنے سے انکار کیا ہے۔ گویا وزیر خارجہ روس نے یہ اشارہ دیا ہے کہ اگر پہلی تجویز پر جاپان غور کرے تو روس دوسری پر گفتگو کے لئے آمادہ ہے۔ لیکن ان صلح جویانہ اشاروں کے باوجود روس خوب جانتا ہے کہ جلد یا بدیر جاپان سے ٹکر ہوگی اور صلح ہے اک مہلت سامان جنگ۔ ہاں اپنی طرف سے وہ اس وقت چھیڑ نہ کریگا۔

جاپان کے لئے روس کی یہ کمزوری اور داخلی مشغولیت جنگ چھیڑ دینے کا موقع ہو سکتی تھی۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ جاپان بھی پہل کرنا نہیں چاہتا۔ مقابلہ سخت ہے اور جاپان کے ہاتھ بھی خالی نہیں۔ منچوکو کے قیام سے متعدد توجہ طلب مسائل نکل آئے ہیں جن کا حل نکالنا ہے۔ دوسرے جاپان اپنے تمام فوجی نظام کی تجدید کر رہا ہے اور اس میں ابھی کئی سال کا کام باقی ہے۔ لیکن اپنی سرپرستی اور قیادت میں منچوکو کے

قیام سے اس کی سرحدوں کا معاملہ جاپان کے لئے نہایت اہم ہو گیا ہے۔ اور مستقل طور پر روس سے تصادم کا ٹلنا غالباً ممکن نہ ہو۔ منچوکو کی وجہ سے جاپان کو مغربی جانب منگولیا سے بنٹنا ہے اور منگولیا کی وجہ سے روس سے بھی۔ منگولیا کے دو حصے ہیں بیرونی اور اندرونی۔ بیرونی میں روسی اثر نہایت قوی ہے اور اندرونی منگولیا میں جنوب و مشرق سے چینی کسانوں کی بکثرت آمد نے یہاں کی خانہ بدوش اور مویشی پالنے کی معشیت کے نظام کو درہم و برہم کرنا شروع کر دیا ہے۔ جاپانیوں کا خیال ہے کہ منچوکو کے ذریعہ منگولیا کو مدد دے کر اس ابتدائی نظام معشیت کی عمر بڑھا سکیں گے اور اس کے حامیوں کو اپنا ساتھی بنا لیں گے۔ لیکن فوجی ضرورتوں کے باعث انھیں ریلیں بنا کر ذرایع نقل و حمل بھی درست کرنے ہیں اور جہاں ریل پہنچی وہاں چینی کسان بھی پہنچتا ہے اور زمین پر قبضہ کر کے عمیق کاشت شروع کر دیتا ہے جس سے وہ خانہ بدوش نظام لامحالہ ختم ہوتا جاتا ہے۔ اس طرح منگولی ابتدائی معشیت کا علاقہ برابر روسی سرحد کی طرف ہٹتا جائیگا اور اس کے ساتھ ساتھ جاپانی بھی آگے بڑھنا چاہیں گے۔ منگولیا میں روس اور جاپان کے اس ناگزیر تصادم سے پہلے گمان ہے کہ خود منگولیا والے روس سے ٹکرا جائیں گے کہ انھیں برابر جاپان سے شہ مل رہی ہے۔

کیا تعجب ہے کہ جنرل اسمٹس جیسے شاطر سیاسی نے دوسرے اہل سیاست کو یہ مشورہ دیا ہے کہ مشرق پر نظر رکھیں!

<u>ایک دلچسپ دستاویز</u> جاپان کی حوصلہ مند سیاست کے مستقبل پر ایک دستاویز سے جسے کینٹن کے چینی اخبارات نے شایع کیا ہے خوب روشنی پڑتی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں شاہ جاپان نے اپنے وزیر اعظم مسٹر تناکا کو حکم دیا تھا کہ وہ سیاست عالم پر ایک عام تبصرہ کر کے جاپان کے لئے ایک مفصل لائحہ عمل بنائیں جو عرصہ تک جاپانی سیاست کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سکے۔ وزیر اعظم نے ایک سال کے مطالعہ اور غور کے بعد ایک یادداشت بصیغہ راز پیش کی جس کی نقل وزارت خارجہ جاپان کا ایک چینی مترجم لے اڑا اور چینی اخبارات نے اسے شایع کر دیا۔ جاپانی وزارت خارجہ نے اس کی صحت سے فوراً انکار کیا لیکن عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دستاویز صحیح ہے اور واقعی بارگاہ شاہی میں پیش کی گئی تھی۔

اس دستاویز میں توسیع سلطنت کو چھ ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) پہلا دور منچوریا اور منگولیا پر تسلط حاصل کرنے کا ہے۔ فتح منچوریا کی تدابیر مفصل درج کی گئی ہیں اور بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ منچوریا اور صوبہ جہول پر حملہ اور قبضہ کے معاملہ میں تفصیلات تک میں اس دستاویز کی پابندی کی گئی ہے۔ منچوریا کے بعد اندرونی منگولیا کو لینے کی تجویز کی گئی ہے۔ اور تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ نیم مختار منگولی شاہزادوں کو جاپانی اثر میں لایا جائے۔ اس پر بھی ہماری آنکھوں کے سامنے عمل ہو رہا ہے۔ حال میں جاپانی فوج نے چہار کے ضلع پر قبضہ کر کے گویا اندرونی منگولیا کی شاہراہ پر قابو پا لیا ہے۔ اس کے بعد بیرونی منگولیا کی باری ہے۔ جو اس وقت عملاً روس کے ماتحت ہے۔ اس مقصد کے حصول کا زمانہ روس کی قوت اور دوسرے معاملات میں روسی۔ جاپانی تعلقات کی نوعیت پر منحصر رکھا گیا ہے۔

(۲) دوسرا دور دریائے یانگتسی کی وادی پر تسلط کا ہے جو چین کا سب سے زیادہ آباد اور زرخیز علاقہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں شنگھائی پر جو حملہ ہوا تھا وہ دراصل اس مقصد کے حصول کے لئے ایک قبل از وقت کوشش تھی جسے چینی مقابلہ کی شدت اور دول یورپ کی مداخلت کے اندیشہ سے فی الحال عارضی طور پر ملتوی کر دیا گیا ہے۔

(۳) تیسرا دور کینٹن میں جاپانی اثر کو اتنی ترقی دینے کا ہے کہ جنوبی چین پر عملاً جاپان کا تسلط ہو جائے۔ سارے چین پر یہ تسلط دغاباز اور خود غرض سپہ سالاروں اور تعلقہ داروں کو قابو میں لا کر حاصل کرنے کی تجویز ہے۔ نسخہ مجرب ہے، کیا عجب ہے کہ کارگر ہو!

(۴) چوتھا دور فرانسیسی ہندی۔ چین میں اثر بڑھانے اور بالآخر اسے سلطنت جاپان میں شامل کرنے کا ہے۔

(۵) پانچواں دور ولندیزی جزائر شرق الہند اور جزائر فلپائن پر قبضہ کا ہے اور

(۶) چھٹا دور' یادش بخیر' ہندوستان پر قبضہ کا! اس لئے کہ بقول مجوز "ہندوستان کو بہ حیثیت سلطنت کوئی خارجی مضبوط قوت ہی متحد رکھ سکتی ہے۔ انگریز اس حیثیت کو چھوڑتے جاتے ہیں جو انھیں مغلوں سے ورثہ میں ملی تھی اور دہلی میں جس قوی اور با اقتدار حکومت کی ضرورت ہے

اس کا فراہم کرنا جاپانیوں کے لئے ہی مقسوم ہے" خانہ انوری کا پتہ یہ بلائے آسمانی ابھی سے معلوم کر رہی ہے !

غرض منصوبہ یہ ہے کہ سائبیریا کو چھوڑ کر سارے ایشیا پر ٹوکیو کا سیاسی، معاشی اور فوجی اقتدار ہو اور جاپان دنیا کی سب سے قوی حکومت ہو، اور اس کی سلطنت رومی، برطانوی، اور مغل سلطنتوں سے بھی بڑی ہو۔

یورپ جاپان اور روس میں جنگ کے امکانات پر جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئیے کہ اس مرتبہ بھی یہ جھگڑا ۱۹۰۵ء کی طرح صرف انھیں دو قوموں تک محدود رہ سکے گا۔ دنیا رفتہ رفتہ چھوٹی ہوتی جاتی ہے اور سیاسی رابطوں اور سیاسی رقابتوں کا ایک ایسا جال بن گیا ہے کہ اسے کہیں سے چھیڑئیے دور دور تک اثر پہنچتا ہے۔ مثلاً روسی اثر کو قابو میں رکھنے کے لئے برطانوی سیاست کی شاطر کاریاں اور جرمنی کو دبائے رکھنے کے لئے فرانس کی ریشہ دوانیاں بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ انگلستان کی سیاست یہ ہے کہ روسی اثر کو دبانے کے لئے جرمنی سے سمجھوتہ کرو، فرانس کی تدبیر یہ ہے کہ جرمنی کو دبانے کے لئے روس سے میل بڑھاؤ۔

روس کی طرف انگلستان کا جو رویہ ہے اس کے متعلق انگلستان کے مشہور اشتراکی صحیفہ LABOUR MONTHLY کے مدیر نے صاف صاف لکھا ہے کہ برطانوی سیاست خارجہ کا سب سے اہم مقصد اس وقت روس پر حملہ ہے۔ اس نے جتایا ہے کہ فرانس اور روس کے معاہدہ کی شدید مخالفت انگلستان کے بااثر اخبارات ٹائمس اور ڈیلی ہرالڈ کر رہے ہیں۔ آبزرور اور ڈیلی میل جیسے ہر دلعزیز اخبارات جرمنی، پولینڈ اور جاپان کے باہم ملکر روس کے خلاف اقدام کی توقع کا ذکر ایک طے شدہ اور پسندیدہ امر کی حیثیت سے کرتے ہیں۔ برطانوی ہوائی فوج کے پرچہ AEROPLANE کی یہ تحریر بھی اس نے نقل کی ہے کہ "ہم برسوں سے اپنی ہوائی فوج کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ تمھارا واقعی عظیم الشان کارنامہ یہ ہوگا کہ جرمنی جا کر روسی حملہ کو روکنے میں مدد دو" لیبر منتھلی لکھتا ہے، " اگر روس کے خلاف جنگ کے بھڑکانے

اور اس کی تیاری کرنے میں برطانوی سامراج کا واقعی حصہ دیکھنا ہو تو سیاسی صحافت کے درپردہ رموز اور میٹھی منافقتوں سے قطع نظر کرکے فوج اور دیگر ملازمین سرکار کے رسالوں اور عام پسند اخباروں کے صاف صاف اور ناتراشیدہ اعلانات کو دیکھئے جو سیاسی ماہروں کی بہ نسبت برطانوی سامراج کی حقیقی مقاصد کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔ جیسا کہ جرمنی کے خلاف جنگ کی تیاری کے وقت ثابت ہو چکا ہے۔ جب ایسکوتھ، گرے اور ہالڈین ان جنگی تیاریوں سے انکار کرتے تھے جو یہ سب درپردہ کر رہے تھے اور عوام کو "بحری تعطیل" اور "جرمنی سے مفاہمت" کے سبز باغ دکھاتے تھے تو اس وقت یہی ڈیلی میل اور لارڈ نارتھ کلف اور لارڈ رابرٹس کھلے کھلے الفاظ میں جرمنی سے ہونے والی جنگ کا ذکر کرتے تھے۔ یہی حال آج آنے والے 'دشمن' روس کے ساتھ ہے۔"

سیاسی منافقتوں کے سلسلہ میں تو انگلستان کے ہونہار نوجوان سیاسی انتھنی ایڈن کی وہ کامیابی ہے جو انھیں ماسکو میں حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے روس اور انگلستان نے امن اور تحفظ عامہ کے لئے باہمی تعاون کی ضرورت کا اقرار کیا ہے۔ لیکن روس اور انگلستان کے تعلقات میں پچھلے دس برس میں کچھ ایسا اتار چڑھاؤ رہا ہے کہ اس اعلان سے زیادہ توقعات وابستہ کر لینا غلطی ہوگی۔ پہلے تو انگلستان نے روس کی انقلابی حکومت کو ۱۹۲۴ء تک تسلیم ہی نہ کیا، پھر تسلیم کرنے کے تین ہی سال بعد لندن میں روسی تجارتی سفارتخانہ پر چھاپہ مارا گیا اور وہاں سے کچھ ایسے کاغذات برآمد ہوئے کہ سیاسی تعلقات پھر منقطع ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں یہ رشتہ پھر جڑ گیا۔ مگر ۱۹۳۳ء میں روس میں برطانوی انجینیروں پر مقدمہ چلا اور اس سے تعلقات سیاسی پھر کشیدہ ہو گئے۔ مگر ۱۹۳۴ء میں پھر ایک تجارتی معاہدہ ہوا جس کے اثرات پر کینیڈا اور اسکاٹستان نہایت سختی سے احتجاج کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ سیاسی تعلقات کی نوعیت برابر بدلتی رہی ہے اس لئے موجودہ خوشگوار اعلانات کو "میٹھی منافقتوں" ہی میں شمار کیا جائے تو زیادہ بعید از حقیقت نہ ہوگا۔

انگلستان نے جو رویہ کچھ عرصہ سے جرمنی کے ساتھ اختیار کیا ہے اس سے بھی مذکورہ بالا خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ ہٹلر کے برسر اقتدار آنے پر کیا کچھ شور و غل انگلستان میں نہ مچا۔ مگر سچ ہے، کامیابی کی طرح

کوئی چیز کامیاب نہیں ہوتی۔ اب تو انگلستان برابر ہٹلر کی جرمنی سے روابط بڑھا رہا ہے۔ اور ممتاز برطانوی اہل سیاست اور با اثر انگریزی اخبارات نے جرمن امن پسندی کے راگ الاپنے شروع کر دیے ہیں اور انداز یہ ہے کہ کسی مستقل سیاسی مفاہمت کے لئے فضا تیار کی جا رہی ہے۔ کوئی چار مہینے ہوئے کہ لارڈ لودین نے، جن سے ہندوستانی بہ حیثیت صدر فرنچائز کمیٹی واقف ہیں اور جو اپنے معروف سیاسی خیالات کی وجہ سے توقع۔ اشتراکیت سے کوئی لفظی ہمدردی نہیں رکھ سکتے، جرمنی کی سیاحت کی، ہٹلر اور بہت سے اور ممتاز نازی اہل سیاست سے ملاقاتیں کیں اور واپسی پر اخبار ٹائمس میں ہٹلر کے مطالبات کے متعلق لکھا کہ "وہ مساوات چاہتا ہے، جنگ نہیں چاہتا، وہ تو جنگ کو یکقلم ترک کرنے تک کو تیار ہے؟ پولینڈ سے معاہدہ کرکے اس نے عہد نامہ ورسائی کے سب سے خطرناک اور تلخ عنصر یعنی پولی کوریڈور کے مسئلہ کو دس سال کے لئے امکانی اسباب جنگ کی فہرست سے خارج کر دیا ہے، وہ قطعی طور پر اور ہمیشہ کیلئے السااس لورین کو فرانس کا حصہ تسلیم کرتا ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ اگر آسٹریا کے دوسرے پڑوسی بھی اسی کا وعدہ کریں تو یہ بھی اپنے محبوب اسٹریا کے معاملہ تک میں فوجی مداخلت سے باز رہنے کا عہد کرنے کو تیار ہے۔ اور اپنی خواہش امن کا ثبوت دینے کے لئے اپنے تمام پڑوسیوں سے جنگ سے اجتناب کا عہد کرنے کو آمادہ ہے۔ اسلحہ کے معاملہ میں بھی وہ صرف مساوات کا طالب ہے اور اگر دوسرے بھی اپنے یہاں لے لے قبول کریں تو یہ بھی اسلحہ کی بین الاقوامی نگرانی کو تسلیم کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ مجھے ذرا شبہ نہیں کہ اس کا یہ رویہ تمامتر خلوص پر مبنی ہے۔ ہٹلر کی جرمنی جنگ کی خواہاں نہیں"

انگلستان کا موقر اور سلطنت برطانوی کی سیاست میں نہایت بااثر رسالہ راؤنڈ ٹیبل لکھتا ہے کہ ہٹلر کے نزدیک مشرقی اشتراکیت سے مغربی دنیا کا پشت پناہ جرمنی ہی کو ہونا چاہیئے۔ جرمنی کی اس امن پسندی اور اس کی فوجی تیاریوں میں مطابقت کی کوشش بھی اس موقر رسالہ نے یوں کی ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی فاتحوں کے غلط رویہ پر ہے۔ اور لارڈ بالفور نے ۱۹۱۶ء میں وزارت برطانوی کے سامنے جو یادداشت پیش کی تھی اس کا یہ حصہ نقل کیا ہے کہ " تاریخ میں شکست خوردہ ریاست کی فوجی قوت کو ختم کرنے کی جو مثالیں ہیں ان میں سے ایک وہ کوشش بھی ہے جو نپولین نے معرکہ ینا کے بعد

پروشیا کی فوج کو ختم کرنے کے لئے کی۔ کوئی دوسری کوشش شاید اتنی ناکام نہ ہوئی ہوگی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ نپولین ہی کی سیاست نے پروشیا کو اس فوجی نظام کی ترتیب پر مجبور کیا جس نے جدید جرمن کو پیدا کیا۔"

الغرض برطانوی سیاست کا رخ جرمنی سے مفاہمت کی طرف ہے۔ ان سطور کے لکھتے وقت جرمنی اور انگلستان میں بحری قوت کے تناسب باہمی کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے اور قرائن ہیں کہ اٹلی اور فرانس کی ناپسندیدگی کے باوجود بہت جلد باہمی مفاہمت سے جرمن کا مطالبہ کہ اس کی بحری طاقت برطانیہ کی قوت کی ۳۵ فیصد ہو تسلیم کر لیا جائے گا۔ اور سیاست عالم میں پھر ایسے ہی جتھے بن جائیں گے جیسے جنگ سے پہلے تھے، ایک طرف انگلستان، جرمنی، پولینڈ اور غالباً جاپان۔ دوسری طرف فرانس، روس، اٹلی اور یورپ کی بعض فرانس دوست جدید ریاستیں۔ اس لئے کہ فرانس کسی طرح جرمن سے سمجھوتہ پر تیار نہیں۔ فرانس کی سیاست کا سب سے بڑا مسئلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ اپنے کو اپنے مشرقی ہمسایوں سے کس طرح محفوظ رکھے۔ اس کا ایک حل تو یہ ہے کہ ان میں نااتفاقی رہے اور فرانس نے اس حل سے بہت کچھ کام لیا ہے دوسرا حل یہ ہے کہ ان پڑوسیوں کے مشرق میں جو عظیم الشان قوت روس کی ہے اس کو اپنا حلیف بنائے۔ چنانچہ اس پر جنگ سے پہلے عمل تھا۔ اسی کے پیش نظر اب پھر روس سے معاہدہ ہوا ہے اور برابر تعلقات کے بڑھانے کی کوششیں جاری ہیں۔

ہندوستان

بین الاقوامی فضا اور ہندوستان وسائل آمد و رفت اور ذرائع خبر رسانی کی ترقی اور پیدائش پر پیمانہ کبیر کے فروغ نے جس سے نئی منڈیوں کی تلاش اور تسخیر ضروری ہو جاتی ہے یوں تو دنیا کے کسی گوشہ کو بھی مغربی ممالک کے اثر و اقتدار سے آزاد نہیں رکھا ہے لیکن برطانیہ کی محکومیت اور اس کے ساتھ صنعتی، تجارتی اور مالی وابستگی کی وجہ سے ہندوستان خصوصیت کے ساتھ مجبور ہو گیا ہے کہ دول عظمے کی رفتار سیاست میں جو کچھ بھی تبدیلی ہو اس کا عکس اپنی سیاسی اور معاشی زندگی میں بھی مشاہدہ کرے۔

بین الاقوامی معاملات کے منصفانہ اور پُرامن تصفیہ کے لئے جنگ کے بعد جو فضا پیدا کی گئی تھی اور جو قوانین اور ادارے بنائے گئے تھے اُن سے منحرف ہو کر مغربی ممالک اب دوبارہ جنگ سے پہلے کی مزاجی دھینگا مشتی کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ اسلحہ اندوزی کی دوڑ شروع ہو گئی ہے۔ مقابلہ اور مسابقت کا زور شور ہے۔ کمزور ملکوں پر طاقتور ملک دانت جمائے بیٹھے ہیں۔ جرمنی نے معاہدہ ورسائی کو ختم کر دیا۔ تاوان جنگ کی ذمہ داری اپنے سر سے اُتار پھینکی۔ فوج، اسلحہ اور بحری و ہوائی جہازوں کے معاملوں میں اپنے کھوئے ہوئے حقوق سب واپس لے لئے۔ اب اس کا مرتبہ دوسرے دول سے کم نہیں ہے۔ آسٹریا کو اپنے اندر جذب کرنے کی دھن اس پر سوار ہے۔ سار کے علاقہ پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ ڈانزگ اور میل کے علاقے بھی عنقریب اس کے قبضہ میں آ جائیں گے۔ اٹلی اپنی فوجی قوت کا خوب مظاہرہ کر رہا ہے اور ملک حبش کو ہضم کرنے کا پکا ارادہ کر چکا ہے۔ جاپان چین میں گھستا چلا جا رہا ہے۔ جرمنی اور جاپان دونوں انجمن اقوام کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے ہیں اور اٹلی بھی علیحدہ ہونے کی دھمکی دے رہا ہے۔

چین اور ملک حبش کا اس کے سوا کوئی دوسرا قصور نہیں ہے کہ وہ کمزور ہیں اور کمزور کو آزادی کے جینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اُسے ہمیشہ کسی طاقتور ملک کے غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہئے۔ جاپان اور اٹلی کو اپنی مصنوعات کے لئے منڈی اور اشیاء خام کی ضرورت ہے۔ اپنی نئی نسل کے حوصلوں اور اُمنگوں کو پورا کرنے کے لئے نو آبادیوں اور محکوم ممالک میں ترقی کے مواقع چاہئیں۔ ان دونوں کے پاس منظم طاقت ہے اور طاقت سب سے بڑا حق ہے۔

جب طاقت حق ہے اور کمزور کا کوئی ساتھی نہیں تو پھر ہندوستان کا کیا حشر ہونے والا ہے؟ گذشتہ بیس سالوں میں جو تحریریں اور کتابیں شائع ہوئیں اُن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ بس اب ظلم و ناانصافی کا زمانہ ختم ہوا۔ کمزور اور پس ماندہ ملکوں کی آزادی اور خودمختاری کا احترام ہوگا۔ اگر ان میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی فی الحال سکت نہیں ہے تو انھیں سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع دیا جائے گا۔ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت اور جمہوری طرز حکومت کی توسیع کی جائے گی۔ بین الاقوامی معاملات میں قانون و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ زور اور قوت کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ معاملات کا تصفیہ جدال و قتال سے نہیں بلکہ

مصالحت ومفاہمت اور معقول وپرامن گفتگوؤں سے کیا جایا کرے گا۔ اسلحہ اور عسکری قوت چونکہ غیر ضروری ہو جائیں گے اس لئے ان کی بہت زیادہ تخفیف کردی جائیگی۔ لیکن یہ سب زائل ہو گئے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا ۵

معاملہ اگر زور آزمائی کا نہ ہوتا اور سمجھانے بجھانے سے کام نکل سکتا، تقریری وتحریری درخواستوں مشاورتی جلسوں اور ملاقاتوں کا اثر قبول کیا جاتا یا معمولی معاشی دباؤ یا اور اسی قسم کی پرامن شورشوں مثلاً مظاہروں، جلسوں، ہڑتالوں، عارضی سول نافرمانیوں اور عدم ادائیگی محاصل سے عوام کے جذبات واحساسات کی شدت کی ترجمانی ہو سکتی تو ہندوستان کو بھی امید ہوتی کہ اس کی بھی شنوائی ہوگی اور حق وانصاف کے مطالبے سے مجبور ہو کر ہندوستان کو بھی آزاد ممالک کا مرتبہ دے دیا جائے گا۔ لیکن جب دنیا کی رائے عامہ کے نزدیک دلائل کی قوت محض زور اور طاقت پر منحصر ہو جائے تو کیا نہتے اور بے زور ہندوستان کے لئے مایوسی کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی رہ جاتا ہے؟۔

حقیقت یہ ہے کہ تحریک امن کی ناکامی ہندوستان کی تحریک آزادی کے لئے ایک نہایت جانکاہ سانحہ ثابت ہوگی۔ ہندوستان کے وہ لوگ جنھوں نے مہاتما گاندھی کے اصول عدم تشدد کو اختیار کیا ہے اس وقت ایک بڑی سخت ابتلا وآزمائش سے دوچار ہیں۔ انھوں نے ایک اہم ذمہ داری اپنے سر لی تھی اور ایک بڑے مذہب کی تبلیغ واشاعت کا بیڑا اٹھایا تھا۔ انھوں نے انسانی فطرت کے متعلق بہت زیادہ حسن ظن اور خوش عقیدگی سے کام لیا تھا۔ انجمن اقوام اپنی موجودہ شکل میں بذات خود تو نہیں لیکن اس کا تخیل اور لٹریچر ان کے لئے ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ ڈر یہ ہے کہ کہیں انجمن اقوام کی تباہی کا اثر ہندوستان کی تحریک عدم تشدد پر بالکل وہی نہ پڑے جو خلافت کی منسوخی کا اثر ہندوستان کی تحریک خلافت پر ہوا تھا یعنی یہ کہ پاؤں تلے کی بنیاد نکل جانے کی وجہ سے انتشار اور بدنظمی کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس وقت بھی کانگریس کمزور نظر آرہی ہے اس کے بعد اس کے اور زیادہ منتشر ہو جانے کا اندیشہ ہے مہاتما گاندھی کی تحریک کی جگہ کوئی دوسری

تحریک آسانی سے نہیں لے سکتی ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سوال یہ ہے کیا اقوام مغرب کی طرح ہندوستان کی ملکی سیاست کو بھی دور بعد از جنگ سے دور قبل از جنگ کی طرف واپس جانا پڑے گا ؟ قدامت پسند جماعت کے نزدیک صورت حال کا اس سے بہتر کوئی دوسرا ارتقا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ غالباً ناممکن ہے۔ ہندوستان کی سیاسی تحریک مستقبل میں کیا شکل اختیار کرے گی اس کے متعلق فیصلہ بہت مشکل ہے۔ عوامل اس قدر غیر متیقن متضاد اور پیچیدہ ہیں کہ ان کے نتیجہ سے جو حرکت پیدا ہوگی اس کا اندازہ کرنا سہل نہیں ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ صورت حال تشویشناک ضرور ہے۔

نئی مجلس مقننہ میں کانگریسی جماعت

مہاتما گاندھی نے جب سے کانگریس کی پالیسی پر اثر ڈالنا شروع کیا ہے ہندوستان کی قومی تحریک کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہوگئی ہے کہ اس کے کارکن سیاسی ترقی اور معاشری اصلاح کے کام ساتھ ساتھ کرنے لگے ہیں۔ سیاسی تحریکیں وقتی جوش اور ہنگامے میں تو خوب سرسبز ہوتی ہیں لیکن جہاں مخالف ہوا چلی اور جوش ٹھنڈا ہوا یہ تحریکیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ جماعتی زندگی منتشر اور رہنماؤں اور پیروؤں کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن معاشری اصلاح کے کام آہستہ آہستہ پھیلتے ہیں، زیادہ مستقل بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں اور وقتی شورشوں کا اتنا اثر قبول نہیں کرتے کہ دفعتہً بہت زیادہ پھیل جائیں اور پھر یکبارگی ختم ہو جائیں۔ پھر سیاسی کاموں کے مقابلہ میں معاشری کام حکومت کی پکڑ دھکڑ سے بھی بڑی حد تک محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان حالات میں جب کہ سیاسی تحریکوں کو چلانا ناممکن ہو جاتا ہے اور چند روز تک جوش و خروش دکھا کر یہ تقریباً فنا ہو جاتی ہیں۔ کانگریس کے کارکن سیاسی تحریک کے زمانۂ انحطاط میں معاشری کاموں میں پناہ لیتے ہیں۔ عوام سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں اور آئندہ کے لئے اپنی قوت کو مجتمع کرتے رہتے ہیں۔

پہلی تحریک عدم تعاون میں پسپائی کے بعد کانگریس ۱۹۲۳ء میں دو گروہوں میں منقسم ہوگئی تھی۔

ایک گروہ نے تو دوبارہ انہی مجالس قانون ساز پر قبضہ کیا جن کا پہلے خود اُس نے نہایت شد و مد سے بائی کاٹ کیا تھا۔ مگر دوسرے گروہ نے وضع پر قائم رہ کر کونسلوں سے اپنی علیحدگی کو جاری رکھا اور تعمیری کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دونوں گروہوں نے اپنی اپنی جگہ بڑے کارہائے نمایاں انجام دئیے اور جب سیاسی صورت حال کے ارتقا نے انھیں حکومت کے بلا واسطہ مقابلہ کے لئے دوبارہ واپس بلایا تو دونوں گروہ منظم اجتماعی قوت اور رائے عامہ کی پوری حمایت اور اعتماد کے ساتھ اپنے نئے فرائض کی بجا آوری میں مصروف ہو گئے۔

پچھلی تحریک سول نافرمانی میں بھی جب کانگریس کے لئے حکومت سے براہ راست مقابلہ کے امکانات مفقود ہو گئے۔ حکومت کی طرف سے ہنگامی قوانین اور سختیوں میں اضافہ ہوا۔ کانگریس کے تمام ادارے اور شاخیں غیر قانونی اور اس کا سرمایہ لائق ضبطی قرار دے دیا گیا۔ اخباروں، تقریروں، جلوسوں، جلسوں حتیٰ کہ نقل و حرکت پر پابندی عاید کر دی گئی۔ رہنماؤں کو جیل میں رہنے کے سوا کسی دوسرے کام کا موقع نہ رہا۔ مہاتماجی نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنی پوری توجہ اور قوت اچھوتوں کے لئے وقف کر دی۔ لوگوں میں عام طور پر تھکن اور بے دلی پیدا ہو گئی اور مقابلہ کی سکت باقی نہ رہی تو سوال پیدا ہوا کہ کانگریس کی منتشر قوتوں کو دوبارہ مجتمع کرنے کی کیا صورت نکالی جائے۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو سول نافرمانی کی قرارداد منسوخ کرنا پڑی جس سے کانگریس کو دوبارہ ایک قانونی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۲۳ء کی طرح اس مرتبہ پھر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک جماعت کونسلوں میں داخل ہو کر اندر سے حکومت کا مقابلہ کرے اور کانگریس کے احیا میں جو باہر دشواریاں پیش آئیں ان کا قانونی اور دستوری طریقہ پر مداوا کرے اور اس طرح پنڈت موتی لال، پریسیڈنٹ پٹیل اور سوراج پارٹی کی قائم کردہ روایات کو زندہ رکھے اور باقی سب لوگ باہر رہ کر تعمیری کاموں میں مصروف رہیں۔ اور عوام سے ملنے کے مواقع میں اضافہ کریں۔ اپنی پُرخلوص خدمت، دیانت اور ایثار سے لوگوں کے دلوں میں عزت و اعتماد پیدا کریں۔ اور ایسے تعمیری کاموں میں مصروف رہیں جن کے بغیر ایک متحدہ قومیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور سوراج ملنے کے بعد چلایا ہی نہیں جا سکتا۔ تعمیری کاموں کا تذکرہ تو اس کے بعد دوسرے عنوان کے

تحت میں کیا جائے گا یہاں کانگریس پارلیمنٹری جماعت کے قیام اور اُس نے اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں جو کام کئے ہیں اُن پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

کانگریس پارلیمنٹری جماعت کو اپنے قیام کی ابتدا میں سخت پیچیدگیوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف تو سوشلسٹ جماعت تھی جو کاؤنسل کے داخلہ کو تضیع اوقات سے تعبیر کرتی تھی اور کانگریس کی پالیسیوں کو ایک سوشلسٹ رنگ دینے کے لئے مصر تھی۔ دوسری طرف پنڈت مالویہ اور مسٹر آنے تھے جو چاہتے تھے کہ کانگریس صاف اور واضح الفاظ میں کمیونل اوارڈ کو مسترد کردے۔ کانگریس کے رہنماؤں کے لئے یہ موقع سخت آزمائش کا تھا۔ ملک میں ان کی قوت بالکل منتشر ہو چکی تھی۔ کمیونل اوارڈ کے مسئلہ میں ہندوؤں کی اکثریت مالویہ جی کی طرف دار معلوم ہوتی تھی۔ انتخاب جداگانہ حلقوں سے ہونے والا تھا جہاں مسلمانوں کی ہمدردی سے کسی فائدہ پہنچنے کی امید نہ تھی اور ہندوؤں کی مخالفت سے نقصان کا اندیشہ تھا۔ اس مسئلہ پر کانگریس کے درمیان تفرقہ یقینی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اس موقع پر کانگریس نے اپنے تدبر اور عاقبت اندیشانہ معاملہ فہمی کا پوری طرح ثبوت فراہم کردیا۔ خطروں اور دشواریوں کی موجودگی میں اس نازک وقت پر کانگریس کے رہنماؤں نے اعلیٰ قومی تخیل کے مقابلہ میں پست فرقہ وارانہ ذہنیت کو ترجیح نہیں دی۔ وقتی مصلحت کی خاطر قوم کے مستقل مفاد کو قربان نہیں کیا۔ اُنھوں نے وہ رویہ اختیار کیا جو ہرچند نہ تو فرقہ پرست مسلمان کے لئے پسندیدہ تھا نہ فرقہ پرست ہندو کے لئے مگر جس سے آیندہ کے لئے مصالحت اور مفاہمت کا دروازہ کھلتا تھا۔ اُنھوں نے اصولاً ایک غیر قوم کی ہندوستان کے خانگی معاملات میں مداخلت کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ کمیونل اوارڈ کو بجائے خود اُنھوں نے نہ قبول کیا نہ مسترد بلکہ فرقہ وارانہ مسائل کے حل کو تمام قوموں کے متفقہ سمجھوتہ پر منحصر رکھا جس کی ایک صورت یہ پیش کی کہ ایک ایسی دستور ساز انجمن طلب کی جائے جس کا انتخاب ملک کی تمام بالغ آبادی (اگر ضرورت ہو تو جداگانہ حلقوں سے) کرے۔

ان تجاویز کو عملی دشواریوں یا دوسرے اسباب کی بنا پر لایق پسند سمجھا جائے یا نہ سمجھا جائے لیکن اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کانگریس نے اس موقع پر جو رویہ اختیار کیا اس سے اس کے اس دعوے کی تائید ضرور ہوتی تھی کہ وہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی نمایندگی کرتی ہے۔ بلکہ پنڈت مالویہ

کی مخالفت اور کانگریسی پالیسی کی حمایت میں کانگریس کے بعض لیڈر مثلاً مسٹر بھولا بھائی دسائی اور سردار پٹیل تو اپنی ایک دو تقریروں میں خلاف توقع حد تک خاصے آگے بڑھ گئے تھے۔

بہرحال اس موقع پر کانگریس نے قومی نصب العین کی خاطر اپنے آپ کو نہایت دلیری اور جسارت سے خطرے میں ڈالا۔ پنڈت مالویہ مسٹر آنے اور ان کی بنائی ہوئی کانگریس نیشلسٹ پارٹی اور ہندو مہا سبھا نے انتخاب کے موقع پر کانگریس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن یہ کانگریس کی خوش نصیبی تھی (اور اس سے لوگوں میں اُس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے) کہ ان تمام مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود بنگال پنجاب اور سندھ کو چھوڑ کر باقی تمام صوبوں سے کانگریسی ممبر بڑی بھاری اکثریت کے ساتھ منتخب ہوئے۔

کانگریسی جماعت نے انتخاب کے وقت رائے دہندوں سے تین کاموں کے انجام دینے کا وعدہ کیا تھا (۱) وائٹ پیپر کی منسوخی اور ہندوستان کی سوراجی دستور بنانے کے لئے دستور ساز انجمن کا مطالبہ (۲) تمام ایسے قوانین کی منسوخی جن سے ہندوستان کی قومی تحریک کو دبانے کا کام لیا جاتا ہے اور (۳) موجودہ دستور کی پابندیوں کے باوجود قومی مفاد اور بہبود کے لئے جو کچھ بھی کیا جاسکتا ہے اس کی کوشش۔

ایک سو چالیس ممبروں سے زاید کی مجلس قانون ساز میں کانگریسیوں کی تعداد صرف ۴۴ تھی۔ اس لئے اپنے وعدوں کو بہ تمام و کمال پورا کرنے کی توان سے توقع کرنا ہی بے جا تھی۔ پھر ہندوستانی مجلس کی ڈبی کی جو حالت ہے اس میں اراکین کی کسی کوشش کا نتیجہ خیز ثابت ہونا بھی محض حکمرانوں کی مرضی اور مصلحت پر موقوف ہوتا ہے اس لئے سوال "فتح و شکست" کا نہیں بلکہ "دل ناتواں" کے "مقابلہ" کا تھا، سو اس اعتبار سے کانگریسی جماعت کی کارگذاریوں کو اپنے مقصد کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب سمجھنا چاہیئے۔ انھوں نے اسمبلی کے گذشتہ اجلاس میں عام طور پر بہت اچھا اثر پیدا کیا۔ ان کی جماعت کی انضباط و تنظیم اور مجلس میں پابندی کے ساتھ حاضری نہایت قابل تعریف رہی۔ دوسری جماعتوں سے ان کا اتحاد عمل اور مصالحت اور مفاہمت بھی جس کے بغیر یہ مجلس میں اپنی کسی تحریک کو بھی منظور اور حکومت کی تحریکوں کو نامنظور نہ کرا سکتے تھے بہت پسندیدہ رہا۔ مسٹر بھولا بھائی دسائی نے خصوصیت کے ساتھ کانگریس کے وقار کو خوب بلند کیا۔ ان کی تقریروں کی خوش بیانی، ان کے اخلاق کا حسن، ان کے خیالات کی وسعت اور رواداری اور

دل کی کشادگی اور فراخی نے دوست دشمن ہر ایک سے بہت جلد خراج تحسین وصول کر لیا۔ کانگرسی جماعت میں اگر انھیں سب سے زیادہ مقبول آدمی کہا جائے تو غالباً نادرست نہ ہوگا۔ مسٹر ستیا مورتی کے سوالات اور مسٹر گوبند ولبھ پنت کی تقریریں بھی کانگرسی جماعت کی عزت بڑھانے میں خاصی معاون ثابت ہوئیں۔

وائٹ پیپر کی مخالفت میں کانگریس کی اپنی تحریک پاس نہ ہو سکی۔ لیکن مسٹر جناح کی جو تحریک پاس ہوئی اس میں کانگریس کو بلاشبہ ایک شریک غالب کی حیثیت حاصل تھی۔

دستور ساز انجمن کا مطالبہ البتہ کانگریس کی طرف سے پیش نہیں ہوا۔ ہر چند اس کے پیش کرنے سے کسی نتیجہ کے پیدا ہونے کی تو توقع نہ تھی لیکن وعدہ کے ایفاء کے سلسلہ میں اس کام کو ہر حال کرنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے آیندہ اجلاس میں اس کے ممکن العمل پہلوؤں پر توجہ کی جائے۔

ایسے قوانین کی منسوخی کے لئے جن سے قومی تحریک کو دبایا جاتا ہے اگر وزیر قانون نے اجلاس کے آخری دنوں میں رخنہ اندازی کے طریقوں مثلاً ڈھائی ڈھائی گھنٹے کی تقریریں وغیرہ نہ کی ہوتیں تو شاید کانگریس کے پاس کچھ کام دکھلانے کے لئے ہوتا۔ اب شملہ کے اجلاس میں ممکن ہے اس کے لئے بھی کوشش کی جائے۔

کانگرسی جماعت نے اپنی طرف سے جو تحریکیں پیش کیں ان میں مندرجہ ذیل خاص طور پر لائق ذکر ہیں:۔ نظر بندوں کو رہا کیا جائے۔ ہندوستانی سیوادل اور خدائی خدمتگاروں اور دوسرے کانگرسی اداروں کو کام کرنے کی اجازت دی جائے۔ جو کانگرسی ابھی تک قید میں انھیں آزاد کیا جائے۔ محاصل کا بار ہلکا کیا جائے۔ مہاتماجی کی دیہی صنعتوں کی انجمن کے خلاف حکومت نے جو سرکلر بھیجا ہے وہ واپس لیا جائے اور سرت چندر بوس رکن مجلس مقننہ کو آزاد کیا جائے۔

ریلوے بجٹ میں حکومت کے خلاف کانگریس نے بہت سی تحریکیں منظور کرائیں مثلاً صرف ہندوستانیوں کو ہی ریلوے کی ادنیٰ اور اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کیا جائے۔ تیسرے درجے کے مسافروں کی شکایتوں کو رفع کیا جائے۔ ریلوے محاصل اس طرح وصول کئے جائیں جن سے زراعت وصنعت کی ترقی میں امداد ملے۔

عام بجٹ میں کانگریس نے مندرجہ ذیل تحریکیں منظور کرائیں:۔ نمک کے محصول کو ۱۴ سے ۱۵ آنہ فی من کیا جائے پوسٹ کارڈ کو نصف آنہ، ایک تولہ کے لفافہ کو ایک آنہ اور پیکٹ کی شرح محصول میں تخفیف

کی جائے۔ کھالوں پر برآمد کا محصول جاری رکھا جائے تاکہ ملکی دباغت کی صنعت کو ترقی ہو۔ انکم ٹیکس ایک ہزار سے زیادہ اور دو ہزار سے کم آمدنیوں پر نہ لیا جائے۔

لیکن کانگریس کی یہ تمام تحریکیں جو مجلس میں پاس ہوئیں ویسرائے نے اپنے اختیار خصوصی سے مسترد کردیں۔ سرجیمس گرگ وزیر مالیات نے سرکاری رویہ کی حمایت میں یہ دلیل پیش کی کہ کانگریسی تحریکیں چونکہ نیک نیتی پر نہیں بلکہ دانستہ مخالفت پر مبنی ہیں اس لئے جب تک کانگریس پارٹی کی نیت درست نہ ہوگی اس وقت تک ان کی کسی ترمیم یا تجویز کو چاہے وہ بظاہر کتنی ہی معتدل کیوں نہ معلوم ہو حکومت منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ لیکن وہ غالباً یہ بھول گئے کہ کانگریس کی تعداد مجلس میں صرف ۴۴ تھی جتنی تحریکیں پاس ہوئیں ان میں کانگریس کے علاوہ ایسی دوسری جماعتوں کے ووٹ بھی شامل تھے جن کی نیت کے متعلق اتنی آسانی سے شاید ان کے لئے بھی قطعی فیصلہ ممکن نہ تھا؟

اسمبلی میں کسی اور دوسری جماعت نے کانگریسی جماعت کے برابر کام نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں مسٹر جناح نے وائٹ پیپر کی مخالفت میں اپنی تحریک کو تین جداگانہ اجزا میں منقسم کرکے بڑی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ لیکن یہ ان کی انفرادی کامیابی تھی۔ اُن کی آزاد جماعت ہر قسم کی بندشوں اور وفاداریوں سے آزاد رہی اور اسے جماعت کہنا خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ مسلم گروپ بھی منتشر رہا۔ کراچی کے المناک سانحہ کے سلسلہ میں جو التوا کی تحریک پیش کی گئی اس میں بھی کانگریسی جماعت نے وسعت نظر سے کام لیا اور مسٹر گوبا کی تحقیقات کی تحریک کی پُرزور حمایت کی۔

حکومت کی جماعت نے اپنی اہلیت کی کچھ اچھی نمائش نہیں کی اور عوام کی ہمدردی حاصل کرنے میں ناکام رہی سابق وزیر تجارت مسٹر بھور کی تقریریں نسبتاً بے ضرر رہیں۔ وزیر قانون، مسٹر سرکار کی تقریروں میں تلخی بغض اور دلآزاری کا پہلو نمایاں رہتا تھا اور وزیر مالیات مسٹر گرگ کی ابتدائی تقریریں گو قابل اطمینان تھیں مگر آخری تقریریں سخت جنگ جویانہ ثابت ہوئیں انھوں نے کانگریس کو ترکی بہ ترکی جواب دئے جو اس وجہ سے کہ موجودہ جماعت عاملہ غیر جواب دہ اور ناقابل بدل ہے اور پبلک کے کسی حصہ کی اُسے نمائندگی حاصل نہیں ہے ناگوار معلوم ہوئے اور اس سے عموماً یہ اثر پڑا کہ حکومت کسی قسم کی مفاہمت کے لئے آمادہ

نہیں ہے بلکہ کانگریس سے جب تک وہ پوری طرح اطاعت قبول نہ کرے ہر میدان میں لڑائی جاری رکھنا چاہتی ہے۔

کانگریس اور حکومت کی تعمیری کوششیں۔

پہلی تحریک عدم تعاون کے بعد کانگریس کی جن تعمیری کوششوں نے خاص اہمیت حاصل کی وہ کھدر اور ہندی کی تحریکیں تھیں۔ اُس وقت کھدر کو رواج اور ترقی دینے کے لئے تمام ہندوستان کے کاتنے والوں کی ایک انجمن بنائی گئی تھی جو کانگریس کی طرح ایک سیاسی ادارہ نہ تھی بلکہ جو سیاست سے علیحدہ رہ کر صرف کھادی کی ترقی میں مشغول رہتی تھی۔ یہ ادارہ جب سے اب تک کام کر رہا ہے۔ کھادی کے بعض قدیم مرکزوں میں اس کے کارخانے قائم کئے گئے ہیں اور اس کی شاخیں تقریباً ہر ضلع اور بڑے قصبہ میں موجود ہیں جہاں خالص کھدر (یعنی ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بنا ہوا) فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے کام کو مستعد اور پُرجوش کانگریسی خیال کے نوجوانوں کی ایک جماعت چلا رہی ہے۔

ہندی پھیلانے کی کوشش کانگریس کے کارکنوں کی طرف سے منظم طریقہ پر خصوصیت کے ساتھ جنوبی ہند میں شروع کی گئی۔ اس مقصد کے لئے ایک سبھا بنائی گئی جس نے گاؤں گاؤں میں تعلیم بالغان، دیہی کتب خانے اور دوسرے تعلیمی مراکز قائم کرکے ہندی کی توسیع میں بہت کوشش کی۔ لاکھوں ایسے لوگوں کو جو پہلے ہندی نہیں جانتے تھے، ہندی بولنا اور لکھنا سکھایا۔ ان کے دل میں ہندی کی محبت پیدا کی اور ضمناً ان پرخلوص کام کرنے والوں نے اپنی سیرت کی اعلیٰ خصوصیات کو بھی اپنے گردوپیش کی آبادی میں پھیلایا۔ مہاتما گاندھی کی تمام تحریکوں کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ خواص کی نہیں بلکہ عوام کی تحریکیں ہوتی ہیں۔ اپنی تمام تحریکوں کی بنیاد وہ عوام کی تائید، حمایت اور قبولیت پر رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کھادی اور ہندی کی تحریکوں کی توسیع کے لئے خواص کا سہارا اور ایسے کام نہیں سوچے جن میں اعلیٰ فنی اہلیت اور قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ایسے کام اختیار کئے جن میں بہت معمولی محنت، مہارت اور کم خرچ سے کام چل جاتا ہے۔

ان مستقل غیر سیاسی اداروں کے علاوہ جو دوسرے نیم سیاسی ادارے اس زمانہ میں تعمیری کوششیں کر رہے تھے وہ کچھ آشرم اور درسگاہیں تھیں جنھیں قومی تحریک کا مرکز سمجھنا چاہئیے یا عارضی مصیبتوں مثلاً سیلاب یا وبائی امراض میں امداد دینے والوں کی جماعتیں ہوتی تھیں جو جب تک مصیبت رہتی تھی یکجا رہتی تھیں

اور بعد میں منتشر ہو جاتی تھیں ۔

اس مرتبہ تحریک سول نافرمانی میں پسپائی کے بعد جب دوبارہ تعمیری کوششوں کو زندہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو تمام ہندوستان کے کاتنے والوں کی انجمن اور جنوبی ہند کی ہندی پھیلانے والی سبھا تو موجود ہی تھیں لیکن یہ کانگریس کے تمام نوجوان کارکنوں کو جو اب جیل سے نکلنے کے بعد بیکار تھے اپنے اندر جذب نہ کر سکتی تھیں ۔ دوسرے کانگریس اپنی تعمیری کوششوں کو اس مرتبہ صرف کھادی تک محدود رکھنا نہ چاہتی تھی بلکہ انھیں وسعت دینا چاہتی تھی ۔ مہاتما جی کے سامنے سب سے اہم معاشری مسئلہ اچھوتوں اور اعلیٰ ذات والوں کی تفریق مٹانا تھا ۔ اس لئے انھوں نے پہلے تو ایسے کارکنوں کی ایک جماعت بنائی جو اچھوتوں کے مسائل کا مطالعہ کریں، ان کی زندگی سدھاریں اور ان کا رتبہ بلند کر کے انھیں اعلیٰ ذات میں شامل کریں ۔ اس جماعت کا مقصد بھی غیر سیاسی تھا اس لئے اس کے قیام میں کوئی قانونی دشواری نہ تھی ۔ پھر بہار کے زلزلہ کی تباہیوں کے بعد کانگریس کے کارکنوں کو مصروفیت کا بہت اچھا موقع مل گیا اور بہار کی امداد اور تعمیر نو میں ان لوگوں نے بڑی بیش بہا خدمات انجام دیں ۔ اس کے بعد مہاتما جی نے دیہی صنعتوں کو ترقی دینے والی انجمن قائم کی ۔ اس کا مقصد بھی غیر سیاسی بیان کیا گیا پھر بورسا د میں پلیگ پھیلنے پر ایک جماعت سردار پٹیل کی سرکردگی میں طاعون زدہ لوگوں کی امداد کے لئے پہنچی ۔ مہاتما جی نے اندور میں ہندی یونیورسٹی کے قیام اور ہندی کی مزید اشاعت کے لئے کوششیں کیں اور اب کوئٹہ کی تباہی کے بعد کوئٹہ کے مصیبت زدوں کی امداد کی طرف کانگریس کے کارکن متوجہ ہیں ۔

لیکن حکومت اس مرتبہ بہت زیادہ چوکنا ہے ۔ وہ کانگریس کی تعمیری کوششوں کو بھی اتنا ہی خطرناک سمجھ رہی ہے جتنا اس کی تخریبی کوششوں کو سمجھتی تھی ۔ ہنگامی قوانین اور دوسرے طریقوں سے وہ سیاسی تحریکوں کو تو دبائے ہوئے ہے لیکن وہ اس طرف سے بھی ہوشیار رہنا چاہتی ہے کہ کہیں معاشری تحریکوں کے چور دروازے سے گھس کر کانگریس عوام میں دوبارہ اثر و اقتدار حاصل نہ کرلے چنانچہ وہ کانگریس کی ہر چال کی پہلے سے پیش بندی کر رہی ہے اور ہر میدان میں کانگریس سے مقابلہ پر

آمادہ ہے ۔ اس سال کے مالیہ میں لوگوں کا خیال ہے مہاتما جی کی دیہی صنعتوں کی انجمن کو زک دینے کے لئے ایک کروڑ روپیہ دیہی تعمیر نو کے لئے منظور کیا گیا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ سلور جوبلی فنڈ کا روپیہ بھی دیہی فلاح و بہبود کے کاموں میں صرف کیا جائے گا ۔ کوئٹہ کے مصیبت زدوں کی امداد کا کانگریس کو موقع نہیں دیا گیا بلکہ حکومت نے خود اپنے فوجی اور سول ملازموں سے ان کی امداد کے لئے وہ کام لئے جو بہار میں بابو راجندر پرشاد نے کانگریس کے کارکنوں سے کرائے تھے ۔ اس باہمی مقابلہ اور سابقت سے اگر حاجتمند لوگوں کی خدمت زیادہ ہوسکتی تو اس سے بہتر کیا بات تھی لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس کھینچا تانی میں دونوں فریق ایک دوسرے کے کام میں روڑے اٹکائیں گے اور کوئی بھی ضروری کام انجام نہ دے سکے گا ۔ حکومت کے وسائل بہت ہیں لیکن اس کے تعمیری کارکنوں میں خلوص نہ ہونے کی وجہ سے اتنے ہی زیادہ مہنگے اور بے اثر ہوتے ہیں ۔ حکومت کانگریس کے کاموں میں کامیابی کے ساتھ مزاحم ہوسکتی ہے لیکن اس سے بہتر تعمیری کام نہیں کرسکتی نہ لوگوں کا اتنا زیادہ اعتماد حاصل کرسکتی ہے ۔

کانگریس سوشلسٹ جماعت کانگریس کی پارلیمنٹری اور تعمیری کارگزاریوں کے مطالعہ کے بعد جب ہم سوشلسٹ جماعت کے اغراض و مقاصد اور عزائم کا مطالعہ کرتے ہیں اور بڈھے کانگریسیوں کے خلاف ان کی سخت تنقیدیں سنتے ہیں تو ہم بالکل ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں ۔ ہمیں باور کرایا جاتا ہے کہ کانگریس کے تمام اقوال بیانات اور قرار دادیں "مہمل" متضاد مبہم" ذومعنی اور منافقانہ ہیں ۔ اس کا لائحہ عمل فضول اور اس کی سعی و کاوش بے نتیجہ ہیں ۔ مہاتما گاندھی کے اقوال و اعمال خصوصیت کے ساتھ تکلیف دہ حد تک مضحک اور ناقابل معاف طریقہ پر بے کار ہوتے ہیں ۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص چاہتا کیا ہے اور کیا کر رہا ہے ؟ کیا قوم و ملک کو اس نے اپنی اوہام اور باطل پرستی کے لئے ایک کھلونا بنا رکھا ہے ؟ کبھی ایک بات کہتا ہے کبھی دوسری ۔ اُس کی کسی دو باتوں میں باہمی ربط اور یکسانیت نہیں پائی جاتی ۔ انگریزوں کا دشمن بھی نہیں، اور انھیں ہندوستان سے نکالنا بھی چاہتا ہے ۔ غریب مزدوروں اور کسانوں کا بھی دوست ہے اور اُن سرمایہ داروں' راجاؤں مہاراجوں کا بھی جو اُن کا خون چوس رہے ہیں ۔ ملک کی صنعتی ترقی کا بڑا حامی ہے لیکن مشین کا جو تنہا اس صنعتی ترقی کی ضامن ہوسکتی ہے مخالف ہے ۔ کونسل کے داخلہ کی کبھی

سخت مذمت کرتا ہے کبھی اس کی حمایت کرنے لگتا ہے۔ اپنے معتمد اور منتخب ساتھیوں سے سول نافرمانی کو شروع کراتا ہے۔ پھر اُن سے اس کو بند کرنے کو کہتا ہے۔ ان کے ایثار و قربانی کی تعریف نہیں کرتا بلکہ انھیں برا بھلا کہہ کر ساری ناکامی کا الزام اُن کے سر تھوپتا ہے۔ کسی جماعتی پابندی اور رشتے کو تسلیم نہیں کرتا۔ اپنے ذاتی فیصلوں کو اکثریت کی رائے سے زیادہ وقیع اور اٹل سمجھتا ہے جب کانگریس کو اُس کی رہنمائی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ بہل باتوں کے لئے روزے رکھ رکھ کر اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ اندرونی آوازیں سنتا ہے اور ان کی بنیاد پر سخت سے سخت نغو فیصلے کرتا ہے۔ عدم تشدد اور تلاش حق کا ایک ڈھونگ بنا رکھا ہے۔ اپنے روحانی تجربوں اور وہم پرستیوں کی خاطر سیاسی زندگی کا جیسا اس نے ستیاناس کیا ہے کسی دوسرے آدمی نے دنیا کے کسی حصہ میں نہیں کیا اس عجائب پرست ملک میں اپنی عجیب عجیب حرکتوں سے جو خوش عقیدگی اور پُر محبت شیفتگی اس نے اپنے لئے پیدا کی ہے اس کی بنا پر اس کا وجود ہندوستان کی ترقی کی راہ میں ایک بڑی سخت رکاوٹ بن گیا ہے یا تو یہ پیدائشی طور پر بے وقوف اور کم عقل ہے یا سخت قسم کا منافق اور حیلہ ساز۔ غرضکہ دونوں صورتوں میں کانگریس سے اس کا اور اس کے ساتھیوں کا اقتدار ختم ہونا نہایت ضروری ہے۔

کانگریس کو ایک واضح اور معقول پروگرام کی ضرورت ہے۔ کانگریس کی ابتدا سرمایہ داروں اور علمی پیشہ والوں نے کی جو سرکاری عہدوں، ملازمتوں، ملک کی تجارت اور صنعت میں زیادہ حصہ کے خواہش مند تھے۔ اپنے مطالبات کو وقیع بنانے کے لئے وہ کبھی کبھی ہندوستان کے گونگے بہرے عوام کی مفلسی اور جہالت کی بھی شکایت کرتے تھے لیکن اصل میں ہمیشہ اپنے طبقہ اور جماعت کا مفاد ان کی نظر کے سامنے رہتا تھا۔ اور اسی کے لئے حقوق حاصل کرنے کی وہ طرح طرح سے کوشش کرتے تھے۔ یہ جنگ گویا برطانوی اور ہندوستانی، بڑے اور چھوٹے سرمایہ داروں کے مابین تھی۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ پھر متوسط طبقہ کے تاجر اور علمی پیشہ والے بھی اس میں شریک کرلئے گئے لیکن یہ سب محفل کی رونق بڑھانے کے لئے شامل کئے جاتے تھے۔ مال غنیمت کے تقسیم کے وقت انھیں کسی حصہ کے ملنے کا موقع نہ تھا۔ مگر جب حکومت

کی بے اتفاقی اس کے بعد بھی قائم رہی اور انھیں "غیر مطمئن تعلیم یافتوں کا ایک قلیل التعداد گروہ" کہہ کر جسے ملک کی نمائندگی کا ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے طعنہ دیا اور چڑایا گیا تو انھوں نے کسانوں، مزدوروں اور عوام کی طرف بھی رخ کیا۔ جلسوں میں انھیں بھی بڑی تعداد میں شریک کرنے لگے اور ان کی طرف سے بھی مطالبات قراردادوں کی شکل میں پیش کئے جانے لگے۔ بڈھے تجربہ کار تو اصل حقیقت سے واقف تھے۔ لیکن اونچے طبقوں کے پُرجوش، بے فکر اور نوآموز نوجوانوں اور ادنیٰ طبقوں کے ذہین اور سمجھدار رہنماؤں کی وجہ سے کانگریسی سیاست نے ایک نیا، غیر متوقع اور ناپسندیدہ رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ ان لوگوں نے ایمانداری سے یہ اعتقاد رکھنا شروع کیا کہ کانگریس کا مقصد واقعی غریب کسانوں اور مزدوروں کی حمایت کرنا ہے۔ ابتدا میں بڈھوں نے نوجوانوں کو سمجھانا چاہا۔ لیکن جب یہ سرپھرے جوشیلے نوجوان اپنے طبقہ اور خود اپنی ہلاکت پر مصر نظر آئے تو یہ گھبرائے اور ان سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے۔ اس طرح کانگریس میں پہلا افتراق تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں رونما ہوا اور اعتدال پسند لبرل طبقہ نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر اپنی ایک جماعت بنالی۔ لیکن عام طور پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کا طبقہ جسے اس بات کا یقین تھا کہ عوام کے گلے کی زنجیر ابھی اس کے ہاتھ میں ہے اس بات سے خائف نہیں ہوا بلکہ حکومت کو ڈرانے کے لئے اسے ایک کارگر حربہ سمجھ کر استعمال کرتا رہا۔ مہاتما گاندھی کے خیالی اور مثالی نصب العین اسے مطمئن کرنے کے لئے کافی تھے۔ اگر ان شرائط کے ساتھ عوام میں بیداری پیدا ہو تو یہ خطرناک نہیں تھی۔ لیکن عدم تعاون کی تحریک کے بعد اور تحریک سول نافرمانی کے زمانہ میں معاملات نے زیادہ سنجیدہ صورت اختیار کرنا شروع کی اور نوجوانوں خصوصیت کے ساتھ بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں نے غالباً سرمایہ داروں کی رعونت کے ردّعمل کے زیر اثر کسانوں اور مزدوروں کی بہبودی کے نصب العین کو ایک مذہبی فریضہ بنالیا۔ اس وقت نہ صرف کمزور بلکہ قوی دل کے سرمایہ داروں میں بھی آئندہ کے متعلق تشویش پیدا ہوئی اور یہ سوچ کر کہ آگ سے کھیلنا اچھا نہیں ہے کانگریس کی مالی اعانت اور اخلاقی حمایت سے ہاتھ کھینچنا شروع کیا۔ انھوں نے دل میں کہا کہ زیادہ کے لالچ میں کہیں جو ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ دوسری طرف حکومت کی سختیاں بھی بڑھ گئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا

کہ جب تک حکومت کی سختی کم نہ ہو اور یہ نیا خطرناک عنصر قابو میں نہ آئے تحریک میں اپنے روپیہ اور اعانت سے گرمی پیدا کرنا مناسب نہیں ہے۔

کانگریس کے پرانے رہنما جو چرخہ، اچھوتوں کی اصلاح، شراب نوشی کے انسداد، گرام سدھار سودیشی، ہندو مسلم اتحاد، آشرموں کی زندگی وغیرہ کا پرچار کرتے ہیں وہ تو بے ضرر بھلے مانس ہیں اُن کی قومی اور سودیشی تحریک سے تو تجارت اور صنعت کو بھی خوب نفع پہنچتا ہے لیکن جو جائیدادوں کی ضبطی، کسانوں کو عدم ادائگی محاصل اور مزدوروں کو ہڑتالوں پر آمادہ کرتے ہیں اور اپنے آئندہ دستور حکومت میں سرمایہ داروں، زمینداروں، راجاؤں مہاراجوں کو کوئی جگہ دینا نہیں چاہتے، بڑے کارخانوں اور تجارتوں کو سرکاری انتظام کے ماتحت چلانا چاہتے ہیں اور دولت کی مساوی تقسیم چاہتے ہیں ان سے ہمارا اشتراک عمل نہیں ہوسکتا حکومت اور برطانوی سرمایہ دار سے ہمارا مقابلہ ہے اُن سے ہم لڑنا چاہتے ہیں ملک کے اندر ساہوکار اور زمیندار میں بھی آپس میں چشمک ہے۔ لیکن ایسے لوگوں کی بیعت، رہنمائی لعد اقتدار میں ہم لڑنا نہیں چاہتے جو اس مقابلہ کو ختم کرکے ہمیں بھی ختم کر ڈالیں۔

کانگریس کے پرانے رہنماؤں سے جن میں ان کی برادری کے بنئے، ساہوکار اور سرمایہ دار بھی تھے اور جن پر اس بنیاد پر انھیں اعتماد تھا انھوں نے کہا کہ آپ کو صاف صاف اپنے ارادوں کو بتا دینا چاہیئے۔ آپکا ارادہ بھی کیا وہی ہے جو آپ کی جماعت کے نوجوان کہتے ہیں۔ ان رہنماؤں کے دل کا حال تو خدا جانتا ہے لیکن جو جواب اُنھوں نے دئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے سرمایہ داروں، زمینداروں اور راجاؤں مہاراجوں کی اتنی تشفی ضرور ہو گئی ہے کہ وہ کانگریس کو پہلے کی طرح اب ہوّا نہیں سمجھتے بلکہ جو ان میں ہمت والے ہیں وہ شاید مبر کانگریس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس موافق صورت حال کے پیدا ہونے میں غالباً اُس ملامت کو بھی بڑا دخل ہے جو کانگریس کے پرانے رہنما اپنے نوجوان ساتھیوں کو وقتاً فوقتاً معلوم نہیں سرمایہ داروں کو دکھلانے کے لئے یا واقعی کرتے رہتے ہیں۔ رہے کانگریس سوشلسٹ سو اُن کی عمارت بغیر بنیاد کے کھڑی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر کانگریس سے علیحدہ ہوئے تو جو تھوڑی لیڈرشپ ملی ہوئی ہے وہ بھی جاتی رہے گی اور ہمیں دبا کر بالکل فنا کر دیا جائے گا۔ یہ لوگ ظاہراً مہاتما جی اور اُن کے رفقار کی چاہیے

کتنی ہی برائی کریں لیکن جب اُن کی قوت ایثار کو دیکھتے ہیں تو دل میں ان کی غریب دوستی کے قائل ہو جاتے ہیں۔ کیا مہاتما جی غریبوں کی خاطر صرف ایک لنگوٹی باندھے نہیں پھرتے۔ کیا وہ کئی مرتبہ جیل نہیں جا چکے ہیں۔ کیا انھوں نے اچھوتوں کے لئے روزہ رکھ کر اپنی زندگی کو خطرہ میں نہیں ڈالا۔ سوشلسٹ جماعت میں باتیں کرنے والے بہت ہیں لیکن کام کرنے والے کم ہیں۔ سوشلسٹ انقلاب کے لئے جس جانبازی اور سرفروشی کی ضرورت ہے اس کی ہمت کتنے ایسے لوگوں میں ہے جو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے ہیں اور اس نسبت کے سہارے سے اعلیٰ تعلیمیافتہ سوسائٹی میں جس میں مردوں سے زیادہ عورتوں کی تعداد ہوتی ہے تعیش پسند وضع اور لباس پر قائم رہتے ہوئے غرور اور زعم باطل کے ساتھ مور کی طرح دُم پھیلائے اکڑتے پھرتے ہیں جب تک وہ انقلابی دیوانگی پیدا نہ ہو جو سوشلسٹ رہنماؤں کو ہر خطرہ کے برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے کانگریس سوشلسٹ جماعت کی تمام باتیں ہوائی قلعوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں ان کی علمی واقفیت، منطقی استدلال، نظری تکمیل اور انقلابی ادب کے گہرے مطالعہ سے انکار نہیں ممکن ہے ان چیزوں میں انھوں نے بڑی دستگاہ حاصل کی ہو لیکن عملی کامیابی کے لئے ضرورت دوسری خصوصیات کی ہے۔ زندگی منطق سے بالا چیز ہے۔ اپنی متضاد، مہمل، ناقابل فہم اور مضحکہ خیز اقوال و اعمال کے باوجود بلکہ غالباً انہی کی وجہ سے کانگریس کے پرانے رہنماؤں میں عمل کی قوت زیادہ ہے۔ اُنھیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہے اور وہ انھیں ایثار پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ کانگریس کے گذشتہ اجلاس میں وہ نہایت آسانی سے سوشلسٹ جماعت پر حاوی ہو گئے۔ ان کا اعتبار ملک میں بڑھ رہا ہے۔ کمیونل اوارڈ کے مسئلہ میں انھوں نے اگر مسلمانوں کو خوش نہیں کیا تو ناراض بھی نہیں کیا۔ پھر ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے بابو راجندر پرشاد نے مسٹر جناح سے گفتگو کی جو ہر چند کامیاب نہیں ہوئی لیکن اس سے کسی قسم کی بدمزگی یا غلط فہمی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ کاؤنسل میں اُن کا کام عام طور پر پسند کیا گیا۔ ان کی تعمیری کوششیں خصوصاً بہار کے زلزلہ کے سلسلہ میں نہایت قابل تعریف رہیں۔ سرمایہ داروں اور راجاؤں کے اندیشوں کو باطل اور بے بنیاد ثابت کرنے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ کانگریس نیشلسٹ اور کانگریس سوشلسٹ جماعتوں کے قیام سے اُن کی اقتدار پر کوئی خراب اثر نہیں پڑا۔ حال میں مسٹر کنہیالال منشی نے بمبئی میں اعتدال پسند جماعت کی طرف سے کانگریس

کے ساتھ اتحاد عمل کے لئے کنایہ اور اشارہ سے آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید کانگریس کی یہ آزمودہ کار جماعت آہستہ آہستہ متحدہ کوشش کے ساتھ کسی کام کو شروع کرنے کی دوبارہ تیاری کر رہی ہے۔ یہ کام غالباً نئے گورنمنٹ آف انڈیا بل سے متعلق ہوگا جس کے متعلق تفصیلی بحث اسی رسالہ کے ابتدائی مضمون میں کی جاچکی ہے۔

ہندوستانی مسلمان | دنیا اور ہندوستان کی رفتار ترقی دیکھنے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس دوران میں ہندوستانی مسلمان کیا کرتے رہے۔ ان میں ایک اُمید افزا بیداری کے آثار نظر آرہے ہیں آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ کو پہچان رہے ہیں۔ ان میں خودداری، عزت نفس، حمیت اور جسارت پیدا ہورہی ہے ہندوستان میں جوان کا صحیح مقصد زندگی ہے اس کا ایک دھندلا سا احساس اُن میں پایا جارہا ہے۔ دریوزہ گری اور اغیار پرستی کی جو قبیح عادتیں ان میں پیدا ہوگئی تھیں وہ فنا ہورہی ہیں۔ وہ اپنی زندگی آزادی سے بسر کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں کے مقاصد کے آلۂ کار بن کر زندہ رہنا نہیں چاہتے۔ اب تک کی بے راہ روی ان کے لئے بہت سبق آموز ثابت ہوئی ہے۔ انھوں نے مختلف راہبروں کے ساتھ تھوڑی دور چل کر عبرت حاصل کی ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اُن کے درد کا علاج وہ نہیں ہے جو دوسروں کا ہے۔ انھیں خود اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونا ہے عزت کی زندگی بسر کرنے کے لئے ذاتی سعی و عمل سے کام لینا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے دوسروں کا سہارا ڈھونڈنا بے کار ہے۔ بے کس اور عاجز بن کر کبھی سرکار اور کبھی ہندوؤں سے رحم و کرم کی التجا کرنا فضول ہے بلکہ اپنی تنظیم خود کرنا چاہئے۔ نئے حالات و واقعات کے مطابق اپنے خیالات و اعمال کو بدل لینا چاہئے۔ وہ ایک زبردست فلسفہ اور پیغام کے امین ہیں۔ انھیں اس امانت کو ہندوستان میں محفوظ رکھنا ہے۔ انھیں دشواریوں اور مشکلات کا سامنا کرنا ہے۔ سچا رفیق اور ہمدرد کوئی نہیں ہے۔ سب اپنا مطلب نکالنے کے لئے دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ اقتدار اور رہنمائی کی جگہوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے۔ خود غرض اغیار اپنا کام نکالنے کے لئے انھیں کبھی کبھی اونچی جگہوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے ہاتھ سے اس طرح گدی پر بٹھایا جانا مسلمان کی غیرت کے منافی ہے۔ عزت و مرتبہ کسی کے دینے سے نہیں ملتا۔ یہ اپنی کوشش سے حاصل کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اپنی زندگی کی اعلیٰ اخلاقی مثال،

احساس فرض، خدمت خلق، ہمدردی اور مروت سے اپنی قومی افضلیت اور برتری کا ثبوت فراہم کرنا ہے انھیں حق و انصاف کی حمایت میں اپنی مجاہدانہ سرفروشیوں سے اپنے مذہب کی تعلیم کا زندہ نمونہ پیش کرنا ہے۔ انھیں اپنا مقررہ فریضۂ خدمت ایمانداری سے ادا کرنا ہے۔ جہاں کہیں بھی ہیں جماعت کے جس طبقے سے بھی ان کا تعلق ہے۔ مزدور ہیں یا کسان و کاریگر۔ تاجر ہیں یا محرر، ادیب ہیں یا مقرر، ڈاکٹر ہیں یا انجنیر انھیں ہر جگہ اپنی اعلیٰ اہلیت کو نمایاں کرنا ہے اور اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ ایمانداری، انصاف، ہمدردی، مروت اور انسانیت کا برتاؤ کر کے ان کی محبت و عزت حاصل کرنا ہے۔ اُن کا کام دوسروں کی عطا کی ہوئی دستوری مراعات اور حقوق سے نہیں چلتا اور ان کی توقیر و عزت اس بات سے نہیں ہوتی۔ وہ یہ چیز اپنی ذاتی کوشش سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی فتح اور اُس قوم و مذہب کی فتح جس کے وہ نام لیوا ہیں اُس وقت ہے جب ان علاقوں سے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں اپنی ہر دلعزیزی اور اعتماد کی بنا پر کثیر اکثریت کے ساتھ میونسپلٹیوں اور مجالس قانون ساز میں منتخب ہو سکیں۔ لوگوں کو اُن کی زبان اور ان کے ادب کے مطالعہ کا شوق ہو اُن کے مذہب کا احترام اُن کے دل میں پیدا ہو۔ ان کا سب سے بڑا تحفظ خود ان کے نیک اعمال ہیں ورنہ رکیک حرکتوں، کمینے جوڑ توڑ اور ایمان و قوم فروشی سے اگر کوئی رعایت یا حق تسلیم کرا یا تو اس سے ممکن ہے ذاتی عروج اور اقتدار کچھ عرصہ کے لئے حاصل ہو جائے لیکن اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔

جن لوگوں میں ترقی کی یہ صحیح سوجھ پیدا ہو رہی ہے وہ ابھی تک عموماً منتشر ہیں اور صرف انفرادی طور پر اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر رہے ہیں۔ مطبع اور منبر پر جن لوگوں کا قبضہ ہے انھیں مسلمانوں کی ترقی کی اس رفتار کا علم نہیں ہے۔ نمائش و اشتہار سے بے نیاز، جفاکش اور ایماندار مسلمانوں کا یہ باعزم اور خاکسار گروہ خاموشی سے اپنا کام کر رہا ہے۔ مستقبل دراصل اس کے ہاتھ میں ہے اور جن کی بلند بانگ آوازوں سے اس وقت فضا گونج رہی ہے وہ اندر سے خالی ہیں۔ ۔ ۔



تنقید و تبصرہ

کتب:-

فردوس الحکمۃ | مصنفہ ابو الحسن علی بن سہل ابن طبری ۔۔ تصحیح ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مدیر شعبہ عربیہ لکھنؤ یونیورسٹی

حجم تقریباً ۶۰۵ صفحے ۔ قیمت ۵ روپے ۔ ملنے کا پتہ ؛ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ؛ دہلی

یہ کتاب عربی میں فن طب کی ان امہات کتب میں سے ہے جو عباسی عہد میں لکھی گئیں ۔ اس کے مصنف نے جو ایک ممتاز اہل علم اور نامور علمی خاندان سے تھا امیر المومنین متوکل علی اللہ کے عہد میں طب کی یہ جامع کتاب مرتب کی ۔ اس میں اس وقت تک کے جملہ طبی مہمات اور مسائل بیان کئے گئے ہیں اور نہایت خوبی اور سلاست کے ساتھ ۔ عبارت صاف اور ادیبانہ ہے ۔ اور مسائل محققانہ ۔ اس کا مصنف ابو الحسن علی بن سہل اس عہد کا مشہور ماہر طب تھا جس کا شاگرد ابو بکر محمد بن زکریا رازی جیسا امام ہے ۔ یہ کتاب اگرچہ اس عہد کی مشہور کتب میں سے ہے جس کا ذکر جا بجا متاخرین ائمہ طب کی کتابوں میں آتا ہے لیکن اب تک یہ طبع نہیں ہوئی تھی ۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی تصحیح سے گیب میموریل کی طرف سے برلن میں چھاپی گئی ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس کی تصحیح میں بہت محنت سے کام لیا ہے اور یورپ اور ہندوستان میں اس کے متعدد نسخوں سے مقابلہ کرکے تصحیح کی ہے ۔ اہل طب کے واسطے یہ کتاب ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے ۔ (ا ۔ ج)

مکتوبات نیاز | مصنفہ جناب نیاز فتحپوری صاحب ۔ تقطیع چھوٹی ۔ ضخامت ۲۸۷ صفحات ۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب ۔ جلد سادہ اور خوشنما ۔ قیمت ۲ روپے ملنے کا پتہ نگار بک ایجنسی ۔ لکھنؤ ۔

یہ جناب نیاز فتحپوری کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے احباب کو لکھے ہیں صحافت اردو میں ادیب و نقاد کی حیثیت سے نیاز صاحب کا مرتبہ بلند و ممتاز ہے ۔ ان کا ایک خاص رنگ ہے

جس نے نئی نسل کی تحریروں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ ان کی ادبی زندگی کا عطر سمجھنا چاہئے۔ ہر خط ایک شعر ہے اور ایک خاص کیفیت کا حامل۔ خطوط مختلف موضوع پر لکھے گئے ہیں لیکن کوئی خط ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر پاکیزگی ذوق، لطافت بیان اور ندرت ادا کی بہترین مثال نظر نہ آتا ہو۔ نیاز صاحب نے غالب کی روایات کو نہایت کامیابی کے ساتھ نہ صرف جاری رکھا ہے بلکہ تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ خطوط شگفتگی اور رنگینی کا ایک خزانہ ہیں۔ ان کی مسرت اور سرخوشی متعدی ہے۔ آپ کتنے ہی حزیں و ملول و افسردہ کیوں نہ ہوں ان خطوں کے پڑھنے کے بعد تازگی اور نشاط پیدا ہونا بالکل یقینی ہے۔ خستہ و مضمحل دل و دماغ کو ان سے وہی کیف و زندگی حاصل ہوتی ہے جو مرجھائے اور سوکھے ہوئے درختوں کو بارش سے میسر آتی ہے۔ نیاز صاحب کا یہ کارنامہ بھی ہماری رائے میں ان کی دوسری ادبی کوششوں کے ہم پلہ ہے۔

خطوط میں مصنف کو اپنے قدرتی اور صحیح جذبات و خیالات کے اظہار کا جیسا موقع ملتا ہے، ایسا کہیں نہیں ملتا۔ کیونکہ اُسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اُس کا مخاطب کوئی اجنبی شخص نہیں ہے بلکہ ایک ہمدرد دوست ہے جس کے سامنے آزادی، بے تکلفی اور بے باکی سے ہر قسم کی بات کہی جا سکتی ہے۔ مصنف کی انتہائی پُرخلوص اور مکمل غیر مصنوعی تحریروں کے نمونے اگر کہیں دستیاب ہو سکتے ہیں تو اُس کے اُن خطوط میں جو وہ اپنے عزیز دوستوں کو لکھتا ہے۔ پھر اُس کی ذاتی زندگی کے مطالعہ کے لئے بھی یہ بہترین ماخذ ہیں۔ ان خطوں سے نیاز صاحب کی ذاتی زندگی کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کرنا پڑتی ہے۔ نیاز صاحب ایک فیاض، مخلص، عالی حوصلہ، دوست پرست اور آزاد مشرب شخص نظر آتے ہیں۔ ان کی سیر چشمی اور فراخدلی توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے۔

مصنف کے خطوط عموماً اس کی زندگی میں شائع نہیں ہوتے۔ لیکن نیاز صاحب اپنے لئے بجائے خود ایک قانون و مثال ہیں۔ ان کی آزاد فطرت دوسروں کی تقلید گوارا نہیں کرتی۔ اس لئے یہاں بھی انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے۔

خطوط جن لوگوں کو لکھے گئے ہیں ان کا صحیح نام و پتہ نہیں دیا گیا اس سے مشکوک طبیعتیں شبہ کر سکتی ہیں

کہ یہ سب ادیب کے تخیل کی کارفرمائی ہے ورنہ درحقیقت خطوط لکھے کسی کو نہیں گئے ۔ لیکن ایک ادیب کو اُس کی تحریروں کے سوا کسی اور جگہ دیکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ یہی اس کی اصل زندگی ہے اسی سے اس کی اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرنا چاہیئے ۔ باقی جو کچھ ہے وہ دھوکا اور فریب ہے ۔ پھر اس قسم کا شبہہ محض وقتی طور پر پیدا ہوسکتا ہے قائم نہیں رہ سکتا ۔ کیونکہ خطوط کی صداقت اور زندگی فوراً تمام شکوک کا ازالہ کردیتی ہے ۔

مکتوبات مطالعہ کے لایق ہیں ۔ شروع میں جناب نیاز اور ان کے ایک مکتوب کی عکسی تصاویر بھی ہیں ۔ (م ۔ ع)

رسائل :-

ساقی افسانہ نمبر ۔ مرتب جناب شاہد احمد صاحب بی اے آنرز ۔ ضخامت ۰۰۰ اصفحات تقطیع بڑی ۔ کتابت و طباعت بہتر کاغذ متوسط قیمت خاص نمبر ۱ر قیمت سالانہ للعہ ۔ مقام اشاعت دہلی ۔

اس سے پہلے متعدد بار رسالہ ساقی اور اس کے خاص نمبروں کا ذکر ان صفحات میں آچکا ہے ۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تقریباً چھ سال سے کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس نے اپنے معیار کو بڑی خوش اسلوبی سے قائم رکھا ہے ۔

اس رسالے کے ہر سال چار خاص نمبر شائع ہوتے ہیں زیر نظر نمبر اس کا افسانہ نمبر ہے ۔ اس میں کل ۴۲ مضامین نظم و نثر ہیں ۔ بیس افسانے ہیں ۔ دس طبعزاد ہیں اور دس دوسری زبانوں کے بہترین افسانوں کے ترجمے ۔ ان تمام افسانوں پر علیحدہ علیحدہ تفصیلی رائے کا اظہار طوالت کا موجب ہوگا جس کی اس موقع پر گنجائش نہیں ۔ مختصر یہ ہے کہ ہر افسانہ ترجمہ یا طبعزاد کسی نہ کسی خصوصیت کا حامل ہے ۔ مضمون نگاروں میں جناب مولانا عنایت اللہ صاحب بی اے علیگ سابق ناظم دارالترجمہ ۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی جناب خواجہ غلام السیدین پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڈھ ۔ جناب ڈاکٹر اعظم کریوی جناب ام اسلم ۔ جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی ۔ جناب اختر حسین رائے پوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ خود مرتب صاحب

نے شکست، سکوت کے عنوان سے بہت اچھا فسانہ لکھا ہے۔ سید وقار عظیم صاحب کا مضمون فسانے کی تنقید بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ نظموں کا معیار بھی خاصا بلند ہے۔ رسالے میں تین بلاک کی تصویریں بھی ہیں ایک ساقی کے خاص مضمون نگاروں کا گروپ فوٹو ہے۔ دوسری سالوی کی اور تیسری لولہ سوسینر کی تصویر کہ رسالے کا ٹائیٹل بھی رنگین ہے اور نہایت خوشنما۔ غرض بحیثیت مجموعی یہ خاص نمبر کامیاب ہے اور نہایت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ (ح۔ح)

الاطفال | یعنی ہمدرد صحت دہلی کی اشاعت خاص۔ مرتبہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب دہلوی۔ تقطیع بڑی حجم ۲۰۸ صفحات، کاغذ معمولی کتابت و طباعت متوسط۔ قیمت خاص نمبر قسم اول ۱۲ قسم دوم ۸ قیمت سالانہ عہ مقام اشاعت ہمدرد منزل لال کنواں دہلی۔

یہ رسالہ حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کی نگرانی و ادارت میں کئی سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے اپنے مضامین و ترتیب کے اعتبار سے اسے اردو کے دوسرے طبی رسالوں کے مقابلے میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ ہر سال اپنا ایک خاص نمبر بھی نکالتا ہے جس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کسی خاص موضوع پر ماہرین فن سے مضمون لکھوائے جاتے ہیں زیر نظر نمبر بچوں سے متعلق ہے۔ اور فاضل مرتب نے بڑی محنت و کوشش سے بچوں کے مختلف امراض ان کی غور و پرداخت ان کی تربیت سے متعلق ہندوستان اور مغربی ممالک کے ماہرین فن کے مضامین فراہم کئے ہیں دلچسپ دستی تصاویر، مرقعوں اور کارٹونوں کے علاوہ تقریباً ۲۴ بلاک کی تصویریں ہیں آخر میں نقل کے عنوان سے علامہ سر اقبال کی بچے پر ایک نظم اور متعدد دلچسپ افسانے ہیں یہ بھی بچے کے ہی متعلق ہیں۔ باہر کے مضمون نگاروں میں محترمہ خالدہ خانم کا مضمون خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس وقت بچہ کے متعلق اردو زبان میں بہت کم لٹریچر موجود ہے اس خاص نمبر کی اشاعت نے اس کی کو بڑی حد تک پورا کر دیا ہے اس لئے جناب مرتب اہل ملک کی طرف سے خاص طور سے شکریہ کے مستحق ہیں ہمیں امید ہے کہ ان کا رسالہ اور یہ خاص نمبر زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل کریں گے۔ (ح۔ح)

غزال یہ ادبی رسالہ حکیم محمد طالب صاحب اور عمر فاروق صاحب۔ ایم اے کی ادارت میں لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے مضامین بھی بلند معیار ہیں۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بھی نہایت نفیس قیمت سالانہ چھ روپئے رعایتی للعہ۔

عصمت سالگرہ نمبر مرتبہ جناب رازق الخیری۔ حجم ۲۲۵ صفحات تقطیع بڑی۔ قیمت قسم اول عہ قسم دوم عہ قیمت سالانہ تین روپئے (سے)

یہ رسالہ ۲۸ سال سے طبقہ نسواں کی مفید و گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے پہلے علامہ راشد الخیری اس کے ایڈیٹر تھے اب اس کی زمام ادارت ان کے ہونہار صاحبزادے جناب رازق الخیری صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولانا پرچے کے نگراں ہیں۔

زیر نظر نمبر اٹھائیسویں سال کا خاص نمبر ہے اس میں خانہ داری حفظان صحت، تربیت اولاد، صنعت و حرفت، مذہب، اخلاق۔ معاشرت، تمدن۔ تاریخ و سیر، سیر و سیاحت، پر بہت اچھے مضمون ہیں دلچسپ افسانے اور ڈرامے بھی ہیں۔ اچھی اور پاکیزہ نظمیں اور غزلیں بھی ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اکثر مضامین اور نظمیں خود عورتوں کی ہیں مردوں میں علامہ راشد الخیری۔ منشی پریم چند۔ حضرت عزیز لکھنوی، جناب تلوک چند محروم کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رسالے کا ٹائیٹل خوشنما رنگین ہے اس کے علاوہ بلاک کی ۵ رنگین اور ۶ ۵ ایک رنگ کی تصاویر ہیں۔ غرض ہر اعتبار سے یہ نمبر مرتب کی محنت جانفشانی اور سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہے۔

اس رسالے نے مضمون نگار خواتین کا ایک خاص حلقہ قائم کر لیا ہے جو اپنے سنجیدہ اصلاحی مضامین کے ذریعے ملک و قوم کی بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس عرصے میں عورتوں کے طبقے میں جو عام بیداری پیدا ہوئی اس میں عصمت اور اُس کے محترم بانی کی سنجیدہ کوششوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ (ح - ح)

اخبار:-

صدق | (دس روزہ) ایڈیٹر جناب مولنا عبدالماجد دریا بادی۔ حجم ۱۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اوسط۔
قیمت سالانہ للعہ/ فی پرچہ ۱/ مقام اشاعت دفتر حق ہیوٹ روڈ لکھنؤ۔

ناظرین مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی کے مشہور اخبار سچ کو بھولے نہ ہوں گے یہ مفید اخبار مولانا نے بعض اہم مصروفیتوں کی وجہ سے بند کر دیا تھا بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب یہ دوبارہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا گر صرف نام اور اہتمام میں تبدیلی ہوئی ہے ورنہ تمام خصوصیات بعینہٖ سچ کی ہیں وہی سچی باتیں وہی محققانہ علمی و مذہبی مضامین اور وہی مولانا کا قلم !

شروع میں یہ پندرہ روزہ نکلتا تھا مگر تیسرے نمبر سے دس روزہ کر دیا گیا ہے ضخامت بھی اتنی ہوتی ہے کہ ایک ہفتہ وار پرچے کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جناب منیجر صاحب اسے بہت جلد ہفتہ وار کر دیں گے۔

مطبوعات موصولہ:-

ترجمۃ القرآن | جناب پادری احمد شاہ صاحب نے ہندی میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے۔ ہم ہندی کے واقف نہیں اس لئے اس کے حسن و قبح کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتے۔ قیمت ۱/ پتہ پادری احمد شاہ صاحب نور منزل ڈاک خانہ راج پور دہرہ دون۔

توجیہ محاورات وکنایات زبان اردو | از جناب ابو عامر محمد باقر حسن صاحب القاری قادری قیمت ۲/ ملنے کا پتہ ابو عامر اینڈ سنز محلہ شاہ ولایت سہارنپور۔

نسوانی دنیا | مدیر مسئول عنایت اللہ خاں صاحب۔ چندہ سالانہ ۳/ مقام اشاعت لاہور۔ یہ رسالہ عورتوں کیلئے لاہور سے جاری ہوا ہے مضامین، افسانے، اور نظمیں سب کا معیار اچھا خاصا بلند ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اور ترقی کریگا۔

مراسلہ

اے خوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا شاندار
کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل

کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا شمار بھی کسی ایسی ہی خوش نصیب قوم میں کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان کی گذشتہ نصف صدی کی تاریخ میں ایک مسلسل ترقی و عروج اور فتح و کامرانی کی داستان ہے؟ کیا ان کا قدم بھی برابر آگے کی طرف اٹھ رہا ہے؟ کیا ان کی تعداد میں اضافہ، ان کی تندرستی و اہلیت میں بیشی، ان کی تجارت و صنعت و زراعت میں مرفہ الحالی، ان کے مکانات میں شوکت و دبدبہ، ان کے طریقہ رہائش میں آرام و آسایش، ان کے تہواروں اور تقریبوں میں بشاشت و شادمانی، ان کی زندگی میں اطمینان و یقین، ان کی عبادت میں فراغت و دلجمعی اور ان کے ادب میں شگفتگی اور تندرستی پائی جاتی ہے؟ کیا ان کی طبیعت بھی نچلا بیٹھنا پسند نہیں کرتی؟ نئے نئے خواب دیکھتی اور ان کی تعبیریں تمام دنیا میں تلاش کرتی پھرتی ہے؟ کوئلہ سے ہیرا، راکھ سے سونا، اور قطرہ سے گوہر بناتی ہے۔ بنجر زمین سے غذا اور مٹی سے فولاد نکالتی ہے۔ ویرانوں کو شہر اور جنگلوں کو گلزار بناتی ہے۔ بیماریوں کے علاج اور نقصانوں کی تلافی کرتی ہے۔ اپنے راستہ میں جس چیز کو حائل دیکھتی ہے اس کی تسخیر پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر سرنگیں، دریاؤں پر پل، سمندروں کے لئے جہاز، ہوا کے لئے طیارے بناتی ہے۔ مقام اور زمانہ کے فاصلوں کو اس طرح مٹا رہی ہے گویا ان کا کبھی وجود ہی نہ تھا۔ اس کی آزادی میں کوئی چیز مخل نہیں ہوتی، کوئی پابندی اس کے لئے پابندی نہیں رہتی۔ ہر دشواری اس کی ایجاد و اختراع کے لئے ایک مہمیز کا کام کرتی ہے ——— ہاں، کیا ہندوستان کی مسلمان آبادی زمین کی خلافت اور اقوام کی امامت کے فرائض انجام دے رہی ہے؟

سوال سخت ہے اور دل دکھانے والا۔ میں آپ کے ان اداروں کے نام سننا نہیں چاہتا جن کو آپ نے گذشتہ پچاس سال میں قائم کیا ہے، میں نتائج دیکھنا چاہتا ہوں۔ میری نظر ذرائع پر نہیں مقاصد پر ہے۔

میں "آج" کو بھی دیکھنا نہیں چاہتا ۔ "آج" سے جو "کل" پیدا ہوگا میری نظر اُس پر ہے ۔ آیئے، میرے ساتھ دیکھئے اور مجھے بتلایئے کہ کل آپ کی کیا حیثیت ہوگی ؟ کن جگہوں پر آپ کا قبضہ ہوگا ؟ کس طریقہ پر آپ زندگی گذار رہے ہوں گے اور آپ کی ہندوستان اور دنیا میں کیا اہمیت اور وقعت ہوگی ؟

بُری بات مُنہ سے نکالتے ہوئے ڈرتا ہوں ۔ بیمار کی حالت کتنی ہی مایوس کن کیوں نہ ہو لیکن جب تک سانس چلتی ہے زندگی کی آس رہتی ہے ۔ علاج و دوا ترک نہیں کی جا سکتی ۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتے ۔

عزیزو، اب بھی آنکھ کھول سکتے ہو ۔ زندگی کے لئے ایک آخری کوشش کر سکتے ہو ۔ حشر کے برپا ہونے میں کیا کسر رہی ہے ۔ کراچی کے شہیدوں کے خون کی بے مائیگی، کوئٹہ کا زلزلہ، پشاور اور ایبٹ آباد کی آتشزدگی، لاہور میں گردوارہ شہید گنج کے معاملہ میں ذلت و رسوائی اگر تمھیں جگانے اور ہشیار کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں تو پھر اور کیا چاہتے ہو ؟

اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھو ۔ خود اعتمادی، جرأت و جسارت ـــــ اسی سے افراد اور قومیں بنتی ہیں اپنے اوپر اعتماد کرو، ہمت بلند رکھو اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالو ۔ کوئی انعام بلند ہمتی اور سرفروشی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ۔ اپنی ذاتی زندگی بناؤ اور اپنی ان بنی ہوئی زندگیوں کو ملا کر قومی زندگی تعمیر کرو ۔



انقلاب فرانس

مصنفہ

مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے (جامعہ)

مکتبہ جامعہ دنیا کے مختلف ممالک کے انقلابات پر مختصر کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اٹلی، روس، امریکہ، آئرلینڈ وغیرہ کے انقلابات کے حالات زیر ترتیب ہیں۔ ناظرین کیلئے یہ بہت ہی دلچسپ اور پُر از معلومات سلسلہ ہے خصوصاً یہ پہلی کتاب اردو زبان میں اس موضوع پر ایک خاص حیثیت کی حامل ہے۔ فوراً طلب فرمائیے۔ قیمت صرف ۱۲ر

انجام (ڈراما)

مصنفہ

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن)

یہ ڈراما رسالہ جامعہ میں شائع ہو کر بحد پسند کیا جا چکا ہے اور جامعہ کے طلبا نے اسٹیج بھی کیا تھا۔ اس میں انسان کی خود فریبی کا ایک نمونہ اور جھوٹی مذہبیت کی پردہ دری اس انداز میں کی گئی ہے کہ پڑھنے والے حیرت سے دنگ رہ جاتے ہیں اور وہ اثر لیکر اٹھتے ہیں کہ انکی روح ایک عرصہ تک بےچین رہتی ہے۔

مزاحیہ پارٹ بھی بڑا خوشگوار ہے۔ کتاب الہ آباد کے خوشنما ٹائپ میں نہایت اچھی چھپی ہے۔ قیمت صرف ۱۲ر

کسان

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

اس کتاب میں کسان کے افلاس کے اسباب اور ان کے علاج پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ اور بتایا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسان کا کیا درجہ تھا اور دیہی نظام کی کیا صورت تھی؟ پھر کسطرح رفتہ رفتہ اسکو خوشحال سے محتاج بنایا گیا؟ اور اب کیا صورتیں اختیار کی جائیں کہ دوبارہ اس کے دن پھر جائیں۔

کسانوں کے غریب طبقہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ضرور پڑھیں۔ قیمت ۸ر

دو خدائی خدمتگار

مترجمہ

جناب محمود علی خانصاحب جامعی

ڈاکٹر خانصاحب اور خان عبدالغفار خاں کے حالات زندگی انگریزی زبان میں مہاتما گاندھی کے ارشاد پر مہادیو ڈیسائی نے لکھے تھے۔ یہ کتاب ان ہی حالات کا نہایت سلیس اور نفیس اردو ترجمہ ہے۔ اسے پڑھکر آپ صوبہ سرحد کی سیاسی تحریک سے ابتدائی واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔

کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے اور آٹھ تصویریں بھی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

رجسٹرڈ نمبر

ال - ۱۸۹۲



جامعہ

اُردُو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیرِ ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صہ

مطبع جامعہ دہلی

فی پرچہ ۸؍

بسم اللہ

جامعہ

نمبر ۹	ستمبر ۱۹۳۵ء	جلد ۲۴

فہرست مضامین

(محمد مجیب صاحب بی۔اے (آکسن) پروفیسر جامعہ)

قومی تعلیم کا نصب العین

(ذیل میں ہم ناظرین جامعہ کے مطالعے کے لئے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے کاشی ودیا پیٹھ (بنارس کی قومی جامعہ) کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں سنایا تھا۔ مدیر)۔

میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے اس جلسہ میں بلا کر اور تقریر کرنے کی اجازت دے کر میری بڑی ہی عزت افزائی فرمائی۔ میرا کام چونکہ مجھے برابر طالب علموں کے ساتھ رکھتا ہے اس لئے اپنی طالب علمی کے اور آجکل کے زمانہ میں مجھے کبھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ میں اپنے کو آج بھی اسی طرح طالب علم سمجھتا ہوں جیسا کہ آج سے ۱۵۔۲۰ سال پہلے سمجھتا تھا۔ اس لئے جب مجھے آپ کے کل پتی جی، ہم سب کے بزرگ اور مخدوم، ڈاکٹر بھگوان داس صاحب کا تار ملا کہ تم کاشی ودیا پیٹھ کے کنووکشن کے جلسہ میں آکر کچھ کہو تو مجھے بہت ہی اچنبھا ہوا۔ ایسا ہی اچنبھا جیسا کہ آپ کے کسی کم عمر طالب علم کو یہ تار پاکر ہو کہ تم آکر جامعہ ملیہ کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں خاص تقریر کرو۔ اسی وجہ سے میں نے جواب میں بھی ذرا دیر کی، اور میرا پہلا خیال یہی تھا کہ میں ڈاکٹر صاحب سے معافی چاہوں اور یہ لکھوں کہ شاید آپ نے تار میں غلط آدمی کا پتہ لکھ دیا ہے۔ لیکن مجھے خیال آیا کہ شاید اس بلاوے میں ایک اور بات چھپی ہے یعنی یہ کہ جامعہ ملیہ میں میرے ساتھی قومی تعلیم کا جو کام بڑے کٹھن حالات میں کر رہے ہیں اس میں کاشی ودیا پیٹھ کو بھائی اور ساتھی جو خود اسی قسم کے کام میں لگے ہوئے ہیں ہماری ہمت بڑھانا اور اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنی ذات کی طرف سے تو معافی مانگ لیتا مگر میرے دل میں آپ کے کام اور آپ کے کام کرنے والوں کی جو عزت ہے اس نے اجازت نہ دی کہ ان کی اس ہمت افزا دعوت کو رد کروں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت آپ کے سامنے حاضر ہوں۔

آج سے کوئی ۱۵ سال پہلے جب اس ودیا پیٹھ کی بنیاد رکھی گئی تھی تو وہ زمانہ ہماری قوم کے لئے

بڑی بے چینی کا زمانہ تھا۔ اس بے چینی کا سلسلہ اب تک کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ کبھی ابھر آتی ہے، کبھی دب جاتی ہے۔ اس بے چینی نے ہماری قوم میں بڑی بیداری پیدا کی ہے اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں نے اس سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ جب اس بیداری کی تاریخ لکھی جائیگی تو اس زمانہ میں قومی تعلیمگاہوں کا قیام ہماری قومی زندگی کے لئے شاید سب سے زیادہ اہم واقعہ تسلیم کیا جائے گا۔ جس طرح سخت بیماری کی حالت میں جسم اپنے روگ کو دور کرنے کے لئے قدرتی طور پر کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ اور اس میں سوچ وچار کو زیادہ دخل نہیں ہوتا اسی طرح ہماری قوم نے بھی قومی تعلیم کے معاملہ کو کچھ بہت زیادہ سوچا تو نہ تھا، لیکن جب دکھ بڑھا تو اس نے اسے رفع کرنے کے لئے اور تدبیروں کے ساتھ آپ ہی آپ یہ تدبیر بھی کی کہ قومی تعلیم کا کچھ انتظام کرے۔ جب بیمار بہت کمزور ہو جاتا ہے تو مرض کو دفع کرنے کی کوششیں بھی کمزور ہی ہوتی ہیں۔ ہماری دوسری کوششوں کی طرح یہ قومی تعلیم کی کوشش بھی بہت کمزور کوشش ہے۔ بلکہ خود ہماری قوم میں اچھے سمجھدار آدمیوں کا خاصا بڑا گروہ ہے جو اس کوشش کی ضرورت ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور اس کے فائدوں سے بالکل بے خبر ہے۔

یہ لوگ اکثر وہ ہیں جو انگریزی پڑھ لکھ لینے، یا کوئی ہنر سیکھ لینے کا نام تعلیم جانتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اپنی ضرورت اور حیثیت کے مطابق جو اور جتنا لکھنا پڑھنا چاہتا ہے اور جو اور جتنا سیکھنا چاہتا ہے لکھ پڑھ لیتا اور سیکھ لیتا ہے۔ اگر ان لوگوں کے خیال کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کیجیئے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک گروہ، یا جماعت، یا سماج اپنی جگہ پر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ الگ الگ آدمیوں کے ملنے سے بن جاتی ہے۔ جیسے پتھروں کا کوئی ڈھیر کہ اس میں اصلی چیز تو الگ الگ پتھر ہیں، یکجا ہونے سے ڈھیر بن گیا ہے۔ سماج میں بھی ان کے خیال میں فرد، اکیلا آدمی، ہی اصلی اور پہلی چیز ہے، سماج بس اکیلوں کے مل جانے کا نام ہے۔ ذہنی زندگی کا سرچشمہ فرد یا اکیلا آدمی ہی ہے۔ وہی سوچتا ہے، وہی سمجھتا ہے، وہی سب ذہنی چیزیں پیدا کرتا ہے اور سوائے اس کے کہ زندگی کو سہل بنانے کے لئے دوسروں سے مدد لے یا ان کی کچھ مدد کر دے، خیالات اور ذہن کے لحاظ سے وہ اپنی دنیا آپ ہے۔ ہمارے تعلیمیافتہ لوگ جمہوریت کے لبرل فلسفہ کو پڑھ پڑھ کر اور ہرکلیس، پراٹیگیس اور رابنسن کے ناموں اور کاموں اور

افسانوں سے متاثر ہو ہو کر اکیلے آدمی کو سماجی زندگی کی اصلی حقیقت اور سماج کو ان اکیلوں کا بس ایک ڈھیر یا انبوہ ماننے لگے ہیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا خیال بھی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ یعنی یہ کہ اصلی چیز اور ابتدائی چیز سماج ہے اور اکیلا آدمی، فرد اسی کے سہارے اور اسی کے لئے ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ سماج کی حیثیت جسم کی ہے اور اکیلا آدمی یا چھوٹے چھوٹے سماجی گروہ اس جسم کے حصے ہوتے ہیں۔ جسم کے حصوں کو جسم سے اور پتھروں کے ڈھیر کو پتھروں سے جو تعلق ہے اس کا فرق ظاہر ہے۔ اس خیال کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ ذہنی زندگی تو بغیر سماج کے ممکن ہی نہیں۔ اکیلا آدمی بطور جانور کے سمجھ میں آ سکتا ہے مگر پورے انسان کی حیثیت سے جس کی امتیازی خصوصیت ذہن ہے اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ذہنی زندگی تو کسی ذہنی زندگی ہی سے پیدا ہوتی ہے، یہ چراغ ہمیشہ کسی دوسرے چراغ ہی سے جلایا جا سکتا ہے، ذہنی زندگی میں "تو" نہ ہو تو "میں" کا وجود بھی نہ ہو۔ اس لئے ذہنی زندگی کے لئے جو اصلی معنوں میں انسانی زندگی ہے، سماج کا وجود لازمی ہے۔ بدن میں ہر حصہ کی کچھ الگ الگ حیثیت بھی ضرور ہوتی ہے مگر اس حد تک کہ وہ کل جسم سے وابستہ ہے اور اس کے اندر اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ایک حصہ کے کٹ جانے سے جسم میں کمی آجاتی ہے مگر وہ باقی رہ سکتا ہے، مگر حصہ جسم سے الگ ہو کر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔ درخت میں ہر ڈالی اور پتی بھی اپنا الگ وجود رکھتی ہے لیکن ڈال یا پتی کے ٹوٹ جانے سے درخت ختم نہیں ہوتا درخت سے الگ ہو کر البتہ ڈال اور پتی کے لئے سوائے فنا کے اور کچھ نہیں۔

جس طرح کچھ عرصہ میں جسم کا ایک ایک ذرہ بدل جاتا ہے مگر جسم کی زندگی برابر جاری رہتی ہے، جس طرح درختوں کی پتیاں بدل جاتی ہیں مگر درخت وہی رہتا ہے، اسی طرح سماج کے افراد بھی برابر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ مگر سماجی زندگی باقی رہتی ہے۔ ہر زندہ چیز کی طرح سماج میں بھی دو کام برابر ہوتے رہتے ہیں، ایک تو بدلتے رہنے کا اور ایک اپنے حال پر قایم رہنے کا۔ ان میں سے کوئی ایک کام بھی رک جائے تو موت کا سامنا ہوتا ہے جو جسم اپنے کو قایم نہیں رکھ سکتا وہ تو فنا ہوتا ہی ہے، پر جس میں اپنے کو بدلتے رہنے کی طاقت نہ رہے وہ بھی موت ہی کے گھاٹ اترتا ہے۔ سماج میں افراد کے وجود کی غرض بس یہ ہے

کہ وہ اس بقا اور فنا، تحفظ اور تغیر، استقی اور ہرمان کا ذریعہ بنیں۔ اور انھیں اس قابل بنانے کے لئے سماج کی تدبیر اور اس کا فرض نئی نسلوں کی تعلیم ہے۔ تعلیم دراصل کسی سماج کی اس جانی بوجھی، سوچی سمجھی کوشش کا نام ہے جو وہ اس لئے کرتی ہے کہ اس کا وجود باقی رہ سکے اور اس کے افراد میں یہ قابلیت پیدا ہو کہ بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سماجی زندگی میں بھی مناسب اور ضروری تبدیلی کر سکیں۔ قومی زندگی میں تعلیم اس طرح گذرے ہوئے زمانہ سے موجودہ زمانہ کو ملاتی ہے جیسے اکیلے آدمی کی زندگی میں اس کا حافظہ۔ جو سماج اپنی تعلیم کا نظام درست نہیں رکھتی وہ اپنے وجود کو خطرہ میں ڈالتی ہے اور جس طرح حافظہ کے ختم ہو جانے سے اکیلی زندگی کا سلسلہ باقی نہیں رہتا اسی طرح قومی تعلیم نہ ہونے سے قومی زندگی کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کی سماجوں میں ہندوستانی سماج کو اپنی علیحدہ حیثیت قایم رکھنی ہے اور دوسری سماجوں کے مقابلہ میں اس کے پاس کچھ ہے جو اسے دوسروں سے الگ کرتا ہے اور وہ اس قابل ہے کہ باقی رہے اور دنیا کی زندگی اس سے مالامال ہو، تو ہماری سماج کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم میں ان خاص چیزوں کا خیال رکھے جنھیں وہ خاص اپنا سمجھتی ہے یا اپنے گذرے ہوئے زمانہ کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچانے کا انتظام کرے، اس لئے کہ صرف کتابوں میں لکھے رہنے سے ہماری تاریخ زندہ نہیں رہ سکتی، اس کی زندگی کی بس ایک صورت ہے کہ وہ سماج کے ہر فرد کے دل اور دماغ کے ریشہ ریشہ میں زندہ ہو۔

مگر بہت سے روشن خیال لوگ ایسے بھی ہیں جو کہیں گے کہ یہ سب قدامت پسندی کی دقیانوسی باتیں ہیں۔ قومی روایات تو اکثر قوم کی راہ میں رکاوٹ ہی ہوتی ہیں اور ماضی کا بوجھ گردن پر اٹھا کر قوم کے لئے آگے چلنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ ان خام خیالیوں سے آزاد ہونا چاہئے اور موجودہ ضرورتوں کا خیال کرکے اور آنے والی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر اپنی نئی نسلوں کو سکھانا پڑھانا چاہئے۔ بس یہی قومی تعلیم ہے اور باقی سب ڈھکوسلے ہیں۔ ایسی باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو دل سے قوم کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اور جن کے دل میں اس بات کی لگن ہے کہ ان کی قوم جلد سے جلد ترقی کرے اور جتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتی ہے بڑھے۔ یعنی خود قوم کی خاطر وہ قومی تعلیم کے اس خیال کو پسند نہیں کرتے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ میں ان لوگوں کی نیک نیتی پر ایک لمحہ کے لئے شبہ نہیں کرتا۔ مگر مجھے گمان ہوتا ہے کہ یہ تعلیم کی ماہیت سے واقف نہیں ہیں ورنہ شاید ایسی بات نہ کہتے۔

تعلیم بس کچھ بول رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام تو نہیں ہے۔ بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے۔ تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔ جس طرح انسان کا جسم ایک چھوٹے سے تخم سے شروع ہوتا ہے، پھر مناسب غذا پا کر حرکت اور کام اور سکون و آرام سے طبیعیات اور کیمیا کے قانونوں کے مطابق کمال کے درجہ کو پہنچتا ہے اسی طرح ذہن کا نشو و نما بھی ذہنی غذا پا کر ذہنی قانونوں کے مطابق ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ ذہن کو یہ غذا کن چیزوں سے پہنچ سکتی ہے اور اس کے اثر کے قانون کیا ہیں۔ تو گذارش ہے کہ ذہنی غذا ملتی ہے تمدن سے، تمدن کی مادی اور غیر مادی چیزوں سے، مثلاً سماج کے علمی نظام سے، سماج کے فنون سے، سماج کے مذہب سے، سماج کی صنعت سے، سماج کے اخلاق کے اصولوں سے، سماج کے قانون سے، سماج کے رسم و رواج سے، سماج کی بڑی بڑی شخصیتوں کی زندگی سے، سماج میں خاندانی زندگی کے نمونہ سے، سماج کے گاؤں، قصبوں اور شہروں کی زندگی سے، سماج کی حکومت سے، فوج سے، عدالتوں سے، سماج کے مدرسوں سے۔

اب یہ نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ سماج کی تمام مادی اور غیر مادی چیزیں سب ذہن انسانی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ انسان کا ذہن اپنے کو ان چیزوں میں ظاہر کرتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ذہن اپنے کو اپنے سے باہر یہ شکلیں دیتا ہے۔ ان چیزوں میں اس شخصیت کے ذہن کا اثر بھی ہوتا ہے جس نے انھیں بنایا، اس قوم یا نسل کا اثر بھی ہوتا ہے جس سے بنانے والا وابستہ تھا، اس وقت اور جگہ کے حالات کا اثر بھی ہوتا ہے جن میں اس نے یہ تمدنی چیز بنائی تھی ان سب کا اثر یوں کہیئے کہ اس چیز میں آکر چھپ رہتا ہے، سو جاتا ہے۔ کوئی نیا ذہن جب انھیں اپنے اندر قبول کرتا ہے تو یہ چھپی ہوئی قوتیں اُبھرتی ہیں، سوتی ہوئی قوتیں جاگتی ہیں۔ تمدنی چیزوں کی ان سوئی ہوئی قوتوں کو پھر سے کسی انسان کے ذہن میں جگانے سے اس ذہن کی تعلیم ہوتی ہے۔ اور کسی چیز سے ذہن کی تربیت اسی حد تک سمجھنی چاہیئے جس حد تک اس کی سوئی ہوئی قوتیں قبول کرنے والے کے ذہن میں جاگی ہیں۔ مثلاً اچھے سے اچھے شعر کو کوئی رٹے جائے ذہن کی کوئی تربیت نہ ہوگی اگر پڑھنے والے کے ذہن میں پوری طرح یا کچھ نہ کچھ وہ کیفیات پیدا نہ ہوں جو کہنے والے پر طاری تھیں اور جنھیں اس نے اپنے کلام میں گویا لا کر چھپایا تھا، سلایا تھا۔ کوئی شخص اگر دوسروں کی مذہبی زندگی کا حال عمر بھر پڑھتا

یا سنتا رہے لیکن اس کے ذہن میں اس ذکر سے مذہب کی سچی کیفیت بیدار نہ ہو تو عمر بھر کے تعلق کے باوجود اس کے ذہن کی اس مذہبی تذکرہ سے کوئی تربیت نہ ہوگی۔ اور یہی حال تمام دوسری تمدنی چیزوں کا ہے۔

تعلیم کے کام سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر ذہن کی تربیت تمدن کی ہر چیز سے نہیں ہوتی۔ جس طرح ہر جسم کو ایک غذا نہیں بھاتی، اس سے کہیں زیادہ ہر ذہن کو بھی ہر ذہنی غذا نہیں پچتی۔ بچہ جس سماج میں پیدا ہوتا ہے اس کے تمدن سے نسلی تعلق کی وجہ سے ہی اس کے ذہن میں کچھ مناسبتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اس لئے خود اپنی سماج کے تمدن کی چیزوں سے اس کے ذہن کی بہتر تربیت ہو سکتی ہے تربیت پا جانے، ترقی کرنے کے بعد ذہن دوسری سماجوں کی چیزوں کو بھی اپنا سکتا اور ان سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر شروع میں اپنی موروثی مناسبت کی وجہ سے ایک صورت میں بڑی آسانی اور دوسری میں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ہر وہ شخص جو تعلیم کے صحیح مقصد کو سمجھتا ہے اس بات پر مجبور ہے کہ بڑی حد تک ذہن کی تربیت کے لئے خود اس سماج کی تمدنی چیزوں سے کام لے جس سے طالب علم کا تعلق ہے ورنہ اس کی کوشش کے اکارت جانے کا ڈر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خود تعلیم کی ماہیت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قومی تعلیم کا نظام قایم کریں۔

اس لئے باوجودیکہ خود ہماری قوم کے بہت سے سمجھدار لوگ ابھی اس بات کو صحیح نہیں مانتے، ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ قومی تعلیم کے چند ادارے تو ملک میں قایم ہو چکے ہیں۔ ان اداروں کا، جن میں آپ کے دو یا پیٹھ کو بڑی اہم حیثیت ہے، فرض یہی نہیں کہ وہ ان طالب علموں کی تعلیم کا انتظام کر دیں جو ان کے یہاں آتے ہیں، یا کچھ عام معلومات کی اور کچھ خاص تحقیقات کی کتابیں شایع کر دیں۔ بلکہ باوجود وسائل کی کمی اور کام کی دشواریوں کے جن سے میں بخوبی واقف ہوں، ان اداروں کا بڑا ضروری فرض یہ بھی ہے کہ ان کے کام کرنے والے اور ان کے استاد اپنے دیس کی قومی تعلیم کا ایک پورا نظام بنائیں۔ میں جانتا ہوں یہ نظام ابھی بہت کچھ خیالی ہوگا اور اسے رائج کرنے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ مگر رائج کرنے کے موقعے کہہ کر نہیں آتے۔ پھر جب آتے ہیں تو ایسے حالات میں آتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا بہت موقع نہیں ہوتا اور وقت کے وقت جو بن پڑتا ہے کر لیا جاتا ہے اور اس میں اکثر بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں جن کا نقصان صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ اس فرض کو ابھی سے انجام

دینے کی ضرورت اس وجہ سے اور بھی ہے کہ ہمارے ملک میں سیاسی ہی نہیں، علمی اور تعلیمی جماعتوں نے بھی قومی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کم غور کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ کیا ہے تو بس یہی کہ موجودہ نظام بہت برا ہے اور اس میں جو ترمیمیں تجویز کی ہیں وہ اکثر بہت جزوی۔ اس لئے کہ ہمارے نظام تعلیم میں بس اتنی تبدیلی سے کام نہیں چلے گا کہ اس میں دیسی زبان کے لئے کوئی اچھی جگہ نکل آئے اور تاریخ کی کتابیں بدل دی جائیں! ہماری قومی تعلیم کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے۔ مثلاً ہمارے دیس میں طرح طرح کے لوگ بستے ہیں، جن کی بولیاں الگ الگ ہیں، رہنے سہنے کے طریقے مختلف ہیں، عادتیں اور رسمیں جدا جدا ہیں، مذہب علیحدہ علیحدہ ہیں قومی تعلیم کا نظام بنانے والوں کو سوچنا ہوگا کہ وہ نظام کی یکسانیت کی خاطر اور ایک متحدہ قوم پیدا کرنے کے ولولہ میں ان تفریقوں کو بالکل پس پشت نہ ڈالدیں گے یا ہر صوبہ اور ہر گروہ کو، جس کا تمدنی اساسہ اتنا ہے کہ اپنے افراد کی ذہنی تربیت کا ذریعہ بن سکے، اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنی تمدنی چیزوں سے تعلیم کا کام لے اور اپنی تعلیم سے اپنے تمدن کی ترقی کی راہیں نکالے۔ اگر آپ کے نزدیک تعلیم کا وہ نظریہ صحیح ہے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے تو غالباً اپنے شہریوں کے ان مختلف گروہوں کو اپنے اپنے تمدن سے تعلیمی کام لینے کا موقع دینا سیاسی دانشمندی کا تقاضا ہی نہ سمجھا جائیگا بلکہ خود صحیح تعلیم کے لئے لازمی مانا جائے گا۔

مثال کے طور پر آپ ہندی مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ ہی کو لے لیجئے۔ کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم ان مسلمانوں کو اس بات کا موقع دیگا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنالیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لئے کتنا اہم ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نیک نیت مگر انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں کہ جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لئے مضر ہو۔ مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں۔ کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دانوں کا یہی تقاضا ہے۔ آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کرسکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے

سکھا دیا لیکن علم برتنے اور سیرت پر اثر انداز ہونے کا کوئی ساماں نہ ہوگا ؟ کیا اس وقت بھی ہمارا نصاب ایسا ہی چوچوں کا مربّا ہوگا جیسا کہ اب ہے یعنی کیا اس وقت بھی ہر چیز کو مضمون بنا کر اور نصاب میں شامل کر کرکے بچہ کے لئے مصیبت اور اس کی تعلیم کے لئے بے اثری کا ساماں کیا جائیگا ۔ یا ایک یا تھوڑی سی چیزوں میں اچھی مہارت پیدا کرکے ایسی قابلیت پیدا کر دی جائے گی جس سے وہ دوسری چیزوں کو ضرورت کے وقت خود حاصل کر سکے ؟ کیا اس وقت بھی پیشہ اور عام تعلیم کو بالکل الگ الگ رکھا جائے گا ۔ یا پیشہ کی تعلیم کا ایسا انتظام ہو سکے گا کہ وہی عام تعلیم کی مضبوط بنیاد ثابت ہو ؟ غرض یہ اور ان جیسے ان گنت مسائل ہیں جن کا ذکر کرکے میں آپ کا وقت ضایع نہیں کرنا چاہتا ۔ اتنا بھی صرف اس لئے ذکر کیا کہ یہاں ایک بڑے قومی ودیا پیٹھ کے کارکن جمع ہیں ، انھیں اس طرف توجہ دلانے سے شاید اس بات کا موقع نکل سکے کہ ہمارے تعلیمی کام کرنے والے ان مسئلوں پر غور کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو قومی تعلیم کے کسی ادارے کی طرف سے شایع کر سکیں تاکہ ہوتے ہوتے سب کے سوچ و چار سے قومی تعلیم کا ایک صحیح پروگرام تو تیار ہو جائے اور اگر کل نظام کو ناموافق حالات کی وجہ سے رائج نہ کیا جا سکے تو کم سے کم ابتدائی تعلیم کے مسئلہ کو طے کرنے کے بعد نمونہ کے مدرسے قایم کئے جائیں اور کم سے کم تعلیم کی اس بنیادی منزل کو میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں ہی کے ذریعہ درست کرنے کی تدبیر کی جائے ۔

کل پتی جی ! میں نے آپ کی دعوت اور اس جلسہ سے فائدہ اٹھا کر بعض تعلیمی مسائل کا ذکر کر دیا کہ شاید اس سے اس تحقیق کا دروازہ کھلے جس کی میں نے درخواست کی ہے ۔ لیکن مجھے یقین نہیں کہ میں نے یہ ٹھیک بھی کیا یا نہیں ۔ اس وقت تو مجھ سے یہ توقع ہوگی کہ میں ان نوجوانوں سے کچھ کہوں گا جو آپ کے ودیا پیٹھ سے تعلیم ختم کرکے جا رہے ہیں ۔ اب آپ کی اجازت سے ان طلبہ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں ۔

عزیزو ! تم علم کے اس شہر کاشی سے یہاں کے اس مشہور ودیا پیٹھ میں اچھے اچھے اور لایق استادوں سے تعلیم پا کر اب دنیا میں قدم رکھتے ہو ۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں جو ودیا پیٹھ سے بہت زیادہ سخت اور بے رحم جگہ ہے تم کیا کرنا چاہتے ہو ۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا حوصلہ ہو کہ تجارت اور کاروبار ، بیوپار یا نوکری سے بہت سی دھن دولت کماؤ اور چین سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی گذارنے کا ساماں کرو ۔ اگر ایسا ہے

تو خدا تمھارے ارادوں میں برکت دے، مگر مجھے تم سے پھر کچھ بہت کہنا نہیں ہے ۔ تم اپنی کامیابی کے لئے خود راہیں تلاش کر لوگے، اگر ٹھیک راستہ پر پڑے تو زیادہ تر اپنا فائدہ کروگے، اگر غلط پر پڑے تو سزا بھگتوگے مگر دوسروں کا کچھ بہت نقصان نہ ہوگا ۔ لیکن چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ کم سے کم کاشی ودیا پیٹھ کے سناتک ہوکر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا ۔ اپنی کامیابی کے لئے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے ۔ تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے فرائض کو ترک کرکے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر اس تک پہنچا جائے ۔ جو اپنی غرض کے لئے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے بھی نہ چوکے وہ آدمی نہیں جانور ہے ۔

اور اگر کاشی ودیا پیٹھ میں پڑھے ہوئے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس کی سیوا میں لگانا چاہتے ہو تو تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے ۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے ۔ وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے ۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے ۔ لیکن کیا کیجئے، تمھارا اور ہمارا ملک ہے، اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے ۔ اس لئے یہ ملک تمھاری ہمتوں کے امتحان، تمھاری قوتوں کے استعمال، اور تمھاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے ۔

ممکن ہے کہ اپنے چاروں طرف اتنی تباہی، اتنی مصیبت، اتنا ظلم دیکھ کر تم بے صبری میں یہ چاہو کہ جیسے بہت سے نوجوان چاہنے لگتے ہیں، کہ اس میں بسنے والی سماج ہی کو ختم کر دو اور برباد کر ڈالو، اس لئے کہ اس میں سدھار کی کوئی صورت نہیں ۔ تمھیں اختیار ہے، مگر اپنے ایک بھائی کی رائے سن لینے میں بھی کیا نقصان ہے ۔ سو میرا خیال یہ ہے کہ تباہی سے ہمارا کام کچھ سہل نہیں ہوگا ۔ تباہی تو پہلے ہی سے کافی موجود ہے ۔ قومی زندگی کا کون شعبہ ہے جس میں پہلے سے تباہی کا دور دورہ نہیں ۔ لیکن ہماری بے شمار بیماریوں اور ان گنت مصیبتوں میں سے ایسی بہت کم ہیں کہ ہم یکایک گرما کر تھوڑی سی دیر میں انھیں ختم کر ڈالیں ۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بگاڑنا اتنا نہیں ہے جتنا کہ بنانا ہے ۔ ہمارے دیس کو ہماری گردنوں سے اُبلتے خون کے دھارے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے ماتھے کے پسینہ کا بارہ ماسی بہنے والا دریا درکار ہے ۔ ضرورت ہے کام کی، خاموش اور سچے کام کی ۔ ہمارا مستقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھویں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھوس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے ۔ سیاسی جھگڑوں کا نفرنسوں اور کانگریسوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے ۔ لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ان میں صدیوں تک کے لئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا ۔ اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال ۔ اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے ۔ جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا، ہاں، کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے ۔

عزیزو! اس نئے ہندوستان کے بنانے کے کام میں تم سے جہاں تک بن پڑے ہاتھ بٹانا ۔ مگر یاد رہے کہ اگر مزاج میں بے صبری ہے تو تم اس کام کو اچھی طرح نہیں کر سکتے ۔ یہ بڑا دیر طلب کام ہے ۔ اگر طبیعت میں جلد بازی ہے تو بھی تم کام بگاڑ دوگے کہ یہ بڑا پتّہ مارنے کا کام ہے ۔ اگر جوش میں بہت سا کام کرنے کی عادت ہے اور اس کے بعد ڈھیلے پڑ جاتے ہو تو بھی شاید یہ کٹھن کام تم سے نہ بن پڑیگا، اس لئے کہ اس میں عرصہ تک ایک سی محنت اور توجہ درکار ہے ۔ اگر ناکامی سے مایوس ہو جاتے ہو تو اس کام کو نہ چھونا کہ اس میں ناکامیاں ضروری ہیں، بہت ناکامیاں اور بار بار ناکامیاں ۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جسے ہر ناکامی اور زیادہ محنت کرنے پر اُبھارتی ہو ۔ اس دیس کی سیوا میں قدم قدم پر خود دیس کے لوگ تمھاری مخالفت کریں گے ۔ وہ لوگ مخالفت کریں گے جنھیں ہر تبدیلی سے نقصان ہوتا ہے، وہ جو اس وقت چین سے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ شاید حالات بدلے تو وہ اس طرح دوسروں کی محنت کے پھلوں سے اپنی جھولیاں نہ بھر پائیں گے ۔ لیکن یاد رکھو کہ یہ سب تھک جانے والے ہیں، ان سب کا دم پھول جائے گا، تم تازہ دم ہو، جوان ہو ۔ تمھارے دل میں اگر شبہ اور بے اعتمادی ہوگی تو اس کام میں بڑی دشواریاں پیش آئیں گی ۔ اس لئے کہ شبہ سے وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو اس کٹھن کام کے لئے ضروری ہے ۔ گندے ہاتھ اور میلے دل لیکر بھی تم اس کام کو انجام کو نہ پہنچا سکوگے کہ یہ مقدس اور پاک کام ہے ۔ نفرت اور بدگمانی بھی اس کام میں کچھ اچھے ساتھی ثابت نہ ہونگے،

کہ تمھاری قومیت کی عمارت کی بنیادیں محبت اور بھروسہ کی چٹانوں ہی پر مضبوط بن سکیں گی۔

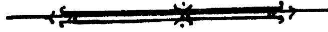
مختصر یہ کہ تمھارے سامنے اپنے جوہر دکھانے کا عجیب و غریب موقع ہے مگر اس موقع سے کام لینے کے لئے بڑی زبردست اخلاقی قوت کی ضرورت ہے۔ جیسے معمار ہوں گے ویسے ہی عمارت ہوگی۔ اور کام چونکہ بڑا ہے ایک کی یا تھوڑے سے آدمیوں کی چند دن کی محنت سے پورا نہ ہوگا۔ دوسروں سے مدد لینا ہوگی اور دوسروں کی مدد کرنا ہوگی۔ تمھاری نسل کے سارے ہندی نوجوان اگر اپنی ساری زندگی اسی ایک دھن میں کاٹ دیں تب شاید یہ ناؤ پار لگے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تم مدد کرنے اور مدد لینے کے قابل ہوگے یا نہیں اور دوسرے مدد دینے کے لئے آمادہ ہوں گے یا نہیں۔

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے، جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں، جہاں بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں، جہاں ایک کا سچ دوسرے کا جھوٹ ہے، جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لئے، ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لئے یکجا کر رکھا ہے، اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے ملکر کام کرنے کی آس ذرا مشکل ہے۔ مگر دل یہی گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لئے یکدل ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ یہاں بالکل مخالف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے ملکر ایک ایسا آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔ قدرت کے اس تجربہ اور قدرت کے اس ارادہ میں اس کی مدد کرنا تمھارا کام ہے۔ اور اس مدد کے لئے اپنے آپ کو اچھا آدمی بنانا اور اپنے دل کو کینہ کپٹ سے خالی کرنا لازمی ہے۔ قربانیوں کے لئے تیار رہنے کی ضرورت ہے، اپنے ارادہ کو مضبوط کرنے اور اپنی نفس کی خواہشوں پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ اگر تم میں اور تمھارے ساتھی نوجوانوں میں یہ صفتیں نہ ہوئیں اور آج ہی تمھیں کسی مہاتما کی کرامت سے سیاسی اور تمدنی زندگی کے اچھے اچھے ادارے میٹھے بٹھائے مفت میں قدرت کی طرف سے تحفہ میں مل گئے تو بھی یاد رکھو کہ یہ تحفہ بے سود ہوگا۔ یہ ادارے سب کے سب نیچے ہوتے ہوتے اسی سطح پر پہنچ جائیں گے جس پر کہ تمھاری اخلاقی

قوت ہوگی اور ان کی شکل ایسی بگڑ جائے گی کہ شکل سے کوئی انھیں پہچان بھی سکے گا ۔ قوم اپنے اداروں کو اور خود اپنے مرتبہ کو اسی درجہ پر قایم رکھ سکتی ہے جس پر وہ خود انھیں اپنے زور بازو سے پہنچانے کے قابل ہو۔ اس لئے ہندوستان کی بڑائی تمھاری خوبیوں پر منحصر ہے ۔ اپنی ذات کی تمام قوتوں کو ترقی دے کر ایک ایسی اخلاقی شخصیت بناؤ جسے بھارت ماتا کے سامنے بھینٹ پیش کرنے جاؤ تو تمھیں خود شرم نہ آئے اور وہ خوش ہوکر اسے قبول کرلے ۔

سیوا کے اس راستہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں ظاہر ہے کہ بڑی دشواریاں ہیں ۔ اس لئے ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہو جاؤ گے ، بیدم سے ہو جاؤ گے ، اور تمھارے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہونے لگے گا کہ یہ جو کچھ کیا سب بیکار تو نہ تھا ۔ اس وقت مادّی اور امکانی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اس تصویر کی طرف دھیان لگانا جو تمھارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہئے یا اس دیس کی تصویر پر جس میں سچائی کی حکومت ہوگی ، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا ، جہاں امیر غریب کا فرق نہ ہوگا بلکہ سب کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پوری پوری ترقی دینے کا موقع ملیگا ، جس میں لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں گے اور ایک دوسری کی مدد ، جس میں مذہب اس کام میں نہ لایا جائے گا کہ جھوٹی باتیں منوائے اور خود غرضیوں کی آڑ بنے بلکہ زندگی کو سدھارنے اور اس کو بامعنی بنانے کا ذریعہ ہوگا ۔ اس تصویر پر نظر ڈالوگے تو تمھاری تھکن دور ہو جائے گی اور تم نئے سرے سے اپنے کام میں لگ جاؤ گے ۔ پھر بھی اگر چاروں طرف کمینہ پن اور خود غرضی ، مکاری اور حیلہ بازی ، غلامی اور غلامی پر رضامندی پاؤ تو سمجھنا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے ، مورچہ سر نہیں ہوا ، اس لئے جنگ جاری رکھنی چاہیئے ۔ اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آنا ہے اور اس میدان کو چھوڑنا پڑے تو یہ تسلی تمھارے لئے بس ہوگی کہ تم نے اپنے بس بھر اس سماج کو آزاد کرنے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمھیں آدمی بنایا تھا ۔ تم چلے جاؤ گے ، دوسرے تمھارے کام کو جاری رکھیں گے ۔ اس لئے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا کام نہیں ۔ سماج کی آزادی اور سماج کی صحت ایسی چیزیں نہیں جو بس ایک دفعہ حاصل کرلی جائیں ۔ یہ اسی سماج کو ملتی ہیں اور اسی کے پاس رہتی ہیں جس کے سپوت انھیں روزانہ نئے سرے سے حاصل کرسکیں ۔

بس، اب رخصت۔ تمھیں تمھاری تعلیم کی سند مبارک ہو۔ تم سے بہت سی اُمیدیں ہیں خدا کرے کہ مایوس نہ کرو۔



ہندستان کی تاریخ میں اصول جنگ کی اہمیت

قوموں کا ایک دوسرے سے لڑنا ایسی بات نہیں ہے جس کا خوشی یا فخر سے ذکر کیا جائے۔ لڑائی سے کوئی مسئلہ طے نہیں ہوتا۔ جو لوگ مارے جاتے ہیں یا زخمی ہوتے ہیں وہ جسمانی اعتبار سے بہترین ہوتے ہیں، بستیاں اُجڑتی ہیں، گھرانے کے گھرانے تباہ ہو جاتے ہیں۔ فوجیں ملکوں کو ویران کر سکتی ہیں۔ آباد نہیں کر سکتیں، وہ ایک عرصے کے لئے مخالفوں کو بے بس اور مجبور کر سکتی ہیں، مگر خالی جبر و تشدد سے کوئی مضبوط سیاسی نظام قائم نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں جو جنگیں ہوئی ہیں ان کی اہمیت کا سبب یہ نہیں ہے کہ فلاں فریق جیتا اور فلاں ہارا، ان کا مطالعہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ جنگ میں قوموں کی صحیح اخلاقی حالت ظاہر ہو جاتی ہے۔ امن کے زمانہ میں قوموں کے بہت سے عیب چھپے رہتے ہیں، جنگ تمام راز فاش کر دیتی ہے۔ سیرت کی کمزوریاں، آپس کی بے اعتباری، صبر اور استقلال اور قوت برداشت کی کمی، ذہنی اور اخلاقی بے مائگی۔ یہ اور ان کے علاوہ بہت سی خامیاں ہیں جو اس وقت اپنی اصل صورت میں نظر آتی ہیں جب کسی جماعت کو اپنی حفاظت کرنے یا کسی دوسری جماعت پر غالب آنے کے لئے اپنی پوری جسمانی اور اخلاقی قوت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جنگ میں کامیابی چند افراد کے کمالات سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ ان اوصاف کی بدولت نصیب ہوتی ہے جو جماعت میں ربط، ہم آہنگی، اور اتحاد عمل پیدا کرتے ہیں۔ ہم یہ بھی قریب قریب ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ہتھیار اور دوسرا سامان جنگ، صف آرائی کے قاعدے اور لڑنے کے طریقے پر عام ذہنیت اور خیالات کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے، یہاں تک یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ ہر قوم کا اصول جنگ اس کے اصول حیات کا آئینہ ہوتا ہے۔

اصول جنگ کے دو پہلو ہیں، لشکر کشی[1] اور جنگ۔ لشکر کشی کے مفہوم میں فوج کی نقل و حرکت،

[1] STRATEGY

یعنی کوچ کے رستے، جنگ کے مقام، حملے کے وقت اور موقعے، حفاظت کے مقام، قلعے اور لشکرگاہ کا انتخاب اور واپسی کے رستے کو محفوظ رکھنے کا انتظام سب شامل ہے۔ جنگ سے مراد ایک میدان میں دو فوجوں کا مقابلہ ہے۔ چونکہ فوجیں نقل و حرکت میں ہر طرح سے زمین کے نقشے کی پابند ہوتی ہیں، ہم کو اصول جنگ کی اہمیت ذہن نشین کرنے کے لئے سب سے پہلے اپنے ملک کی سرحد پر غور کرنا چاہیئے۔

لشکرکشی کے مسلمہ اصولوں کے مطابق شمال مغرب میں ہندستان کی صحیح سرحد یا تو دریائے سندھ ہے یا پھر افغانستان اور بلوچستان کے پہاڑوں کا مغربی حصہ۔ اگر ہرات، قندھار، بلخ اور بدخشاں ہندستانیوں کے قبضے میں ہوں تو مغرب کی طرف سے کسی دشمن کا حملہ کرنا مشکل ہے، لیکن تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم ان مقامات پر مستقل قبضہ رکھ نہیں سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ موریا بادشاہوں کے عہد میں ہندستان کی ریاست نے یہ کر دکھایا، لیکن اس زمانے کے حالات کا اندازہ ہم صرف قیاس سے لگاتے ہیں، اور یہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مغل بادشاہ قندھار اور بلخ کو قابو میں نہیں رکھ سکے، اور انگریز بھی اس کوشش میں ناکامیاب ہوئے۔ ہمارے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ ہم سندھ کے دونوں کناروں کو محفوظ کرلیں، اور دشمن کا مقابلہ پہاڑوں پر چڑھ کر نہ کریں بلکہ میدان میں، جہاں ہمارے سپاہی زیادہ اطمینان سے لڑ سکتے ہیں اور ضرورت ہو تو قلعوں کی آڑ لے سکتے ہیں۔ سندھ کی وادی کا مغربی حصہ اتنا آباد نہیں ہے کہ وہاں ایک بڑی فوج کے لئے سامان رسد مہیا کیا جا سکے، اور اس میں جو قبیلے آباد ہیں ان سے ہندوستانی حکومت کے دوستانہ تعلقات رکھے جائیں تو دشمن کو کبھی اس کا یقین نہ ہو سکے گا کہ اس کی واپسی کا رستہ محفوظ ہے۔ وہ دشمن بڑا ہی بیباک یا بیوقوف ہوگا جو ان دشواریوں کے باوجود حملہ کرنے کا حوصلہ کرے۔

لیکن ہندوستانی ریاستوں نے سرحد کی حفاظت کا ایسا معقول انتظام کہ حملہ آوروں کو سندھ سے آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہو، بہت کم کیا۔ ہندوستان کی سرحد کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب ہندوستان ایک متحدہ ریاست ہو، اور ایسا اتحاد جب کبھی ہوا تو اس ہمت اور استقلال کی بدولت جو کسی خاص وجہ سے عارضی طور پر ظہور پذیر ہوا اور کوئی قومی اور دائمی وصف نہیں تھا۔ موریا ریاست کے قائم ہونے


سرحد
دریا
پهاڑ
کوه هندوکش
دریای کابل
دریای اندس
دریای جهلم
دریای چناب
دریای راوی
لاهور
دریای ستلج
غربی همالیه
ملتان
دریای اندس
دریای جمنا
دهلی
میرته

تک ہندوستان کا سیاسی وجود ہی نہ تھا، گپت ریاست اپنے سیاسی فرائض سے غافل رہی اور اس کے عروج کے زمانے میں بھی ستلج شمال مغربی سرحد سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے ہُون قوم کے حملے روکے نہیں جاسکے۔ اور ان وحشیوں نے ملک کے اندر گھس کر گپت ریاست اور اس کے اعلیٰ تمدن کو نیست و نابود کر دیا۔ راجپوتوں میں بھی کوئی ایسا دوراندیش مدبر نہیں تھا جس کی نظر شمال مغربی سرحد تک پہنچتی۔ محمود غزنوی کے زمانے میں سرحد پر جے پال کا راج تھا اسے رستے سے ہٹانے کے بعد پھر کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی اور محمود نے لاہور پر قبضہ کر کے کھلے دروازے میں بنیاں بھی لگادیں کہ اسے کوئی اتفاقی جھونکا بند نہ کرسکے۔ یہ دروازہ شہاب الدین غوری نے قریب ڈیڑھ صدی بعد اسی طرح کھلا پایا۔

شہاب الدین غوری کی ہندوستانی مقبوضات کو شمس الدین التمش نے ایک ریاست کی شکل دینے کا ارادہ کیا، اور بلبن نے اس کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ لاہور، دیپال پور اور ملتان محافظ فوج کی مرکزی چھاؤنیاں بنائی گئیں اور سندھ کے دونوں کناروں پر پہرہ دیا جانے لگا۔ علاءالدین نے جب ایک مستقل فوج کا انتظام کر لیا تو اس کے سردار بجائے اس کے کہ سرحد پر دشمن کی تاک میں بیٹھے رہیں خود بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے، اور افغانستان کے تاتار صوبہ داروں کے دانت کھٹے کر دئے کہ پھر انھیں ہندوستان پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن چودھویں صدی کے آخر میں جب امیر تیمور نے لشکر کشی کی تو سرحد کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا، اور اندرونی فساد کی بدولت بابر کو بھی رستہ صاف ملا۔

مغل بادشاہوں کو افغانستان اور خراسان کا مشرقی حصہ ورثے میں ملا تھا، اور اس وجہ سے وہ جنوب میں ہرات اور شمال میں بدخشاں اور بلخ کو اپنی سرحد بنانے کا حوصلہ کرسکتے تھے۔ مگر ان قلعوں تک فوج اور سامان جنگ پہنچانا اتنا دشوار تھا کہ وہ اپنا حوصلہ پورا نہ کرسکے اور انھیں کابل کی وادی پر قناعت کرنی پڑی۔ چونکہ ہمسایہ ریاستیں ان کی طاقت اور دولت سے واقف تھیں، اس لئے ان کا کابل پر قابض رہنا بھی سرحد کی حفاظت کے لئے کافی ثابت ہوا۔ اس وقت انگریزی حکومت نے سرحد وہیں پر قائم کی ہے جہاں پہلے ترک بادشاہوں نے کی تھی۔

ناکہ بندی اور فوج کے انتظام کے علاوہ ہماری سرحدی حکمت عملی کا ایک پیچیدہ مسئلہ یہ بھی ہے کہ

ان قبائل کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے جو سندھ کے اس پار کے پہاڑوں میں آباد ہیں۔ وہ کسی قسم کی اطاعت گوارا نہیں کرتے، آباد ایسی سرزمین پر ہیں جو مستقل حکومت کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی، اور سپاہی اس غضب کے ہیں کہ انھیں شکست دینا ممکن بھی ہو تو قابو میں رکھنا ممکن نہیں۔ ان کو رام کرنے کے لئے ہر طرح کی تدبیریں کی جا چکی ہیں، شہاب الدین غوری نے ان کو مسلمان کر کے درہ خیبر اور درہ خرم کو رہزنی سے محفوظ کرنا چاہا، غیاث الدین بلبن نے عاجز آ کر ان کی نسل کو مٹا دینے کی کوشش کی، مغلوں نے سمجھا کہ تھانے اور چھاؤنیاں قایم کر کے انھیں مرعوب کر لیں گے، لیکن ان تدبیروں میں سے کوئی کارگر نہیں ہوئی اس وقت کی حکومت کا طرز عمل وہی ہے جو مغلوں نے بالآخر اختیار کیا تھا۔ سرحدی قبیلے روپیہ دے کر خوش رکھے جاتے ہیں اور کبھی کبھی یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ وہ زیادتیاں کریں گے تو نقصان اٹھائیں گے امن کے زمانے میں یہ صورت حال کچھ زیادہ ناقابل اطمینان نہیں، لیکن ان قبائل کی دوستی کا کوئی اور خریدار پیدا ہو جائے تو معاملہ بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔

سرحد کی حفاظت کا معقول انتظام کرنے کے لئے اس علاقے کے نقشے پر غور کرنا کافی نہیں ہے جسے ہم اپنی سرحد ٹھہرائیں۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ فن جنگ کے ان ماہروں نے جو ہندوستان پر حملہ آور ہوئے کون سا رستہ اختیار کیا، آگے کیونکر بڑھے اور واپسی کے رستے کو کیسے محفوظ کیا۔ مسئلے کے اس پہلو پر نظر ڈالتے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ بڑی فوجیں ہندوستان میں صرف ایک رستے سے داخل ہو سکتی ہیں، اور وہ درہ خیبر ہے۔ مشرق میں برہم پتر کی وادی بہت ہی دشوار گذار ہے، پھر یہاں سے اس مقام تک جہاں دریائے سندھ ہمالیہ کو چھوڑ کر جنوب کی طرف مڑتا ہے کوئی درہ ایسا نہیں ہے جو قابل گذر کہا جا سکے۔ کابل کی وادی سے جنوب کی سمت میں پہاڑوں کا جو سلسلہ چلتا ہے اس میں بہت سے چھوٹے بڑے درے ہیں، لیکن بلوچستان اور مکران کی جانب سے وہی فوج حملہ کر سکتی ہے جو چھ سات مہینے کا کھانے پینے کا سامان اپنے ساتھ رکھے، ان دروں سے نکل کر فوج صوبہ سندھ میں داخل ہوتی ہے، اور اس صوبے کے متعلق ایک عرب سیاح نے حضرت عثمان کو جو رائے دی تھی کہ اگر وہاں کوئی بڑی فوج بھیجی گئی تو وہ بھوکوں مر جائے گی اور چھوٹی فوج کو وہاں کے باشندے کھا جائیں گے بالکل صحیح ہے۔

سندھ کے جنوب مشرق میں دلدل اور ویرانے ہیں، مشرق میں تھار کا ریگستان ہے، اس لئے اس طرف سے فوج صرف دریائے سندھ کے کنارے کنارے چل کر اور ملتان کے قریب مشرق کی طرف مڑ کر مقابلتاً زرخیز علاقوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ واپسی کے لئے پھر یہی رستہ اختیار کرنا ہوگا، اور فتحیاب ہونے پر بھی رسد فراہم کرنے میں دشواریاں پیش آتی رہیں گی۔ اس وجہ سے کوئی حملہ آور جو خیبر کی طرف سے داخل ہو سکتا ہو سندھ کے رستے نہ آئے گا۔ تاریخ میں ہم کو سندھ پر مغرب سے صرف ایک حملے کی مثال ملتی ہے، اور وہ محمد ابن قاسم کی لشکر کشی ہے۔ لیکن محمد ابن قاسم کا مقصد سندھ فتح کرنا تھا۔ اس نے ملتان پر قبضہ کر کے شمالی سندھ کی ناکہ بندی کر لی، پنجاب پر حاوی ہونے کا اسے موقعہ نہیں ملا اور غالباً اس کا ارادہ بھی نہیں تھا کہ پنجاب پر حملہ کرے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے پاس تھوڑی سی فوج تھی، اور اگر سندھیوں میں ذرا بھی اتحاد ہوتا تو وہ اسے آسانی سے دکھا جاتے۔

ہندوستان فتح کرنے کے ارادے سے جتنے حملے کئے گئے وہ سب خیبر کی طرف سے تھے۔ کبھی کبھی فوجیں غزنیں سے ملتان، اور پھر سرہند ہوتی ہوئی دہلی کی طرف بڑھی ہیں۔ سکندر کابل کی وادی سے ہو کر آیا، اور بیاس کے کنارے تک پہنچا۔ اس کی لشکر کشی کو انگریز مورخ ایک بڑا کارنامہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور اگر ہم صرف اس ہمت اور بیباکی کو مدنظر رکھیں جس کے بل پر سکندر انجان علاقوں میں گھستا ہوا چلا گیا تو بےشک اس کی لشکر کشی ایک کارنامہ تھی۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سکندر کو کسی ایک جنگ میں ناکامیابی ہوتی تو اس کی فوج یقیناً نیست و نابود ہو جاتی، اور ایسی چال جو ساری بازی کو خطرے میں ڈال دے ہرگز صحیح اور مناسب نہیں۔ سکندر کے مقابلے میں محمود غزنوی کے حملے فنی اعتبار سے لشکر کشی کے بہت بہتر نمونے ہیں۔ محمود نے پہلے پشاور فتح کیا، پھر بھیرا اور ملتان پر قبضہ کر کے اپنے ایک بازو کو محفوظ کیا، اور شمال میں سوات اور باجوڑ کی وادیوں میں جا کر وہاں ایسا رعب جمایا کہ بایاں بازو بھی محفوظ ہو گیا، اور وہ اطمینان سے جتنے عرصے کے لئے اور جتنی دور تک ہندوستان کے اندر بڑھ جاتا، واپسی میں کسی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا۔

لیکن جو مقصد محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین نے کئی حملوں میں پورا کیا وہ امیر تیمور نے ایک ہی چال میں حاصل کر لیا، اور اس کی لشکر کشی میں فن جنگ کا ہر کمال نظر آتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت

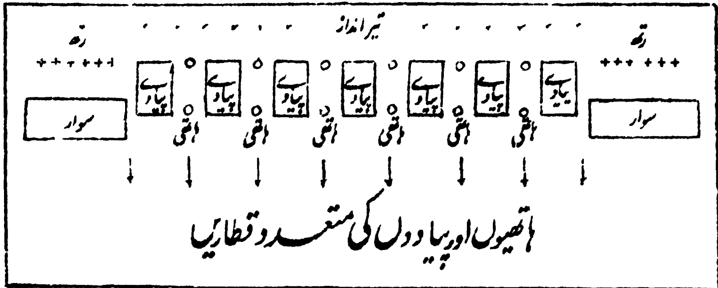
مدافعت کرنے والا کوئی نہ تھا، ورنہ یہ ظاہر ہو جاتا کہ امیر تیمور نے کس ہوشیاری سے مقابلے کی ہر امکانی صورت پر غور کر لیا تھا اور ہر چال کی پیش بندی کر لی تھی۔ اس نے پہلے اپنے پوتے پیر محمد کو ایک بڑی فوج کے ساتھ غزنی سے ملتان کا محاصرہ کرنے کو بھیجا، اور خود خیبر کے رستے سے ہندوستان میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اگر پیر محمد کے مقابلے پر کوئی بڑی فوج بھیجی جاتی جس سے اس کے شکست کھانے کا اندیشہ ہوتا تو تیمور لاہور پر تیزی سے بڑھ کر دشمن کو اپنی دونوں فوجوں کے درمیان گھیر لینے کی کوشش کرتا۔ اگر ہندوستانیوں کو معلوم ہو جاتا کہ امیر تیمور درہ خیبر سے داخل ہونے والا ہے اور وہ مدافعت کے لئے دو فوجیں بھیجتے، ایک ملتان اور دوسری پشاور، تب بھی ان کی بازی کمزور رہتی۔ تیمور کی دونوں فوجیں شکست کھاتیں تو ان کی واپسی کا رستہ کھلا ہوا تھا، لیکن ان میں سے ایک بھی فتحیاب ہوتی تو ہندوستان کی دونوں فوجوں کو پسپا ہونا پڑتا، کیونکہ تیمور لاہور کی طرف بڑھ کر یا پیر محمد سرہند کی طرف کوچ کر کے ہندوستانیوں کی کامیاب فوج کو گھیرنے کی دھمکی دے سکتا تھا، اور دشمن کے پیچھے ہٹنے سے تیمور کی دونوں فوجیں ایک دوسرے سے مل کر دوبارہ مقابلہ کر سکتی تھیں۔ اس وقت بھی اگر شکست ہوتی تو واپسی کا رستہ محفوظ رہتا۔ اگر تیمور کو فتح پانے کا پورا یقین نہ ہوتا اور اس کی فوجیں دنیا کی بہترین فوجیں نہ ہوتیں، تب بھی اس کی تدبیریں ایسی تھیں کہ اچھے اچھے سپہ سالاروں کو عاجز کر دیتیں۔

ہندوستان کے ہندو مسلمان سپہ سالاروں میں لشکر کشی کے ماہر بہت کم ملتے ہیں، اور ان میں سب سے اعلیٰ درجہ شیر شاہ اور میر جملہ اورنگ زیب کے سپہ سالار کو دینا چاہئے۔ سوا ان تدبیروں کے جو سرحد کی حفاظت کے لئے اختیار کی گئیں، ہماری تاریخ میں ایسے موقعے بھی بہت کم ہوئے ہیں جب لشکر کشی نے کسی فوج کی قسمت کا فیصلہ کیا ہو۔ ہندوستان کے سپاٹ میدان اور سست آدمی فن لشکر کو ترقی دینے کے لئے موزوں نہیں ہیں، اور ہم نے ہمیشہ سے لشکر کشی کے مقابلے میں فوج کی تعداد، سپاہیوں کی دلیری اور ہتھیاروں کی خوبی کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اسی وجہ سے جو فوجیں باہر سے آئیں اور ہندوستانی فوج کی تعداد، اس کے ہتھیار اور ساز و سامان کا جنگ کے طریقے میں جدتیں کر کے مقابلہ کیا وہ کامیاب ہوئیں۔ فن جنگ کی جدتوں اور امکانی ترقیوں سے بے خبر رہنا ہندوستان کی کسی ایک قوم کی خصوصیت نہیں بلکہ

ہندوستانی آب وہوا کی تاثیر معلوم ہوتی ہے۔ جو قوم یہاں آئی ایک نیا اور کارگر اصول لیکر آئی، مگر کامیاب ہوتے ہی وہ ملک کے فرسودہ رواج کی پیرو ہو گئی اور اپنی روش بھول گئی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے سے پہلے سپہ گری ایک خاص ذات کا پیشہ تھی۔ یہاں کی لڑائیاں زیادہ تر عزت اور حیثیت بڑھانے کے لئے لڑی جاتی تھیں، اور معلوم ہوتا ہے یہاں ملک گیری کی ہوس دوسری قوموں کے مقابلے میں کم تھی، کیونکہ منو کے دھرم شاستر میں لکھا ہے کہ اگر ایک راجہ دوسرے راجہ کو میدان میں شکست دے تو اسے اپنے حریف کے ملک کو ضبط نہ کر لینا چاہئے، بلکہ اسے یا اس کے خاندان کے کسی اور قابل آدمی کو اپنے ماتحت کی حیثیت سے گدی پر بٹھا دینا چاہیے۔ اس وجہ سے ہمیں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ منو کے دھرم شاستر اور کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں یہ بھی لکھا ہے کہ فوج کی تنظیم اور میدان جنگ میں اس کی ترتیب کیسی ہونی چاہئے۔ ہندوستان کے سپاہی بے شک اپنے فن میں ماہر اور بہت بہادر ہوتے تھے، لیکن رسم کی پابندی نے ان میں ترقی کرنے اور نئے اصول ایجاد کرنے کی خواہش پیدا نہیں ہونے دی۔ وہ یہ بھی سمجھ نہ سکے کہ جنگ کا اصل مقصد جیتنا ہوتا ہے، بہادری، جاں بازی اور فنی کمالات محض ضمنی اور اکثر غیر ضروری اوصاف ثابت ہوتے ہیں۔ تمام ناکامیوں کے باوجود ہندو سپاہی اور سپہ سالار رسم ورواج اور اپنی پرانی ذہنیت کو بدل نہ سکے۔ یہ وہی رسم کی غلامی ہے جو ہمیں ان کی زندگی کے اور اصولوں میں نظر آتی ہے۔

قدیم ہندوؤں اور راجپوتوں کا اصول جنگ یہ تھا کہ فوجیں خاص ترتیب سے میدان میں کھڑی ہوں، ایک مقررہ قاعدے کے مطابق لڑیں، ہر شخص کو اپنے جوہر دکھانے کا موقعہ ملے اور جس فوج کے سپاہی زیادہ طاقت ور، بہادر اور مشاق ہوں وہ ان اوصاف کے بل پر جیت جائے۔ اس قاعدے میں وہ تمام باتیں جو فن جنگ کی بنیاد ہیں نظر انداز کی گئی تھیں، اور جب باہر کی قوموں نے جو دوسرے طریقے سے لڑتی تھیں ہندوستان پر لشکر کشی کی تو دیسی اصول جنگ کی تمام خامیاں واضح ہو گئیں۔



ہاتھیوں اور پیادوں کی متعدد قطاریں

ہندوستانی فوجوں کی ترتیب کم و بیش اسی طرح ہوتی تھی جیسی کہ مندرجہ بالا نقشے میں دکھائی گئی ہے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ترتیب کے ذریعے سے فوج میں قلعہ کا سا استحکام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، اس کا سبک رفتار عنصر بس سواروں کے دستے ہوتے تھے، لیکن ہاتھیوں اور پیادوں کے ساتھ اتحاد عمل قائم رکھنے کی ضرورت ایسی تھی کہ ان کی سبک روی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اگر جم کر لڑائی ہو تو یہ ترتیب بہت مفید ہو سکتی ہے، اور دیکھنے میں ایسی چست معلوم ہوتی ہے کہ دشمن کے دل دہلا دے، مگر اس ترتیب کے ساتھ حملہ کرنا بہت مشکل ہے اور اگر وہ ایک دفعہ بگڑ جائے تو اس کا درست کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ترتیب کی خامیوں کے علاوہ قدیم ہندو اور راجپوت سپاہی اس سبب سے بھی نقصان میں رہتے تھے کہ ان کے ہتھیار بہت بھاری تھے۔ کسی مورخ نے کہا ہے کہ رومانے ایک عالم گیر سلطنت اپنی تلوار کی بدولت قائم کی جو ہلکی، چھوٹی، دو دھاری اور نکیلی ہوتی تھی، اور جس سے کاٹنے کی بہ نسبت بھونکنے کا کام زیادہ لیا جاتا تھا۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہتھیار کے استعمال میں سپاہی کی قوت جتنی کم صرف ہو اچھا ہے، کیونکہ لڑائیاں اکثر گھنٹوں تک جاری رہتی ہیں، اور سپاہیوں کا تھکنا فوج کی شکست کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ دوسری اور اتنی ہی اہم بات یہ ہے کہ گھمسان کی لڑائیوں میں لمبے ہتھیار بیکار ہو جاتے ہیں، اور اگلے زمانے میں جب توپیں نہیں تھیں تو لڑائی کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں تھی کہ صفیں ایک دوسرے سے گتھ جائیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں کئی معرکے ایسے ہوئے ہیں جو مختلف اصول جنگ کے مثالی نمونے ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ پہلا معرکہ یونانی سپہ سالار سکندر اعظم اور شمال مغربی پنجاب کے راجہ پورس کے درمیان ہوا،

جس میں پورس نے بری طرح شکست کھائی۔ پورس نے اصول کے مطابق فوج کو ترتیب دی اور بہت بہادری سے لڑا۔ سکندر نے موقعے اور محل کے مناسب طریقہ جنگ اختیار کیا، اپنے سپاہیوں کے اوصاف اور دشمن کی کمزوریوں سے پورا فائدہ اٹھایا، جیتنے کے ارادے سے لڑا اور ارادے میں کامیاب ہوا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے، سکندر کو ایک مرتب فوج کے مقابلے میں دریا پار کرنا تھا اور پار کرکے اپنی فوج کو اس طرح ترتیب دینا تھا کہ وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ فوجوں کی نقل و حرکت نقشے میں دکھائی گئی ہے۔ سکندر نے پہلی چالاکی تو یہ کی کہ میدان کا انتخاب خود کیا، اور لڑائی ایسے وقت چھیڑی جب دشمن کو اس کا موقعہ نہیں ملا تھا کہ میدان میں پوری طرح پھیل کر کثرت تعداد کا فائدہ اٹھائے۔ ہندوستانیوں کو نیچا دکھانے میں ایک حد تک ان کی تقدیر بھی شریک تھی، کیونکہ رات کو بارش ہو چکی تھی، زمین پر پیر پھسلتا تھا اور ہندستانی تیر انداز، جو اپنی کمانوں کو زمین میں گاڑ کر اور پیر کی ٹیک لگا کر تیر چلاتے تھے سکندر کے ایرانی تیراندازوں کا جواب نہ دے سکے۔ یونانیوں کا بیان ہے کہ ہندستانیوں کے تیر موٹی سے موٹی ڈھال اور زرہ کو پار کر جاتے تھے، لیکن جب تیر چلانے میں اتنا اہتمام کرنا پڑتا ہو کہ دشمن کو تیر انداز کا خاتمہ کر دینے کا موقعہ مل جائے تو پھر تیر کی تیزی سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ سکندر نے اپنے لئے زیادہ اور دشمن کے لئے کم میدان اس نیت سے خالی چھوڑا تھا کہ امکان ہو تو دشمن کو گھیر لے، اس نے زیادہ زور کے حملے پورس کے دونوں بازوؤں پر کئے، اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو پھر لڑائی نہیں رہی بلکہ قتل عام شروع ہو گیا۔ پورس کی پشت پر پہاڑیوں اور دریا کے درمیان ایک تنگ رستہ تھا، اور میدان سے قدم اکھڑنے کے بعد پورس کی فوج کا اس طرف سے سلامت گذرنا محال تھا۔ اسی سبب سے اس کی فوج کا بہت حقیر حصہ بچ سکا، اور وہ خود گرفتار ہو گیا۔

اس لڑائی سے منجملہ اور باتوں کے ہندستانی یہ سبق بھی سیکھ سکتے تھے کہ فوج میں ہاتھی فائدے سے زیادہ نقصان پہنچاتے ہیں۔ یونانیوں کو اس سے پہلے بھی ہاتھیوں سے سابقہ پڑ چکا تھا، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہاتھی ڈر کر یا زخمی ہو کر بھاگتا ہے تو دوست دشمن کا فرق نہیں کرتا۔ انھوں نے پورس کے ہاتھیوں کو نفتے کے گولوں سے ڈرا کر بھگا دیا، اور بھاگنے میں انھوں نے پیادوں کو ایسا روندڈالا کہ پھر وہ کسی مصرف کے نہیں رہے۔

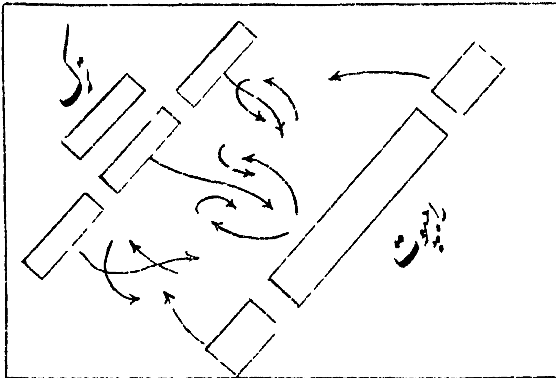
جہلم
پایاب
میدان جنگ
جہلم
دوسری لشکر گاہ
دلدل
سکندر کی پہلی لشکر گاہ
پورس کی پہلی لشکر گاہ

(یہ نقشہ ونسنٹ سمتھ کی کتاب "ہندستان کی قدیم تاریخ" سے نقل کیا گیا ہے۔)

سکندر کے بعد دوسرا سپہ سالار جس نے ہندستانیوں کی کمزوری کو سمجھ لیا اور اس سے فائدہ اٹھایا محمود غزنوی تھا۔ ہندستانی فوج ایک قلعہ کی طرح تھی جو مشکل سے تیار ہوتا ہے اور جگہ سے ہل نہیں سکتا۔ محمود کی لشکرکشی نے ہندستانیوں کو بالکل عاجز کر دیا، کیونکہ اس کی فوجیں نہایت سبک رفتار تھیں، اور اگرچہ وہ بہت دور سے آتا تھا، راجپوت فوجیں کبھی مقابلے کے لئے اچھی طرح تیار نہیں ہو پاتی تھیں محمود کا ہمیشہ ایک خاص مقصد ہوتا تھا جو لڑے بغیر حاصل ہو جاتا تو اس کے نزدیک اور بھی اچھا تھا، جب پہلی چار لڑائیوں کے بعد اس نے دیکھا کہ راجپوت بہت مرعوب ہو گئے ہیں تو اس نے اپنی فوجوں کی بہادری اور سپہ گری کے کمالات کی نمائش نہیں کی اور حتی الامکان جم کر لڑنے سے پرہیز کرتا رہا۔ یہ مصلحت بھی

اس کے راجپوت حریفوں کی سمجھ میں نہ آئی۔

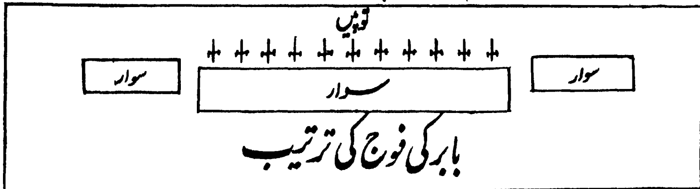
محمود کی لشکر کشی اتنی کامیاب تھی اور اس کے پاس آزمودہ کار سپاہیوں کی ایسی افراط تھی کہ فن جنگ میں جدتیں کرنے کی اسے کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سکندر اور پورس کی لڑائی کے بعد دوسرا معرکہ جس میں ہندستانی اصول جنگ کا تازہ امتحان ہوا پرتھوی راج اور شہاب الدین غوری کے درمیان ترائن کی دوسری جنگ تھی۔ شہاب الدین ایک مرتبہ سپاہیوں کے لالچ اور نافرماں برداری کی بدولت ذلیل ہوا اور گرفتار ہوتے ہوتے رہ گیا، دوسرے مقابلے کے لئے اس کے سپاہی اور سردار تیار ہوکر تو آئے تھے، لیکن فوج کی تعداد سولہ سترہ ہزار سے زیادہ نہ تھی اور پرتھوی راج پچاس ہزار سے اوپر لشکر لے کر آیا تھا۔ اسی سبب سے شہاب الدین اُس سے بھڑتے ہوئے ہچکچایا، اور ایک روایت ہے کہ اس نے راجپوتوں کو غافل رکھنے کے لئے صلح کی گفتگو چھیڑی۔ بہرحال لڑائی کے دن جو تدبیر اس کے کام آئی اس کا مکرو فریب سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ محض دشمن کی ترتیب بگاڑنے کی ایک ترکیب تھی جو بہت کارآمد ثابت ہوئی شہاب الدین نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا، جس میں سے ایک اس کے ماتحت محفوظ دستے کے طور پر رہا، اور تین باری باری سے راجپوتوں پر حملہ کرکے بھاگتے اور پلٹ کر لڑتے رہے، یہاں تک کہ راجپوت فوج کے پیادے، سوار اور ہاتھی سب تتر بتر ہوگئے جب آخری مرتبہ محفوظ دستے کا سہارا لیکر شہاب الدین کی پوری فوج نے حملہ کیا تو راجپوتوں کے پیر اُکھڑ گئے اور ان کی فوج کٹ مری۔ شہاب الدین اگر راجپوتوں کی



قلعہ نما صفوں پر پوری طاقت سے حملہ کرتا تو اس کی فوج پاش پاش ہو جاتی، جو تدبیر اس نے اختیار کی وہ اس سبب سے کارآمد ہوئی کہ اس نے دشمن کو ایسے طریقے سے لڑنے پر مجبور کیا جس میں اس کے سپاہی ماہر تھے اور دشمن بالکل ناواقف، اور اس طرح وہی صفت جس پر راجپوت بھروسا کرتے تھے ان پر تباہی لائی۔

ترکوں نے ہندستانی اصول جنگ میں جو اضافہ کیا وہ سواروں کا استعمال تھا، لیکن ملک میں آباد ہونے کے بعد سے اس میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی، بلکہ اس اعتبار سے تنزل ہوا۔ کہ انھیں بھی ہاتھیوں نے لبھا لیا۔ پھر بھی ان کی فوجی قابلیت اور مستقل مزاجی کا ایک نمایاں ثبوت یہ ہے کہ وہ ۸۰ برس تک مسلسل تاتاروں کے حملے پسپا کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ خطرہ خود ہی جاتا رہا، ترکوں کے جانشین پٹھان ہوئے جو شاید ان سے بھی بہتر سپاہی تھے، مگر اصول جنگ اور ہتھیاروں میں انھوں نے بھی کوئی ترمیم یا جدت نہیں کی۔ جب مغل ایک نیا ہتھیار، یعنی توپ لے کر آئے تو ان کے سامنے نہ راجپوتوں کے قدم جم سکے نہ پٹھانوں کے۔

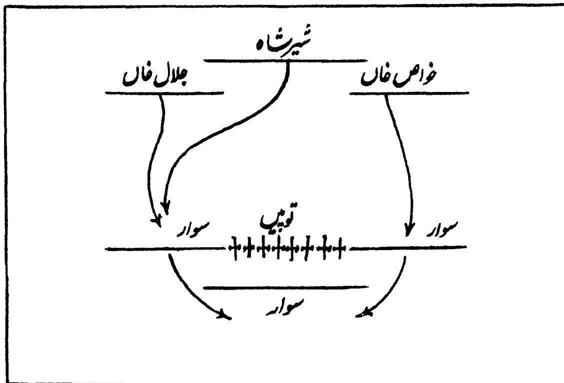
بابر توپوں کو تھوڑے تھوڑے فاصلے سے فوج کے قلب میں رکھتا تھا، اور انھیں زنجیروں سے باندھ دیتا تھا۔ توپوں کے پیچھے منتخب سواروں کے دستے ہوا کرتے تھے، جب دشمن حملہ کرتا تو پہلے توپیں چھوڑی جاتیں، پھر جب اس کی صفیں توپوں سے ٹکراتیں یا یہ دیکھا جاتا کہ توپوں نے دشمن کو پریشان یا بے ترتیب کر دیا ہے تو بابر کے سوار توپوں کے درمیان سے نکل کر حملہ کرتے، اگر پہلا حملہ ناکامیاب رہتا تو وہ پھر توپوں کے پیچھے آجاتے اور توپچیوں کو، جو اس دوران میں گولہ باری کے لئے تیار ہو جاتے تھے، توپیں چلانے کا موقعہ دیتے۔ دائیں اور بائیں بازوؤں پر سواروں کے جو دستے ہوتے تھے وہ حسب ضرورت دشمن کے بازو یا پشت مارنے کے لئے کام آتے تھے۔ پانی پت کے میدان میں پٹھانوں اور سیکری کے قریب کھانوا



بابر کی فوج کی ترتیب

میں راجپوتوں کو بابر نے اسی ترکیب سے شکست دی۔ اس ترتیب کو اختیار کرنے کا خاص سبب یہ تھا کہ بابر کی فوج دشمن کے مقابلے میں بہت کم تھی، اور جب تک اسے آڑ لینے کا موقعہ نہ ملتا وہ پٹھانوں اور راجپوتوں کے ٹڈی دل کے سامنے کسی طرح ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ اگر صورت حال کچھ اور ہوتی تو بابر یقیناً دوسری تدبیر اختیار کرتا کیونکہ موقعہ شناس سپہ سالار قاعدہ کی خاطر اپنی عقل کو معطل نہیں کر دیتا۔ بابر کو غالباً یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کی ترتیب حملہ کرنے کے لئے بالکل ناموزوں ہے، اور دشمن اس کی ترتیب کا گُر سمجھ کر چوکس ہو جائے تو وہ بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ پانی پت کے پندرہ سال بعد شیر شاہ نے اس ترتیب کو ایسا بگاڑا کہ مغل فوج نیست و نابود ہو گئی۔

چونسا کی شکست کے بعد ہمایوں نے دہلی آکر ایک خاصی بڑی فوج جمع کی، اور ۱۵۴۰ء میں بلگرام کے قریب گنگا کے کنارے شیر شاہ سے اس کا دوسرا معرکہ ہوا۔ ہمایوں کے سپاہی بہت اچھے اور آزمودہ کار تو نہیں تھے لیکن ان کی تعداد دشمن سے کچھ زیادہ تھی، اور ہمایوں کو بہت سی توپیں اور کئی مشہور توپچی ورثے میں ملے تھے۔ شیر شاہ کے پاس ایک توپ بھی نہیں تھی، اور اس سبب سے اس نے ایک طریق جنگ اختیار کیا جس سے مغلوں کی توپیں اور ان کے بہترین سپاہی جو توپوں کی آڑ میں رہتے تھے بیکار رہے۔ اس نے اپنی فوج کے تین حصے کر دئے، جس میں سے ایک نے مغلوں کے دائیں اور دوسرے نے ان کے بائیں بازو پر حملہ کیا، اور تیسرا توپوں کی زد سے باہر کھڑا رہا، تاکہ ضرورت کے وقت باقی دونوں حصوں کو مدد کرے۔ خواص خاں



نے مغلوں کے دائیں بازو کو توڑ کر پیچھے ہٹا دیا، جلال خاں پس پا ہونے والا تھا کہ شیر شاہ نے کمک پہنچائی اور مغلوں کا یہ بازو بھی ٹوٹ گیا۔ جو سوار اس وقت دشمن کا مقابلہ کر سکتے تھے وہ بھاگنے والوں اور توپوں کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے، اور انھیں ایک حملہ کرنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوا۔

ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد ترکوں کی طرح مغلوں نے بھی فن جنگ پر جیسا کہ چاہیے توجہ نہیں کی، اگرچہ وہ پہلے کی بہ نسبت بہت بہتر توپیں بنانے لگے، اور بندوقوں کا بھی رواج ہو گیا۔ جب اورنگ زیب کے زمانے میں مرہٹوں سے لڑنا پڑا تو معلوم ہوا کہ مغل فوج میں وہ تمام عیب پیدا ہو گئے ہیں جو قدیم ہندو اور راجپوت فوجوں میں تھے، یعنی اسے یکجا کرنا مشکل ہے، اس کے ساتھ ساز و سامان بیحد ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ بہت سست ہو گئی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد میں ملک عنبر، وزیر احمد نگر نے مغل فوج کی کمزوریوں کو تاڑ لیا اور مرہٹوں کو قزاقانہ جنگ کے لئے تیار کر کے مغلوں کے مقابلے پر چھوڑ دیا۔ مرہٹے کبھی جم کر نہیں لڑتے تھے، بلکہ موقعہ پاکر لشکر گاہ پر شبخوں یا چھاپے مارتے، یا ان چھوٹے چھوٹے دستوں کا صفایا کر دیتے جو سامان مہیا کرنے کے لئے ادھر ادھر بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح مغلوں کو کوئی نمایاں شکست تو نہیں ہوئی، مگر ان کی ہمت پست ہو گئی۔ اورنگ زیب کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مرہٹے اپنے اس طریقہ پر عمل کرتے رہے، مگر جب انھیں ملک اور دولت حاصل ہوئی تو وہ بھی بھاری فوجیں تیار کر کے جم کر لڑنے کا حوصلہ کرنے لگے۔ اس کے لئے وہ موزوں نہیں تھے اور پانی پت کی آخری لڑائی میں ان کی فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔

یورپی قومیں جب ہندوستان آئیں تو ہمارے دیسی اصول جنگ پھر بالکل فرسودہ اور بے کار ثابت ہوئے۔ علاوہ اس کے کہ ہماری توپیں اور بندوقیں بہت ناقص تھیں ہم اپنے سپاہیوں کی تربیت اور قواعد پر کافی توجہ نہیں کرتے تھے اور یورپ کی پیادہ فوج اور سنگینوں کے جواب میں ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ مختلف والیان ملک نے اپنی کمزوری دیکھ کر اپنے سپاہیوں کو نئے اصولوں کے مطابق قواعد کرانے کی بہت کوشش کی، مگر افسوس ہے یہ وہ زمانہ تھا جب باہمی عداوتوں اور غداری کا ایسا زور تھا کہ ہندوستان کا شیرازہ خود بخود بکھر گیا اور ہم میں کبھی اتنا اتحاد عمل اور اعتماد اس حد تک قائم نہیں ہو سکا کہ دشمن کا کہیں پر جم کر مقابلہ کر لیا۔

ہتھیار اور اصول جنگ کی جدتوں کی جو اہمیت دکھلائی گئی   س سے یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ یہی اصل چیزیں ہیں۔ دنیا کی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ لڑائی میں آزاد قومیں غلاموں پر ہمیشہ غالب آتی ہیں اور آزاد قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب وہ ہوتی ہیں جن کے افراد کی ذہنی نشو و نما میں رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں، جن کا اتحاد عمل قومی ارادے کی یکسوئی اور یک جہتی کا نتیجہ ہو اور جن میں حکم چلانے اور بجا لانے کا یکساں مادہ ہو۔ یہ اوصاف لڑنے سے نہیں پیدا ہوتے، یہ سپاہیوں کے لئے مخصوص نہیں ہیں، اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھیں پیدا کرنا اور ترقی دینا تعلیم گاہوں کا خاص وظیفہ ہے۔ ہر قوم کے بہترین سپاہی وہ نہیں ہوتے جو وردی پہنتے اور چھاؤنیوں میں رہتے ہیں، بلکہ وہ نوجوان جو صحیح تربیت پاتے ہیں اور تربیت سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔



کامیابی

سلیم بی اے کے امتحان سے فارغ ہو کر سیدھا گھر آیا۔ گھر کے نام سے دل میں سکون، آرام، محبت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مگر سلیم کا گھر ٹھیکہ پر بنا ہوا، کرایہ کا مکان تھا۔ جس کے مستقل مکین دو تھے۔ ایک سلیم کے محرورالمزاج والد دوسرے اُن کا مخبوط الحواس نوکر۔ ان میں سے والد بزرگوار حج اور زیارات کو گئے ہوئے تھے البتہ نوکر نقد موجود تھا۔ سلیم کو اس مکان کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ مگر کرتا کیا، اس کے سوا اور کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ وہ غریب باپ کا غیور بیٹا تھا۔ اس کے دوست بہت کم تھے، اور وہ بھی اسی کی طرح غریب تھے۔ ان میں سے کسی میں یہ مقدرت نہ تھی کہ اسے زیادہ دن اپنے یہاں مہمان رکھ سکتے اور اگر ہوتی بھی تو وہ خود اسے کب گوارا کرتا۔ غرض امتحان کا آخری پرچہ کرتے ہی، اس نے بستر باندھا اور آغاز مئی کی دھوپ میں تپتا، اور لو میں جھلستا ہوا وہ اپنے اس مامن میں پہنچا۔ میاں بدھو نے بڑی گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا شربت پلایا۔ پنکھا جھلا، اور ایک ایک لفظ کے کئی جملوں میں اس کی خیریت پوچھی۔ جب کبھی وہ تعطیل میں گھر آتا تھا، میاں بدھو ازراہ محبت یہ کہا کرتے تھے کہ تم دُبلے ہوگئے ہو۔ اس کی وجہ یہ سمجھتے تھے کہ کالج میں ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا نہیں ملتا اور دوسری یہ کہ "مولوی صاحب" یا "میاں جی" "بچے" کو ٹھونکتے بہت ہیں۔

دو رات تو سلیم کو سونے میں گذر گئے۔ نیم خوابی کی حالت میں وہ منہ ہاتھ دھونے اور کھانا کھانے کو اٹھتا تھا اور پھر سو جاتا تھا۔ تیسرے دن سے "کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس شہر میں اس کے والد تھوڑے ہی دن پہلے آئے تھے۔ اس لئے اس کا جاننے والا دو چار آدمیوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کے ایک رشتہ کے خالو تحصیل میں سیاہہ نویس تھے ان کے گھر، روز شام کو جایا کرتا تھا۔ خالہ سے اپنی والدہ مرحومہ کی تعریف اور اپنے والد مدظلہ کی بُرائیاں سنتا تھا۔ خالو کے سیاہے کی میزان جوڑتا تھا۔ ان کے بڑے لڑکے کو سبق پڑھاتا تھا اور چھوٹے بچے کو کھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک پرانے ہم سبق کے یہاں

چلا جاتا تھا جو اپنے خاندان کی لڑائیوں کے قصے سنایا کرتے تھے اور کبھی ایک نئے واقف کار کے یہاں، جو اپنی نوکر کی نمک حرامی کی شکایت کیا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے شناساؤں میں ایک مرزا صاحب اور تھے، ان کی صحبت کسی قدر دلچسپ تھی، مگر ایک تو ان کا گھر دور تھا۔ دوسرے وہ اس قدر قوی ہیکل ورزشی آدمی تھے کہ سلیم کو ان کے سامنے اپنے نحیف جثہ پر شرم آتی تھی۔ مصیبت اور یہ تھی کہ اوپر سے وہ نصیحت کے ردے جماتے تھے۔ خیر یہاں تک بھی غنیمت تھا، وہ تلقین سے آگے بڑھ کر تعلیم شروع کر دیتے تھے اور سلیم کو ان کے ساتھ جسم کو عجیب عجیب مضحک طریقوں سے توڑنے مروڑنے کی مشق کرنی پڑتی تھی، جس سے اس کا پلیتھن نکل جاتا تھا اور کئی کئی روز تک بدن میں درد رہتا تھا اس لئے ان سے ملنے سے اس کی طبیعت رُکتی تھی۔ زیادہ وقت وہ کتب بینی میں اور خیالی پلاؤ پکانے میں صرف کرتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گذر گئے۔ اب امتحان کا نتیجہ نکلنے والا تھا اور سلیم اس کے انتظار میں بے چین رہتا تھا۔ وہ بڑا ذہین اور محنتی طالب علم تھا۔ انٹرنس، اور ایف اے اوّل درجے میں پاس کیا تھا۔ بی اے میں بھی اس کے پرچے بہت اچھے ہوئے تھے۔ اور قاعدے سے اسے اوّل درجہ ملنا چاہئے تھا۔ مگر ممتحنوں کی نسبت اس نے سُنا تھا کہ وہ امتحان کے پرچے اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دیوان حافظ میں فال دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے نتیجہ کی طرف سے اسے پورا اطمینان نہیں تھا۔ نوجوانی کا ناہموار تخیل اور تلاطم اسے امید و یاس کی اٹھتی گرتی لہروں میں بہائے لئے جا رہا تھا۔ مگر انتظاریوں ہی کیا کم سخت ہے پھر جب اس کے ساتھ بے اطمینانی بھی شامل ہو جائے، تو اس کی شدت کا کیا پوچھنا۔ سلیم کے ایک دوست نے جو الہ آباد میں رہتے تھے، وعدہ کیا تھا کہ جب نتیجہ معلوم ہوگا تو اسے تار دے دیں گے۔ کئی روز سے وہ سوتے جاگتے ہر وقت اس تار کی فکر میں رہا کرتا تھا۔ خدا جانے کتنے چکر اس نے تار گھر کے لگائے۔ اس کے والد اُسی ڈاکخانہ میں ملازم تھے جس کے ساتھ یہ تار گھر تھا۔

اس لئے تار بابو اور چپراسی اسے پہچانتے تھے۔ پھر بھی اسے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ اس کے نام کا کوئی تار آیا ہے۔ وہ سامنے سڑک پر بے پروائی کے انداز سے ٹہلتا رہتا تھا۔ اور جب کوئی چپراسی سرخ بائیسکل پر نکلتا تو اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا تھا کہ شاید اس کے پاس میرا تار ہو، اور

یہ مجھے مخاطب کرے۔ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بڑی حسرت سے اپنے دل میں کہتا تھا کہ تار پر تار چلا آتا ہے، مگر میرے نام کا ایک بھی نہیں، تار آتا ہے پر نہیں آتا۔

آج صبح سے اس نے نقشہ بدل دیا تھا۔ بجائے تار گھر کے سامنے سعی کرنے کے وہ معتکف ہو کر گھر پر بیٹھ گیا اور کتب بینی میں وقت گذارنے لگا۔ مگر دل اسی طرف لگا ہوا تھا۔ ایک بجے کے قریب وہ کھانا کھانے بیٹھا۔ کھانے میں صرف ماش کی دال اور روٹی تھی اس لئے کہ گوشت بقول بدھو کے بلی کھا گئی تھی۔ یہ حادثہ اکثر پیش آیا کرتا تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ بلی گوشت اُسی دن کھاتی تھی جس دن میاں بدھو کی افیم ختم ہو جائے۔ بدگمانی بُری چیز ہے۔ اس لئے ہم اس کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ افیون ان کے ہوش کی کنجی تھی، جس دن چسکی نہ ہو اس دن وہ غافل ہو جاتے تھے اور حریف جو ہر وقت گھات میں رہتا تھا۔ اپنا کام کر جاتا تھا۔ گوشت کے نہ ہونے کی تلافی میاں بدھو نے یہ کی تھی کہ دال کو بگھار کر اوپر سے کتری ہوئی ادرک، پیاز، ہری مرچ کی تہہ جمادی تھی بدھو کھانا رکھ کر بیٹھے تھے اور سلیم نے نوالہ توڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ باہر سے آواز آئی "تار لے جاؤ" ہڑپ کر اٹھنا، جھپٹ کر دروازہ پر پہنچنا، سنبھل کر اپنے اضطراب کو چھپانا، تار لے کر رسید کے فارم پر دستخط کرنا، چپراسی نے جو کچھ کہا اسے نہ سننا کمرہ میں آکر لفافہ چاک کرنا، یہ سب کچھ بےخبری کے عالم میں چند لمحے کے اندر ہو گیا۔ " اوّل درجہ، دلی مبارکباد" یہ چار لفظ آنکھوں کے رستے دماغ میں پہونچے اور بجلی کی رو کی طرح رگ و پے میں دوڑ گئے۔ خوشی کا ایک ہیجان تھا جس نے قوت خیال کو قریب قریب معطل کر دیا تھا۔ مگر تار والے کی آواز نے اس طلسم کو توڑ دیا "ہمارا انعام مل جائے، بابو صاحب" سلیم چونک پڑا، اس نے اٹھ کر جیب سے ایک روپیہ نکالا اور باہر جا کر چپکے سے چپراسی کے ہاتھ میں دے دیا۔ چپراسی نے سلام کیا۔ اور بائیسکل پر بیٹھ کر ہوا ہو گیا۔ اندر آکر سلیم کی نظر کھانے پر پڑی مگر اب اس کی اشتہا کافور ہو چکی تھی اور صرف ایک خواہش دل پر مسلّط تھی۔ کہ اپنی کامیابی کی خوشخبری کسی کو سنائے اور اس سے داد لے۔ اس نے سوچا کہ بدھو غالباً چسکی پینے گیا ہے۔ اور کوئی دم میں آیا ہی چاہتا ہے اس کے آنے کے بعد۔ کھانا کھائے بغیر چھٹکارا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھی شیروانی پہن اور گنگناتا ہوا دروازہ سے باہر نکل گیا۔ سڑک پر پہنچ کر خیال آیا کہ جوتا نہیں بدلا ہے۔ مگر

اب واپس جانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اس لئے دو سال کی پرانی گرگابی پہنے سٹر پٹر کرتا خالہ کے گھر کی طرف چل کھڑا ہوا۔

راہ میں تصور نے۔ اس کی بیوی کی تصویر نظر کے سامنے پیش کر دی۔ یہ نیک بخت ابھی تعین کی اکثر قیود سے آزاد تھی مگر یہ مسلم تھا کہ وہ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت کی تمام صفات سے آراستہ ہے ایک مدت سے وہ تنہائی کی گھڑیوں میں سلیم کی ہمدم اور ہمساز رہا کرتی تھی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس یادگار موقع پر اسے مبارکباد دینے نہ آتی لیجئے' وہ آگئی' سرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے۔ اس کا حسین چہرہ فخر و مسرت سے دمک رہا ہے۔ حجاب کی سرخی عارض تاباں پر دوڑی ہوئی ہے۔ سرمہ آلود آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلک رہے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

دونوں کی نظریں ایک لمحہ کے لئے ملتی ہیں۔ اور پھر شرم سے جھک جاتی ہیں۔ سلیم ہمہ تن گوش ہے کہ وہ کچھ کہے اسے انتظار ہے کہ یہ پہل کرے۔ دونوں کو بہت کچھ کہنا ہے۔ مگر سوچتے ہیں یہ کہ آخر ابتدا کیونکر کریں۔.. .... خالہ کا گھر آگیا۔ سلیم کو اس واقعے نے جھنجوڑ کرا خواب شیریں سے بیدار کر دیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا خالہ کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ معظمہ سامنے دالان میں بچے کو لئے بیٹھی تھیں۔ سلیم کو دیکھتے ہی کہنے لگیں' بیٹا سلیم اس وقت تمھیں خدا نے بھیجا ہے اس کی کارسازی کے صدقے۔ ننھا رات سے بخار میں تپ رہا ہے۔ محمود نے جا کر ڈاکٹر سے نسخہ لکھوایا اور دوا کے انتظار میں کھڑا رہا مگر اتنا ہجوم تھا کہ اسکول کا وقت آگیا اور اس کی باری نہیں آئی وہ نسخہ یہاں پھینک' کتابیں لے اسکول چلدیا۔ اب میں دوا کس سے منگواتی نصیبا تو جب سے بوڑھی ہوئی ہیں انھیں مردوؤں میں جاتے شرم آتی ہے۔ بیٹا ذرا تم ہی تکلیف کرو اور یہ نسخہ لیکے دوا لا دو۔ اور ہاں لوٹتے میں عطار کی دکان سے آدھ پاؤ بید مشک کا عرق۔ اور تولہ بھر کھٹے میٹھے انار کا شربت لیتے آنا مجھے صبح سے دھڑکن نے ستا رکھا ہے"۔

سلیم نے بچے کے پاس جا کر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو آگ کی طرح پھک رہا تھا مگر خالہ کی تسکین

دینے کے لئے اس نے کہا " بخار تو اب کم معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی دوا لاتا ہوں ۔ خدا نے چاہا تو پیتے ہی اتر جائیگا " نسخہ لیکر وہ ہسپتال میں گیا، جو قریب تھا۔ کمپونڈر بنچ پر پاؤں پھیلائے سو رہا تھا اس کے اُٹھنے اور دوا کے لینے میں کچھ دیر لگی عطار کے یہاں سے اس نے عرق اور شربت لیا۔ سیب کا مربہ چاندی کے ورق خالہ کے لئے اور پیپرمنٹ کی ٹکیاں ننھے کے لئے خریدیں ۔گھر آیا تو خالہ نے بہت سی دعائیں دیں۔ اگر اختلاج سے بےچین نہ ہوتیں تو بلائیں بھی لے تیں ۔ دونوں مریضوں کو دوا پلا کر وہ کچھ دیر ننھے کے پاس بیٹھا اس کے پاؤں سہلاتا رہا خالہ اپنی اور بچے کی بیماری اور اپنے شوہر کی بے پروائی اور بے مہری کا دکھڑا روتی رہیں۔ تھوڑی دیر میں بچے کو نیند آگئی اور خالہ بھی باتیں کرتے کرتے اونگھنے لگیں اس لئے وہ شام کا وعدہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے دل پر افسردگی سی چھاگئی تھی مگر کامیابی کا نشہ ایسا نہ تھا کہ اتنی جلدی اتر جاتا یہاں سے وہ اپنے پرانے ہم سبق کے یہاں پہنچا۔ دیکھا کہ وہ اپنی بیٹھک میں منہ ڈھانپے پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں۔ سلیم سمجھا کہ سو رہے ہیں مگر وہ اس کے پیروں کی آہٹ سے اُٹھ بیٹھے اور مری ہوئی آواز میں کہنے لگے " تم خوب آگئے ہیں تو سہ پہر کو تمھارے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا " سلیم نے دیکھا کہ ان کے چہرہ کا رنگ اڑا ہوا ہے۔ آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے ہونٹ خشک ہیں۔ اس نے گھبرا کر پوچھا " خیر تو ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں " کہنے لگے " سلیم کیا بتاؤں میں تو زندگی سے عاجز آگیا ہوں اس روز روز کی مصیبت سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے والد کے انتقال کے بعد گھر بار سنبھالنے کے لئے میں نے پڑھنا چھوڑا مگر اس بوجھ نے میری کمر توڑ دی ۔ میرا جیسا مرنجا مرنج آدمی اور سابقہ اس کنبے سے جس میں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے ۔ مردوں کو تو میں کسی نہ کسی طرح ٹھیک کر لیتا ہوں مگر عورتوں کا کیا علاج کروں آج کا قصہ سنو۔ میری بیوی سے اور والدہ صاحبہ سے مدت سے لڑائی ٹھنی ہوئی ہے بات چیت ترک تھی صبح کو ذرا سی بات پر دونوں آپے سے باہر ہوگئیں وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ یا اللہ تیری پناہ ۔مختصر یہ کہ بیوی ڈولی منگا کر میکے چلی گئیں والدہ کوٹھری کی کنڈی لگا کر بیٹھ رہیں ۔گھر میں آگ تک نہیں سلگی ۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہیں، چچا صاحب کو گاؤں سے بلوایا ہے کہ والدہ کو سمجھائیں یہ قصہ طے ہو جائے تو میں بیوی کے

یہاں جاؤں۔ وہاں جو کچھ پیش آئے گا اس کے خیال سے دل لرزتا ہے۔ خیر خدا مالک ہے" بر سر اولادِ آدم ہر چہ آید بگزرد" سلیم بڑی دلسوزی سے اولادِ آدم کے درد کی داستان سنتا رہا وہ ان معاملات میں بالکل ناتجربہ کار تھا۔ والدہ اس کے چھٹ پنے میں انتقال کر چکی تھیں۔ رہی اس کی بیوی سو اس سے ابھی تک لڑائی تو ایک طرف خفیف سی رنجش کی بھی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہ کن الفاظ میں تعزیت کرے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تقدیر نے اس کی مدد کی اور عین اسی وقت ایک بیل گاڑی بیٹھک کے سامنے آکر رکی جس میں اولادِ آدم کے چچا کی سفید داڑھی نظر پڑی اس کے حق میں وہ اس وقت رجال غیب سے کم نہیں تھے۔ موقع کو غنیمت سمجھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور چچا کو سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

خوشی کی جگہ اسے غصہ آ رہا تھا۔ اور وہ سیدھا گھر جانے کا قصد کر رہا تھا۔ مگر اس کے نئے دوست کا مکان رستے میں پڑتا تھا۔ اس نے سوچا۔ چلو انھیں بھی دیکھتے چلیں۔ شاید انھیں سے دل کی بات کہنے کا موقع مل جائے اس نے ان کی گلی میں قدم رکھا تھا کہ وہ حضرت خود لمبے لمبے ڈگ بھرتے اسی طرف آتے نظر آئے سلیم وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ قریب آکر صاحب سلامت کے بعد انھوں نے انتہائی سراسیمگی کے انداز میں فرمایا "سلیم صاحب معاف کیجئے گا میں اس وقت بڑی جلدی میں ہوں نوکر مردود نے مجھے لوٹ لیا۔ کیش بکس توڑ کر ساری رقم اڑا لے گیا۔ بیس گڈیاں تو دس' دس کے نوٹوں کی تھیں۔ روپیہ کی تعداد ٹھیک یاد نہیں میں ابھی گھر میں آیا تو معلوم ہوا۔ تھانہ پر رپٹ لکھوانے جا رہا ہوں آپ چل کر بیٹھئے میں پانچ منٹ میں حاضر ہوتا ہوں آپ کو سارا قصہ تفصیل سے سناؤں گا"

اب سلیم کو ضبط کی تاب نہیں رہی اور وہ دل ہی دل میں برس پڑا" لعنت ہے اس ملک پر جس میں غم کا شریک تو ایک طرف، کوئی خوشی کا ساتھی بھی نہیں ملتا۔ اور پھر کسی میں اتنا حوصلہ نہیں کہ مصیبت کو ہنسی میں ٹال دے یا چپ چاپ سہہ لے۔ جہاں دیکھئے شکوہ و شکایت' آہ و زاری' نالہ و فریاد' سب زخمی اور سب کو اپنے زخموں کی نمائش کا شوق۔ سب درد میں مبتلا اور سب کو کراہنے کی عادت۔ اس ہر وقت کی ہائے ہائے میں کوئی شخص جس کے دل میں دوسروں کا درد ہو کس طرح خوش رہ سکتا ہے۔ انسان اپنی تکلیفوں پر صبر کرے مگر دوسروں کی تکلیفوں پر کیسے صبر کرے۔ غم و غصہ کی اس فضا میں ہمت' اولوالعزمی' بلند خیالات

اعلیٰ مقاصد کیونکر پنپ سکتے ہیں۔ کہنے والا کہتا ہے۔ "خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی" فرض کا احساس خدمت کی لگن۔ پیدا کرو تو کلفت میں راحت، درد میں لذت پاؤ گے۔ زندگی کی تلخیاں شربت کے گھونٹ بن جائیں گی مگر:-

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

اس عمر میں جسے جوانی کہتے ہیں تھوڑی سی نشاط طبع تھوڑی سی خوش دلی، ذرا سی ہمت افزائی، ذرا سی دلدہی کے بغیر محنت و ترقی ناممکن ہے۔ میں نے جن جن مصیبتوں سے بی اے تک پڑھا انھیں میں جانتا ہوں یا خدا جانتا ہے۔ آج اس محنت کا ثمر حاصل ہوا اتنی بڑی خوشی کو میں تنہا کیونکر سمیٹتا کیا میں اس کا مستحق نہیں تھا کہ کوئی اس خوش خبری کو سن کر مجھے مبارک باد دیتا۔ مگر جن سے اس کی اُمید تھی ان سے سخت مایوسی ہوئی کسی نے میری خوشی کا بوجھ نہیں بٹایا سب نے اپنے رنج کا بوجھ مجھ پر لاد دیا۔ ایک مرزا صاحب رہ گئے ہیں ان کے یہاں جاؤں تو خدا جانے کیا منظر دیکھنے میں آئے شاید ان کو کسی نے قتل کر دیا ہو یا زیادہ قرین قیاس ہے کہ اُنھوں نے کسی کی گردن مروڑ دی ہو۔ نہیں اس شہر میں، اس ملک میں خوش ہونا جرم ہے اسے ظاہر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ چھپانا چاہیئے، انگریزی مثل ہے " ہنسنے والے کے ساتھ دنیا ہنستی ہے۔ رونے والا اکیلا روتا ہے" مگر ہماری دنیا اُلٹی ہے۔ رونے والے کے ساتھ روتی ہے ہنسنے والے کے پاس نہیں پھٹکتی روئے جا اے بدنصیب ہندوستان، تیری قسمت میں رونا ہی لکھا ہے ...."

ان خیالات میں غرق سلیم اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ یکایک اسے اسکول کے بچوں کی ایک ٹولی نظر آئی جن میں اس کا خالہ زاد بھائی محمود بھی تھا۔ محمود نے اسے دیکھکر سلام کیا اور اس کی طرف بڑھا سلیم اس سے کہہ چکا تھا کہ نتیجہ کا تار آنے والا ہے۔ قریب آکر اس نے اشتیاق کے لہجے میں پوچھا " کہئے بھائی جان تار آگیا؟"

سلیم نے کسی قدر تامل کے بعد جواب دیا " ہاں دوپہر کو تار آیا میں پاس ہوگیا .... اول درجہ میں"

محمود کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا " مبارک ہو بھائی جان۔ لائیے مٹھائی کھلوائیے۔ اچھا اب آپ کو کس درجہ میں

ترقی ملے گی؟" سلیم اس بھولے پن کے سوال پر مسکرایا" ترقی؟ بھئی بی اے کے بعد تعلیم کی ایک منزل ختم ہو جاتی ہے کوئی چاہے تو ایم۔ اے' یا قانون کے درجہ میں داخل ہو جائے۔ میں نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا خیر اب تم گھر جاؤ خالہ انتظار میں ہونگی۔ میں شام کو تمھارے لئے مٹھائی لے کر آؤں گا" محمود خوش خوش اپنے ساتھیوں میں جا کر مل گیا۔ شاید اس نے ان پر رعب گانٹھنے کے لئے اپنے بھائی کی کامیابی کی خبر سنائی ہوگی سلیم کے کان میں ایک لڑکے کی آواز آئی" اجی یہ نفرے کسی اور کو دو۔ بی۔ اے میں اوّل آنے والے کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے" سب لوگوں نے سلیم کی طرف غور سے دیکھا اور منہ پھیر کر زور سے قہقہہ لگایا سلیم کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی مگر اب اس کی طبیعت کی لے بدل چکی تھی۔ جذبۂ مسرت جو کچھ دیر کے لئے غصہ کے جوش میں دب گیا تھا ابھر آیا۔ اس کے دل میں خاموش خطابت کا طوفان پھر اٹھا۔ مگر اب ہوا کا رُخ اور تھا" شکر ہے نوجوان ہندوستان ابھی غم اور غم پرستی کے زہر سے محفوظ ہے۔ اس کی رگوں میں شوخی اور زندہ دلی کا خون دوڑتا ہے۔ اس میں ہنسنے کا ذوق اور ہنسنے کی قوت باقی ہے۔ اسے دیکھ کر کچھ اُمید ہوتی ہے کہ یہ زندگی کی کڑیاں ہنس کھیل کر سہے گا۔ مشکلوں کا مقابلہ مردانہ وار کرے گا۔ ایسے رفیق کے بل پر انسان کارزارِ حیات میں قدم رکھ سکتا ہے ؎

اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم"

سلسلہ خیال یہاں تک پہنچا تھا کہ اس کی نظر حلوائی کی دکان پر جا پڑی اسے محمود کا مٹھائی کا تقاضا یاد آگیا اور بھوک کی شدت بھی محسوس ہوئی کیونکہ اس نے دوپہر کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک روپیہ کی گرما گرم جلیبیاں خریدے کچھ خود کھائے کچھ میاں بدھو کی نظر کرے۔ اور باقی شام کو محمود کے لئے لے جائے۔ وہ حلوائی کی دکان کی طرف بڑھا اور ہندوستان کے مستقبل کے فکر جلیبیوں کے پیچ میں غائب ہو گئے۔



ہندوستان کا رزرو بنک

پچھلے دنوں رزرو بنک کا سارے ہندوستان میں بڑا چرچا رہا۔ اسمبلی میں کئی سال تک اس کے مسودہ قانون پر گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ جو لوگ ہندوستان کے دستور میں اصلاح کی تجویزوں پر غور کر رہے تھے اُنھوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں کہا کہ رزرو بنک کا قائم ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے بین الاقوامی منڈیوں میں ہندوستان کا ساکھ قائم نہ ہو سکے گا اور بے ساکھ کے نئی حکومت کے مالیہ میں توازن قائم ہونا دشوار ہو جائے گا۔ آخر کار رزرو بنک ایکٹ منظور ہوا۔ سر سکندر حیات خاں سابق گورنر پنجاب اس کے ڈپٹی گورنر بنائے گئے۔ نواب مزمل اللہ خاں اور آدم حاجی محمد سیٹھ اور دوسرے ہندوستانی اس کے مرکزی بورڈ کے رکن ہوئے اس کے حصے فروخت ہوئے۔ اُن بنکوں میں جہاں حصوں کی خریداری کے لئے درخواستیں لی گئیں لوگ ٹوٹ پڑے۔ بنک کو جتنے روپیہ کی ضرورت تھی اس سے زیادہ کی درخواستیں آگئیں۔ اخباروں میں ہر ہفتہ پچھلے جمعہ تک کا جمع قرض کا چٹھا نکلنے لگا جو اور بنکوں کے جمع قرض کے چٹھوں سے اس اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کہ عام بنکوں کا صرف ایک یکجائی چٹھا ہوتا ہے لیکن اس کا چٹھا دو علیحدہ علیحدہ شعبوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اول اجرائے سکہ کا شعبہ اور دوسرا ساہوکارے کا شعبہ۔ دوسرا تو تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے جیسا اور تمام بنکوں کا لیکن پہلے کے علیحدہ دینے کی کیا ضرورت ہے اور رزرو بنک کا سکہ کے اجراء سے کیا تعلق ہے۔ ہندوستان میں تو سکہ سازی کا کام طرف حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ اس بنک کو یہ خدمت کیوں سپرد کر دی گئی۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوال پیدا ہوتے ہیں اور طبیعت میں جستجو ہوتی ہے کہ معلوم کیا جائے کہ رزرو بنک کسے کہتے ہیں۔ اس کی عام طور پر کیا خصوصیات ہوتی ہیں اور ہندوستان کے رزرو بنک کی کیا امتیازی خصوصیات ہوں گی۔ ہندوستانی قوم پرستوں کا کیا مطالبہ تھا اور حکومت نے کس قسم کا بنک قائم کیا ہے۔ حکومت سے اس کا کیا تعلق ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ صفحات مابعد میں کوشش کی جائے گی کہ اس قسم کے تمام مسائل کے متعلق بحث کی جائے اور رزرو بنک کا ایک صحیح تخیل پیش کیا جائے۔

رزرو بنک کسے کہتے ہیں "رزرو" کے معنی انگریزی میں محفوظ کے ہیں ۔ مثلاً "رزرو" پولس یا "رزرو" فوج سے مراد یہ ہے کہ ایسی پولس یا فوج جو کسی آڑے وقت کے لئے محفوظ رکھی جاتی ہے ۔ جب معمولی پولس یا فوج سے کام نہیں چلتا تو جو پولس یا فوج محفوظ ہوتی ہے اُسے بلایا جاتا ہے ۔ اسی طرح افراد، کمپنیاں، بنک اور انجمنیں اپنا تمام سرمایہ کاروبار میں نہیں لگا دیتیں بلکہ کچھ "محفوظ" رکھتی ہیں تاکہ تنگی اور مشکل کے وقت جب روزانہ کی آمدنی سے مطالبات پورے نہ کئے جا سکیں اس محفوظ سرمایہ کو کام میں لائیں اور اپنا ساکھ قائم رکھ سکیں ۔

عہد جدید کے کاروبار اور مبادلہ کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں سونے یا چاندی کے استعمال میں بہت کفایت سے کام لیا جاتا ہے ۔ سونا چاندی چونکہ ہر شخص کے لئے قابل قبول ہے اس لئے بہترین ذریعہ مبادلہ ہے ۔ خرید و فروخت میں اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن کاروباری لوگ جہاں تک ہو سکتا ہے سونے چاندی کی شکل میں ادائیگی کو ملتوی کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چاندی سونے کا ذرا سا ٹکڑا اگر اپنے پاس ہوتا ہے تو اُسے مختلف آدمیوں کو دکھا دکھا کر اُن کا اعتبار و اعتماد حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کم وزن ٹکڑے سے اس اعتبار کی بنیاد پر اتنا ہی کام نکالتے ہیں جتنا عدم اعتبار کی صورت میں اس سے کئی گنے زیادہ وزنی ٹکڑوں سے لیا جاتا ۔ مطالبوں کی ادائیگی جلد یا بہ دیر بہرحال کرنا ہی پڑتی ہے ۔ لیکن اعتبار کی وجہ سے وقتی طور پر زبانی یا تحریری وعدوں سے کام چل جاتا ہے اور کاروبار کو سہولت کے ساتھ وسیع کیا جا سکتا ہے ۔ پھر کاروبار کا یہ قاعدہ ہوتا ہے کہ روپیہ کی وصولیابی اور ادائیگی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے ۔ ایک کو مال قرض دیا جاتا ہے تو دوسرے سے وصول کیا جاتا ہے ۔ ایک کا قرض چکتا یا جاتا ہے تو دوسرے سے لیا جاتا ہے ۔ ایسے مواقع کم یا بالکل نہیں ہوتے کہ ادا تو سب کو کرنا ہو لیکن وصول کسی سے نہ ہوتا ہو ۔ ہر روز، ہر مہینہ، اور ہر سال کے لئے ایک رقم اپنے اور دوسرے کاروباری لوگوں کے تجربہ سے ایسی متعین کر لی جاتی ہے (مثلاً پانچ فیصدی، دس فیصدی، پندرہ فیصدی) جس کی موجودگی میں اطمینان ہوتا ہے کہ سب مطالبے آسانی سے نبٹائے جا سکیں گے ۔ بس اس رقم کے برابر سونا چاندی یا ایسا سکہ جو سونے چاندی کے مساوی سمجھا جاتا ہو محفوظ

رکھ لیا جاتا ہے اور بے فکری سے کاروبار کو جاری رکھا جاتا ہے۔ اب جب تک تخمینہ غلط ثابت نہ ہو یا غیر معمولی حالات کی وجہ سے ایک دم مطالبوں میں خلاف توقع اضافہ نہ ہو جائے کاروبار ٹھیک چلتا رہے گا ورنہ کسی ایک شخص کا مطالبہ بھی اگر وقت پر ادا نہ ہوا تو ہوا اُکھڑ جائے گی۔ ٹاٹ اُلٹنا پڑے گا اور سارا کاروبار بیٹھ جائے گا۔

کم سونے چاندی اور پونجی سے زیادہ رقموں کے کاروبار چلانے کا لالچ ایسا ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ پھر تجارت و صنعت کی دوڑ میں لوگ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی فکر میں کچھ ایسے لگے رہتے ہیں کہ ہر طرح کی چوکسی اور آگے کا خیال چھوڑ دیتے ہیں۔ سرمایۂ محفوظ کا تناسب گھٹتے گھٹتے خطرناک حد تک پہنچ جاتا ہے اور جہاں ایک کا دوالا نکلا سارے بازار والوں کا دوالہ نکل جاتا ہے لوگ جلد باز ہوتے ہیں اُنھیں اس بات کے معلوم کرنے کی فرصت اور پروا نہیں ہوتی کہ قرض دار میں قرض کے ادا کرنے کی اہلیت ہے یا نہیں۔ اگر انتظار کیا جائے گا تو اس سے روپیہ وصول ہو سکے گا یا نہیں پھر اُنھیں خود اپنے قرضوں کی ادائگی کی فکر سوار ہوتی ہے اور جو ہلّڑ مچتا ہے اور آپا دھاپی ہوتی ہے وہ قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ کسی کو کسی کا اعتبار نہیں رہتا۔ سارا کاروبار ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہزاروں خاندان برباد، گھر اور کارخانے ویران اور لوگ بے روزگار ہو جاتے ہیں۔

جس طرح افراد، فرداً فرداً اس طرح کی بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ کمپنیاں اور بنک مشترکہ طور پر کرتے ہیں اور حکومتیں بھی اس قسم کی ناعاقبت اندیشیوں سے باز نہیں رہتیں۔ افراد کی بے احتیاطیوں کا انجام جب اس قدر زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے تو بڑے دلالوں، کمپنیوں، بنکوں اور حکومتوں کی بے احتیاطیوں کا خمیازہ تو کل ملک بلکہ ساری دنیا کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اس لئے ضرورت اس بات کی محسوس کی جاتی ہے کہ ہر ملک میں ایک بنک کم از کم ایسا ہو جس کو اپنے ذاتی نفع سے زیادہ اجتماعی مفاد کا خیال ہو اور جو وقتی فایدہ کے لالچ میں حزم و احتیاط کے اصول کو ہاتھ سے نہ دے اور تمام ملک کی منڈیوں، کاروباری لوگوں، بنکوں، کمپنیوں اور نیز حکومت کے لین دین پر اتنا اثر و اقتدار رکھے کہ انھیں کبھی حدود احتیاط سے متجاوز نہ ہونے دے۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی

کل ہونا چاہئے کہ جسے جہاں ذرا سا مروڑا اور فوراً ملک کے تمام اعتبار و اعتماد کی وزنی گاڑی تیز یا آہستہ ہو گئی ۔ یہ کام رزرو بنک کا ہے اور یہ رزرو بنک اس لئے کہلاتا ہے کہ ملک کے تمام بنکوں اور حکومت کا سرمایہ محفوظ اس کے پاس جمع ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات بہت وسیع ہوتے ہیں ۔ یہ نیا کاغذی سکہ بنا سکتا ہے ۔ غیر ملکوں سے اپنے اعلیٰ اعتبار پر بڑی بڑی رقموں کے قرض لے سکتا ہے اور اپنے ان زبردست وسائل کی بنا پر پوری اہمیت رکھتا ہے کہ جب حکومت اور ملکی بنک مخمصے میں پڑے ہوں تو انہیں سہارا دے اور ان کی مشکل آسان کر سکے ۔

سرکار، غیر ملکی سرمایہ دار اور قوم پرست ہندوستانی کو رزرو بنک سے فایدہ

رزرو بنک کا مطالبہ ہندوستانی قوم پرستوں، برطانوی رجعت پسندوں اور سرکار تینوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ترقی اور رجعت دونوں پہلو شامل تھے ۔ ہندوستانی قوم پرست موجودہ حکومت کے انتظام سے مطمئن نہیں تھے اس لئے وہ حکومت کی جگہ رزرو بنک سے ملکی سکہ، مبادلہ اور سرکاری لین دین کا کام کرانا چاہتے تھے ۔ برطانوی سرمایہ داروں کو مستقبل کی ہندوستانی قومی حکومت کی طرف سے خطرہ تھا اس لئے وہ ان کاموں کو حکومت کے ہاتھ سے نکال کر ایک آزاد، محفوظ اور لائق اعتماد ادارے کو سپرد کرنا چاہتے تھے جس پر سیاسی جماعتوں کے وقتی عروج و زوال کا کوئی اثر نہ پڑ سکے ۔ موجودہ ہندوستانی حکومت جب یہ کہتی تھی کہ مجھے بین الاقوامی منڈیوں میں ہندوستان کے ساکھ اور اعتبار کی فکر ہے تو اس کے دل میں بھی ہندوستانی قوم پرستوں کی طرف سے اندیشہ پایا جاتا تھا ۔ قوم پرستوں نے اکثر کہا ہے کہ موجودہ سرکار کے تمام قرضے ادا کرنے کے لئے ہندوستان پابند نہیں ہے ۔ کانگریس نے سرکاری قرضوں کی تحقیقات کے لئے کمیٹی مقرر کر کے اس بات کو بھی اشارتاً بتا دیا تھا کہ کس قسم کے قرضوں کی ادائگی سے آئندہ کی قومی حکومت منحرف ہو جائے گی ۔ اس قسم کی گفتگوؤں سے غیر ملکی قرضخواہوں کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور وہ سرکاری قرضے کی دستاویزوں کو بازار میں بیچنا شروع کرتے ہیں جس سے ان دستاویزوں کی قیمت گھٹنا شروع ہوتی ہے اور سرکار کی آبروریزی ہوتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باہر کے لوگ ہمارے رقعہ اور دستاویز کو ٹکے دمڑی کے بھاؤ بھی نہ خریدیں اور ہمارا شمار دوالیہ حکومتوں میں ہونے لگے ۔

انتقال حکومت کے زمانہ میں یہ چیز خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے۔ فرض کیجئے سرکار اور مجلس مقننہ کی قوم پرست جماعت میں کسی بات پر اختلاف رائے ہوجائے۔ بات اس قدر بڑھے کہ دستور کو معطل کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ قوم پرست جواب کے طور پر عدم ادائیگی محاصل کی تحریک شروع کردیں۔ سرکار کو مالی دشواری ہو اور ان غیر معمولی حالات میں وہ باہر سے قرض لینا چاہے اور اس موقع پر قوم پرست تمام سرکاری قرضوں سے اپنی بریت کا اعلان کردیں تو سرکار کے لئے یہ ایک بڑی آزمائش کا وقت ہوجائے اس میں شک نہیں کہ قوم پرستوں کی اس حرکت سے صرف سرکار ہی کے اعتبار کو نہیں بلکہ کل ملک کے اعتبار کو سخت نقصان پہنچے گا اور آیندہ قوم پرستوں کی حکومت کسی اپنے مشکل کے وقت قرضہ لینا چاہے گی تو اُسے بھی نہ ملے گا لیکن چونکہ انتہا پسند کانگریسی آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں اس لئے وہ اس طرف سے لاپروا ہیں۔ لیکن سرکار اور قدامت پرستوں کی جمیعت چونکہ چیزوں کو اپنی حالت پر قائم و برقرار رکھنے میں ہے لہذا وہ ایک ایسے ادارے کا قیام نہایت ضروری سمجھتے تھے جو وقتی سیاسی شورشوں اور ہنگاموں سے بغیر متاثر رہ کر ملکی اور غیر ملکی ساکھ اور اعتبار کے کام کو چلاسکے۔

اس لئے سرکار کے نزدیک تو زرزر و بنک کو زیادہ اہمیت صرف اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے سکہ مبادلہ اور قرض کے انتظام کو قوم پرست جماعتوں کی مداخلت سے محفوظ رکھا جاسکیگا۔ اس کے دوسرے فوائد اس کے نزدیک ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں مگر قوم پرست ان ضمنی فواید کو ہی اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ وہ رزرو بنک سے ملک کی تجارتی، صنعتی اور زراعتی ترقی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ تجارت، صنعت و زراعت کو آج کل ضرورت کے وقت کم شرح سود پر روپیہ نہیں ملتا۔ اس لئے ترقی کے بہت سے کام شروع نہیں کئے جاسکتے۔ ملک میں بنک کا کاروبار بہت کم پھیلا ہوا ہے دیسی ساہوکار انفرادی طور پر گراں شرح سود کے ساتھ زیادہ تر غیر دولت آفریں اغراض کے لئے قرضے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ منتشر ہیں اور ایک شیرازہ میں باہم منسلک نہیں ہیں اس لئے کم سونے چاندی سے (اعتبار کے سہارے پر) زیادہ سرمایہ کا کام نہیں لے سکتے اور ایک ہی روپیہ کو چار مختلف کاموں میں بہ یک وقت نہیں لگا سکتے۔ انجمن ہائے امداد باہمی اور رہنی بنکوں کی توسیع

میں بھی سرمایہ کی کمی کی وجہ سے دشواریاں ہیں۔ پھر جو بنک کسی نہ کسی طرح قائم ہوتے ہیں وہ مشکل کے وقت سہارا نہ ملنے کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔ قوم پرست ایک تو اس خرابی کو رفع کرنا چاہتے ہیں دوسرے وہ حکومت کی مبادلہ اور سکہ سازی کی پالیسی کو ہندوستان کی تجارت وصنعت کے لئے سخت مضر سمجھتے ہیں۔ وہ حکومت پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ گذشتہ تیس چالیس سال سے اُس نے دانستہ طور پر ہندوستانی سکہ، مبادلہ، باہر سے روپیہ قرض لینے اور تمام بیرونی مطالبات کی ادائیگی کا انتظام اس طرح کیا ہے جس سے ملکی صنعتوں، تجارتوں اور محصول ادا کرنے والوں کو تو نقصان پہنچا ہے۔ مگر برطانیہ کے کاروبار کو فروغ حاصل ہوا ہے۔ اُنھیں موجودہ حکومت پر بالکل بھروسہ نہیں ہے اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ جو کام اب حکومت کر رہی ہے وہ رزرو بنک کو سپرد کر دیا جائے۔

القصہ جہاں تک رزرو بنک کے محض مطالبہ کا تعلق ہے غیر ملکی سرکار اور سرمایہ دار اور ہندوستانی قوم پرست دونوں متحد الخیال ہیں۔ لیکن جب سوال یہ پیش ہوتا ہے کہ رزرو بنک کس طرح کا ہو تو اس میں رائے کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کام تو ایسے ہیں جن سے دونوں کا مفاد وابستہ ہے اور کیسا ہی رزرو بنک کیوں نہ بنایا جائے اس میں نسبتی اہمیت کے اختلاف کے ساتھ وہ کام بہر حال کئے جائیں گے لیکن بہت سے ایسے اہم کام ہوں گے جن میں دونوں کے اغراض ومفاد میں بُعدالمشرقین پایا جائے گا اور کسی قسم کی مفاہمت اور مصالحت کی گنجائش نہ ہوگی۔ جو چیز ایک طبقہ کے لئے غذا کا کام دے گی دوسرے کے لئے زہر کی تاثیر رکھے گی۔ اس لئے جو دستور العمل اور افسران وعملہ ایک طبقہ کے لئے پسندیدہ ہوگا دوسرے کے لئے اس کا پسندیدہ ہونا لازمی نہیں ہے۔ نئے قائم شدہ رزرو بنک کے دستور العمل پر تو بعد میں بحث کی جائیگی یہاں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ایسے بنیادی مسائل سے واقفیت پیدا کرادی جائے جن کے بغیر رزرو بنک کے اغراض ومقاصد کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔

ساکھ کے کاروبار اور اجرائے سکہ میں باہمی ربط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ عہد جدید کے کاروبار میں اعتبار کا عنصر بہت غالب ہے یعنی لوگوں کے زبانی وتحریری وعدوں کو کچھ عرصہ کے لئے اتنا ہی وقیع سمجھا جاتا ہے جتنا ٹھوس سونے اور چاندی کو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ذرا سے شک وشبہ سے ساکھ کا سارا

کاروبار بیٹھ جاتا ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی بہت زیادہ محسوس کی جاتی ہے کہ اعتبار کی یہ عظیم الشان عمارت کسی مستحکم بنیاد پر قائم ہو تاکہ بے اعتمادی کے معمولی ہچکولوں کا تو کم سے کم بالکل اثر قبول نہ کرے۔ یہ مستحکم بنیاد کیا ہو سکتی ہے؟

سب سے زیادہ مستحکم تو وہ بنیاد ہوگی جو ہر جگہ، ہر وقت اور ہر حالت میں لوگوں کے اعتماد کو قائم رکھ سکے۔ ظاہر ہے اس حیثیت سے سب سے زیادہ مکمل سونا چاندی اور اس کے خالص اور بے میل سکے ہیں جو ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنی قدر ذاتی کی وجہ سے عام طور پر ہر شخص کے لئے لائق قبول ہوتے ہیں۔ یہ تو سب سے زیادہ مستحکم بنیاد تمام ساکھ کی ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ سونے چاندی کی مقدار محدود ہے اور یہ دھاتیں قیمتی ہوتی ہیں اس لئے ان کے استعمال میں کفایت ضروری ہوتی ہے اور محض ان کی بنیاد پر کاروبار کو زیادہ وسیع نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کوئی دوسری چیز اور تلاش کی جائے جس کی عام مقبولیت ملک سے باہر اگر نہیں تو کم از کم ملک کے اندر سونے چاندی کے قریب قریب ہو۔ تجربہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ سرکار یا مرکزی بنک کے نوٹوں کے قبول کرنے میں بھی عام طور پر لوگوں کو کوئی تامل نہیں ہوتا۔ اور ملک میں یا جہاں جہاں ملکی سرکار اور اس کے مرکزی بنک کا ساکھ زیادہ ہے کاغذی نوٹ اپنی اعتباری قیمت پر چلتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ کاغذی نوٹ محض سونے چاندی کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی مساوی قیمت کا سونا چاندی ہمیشہ سرکاری خزانوں یا بنکوں میں محفوظ ہوتا ہے ورنہ عموماً ان کی مساوی قیمت کا سونا چاندی سرکاری خزانوں اور بنکوں میں نہیں ہوتا۔ لیکن اتنا کافی سرمایہ محفوظ ان کی پشت پناہی کے لئے ضرور ہوتا ہے کہ انھیں بھی تقریباً سونے چاندی کی نمائندگی حاصل ہوتی ہے اور چونکہ سب آدمی بہ یک وقت اپنے کاغذی سکوں کے معاوضہ میں سونا چاندی طلب نہیں کرتے اس لئے سب اپنی ضرورت کے وقت ہمیشہ آسانی سے انھیں سونے چاندی میں منتقل کر سکتے ہیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ کاغذی سکوں کے جس حصہ کے لئے مساوی قیمت کا سونا چاندی خزانہ میں موجود نہیں ہوتا اس کی مقدار میں اضافہ حکومت یا بنک من مانے طریقہ پر کر سکتے ہیں کیونکہ اگر ایسا کریں تو اُن کا کاغذی سکہ بازار میں کبھی بھی اُس نرخ پر نہ چل سکے جس پر سونے چاندی کے سکے چلتے ہیں۔ پبلک کی نگاہ میں جتنا اپنا ساکھ دیکھا جاتا ہے اتنا ہی نیا کاغذی

(اعتباری) سکہ جاری کیا جاتا ہے۔ پبلک کے ساکھ کا اندازہ سرکاری تمسکات کی فروخت سے کیا جاتا ہے جتنے تمسکات پبلک خریدتی ہے۔ اجرائے سکہ کے جمع قرض کے حساب میں ان کا شمار "جمع" میں اور نئے کاغذی نوٹوں کا "قرض" میں کیا جاتا ہے۔ جمع قرض کے حساب میں توازن رہنا نہایت ضروری ہے ورنہ نوٹوں کی کوئی قیمت نہ رہیگی۔ پھر چونکہ سرکار کا ساکھ عموماً بازار میں تمام دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے تمسکات کو سونے چاندی کے ہم پلہ سمجھا جاتا ہے اور انھیں "طلائی حاشیہ والے تمسکات" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لئے جو نوٹ ان تمسکات کی ضمانت پر جاری کئے جاتے ہیں وہ ہر شخص کے لئے ایسے ہی قابل قبول ہوتے ہیں گویا ان کی پشت پناہی پر سونا چاندی موجود ہیں۔ غرضکہ یوں ساکھ کے کاروبار کی پوری عمارت سونے چاندی اور کاغذ کے سکوں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ "ساکھ کی عمارت" کا کیا مفہوم ہے۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ کاروباری لوگ جہاں تک ممکن ہے اپنا روپیہ پھنسانا نہیں چاہتے بلکہ اُسے گردش میں رکھنا چاہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر کسی کو مال فروخت کرتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ کسی طرح فوراً نقد دام وصول کرلیں۔ اگر خریدار سے نقد دام فوراً وصول ہونے کا امکان نہیں دیکھتے تو کوشش کرتے ہیں کہ اس سودے کی ضمانت پر کسی تیسرے آدمی سے نقد روپیہ فوراً لے لیں یا کم از کم بازار میں اپنا اتنا اعتبار پیدا کرلیں کہ اُنھیں مال اودھار ملتا رہے تاکہ خرید و فروخت کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ نہ ہو کہ ایک دو سودوں پر ہی انحصار کرکے کئی دن تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیکار بیٹھنا پڑے، مال کے روانہ کرنے، پہنچنے، وصول کرنے اور اس کے دام ادا کرنے میں وقت لگتا ہے۔ اگر اس وقت کا خیال کرکے فروشندہ منافع کی شرح میں اضافہ کرتا ہے تو خریدار مال خریدنے میں پس و پیش کرنے لگتا ہے اور اگر اضافہ نہیں کرتا ہے تو اپنی محنت اور روپیہ کے اتنے عرصہ تک بے کار رہنے کا فروشندہ کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے وہ اس بات پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ اگر اپنے روانہ کئے ہوئے مال کی قیمت اُسے فوراً مل جائے یا اُس قیمت کے برابر بازار والوں میں اس کا ساکھ قائم ہو جائے تو وہ اپنے پورے مطالبہ میں تھوڑی سی کتر بیونت یعنی کٹوتی کو بھی گوارا کرے گا۔ اس سے

جو خفیف نقصان ہوگا اُس کی بہت زیادہ تلافی نئے خریداروں کو مال روانہ کرنے اور ایک ہی روپیہ سے اتنی مدت میں کئی سودے کرنے سے ہو جائے گی اور اس کے منافع کی مجموعی شرح بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

مطالبوں کی ادائگی میں جو دیر لگتی ہے اور اس کی وجہ سے جو روپیہ ایک ہی سودے میں پھنس کر رہ جاتا ہے اُسے گردش میں لانے کی تدبیر ہر کاروباری شخص اپنی جگہ پر سوچتا ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ مگر جو طریقہ عام طور پر ہر جگہ اختیار کیا گیا ہے وہ "ہنڈیوں کی کٹوتی" کا ہے۔ مقروض کے نام قرضخواہ کی جانب سے مطالبہ کی ادائگی کے لئے جو تحریر لکھی جاتی ہے اس کا نام ہنڈی ہوتا ہے۔ ہنڈیاں "درشنی" اور "میعادی" دو طرح کی ہوتی ہیں۔ اگر مطالبہ کی ادائگی فرمائش دیکھتے ہی کرائی جاتی ہے تو وہ "درشنی ہنڈی" کہلاتی ہے اور جو تین، چھ یا نو مہینے بعد کرائی جائے تو وہ "میعادی" کہلاتی ہے قرضخواہ یا ان کے دلال وغیرہ اپنی ہنڈیاں لے کر نکلتے ہیں اور ساہوکاروں یا بنکوں سے کہتے ہیں کہ اپنی کٹوتی کا حق کاٹ کر ہنڈی کے برابر نقد روپیہ انھیں دیدیں یا اس قدر روپیہ کا ہمارا ساکھ تسلیم کرلیں۔ بنک عموماً دوسری صورت اختیار کرتے ہیں۔ بنکوں کے یہاں قرضخواہوں کی امانتیں عموماً جمع ہوتی ہیں۔ ان کی امانت کے حساب میں اس رقم کا بھی اضافہ کرلیا جاتا ہے اور اس کے برابر مزید چک جاری کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے قرضخواہوں کی ہنڈی جب بنک خرید لیتے ہیں تو فوراً اقرار ادائگی کے لئے مقروض کے پاس روانہ کر دیتے ہیں اور جب مقروض اپنے دستخط کرکے اقرار کرلیتا ہے تو اگر ان کے پاس روپیہ فاضل ہوتا ہے تو تین، چھ یا نو مہینے تک جتنی ہنڈی کی میعاد ہوتی ہے خود انتظار کرتے رہتے ہیں ورنہ بڑے ساہوکاروں اور بنکوں کے ہاتھ جن کے پاس روپیہ فاضل ہوتا ہے اپنی شرح کٹوتی سے کم شرح پر کٹوتی کراکے اس ہنڈی کو فروخت کر ڈالتے ہیں۔ لیکن ان بڑے بنکوں کے یہاں سے بھی عموماً نقد ادائگی نہیں ہوتی بلکہ فروخت کرنے والوں کے امانت کے حساب میں یہ رقم درج کرلی جاتی ہے اور انھیں چک جاری کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاآنکہ نوبت سب سے بڑے بنک تک پہنچتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہنڈیوں کی کٹوتی کرنے کے بعد ان کی قیمت کی ادائگی کے لئے چھوٹے بنکوں سے لے کر بڑے سے بڑے بنک عموماً ایک ہی طریقہ اختیار کرتے ہیں یعنی فروشندہ کو اپنے نام ہنڈی

کی رقم کے برابر چکوں کے جاری کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فروشندہ کو تمام رقم کی فوراً ضرورت پیش نہیں آتی۔ رفتہ رفتہ وہ بنک کے نام چک جاری کرکے اس رقم کو وصول کرتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن کو چک دئے جائیں ان کا حساب بھی بنک میں ہو، اس لئے بنک کو انھیں نقد روپیہ ادا نہ کرنا پڑے اور ایک شخص کے حساب میں سے دوسرے کے حساب میں رقموں کے منتقل کرنے سے کام چل جائے پھر یہ بھی ہو سکتا ہو کہ لوگوں کو بنک پر اعتماد ہو اور اس کے نام جو چک ہو اُسے سرکاری نوٹ کے برابر وقیع سمجھتے ہوں اور اُسے فوراً نقدی میں منتقل کرانا ضروری نہ سمجھتے ہوں بلکہ باہمی مطالبات کی ادائیگی کے لئے تھوڑے عرصہ کے واسطے آپس میں منتقل کرتے رہیں۔ ان تمام صورتوں میں بنک کو اپنے چک کے معاوضہ میں فوراً چاندی سونے کے سکّے یا نوٹ دینا نہ پڑیں گے اور وقتی طور پر خود اُس کے چک سکّوں کے فرایض انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جلد یا بہ دیر لوگ سونے چاندی کے سکوں یا نوٹوں میں اپنے مطالبات کی ادائیگی کے خواہش مند ہوں گے۔ اب اگر بنک کے پاس سرمایہ محفوظ اتنا کافی ہوگا کہ وہ لوگوں کے مطالبات کو آسانی سے ادا کرسکے تو خود ادا کرے گا۔ ورنہ جو ہنڈیاں، دستاویزیں اور تمسکات وغیرہ اس کے پاس "جمع" کے طور پر ہوں گے اُن کے رہن، فروخت یا کٹوتی کرانے کی فکر کرے گا۔ اس کام کے لئے چھوٹے بنک عموماً بڑے بنکوں کے پاس جاتے ہیں۔ اب اگر ان کا اعتبار بڑے بنک کے یہاں اچھا ہے اور بڑے بنک کو روپیہ کی خود زیادہ ضرورت نہیں ہے تو انھیں سونے چاندی کے سکّے یا نوٹ مل جائیں گے ورنہ انھیں اپنی کٹوتی کی شرح میں اضافہ کرکے اپنے کاروبار کو محدود کرنا پڑے گا اور بہت سے ایسے لوگ جو نفع بخش اور معقول کاروبار میں روپیہ لگانا چاہتے ہوں گے اپنی ہنڈیاں فروخت نہ کرسکیں گے۔ ان تاجروں اور کاروباری لوگوں کے حوصلے دل ہی دل میں گھٹ کر رہ جائیں گے۔ وہ کام پھیلانا اور بڑھانا چاہیں گے۔ ان کے پاس ضمانت معقول ہوگی لیکن نہ بڑھا سکیں گے۔ ان حالات میں اگر بنک اصول حزم واحتیاط کو چھوڑکر، اپنے سرمایہ محفوظ کے تناسب کا خیال کئے بغیر ہنڈیاں کم شرح پر خریدنا جاری رکھیں گے اور ان کے ذمہ مطالبے بڑھتے جائیں گے اور جب ان سے نقد روپیہ طلب کیا جائے گا یہ نہ دے سکیں گے تو ان پر مصیبت کا وقت آجائے گا اور دوالہ نکل جانے کا اندیشہ پیدا ہوجائے گا

یہی حال درجہ بہ درجہ نسبتی فرق مراتب کے ساتھ تمام بنکوں کا ہوگا۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوا کہ ہنڈیوں کے کٹوتی کے سلسلہ کو عافیت اور اطمینان سے اُسی وقت توسیع دی جا سکتی ہے جب سونے چاندی کے سکّوں اور نوٹوں کی مقدار میں جن پر اعتبار کی پوری عمارت کھڑی کی جاتی ہے اضافہ کیا جائے۔ سونے چاندی کے سکّوں کی مقدار میں تو مالی دشواری کی وجہ سے وقت کے وقت آسانی سے اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نوٹوں کی مقدار میں اگر سرکار یا نوٹ جاری کرنے والا ادارہ منڈی کی ضرورت کی طرف توجہ کرے تو سہولت کے ساتھ اضافہ ممکن ہے۔

گھبراہٹ اور تجارتی بحران کے دنوں میں جب بے اعتباری کی وبا پھیلتی ہے اور ہر شخص سونے چاندی یا نوٹوں کی شکل میں ادائگی کا مطالبہ کرتا ہے اس وقت تو نوٹ جاری کرنے والے ادارے کا اگر اُسے یہ معلوم ہو کہ ساہوکاروں اور بنکوں کا روپیہ معقول کاروبار میں پھنسا ہوا ہے یہ ایک اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی ہنڈیوں کو خریدے اور ان کی ضمانت پر نئے کاغذی سکّہ کو جاری کرے کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو ہزاروں تاجروں اور بنکوں کا دوالہ نکل جائے گا اور ملک کے اعتباری کاروبار کو سخت صدمہ پہنچے گا۔

اس لئے اعتبار کی عمارت کو صحیح بنیاد پر قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجرائے سکّہ اور ساہوکارے میں یکجہتی اور ہم آہنگی ہو۔ سکہ جاری کرنے والے ادارے کو منڈی سے قریبی تعلق اور وابستگی ہو۔ وہ اُس کی ضروریات کا اندازہ اور تخمینہ کر سکے اور سکہ کی مقدار میں حسب ضرورت کمی بیشی کر سکے۔ یہ اُس وقت ہی ممکن ہے جب ایک ہی ادارے کے ذمہ دونوں انتظام سپرد کئے جائیں یعنی ایک ہی مرکزی بنک ساہوکارے کے اعلیٰ کام اور اجرائے سکّہ کے فرائض کو انجام دے۔

اس سے ایک دوسرا بڑا فایدہ اور بھی ہوگا۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ساہوکارے کے کام کو اطمینان سے کرنے کے لئے سرمایہ محفوظ جمع رکھنا پڑتا ہے۔ اسی طرح اعتباری سکہ کے لئے بھی سرمایہ محفوظ جمع رکھا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں سرمایہ ہائے محفوظ ایک مرکزی جگہ پر رہیں گے تو دونوں کو ایک

دوسرے سے تقویت ہوگی اور ساہوکارے اور اجرائے سکہ کے کام زیادہ مستحکم بنیاد پر کئے جاسکیں گے۔
ساہوکارے کے کاروبار اور اجرائے سکہ کے کام میں باہمی ربط دکھانے کے بعد اب ہم یہ معلوم کریں گے کہ ہندوستان میں اب تک صورت حال کیا رہ چکی ہے۔ یہاں ان دونوں کاموں میں کس قدر یکجہتی اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے کن اداروں کو یہ کام اب تک سپرد رہے ہیں اور یہاں کے انتظام میں کس قسم کی خامیاں ہیں جن کی وجہ سے ایک نئے ادارے یعنی رزرو بنک کا قیام بہت ضروری ہوگیا ہے۔ (باقی)



انقلابی جماعت اور عوام

۱۷۸۹ء اور ۱۸۷۰ء کی درمیانی مدت میں، فرانس کی حکومت سخت انقلاب انگیز دور سے گذرتی رہی متعدد خانہ جنگیاں ہوئیں، کبھی کسی طبقہ کو عروج نصیب ہوا کبھی کسی کو۔ الغرض جو قتل و غارتگری، تباہی و بربادی، اس عہد میں حریت فکر، اصلاح نوع انسانی اور امن و سکون عالم کا نام لے لے کر محارب فریقین نے جایز رکھی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ پیرس کے لوگ فطرتاً جلد مشتعل اور جنگ کے لئے فوراً طیار ہو جانے والے واقع ہوئے ہیں۔ اس لئے پیرس کے چوراہوں، سڑکوں اور گلیوں پر، اینٹ پتھر، لوہا لکڑی، خاک دھول وغیرہ وغیرہ کے انبار لگا لگا کر متعدد بار مضبوط سدیں (BARRICADES) بنائی گئیں اور باقاعدہ فوجی طریقہ پر محصور ہو کر، حکومت وقت کی فوجوں سے، انقلاب پسند جماعتوں نے جنگ کی۔ ہرچند اکثر وبیشتر ان کو ناکامی ہوئی لیکن جب وہ کامیاب ہوئیں تو انھوں نے حکومتوں کو درہم برہم کر ڈالا۔

وکٹر ہیوگو فرانس کا ایک نہایت مشہور فلسفی ادیب ہوا ہے۔ اُس نے اسی انقلابی دور کے ماحول میں اپنی زندگی کے بہت سے ایام بسر کئے تھے اور اس وقت کی بعض تحریکوں میں بھی عملی حصہ لینے کا اُسے موقع ملا تھا۔ اُس نے اس انقلابی عہد کے بعض واقعات کا نقشہ اپنے ناولوں میں کھینچا ہے۔ اس کے ایک ناول لامزرایبل کے بعض انتخابات کو ہم اس جگہ درج کرتے ہیں تا کہ اس دور کی انقلابی ذہنیت اور دیگر خصوصیات کا اندازہ، ایک فلسفی ادیب کے نقطۂ نگاہ سے ناظرین جامعہ بھی کر سکیں۔

جون ۱۸۳۲ء میں، پیرس کی شنواری سڑک پر، باغی جن کی تعداد ۲۷ تھی ایک سد بنائے ہوئے محصور ہیں۔ حکومت وقت کی فوجیں ان کی سرکوبی کے لئے مستعد ہیں۔ رات ختم ہو گئی ہے۔ صبح نمودار ہونے والی ہے۔ اندرون حصار کی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے، وکٹر ہیوگو ایک جگہ لکھتا ہے:-

انقلاب پسند جماعت کے دل امیدوں سے لبریز تھے کیونکہ رات کے حملہ کی جس طرح انھوں نے

مدافعت کی تھی اس سے ان کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور دن نکلتے ہی جو حملہ ہونے والا تھا اس کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ حملہ کا انتظار کر رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ انھیں اپنی کامیابی کا اتنا ہی یقین تھا جتنا کہ اپنے مقصد کی صداقت کا۔ علاوہ ازیں، انھیں کمک کے آنے کی بھی امید تھی اور اس امید سے انھیں بہت تقویت حاصل تھی۔ فرانس کی خصوصیت ہے کہ جب وہ مصروف پیکار ہوتی ہے تو حد درجہ خوش دلی کے ساتھ اپنی کامیابی کی بھی پیشین گوئی کر لیتی ہے، چنانچہ انھوں نے بھی آنے والے دن کو، تین حصوں میں تقسیم کر کے سمجھ لیا تھا کہ صبح چھ بجے وہ رجمنٹ آئیگی جسے انقلاب میں شریک ہونے کے لئے ہموار کیا جا چکا تھا۔ دوپہر کو تمام پیرس میں شورش برپا ہو جائے گی اور غروب آفتاب کے وقت تک انقلاب مکمل ہو جائے گا سینٹ میری کے گھنٹے کی آواز انھیں سنائی دے رہی تھی جو اس بات کا قطعی ثبوت تھی کہ دوسری سد، (جین کی) جو نسبتاً بڑی بھی تھی، ابھی تک مقابلہ کرنے میں کامیاب تھی۔

یہ نیک فالیں ایک گروہ سے دوسرے گروہ تک، نہایت خوشی اور مسرت کے ساتھ پہنچائی جا رہی تھیں کہ انجولراس باغیوں کا سردار نمودار ہوا۔ وہ حصار سے باہر، اندھیرے میں گھوم پھر کر واپس آیا تھا۔ تھوڑی دیر تک، وہ اپنے ساتھیوں کی پُرمسرت گفتگو کو سنتا رہا۔ پھر طلوع آفتاب کی بڑھتی ہوئی روشنی میں، جس نے اس کے چہرے کو سرخ و شاداب بنا دیا تھا اُس نے کہا:۔

"پیرس کی تمام فوج باہر آگئی ہے۔ اس فوج کا ایک تہائی حصہ، اس سد پر حملہ کرنے کی طیاری کر رہا ہے جس کے پیچھے تم ہو۔ قومی محافظ دستہ بھی موجود ہے۔ ایک گھنٹہ میں تمھارے اوپر حملہ کیا جائیگا عوام جو کل تک پورے جوش سے کام لے رہے تھے آج صبح سے بالکل سرد ہیں۔ انتظار اور امید کی کوئی صورت نہیں۔ نہ کوئی رجمنٹ مدد کو آئیگی اور نہ کوئی راہ مفر کی دکھائی دے گی۔ تم سے سب نے منہ موڑ لیا ہے۔

یہ سُن کر آپس کی گفتگو سے جو ایک بھنبھناہٹ سی فضا میں پائی جاتی تھی وہ دفعتہً بند ہو گئی۔ سب پر ایک سکتہ کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک ناقابل بیان خاموشی چھائی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا موت کا فرشتہ ابھی یہاں سے اُڑ کر گیا ہے۔ لیکن یہ حالت صرف ایک لمحہ تک قائم رہی اور اس کے

بعد ایک نہایت معمولی اور ناقابلِ التفات گروہ میں سے ایک آواز نے' انجولراس کو مخاطب کرکے کہا:-

" ایسا ہے تو یہی سہی۔ بھائیو! ہمیں زبان سے نہیں بلکہ اپنے بے جان جسموں سے احتجاج کرنا چاہیئے اور دنیا پر یہ ظاہر کر دینا چاہیئے کہ اگر عوام نے ہم سے منہ موڑ لیا ہے تو خیر' احرار عوام سے کبھی منہ نہیں موڑ سکتے۔

ان الفاظ نے انفرادی تفکرات کے تکلیف دہ بادل کو یکقلم فنا کر دیا اور ایک پُرجوش نعرہ کے ساتھ سب نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اس آدمی کا نام کسی کو نہ معلوم ہو سکا جس نے یہ فیصلہ کن الفاظ کہے تھے وہ کوئی غیر معروف معمولی آدمی تھا' ایک فراموش کردہ انسان' ایک وقتی ہیرو' ایسا لامعلوم شخص جو انسانی نازک ترین لمحات میں' ایک خاص موقع پر' ایک خاص انداز بلند کے ساتھ' وقت کے مناسب حال جو فیصلہ کن نقطہ ہوتا ہے کہ گذرتا ہے اور اس کے بعد تاریکی میں غائب ہو جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ بجلی کی طرح چمک کر خدا اور مخلوق کی نمایندگی کرتا ہے اور پھر فنا ہو جاتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے اس قسم کا عزم راسخ' ۶ جون ۱۸۳۲ء کی فضا کے ذرہ ذرہ پر مسلط تھا۔ کیوں کہ ٹھیک اسی وقت سینٹ میری کی سد میں' وہاں کے محصور باغیوں نے' ایک ایسی ہی آواز بلند کی' جس نے تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ وہ آواز یہ تھی جسے باغیوں کے مقدمہ کی سماعت کے وقت شہادت کے طور پر قلمبند کیا گیا تھا۔" وہ ہماری مدد کو آئیں یا نہ آئیں' یہ ان کی خوشی ہے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہمارا راستہ کھلا ہوا ہے ہم سب کو ایک ایک کرکے یہیں فنا ہو جانا ہے"۔

اس واقعہ سے ہم کو پتہ چلتا ہے کہ گو بظاہر یہ دونوں سدیں' مادی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دی گئی تھیں لیکن پھر بھی ان میں روحانی گفت وشنید جاری تھی۔

سد کی کیفیت نزع شروع ہونے والی تھی۔ اس موقع کے المناک تجمل وشوکت کو ہر چیز بڑھا رہی تھی۔ ہوا کی ہزاروں پُراسرار صدائیں' جو سڑک پر' اس مسلح ہجوم کی آمد ورفت سے پیدا ہوتی تھیں جسے سد کے اندر سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں جو تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد صاف سنائی

دیتی تھیں۔ توپخانہ کی بھاری گڑ گڑاہٹ، پلٹن کی بندوقوں کی آوازیں اور توپوں کے دغنے کی صدائیں جو شہر پیرس کی بھول بھلیوں میں گونجتی تھیں۔ جنگ کے دھوئیں کا اُٹھنا جو چھتوں کے اوپر بالکل سنہرا نظر آتا تھا۔ پُراسرار چیخیں جو دور سے صاف سنائی نہ دیتی تھیں اور اس لئے اور زیادہ بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ خطرات کا، بجلی کی چمک کی طرح تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد نمودار ہونا۔ سینٹ میری کے الارم سگنل کی آواز جواب بالکل ایک سسکی کی طرح سنائی دیتی تھی۔ موسم کا اعتدال، آسمان کا، دھوپ اور بادلوں کی وجہ سے ایک دلفریب شان سے نظر آنا۔ دن کا حسن اور مکانوں کی وحشت زا خاموشی، ان سب سے ایک شاندار ٹریجڈی کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔

مکانوں کی وحشت زا خاموشی کا سبب یہ تھا کہ گذشتہ شام سے شنواری سڑک کے دونوں کناروں پر جو مکانوں کی قطاریں تھیں وہ بالکل دور ندہ صفت دیواریں بن گئی تھیں۔ ان کے دروازے، کھڑکیاں اور روشندان سب بالکل بند کر لئے گئے تھے۔ وہ دن اس دن سے مختلف تھا جس میں کہ ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ ہمارے سامنے جو انقلاب ہوا، اس کے لئے وقت آگیا تھا۔ اس لئے جب لوگ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے اُٹھے جو ضرورت سے زیادہ عرصہ تک قائم رہ چکی تھی اور جسے "عطا شدہ پروانہ آزادی" اور "دستوری حکومت" کے منافقت آمیز ناموں سے موسوم کیا جاتا تھا تو اس وقت فضا میں عالمگیر غیض وغضب پھیلا ہوا تھا۔ سڑکیں جب کھودی گئیں، شہر والوں نے اظہار رضامندی کیا۔ تجارت پیشہ طبقہ نے مسکرا مسکرا کر آزادی کا ترانہ، دبی زبان سے گایا۔ باشندوں نے جن کے رگ و ریشہ میں بغاوت کا نشہ سرایت کر گیا تھا، باغیوں کو پناہ دی اور مکانوں نے ان وقتی اور عارضی قلعہ نما سدوں کے ساتھ، جو ان کے سہارے سے تعمیر کی گئی تھیں، اظہار اخوت کیا۔ لیکن جس وقت کا اس جگہ ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت زمانہ کا میلان، انقلاب کی طرف نہیں تھا اس لئے بغاوت فیصلہ کن طریقہ پر اختیار نہیں کی گئی۔ عوام نے تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور باغیوں کی جماعت بے یار ومددگار رہ گئی۔ باغیوں کے چاروں طرف جو گنجان آبادی بسی ہوئی تھی وہ ایک سنسان ریگزار کی مانند ہو گئی۔ دلوں میں سردی پیدا ہو گئی۔ مکانوں کے دروازے اس طرح مقفل ہوئے کہ دیوار بن گئے۔ اور سڑک ایک ایسی وادی بن گئی جس کی پُر سکون اور ہموار سطح سے گذر کر، فوج

اطمینان سے، سدپر حملہ آور ہوسکی۔

عوام کو اچانک اس بات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی مرضی اور خواہش سے زیادہ اپنی رفتار میں تیزی پیدا کریں۔ جو کوئی بھی اس قسم کا قصد کرے گا اس کا انجام عبرتناک ہوگا۔ عوام اس کے کبھی روادار نہیں ہوسکتے۔ ایسی صورت میں وہ باغیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں اور خود بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ باغی کوڑھیوں کی مانند ہو جاتے ہیں جن سے ہر شخص گھن کرنے لگتا ہے۔ ان کے لئے مکانات، ساحل کی مضبوط چٹانیں بن جاتے ہیں۔ دروازے، انکار کی مجسم تصویریں، سڑک کی طرف مکان کا جو رخ ہوتا ہے وہ ایک ٹھوس دیوار نظر آتا ہے۔ یہ دیوار دیکھتی ہے، سنتی ہے لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ یہ کھل سکتی ہے اور چاہے تو پناہ دے سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں کرتی۔ یہ دیوار عدالت کا ایک جج بن جاتی ہے یہ دیکھتی ہے اور موت کا حکم سناتی ہے۔ یہ بند مکانات کس قدر ہوش ربا منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ مردہ معلوم ہوتے ہیں درآنحالیکہ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ زندگی، جو یہ معلوم ہوتا ہے، سکتہ کے عالم میں ہے ان سے لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ چوبیس گھنٹے گذر گئے ہیں کوئی ان مکانوں سے باہر نہیں نکلا۔ لیکن ان مکانوں سے کوئی غائب بھی نہیں ہوا۔ اس مکان کے اندرونی حصہ میں جو باہر سے بالکل چٹان معلوم ہوتا ہے لوگ چلتے پھرتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں غرضکہ مکان کے اندر رہ کر جس قدر کام کئے جاتے ہیں، سب کرتے ہیں لیکن وہ سہمے ہوئے ہوتے ہیں جو بجائے خود ایک خوفناک چیز ہے۔ اپنی اس سنگین غیر مہماں نوازی کے لئے وہ خوف و دہشت کا ہی عذر پیش کرتے ہیں جس میں بزدلی بھی شامل ہے جو جرم کی نوعیت کو اور بھی زیادہ قابل معافی بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ خوف ایک جذبہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خوف کو اس طرح غضب میں تبدیل کر سکتے ہیں جیسے عاقبت اندیشی کو غصہ میں۔ اور اسی بنیاد پر "جنون اعتدال پسندی" کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ انتہائی خوف کی بجلیوں میں سے بعض وقت غصہ کا جذبہ، ایک سوگوار دھوئیں کی مانند بلند ہوتا ہے اور عوام جواب طلب کرنے لگتے ہیں۔ "یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ انھیں کسی بات سے تسکین ہی نہیں ہوتی۔ یہ امن پسند آبادی کو بدنام کرتے ہیں۔ کیا اس قسم کے مہمل انقلابات دیکھتے دیکھتے ہم تھک نہیں گئے ہیں؟ یہ لوگ یہاں مرنے کیوں آئے ہیں؟ جس طرح آئے ہیں اگر ہمت ہے تو اسی طرح

نکل بھی جائیں۔ یہ سب ان کا ہی قصور ہے جس سزا کے یہ مستحق ہیں وہ انھیں مل رہی ہے۔ سڑکوں کو دیکھو کس طرح توپ کے گولوں سے چھلنی ہو گئی ہیں۔ یہ سب کے سب متنفی اور امن شکن ہیں۔ ہم کبھی ان کے لئے اپنے مکان کے دروازے نہ کھولیں گے۔" مکان ایک مقبرہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ باغی سسک سسک کر دروازے کے سہارے دم توڑتے ہیں۔ وہ گراب کی باڑھوں اور ننگے نیزوں کو اپنی سمت بڑھتے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم چلائیں گے تو لوگ ہماری آواز سن سکیں گے لیکن ہماری مدد نہ کریں گے۔ ایسی دیواریں ہیں جو اپنی آغوش میں انھیں پناہ دے سکتی ہیں۔ ایسے آدمی ہیں جو انھیں بچا سکتے ہیں۔ ان دیواروں میں گوشت کے کان بھی مگران مکانوں کے رہنے والوں کے جگر پتھر بن گئے ہیں۔

ہم اس کے لئے الزام کسے دیں؟ سب کو اور کسی کو بھی نہیں۔ قابل الزام وہ نالائق عہد ہے جس میں ہم زندگی گذارنے پر مجبور ہیں۔ وہ لوگ جو دنیا کو جنت بنا دینے کا خواب دیکھتے ہیں جب کبھی اپنے آپ کو بغاوت کے لئے آمادہ کرتے ہیں اور ان کا فلسفیانہ احتجاج ایک مسلح احتجاج کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ علم کی دیوی کی پوجا کرتے کرتے جب کبھی وہ جنگ کے دیوتا کے پجاری بن جاتے ہیں تو اس جدید صورت حال سے جس قدر خطرات پیدا ہوتے ہیں ان سب کی ذمہ داری انھیں پر عاید کی جا سکتی ہے۔ دنیا کو جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے جب بے صبر ہو کر بغاوت کی راہ اختیار کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے تقریباً ہمیشہ یہ وقت سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں اور جب انھیں اس کا احساس ہوتا ہے تو سر تسلیم خم کر کے، خندہ پیشانی سے نتائج کی جگہ تباہی و بربادی قبول کر لیتے ہیں۔ بغیر شکایت کا حرف زبان پر لائے ہوئے یہ خدمت کرتے ہیں۔ انھیں معاف کر دیتے ہیں جو ان سے انحراف کرتے ہیں اور ان کی بلندی و عظمت اسی میں ہے کہ بے یار و مددگار ہونے پر بھی راضی برضا ہیں۔ یہ موانع کے مقابلہ میں سرکش ہیں اور احسان فراموشی کے سامنے مسکین و مہربان۔

لیکن کیا ان کا ساتھ نہ دینا واقعی احسان فراموشی ہے؟ اگر ہم نسل انسانی کے نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو جواب ہمیں اثبات میں دینا پڑے گا اور جو محض ایک فرد کے نقطہ نگاہ سے تو نفی میں۔

ترقی انسان کی امتیازی سرشت ہے۔ نسل انسانی کی مشترکہ حیات اور نسل انسانی کا مجموعی

اقدام ترقی کہلاتا ہے ۔ ترقی سفر کرتی ہے ۔ اس کا عظیم الشان انسانی اور دنیاوی سفر، اعلیٰ علیین اور خالق کون ومکاں کی جانب ہے ۔ یہ ٹھہرتی ہے تاکہ گم شدہ بھیڑوں کو یکجا جمع کرے ۔ اس کے مقامات ہوتے ہیں جہاں وہ کنعاں کی طرح ایسے نظاروں کے مشاہدہ کے لئے رکتی ہے جو افق پر ملکیت نمودار ہو جاتے ہیں ۔ اس کی راتیں ہوتی ہیں جب وہ سو جاتی ہے اور جب ترقی مصروف خواب ہوتی ہے اس وقت اہل فکر و نظر، روح انسانی کے ان تاریک سالوں کو دیکھ کر جانگسل تفکرات میں مبتلا رہتے ہیں اور چھپی ہوئی تاریکی میں ٹٹولتے پھرتے ہیں کہ کسی طرح ترقی کو بیدار کریں لیکن ناکام رہتے ہیں ۔

ایک دن گرارڈ دی نروال نے ان سطور کے مصنف سے کہا کہ "خدا شاید مرگیا ہے"۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر خدا اور ترقی کے فرق کو مخلوط کر دیا اور اپنی نادانستگی میں سلسلہ ترقی کے ٹوٹ جانے کو خدا کی موت سے تعبیر کیا ۔ لیکن اس قسم کی مایوسی سخت غلطی ہے ۔ ترقی ہمیشہ دوبارہ بیدار ہوتی ہے اور طولانی قصہ کو مختصر کرکے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ سوتے سوتے بھی حرکت کرتی رہتی ہے ۔ کیونکہ اس کے حجم میں ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور جب وہ بیدار ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد طویل ہو گیا ہے دریا کی طرح ترقی کو بھی ہم کبھی پُرسکون نہیں کہہ سکتے ۔ ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہ کرو ۔ ترقی کے سامنے کوئی چٹان کھڑی نہ کرو کیونکہ رکاوٹ سے پانی میں جھاگ پیدا ہونے لگتا ہے اور انسانیت موانع ترقی کے مقابلہ میں ابلنا شروع کر دیتی ہے ۔ اسی وجہ سے فسادات رونما ہوتے ہیں ۔ لیکن ان فسادات کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک راہ نکل آئی ہے ۔ جب تک کہ امن وامان قائم نہ ہو اور یہ صرف عالمگیر امن سے ممکن ہے جب تک ہم آہنگی اور یکجہتی کا دور دورہ نہ ہو ترقی کے لئے برابر انقلابات ہی منازل کا کام دیتے رہیں گے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترقی کیا ہے ۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ یہ جمہور کی حیات ابدی ہے ۔ تو پھر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ افراد کی وقتی زندگی نسل انسانی کی اس دائمی حیات سے مقابلہ پر آمادہ ہو جاتی ہے لیکن ہمیں بلا کسی قسم کی تلخی کے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیئے کہ افراد کے مفاد کو ایک امتیازی نوعیت حاصل ہے اور اس مفاد کے قیام و محافظت کا حق ان سے کسی طرح نہیں چھینا جا سکتا ۔ عہد حاضر کی انانیت لائق عفو ہے ۔ وقتی زندگی کے بھی ایسے مطالبات ہو سکتے ہیں جنھیں مستقبل کے لئے ہمیشہ قربان نہیں کیا جا سکتا ۔

جونسل کہ اس وقت کرۂ ارض سے گذر رہی ہے اُسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ آیندہ نسلوں کے لئے جو رتبہ میں ہر حال اس کے مساوی ہیں اور جن کی باری کچھ عرصہ بعد آئیگی' اپنی زندگی کو مختصر کر دے۔ وہ جس کا نام "ہر شخص" ہے شکایتانہ لہجہ میں کہتا ہے :۔ "میں زندہ ہوں' میں جوان ہوں' مجھے اپنے محبوب سے الفت ہے۔ میں بوڑھا ہوں مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں ایک خاندان کا سرپرست ہوں۔ میں محنت کرتا ہوں مجھے خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ میرا کاروبار کامیاب ہے۔ میرے مکان کرایہ پر اُٹھتے ہیں' میرا روپیہ گورنمنٹ کی دستاویزوں میں لگا ہوا ہے۔ میں خوش ہوں۔ میری بیوی ہے بچے ہیں۔ مجھے یہ سب چیزیں عزیز ہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے چین سے جینے دو" اور اس کے یہ کہنے سے نسل انسانی کے پُر شکوہ ہراول پر ایک سرد مہری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے' جنگ میں مصروف ہو کر' اپنے زریں ماحول سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ آنے والی صداقت' اپنے حصول' مقصد کے لئے' گذرے ہوئے از بیتی خونی جنگ میں اپنے ذرایع کامیابی تلاش کرتی ہے مستقبل' ماضی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ پاک خیال' عمل کے موقع پر ناپاک ہٹ دھرمی اور زور وزبردستی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جنت بنانے کا خواب دیکھنے والے اپنی شجاعت اور مردانگی کو تشدد پسندی سے اس قدر پیچیدہ بنا لیتے ہیں کہ انھیں فساد برپا کرنے کے الزام کی جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔ ہر چند یہ تشدد ان کے اصول کے خلاف ہوتا ہے لیکن پھر بھی موقع اور محل کی مناسبت سے اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی جو مہلک ترین سزا ہے اُسے بھی انھیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ کرنے والے جب بغاوت کرتے ہیں تو لڑائی کے وقت قانون جنگ کی پرانی روایات کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ مخبروں کو وہ گولی سے اُڑا دیتے ہیں۔ دغابازوں کو وہ قتل کر دیتے ہیں۔ زندہ آدمیوں کو وہ دفن کر دیتے ہیں اور اُنھیں بے تھاہ تاریکیوں میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ موت کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں جو بہت ہی سخت چیز ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روشنی کی نشر و اشاعت سے دست بردار ہو گئے ہیں حالانکہ ان کی غیر محدود اور لازوال طاقت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔ یہ تلوار سے ضرب کاری لگاتے ہیں لیکن تلوار ایک پیچیدہ ہتھیار ہے جس کی دو دھاریں ہوتی ہیں اگر ایک دھار سے

آدمی اپنے حریف کو زخمی کرتا ہے تو دوسرے سے خود بھی زخمی ہو جاتا ہے۔

بغاوت کے اس رخ کو دکھانے کے بعد جو کافی کریہ المنظر ہے اور جس کے ظاہر کرنے میں ہم نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اب ہمارے لئے یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدح و ستائش نہ کریں جو مستقبل کے لئے لڑتے ہیں اور دنیوی جنت کو فضائے خیال سے عالم آب و گل میں منتقل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی فتح و شکست سے بحث نہیں ہے۔ ان کی شکست بھی لائق احترام ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ شکست میں ہی ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ جب ترقی کے نصب العین کے مطابق فتح حاصل ہوتی ہے تو وہ عوام کی تحسین و آفرین کی مستحق ہوتی ہے۔ لیکن شاندار مقابلہ کے بعد بہادرانہ شکست ان کی ہمدردی اور دلسوزی کی طلبگار ہوتی ہے۔ اول الذکر میں شان ہے مؤخر الذکر میں رفعت۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم شہادت کو فتح پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جان براؤن، واشنگٹن سے بہتر ہے اور پسکین، گیری بالڈی سے۔ دنیا میں کوئی ایسا بھی ہونا چاہئے جو مفتوحوں کی طرفداری کر سکے۔ لوگ مستقبل کے ان معماروں کے ساتھ جب وہ ناکام رہتے ہیں سخت غیر منصفانہ سلوک کرتے ہیں۔

انقلاب پسندوں پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ خوف و دہشت کا بیج بوتے ہیں۔ ان کے نظریے لائق تعزیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے مقاصد کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے ایسے خیالات کی طرف سے بھی اندیشہ کیا جاتا ہے جن کے پیدا ہو جانے کا بعد کو امکان ہے اور ان کے ضمیر کی سچائی کو کذب و ریاکاری سمجھا جاتا ہے۔ انھیں اس بات پر ملامت کی جاتی ہے کہ وہ حکمراں اجتماعی حقیقت کے مقابلہ میں رنج و غم غصہ و مایوسی، ظلم و غیر انصافی کے انبار اور تودے کھڑے کر رہے ہیں اور تاریکی کی چٹانیں اکھاڑ اکھاڑ کر سدیں بناتے ہیں تاکہ ان کے پیچھے کھڑے ہو کر لڑ سکیں۔ لوگ ان سے چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ تم دوزخ کا منہ کھول رہے ہو۔ لیکن اس کا جواب وہ یہ دے سکتے ہیں کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بہترین صورت تو یہ ہے کہ معاملات کا تصفیہ پرامن طریقہ پر کیا جائے۔ لیکن اس طریقہ کو قابل عمل بنانا بالکل ہیئت اجتماعی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ چاہے تو تشدد کو روک سکتی ہے اور پھر ایسے علاجوں کی لوگ جستجو نہ کریں جن میں قتل و خونریزی شامل ہوتی ہے۔ تلطف اور مہربانی سے اگر خرابی اور شکایت کا مطالعہ

اور تعین کیا جائے اور اس کے دفعیہ کی تدبیریں کی جائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ لوگ امن شکن طریقے اختیار کریں ہیئت اجتماعی سے یہ ہماری پُرزور استدعا ہے کہ وہ اسی اصول پر عمل کرے۔

بہرکیف، ایسے سب لوگ اپنی شکست میں بھی بلکہ شکست میں خصوصیت کے ساتھ اور زیادہ، بزرگ و برتر ہیں۔

تمام اکناف عالم کے احرار فرانس پر نگاہ جمائے ہوئے ہیں۔ نصب العین کی اٹل منطق ان کے ساتھ ہے اور اپنی عظیم خدمت کو پورا کرنے میں وہ منہمک ہیں۔ وہ اپنی حیات کا پاک تحفہ ترقی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وہ خدا کی مشیت پوری کرتے ہیں اور ایک مذہبی فریضہ انجام دیتے ہیں۔ وہ مقررہ وقت پر اسی لاپرواہی کے ساتھ جس طرح کہ تھیٹر کا ایک ایکٹر منیجر کے اشارہ پر کام کرتا ہے، یزدانی پس پردہ آواز پر لبیک کہتے ہوئے قبر میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس یاس افزا جنگ اور پُرسکون فنا کو وہ اس لئے قبول کرتے ہیں تاکہ جولائی ۱۷۸۹ء میں جو عالیشان بے پناہ انسانی تحریک شروع کی گئی تھی وہ شاندار، پُرشوکت اور عالمگیر انجام تک پہنچا دی جائے۔

گذشتہ ابواب میں جو مختلف امتیازی فرق ہم نے نمایاں کئے ہیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک اور کا بھی اضافہ کیا جائے۔ بغاوتیں دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو قبول عام کا شرف حاصل کر لیتی ہیں اور انقلاب کہلاتی ہیں اور دوسری وہ جو رد کر دی جاتی ہیں اور فتنہ و فساد کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ بغاوت کا پھیلنا، انقلاب انگیز خیالات کا گویا ایسے امتحان میں کامیاب ہونا ہے جس میں کہ عوام ممتحن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر عوام بغاوت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں تو بغاوت ایک مرجھائے ہوئے پھول کی مانند ہو جاتی ہے اور سڑک کے بلوہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

دنیا میں جنت بنانے کا حوصلہ رکھنے والے جب چاہیں اور جس وقت اپیل کریں یہ ضروری نہیں ہے کہ عوام اسی وقت بغاوت کے لئے طیار ہو جائیں۔ قوموں کی رگوں میں شہیدوں اور ہیروؤں کا خون ہر وقت موجزن نہیں رہتا۔ عوام حقیقت پرست ہوتے ہیں۔ ایسی بغاوتوں سے جن کی بنیاد خیالی نظریوں پر ہوتی ہے ان کی

طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب اول تو یہ ہے کہ اس قسم کی بغاوتوں کا انجام اکثر شکست فاش ہوتا ہے اور دوئم یہ کہ ان کی ابتدا جس نقطہ سے ہوتی ہے وہ محض خیالی ہوتا ہے جس کی طرف ان کا ذہن بمشکل ہی منتقل ہو سکتا ہے۔ لیکن بغاوت کرنے والے جس قدر سرگرمی اور مستعدی اپنے کام میں دکھلاتے ہیں وہ صرف اس خیالی نصب العین کی خاطر دکھلاتے ہیں۔ بغاوت ایک جذبہ پُر جوش کا نام ہے۔ جذبہ پُر جوش بعض وقت غصہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسی لئے ہتھیار اُٹھائے جاتے ہیں۔ لیکن تمام بغاوتیں جو حکومتوں اور موجودہ طریقہ وانتظام کے خلاف کی جاتی ہیں ان کا مقصد اعلیٰ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۸۳۲ء کے واقعات کو ہی لیجئے ۱۸۳۲ء میں جو جنگ باغیوں کے سرداروں اور خصوصیت کے ساتھ شنواری سڑک کے نوجوانوں نے کی وہ خاص طور پر لوئی فلپ کے خلاف نہیں کی گئی۔ اُن میں کی ایک کثیر جماعت ایمانداری کی بات یہ ہے بادشاہ کی صفات کی جو انقلاب اور مطلق العنانی کے درمیان کھڑا ہوا تھا معترف تھی۔ ان میں سے کسی ایک متنفس کو بھی اس سے نفرت نہ تھی۔ لیکن وہ جس بات کی مخالفت کر رہے تھے وہ وہی تھی جس کی مخالفت اُنھوں نے لوئی فلپ کے پیشرو چارلس دہم سے کی تھی یعنی اس نظریہ کی کہ بادشاہ کو سلطنت کرنے کا حق خدا نے دیا ہے۔ جیسا کہ ہم تفصیل کے ساتھ سمجھا چکے ہیں وہ جس چیز کو مٹانا چاہتے تھے وہ وہ امکانات تھے جن کی بنیاد پر تمام دنیا میں ایک آدمی کو دوسرے آدمیوں کے حقوق غصب کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور جن کی وجہ سے چند اشخاص کو دوسروں کے خلاف خاص مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ وہ پیرس کو بادشاہ سے اس لئے نجات دلانا چاہتے تھے تاکہ نتیجہ کے طور پر تمام دنیا سے استبدادیت فنا ہو جائے۔ ان کا طریقہ استدلال یہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا۔ ان کا مطمح نظر اس میں شک نہیں، حصول کے لئے بہت طویل مدت چاہتا تھا اور بالکل صاف اور واضح بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے سعی حصول کے وقت اس کی خامیاں ظاہر ہونا یقینی تھیں لیکن باوجود اس کے مقصد کی بلندی اور عظمت سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

یوں لوگ اپنے خواب وخیال کی خاطر قربان ہو جاتے ہیں۔ شہیدوں کے لئے بھی ان کے خیالات توہمات ہی ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ توہمات ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسانی حقائق کی آمیزش ہوتی ہے۔ باغی بغاوت پھ

سونے کا پانی پھیر دیتا ہے اور اس کو شعریت میں رنگ دیتا ہے۔ وہ ایسے مقابلوں میں جن کا المناک انجام یقینی ہے اپنے آپ کو پھینک دیتا ہے لیکن یہ سب کچھ وہ اسی وقت کرتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو اس انجام کے نشہ سے مدہوش کر لیتا ہے۔ کسے معلوم ہے کہ ایک صبح ایسی بھی طلوع ہو جب انھیں فتح نصیب ہو جائے ان کی تعداد ایک حقیر اقلیت ہوتی ہے۔ ان کے خلاف ایک پوری فوج ہوتی ہے۔ لیکن وہ جس چیز کی مخالفت کے لئے لڑتے ہیں اُسے ابتدائی حقوق انسانی، فطری قانون، انصاف، صداقت اور ہر شخص کی اپنے اوپر اپنی بادشاہت کے نام سے موسوم کرتے ہیں جو کسی دوسرے شخص کو منتقل نہیں کی جا سکتی اور ضرورت کے وقت وہ تین سو اسپارٹن کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ وہ لڑتے ہوئے اپنے آپ کو ڈان کوائکزوٹ (شیخ چلی) نہیں سمجھتے بلکہ لیونیڈا اس خیال کرتے ہیں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جب ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جاتی ہے وہ پیچھے نہیں ہٹتے۔ سر جھکا کر وہ جھپٹتے ہیں اور انھیں برابر غیر معمولی فتح کی امید رہتی ہے یعنی انقلاب کی تکمیل، ترقی کی رہائی، نسل انسانی کا تسلط اور عالمگیر نجات اور یہ کچھ نہیں تو کم از کم تھرماپلی کا احیاء و تجدید۔

ترقی کے لئے اس قسم کی جو لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، اکثر ناکام رہتی ہیں۔ اس کا سبب ہم نے اوپر وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ شیخ چلیوں کی قیادت میں جن کے منصوبے بہت بلند ہوتے ہیں عوام آسانی سے چلنے کے لئے طیار نہیں ہوتے۔ عوام کا بہت وزنی حجم ہوتا ہے اور اس وزن کی وجہ سے ہی ان کی رفتار کمزور اور ناپائدار ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ کسی ایسی مہم میں شریک ہونا نہیں چاہتے جو پُر خطر ہو لیکن خیالی نصب العین کے حصول کے لئے ہمیشہ پُر خطر راہ اختیار کرنا پڑتی ہے۔

علاوہ ازیں ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہر تحریک میں ذاتی اغراض و مفاد بھی کام کرتے رہتے ہیں اور انھیں خیالی اور جذباتی انسانوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی۔ بعض اوقات جب معدہ کی محافظت کے لئے کوشش کی جاتی ہے تو دل پر فالج گر جاتا ہے۔

فرانس کی عظمت اور رعنائی اسی بات میں ہے کہ دوسری قوموں کی طرح اُسے اپنے پیٹ پالنے کا خیال ذرا کم رہتا ہے۔ وہ اپنی کوکھ کے گرد رسی زیادہ آسانی سے باندھ سکتی ہے۔ وہ سب سے پہلے

جاگتی ہے اور سب سے آخر میں سوتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے اور تلاش و جستجو کے لئے برابر مستعد رہتی ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لئے کرتی ہے کہ وہ فطرتاً آرٹسٹ ہے۔

جس طرح حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ وہ حسن ہو جائے۔ اسی طرح منطق کا جو منتہا ہے وہ مطمع نظر کی ابتدا ہے۔ آرٹسٹ میں تضاد نہیں ہوتا۔ حسن سے محبت کے معنی وہی ہیں جو نور کے مشاہدہ کے ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر یورپ کی شمع کو روشن رکھنے یعنی اس کی تہذیب کی علمبرداری کی خدمت پہلے یونان نے کی وہاں سے یہ خدمت روم کو منتقل ہوئی اور اب اس بات کا فخر فرانس کو حاصل ہے۔ فرانس وہ قوم ہے جسے خدا نے روشنی پھیلانے کے لئے مامور کیا ہے۔

یہ بات بہت موزوں و مناسب ہے کہ ایک قوم کی شاعری اس کی ترقی کا ایک اہم عنصر ہوتی ہے۔ تہذیب کی ترقی کا تخمینہ ایک قوم کے تخیل کی فراوانی سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ایک تہذیب پھیلانے والے ملک کو مردانہ صفات رکھنا چاہئیں۔ اُسے کورنتھ ہونا چاہئے سائبرس نہیں۔ جس قوم میں زنانہ پن آجاتا ہے وہ پست و ذلیل ہو جاتی ہے۔ تہذیب کے لئے نفاست کی ضرورت نہیں ہے بلکہ رفعت کی ضرورت ہے۔ اس شرط کے ساتھ ہم مثالی نصب العین کو نسل انسانی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

جدید نصب العین کا نمونہ ہمیں آرٹ میں ملتا ہے اور اس کے حصول کے ذرائع سائنس میں۔ شاعر کے اعلیٰ تخیل کو یعنی ہیئت اجتماعی کے حسن کو ہم سائنس کے ذریعہ سے حقیقت کا جامہ پہنا سکتے ہیں۔ جنت عدن اگر دوبارہ تعمیر کرنا ہے تو یہ اب دو جمع دو کے ذریعہ سے ہی ممکن ہے۔ اس نقطہ پر جہاں کہ تہذیب اب پہنچ گئی ہے صحت و واقعیت حسن کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں۔ سائنس کے آلات سے نہ صرف آرٹ کے جذبہ کو مدد ملنے لگی ہے بلکہ اس کی تکمیل کا واحد ذریعہ اب صرف یہی رہ گئے ہیں۔ خواب حساب لگانے پر مجبور ہو گیا ہے۔ آرٹ جو فاتح ہوتا ہے اُسے اب ضرورت ہے کہ وہ اس سائنس کا سہارا ڈھونڈے جو اشیاء کو حرکت دیتا ہے۔ اور سہارے کی مضبوطی ہمیشہ بہت اہم چیز ہوا کرتی ہے۔ عہد جدید کی روح یونانی ذہنیت کا شاہکار ہے اور اُسے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والا ہندوستانی شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سکندر ہاتھی پر سوار ہے۔

تہذیب کی راہبر بننے کے لئے وہ نسلیں غیر موزوں ہیں جو پرانے معتقدات کے بوجھ سے پتھر بن گئی ہیں یا جن کی اخلاقی عظمت کو مالی منفعت کے جذبہ نے فنا کر دیا ہے۔ پتھر کے بت یا سونے کے سکّے اس عضو کو جو ملتا ہے اور اس ارادہ کو جو اس کے ہلنے کا سبب ہوتا ہے برباد کر دیتے ہیں۔ مذہبی یا تجارتی مشغولیت ایک قوم کی چمک کو زائل کر دیتی ہے۔ اس کی سطح کو پست کر کے اس کے افق کو تنگ کر دیتی ہے اور اس عالمگیر مقصد کے احساس کو چھین لیتی ہے جسے بہ یک وقت انسانی اور ایزدی کہا جا سکتا ہے اور جس کی وجہ سے قومیں پیغمبری کے مرتبہ بلند تک پہنچ جاتی ہیں بابل کے سامنے کوئی مطمح نظر نہیں تھا۔ کارتھیج کا کوئی نصب العین نہ تھا۔ ایتھنس اور روم کے گرد البتہ تہذیب کا ایک مقدس حلقہ کھنچا ہوا تھا جو صدیوں کی تاریکی کے باوجود اب تک ان کے ساتھ وابستہ ہے۔

فرانس بھی من حیث القوم اسی زمرہ میں شامل ہے جس میں کہ یونان اور روم ہیں۔ وہ اپنے حسن کی وجہ سے یونانی ہے اور اپنی شوکت کی بنا پر رومی۔ مزید برآں اس کا اخلاق بھی بلند ہے۔ وہ ایثار کرنا جانتا ہے اور قوموں کے مقابلے میں اس میں محبت اور فدائیت کے جذبے بہت زیادہ کام کرتے رہتے ہیں مگر یہ جذبے کبھی اس پر طاری ہو جاتے ہیں اور کبھی غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ان لوگوں کے لئے جو اُسے اس وقت دوڑنے کے لئے کہتے ہیں جب وہ محض چلنا چاہتا ہے یا اس وقت چلنے کو کہتے ہیں جب وہ ٹھہرنا چاہتا ہے بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔ فرانس پر بھی مادیت کا دورہ ہوتا ہے اور بعض اوقات جو خیالات اس کے اعلیٰ دماغ کو منتشر رکھتے ہیں ان میں فرانس کی اس عظمت و شوکت کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں ہوتا جو مسولینی یا ساوتھ کیرولینا کے شایان شان ہیں پھر ایسے وقت کیا کیا جا سکتا ہے۔ دیو بونا بن جاتا ہے عظیم الجثہ فرانس چھوٹی حقیر چیزوں کے لئے تمنا کرنے لگتا ہے۔

ایسے موقعوں پر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ چاند اور تاروں کی طرح قوموں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ گہن میں آجائیں اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے اگر روشنی واپس آجائے اور گہن ہمیشہ کے لئے رات میں منتقل نہ ہو جائے طلوع اور حیات بعد الموت ہم معنی الفاظ ہیں۔ نور کا دوبارہ نمایاں ہونا نفس کے وجود کے مرادف ہے۔

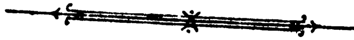
ہمیں ان واقعات کا بیان سکون کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ ایک حد کے اوپر موت یا حالت جلاوطنی میں قبر ایک ارادت مند کے لئے نہایت مسرت بخش انجام ہیں۔ عقیدت و شیفتگی کا اصلی نام بے غرضی ہے جنھیں ان کے حال پر چھوڑا گیا انھیں اچھا ہوا ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ جو جلاوطن کئے گئے خوب ہوا کہ وہ جلاوطن کئے گئے۔ لیکن ہم معزز اور برگزیدہ اقوام سے اس قدر التجا ضرور کریں گے کہ جب وہ پیچھے ہٹیں تو حد سے زیادہ پیچھے نہ ہٹا کریں۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ معقولیت کی طرف واپس ہونے کا بہانہ کرکے پستی کی طرف ضرورت سے زیادہ نیچے اتر جائیں۔

مادہ کا وجود ہے۔ وقتی مصلحت کا وجود ہے۔ ذاتی اغراض و مفاد کا وجود ہے۔ معدہ اور شکم کا وجود ہے۔ لیکن عرض صرف اس قدر ہے کہ معدہ کو ہی عقل و تمیز کی انتہا نہ تصور کر لینا چاہیئے۔ عارضی زندگی کے حقوق کا ہمیں اعتراف ہے لیکن دائمی زندگی کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ افسوس! ابھرنے کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ گرنے سے بھی محفوظ ہو گئے۔ تاریخ میں ہمیں اس قسم کی مثالیں ہماری تمنا کے خلاف بہت زیادہ ملتی ہیں۔ ایک قوم برگزیدہ و سرفراز ہے۔ اس نے نصب العین کی فضائی لذت کا ذائقہ چکھا ہے۔ لیکن ایک وقت آتا ہے وہ کیچڑ میں لوٹنا شروع کر دیتی ہے اور اسے اپنے لئے اچھا سمجھتی ہے اور جب ہم اس سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ اس نے سقراط کو چھوڑ کر فالسٹاف کو اپنا رہنما کیوں بنالیا؟ تو جواب یہ ملتا ہے کہ میں مدبرین کی زیادہ قدر کرتی ہوں!۔

جنگ کے بیان کو دوبارہ شروع کرنے سے پہلے ایک اور بات کہنا بھی ضروری ہے۔

اس جنگ کو جس کا کہ ہم تذکرہ کر رہے ہیں مشابہت ان حرکات سے دی جاسکتی ہے جو تشنج کی حالت میں کی جاتی ہیں۔ پابہ زنجیر ترقی بیماروں کی مانند ہوتی ہے اور مرگی کے اس قسم کے افسوسناک دورے اس پر پڑتے رہتے ہیں۔ ترقی کی اس بیماری یعنی خانہ جنگی سے ہم برابر دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ اس ڈرامہ کا جس کا محور ضمیر اجتماعی کی ملامت ہے اور جس کا صحیح عنوان ترقی ہے یہ ایک مہلک پہلو ہے جو بہ یک وقت کھیل بھی کہا جا سکتا ہے اور کھیل کے درمیان کا وقفہ بھی۔

ترقی ! یہ آواز جو ہم اکثر بلند کرتے ہیں ہمارے تمام تخیل پر حاوی ہے اور اپنے ڈرامہ کے اس حصہ پر جہاں کہ ہم پہنچ گئے ہیں ہمیں اجازت ملنا چاہیئے کہ ہم اس نقاب کو نہ اٹھائیں جو اس پر پڑا ہوا ہے اور اس کی روشنی کو پوری طرح چمکنے دیں کیونکہ وہ تخیل جو اس میں موجود ہے آسے ابھی بہت سی آزمائشوں سے گذرنا ہے ۔ کتاب جو ناظر کے ہاتھ میں ہے شروع سے آخر تک اپنی مجموعی اور تفصیلی حیثیت کے ساتھ، چاہے اور جو بھی اس کی فروگذاشتیں، مستثنیات اور خامیاں ہوں ترقی کو ظاہر کرتی ہے اور یہ ترقی ہے بُرائی سے بھلائی کی طرف، ظلم سے انصاف کی طرف، جھوٹ سے سچائی کی طرف، رات سے دن کی طرف، بھوک سے ضمیر کی طرف، بدعنوانیوں سے زندگی کی طرف، بہیمیت سے احساس فرض کی طرف، دوزخ سے جنت کی طرف، نیستی سے خدا کی طرف ۔ آغاز، نفس امارہ سے ہوتا ہے اور انجام نفس مطمئنہ پر ۔ ابتدا میں شیطان ہے اور آخر میں فرشتہ ہو



محکومیت نسواں

عورت اور مرد کے دماغ اور ذہن کا فرق — کہا جاتا ہے کہ مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں جسمانی نقائص بھی موجود ہیں۔ مثلاً عورتوں کا بھیجہ ہلکا اور چھوٹا ہوتا ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ اول تو یہ بات ہی مشکوک ہے۔ کیونکہ اس کے لئے ابھی تک کافی شہادت نہیں پائی گئی۔ اور یہ محض اس بات سے قیاس کر لیا گیا ہے کہ مرد کا جسم بڑا اور بھاری نظر آتا ہے۔ اگر جسامت ہی اصل معیار ہو تو پھر عجیب و غریب نتائج پیدا ہو جائیں گے۔ کیونکہ پھر یہ ماننا ہوگا کہ ہر لمبے چوڑے آدمی کا دماغ بھی بڑا بھاری ہوگا اور وہ نحیف الجثہ لوگوں سے عقل میں بھی زیادہ ہوگا۔ پھر اس اصول پر ہاتھی اور وہیل کے سے جانوروں کو نوع انسان پر بوجہ عقل کے بھی ترجیح دینی ہوگی۔ علم تشریح کے ماہروں کے نزدیک انسان کی عقل کی بابت جسامت اور دماغ یا سر کی بڑائی چھوٹائی کی مناسبت سے کوئی معیار قائم کرنا ہرگز صحیح نہیں۔ خود مجھ سے ایک سائنس داں نے بیان کیا کہ اوس نے جو سب سے وزنی دماغ پایا وہ ایک عورت کا تھا۔ اُس سے بڑھ کر وزنی بھیجہ آج تک سنا بھی نہیں گیا۔ اس کے ماسوا یہ امر بھی ہرگز مسلّم نہیں کہ دماغ کے وزن کا کوئی تعلق ذہن و عقل کی خوبی سے بھی ہے۔ گو یہ ضرور ہے کہ دماغ ہی تخیل اور تفکر کا جسمانی مرکز ہے لیکن ذہن کے مختلف شعبوں کا دماغ کے مختلف حصوں سے متعلق ہونا خود ایک مابہ النزاع مسئلہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دماغ کی جسامت کو انسان کی عقلیت سے غیر متعلق ہونا ایک ایسی بات ہے جس کو جھٹلانا گویا دنیا کے بہت سے تجربوں کو رائگاں کر دینا ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ دماغ کی جسامت ہی پر انسان کی عقل کی خوبی کا دارومدار نہیں ہو سکتا۔ جسم انسانی میں نظام اعصاب کے سے نفیس نظام میں فطرت جس نزاکت کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ہر محرک کے اثرات نہ صرف محرک کی کمی بیشی سے بلکہ محرک کی نوعیت اور قسم کے لحاظ سے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اگر کسی آلہ کی خوبی اُس کام کی نفاست اور نزاکت سے جانچی جا سکتی ہے جو اُس آلہ سے انجام پائے تو ہر بات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کا

دماغ اور اُس کا نظام اعصاب جس نفاست اور نزاکت سے کام کرتا ہے وہ فی الجملہ مرد کو نصیب نہیں۔ مجرد ملحوظات سے قطع نظر، بالعموم کسی جسمانی عضو کی خوبی اُس کی جسامت پر نہیں بلکہ اس عضو کے فعل کی خوبی پر منحصر ہے جس کا تعلق دوران خون کی کمیت اور کیفیت سے ہوا کرتا ہے۔ اور فی زمانہ تجربات کی بنا پر ایک نظریہ یہ بھی قایم کیا گیا ہے کہ اگر مردوں کا بھیجہ زیادہ بڑا ہوتا ہے تو عورتوں کے دماغ میں تصورات کی دورانی کیفیت بہت بہتر ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر کچھ اور بھی قیاسات قایم کئے جاسکیں تو یہ بھی تحقیق ہوتا ہے کہ مردوں کے ذہن کی رفتار میں وہ تیزی نہیں ہوتی جو عورتوں کے ذہن کی رفتار میں ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ عورتیں نسبتاً زود حس اور تیز فہم ہوتی ہیں۔ جس طرح ہر بڑی چیز اپنی جگہ سے دیر میں جنبش کھاتی ہے اسی طرح مرد کا ذہن بھی حرکت کرنے میں سست ہے۔ لیکن جب حرکت شروع ہو جاتی ہے تو بھاری جسم کی حرکت کی طرح اُس کی حرکت بھی دیر تک قایم رہتی ہے اور بہت کچھ کر ڈالتی ہے۔ پھر اس کی سمت بھی اُسی طرح مشکل سے بدلتی ہے اور اُس کا زور بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ہم ہر آن یہی دیکھتے ہیں کہ جو کام جلدی کرنے کا ہوتا ہے اُس میں عورتیں ہمیشہ بازی لے جاتی ہیں۔ عورت تھکتی جلد ہے لیکن اس کی تھکن دور بھی جلد ہوتی ہے۔ الغرض جو کچھ عورت کی ذہنی استعداد کی بابت اوپر کہا گیا اُس کی بابت میں پھر یہی کہتا ہوں کہ محض قیاسات کو میں نے پیش نظر رکھ کر بحث کی ہے تب ان نتائج کو پہنچا ہوں کہ عورتوں کی ذہنیت اگر دوسری وضع سے خلق ہوئی ہے تب بھی عورت کسی نہ کسی طرح ایک کارآمد شریک حیات ہے۔ ورنہ ابھی تک قطعی یہ رائے قایم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی ذہنیت نظرتاً مرد کی ذہنیت کے مقابلہ میں کسی طرح پست یا ادنیٰ ہے۔ یا دونوں میں کوئی حقیقی فرق بھی ہے۔ علم النفس کی تحقیقات ابھی اتنی مکمل نہیں ہوئی ہے کہ آسانی سے ان باتوں پر کوئی آخری رائے قایم کی جائے۔ لیکن جو کچھ سیرت انسانی کی بابت علوم نے بتایا ہے اُس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ صنف نسواں کی خلقی خامیاں درحقیقت خلقی نہیں بلکہ فرضی ہیں اور ان تعصبات پر محمول کی جاسکتی ہیں جو سوسائٹی میں عورتوں کے خلاف عام ہو رہے ہیں۔ چونکہ عورتوں کے حقیقی خواص پر فلاسفہ اور سائنس دانوں نے کبھی بے لوث نظر نہیں ڈالی اس لئے اُن کی مفروضہ پیدایشی کمزوریوں کی بابت دنیا کے مختلف حصوں کے لوگ اتفاق رائے رکھنے سے بھی بہت دور

ہیں اور جہاں کے لوگوں کو جیسی بن پڑتی ہے ویسی رائے ان کے متعلق قایم کر لیتے ہیں۔ مثلاً ایشیائی لوگ عورتوں میں خواہش نفسانی زیادہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ اس وجہ سے ہندوؤں کی کتابوں میں عورتوں پر جو لعن طعن ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ برخلاف اس کے انگریزوں میں عورت کو از حد "سرد مزاج" قرار دیتے ہیں۔ انگریزی کی وہ ضرب الامثال جو عورتوں کی غیر مستقل مزاجی ظاہر کرتی ہیں اکثر فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہیں۔ بلکہ غیر مستقل مزاجی کے لئے عورتوں کو فرانس میں زیادہ اور انگلستان میں کم مطعون کرتے ہیں۔ انگریز قوم کی عورتوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عورتوں یا مردوں کے فطری خواص کی بابت صحیح رائے نہیں قایم کر سکتیں جس کی وجہ فی الجملہ یہ ہے کہ انگلستان میں انسان کے باطنی خواص کے مجرد صورت میں ظاہر ہونے کی نوبت ہی بہت کم آتی ہے۔ خواہ یہ بات اچھے معنوں میں کہی جائے یا بُرے معنوں میں لیکن واقعہ یہ ہے کہ زمانہ موجودہ کی قوموں میں انگریز ہی وہ ہیں جو فطری حالات سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ کیونکہ انگلستان وہ ملک ہے جہاں نظام معاشرت نہایت کامیاب اصول پر قایم ہے اور جو چیزیں اس کے خلاف پڑتی ہیں ان کو وہ اگر مغلوب نہیں کر سکتا تو دبا ضرور دیتا ہے۔ انگریز قوم کی ضابطہ پسندی نہ صرف عمل میں بلکہ محسوسات میں بھی ظاہر ہے۔ دوسری قوموں میں لوگ دوسروں سے اخذ کئے ہوئے خیالات پر بھی کاربند ہو جاتے ہیں۔ اور سوسائٹی کی ضروریات کا بھی کافی لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی دنیائے عمل میں اگرچہ فطرت انسانی سے مقابلہ ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو لیکن فطرت انسانی کو بالکل بالائے طاق نہیں رکھ دیا جاتا۔ یعنی ان میں ممکن ہے کہ ضابطہ پسندی کو اتباع فطرت پر عملاً ہمیشہ فوقیت ہی کیوں نہ دی جاتی ہو مگر فطرت سے بالکل بے پروائی نہیں برتی جاتی۔ مگر انگلستان میں تو گویا ضابطہ نے بالکل ہی فطرت کی جگہ لے لی ہے۔ یعنی زندگی کا بیشتر حصہ بجائے اس کے کہ رواجی ضوابط کے ماتحت میلان طبیعت کے مطابق بسر کیا جاتا میلان طبیعت سے بالکل بے نیاز ہو کر محض ضابطہ کی اتباع میں بسر کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال کے اچھے اور برے دونوں پہلو نکلتے ہیں اور بدترین پہلو اس کا یہ ہے کہ انگریز خاصکر فطرت انسانی کی حقیقت بہت مشکل سے پہچانتا ہے اور اس کی رائے اس موضوع پر درست نہیں ہو سکتی۔ اور اس بارہ میں جیسی فاش غلطیاں انگریز کرجاتا ہے دوسرا نہ کرتا ہوگا۔ انگریز جس طرح

یہ عیب ہے فرانسیسی تعصب کی بیماری میں مبتلا ہے۔ انگریز کی غلطی میں ایک الٹا پن یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے تجربہ میں نہیں آتی وہ اُس کے وجود ہی سے انکار کرنے لگتا ہے۔ اور فرانسیسی کی غلطی میں یہ سیدھا پن ہے کہ جو چیز اُس کے تجربہ میں نہیں آتی اُسے وہ لامحالہ موجود خیال کرتا ہے۔ چنانچہ انگریز "فطرت" کو تو جانتا ہی نہیں کیونکہ وہ اس کے مشاہدہ میں آئی ہی نہیں۔ لیکن فرانسیسی عموماً اس کی بابت بہت کچھ جانتا ہے لیکن اس کی رائے فطرت کے بارہ میں اس لئے غلط ہوا کرتی ہے کہ اُس نے فطرت کو جب دیکھا بہت مصنوعی اور خود ساختہ وضع میں دیکھا۔ کیونکہ سوسائٹی نے ہر چیز کی فطرت پر جو رنگ چڑھایا ہے وہ کسی چیز کو اس کی اصلی حالت میں نہیں دیکھنے دیتا۔ پس معاشری دنیا میں کسی چیز کی حقیقت کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یا تو اُس کا فطری عنصر الگ کر دیا جائے یا اس کی حالت میں تغیر دے کر اُسے دیکھا جائے پہلی صورت میں تو فطرت کا کچھ نہ کچھ شائبہ ضرور ہی باقی رہ جاتا ہے جس پر انسان کی نظر پڑ سکتی ہے۔ اور دوسری صورت میں نظر تو بہت کچھ آجاتا ہے لیکن اس طرح زیر مطالعہ چیز کی قدرتی نشو و نما کا صحیح طور پر نظر آنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

ایسے فرق پر غور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے

میں کہہ چکا ہوں کہ یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ مرد اور عورت کے ذہن کا فرق کس قدر حقیقی ہے اور کہاں تک مصنوعی ہے یا یہ کہ کوئی قدرتی فرق ہے بھی یا نہیں۔ لیکن اگر کوئی فرق ہے تو اس کے اسباب کا اوپر ایک بار حوالہ دیا جا چکا ہے اور اُن پر نظر کرنے کا صرف یہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ ذہن پر خارجی اثرات کے فطری نتائج پر غور کیا جائے۔ چونکہ انسان کو اُس کے حالات سے بالکلیہ الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اس لئے اُس کے سابقہ اور موجودہ حالات پر غور کرنے سے ہی اُس کی حقیقت کا کچھ پتہ چل سکتا ہے۔

پس ہمیں یہی صورت پیش نظر رکھنا ہے کہ فی الحال مرد عورت سے کن باتوں میں بڑھا ہوا ہے۔ عورت کا جسم مرد سے کمزور ہے۔ فلسفہ سائنس یا فنون لطیفہ میں کسی عورت نے کوئی بڑا کارنامہ کبھی نہیں پیش کیا۔ کیا اس کا عورت کی قدرتی نا اہلیت کے علاوہ اور بھی کوئی سبب خیال کیا جا سکتا ہے؟۔

علامہ عورتیں

عورتوں کی ابھی تین پشتیں بھی نہیں گذریں کہ اُنھوں نے فلسفہ اور سائنس کے میدان میں قدم

رکھنا شروع کیا ہے۔ انگلستان اور فرانس میں تو زمانہ حال تک اس طرف توجہ کرنے والی عورتیں شاذ ہی ہوتی تھیں۔ اس قلیل عرصہ میں اگر اس میدان میں کسی عورت نے کوئی کارنامہ دکھایا بھی ہوتا تو وہ معجزہ سے کم نہوتا کیونکہ یہ مذاق اُن میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ البتہ جس مضمون میں مہارت حاصل کرنے کا ان میں کافی موقع ملتا آیا ہے۔ مثلاً ادبیات (نظم ونثر دونوں) میں کوئی انعام ایسا نہ تھا جو انھوں نے بھی نہ حاصل کیا ہو اور کوئی داد نہ تھی جو انھیں نہ ملی ہو۔ زمانۂ قدیم میں جب عورتوں کو شاذ ہی کسی فن میں حصہ لینے کا موقع ملتا تھا ایسی ایسی قابل عورتیں گذری ہیں کہ اُس زمانہ کے رنگ کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ یونانیوں کے بڑے شعرا میں صَفُو کا نام لیا جاتا ہے جو ایک عورت تھی۔ اور اسی طرح ہرٹس بھی تھی جو اپنے زمانہ کے بڑے بڑے شعرا سے مقابلہ میں بار بار بازی لے گئی۔ اَسپَیزیہ ایک فلسفیہ تھی جس نے تصانیف تو نہیں چھوڑیں لیکن یہ وہ تھی جس سے سقراط نے درس لیا تھا۔

عورتوں میں اجتہاد کی کمی گر دوسرے اوصاف کی موجودگی

زمانۂ موجودہ میں مردوں اور عورتوں کی تصانیف کے مقابلہ سے عورتوں کی بس اتنی خامی ضرور نکلتی ہے کہ ان میں جدت کی کمی ہوتی ہے مگر جدت ناپید نہیں۔ کیونکہ ذہن کے فعل کا ہر نتیجہ اگر وہ کسی لائق ہوتا ہے تو وہ خود ہی طبیعت کی جدت پر دلالت کرتا ہے۔ ذہن کا ہر تصور ایک نئی چیز ہے۔ اسے کسی دوسری چیز کی نقل نہ سمجھنا چاہئے۔ جدت آمیز خیالات جو اس معنی میں جدت آمیز ہوں کہ کہیں سے اخذ یا نقل نہ کئے گئے ہوں وہ خیال کرنے والے کے ذاتی مشاہدہ اور تفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں اور عورتوں کی تصانیف میں برابر پائے جاتے ہیں۔ لیکن ابھی تک جدت کے ایسے زبردست نمونے جو زمانہ میں انقلاب پیدا کردیں یا جن سے کسی عقلی مذہب کی بنا قائم ہو جائے عورتوں نے نہیں دکھائے ہیں۔ لیکن ان کے طرز ادا اور جزئیات کی ترتیب میں ان کا جوہر کسی سے کم نہیں رہا جیسا کہ زمانہ حال کی ناولوں میں عورتوں کی لکھی ہوئی ناولوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ ادبیات جدیدہ میں میڈم اسٹیل کی فصیح البیانی اور طرز ادا کو پہنچنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اور میڈم سان کا مصورانہ طرز بیان تو وہ شے ہے جو بدن میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے۔ اب عورت میں البتہ جو خامی ظاہر ہو رہی ہے اس کی علت پر بھی نظر کرنا چاہئے۔

کیا عورتوں میں جدت کا مادہ مفقود ہے؟

دنیا کا وہ زمانہ جس میں عالم کے بڑے بڑے حقائق اور کارآمد راز انسان

کی محض خداداد قابلیت اور محض پرواز خیال سے بغیر علم کی خاص امداد کے جو منکشف ہوتے رہے ایسا زمانہ تھا جس میں عورت کو خیال آرائیوں سے کوئی رگاؤ ہی نہ تھا۔ اور پھر بھی دو ایک مثالیں عورتوں نے اس زمانہ میں ایسی قائم کیں جس پر وہ ناز کرسکتی ہیں۔ سچ پوچھئے تو عورتوں کے کسی گروہ میں ان چیزوں کا چرچا نہیں ہونے پایا جس سے ان کو اس قسم کی قدرت حاصل ہوتی اور یہی وہ زمانہ گذرا ہے جس میں جو کچھ بھی جدتیں پیدا ہونا تھیں اور پرواز خیال کو جہاں تک پہنچنا تھا اس کی حد گویا پوری ہوگئی۔ اور جدت کے لئے جو کچھ میدان اب باقی رہا ہے اُسے طے کرنے کی اُمید آئندہ ہوسکتی ہے تو فی الجملہ اُنہی لوگوں سے جن کی تعلیم و تربیت خاص طریقوں سے ہوئی ہو۔ حال میں مارس صاحب نے موجودہ دور کی جدت تخیل پر بحث کرتے ہوئے خوب کہا ہے کہ یہ چیز اب تو صرف اُنہی لوگوں کو میسر آسکتی ہے جو پرانے لوگوں کے تخیلات پر عبور رکھتے ہوں۔ کیونکہ زینہ کا ہر نیا قدمچہ اب صرف پرانے قدمچوں کے اوپر ہی بنانا ہے۔ یعنی جب تک قدامت کی باتوں پر کسی کو عبور نہ ہو نئی بات پیدا کرنا مشکل ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں کتنی عورتیں ہیں جو قدما کے اقوال پر عبور رکھتی ہیں۔ آج کل شاید مسز سومرول کے علاوہ کوئی عورت نہیں جو ریاضی میں اتنی مہارت رکھتی ہو کہ کوئی نیا انکشاف اپنے مضمون میں کرسکے۔ کیا عورتوں کی قدرتی نااہلیت صرف اس وجہ سے مان لی گئی ہے کہ دو ایک جوان میں سے اس پایہ کو پہنچ سکی ہیں اُنھوں نے اپنے زمانہ میں کوئی کار نمایاں نہیں کیا؟ جب سے علم اقتصاد بطور ایک علم کے نمودار ہوا ہے اب تک صرف دو عورتیں ایسی گذری ہیں جنھیں اس علم پر قلم اُٹھانے کی نوبت آئی ہے اور اس اثنا میں کتنے مرد اس لائق ہوئے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر کچھ لکھا ہے اور کوئی کمال دکھایا ہے یہ ایک لائق غور بات ہے۔ یہی حال دیگر علوم میں ہے کہ عورتوں کو اُن معلومات کے حاصل کرنے کے مواقع ہی نہیں دئے گئے جن کی بنا پر ان کے ذہن میں وہ جولانی پیدا ہوتی جس کے بغیر خداداد قابلیت بھی آج کل کام نہیں آتی۔ جب وہ زمانہ آجائے گا کہ عورتیں ابتدائی معلومات سے کافی حد تک بہرہ اندوز ہوچکی ہونگی تب ہی یہ بھی طے ہوسکے گا کہ آیا ان میں جدت کا خلقی مادہ موجود ہے یا نہیں۔

عورتوں کے خیالات چرائے جاتے ہیں

بعض آدمی بغیر دوسروں کے خیالات پر عبور حاصل کئے ہوئے اپنے فطری ذوق اور خلقی جدت سے خاص خاص مسئلوں میں ایسی بات پیدا کرلیتا ہے کہ جس کی توجیہ خواہ وہ

خود نہ کر سکے لیکن وہ دنیائے علم میں گویا کارنامہ شمار ہو سکتی ہے بشرطیکہ بالآخر اس کی صداقت علمی یا عملی نقطۂ نظر سے مسلم ہو جائے۔ (لیکن جب تک ایسی بات جانچ نہیں لیجاتی اور فلسفہ یا سائنس کے حقائق میں اپنی جگہ نہیں پیدا کر لیتی اُس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی)۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا الہامی علم عورت کو کبھی نہیں ہوتا؟۔ میں کہتا ہوں کہ نہیں عورتوں میں سینکڑوں کو ہوتا ہے۔ مگر افسوس تو اس کا ہے کہ ان کو کوئی ایسا ہمدرد نہیں ملتا جو اس جوہر کو پرکھے اور دنیا کے سامنے پیش کرے۔ اور اگر کوئی پیش بھی کرتا ہے تو وہ اُس پیش کرنے والے کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مردوں نے جتنے خیالات اپنے بنا کر پیش کئے ہیں وہ سب دراصل اُنہی کے تھے؟ ان میں یقیناً بعض ایسے خیالات بھی تھے کہ (ان پر مردوں نے اپنی مہر تصدیق لگا کر) ان کو اپنی جانب منسوب ہو جانے دیا۔ میں اپنے ہی بارہ میں غور کرتا ہوں تو دیکھتا یہ ہوں کہ اپنے خیالات کے باب میں میں واقعی بہت کچھ عورتوں کی فراست کا احسان مند ہوں۔

عورتیں نقالی کیوں کرتی ہیں | خالص ادبیات اور فنون لطیفہ کو لیجئے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میدان میں عورتیں مردوں کی نقالی کیوں کرتی ہیں؟ میں یہ پوچھتا ہوں کہ رومی ادبیات یونانی ادبیات کے متبع کیوں ہیں اور مبصرین ایک کو دوسرے کی نقل کیوں قرار دیتے ہیں؟۔ اس کی وجہ بس یہی ہے کہ اہل یونان دنیائے علم میں پہلے نمودار ہوئے تھے۔ اگر عورتیں مردوں سے جدا ہو کر کہیں اور رہتی ہوتیں (یا مردوں سے پہلے پیدا ہوئی ہوتیں) تو یقیناً وہ ادبیات میں ہرگز مردوں کی نقال نہ ہوتیں۔ عورتوں کے اس میدان میں آنے سے پہلے ہی وہ سب کچھ ہو چکا تھا جس کا خیال اُنھیں اب آیا ہے۔ پس لامحالہ اب جو ان کا سبق ہوگا وہ دوسروں کا آموختہ ہوگا۔ ان میں جدت کہاں سے آسکتی ہے۔ اور قابل الزام کیا بات ہے؟ فرانس اور اطالیہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ باوجود پرانے ادبیات کا اتباع ترک کر دینے کے کوئی مہتم بالشان جدت نئے ادبیات میں نہیں پیدا کی جا سکی۔ اور عورتیں تو ابھی صرف مردوں ہی کی شاگرد ہو رہی ہیں۔ ابھی سے وہ جدت کیسے پیدا کر لیں گی؟ اگر عورتیں مجموعی طور پر اپنا رنگ الگ اختیار کرنا چاہیں تو اس میں صدیاں گذر جائیں گی تب وہ بات حاصل ہوگی۔ کیونکہ عجلت میں تو صرف نقل ہی ہو سکتی ہے۔ اور نقل سے انسان اصل بھی اختیار کر سکتا ہے

مگر دیر میں۔ کیونکہ جمہور کا رواج ترک کرنا ایک دن کا کام نہیں۔ اگر عورتوں کو بحیثیت مجموعی اپنے فطری مذاق کا مطالعہ کرنا ہے اور ایک نیا رنگ ادبیات یا صنائع میں اختیار کرنا ہے تو اس کے لئے مدتوں کی کاوش درکار ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ چونکہ مرد اور عورت کے ذہنی رجحانات میں کوئی اصولی فرق بالآخر نہ پایا جائیگا اس لئے ان کا کوئی مخصوص رنگ قایم ہونے کی توقع نہیں ہوسکتی۔ اب رہا اُن میں سے ہر ایک کے مذاق میں وجہ تمیز قایم ہونا اس میں ابھی کافی عرصہ لگے گا۔ کیونکہ وہ سابق کے اثرات سے چھٹکارا آسانی سے نہیں پاسکتیں۔

فنون لطیفہ میں عورتیں کیوں پیچھے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ فنون لطیفہ میں عورتوں نے بہت کم کوئی جدت دکھائی ہے اور انہی فنون میں ان کی کم مایگی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ فنون لطیفہ کو فی الجملہ عورتوں نے کبھی کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا اور ظاہر ہے کہ ان فنون میں پیشہ ور لوگوں نے اُن لوگوں کی کوئی قدر نہیں باقی رکھی جو ان کو شوقیہ حاصل کرتے ہیں۔ عورتوں کو موسیقی تو ضرور پیشہ کی غرض سے بھی سکھائی جاتی ہے مگر وہ موسیقی کا برتنا سیکھتی ہیں نہ کہ وہ چیز جس سے ان میں واقعی جدت اور اختراع کا مادہ پیدا ہو۔ لیکن ناٹک کی اداکاریوں میں وہ اگر مردوں سے زیادہ نہیں ہیں تو کسی طرح ان سے کم بھی نہیں اب جو پیشے مردوں کے لئے مخصوص ہیں ان میں عورتوں کا مقابلہ صرف ان ہی مردوں سے ہوسکتا ہے جو فن کو عورتوں کی طرح محض شوقیہ اختیار کئے ہوئے ہوں۔ چنانچہ دُھن اور راگنیوں کی تصنیف میں عورتیں کسی غیر پیشہ ور مرد سے ہرگز گھٹ کر نہیں رہتیں۔ اور اسی امر کو ملحوظ خاطر رکھئے تو مصوری میں بھی عورتیں مردوں کی ہم پلہ ہی ثابت ہوں گی۔ البتہ وہ ان پرانے مصوروں کا مقابلہ آج بھی نہیں کرسکتیں جن کے زمانہ میں اعلیٰ حیثیت کے لوگ بھی فن مصوری حاصل کیا کرتے تھے۔ اور ان کا مقابلہ جہاں تک جدت کا تعلق ہے آج کل کے مرد مصور بھی بمشکل کرسکتے ہیں۔ چودھویں اور پندرھویں صدی میں اٹلی کے مشہور مصور وہ لوگ تھے جو اپنے زمانہ کے بہترین تعلیم یافتہ اور مہذب لوگ سمجھے جاتے تھے۔ بلکہ بعض تو وہ تھے جن کو یونان کے سے ہمدردان حکماء کے ہم پلہ خیال کرنا چاہئے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ فنون لطیفہ کو انسانی تخیل اور محسوسات کی بنا پر وہ درجہ دیا جائے کہ کوئی آدمی ان میں کمال حاصل کرکے دنیا کا

بہترین انسان مانا جا سکے۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ انسان کی عظمت سیاسی یا فوجی قابلیت کے لحاظ سے دنیا میں قایم ہوتی ہے۔ اور صرف ایسی ہی چیزیں رہ گئی ہیں جنھیں سیکھ کر آدمی کسی بادشاہ کا مقرب یا کسی رئیس کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔ آج کل اگر کسی کو کسی فن میں اپنی شہرت یا کمال حاصل کرنے کے لئے سرمغزن کرنا ہو تو وہ مصوری (پینٹنگ) کی طرف توجہ ہی مشکل سے کرے گا کیونکہ ایسے فنون میں شہرت کوئی شہرت نہیں رہی۔ البتہ موسیقی ایک دوسری ہی چیز ہے جس میں عام ذہانت کے علاوہ ذہن کی ایک خاص خداداد قابلیت بھی چاہئے۔ اور اسی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ عورتوں میں اب تک فن موسیقی کی کوئی جدت طراز مصنفہ کیوں نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس فن میں جس خاص ذہنی استعداد کی حاجت ہو اس کا ظہور بغیر مناسب تعلیم حاصل کئے ہوئے نہیں ہو سکتا۔ جرمنی اور اٹلی وہ ممالک ہیں جہاں دنیا کے بہترین مصنف گذرے ہیں۔ یہ مصنف سب مرد تھے مگر یہ وہ ممالک ہیں جہاں عورتیں ہر بات میں مردوں سے اب بھی بہت پیچھے ہیں۔ چنانچہ ایسے ممالک کے باکمال مردوں سے وہاں کی یا کہیں کی عورتوں کا مقابلہ کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

اس پس ماندگی کے مزید وجوہ | جن مشاغل میں عورتیں اور مرد یکساں شریک ہیں اُن میں عورتوں کا پیچھے رہ جانا اور بھی متعدد وجوہ پر مبنی ہے۔ اول تو عورت کو اُن مشاغل میں پڑنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ ان کا دماغ ہر وقت خانہ داری کے معاملات میں الجھا رہتا ہے کیونکہ تربیت کے لحاظ سے ان کا مآل زندگی گھر کے کاروبار کو سنبھالنا ہے۔ اگر سب عورتوں کا یہ حال نہیں تو ہر خاندان میں کم از کم ایک عورت تو اس طرح کی ضرور ہوتی ہے۔ بعض صورتوں میں ان فرایض کا انجام دینا جسمانی مشقت کے بغیر بھی ممکن ہے۔ لیکن گھر کی فکر وہ چیز ہے جو ہر آن دماغ پر قبضہ کئے رہتی ہے۔ کیونکہ خانہ داری میں ہر ہر لحظہ کی فکر اور ذرا ذرا سی بات پر نظر رکھنا پڑتی ہے۔ بلکہ ہر آن ایسے سوال درپیش رہتے ہیں کہ پہلے سے ان کا کوئی خیال بھی نہیں ہوتا۔ اس طرح ایک ایک بات کو سوچنا اور اُن کا خیال رکھنا ایسی ذمہ داری ہے جس سے دماغ کو دار ملنا ممکن ہی نہیں۔ اگر کوئی عورت بڑی مالدار اور حیثیت دار ہوئی تو ممکن ہے کہ ایک حد تک

ان جھگڑوں سے بھاگ سکے لیکن پھر بھی کہاں تک ؟ سارے خاندان کے آرام کی ذمہ داری اور پھر دنیا کا رکھ رکھاؤ یہ اس کی جان کے لئے کیا کم عذاب ہے ۔ اگر خانہ داری کا وبال اس کے سر سے کم ہوتا ہے تو اس رکھ رکھاؤ اور تعلقات کے نباہنے کی فکر اور زیادہ ہو جاتی ہے ۔ دعوتوں میں جانا، گانے کی محفلوں میں شرکت، شام کے جلسوں میں پہنچنا، دن کو ملنے جلنے کے لئے جانا آنا، خطوط لکھنا یہ سب تعلقات کا نباہنا ہے ۔ اور اس سب سے بڑھ کر ایک فرض دنیا نے ان پر اور عاید کیا ہے ۔ یعنی اپنے کو دلکش بنانا ۔ اونچے طبقہ کی عورت کی ہشیاری سب سے زیادہ اپنی اداؤں کے سنجیدہ بنانے اور بات کا سلیقہ سیکھنے میں صرف ہوتی ہے ۔ اگر صرف اس کے ظاہری پہلو کو لیجئے تو خوش پوشی کا ذوق بغیر دماغ خرچ کئے ہوئے حاصل نہیں ہوتا ۔ خوش پوشی سے میری مراد لامحالہ پوشاک کو قیمتی بنانے سے نہیں بلکہ یہ آدمی کے مذاق کی بات ہے جو طبیعت کی نفاست پسندی سے تعلق رکھتی ہے ۔ یہ مذاق بغیر قوت متفکرہ کے مسلسل کام میں لائے ہوئے نہ پیدا ہو سکتا ہے نہ باقی رہ سکتا ہے ۔ اور وہ ایک ہی قوت ہے جو اس مذاق کی ترقی میں بھی کام آتی ہے اور اسی سے علوم و فنون وغیرہ میں بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں ۔[۵۹]

---

[۵۹] "معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی ذوق سلیم ہے جو خواہ کسی علمی حقیقت کی دریافت میں کام آئے خواہ زیوروں کے انتخاب میں یا فنون کے اصول اخذ کرنے میں ۔ مثال میں لباس کے فیشن کو لے لیجئے جس میں اچھے بُرے مذاق کا برابر خیال رکھا جاتا ہے ۔ ہر زمانہ میں لباس کا فیشن بدلا کرتا ہے ۔ یعنی اس کا کوئی جزو کبھی چھانٹ کر چست کر دیا جاتا ہے اور کبھی بڑھا کر ڈھیلا کر دیا جاتا ہے لیکن فی الجملہ سراپا کی وضع وہی باقی رکھی جاتی ہے ۔ گویا لباس کی عام طرح ایک مقرر ہے جس پر ہر زمانہ کا فیشن کم و بیش مبنی ہوتا ہے ۔ اب جس شخص کی ایجاد و اختراع فیشن میں سب سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے یا جس شخص کی خوش پوشی اس کے ذوق سلیم کی داد دیتی ہے وہ درحقیقت اُسی فراست سے کام لینے کا عادی ہو جو اگر کسی بڑے مقصد کیلئے صرف کی جائے تو فنون کے بڑے بڑے کارناموں کے ذکر میں اسکے نتائج کہیں تو کمال فن کے نام سے موسوم ہوں اور کبھی ذوق سلیم کی جبلی زریں مثال کہلائیں ۔" (ماخوذ از مقالات سر جوشوا رینالڈس) ۔

غرضکہ فی الجملہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے پاس ایک ہی دماغ ہے جس کو وہ جدہر چاہے لگا دے۔ کیونکہ دنیا میں آدمی زیادہ تر ایک ہی کام میں لگ سکتا ہے اور ایک ہی طرف پورا دھیان رکھ سکتا ہے۔ عورت کو تو سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہر ایک اُسی کی ذات سے اپنی راحت ڈھونڈہتا ہے اور اس کو اپنا وقت اور اپنی زندگی بہتوں کی خدمت کے لئے وقف کرنا ہوتی ہے۔ اُس کی مخصوص ذمہ داریاں تو دوسری ہی چیز ہیں۔ اگر کوئی مرد فقط اپنا کار زندگی انجام دینے کے علاوہ کسی کو خوش کرنے کے لئے اپنا ایک منٹ بھی نہ صرف کرے تو کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اپنے روزگار یا پیشہ کا عذر کرکے ہمیشہ اس قسم کی توقعات کو بالائے طاق رکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی عورت اپنے لئے وجہ معاش پیدا کرتی ہے تو بھی سوسائٹی اُس کے اس قسم کے عذرات سننے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس کے گھر میں کسی کی علالت یا موت کا عذر کسی خوشی کے جلسہ سے اُس کی غیرحاضری کو معاف کرا دے لیکن جس شغلہ سے وہ اپنا پیٹ پالنا چاہتی ہے وہ ایسی صحبتوں سے غیرحاضر ہونے کے لئے کوئی حیلہ نہیں ہو سکتا جہاں اس کی صنف کو زینت محفل اور ذریعہ تفریح بنانے کا دستور ہے۔ بالعموم عورتوں میں سے اگر کسی کو کوئی نمایاں کام کرنا ہو تو اُسے سب سے بڑی پریشانی اس کے لئے وقت نکالنے میں ہوتی ہے اور یہی صورت حال ہے جس کی وجہ سے وہ زیادہ دیر تک اگر چاہے بھی تو کسی ایک طرف متوجہ نہیں ہو سکتی۔ پھر کیا عجب ہے جو عورتوں نے دنیا کے بڑے بڑے کاموں میں حصہ نہیں لیا۔ سائنس اور فلسفہ تو الگ رہا فنون لطیفہ میں تو صرف دماغ ہی صرف کرنا نہیں بلکہ ہاتھ کی مشق بھی درکار ہوتی ہے۔

شہرت مرد کے لئے عیب نہیں مگر عورت کے لئے عیب ہے

ہر ذہنی مشغلہ اور ہر فن میں ایک تو مہارت وہ ہوتی ہے جس سے پیشہ ور آدمی اپنی روزی کماتا ہے اور ایک مہارت اس کمال کا درجہ رکھتی ہے جسے حاصل کرکے آدمی زندۂ جاوید بن جاتا ہے۔ مگر اس پایہ کی مہارت بغیر کسی ایسے غیرمعمولی جوش اور ہمت کے نہیں حاصل ہو سکتی جو انسان کو دائمی مشقت اور مسلسل کوشش پر آمادہ نہ کر دے۔ محض طبعی میلان ایسی بے پایاں شہرت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اب خواہ اس کی علت کچھ ہی ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ عورتوں میں اس شدت کی شہرت پسندی نہیں ہوتی جو اس کو اتنی ہمت دلائے۔ کیونکہ ان کے مفاد کا دائرہ نہایت محدود ہے۔

وہ اپنا اثر صرف اپنے آس پاس کی مخلوق پر دیکھنا چاہتی ہیں۔ اُن کی آرزو اُن کی تمنا جو کچھ ہے وہ صرف اس قدر کہ جن لوگوں کو وہ اپنی نظر سے دیکھ سکتی ہیں بس وہ ان کو پسند کریں اور محبوب رکھیں۔ اور مقصد کے لئے جس قدر علم و ہنر درکار ہے وہی ان کے نزدیک کافی بھی ہے۔ یہ سیرت نسوانی کا وہ پہلو ہے جو بحالت موجودہ اُن کے متعلق رائے قایم کرنے میں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کو میں ان کی خلقت کی کجی پر ہرگز نہیں محول کرتا۔ مردوں کو شہرت کی جو ہوس ہے وہ تعلیم اور رائے عامہ کے اثرات سے پیدا ہوئی ہے۔ دنیا کی لذتیں چھوڑ کر مشقت کی زندگی اختیار کرنا شرافت نفس کی دلیل کہلاتا ہے۔ اور شہرت وہ چیز ہے جو اس عالی ہمتی کو اور فروغ دیتی ہے۔ لیکن یہی شہرت کی خواہش عورت کے لئے دیدہ دلیری اور ان کی نسوانیت کے منافی خیال کی جاتی ہے۔ پھر جب عورت کا معاشری فرض یہ ٹھیرا کہ جس کسی سے اسے سابقہ پڑے اُس پر وہ اچھا اثر قایم کرنے کی کوشش کرتی رہے اور اپنی راحت کا ذریعہ اُنہی کو قرار دے تو اس کا مفاد زندگی اس دائرہ سے بڑھ کر شہرت پسندی کی حد تک کیسے پہنچ سکتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کی نظر میں وقعت حاصل کرنے کی خواہش یقیناً عورت کو اسی قدر ہوتی ہے جتنی مرد کو۔ لیکن ہمارا نظام معاشرت کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ عورت کی عزت اور وقعت کا دار و مدار زیادہ تر اس کے شوہر یا باپ بھائی کی وجاہت پر ہوا کرتا ہے۔ بلکہ اگر وہ اپنی ہستی کو بغیر کسی مرد کے توسط کے بڑھانا چاہے یا مرد سے اپنا رشتہ توڑنا چاہے تو یہی بات اس کی ذاتی عزت کو مٹا دینے کے لئے کافی ہے۔ جس شخص کی نظر ہماری موجودہ زندگی کے خانگی اور معاشری پہلوؤں پر پہنچ سکتی ہے اس کے لئے مرد اور عورت کی ظاہرا اہلیت اور نااہلیت کے اسباب کو سمجھنا کوئی بات نہیں۔

عورت کی اخلاقی برتری باعتبار اخلاق کے مرد اور عورت میں جو فرق ہے اس میں عورت کی برتری مسلم ہے۔ لیکن یہ فقط زبانی تعریف عورت کی ہے جسے سن کر خوددار عورتیں جھنجھلا اُٹھیں گی۔ کیونکہ دنیا کے کسی اور معاملہ میں ایسا نہیں ہوا کرتا کہ اچھے اخلاق والے اونیٰ اخلاق والوں کی حکومت سہیں۔ اگر اس قسم کی فضول سائنس سے کوئی سبق حاصل ہوتا ہے تو یہی کہ اقتدار سے بڑھ کر نفس کو ذلیل کرنے والی کوئی چیز دنیا میں نہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ غلامی آقا اور غلام دونوں کے اخلاق کو غارت کرتی ہے لیکن اس میں غلام اُتنا

خراب نہیں ہوتا جتنا کہ آقا۔ کیونکہ اخلاقی قوت آزادی کی کمی یعنی "روک ٹوک" سے اُس قدر تباہ نہیں ہوتی جتنی کہ بے پایاں اختیارات کے استعمال سے۔ کہا جاتا ہے کہ عورتیں اُتنے جرائم نہیں کرتیں جتنے مردوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہی بات پرانے زمانہ کے حبشی غلاموں کی بابت بھی اتنی ہی صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے بس ہی میں نہیں وہ جرائم میں مبتلا ہونے کا موقع کہاں سے پائیں گے؟ سوائے اُس صورت کے کہ خود اُن کے آقا اُنھیں اس کی ترغیب دیں۔ دنیا کے اس اندھے پن کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں مل سکتی کہ عورتوں کے معاشری حالات پر کوئی نظر نہیں کرتا اور بڑے بڑے لکھے پڑھے لوگ بھی عوام کی طرح ایک طرف تو عورتوں کی ذہنی کمزوریوں کا دکھڑا روتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے اخلاق کی احمقانہ داد بھی دے رہے ہیں!

عورت اگر متعصب ہے تو کیوں۔

عورتوں کی اخلاقی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کے اس عیب پر بھی نظر پڑتی ہے کہ ان میں اخلاقی تعصب بھی بہت ہوتا ہے۔ اور یہ برابر کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تعصبات پر بالکل قابو نہیں رکھتیں۔ بلکہ اُن کی قوت فیصلہ ہر بات میں ان کی رغبت و نفرت کے تابع ہوتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ بات کچھ ثبوت کی محتاج ہے کہ مردوں کو جس قدر ان کا ذاتی مفاد گمراہ کرتا ہے اُس سے زیادہ عورتوں کو ان کے تعصبات گمراہ کرتے ہیں۔ دونوں کا اصل فرق زیادہ تر اس بات سے کھلے گا کہ مرد اگر اپنے ذاتی فرائض اور مفاد عامہ کے لحاظ کو ترک کرتا ہے تو محض اپنی ذات کے فائدہ کے لئے لیکن عورت اگر ایسا کرتی ہے تو (چونکہ اُس کی ذات کوئی ہستی ہی نہیں رکھتی نہ اس کے لئے ذاتی مفاد درحقیقت کوئی چیز ہے) کسی اور کے فائدہ کے لئے۔ سوسائٹی عورتوں کو صرف یہ احساس سکھاتی ہے کہ ان کے فرائض کا دائرہ بس اُن لوگوں تک محدود رہے جن سے اس کا تعلق ہے۔ اور صرف اُنہی کے مفاد کا لحاظ اُسے کرنا چاہئے۔ جہاں تک اس کی تعلیم کا تعلق ہے اُنھیں ان خیالات کا شائبہ بھی نہیں پیدا کرایا جاتا جو معمولی سمجھ کے لوگوں کے مقاصد اور اخلاق کو وسیع اور برتر بناتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ شکایت عورتوں کی بابت باقی رہتی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ ان کی زندگی کا جو ایک فرض مقرر کیا گیا ہے اُس کو وہ حد سے زیادہ وفاداری کے ساتھ پورا کرتی ہیں کیونکہ دوسرے فرائض کی طرف متوجہ ہونے کی اُن کو

چنداں اجازت ہی نہیں۔

مردوں کو کیوں عورتوں کی حمایت کرنا چاہئے

عورتوں کی موافقت میں جو کچھ کہا جاتا ہے اُس کو عموماً یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ عورتیں جس حال میں بھی ہیں مگر کسی بات کی شاکی نہیں ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ مرد کچھ دن اور اُن رعایتوں سے فائدہ اُٹھالیں جو معاشرت نے اُن کے لئے ناجائز طور پر مخصوص کر رکھی ہیں لیکن یہ غیر منصفانہ بات زیادہ دنوں چلنے والی نہیں۔ مشرقی حرم سراؤں کی عورتیں بھی تو کسی سے گلہ کرنے نہیں جاتیں کہ ہم کو یورپ والیوں کی سی آزادی کیوں نہیں دی جاتی۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ تو یورپ والیوں کو نہایت دیدہ دلیر اور بے شرم کہتی ہیں۔ خود مردوں میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی غلامی کو محسوس کرتے ہیں لیکن دنیا میں اگر کوئی آزادانہ طریق معاشرت دریافت ہو جائے تب بھی یہ لوگ یقین ہے کہ اپنی موجودہ پابندیوں کا کوئی گلہ ہرگز نہ کریں گے۔ عورتیں اپنی صنف کے لئے کوئی عام شکایت نہیں کرتیں۔ لیکن اُن کی تحریریں کم از کم ایسے درد بھرے دکھڑوں سے جن سے کوئی عملی نتیجہ نکلنے کا گمان نہیں ہو سکتا ہرگز خالی نہیں ہیں۔ سردست ان کا شکوہ بس اُسی طرح کا ہے جیسے مرد غم دنیا کا شکوہ کیا کرتے ہیں۔ ایسے شکوہ کا مقصد نہ تو کسی پر کوئی الزام رکھنا ہوتا ہے نہ حالات میں کوئی تغیر پیدا کرنا۔ عورتیں اگرچہ شوہروں کے اختیارات پر براہِ راست کوئی رائے زنی نہیں کرتیں لیکن ہر عورت جب موقع پا جاتی ہے تو خاص کر اپنے شوہر (یا شاید اپنی جاننے والیوں کے شوہروں) کے خلاف شکایتوں کا طومار ضرور باندھنا چاہتی ہے۔ اور یہ وہ صورت ہے جو بجنسہٖ ہر قسم کی غلامی میں (خاصکر جبکہ غلاموں کو آزادی کے خواب دکھائی دینا شروع ہو چکے ہوں) پائی جاتی ہے۔ آزادی کی تمنا جب پیدا ہونے لگتی ہے تو محکوم لوگ اپنے حاکموں کے اختیارات سے نہیں بلکہ پہلے اُن کے ظلم سے نالاں ہوتے ہیں اور بڑبڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد اُن کو حاکموں کے بے جا اختیارات پر حملہ کی جرأت ہوتی ہے۔ انگلستان میں عوام نے سب سے پہلے صرف چند حقوق بلدیہ (میونسپلٹی کے حقوق) کا مطالبہ کیا تھا پھر انھوں نے یہ ضد شروع کی کہ جبتک انتظامات میں ہماری رائے نہ شامل کی جائے ہم سے ٹیکس نہ مانگے جائیں۔ کیا اُس زمانہ میں کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات آسکتی تھی کہ بالآخر یہی عوام اپنے بادشاہ کے شاہی اختیارات بھی چھین لیں گے؟۔ اب نسوانی تحریک حریت ہی

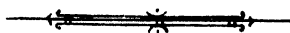
وہ تحریک رہ گئی ہے جس میں پرانے قاعدوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اشخاص اُسی طرح مطعون ہوتے ہیں جیسے وہ لوگ جو پرانے زمانہ میں اپنے بادشاہ سے اپنا حق بغاوت تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ اور ہر طرح کی لعن طعن سنتے تھے۔ جو عورت اپنے شوہر کی مرضی کے خلاف کسی تحریک میں حصہ لینا چاہتی ہے قبل ازیں کہ وہ دوسروں کے لئے خود کو شمع ہدایت بناسکے شہادت کا مرتبہ پہلے ہی پالیتی ہے۔ کیونکہ جہاں اُس نے دوسروں کو ابھارنا شروع کیا اس کے شوہر نے اُس کو وہیں پر روک دیا۔ پس عورتوں سے خود اپنی آزادی کے لئے کوشش کرنے کی چنداں توقع ہی نہیں ہوسکتی تاوقتیکہ مرد بھی بڑی تعداد میں اُن کا ہاتھ بٹانے پر آمادہ نہ ہوجائیں۔



غزل

کسی نے ابھی مجھ کو مانا نہیں ؎ موافق مرے یہ زمانہ نہیں
ابھی اور چمکیں گے جوہر مرے ؎ ابھی مجھ کو دنیا نے جانا نہیں
مری شاعری ہے تقاضائے ذوق ؎ مجھے زورِ فن آزمانا نہیں
مجھے خلق کے دل میں کرنا ہے گھر ؎ فقط رنگ اپنا جمانا نہیں
جو کہتا ہوں میں دل کی ہے واردات ؎ یہ کچھ شاعری یا فسانا نہیں
زمانا ہوا مجھ کو جیتے ہوئے ؎ مزا میں نے جینے کا جانا نہیں
نہیں ہے وہ، دل ہے کوئی اور شے ؎ اگر تیرِ غم کا نشانا نہیں
سجھایا میں نے بہت نیک و بد ؎ یہ دل میرا کم بخت مانا نہیں
مرا شیشۂ دل ہے نازک بہت ؎ نظر سے تم اس کو گرانا نہیں
خفا جس قدر چاہو مجھ سے رہو ؎ مگر دل سے مجھ کو بھلانا نہیں

میں ہنستا رہا زندگی بھر جلیل
کسی نے مرا درد جانا نہیں



کیفِ غم

نہ اعتبار قفس کا نہ آشیانے کا
یہاں مقام نہیں کوئی دل لگانے کا

دلِ حزیں نہ رہا رنجِ ہجر اُٹھانے کا
کہاں سے لاؤں مگر حوصلہ بُھلانے کا

کبھی ملامتِ شکوہ کبھی شکایتِ شکر
بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں وہ روٹھ جانے کا

کوئی شہیدِ ستم ہے کوئی قتیلِ کرم
معین ایک طریقہ نہیں ہٹانے کا

کہیں سے سُنیئے کسی کی زبان سے سُنیئے
ہر اک فسانہ ہے ٹکڑا مرے فسانے کا

نہ وہ تڑپ ہے نہ ہیجانِ آرزو دل میں
مآل دیکھ لیا ___ ؟ صبر آزمانے کا

سمندِ عمر تو کچھ سست رو نہ تھا کوکب
کہ برقِ غم نے کیا کام تازیانے کا



دنیا کی رفتار

(الف) غیر ممالک

حبش اور اٹلی حبش پران سطور کے لکھے جانے تک تو اٹلی نے حملہ نہیں کیا ہے - مگر تیاریاں مکمل ہیں۔ اور گذشتہ اشاعت میں برطانیہ اور فرانس کے اثر سے اٹلی کے باز رہ سکنے کا جو ذکر تھا وہ اثر بھی کارگر نہ ہوا۔ تینوں دول کی مشاورتی مجلس ناکام رہی - اور کیوں نہ رہتی - فرانس کا احتجاج محض رسمی اور دکھاوے کی بات تھی - اس لئے کہ فرانس تو کچھ عرصہ سے اٹلی کو ساتھ لینے کے لئے پوری کوشش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اٹلی جرمنی کے ساتھ ہو گیا تو سیاسی اقتدار کا جو فرانسیسی جال تمام یورپ میں پھیلایا ہے وہ نابود ہو جائے گا - رہی انگلستان کی حبش دوستی اور انصاف پروری تو یہ بھی برطانوی اغراض کے میٹھے میٹھے نام ہیں - اور اٹلی والے ایسے نادان تو ہیں نہیں کہ ان باتوں کو نہ سمجھیں!

اٹلی کا ایک ممتاز جریدہ 'اِل جوزال واٹالیہ' لکھتا ہے :- "برطانوی سلطنت بہت دولتمند ہے' بہت آباد ہے اور بہت وسیع ہے' لیکن برطانیہ کی یہ وسیع سلطنت صرف اس کے شہریوں کی پرامن حوصلہ مندی کا نتیجہ نہیں بلکہ اخلاقی اصولوں سے یکقلم بے نیاز فوجی فتوحات کا ثمر بھی ہے - انگلستان کے پاس اس وقت بھی آدھا افریقہ ہے - اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ اس کے پاس کیسے آیا۔ اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقبوضات میں تہذیب پھیلا کر ایک نیک کام کر رہا ہے تو اسے بھی ہمارے تہذیب پھیلانے کے حق کو تسلیم کرنا چاہیئے!"

جزیرہ سارڈینیا میں ان سپاہیوں کو مخاطب کر کے جو افریقی مہم پر بھیجے جا رہے تھے مسولینی نے کہا :- "کاگلیاری کے سیاہ پوش نوجوانو! ہمیں نئے پرانے بہت سے حساب چکانے ہیں اور وہ سب چکائے جائیں گے - ہمارے ملک سے باہر جو کہہ رہے ہیں اس پر کان نہ دھرو - ہم تو بس حرف بحرف

انھیں لوگوں کی نقل کریں گے جو اس وقت ہمارے استاد بن رہے ہیں۔ وہ ہمیں پہلے ہی اچھی طرح سکھا چکے ہیں کہ جب سلطنت بڑھانے یا اس کے تحفظ کا سوال آتا ہے وہ دنیا کی رائے کا ذرا لحاظ نہیں کرتے!"

ان بیانات کے ہلکے طعن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ برطانیہ کا یہ منہ تو نہیں کہ وہ کسی اخلاقی اصول کی حمایت کا نام لے کر اٹلی کو حبش پر قابض ہونے سے روکے۔ جمعیۃ اقوام کی رکنیت، آزادیٔ اقوام، ایک قدیم عیسائی حکومت کی حمایت، پسماندہ قوموں کی حمایت یہ سب انچھر کہیں اور چل جائیں تو چل جائیں اس ملک پر کیسے چلتے جس سے برطانیہ مدتوں سے اسی حبش کے علاقہ کی بانٹ کے متعلق "ساز باز او عہد و پیماں" کرتا رہا ہے۔ اٹلی اب اس برطانیہ اخلاقی تعلیم کو کیسے بآسانی مان لے جس نے ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۴ء میں اسی اٹلی سے ۳ معاہدے کئے جن تینوں میں حبش کے تقریباً تمام علاقہ کو اٹلی کا حلقہ اثر تسلیم کیا گیا۔ یہ ضرور ہے کہ ۱۸۹۶ء میں اٹلی نے اپنی شکست کے بعد حبش سے جو معاہدہ کیا اس میں حبش کی کامل خود مختاری تسلیم کی" مگر فرانس اور برطانیہ سے جب بھی اس باب میں گفت و شنید ہوئی تو یہ سارا علاقہ اٹلی ہی کے حلقہ اثر میں مانا گیا۔

۱۹۰۶ء کے معاہدہ میں بھی پھر ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۴ء کے معاہدوں کے مسلمات کو مانا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں اٹلی کی افریقی سلطنت کے مسئلہ پر مفصل تبصرہ ہوا اور لندن میں جو خفیہ معاہدہ ہوا اس میں بھی اٹلی سے افریقی نوآبادیوں میں اضافہ کا وعدہ کیا گیا کہ اس وقت جرمن حلوائی کی دوکان پر ہر ایک کو فاتحہ پڑھنے کا موقع تھا مگر جب جرمنی کی شکست کے بعد اس کی افریقی نوآبادیاں فاتحوں میں تقسیم ہوئیں تو فرانس اور برطانیہ نے تو افریقہ میں اپنا نوآبادی رقبہ بڑھا لیا مگر اٹلی کو اس میں حصہ نہ ملا۔ پھر اٹلی نے ۱۹۱۹ء میں اپنی نوآبادیوں ارٹریا اور سومالیہ کے درمیان حبش کے بیچ میں سے ہو کر ریل نکالنے کی تجویز برطانیہ کے سامنے پیش کی اور اس کے عوض برطانیہ کی اس خواہش میں مدد کا وعدہ کیا کہ وہ نیل ازرق پر بند باندھ سکے اور وہاں سے سوڈان کو ایک سڑک لے جائے تو اس یادداشت میں بھی اٹلی نے صاف لکھا تھا کہ "جھیل تسانہ کا رقبہ (جہاں سے نیل ازرق نکلتا ہے) اطالوی حلقہ اثر میں ہے اور اطالوی حلقہ اثر میں تمام حقوق اعلیٰ بحق اٹلی محفوظ ہیں!"

شاید اس وقت یہی بات برطانیہ کو ناگوار ہوئی کہ یہ معاملہ آگے نہ بڑھنے دیا گیا۔ مگر آخر ۱۹۲۵ء میں برطانیہ نے اٹلی سے یہی معاہدہ کیا بشرطیکہ اٹلی نیل ازرق کے پانی کے معاملہ میں مداخلت سے احتراز کا وعدہ

کرے۔ اس معاہدہ میں بھی تو برطانیہ نے تسلیم کیا تھا کہ "مغربی حبش بلا شرکت غیرے، طالوی حلقہ اثر میں ہے اس حلقہ میں جس قدر معاشی مراعات کا مطالبہ اٹلی کرے گا ہم اس کی حمایت کریں گے۔" اگر اس کے جواب میں برطانیہ یہ کہے کہ اس نے صرف معاشی حلقہ اثر تسلیم کیا تھا سیاسی نہیں تو اس کے جواب میں خود شاہ حبش کا یہ قول پیش کر دینا کافی ہے کہ "ہم اس حقیقت سے کیسے چشم پوشی کرلیں کہ معاشی اور سیاسی حلقہ اثر میں بہت قریب کا رشتہ ہوتا ہے۔"!

غرض یہ کہ برطانیہ کے لئے بہت مشکل ہے کہ وہ اٹلی پر کوئی اخلاقی اثر ڈال سکے۔ فرانس اٹلی کو جرمنی کا ساتھی نہیں بنانا چاہتا اس لئے برطانیہ کے اخلاقی راگ میں بہت دھیمے سُروں سے شریک ہے۔ بلکہ خیال تو یہ ہے کہ قیام روما کے زمانہ میں موسیو لاول فرانسیسی وزیر نے اٹلی کو اس معاملہ میں پوری آزادی کی بشارت دیدی ہے۔ حبش کا مسئلہ دراصل زور آوروں میں ایک کمزور کے مال کی تقسیم کا مسئلہ ہے۔ جاپان تک نے وہاں جو حقوق حاصل کرلئے ہیں ان کا ذکر ہم پچھلی اشاعت میں کرچکے ہیں۔ حبش کی ہمدردی نہیں بلکہ ان حقوق کا پاس ہے کہ اگر جاپانی سفیر متعینہ روما مسولینی کو یقین دلاتا ہے کہ جاپان کو حبش میں صرف اپنے معاشی اغراض سے سروکار ہے وہ کوئی سیاسی تعلق نہیں چاہتا تو جاپانی رائے عامہ کے دباؤ سے جاپان کی وزارت خارجہ یہ اعلان کرتی ہے کہ یہ بیان ہمارے ایما سے نہیں دیا گیا۔ انھیں حقوق کا پاس ہے کہ جاپان میں حبش کے مسائل کے مطالعہ کے لئے جمعیتوں پر جمعیتیں قائم ہورہی ہیں اور ان کی طرف سے حبشی وزارت خارجہ کو ہمت افزائی کے پیام بھیجے جارہے ہیں اور یہ مشورہ دیا جارہا ہے کہ ملک کی آزادی کسی داموں ہاتھ سے نہ دینا۔ امریکہ نے جو اپنا نہایت قابل سفیر اس دور افتادہ اور پسماندہ ملک میں بھیجا تھا تو وہ بھی کچھ یونہی نہیں۔ ایک امریکن اور برطانوی سرمایہ کی کمپنی نے آخر شاہ حبش کی موجودہ مصیبت سے فائدہ اٹھاکر آدھے ملک حبش کے تیل کا ٹھیکہ حاصل کرہی تو لیا۔ برطانیہ جو اخلاق سیاسی کی حمایت میں اٹلی کے خلاف قوت تک کے استعمال کو آمادہ معلوم ہوتا ہے اور جس کی بے غرضی کا یہ عالم ہے کہ اس مذکورہ بالا تیل کے ٹھیکہ کے متعلق اس نے حبشی حکومت کو خود اپنے اور امریکہ کے سرمایہ داروں کے مفاد کے خلاف یہ مشورہ دیا ہے کہ یہ ٹھیکہ اس وقت نہ دیا جائے (اگرچہ اس یقین کا ذکر بھی خبروں میں آچکا ہے کہ حبشی حکومت یہ مشورہ قبول نہ

کرے گی !) وہ بھی اپنے اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کی تدبیروں سے غافل نہیں ہے جو تقریباً نصف صدی سے اس کے پیش نظر ہے یعنی جھیل تسانہ کے پاس نیل ارزق پر ایسا بند بنانا جس پر اس کا قابو ہو۔ سنا ہے کہ گذشتہ جون میں مصری، سوڈانی (برطانوی نہیں !) حکومتوں اور حبشی حکومت میں معاہدہ ہوا ہے کہ اس بند کی تعمیر جس کا ٹھیکہ نیویارک کی وھائٹ کمپنی کو دیا جاچکا تھا مگر کام میں بوجوہ تعویق تھی، اب بہت جلد شروع ہو جائیگی۔ اس خبر کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مصری حکومت نے اواخر مئی گذشتہ میں تعمیری کام کے جس پروگرام کا اعلان کیا تھا اس میں اس بند کے لئے بھی روپیہ کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس مذکورہ معاہدہ کی رو سے، کہتے ہیں کہ، کام کے مصارف ۹۰ فی صدی (تقریباً ۲ کروڑ روپیہ) مصری حکومت اور ۱۰ فیصد سوڈانی حکومت برداشت کرے گی۔ تکمیل کے بعد محفوظ پانی میں سے ۱۰ فیصد سوڈان کو ملا کرے گا اور یہ حصہ ۲۵ سال بعد ۵۰ فیصد تک بڑھ سکتا ہے بشرطیکہ سوڈان مصارف میں بھی اس نسبت سے شریک ہو۔ حبش کو معاہدہ کی تکمیل پر ۵، لاکھ روپیہ ملے گا اور بند کی تیاری کے بعد سے ہر سال ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور لگان۔ اور اگر حبش کو روپیہ کی فوری ضرورت ہو تو اس لگان کی جگہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ بند بن جانے پر ۵، لاکھ روپیہ نقد لے لے اور پھر دس سال تک ہر سال ۵، ہزار روپیہ۔ بند کی تیاری میں حتی الوسع حبشی مزدوروں سے ہی کام لیا جائیگا۔ جھیل تسانہ کے پانی کی سطح پانی کے روکنے کی وجہ سے اونچی نہ ہونے دی جائیگی اور اگر کبھی ایسا ہو اور اس سے آس پاس کی املاک کو نقصان پہنچے تو مصری حکومت مالکان کو تاوان ادا کریگی۔ بند کی تعمیر کا کام شروع ہونے سے پہلے مصری اور سوڈانی حکومتوں کو ادیس ابابا سے اس جھیل تک ایک موٹر کی سڑک بنانی ہوگی اور اس کی مرمت کے مصارف برداشت کرنے ہوں گے۔

مختصر یہ کہ جاپان، امریکہ، برطانیہ سب اپنی اپنی فکر میں ہیں۔ اور حبش کی موجودہ مصیبت کے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ اٹلی چاہتا ہے کہ سب کچھ اسے ملے۔ اور یہ اٹلی کے مخالف اس لئے ہیں کہ انہیں بھی کچھ مل رہے۔ جمیعتہ اقوام سے بھی اس حالت میں کسی معقول مدد کی جو واقعی حبش کے فائدہ کے لئے ہو امید رکھنا عبث ہے۔ اس کے متعلق بھی تو کہنے والے نے خوب کہا ہے۔ " بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند"

لیکن خودغرضیوں کے اس معرکہ میں بہت سے اور اندیشے بھی ہیں۔ سب سے زیادہ اندیشہ تو یہ ہے کہ شاید اٹلی کو اس شان کی فتح نہ ہو اور اس قدر جلد نہ ہو جتنی کہ اس کی توقع ہے۔ اٹلی کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہیں ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ اٹلی ایک طویل جنگ کے بار کو اچھی طرح اٹھا بھی سکیگا یا نہیں۔ ۳۶-۱۹۳۵ء کے میزانیہ میں اس جنگ کے مصارف کے لئے گنجائش نہ رکھنے کے باوجود ایک ارب ۷۰ کروڑ لیرا کا خسارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری ریاستوں کے میزانیوں کا خیال کیجئے تو یہ خسارہ کچھ ایسا بہت نہیں۔ مگر اٹلی کے اپنے ملک میں نہ لوہا پیدا ہوتا ہے نہ کوئلہ، نہ تیل، نہ ربر، نہ کپاس اور یہ چیزیں صنعتی ترقی کی بنیاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہزار جتن کرلے کے باوجود اٹلی کا توازن تجارت اس کے خلاف ہے۔ ۱۹۳۴ء میں تجارت خارجہ میں ۴ فیصدی کی کمی ہو گئی اور وہ بھی اس ترتیب سے کہ برآمد میں تقریباً ۱۴ فیصدی کمی ہوئی اور درآمد میں ۲ فیصدی سے اوپر اضافہ۔ مجبوراً بہ نوں میں بہت سی چیزوں کی درآمد پر سابقہ اجازت نامہ کی قید لگائی گئی۔ اس لئے کہ درآمد کی قیمت ادا کرنے کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۴ء سے ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء تک سرکاری بنک سے کوئی ۲ ارب لیرا نکالے جا چکے ہیں۔

مالی حالت کے قابل اطمینان نہ ہونے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر جنگ نے طول کھینچا تو اٹلی کی دشواریاں بہت بڑھ جائیں گی۔ اس کا اثر آسٹریا میں کمزور ہوگا تو وہاں تونی۔ اشتراکی جماعت جو پہلے سے خاصی قوی ہے اور جرمنی کے ساتھ آسٹریا کا الحاق چاہتی ہے اور قوت پکڑیگی اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر جرمنی نے آسٹریا کا رخ کیا تو فرانس کو لامحالہ میدان میں کودنا پڑے گا۔ اور ایک عالمگیر جنگ کا آغاز ہو جائیگا جسے ہر چند کہ سب ناگزیر سمجھتے ہیں مگر ہر ایک اسے کچھ اور ٹالنے کی فکر میں ضرور ہے۔

دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر اٹلی ان یورپی پیچیدگیوں کے باعث اور اپنی مالی کمزوری کی وجہ سے اس مہم میں ناکام ہوا تو مسولینی کا اقتدار اٹلی میں ختم ہو جائیگا۔ اور اس اقتدار کے خاتمہ کے معنی یہ ہیں کہ اٹلی میں بالشویک طرز کی حکومت قایم ہو جائے۔ کہ فاشستی انقلاب کے بعد تغیر کی صورت بالشویکی انقلاب ہی نظر آتی ہے۔ اور یہ بات روس کے علاوہ کسی مغربی حکومت کو پسند نہیں۔ اس لئے کہ مسولینی شورہ پشت سہی مگر پھر سرمایہ داری نظام کا محافظ ہے۔

ان پیچیدگیوں کے پیش نظر مختلف دول کے رویہ کے متعلق پیش گوئی کرنا بہت دشوار ہے، مگر انداز یہ ہے کہ اٹلی جنگ کریگا۔ فرانس بظاہر اور انگلستان دل سے اس میں مزاحم ہونے کی کوشش کریں گے لیکن اس طرح نہیں کہ ان کی مزاحمت موثر ثابت ہوسکے۔ اٹلی جلد سے جلد کوئی فوجی فتح حاصل کرنے کی تدبیر کرے گا۔ اور اس کے بعد جمعیۃ اقوام یا دول عظمیٰ کے کہنے پر سمجھوتہ کریگا۔ اس سمجھوتہ میں اسے اس سے تو بہتر شرائط حاصل ہوجائیں گے جیسے اس وقت تک پیش کئے گئے ہیں۔ مگر شاید وہ سب کچھ حاصل نہ ہوسکے جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس کے "حق" میں سے جاپان، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کو بھی حصہ رسدی مل جائے! اور کیا عجب ہے کہ شاطر حکومت کو باوجود ہمدردیٔ انسانی اٹلی سے زیادہ ہی حصہ مل رہے!

مگر یہ سب عقلی قیاسات ہیں۔ تاریخ میں ایک نہایت موثر عنصر قسمت و اتفاق کا بھی ہے۔ اور ایسا بھی ہوا ہے کہ چھوٹی فوجوں نے بڑی فوجوں پر اور کمزوروں نے زور آوروں پر غلبہ پایا ہے۔ حبش کے حریت پسند مجاہد اگر مغربی استعمار کے مقابلہ پر اڑ گئے تو کیا عجب ہے کہ اس پسماندہ قوم کے ہاتھوں ہی یورپ کے سارے نظام معاشرت کا شیرازہ بکھر جائے!

اسپین | گذشتہ چار برس میں اسپین کو مشکل ہی سے ایک دن کو بھی چین نصیب ہوا ہے۔ چار سال پہلے جس جمہوریہ کا قیام ہوا تھا اس کا سب کام نومبر ۱۹۳۳ء کے انتخابات نے ختم کر دیا۔ اس انتخاب میں قدامت پسند اور معتدل جماعتوں کی بہت بڑی اکثریت حکومت کے لئے منتخب ہوئی۔ اور اس نے سابقہ انتہا پسندوں کے کئے ہوئے کاموں کو مٹانے کی سب تدبیریں کیں۔ گذشتہ اکتوبر میں جب ان کارروائیوں کے خلاف بلوے ہوئے تو انھوں نے نہایت مضبوطی سے انھیں دبا یا اور اس وقت سے تو حقیقی وزارتیں بنی ہیں سب نے ایک ایک کرکے انتہا پسندوں کو قومی کاموں سے الگ کر دیا ہے۔ موجودہ وزیر اعظم لیرو ذ بہت مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں۔ اسی لئے مارشل لا کے زور پر حکومت کر رہے ہیں۔ جون میں پھر مارشل لا کی مدت میں توسیع کر دی گئی اور وجہ یہ بتائی گئی کہ پولیس کا دباؤ کم ہوتے ہی پھر بدامنی شروع

ہوگئی تھی۔ اسی زمانہ میں وزارت نے ہر قسم کے سیاسی جلسوں کو تا حکم ثانی ممنوع قرار دیدیا۔ لیکن ان تدابیر سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے قدم کچھ بہت مضبوط نہیں ہیں۔ اور اس کے خلاف ناراضی کے جذبات عام ہیں۔ اس لئے کہ اس ممانعت سے چند ہی روز پہلے ویلنسیا میں سابق وزیر اعظم مانول ازانا کی تقریر سننے کے لئے ۸۰ ہزار آدمیوں کا مجمع ہوا تھا جس میں انھوں نے فرمایا" ہمیں جمہوریہ کے قیام کے لئے پھر سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسی جمہوریہ جو ۱۴ اپریل ۱۹۳۱ء والی جمہوریہ سے بہت بہتر ہو۔ اسپین کو امن اور سکون درکار ہے، جماعتی انصاف کی ضرورت ہے۔ اور یہ صرف لفظوں میں نہیں واقعی"۔ قرائن ہیں کہ یہ مانول ازانا اور سابق وزیر عدل پریٹو تمام ان سیاسی جماعتوں کو جو قدامت پسند نہیں ہیں یکجا کرکے متحدہ کارروائی کا انتظام کر رہے ہیں۔

مالی حالت نازک ہے۔ پردیسی قرضوں اور درآمد کی قیمت کی ادائیگی کے لئے بہت بڑی رقم باہر بھیجنی ہے۔ قومی ساکھ گھٹ رہی ہے۔ اگر اسپین ان وجوہ سے باہر کے ملکوں سے مال نہیں خرید سکتا تو باہر کے ملک اسپین سے کیسے خریدیں۔ ڈر ہے کہ اگر تجارت یوں ہی بگڑتی گئی تو ملک میں نہایت سخت بیکاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صورت حال کو درست کرنے کے لئے ساکھ کی خرابی کے باعث باہر سے اور قرض لینا دشوار ہے اس لئے اندرون ملک ہی میں مصارف کم کرنے کی تدبیریں کرنی ہونگی۔ اور یہ کام سیاسی بے اطمینانی کے زمانہ میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسپین میں پھر حکومت کا کوئی انقلاب جلد رونما ہو۔

یوگوسلاویا گذشتہ مئی کے انتخابات کے بعد دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ یوگوسلاویا میں امن چین ہے اور سربیوں اور کروٹیوں کی باہمی مخالفت میں معتدبہ کمی ہوگئی ہے اور عنقریب یوگوسلاویا کو ایک متحدہ قوم سمجھا جاسکے گا۔ لیکن پچھلے چند ماہ کے حالات سے اس خیال کی تصدیق نہیں ہوتی۔ شروع جون میں جب نئی یوگوسلاوی پارلیمنٹ (سکپشتینا) کا اجلاس ہوا تو صرف کروٹی نمائندوں نے ہی شرکت سے انکار نہ کیا بلکہ حکومت کی مخالف دوسری سیاسی جماعتوں کے مندوب بھی اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ کروٹی نمائندے تو

اپنے قائد اعظم اسٹیفن راڈیچ کے قتل (۱۹۲۸ء) کے بعد سے پارلیمنٹ میں شریک نہیں ہوئے اور انھوں نے اس انتخاب کے بعد بھی یہی اعلان کیا ہے کہ جب تک سیاسی انتخابات کسی بالکل غیر جانبدار حکومت کی نگرانی میں عمل میں نہ آئیں ہم حکومت سے تعاون کرنا نہیں چاہتے۔ ۲ جون کو ان کروٹی اور دوسری مخالف جماعتوں کے قائدوں نے جو قرار دادیں منظور کیں ان کا منشاء یہ ہے کہ (۱) ۱۹۱۸ء سے برابر ملک میں ایک کشمکش ہے۔ جس میں ایک طرف کروٹ قوم کی یہ امید ہے کہ یوگوسلاوی حکومت انہیں آزادی بخشے گی اور دوسری طرف یہ سربی حوصلہ ہے کہ یوگوسلاویہ کو بس ایک بڑا سرویا بنالیں۔ (۲) موجودہ حکومت نے معاملہ کو اس درجہ بڑھادیا ہے کہ سمجھوتہ کی توقع تقریباً کالعدم ہے۔ (۳) اگرچہ پچھلے انتخابات میں سرکاری پولیس نے بے شمار کروٹی کسانوں کو قتل تک کر ڈالا مگر کروٹ قوم کا عزم مصمم ہے کہ موجودہ مطلق العنان حکومت کی اس کوشش کا کہ کروٹ جماعت کو ملک میں ایک پست جگہ دی جائے آخر دم تک مقابلہ کرے گی۔ (۴) یوگوسلاویا کی بقا اس پر منحصر ہے کہ کروٹ جماعت کے مطالبات جلد از جلد پورے کئے جائیں، موجودہ حکومت کے حامیوں نے پارلیمنٹ میں اپنی بریت کے ثبوت دینے چاہے۔ اور اس میں کروٹ مخالفت کو بے حقیقت ثابت کرنا چاہا۔ اور جوش اتنا بڑھا کہ ساری کروٹ قوم پر خاصی لعن طعن شروع ہوگئی حتیٰ کہ شاہ اسکندر کے قتل کی سازش میں شمولیت کا الزام بھی کروٹ قائدوں پر لگا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزارت کے پانچ اراکین نے جو اعتدال پسند تھے استعفیٰ دیدیا اور اس طرح وزارت ٹوٹ گئی۔ شہزادہ پال نے بھی جو اس وقت ایجنٹ ہیں کچھ نرمی کا ثبوت دیا۔ اور کروٹ جماعت کے قائد ڈاکٹر ماچک کو بلگریڈ بلایا گیا۔ ماچک کا یہ سفر گویا ایک فاتح کا جلوس تھا۔ بلگریڈ میں شہزادہ پال کے سامنے ماچک نے اپنے مطالبات پیش کئے اور اس پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ کئی مہینہ انتظار کر سکتے ہیں تاآنکہ ایک غیر جانبدار حکومت عام انتخابات کا انتظام کردے اس کے بعد ایک نئی وزارت ترتیب دی گئی۔ وزارت میں بہت سی ان جماعتوں کو شامل کیا گیا جو ملک میں صلح و آشتی کے خواہاں ہیں۔ بوسینا کے مسلمانوں کو بھی اس میں شریک کیا گیا۔ سابق وزیر اعظم کو وزارت میں شریک نہیں کیا گیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئی وزارت کروٹ جماعت کے ساتھ

انصاف کریگی اور کرد ٹوں کے قائد ڈاکٹر ماچک کو جن کے مشورہ سے یہ قائم ہوئی ہے ضرور اس کا یقین ہے لیکن غریب کروٹ پہلے بھی اس قسم کی بہت سی امیدیں خاک میں ملا چکے ہیں، اس لئے ابھی مشتبہ نظر سے اس سب تبدیلی کو دیکھ رہے ہیں۔ لیکن شہزادہ پال کا اثر غالباً اس مرتبہ کوئی معقول فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جائے۔

رومانیا | بظاہر اس ملک میں امن ہے۔ مگر یہ سکون غالباً طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔ اس لئے کہ سکون کے قایم رکھنے کے ذرایع ذرا مشتبہ قسم کے ہیں۔ اکثر بڑے شہروں میں فوجی قانون نافذ ہے۔ تقریر کی آزادی سلب کی جا چکی ہے۔ اخبارات پر سنسر متعین ہے، اور ہر شخص جس کو کوئی بھی سیاسی اہمیت حاصل ہے زیر نگرانی ہے۔ یہ سب اس لئے کہ موجودہ حکومت اور خاندان شاہی کا اقتدار قایم رہے جو اقتدار اپنے قیام کے لئے ان وسیلوں کا محتاج ہو اس کی بنیادیں ظاہر ہے کہ مضبوط نہیں ہوتیں۔ اور اس سارے ہنگامہ کی اصلی وجہ ـــــ کون باور کریگا ـــــ ایک مہ جبین یعنی شاہ کرول کی محبوبہ ماگدا لوپسکو ہے! یہ عورت جب سے شاہ کرول کے دل پر قابض ہوئی ہے رومانیا کے ملک پر بھی حکومت کر رہی ہے اور اس کی خاطر حکومت اور خاندان شاہی ساری قوم سے برسر پیکار ہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں گذرے کہ کسانوں کی سیاسی جماعت نے جو ملک میں بڑی اہمیت رکھتی ہے ایک عظیم الشان جلسہ کیا جس میں تمام ملک سے نمائندے شریک ہوئے اور اس میں ان کے قائد ڈاکٹر جولیس مانیو نے شاہ کرول کو صاف صاف الفاظ میں متنبہ کیا کہ ابھی وقت ہے کہ میڈم لوپسکو کو ملک سے باہر بھیجدیا جائے ورنہ رومانیا کے کسان جو آبادی میں ۸۰ فیصدی ہیں تخت شاہی کے خلاف بغاوت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ دوسرے مقرروں نے جتایا کہ میڈم لوپسکو کے تسلط کی وجہ سے اور محل کی سازشوں کے باعث ملک دنیا کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتا۔ دوسری سیاسی جماعتوں نے بھی اس قسم کے احتجاجی جلسے کئے ہیں۔ ایک طرف رومانی قوم ہے اور تخت شاہی، دوسری طرف ـــــ میڈیم لوپسکو! غریب کرول کے لئے فیصلہ واقعی مشکل ہوگا۔!!

یونان | یونان کا سب سے اہم سیاسی مسئلہ تقریباً دس سال سے یہی ہے کہ ملک میں حکومت خالص جمہوری ہو یا شاہی۔ مشہور سیاسی وِنی زِلوس جمہوری گروہ کا قائد تھا حکومت میں فوجی افسروں کے روزافزوں اثر نے اسے گذشتہ مارچ کی بغاوت پر آمادہ کیا۔ یہ بغاوت حکومت وقت نے نہایت آسانی سے دبا دی۔ خیال تھا کہ بغاوت کے بعد جو انتخابات ہونگے ان میں شاہ پسندوں کا پلہ بھاری رہیگا۔ مگر گذشتہ جون میں جب انتخابات ہوئے تو ۳۰۰ نشستوں میں سے صرف ۲ شاہ پسندوں کو ملیں۔ اور وزیراعظم سلدارس اور فیلڈ مارشل کنڈ اٹلس کی جماعت ۲۸۰ نشستوں پر اپنے آدمی منتخب کرانے میں کامیاب ہوئی۔ اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاہ پسندوں کی قوت بہت کم ہے اور یہ آسانی سے شاہی حکومت قایم نہیں کرا سکتے۔ مگر انتخاب کے بعد سے صورت حال کچھ ایسی بدل رہی ہے شاہ پسند تو کہتے ہیں کہ اگلے موسم سرما میں سابق شاہ جارج یونان کے تخت پر متمکن ہوں گے۔ اور قرائن بھی یہی بتاتے ہیں کہ اگر یہ توقع مبالغہ سے خالی نہیں تو بلاشبہ ملک اور اس کے اہل سیاست اس وقت شاہی حکومت کے قیام کے بہت زیادہ حامی ہیں، مثلاً یونان کے دو مشہور مدبر نکولاس پولیٹس نے، جو موجودہ نظام حکومت کے بانیوں میں سے ہے، خود بیان کیا ہے کہ قانونی شاہی مطلق جمہوری حکومت سے بلا شبہ ہزارگنی بہتر شکل حکومت کی ہے" خود وزیراعظم سلدارس جو انتخابات سے پہلے شاہی یا جمہوریت کے مسئلہ پر قومی رائے حاصل کرنے کا مخالف تھا اب اس کا حامی ہو گیا ہے۔ اور وزیر جنگ مارشل کنڈ اٹلس نے آخر جون میں اس خیال کا اظہار کیا کہ انھیں سابق بادشاہ کے واپس بلانے کے خیال سے ہمدردی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان لوگوں کی حمایت کے باعث اور خالص شاہ پسندوں کی کمزوری کے سبب سے بادشاہ اگر واپس آئیگا تو بھی حکومت کی شکل آئینی شاہی کی ہوگی مطلق العنان بادشاہت کی نہیں۔

چین | چین میں کیومن ٹانگ جماعت کو وہی اہمیت حاصل ہے جو اٹلی میں فاشستی جماعت کو اور جرمنی میں نازیوں کو۔ مسولینی اور ہٹلر کی طرح اس جماعت کا قائداعظم جنرل چیانگ کائی شیک ہے۔ چین کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ ملک میں سیاسی وحدت پیدا کی جائے اور وسائل دولت کو ترقی دی جائے۔ سات

آٹھ سال سے یہ جماعت ان دونوں کاموں کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ لیکن بیرونی حکومتیں خصوصیت کے ساتھ جاپان اسے یکسوئی کے ساتھ کام کرنے کی مہلت نہیں دیتیں۔ ۱۹۳۳ء میں تانگو کے مقام پر التوائے جنگ کا جو معاہدہ ہوا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر جنرل چیانگ نے مرکزی حکومت کو خاصا مضبوط بنا لیا اور اصلاح کے کاموں میں بھی اچھی ترقی کی۔ ۱۸ر جون کے نیوز کرانکل میں سر سیموئل ہور نے لکھا تھا "امن و قیام کی ترقی کی علامات نظر آ رہی ہیں اور مرکزی حکومت کے حملوں کی کامیابی سے اس کا اثر و اقتدار بڑھ رہا ہے" گذشتہ جنوری میں جاپان کی حکومت بھی چین سے صلح کرنے کے لئے آمادہ نظر آتی تھی اور اپریل میں اس نے چین کی ترقی کا اعتراف اس طریقہ پر کیا کہ اپنی چینی سفارت کو لیگیشن کی جگہ ایمبیسی کا مرتبہ دے دیا۔ لیکن پہلی جون کو عین اس وقت جب سفیروں کے تبادلہ کی خوشی میں دعوت ہو رہی تھی جاپانی فوج کا ایک نمایندہ تمام دنیا سے چین کی غداری، اشتعال انگیزی اور ریشہ دوانیوں کی شکایت کرنے لگا جس کی پاداش میں چین کے سامنے جاپانی فوج نے چودہ مطالبات پیش کئے اور ان مطالبات کے تسلیم کرانے کے لئے ہزاروں جاپانی سپاہیوں، ٹینکوں، مسلح موٹروں، توپوں اور دیگر اسلحہ جنگ کی نمائش کی گئی اور چودہ دن کے اندر جاپانیوں نے اپنے یہ تمام مطالبات چین کی قومی حکومت سے منظور کرا لئے۔

جاپان کو زمین کی جس بھوک نے بے چین کر رکھا ہے اس کی تسکین منچوکو جیسی آزاد ریاستوں کے قیام سے نہیں ہو سکتی چاہے ان میں اس کا اثر و اقتدار کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو جائے۔ وہ پھیلنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے اور سرحدوں کی حد بندیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن جب تک جاپان تمام دنیا کو اپنے زیر نگیں نہ کرلے سرحدیں بہر حال باقی رہیں گی اور لوگ یہ کہیں گے کہ "بس جناب اس کے آگے آپ کا حکم نہیں چل سکتا"۔ لیکن جاپان کی طاقتور اور منظم فوج اس گستاخی کی تاب نہیں لا سکتی اور تلوار کھینچ کر جواب طلب کرتی ہے "کیوں؟" اس کا جواب چین غریب کیا دے سکتا ہے۔ سہم کر پیچھے ہٹتا ہے۔ جاپانی تلوار نیام میں کر کے ایک قدم آگے بڑھا لیتا ہے۔ چین کہتا ہے "خیر یونہی سہی۔ آیندہ سے سرحد یہاں سے شروع ہوگی" جاپانی پھر بگڑ کر تلوار پر ہاتھ رکھتا ہے غرضکہ پیشقدمی اور پسپائی کا سلسلہ برابر جاری ہے،

برطانیہ، امریکہ، روس سب اپنی فکروں میں مبتلا ہیں۔ خواہ مخواہ کی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے رہی انجمن اقوام سو وہ ایسا ڈھونگ ہے جس کا فریب روز بروز کھلتا جا رہا ہے۔

جاپانی فوج سے جھگڑا سرحد پر ہی ہو سکتا تھا۔ منچوکو ریاست کے مغرب میں چہار اور جنوب میں ہوپی ای کے چینی صوبے ہیں۔ ان دونوں صوبوں کے گورنروں سے جاپانی فوج کو شکایت پیدا ہوئی۔ چہار کے صوبہ میں شکایت یہ تھی کہ جاپانی فوج کے چار خاص افسروں کو چانگ پی ای کے مقام پر کئی گھنٹہ تک روکے رکھا گیا۔ ان لوگوں کے پاس نہ پاسپورٹ تھے اور نہ کوئی اور ایسا کاغذ جن سے ان کی شناخت کی جا سکتی۔ ہوپی ای کے صوبہ میں شکایت یہ تھی کہ چین کے ایسے دو اخبار والوں کو کیوں قتل کیا گیا جنھیں جاپانی فوج اپنی موافقت میں پروپگنڈا کرنے کے لئے تنخواہ دیتی تھی۔ لیکن شہر ٹائنٹسین میں جہاں یہ چینی قتل ہوئے انتظام دراصل جاپانی پولس اور جاپانی فوج کا تھا اس لئے چینی حکومت اس الزام سے بالکل بری تھی۔

جاپانی مطالبات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صوبوں کے گورنر برطرف کر دئے گئے۔ ان کی جگہ ایسے گورنروں کا تقرر کیا گیا جو قومی حکومت کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں۔ قومی افواج ان علاقوں سے ہٹالی گئی ہیں۔ تمام ایسے حکام جن پر جاپانی فوج کو بھروسہ نہیں تھا علیحدہ کر دئے گئے ہیں۔ کیومن ٹانگ یعنی چینی قومی پارٹی کے تمام دفاتر ان علاقوں میں بند کر دئے گئے ہیں۔ شمالی چین میں جتنی جماعتوں کے متعلق یہ شبہ تھا کہ یہ جاپان کی مخالف ہیں سب توڑ دی گئی ہیں۔ جن درسگاہوں کے متعلق یہ خیال تھا کہ ان میں جاپان کے خلاف تعلیم دی جاتی ہے وہ بند کر دی گئی ہیں۔ جن چینی کتابوں میں جاپان کے خلاف کہیں کچھ عبارت لکھی ہوئی تھی وہ جلا دی گئی ہیں۔

ان واقعات کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ جاپان آہستہ آہستہ چین میں گھستا جا رہا ہے اور کسی مقام پر رکنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ کیونکہ جب کسی نئے علاقہ پر قبضہ کرتا ہے تو اس کی مدافعت کے لئے اس کے قریب کے علاقوں پر اثر قائم کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ اثر بڑھتے بڑھتے قبضہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر مجبوراً آگے کے علاقوں میں اثر قائم کرنے کی ضرورت درپیش

ہو جاتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔ جاپان نے پہلے جنوبی منچوریا پر قبضہ کیا۔ اس کی مدافعت کے لئے شمالی منچوریا میں اثر پیدا کرنا ضروری ہوگیا۔ جب تمام منچوریا پر مکمل اقتدار حاصل ہوگیا تو اس کی مدافعت کے لئے جہول اور اندرونی منگولیا پر اثر قائم کرنا ضروری ہوگیا اندرونی منگولیا پر قبضہ ہونے کے بعد اس کی مدافعت کے لئے ہوپی ای اور چہار پر اثر قائم کرنا ضروری ہوا۔ ان کے قبضہ میں آجانے کے بعد آگے کے اور علاقے ہیں تا آنکہ کل جمہوریت چین پر جاپان کا قبضہ ہو جائے گا۔ جنرل چیانگ کائی شیک اور انکی قومی جماعت سیاسی وحدت اور ملکی ترقی دولت کے خواب دیکھتے رہیں گے اور تلخ حقایق ان کے ہاتھوں سے ان کا ملک چھین کر جاپانی امپیریلزم کے حوالے کردیں گے چین کا ملک بھی ہندوستان سے کم بدنصیب نہیں ہے۔ دیکھئے ان دونوں ستم زدوں کے نصیب کب پھرتے ہیں!



تنقید و تبصرہ

کتب:-

تزک والا جاہ مصنفہ برہان ابن حسن، حصہ اول، مترجمہ سید محمد حسین نینر" مدراس یونیورسٹی اسلامک سیریز، نمبر۱۔ (انگریزی) تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۸}$، حجم ۱۴۷ صفحہ۔ قیمت صہ؍

یہ ایک سلسلے کی پہلی قسط ہے جس کا مقصد کرناٹک کے نوابوں کی تاریخ کے فارسی ماخذ اہل علم کی خدمت میں پیش کرنا ہے۔ ہندستان کی تاریخ سے جو لوگ سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں وہ اس سلسلے کی اہمیت کا اندازہ کر سکیں گے۔ کرناٹک کے نواب ہندستانی والیان ملک میں پہلے لوگ تھے جنھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو ملکی مسائل میں دخل دینے کی دعوت دی اور اس طرح ایک رسم قائم کی جس کی بدولت ہندوستان ایک غیر قوم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ لیکن باوجود اس کے کہ کرناٹک کے نوابوں نے انگریزوں کی حمایت قبول کی اور ثابت قدمی سے ان کا ساتھ دیتے رہے، انگریز مورخ ان کی کمزوریوں اور غلطیوں ہی کو یاد کرتے ہیں جو تصنیف اس وقت زیر نظر ہے اس میں صرف نواب انورالدین خاں کا ذکر کیا گیا ہے، لیکن اس میں ایک جگہ وہ احسانات انگریز سپہ سالار سرآیرکوٹ کی زبانی بیان کئے گئے ہیں جو انورالدین خاں نے انگریزی کمپنی پر کئے، اور یہ بھی جتا دیا جاتا ہے کہ نواب ان پر مہربان نہ ہوتا تو فرانسیسی انھیں سمجھ لیتے۔ ہمیں اس بات پر خوشی ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ معلوم کرکے بہت کچھ تسکین ہوتی ہے کہ کرناٹک کے نوابوں میں شرافت اور خودداری کی کمی نہیں تھی، ان کا قصور جو کچھ ہے سیاسی ہے، طبعی بداندیشی کا نتیجہ نہیں۔

فاضل مترجم نے فارسی ترکیبوں اور لفظی صنعتوں کو انگریزی میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر بہت اندازکے ساتھ، اور ترجمے میں خاصی روانی ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں دکنی تاریخ کے ماخذوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو حضرات تاریخ سے شوق رکھتے ہیں انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

م م

شذرات

مولوی ممتاز علی صاحب مرحوم کی وفات اتنا بڑا قومی حادثہ ہے کہ اس کا داغ ہمارے دلوں سے مدت تک نہیں مٹے گا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں کا کوئی گھرانا ایسا نہ ہوگا جس میں مولوی صاحب کا ماتم نہ ہورہا ہو۔ اخباروں میں جن تعزیتی جلسوں کی خبریں آتی ہیں ان میں ایک ذرا سا شائبہ اس غم والم کا نظر آتا ہے۔ لیکن اس کا پورا اندازہ ان غیر رسمی صحبتوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جن میں خاندان کے چھوٹے بڑے مل کر مرحوم کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان کا کوئی قریبی عزیز دنیا سے اُٹھ گیا۔ اتنے دلوں میں جگہ کرلینا ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ یہ اہل دل ہی کے حصے میں آیا ہے۔

مرحوم ان چند بزرگوں میں سے تھے جن کے حساس قلب پر غدر کے بعد مسلمانوں کی پستی کو دیکھ کر چوٹ لگی، جن کی بلند ہمت نے انھیں اس پستی سے ابھارنے کا عزم کرلیا اور جن کی صائب تدبیر نے اس عزم کو حتی الامکان پورا کیا۔ ان بزرگوں میں سے ہر ایک نے قومی زندگی کو سدھارنے کا کوئی کام اپنے ذمے لے لیا اور اسی کے ہورہے۔ مولوی صاحب مرحوم کا کام سب سے مشکل تھا۔ جہالت اور تعصب کی وجہ سے ہر اصلاحی کوشش کی مخالفت ہوتی تھی لیکن تعلیم نسواں، حقوق نسواں کا تو نام ہی لینا غضب تھا۔ سرسید مرحوم جیسے روشن خیال بزرگ جو تحریک اصلاح و ترقی کے روح رواں اور اس شعر کے حقیقی مصداق تھے۔

یک چراغے است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

تعلیم نسواں کے بارے میں تاریک خیال نہیں تو تنگ خیال ضرور تھے، مولوی صاحب انھیں کے نظر کردہ تھے مگر ان کی نظر اس معاملے میں زیادہ وسیع اور زیادہ گہری تھی اور ان کی ہمت کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں جس نے قوم کی مخالفت کے علاوہ سردار قوم کی مخالفت کا ادب سے، خاموشی سے استقلال سے مقابلہ کیا اور کم وبیش چالیس سال کی مدت میں تعلیم نسواں کے پیام کو ہندوستان کے ایک ایک گوشے میں پہنچا دیا۔ اب زمانے کا رنگ اور قوم کا مذاق بہت کچھ بدل گیا ہے مگر ابھی تک تعلیم نسواں اور آزادی نسواں کی

اہمیت جیسی چاہیئے نہیں سمجھی گئی ہے۔ جس دن یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں آجائے گی اس دن مولوی ممتاز علی کی ذات اور ان کی خدمات کی حقیقی قدر ہوگی۔

ہم مرحوم کے صاحبزادوں اور دوسرے عزیزوں کو یقین دلاتے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے طلبہ اور اساتذہ اس درد میں جس کا کوئی درماں نہیں ان کے شریک ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مرحوم کی مغفرت کرے ان کے اعقاب کو صبر عطا فرمائے۔ اس نے اپنے فضل سے مرحوم کو ایسے قابل بیٹے عطا فرمائے ہیں جو ان کے کام کو پہلے سے کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ہمیں اُمید ہے کہ سید امتیاز علی صاحب تاؔج مرحوم کی ایک مبسوط سوانح عمری مرتب فرمائیں گے جو خادمانِ ملت کے لئے شمع ہدایت ثابت ہوگی ۔



سالنامہ پیام تعلیم دہلی

(تاسیس نمبر ۳۵ سنہ)

نہایت خوشی کی بات ہے کہ پیام تعلیم کا تاسیس نمبر ۲۹ اکتوبر ۳۵ سنہ ۶ کو بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع ہوگا۔ دستی تصویریں، ہاف ٹون اور لائن بلاک اس غیر معمولی تعداد میں دئے جائیں گے کہ بچوں کے کسی پرچے میں آج تک شائع نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ لاجواب تحفہ بچوں کے لئے ایک ایسی چیز ہوگی کہ عرصے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ کر خدمت خلق اور قوم پرستی کا سبق سیکھیں گے۔ ۳۴ سنہ ۶ کے سالنامہ کے مقابلہ میں یہ نمبر اسی قدر بہتر ہوگا جس قدر ۳۵ سنہ ۶ میں پیام تعلیم سالگذشتہ کے مقابلہ میں ترقی کر گیا ہے۔ جو بچے اس سب سے اچھے باتصویر رسالے کے خریدار نہیں ہیں فوراً ۲/ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر خریدار بن جائیں۔ یا اگر صرف یہ شاندار پرچہ خریدنا چاہتے ہوں تو ۸/ کے ٹکٹ بھیجدیں۔ پرچہ ۲۹ اکتوبر کو انھیں مل جائے گا۔

منیجر "پیام تعلیم" قرولباغ۔ دہلی

رجسٹرڈ نمبر   ال-۱۸۹۲



جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴	ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۱۰

فہرست مضامین

(پروفیسر محمد مجیب بی ۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

خط مولانا حالی مرحوم

برخوردار — تمہارا خط پہنچا مگر اسکو پہنچے ہوئے اب بہت دن ہو گئے اب بہت جلد
اپنی اور متعلقین کی خیر و عافیت لکھو جبتک بارش نہ ہو حسن علی کو دھوپ اور لو میں
نہ بھیجدینا اور بارش کا حال بھی لکھو کہ ہوئی یا نہیں یہاں ابھی بارش نہیں ہوئی مگر دلی اور تمہارے ضلع
سے بارش کی خبر آئی ہے — بمبئی میں مولوی مہدی صاحب نعمانی صاحب سخت بیمار ہوگئے تھے اور انکا دم
یاس ہوگئی تھی اور علاج نقلیں انکی اور سے بہت پریشان تھے مگر اب بہت افاقہ ہے علالت نقلیں
انہیں کے پاس بمبئی میں ہیں — میں نہایت عدیم الفرصت ہوں اسی سبب سے دیوان اور
سکٹ وغیرہ نہیں بھیج سکا حقیقی کو دعا اور سارا اکی والدہ کو دعا راقم الطاف حسین حالی
۱۳ رجون ۱۸۹۳ء



حالی

مولانا حالی مرحوم کی زندگی کے حالات یا تو اس مختصر یادداشت میں ملتے ہیں جو انھوں نے خود مرتب کی تھی اور جو مکتوبات حالی اور مقالات حالی کے ساتھ شائع ہوئی، یا اس چھوٹے سے رسالے میں جو محمد امین زبیری صاحب نے لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس موقع پر جب حالی صدی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے، ہمارے اہل قلم میں سے کوئی مولانا حالی کی ایک مبسوط سیرت لکھنے کا ڈول ڈالے گا۔ ہماری آنکھیں مولوی عبدالحق صاحب کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

ہم اس مضمون میں ایک سرسری خاکہ مولانا حالی کی سیرت کا پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دھندلی سی، ادھوری تصویر ہے جو مولانا کی نظم و نثر کو پڑھ کر اور ان کے حالات ان کے عزیزوں سے سن کر، ذہن میں قائم ہو گئی ہے۔

اس تصویر میں ایک معلم، ایک نقاد، ایک مصلح قوم کے خط و خال بھی موجود ہیں لیکن دل کی کیفیت جو آنکھوں سے جھلکتی ہے صاف کہہ رہی ہے کہ یہ ایک شاعر کا چہرہ ہے۔

شاعر کا مفہوم ہمارے ملک میں بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ایک خاص کینڈے کے شاعر دیکھتے آئے ہیں اور ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ سب شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شاعر کا ہیولیٰ ایک ہے مگر تربیت کے فرق سے اس کی صورتیں دو ہو جاتی ہیں۔ وہ جوہر جو سب شاعروں میں عام ہیں یہ ہیں: تخیل کی تیزی، نظر کی باریکی، حسن اور تناسب کی پرکھ، احساس کی شدت خصوصاً محبت اور خودی کے جذبات کی فراوانی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعر کس زمانے میں پیدا ہوتا ہے اور اسے ان جوہروں کی تربیت کے لیے کون میدان ملتا ہے۔

اگر زمانہ انتشار کا ہے، معاشرت کا شیرازہ بکھر چکا ہے، فرد کا رشتہ جماعت سے ٹوٹ گیا ہے، سب اپنے اپنے حال میں اور اپنی اپنی فکر میں ہیں تو شاعر بھی باہر کی دنیا سے آنکھ بند کر کے اندر کی دنیا میں ڈوب جاتا ہے

اس کا تخیل اور اس کا مشاہدہ نفس کے دائرے کو اپنی جولانی کے لیے تنگ پاتا ہے تو اس واردات کو جو قلب پر گزرتی ہے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس میں نئی نئی باریکیاں پیدا کرتا ہے۔ یہاں تک کہ مشاہدے کی قید ہی ٹوٹ جاتی ہے۔ محض خیال کے جادو سے وہ ایک طلسم حیات باندھتا ہے اور اسی میں مگن رہتا ہے۔ اس کی نظر حسن اور تناسب کو ڈھونڈتی ہیں مگر وہ عالم فطرت اور عالم معاشرت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ اپنے مذاق کے مطابق ایک خیالی پیکر حسن تراشتا ہے اور اس کی خفیف سی جھلک کسی انسان میں دیکھ کر اسے اپنا معشوق بنا لیتا ہے۔ محبت کا جذبہ جس کی وسعت نامحدود ہے سمٹ کر اسی ایک مرکز پر قائم ہو جاتا ہے اور اس کی شدت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وہ اور تمام جذبات کو اپنے رنگ میں رنگتا اور شاعر کی ساری زندگی پر چھا جانا چاہتا ہے۔ مگر خودی کا جذبہ جو اس داخلیت کی فضا میں پھیل کر خود پرستی کی حد تک پہنچتا ہے محبت یا عشق کا حریف مقابل بن جاتا ہے عشق اور خودی کی اس کشمکش سے شاعر کی نفسی زندگی میں ایسے پیچ پڑ جاتے ہیں جو کھولے نہیں کھلتے۔ وہ وارفتہ مزاج، بے چین اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ وہ شدت سے محبت کرتا ہے اور اس سے زیادہ شدت سے شکایت کرتا ہے۔ جب معشوق اس پیکر خیال سے مختلف ثابت ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں ہے، جب اصلی زندگی طلسمی زندگی سے ٹکراتی ہے، تو وہ کڑھتا ہے، مچلتا ہے، فریاد کرتا ہے۔ اس کی وضع نفسی کی پیچیدگی، اس کے جذبات کا انتشار اور شدت، اس کے اسلوب بیان میں پیچیدگی، مبالغہ اور بے ربطی پیدا کر دیتی ہے۔ اردو شاعری نے اگر پہلے نہیں تو انیسویں صدی کے شروع سے یہی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ جو لوگ اس صدی میں پیدا ہوئے انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو انھیں صرف اسی قسم کی شاعری اور اسی قسم کا شاعر نظر آیا۔ کسی اور طرز کے شاعر کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر زمانہ موافق ہو، روح اجتماعی زندہ ہو، افراد کا رابطہ حیات و کائنات سے قائم ہو، شاعر کی خلقی صفات کو نشو و نما کا موقع ملے تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو جاتا ہے۔ تخیل کی تیزی مشاہدے کی وسعت کے ساتھ مل کر اسے خدا کی دنیا اور انسان کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہے، اس وسیع جلوہ گاہ میں اسے حسن و تناسب کا حقیقی جلوہ حسن صورت اور حسن معنی کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ وہ فطرت کی ہم آہنگی اور معاشرت کے توازن سے آشنا ہوتا ہے تو اس کے جذبات میں بھی ربط ضبط اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کا جذبۂ محبت نوعی ہمدردی کے ساتھ مل کر اس قدر وسعت حاصل کرتا ہے کہ دوستی، صلۂ رحم، حب وطن، حب انسان سب پر حاوی ہو جاتا ہے اور اگر وہ حب الٰہی کا حوصلہ کرے تو اسے زیب دیتا ہے۔ شاعر کی خودی کو یہ عالمگیر محبت کاٹ چھانٹ کر سنوارتی ہے۔ انانیت کے کانٹے نکل جاتے ہیں۔ خودداری، غیرت، استغنائے نفس کے پھول باقی رہ جاتے ہیں۔ زندگی اور خیالات کی حقیقت اور ہم آہنگی اسلوب بیان سے سادگی اور سچائی بن کر ٹپکتی ہے۔ یہ شاعر متین، خود مزاج، منکسر اور بردبار ہوتا ہے۔ وہ نفس انسانی، عالم معاشرت، عالم فطرت کے حقائق کو ہمدردی کی نظر سے خود دیکھتا ہے اور دوسروں کو دکھاتا ہے۔ درد و سوز اسی کا حصہ ہے اس لئے کہ اسے صرف اپنا ہی غم نہیں سارے جہان کا غم ہوتا ہے۔ عاشقی کا دعویٰ اسی کو پھبتا ہے اس لئے کہ وہ اپنی خودی کا عکس معشوق کی ذات میں نہیں ڈھونڈھتا بلکہ معشوق کی حقیقی صفات کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی طرف کھنچتا ہے زندگی کی تلخیاں اسے بھی چکھنی پڑتی ہیں، محبت کی کڑیاں اسے بھی جھیلنی پڑتی ہیں مگر وہ ضبط اور متانت کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ فریاد بھی کرتا ہے تو سادگی اور سچائی سے۔

شاعر کے اس تصور کو ذہن میں رکھ کر حالی کی زندگی پر نظر ڈالئے۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ بھائی بہنوں کی سرپرستی میں اس یتیم کی پرورش ہوئی۔ حالی کو شروع سے "خود بخود تعلیم کا شوق حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔" پہلے پانی پت کے دستور کے مطابق کلام مجید حفظ کیا۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی کتابیں اور عربی صرف و نحو پڑھی۔ ۔۔۱ برس کی عمر میں حالی کی شادی کر دی گئی اور بہ ظاہر ان کی تعلیم کا دروازہ بند ہو گیا۔

"مگر علم کی لگن نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حالی "گھر والوں سے روپوش ہو کر" دلی چلے آئے۔ اور ڈیڑھ برس وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی پڑھیں۔ یہاں انھیں غالب کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مرزا کے فارسی اور اردو شعر جو سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ ان سے حل کیا کرتے تھے اور ان کے چند فارسی قصیدے بھی ان سے پڑھے۔ شاعری کا جوہر جو فطرت نے حالی کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا غالب کے فیض تربیت سے ابھرنے لگا۔ ایک آدھ غزل اردو فارسی کی کہہ کر غالب کو دکھائی تو انھوں نے

کہا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کروگے"۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر کے لڑکے سے غالب جیسے جوہر شناس نے یہ بات کچھ دیکھ کر اور کچھ سمجھ کر کہی ہوگی۔

بزرگوں اور عزیزوں کے جبر سے حالی کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پانی پت واپس جانا پڑا۔ حصار میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں داخل ہوئے مگر ۱۸۵۷ء کی بدامنی میں گھر چلے آئے۔ کوئی چھ برس تک وہیں رہ کر "بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتے رہے"۔

۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رئیس جہانگیر آباد نے انھیں طلب کیا اور آٹھ برس تک نہایت شفقت اور محبت سے اپنے پاس رکھا۔ نواب صاحب اردو اور فارسی کے خوش گو شاعر تھے۔ ستھرا اور پاکیزہ مذاقِ سخن رکھتے تھے۔ ہم مذاق مربی کی صحبت سے حالی کی شاعری چمک اٹھی۔ اس عرصہ میں وہ غالب سے اصلاح لیتے رہے مگر اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا نواب صاحب کی صحبت سے۔ "وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔"

۱۸۶۹ء میں غالب نے وفات پائی۔ حالی نے اپنے شفیق استاد کا جو مرثیہ لکھا وہ ایک طرف ان کے کمالِ شاعری کا نمونہ ہے تو دوسری طرف ان کی احسان شناسی اور عقیدت مندی کو ظاہر کرتا ہے جو شاعروں کے یہاں بہت کم یاب جنس ہے۔ غالب کی سیرت کا وہ نقشہ کھینچا ہے کہ اس سے بہتر قلمی تصویر ہماری نظم و نثر میں نہیں ملتی۔ یونانیوں کے ذہن میں جو تصور "انسانیت" کا تھا اس کی جھلک حالی کو غالب کی ذات میں نظر آئی اور اسے انھوں نے شعر کا جامہ پہنا کر بقائے دوام بخش دی۔

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا　　　معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

یہ ایک شعر ایک قصیدے سے کم نہیں ہے۔

تھوڑے ہی دن کے بعد نواب شیفتہ کا بھی انتقال ہوگیا۔ حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی۔ یہاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوں ان کی عبارت کو درست کردیا

کریں۔ لاہور کے اس چار برس کے قیام نے حالی کے مذاق ادب اور مذاق شعر کو بہت کچھ بدلا۔ انگریزی کتابوں کے ترجموں پر نظر ڈالنے سے حالی کی طبع سلیم نے وہ باتیں اخذ کرلیں جو لوگوں کو انگریزی ادب کی تحصیل میں عمریں کھپانے سے بھی حاصل نہیں ہوتیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ "نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی" ادھر مولوی محمد حسین آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی "جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس عنوان پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔"

حالی نے اس مشاعرے کے لئے چار نظمیں "برکھارت" "نشاط امید" "مناظرۂ رحم و انصاف" اور "حب وطن" لکھیں۔ ۱۸۷۵ء یا ۱۸۷۶ء میں وہ لاہور سے دہلی اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آئے۔

یہ حالی کی زندگی اور ان کی شاعری کا پہلا دور ہے۔ ان کے اس زمانے کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ ان کے مکتوبات میں جو شائع ہوئے ہیں ۱۸۸۴ء سے پہلے کا کوئی خط نہیں۔ ان کی نظم و نثر سے سوائے اس کے کہ ان کے جذبات و خیالات کا اندازہ ہو زندگی کے واقعات کا کچھ پتہ نہیں چلتا اس لئے کہ خود نمائی اور خود فروشی ان کا شیوہ نہیں تھا۔ جو کوئی حالی کی سیرت لکھے گا اسے اس دور کے حالات معلوم کرنے میں بڑی کرید اور تلاش سے کام لینا پڑے گا۔

پھر بھی جو کچھ معلوم ہو سکا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی کی آدھی سے زیادہ عمر عسرت اور گمنامی میں کٹی۔ ان کی شادی خوش حال گھرانے میں ہوئی تھی مگر ان کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ گھر کی روٹیاں توڑیں۔ ان کے بزرگوں کو اپنے علم و فضل کی وجہ سے سلطنت مغلیہ سے مدد معاش ملتی تھی۔ سلطنت کے زوال کے بعد حالی کے والد کو اور خود ان کو انگریزی حکومت کی نوکری کرنی پڑی مگر زمانے کا رنگ بدل چکا تھا مشرقی علوم کی قدر نہیں رہی تھی۔ نئے حکمرانوں کے ہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت تھی ان سے حالی محروم تھے۔ اس لئے چھوٹے عہدوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ مگر اس کے باوجود ان کے احباب میں چھوٹے بڑے سب ان کا احترام کرتے تھے۔

ان کے پاکیزہ اخلاق اور سیدھی سادی خاموش طبیعت میں کس غضب کا وقار ہوگا کہ غالب جیسا

شخص اپنے نوجوان شاگرد کے آگے جھکتا تھا۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حالی نے واعظانہ جوش میں "نماز پنجگانہ کی فرضیت پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا جس میں ان سے اس بات کی درخواست کی تھی کہ آپ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔" غالب کے پاس اس زمانے میں گم نام خط بہت آیا کرتے تھے جس میں لوگ "ان کے افعال و اعمال پر بہت نازیبا طریقے سے ملامت کرتے تھے اور کھلم کھلا گالیاں تک لکھتے تھے۔" حالی کی تحریر پڑھ کر برس پڑے، اپنی گنہگاری کا اعتراف ایسے دل خراش الفاظ میں کیا جس سے انتہائی رنج و غصہ ظاہر ہوتا تھا۔ دوسرے روز انھوں نے حالی کو ایک غزل لکھ کر بھیجی جس میں ان کی نصیحت گری کا شکوہ تھا۔ حالی نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کو پڑھ کر غالب نے ایک قطعہ شیفتہ کو بھیجا جن کے ساتھ حالی دلی میں مقیم تھے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ غالب اور شیفتہ دونوں حالی سے کس قدر محبت رکھتے تھے اور ان کی کتنی عزت کرتے تھے۔

قطعہ

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری	ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب نجید	تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بہ فرض محال	بران سرم کہ دران عمر این دو کار کنم
یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ	دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

حالی نے پھر انتہائی ندامت کے ساتھ معذرت کا قطعہ لکھا۔ آخر غالب نے یہ کہہ کر کہ "ایں بحث بحشر موقوف" اس قصے کو ختم کیا۔ اس واقعے سے حالی کے مذہبی جوش کا بھی پتہ چلتا ہے جو وہ اس عمر میں رکھتے تھے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کی رو میں ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جانے کا انھیں کتنا رنج ہوا مگر زمانے کا اثر کس غضب کا ہوتا ہے کہ حالی جیسا جوان صالح شاعری کی محفل میں قدم رکھ کر وہی بگلا راگ گانے لگا جو وہاں چھڑا ہوا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں تمدن و معاشرت کے انتہائی تنزل کے ساتھ شاعری بھی پستی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ انفرادیت اور داخلیت کا رنگ جس کا ذکر ہم نے اس مضمون کے ابتدا میں کیا ہے، چھایا ہوا تھا۔ اور وہ بھی ایسا بگڑا ہوا رنگ جس نے اخلاق کے ساتھ ادب کو بھی بگاڑ دیا۔ داخلیت

اور جذبات پرستی اشخاص ہیں ہو یا قوموں میں جوانی کے ساتھ کھپ جاتی ہے مگر خزاں عمر میں کسی طرح نہیں نبھ سکتی۔ ساون کے اندھے کو ہرا ہی ہرا سوجھے تو ایک بات ہے مگر کاتک کا اندھا ہرا ہی ہرا دیکھنا چاہے تو سمجھنا چاہیے کہ عقل کی آنکھوں سے بھی معذور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا شباب مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ گردش روزگار نے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر وہ جوان بننے کے شوق میں اکڑتے پھرتے تھے۔ ان کے ولولے سرد ہو چکے تھے مگر ٹھنڈی گرمیاں ابھی تک چلی جاتی تھیں۔ جوانی کے نشے میں انسان خود بخود اپنے نفس کی کیفیات میں ڈوب کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے لیکن جوانی کے گزر جانے کے بعد وہ کوشش کر کے یہ بے خبری پیدا کرنی چاہے تو اس کے دو ہی طریقے ہیں یا تو وہ عیش و عشرت کے گرداب میں چکر کھاتا ہے یا ترک و تجرد کے سراب میں لوٹا کرتا ہے خود پرستی کی یہ دونوں راہیں لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اختیار کر رہے تھے۔ اکثر شعرا خرابات مغاں میں "بگیر و بنوش" کا شور مچا رہے تھے اور بعض گوشۂ خلوت میں "بگذار و بگذر" کا نعرہ لگا رہے تھے۔

حالی کی طبیعت بالقوۂ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی، مگر زمانے کے طوفان اور جوانی کے ہیجان نے انھیں بھی اس چکر میں ڈال دیا۔ عنفوان شباب میں انسان کو پہلے پہل خودی اپنی جھلک دکھا کر چھپ جایا کرتی ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے پھر جب زمانے کی ہوا بھی اسی رخ چل رہی ہو تو اس کی سرگشتگی کا کیا ٹھکانا! تاہم حالی کی صلاحیت طبع نے اور غالب و شیفتہ کے فیض تربیت نے انھیں بہت کچھ سنبھالے رکھا۔ غالب سے انھوں نے حسن تخئیل، ندرت فکر، شوخی گفتار سیکھی، اور شیفتہ سے بیان کی سادگی اور سلاست کا ذوق حاصل کیا۔ اردو اور فارسی کے قدیم استادوں میں سے یوں تو سبھی کے کلام کا مطالعہ انھوں نے کیا ہوگا مگر میر، درد اور سب سے زیادہ سعدی کا اثر ان کے اشعار میں نظر آتا ہے۔ اسی کی برکت ہے کہ غزل کے اس رنگ میں بھی جو حالی نے محض عارضی محرکات کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جس سے انھیں خلقی مناسبت نہیں تھی، ایسے ایسے شعر مل جاتے ہیں:

قلق اور دل میں سوا ہو گیا ۔۔۔ دلاسا تمھارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا ہمیں زخم دل ۔۔۔ اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
بیاں ہے لیجئے جب نام اس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح — کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

اس دور کا شاہکار غالب کا مرثیہ ہے جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اس کا مقابلہ حالی کی قدیم غزلوں سے کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ رسمی قافیہ پیمائی اور سچی شاعری میں کیا فرق ہے۔ جب شاعر کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے میدان بھی وسیع ملتا ہے تو وہ کیا چیز کہہ جاتا ہے۔

لاہور کے طرز جدید کے مشاعرے کی نظمیں صاف کہہ رہی ہیں کہ حالی کی طبیعت پرانی شاعری کی کال کوٹھری سے نکل کر کھلے میدانوں میں جولانی دکھانے کے لئے بے چین تھی۔ بس ایک ذرا سی چھیڑ کی ضرورت تھی، ورنہ جو شخص آدھی عمر غزل گوئی میں صرف کر چکا ہو وہ پہلی کوشش میں "نشاط امید" اور "حب وطن" جیسی نظمیں کبھی نہیں کہہ سکتا۔

سنئے اور لطف اٹھائیے:۔

اے مری امید میری جاں نواز — اے مری دل سوز میری کارساز

....

کاٹنے والی غم ایام کی — تھامنے والی دل ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

....

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کا درماں ہے تو　　عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تو

....

ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب　　مشکلیں آسان نظر آتی ہیں سب

....

عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست　　گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست
تو نے دیا آ کے ابھارا جہاں　　سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

اے سپہر بریں کے سیارو　　اے فضائے زمیں کے گلزارو
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا　　اے لبِ جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری　　اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھونکو　　دہرِ ناپائیدار کے دھوکو
یوں تو ہر حال میں ہیں ہو عزیز　　تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز

"حب وطن" کے آخری حصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی کے دل میں درد ملت کا جذبہ بیدار ہو چکا ہے۔ ان کا دل اپنے تمدن و معاشرت کی بربادی پر کڑھتا ہے اور اسکی ترقی کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن ابھی تک اس میں مصلحانہ جوش پیدا نہیں ہوا ہے اور جوش پیدا ہوتا تو کیونکر؟ ملک کی جو حالت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے وہ انتہا سے زیادہ مایوس کن تھی۔ ۱۸۵۷ء کے قہر و غضب کے بعد لوگوں کے دل پر خوف، ہیبت، مایوسی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ ابنائے زمانہ اکثر نئے آقاؤں کی ہواداری میں مصروف تھے۔ پرانے وفادار پرانی خدمات کے صلے لے رہے تھے اور نئے خیر خواہ نئی خدمات انجام دینے کی فکریں کر رہے تھے۔ افراد کو چھوڑ کر مسلمان عام طور پر سہمے ہوئے، روٹھے ہوئے، اپنے گھروں میں بیٹھے تھے اور نئی حکومت، نئی تعلیم، نئی تہذیب سے کچھ واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کا انجام کیا ہوگا۔

۱۸۷۶ء میں دلی آنے کے بعد حالی کے دل پر انتہائی مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ جوانی کی ندی چڑھ کر اتر چکی تھی اور طبیعت سکون پر آ کر گزری ہوئی زندگی کا جائزہ لے رہی تھی۔ لاہور کے قیام میں حالی کا مذاق شعر بدل چکا تھا۔ اب انھیں اپنی پچھلی شاعری نکمی نظر آتی تھی اور اتنی عمر کے اکارت جانے کا بے حد قلق تھا۔ پھر یہ مشکل تھی کہ نئی آرزوئیں جو ان کے دل میں ابھرنے کے لیے بیچین تھیں مایوسی کے بوجھ سے ابھرنے نہیں پاتی تھیں بلکہ سچ پوچھیے تو حالی کو ان کا پوری طرح احساس بھی نہ تھا۔

در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام است

اس یاس و بے دلی سے حالی کو نجات دینے والا وہی شخص تھا جس نے اس نازک وقت میں تمام مسلمانوں کی دستگیری کی۔ سرسید احمد خاں کو اس تدبر اور حکمت عملی کا بچا کھچا سرمایہ ملا تھا جس کی بدولت مسلمانوں نے سات آٹھ سو برس ہندوستان پر حکومت کی۔ انھوں نے دیکھا کہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا اب کوئی مرکز باقی نہیں رہا ہے اور ان کا انتشار انھیں ہلاکت کی طرف لے جا رہا ہے۔ مصلحت شناسی کی نظر سے زمانے کے رنگ کو پہچان کر انھوں نے ایک طرف تو تمدن و معاشرت کے بکھرے ہوئے اجزا کو "قوم" یا "ملت" کے شیرازہ میں باندھنے کی کوشش کی اور دوسری طرف حکومت وقت سے، جہاں تک اس ذلت و افتادگی کی حالت میں ممکن تھا، عزت کے ساتھ مصالحت کرنے کا ڈول ڈالا جسے آج ان کے موافقین و مخالفین دونوں اپنی کم نظری سے ابدی وفاداری کا عہد سمجھتے ہیں۔ سرسید کو یقین تھا کہ مغربی علوم حاصل کرنا اور ایک حد تک مغربی تہذیب اختیار کرنا نہ صرف مسلمانوں کی ترقی کے بلکہ ان کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے ایک علمی انجمن کی، پھر ایک تعلیم گاہ اور ایک تعلیمی کانفرنس کی بنا ڈالی کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کریں۔

سرسید کی شخصیت اور ان کی تحریک کا حالی پر عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا، وہ راہ عمل نظر آ گئی، وہ مقصد حیات ہاتھ آ گیا جسے ان کا دل ڈھونڈھتا تھا۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبۂ قومی کو بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں۔

۱۸۷۹ء میں سرسید کی فرمائش سے حالی نے مسدس مدوجزر اسلام لکھا جس میں ان کی نئی قوت اور نیا جوش پورے شباب پر نظر آتا ہے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاعر اپنا دکھڑا رونے کے بجائے ایک قوم کے عروج وزوال کی داستان سناتا ہے، خیال آرائی اور مبالغے کو ترک کرکے اصلیت کا نقشہ کھینچتا ہے، لفاظی کو چھوڑ کر سیدھی سادی زبان اختیار کرتا ہے، تو اس کے کلام میں اعجاز کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ مسدس ان نظموں میں ہے جو مردہ قوموں کو جلا دیتی ہیں۔

سرسید کی بدولت شاعر کو قوم مل گئی اور قوم کو شاعر مل گیا۔ اب حالی کی زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف ہو گئی۔ چند سال تک وہ ملازمت کے سلسلے کو نبھاتے رہے۔ عربک اسکول دہلی سے بدل کر پنجاب کالج لاہور میں طلبہ کے اتالیق مقرر ہوئے اور تھوڑے دن بعد اپنی جگہ پر واپس آگئے۔ مگر اس عرصہ میں وہ برابر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی نظموں سے حامیان تعلیم کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ۱۸۸۸ء میں جب سرآسماں جاہ نے دولت آصفیہ کی طرف سے ان کا وظیفہ مقرر کیا تو فکر معاش سے مطمئن ہو کر وہ علمی اور ادبی مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

حالی نے جو مقصد اپنی زندگی کے قرار دئے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ملک کے ادبی مذاق کی اصلاح کریں۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے تھے۔ تنقید کے صحیح اصول مقرر کرنا اور عمدہ نمونے پیش کرنا۔ حالی نے ان دونوں طریقوں سے کام لیا۔ ۱۸۹۳ء میں انھوں نے اپنی قدیم وجدید غزلوں کا مجموعہ ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا جس میں شعر وشاعری کے اصولوں سے حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ ان کے حسن ذوق، وسعت نظر اور جدت خیال کا آئینہ ہے۔ جب کوئی غیر شاعر شعر کی علمی تنقید پر قلم اٹھاتا ہے تو عموماً منطقی بحثوں میں الجھ کر اصل حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ مگر حالی خود شاعر ہیں اس لئے انھوں نے اصولی مسائل کے ساتھ ساتھ فن کی باریکیوں کو بھی خوب سمجھا ہے اور خوب سمجھایا ہے۔ اردو میں حالی سے پہلے شعر کی تنقید کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ لفظوں اور ترکیبوں کو اساتذہ کے کلام کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لیں۔ حالی نے پہلے پہل یہ بحث چھیڑی کہ شاعری کی روح کیا ہے اور وہ شعر میں کیوں کر پیدا ہوتی ہے۔

نثر میں تنقید شعر کے علاوہ حالی نے سیرت نگاری کی صنف کو اختیار کیا۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے "حیاتِ سعدی"، ۱۸۹۶ء میں "یادگارِ غالب" اور ۱۹۰۱ء میں سرسید کی سیرت "حیاتِ جاوید" کے نام سے شائع کی۔ یہ تینوں بزرگ وہ ہیں جنھوں نے مختلف حیثیتوں سے ان کی زندگی پر اثر ڈالا ہے۔ غالب ان کے استاد تھے۔ سعدی جگت استاد ہیں۔ مگر جس حد تک حالی نے ان سے کسبِ فیض کیا ہندوستان کے کسی شاعر نے نہ کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں سعدی کا رنگ اتنا صاف جھلکتا تھا کہ لوگ انھیں "سعدیِ ہند" کہنے لگے۔ اور سرسید تو ان کی زندگی کے دوسرے دور میں ان کے مرشد ہی تھے۔ حالی کی احسان شناسی کا یہ بھی ایک ثبوت ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اور روحانی رہنماؤں کی سیرت لکھ کر ان کو حیاتِ جاوید بخش دی۔

سیرت نگاری میں بھی حالی نے وہی مجددانہ شان دکھائی جو شعر اور تنقید شعر میں دکھائی تھی۔ یہ تینوں کتابیں خصوصاً "حیاتِ جاوید" محض واقعات کی پوٹ اور تعریفوں کا پشتارہ نہیں بلکہ جدید طرز کی سوانح عمری کا نمونہ ہیں جس میں انسان کی پوری زندگی پر اور اس کے عمل پر تبصرہ کیا جاتا ہے، اس کا تعلق اس زمانے سے دکھایا جاتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ حالی ان تینوں بزرگوں سے، جن کی سیرت انھوں نے لکھی، خصوصاً سرسید سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے مگر نہ تو انھوں نے ان کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا ہے اور نہ جان بوجھ کر ان کی برائیوں کو چھپایا ہے۔

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں بھی پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوبِ بیان اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ علمی متانت و وقار کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔

ادب و شعر کی تہذیب و تجدید کے علاوہ دوسرا بڑا مقصد حالی کے سامنے یہ تھا کہ مسلمانوں کے دل میں جذبۂ ملی اور حمیتِ قومی پیدا کریں اور ان کے اس جوش سے تعلیم کی ترقی اور اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیں۔ مسدس کے بعد انھوں نے "تعصب و انصاف" "کلمۃ الحق" "مناظرۂ واعظ و شاعر" "پھوٹ اور

ابکھے کا مناظرہ" "شکوۂ ہند" "ننگ خدمت" کے ذریعے سے مسلمانوں کو ان کے اخلاقی عیوب پر غیرت دلائی، ان کے بزرگوں کے اوصاف یاد دلائے اور احتساب نفس اور تہذیب نفس کا سبق پڑھایا۔ "بیوہ کی مناجات" سے ایک شرمناک معاشرتی ظلم کی طرف متوجہ کیا اور "ترکیب بند بر مدرسۃ العلوم" "مسلمانوں کی تعلیم" اور اس قسم کی متعدد نظموں سے سرسید کی تعلیمی تحریک کی اہمیت سمجھائی اور اس کی مدد پر آمادہ کیا۔

عام طور پر شاعر، چاہے وہ اپنے کلام میں عمل کی کتنی ہی تلقین کرتے ہوں، خود عمل کے ہیٹے ہوتے ہیں۔ مگر حالی ان شاعروں میں سے نہیں تھے۔ انھوں نے جہاں تک ہو سکا سرسید کے کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ ان کے ساتھ ڈپوٹیشن میں حیدر آباد گئے۔ اپنی ذاتی کوشش سے پانی پت اور کرنال میں چندہ کر کے ایک معقول رقم ان کی نذر کی اور اپنے کنبے کے لڑکوں کو علی گڑھ میں داخل کرا دیا۔ اس کے علاوہ اپنے طور پر تعلیم کی ترویج میں دل وجان سے کوشش کرتے رہتے تھے۔ کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھوں نے پانی پت میں ایک اسکول قائم کرنے کی کوشش کی مگر کافی چندہ نہ ہو سکا جتنی رقم جمع ہوئی تھی اس سے ایک کتب خانے کی عمارت بنوا کر وکٹوریہ لائبریری قائم کر دی جو اب میونسپل کمیٹی کے انتظام میں ہے۔ آخر عمر میں حالی مسلم اسکول اور ایک لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جس کی وجہ سے پانی پت اور آس پاس کے علاقے کے مسلمانوں میں تعلیم کا چرچا ہو گیا۔ ان تعلیمی خدمات کے اعتراف میں وہ ۱۹۰۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کراچی کے صدر منتخب ہوئے۔ جو خطبہ انھوں نے اس موقع پر پڑھا وہ کانفرنس کے نہایت مفید اور پر مغز خطبات میں سے ہے جن کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ ہوگی۔

علی گڑھ کے ٹرسٹی کی حیثیت سے انھوں نے اس کے انتظامی امور میں بہت کچھ مدد دی اور جب کبھی کالج میں کوئی جھگڑا اٹھا انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ انصاف کی حمایت اور ترقی پسند جماعت کی ہمنوائی کی۔ سرسید کی محبت ان کے دل میں بسی ہوئی تھی مگر حق کی محبت اس سے بھی زیادہ تھی۔ اس لئے بعض موقعوں پر انھوں نے کھلم کھلا سرسید کی مخالفت کی مثلاً ۱۸۹۷ء میں جب یورپین اسٹاف کالج کے معاملات پر حاوی ہو گیا تھا انھوں نے اس کا زور توڑنے میں سرسید کی مخالف جماعت کا ساتھ دیا۔ اسی طرح مسٹر ماریسن اور مسٹر آرچبولڈ سے جو اختلافات ہوئے اس میں بھی وہ آزاد پارٹی کے ساتھ تھے۔

اب ذرا ایک نظر حالی کی ذاتی زندگی پر بھی ڈالئے۔ ایک سن رسیدہ عالم، شاعر، حق پرست، حق گو، صاف دل، پاک باطن، حلیم، منکسر، خوددار، غیرت مند، محبت کا پتلا، اخلاق کا مجسمہ، دوستوں کا دوست، عزیزوں کا کفیل، غیروں کا ہمدرد، پانی پت میں رہتا ہے۔ اس کا دل محبت سے معمور ہے، اس کی زندگی خدمت کے لئے وقف ہے۔ کس کی محبت اور خدمت؟ علم وادب کی، ملک وقوم کی، خاندان کی، ہمسایوں کی۔ ادھر تصنیف و تالیف کا شغل جاری ہے ادھر لوگ اپنی نظمیں اور کتابیں اصلاح کے لئے بھیجتے ہیں، علمی کاموں میں مشورہ طلب کرتے ہیں، ادبی مسائل کا حل چاہتے ہیں۔ یہ شخص سب کی فرمائشیں پوری کرتا ہے، سب کو جواب دیتا ہے اور اس عجز وانکسار کے ساتھ جیسے ان کے احسان کا شکریہ ادا کر رہا ہے۔ کوئی تعریف کرے تو شرمندہ ہوتا ہے، بجا اعتراض ہو تسلیم کر لیتا ہے، بیجا اعتراض ہو چپ ہو رہتا ہے۔ دشمن پھبتیاں کستے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، یہ چشم پوشی سے کام لیتا ہے۔ دوستوں میں سے کوئی جواب دینا چاہے تو اسے منع کر دیتا ہے۔ بغض وحسد کے بادل برستے ہیں اور برس کر کھل جاتے ہیں، علم کا دریا بہتا چلا جاتا ہے۔

کنبہ بہت بڑا ہے۔ اپنی اولاد، بھائی بہنوں کی اولاد، اولاد کی اولاد۔ مگر یہ مرد خدا اتنا بڑا دل رکھتا ہے جس میں ایک ایک کی گنجائش ہے۔ قریب کا عزیز ہو یا دور کا سب کے ساتھ ایک سی شفقت، ایک سا سلوک۔ محبت جب نامحدود ہو تو قریب اور بعید کا فرق باطل ہو جاتا ہے۔ اور اس شخص کی محبت بھی محض زبانی قلبی نہیں عملی محبت ہے۔ وہ سب کے دکھ سکھ میں شریک ہے، مشکلوں میں ہدایت کرتا ہے، ضرورت کے وقت دستگیری کرتا ہے، بیماری میں تیماردار ہے، مصیبت میں غمخوار ہے، خاندان بھر کے بچوں کی تعلیم کا کفیل اور تربیت کا نگراں ہے اور خاندان کے باہر بھی ہمسایوں کے ہونہار لڑکوں کو اپنی قلیل آمدنی میں سے وظیفے دے کر مدرسے میں پڑھنے بھجواتا ہے، جو پڑھ چکے ہیں ان کی معاش کی فکر کرتا ہے، جو برسرِ کار ہیں ان کی ترقی میں کوشاں ہے۔

وہ سچا دین دار ہے، مومن ہے، عابد ہے، زاہد ہے، احکام ظاہر کا پابند ہے، طریق باطن کا سالک ہے مگر اسے نہ دین کا گھمنڈ ہے، نہ ایمان کا، نہ عبادت کا، نہ زہد کا، نہ شریعت کا، نہ طریقت کا۔ وہ اپنی نجات کا وسیلہ دو چیزوں کو سمجھتا ہے جو اصل میں ایک ہیں۔ محبت اور خدمت۔

حالی کی سیرت کی یہ ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ آپ اسے صاف روشنی میں دیکھنا چاہیں تو ان کے

کلام کا مطالعہ کیجئے۔ ہم حالی کے دوسرے دور کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ طویل بہت ہو چکا ہے۔ تنقید اور تشریح کی گنجائش نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ حالی کا کلام آپ ہی اپنی تنقید اور آپ ہی اپنی شرح ہے۔

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا — باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ — ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی وگدا میں ہے طبیعی — جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں — ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ — دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ
ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر — سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی — پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو — نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

تذکرۂ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب — درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر — موج حائل ہے اور ہوا ناساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے اُبھرے　　یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں　　مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک
ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو　　ورق جب اس کا اڑائے گئی ہوا ایک ایک
بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ　　جگر کے پار ہے اب تک تری نوا ایک ایک

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم　　سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو　　کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں　　نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا　　کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا　　کچھ کر لو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں　　گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں　　جو جوانی میں مزہ دیتی تھیں تب بیداریاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق　　رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور　　تجھ سے جہاں میں لاکھ سہی تو مگر کہاں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ　　اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انھیں مگر — وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ — فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک واعظ — بہت جانچ لیتے ہیں دیتے ہیں تب کچھ
یہ طبل تہی ہیں جو پکارتے ہیں — جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن — مری الفت در و دیوار سے پوچھ
تصور میں کیا کرتے ہیں جو ہم — وہ تصویر خیال یار سے پوچھ

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے — کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

یاد ایام کہ بے رنگ تھی تصویر جہاں — دست مشاطہ نہ تھا محرم زلف دوراں
گل خود رو سے لبا تھا چمن کون و مکاں — چار سو حسن خداداد کا سکہ تھا رواں
وضع عالم میں نہ آیا تھا تغیر اب تک
خط قدرت کی وہی شان تھی اور لوک پلک
طفل معصوم کے مانند تھا یہ عالم پیر — نقش ہر اک صنعت بے چون و چرا کی تصویر
ملک فطرت میں نہ تھی سلطنت نفس شریر — طبع نے مملکت روح نہ کی تھی تسخیر
خواب غفلت کی گھٹا دل پہ نہ چھائی تھی بہت
دن چھپا تھا ابھی اور رات نہ آئی تھی بہت

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو — اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تو

ہے ناگوار ی پہچان تیری
الحق مڑا ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تو ہے
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے
خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے
رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے
تیرے جلو میں رسوائیاں ہیں
سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر
دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں
آتی ہے دنیا اک زلزلے میں

اے راست گوئی اے ابر رحمت
ہے اس چمن میں تیری ہی برکت
گر تو نہ ہوتی یاں سایہ افگن
برباد کب کا ہوتا یہ گلشن
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے
آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
تو بے کسوں کی یاور رہی ہے
تو گمرہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چھائی
کھیتی انھیں کی یاں لہلہائی
مشرق میں جب تھی تیری حکومت
چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دور تیرا مغرب میں آیا
مغرب کو تو نے مشرق بنایا

وہ مسلمانوں کی ہر بازی میں سبقت کیا ہوئی
وہ حجازی غیرت اور ملکی حمیت کیا ہوئی
ہم مسلمانوں سے ہے اے ہند ننگ اسلام کو
تھا لقب خیر الامم جس کا وہ امت کیا ہوئی
جی کسی کی عزت افزائی سے خوش ہوتا نہیں
دل گواہی جس پہ دیتا تھا وہ عزت کیا ہوئی
دین و دولت، علم و دانش ہم میں کچھ باقی نہیر
حق نے پوری کی تھی جو ہم پر وہ نعمت کیا ہوئی
ملک و مال و سلطنت اک آنی جانی چیز تھی
جو ہمیشہ رہنے والی تھی وہ دولت کیا ہوئی

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سر رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں — راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے — روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھئے — ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا

سرخ رو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اے مرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پہ میرے داغ ہیں جتنے — منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے — لینے کے یاں پڑ گئے دینے

....

سیلانی جب باغ میں آئے — پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا سوئے سیلانی بن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم — جب ہوئی پیت گنوایا پیتم

....

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھاؤں ہیں ارماں
منگنی بیاہ برات اور رخصت — میل ملاپ سہاگ اور سنگت

۷۹۴
۵

ہیں وو دن کے سب بہلاوے　　　　آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دنیا　　　　اوچھے کا سا پیار ہے دنیا

مولانا حالی کے آبا و اجداد

میں نے عرصۂ دراز کی تلاش و تحقیق اور بہت کچھ محنت و کاوش کے بعد شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی کی ایک مبسوط سوانح عمری قلمبند کی ہے جو "تذکرۂ حالی" کے نام سے انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگی۔ اپنے محترم دوست محمد عاقل صاحب ایم۔ اے نائب مدیر جامعہ کے ارشاد کی تعمیل میں اس تذکرہ کے اولین دو باب میں قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حالی کے قدرداں جو ملک میں کافی موجود ہیں انھیں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ فرمائیں گے۔

(محمد اسماعیل)

باب اوّل

مولانا کا نام و نسب اور خاندان

والد اور والدہ کی طرف سے مولانا کا شجرۂ نسب

آج اس بات کو پورے سو برس گذر چکے ہیں جبکہ شمالی ہند کے مشہور تاریخی شہر پانی پت میں نظم اردو کا بہترین نقاد، جدید اور نیچرل شاعری کا بانی، اور قومی، اصلاحی اور اخلاقی نظموں کا زبردست مجدد پیدا ہوا۔ والدین نے الطاف حسین نام رکھا۔ یہی وہ بچہ ہے جو بڑا ہو کر شمس العلماء مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام سے دنیا میں مشہور ہوا۔

مولانا والدہ کی طرف سے سید ہیں اور والد کی جانب سے انصاریوں کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جو مشہور اور جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اولاد سے ہیں۔ مولانا کے دونوں شجرے یہاں درج کیے جاتے ہیں جو نہایت تلاش سے فراہم کیے گئے ہیں۔

والد کی طرف سے شجرۂ نسب

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن خواجہ ایزد بخش بن خواجہ بو علی بخش بن خواجہ محمد بخش بن خواجہ غلام محمد بن خواجہ عبدالسبحان بن خواجہ عبدالکریم بن خواجہ مسلم بن خواجہ زین الدین احمد بن خواجہ عبدالکافی

بن خواجہ ضیاء الدین بن خواجہ ابو راشد بن خواجہ ابو حامد بن خواجہ ابوتراب بن خواجہ نصیر الدین محمود بن قاضی خواجہ ملک علی بن خواجہ میرک علی شاہ بن خواجہ مسعود بن خواجہ عمر بن خواجہ ابراہیم بن خواجہ عثمان بن خواجہ ابوطاہر بن خواجہ عتقہ بن خواجہ انفع بن شیخ نافع بن خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ بن خواجہ محمد الملقب بہ امیر شیخ ابواسحق بن خواجہ فضل اللہ بن خواجہ عبداللہ بن اسعد انصاری بن شیخ محمد (ثانی) بن شیخ نصیر بن شیخ محمد (اول) بن شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات بن ابو المنصور محمد بن ابی معاذ انصاری بن محمد انصاری بن احمد انصاری بن علی انصاری بن جعفر انصاری بن ابو منصور مت الانصاری بن حضرت خالد ابوایوب انصاری خزرجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شجرۂ نسب والدہ کی طرف سے | مولانا خواجہ الطاف حسین حالی بن امۃ الرسول زوجہ خواجہ ایزد بخش بنت سید محمد شفیع بن سید محمد امین بن سید عبدالرحمٰن بن سید عبدالرحیم بن سید ابوالقاسم بن سید علی بن سید منجھو بن سید محمد بن سید امجد بن سید نعمت اللہ بن سید اخوند بن سید حسام الدین بن سید شمس الدین بن سید معظم بن سید مرتضیٰ بن سید نورالدین بن سید مغیث بن سید محمد بن سید موسیٰ بن سید ابی تمیم بن سید یحییٰ بن سید ابراہیم بن سید موسیٰ نکول بن سید ابوجعفر بن حضرت سید اسماعیل شہید بن حضرت سید احمد بن حضرت امام ابوالقاسم اسماعیل شہداً یوری بن حضرت سید محمد ناطق بن حضرت اسماعیل ناطق بن حضرت امام جعفر صادق بن حضرت امام ابوجعفر محمد باقرؓ بن حضرت امام علی زین العابدینؓ بن حضرت سیدنا امام حسینؓ بن حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا بنت خاتم الانبیاء افضل الرسل حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

باب دوم

آبا و اجداد

حضرت ابوایوب انصاری، حضرت ابومنصور مت الانصاری، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری
ملک محمود شاہ انجو، خواجہ میرک علی شاہ، قاضی خواجہ ملک علی انصاری۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے مولانا، حضرت خواجہ ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے آباواجداد

میں سے اکثر بزرگ نہایت نامور اور مشہور ہوئے ہیں۔ چند کا نہایت ہی مختصر تذکرہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوایوب انصاری آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جب حضور نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی ہے تو یثرب پہنچ کر سب سے اول جس خوش قسمت انسان کو آنحضرت کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا وہ حضرت ابوایوب ہی تھے۔ جب تک مسجد نبوی اور اہل بیت اطہار کے لئے حجرے نہ بن لیے آنحضورؐ آپ ہی کے مکان میں قیام پذیر رہے۔ دراصل یہ کوئی تھوڑا اشرف نہیں ہے جو تمام انصار کے مقابلہ میں حضرت ابوایوب کو حاصل ہوا۔ تمام صحابہ اسی شرف کی وجہ سے آپ کی نہایت تعظیم کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں آپ کا وظیفہ پانچ ہزار سے بڑھا کر بیس ہزار کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں چالیس غلام ان کا کاروبار کرنے کے لئے ان کو مرحمت فرمائے تھے۔

۵۲ھ میں آپ ایک لشکر میں شامل ہو کر شام میں جہاد کے لئے گئے۔ لشکر کا امیر یزید بن حضرت معاویہؓ تھا مگر ابھی راستے ہی میں تھے کہ آپ ایسے شدید بیمار ہوگئے کہ زندگی کی آس نہ رہی۔ یزید عیادت کے لئے آیا تو آپ نے اسے وصیت کی کہ "اگر میں مرجاؤں تو میرے جنازے کو لے کر مع فوج کے روانہ ہونا اور کفار کی سرزمین میں جہاں تک جانا تمہارے لئے ممکن ہوسکے چلے جانا۔ جب دیکھو کہ آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہے تو وہیں مجھے دفن کر دینا اور لوٹ آنا۔" اس بوڑھے صحابی رسولؐ کی ہمت، اولوالعزمی اور بلند خیالی پر غور کرو کہ کتنی عجیب وغریب ہے۔ اس وصیت سے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس جوش میں فوج برابر آگے بڑھتی جائے گی اور دشمن کا ملک فتح ہوتا جائے گا۔ کتنا پاک جذبہ اور کتنا بہادرانہ خیال تھا۔ سچ ہے ؎

حق کو ہوتا ہے جنھیں دنیا میں کرنا سربلند
خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا

یزید نے اس مقدس وصیت کی پوری پوری تعمیل کی۔ جب اس جلیل القدر صحابی کا انتقال ہوگیا تو یزید نے فوج کو تیاری کا حکم دیا۔ جنازہ آگے آگے اور فوج پیچھے پیچھے لڑتی بھڑتی روانہ ہوئی یہاں تک کہ بالکل قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جنازہ پہنچ گیا۔ آگے راستہ کہاں تھا۔ پس یزید نے جنازہ وہیں دفن کر دیا اور شاہ قسطنطنیہ سے کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنے ایک محترم بزرگ کو یہاں دفن کیا ہے اگر تم نے دشمنی میں آکر ان کے مزار کی بے حرمتی کا

ارادہ کیا تو یاد رکھنا کہ شام میں عیسائیوں کے جس قدر گرجا ہیں فوراً سب کے سب زمین کے برابر کروا دوں گا۔

یہی خوف تھا جس کے باعث حضرت ابوایوبؓ کا مزار باوجود غیر سلطنت اور دشمن کے ملک میں ہونے کے ہمیشہ محفوظ رہا۔ جب ۸۵۷ھ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کیا تو اس نے آپ کے مزار کو پختہ اور عظیم الشان بنوا دیا اور وہ آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ترکی کے تمام سلاطین عثمانیہ کی رسم تاجپوشی آپ ہی کے پرانوار مزار پر عمل میں آتی رہی ہے۔

حضرت ابومنصور بن الانصاری | یہ حضرت ابوایوبؓ کے لڑکے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مہم حضرت احنف بن قیسؓ صحابی کی زیر سرکردگی خراسان بھیجی تھی۔ حضرت ابومنصور اسی فوج میں شامل ہو کر مدینہ سے گئے تھے۔ خراسان پہنچ کر آپ نے بمقام ہرات مستقل سکونت اختیار کر لی اور پھر واپس مدینہ نہ آئے۔ آپ نے اپنی شادی بھی ہرات ہی کی تھی اور غالباً یہی تعلق وہاں مستقل قیام کا باعث ہوا۔

شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری | حضرت ابوایوبؓ کی اولاد میں یہ بزرگ نہایت زبردست عالم اور بے عدیل فاضل گزرے ہیں۔ تمام متقدمین ان کی بزرگی، علم، زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کے قائل ہیں۔ فن حدیث کے بہت بڑے امام اور صوفی کامل تھے۔ ان کے فضائل و مناقب سے کتب تصوف و سیر بھری پڑی ہیں۔ بہت سی کتب کے مصنف، بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے خطیب تھے۔ ۸۰ سال کی عمر میں ۲۲ ربیع الاول ۴۸۱ھ کو ہرات میں وفات پائی۔ علمائے فرنگی محل لکھنؤ آپ کی اولاد سے ہیں۔

ملک شرف الدین محمود | خواجہ ملک شرف الدین امیر محمود شاہ انجو الملقب بہ آق خواجہ غزنوی دور میں فارس و کرمان اور عراق عجم کا فرماں روا تھا۔ سلطان مسعود بن سلطان محمود غزنوی کے ہاتھ سے شکست کھا کر ملک چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ انجو فارسی میں امیر سامان کو کہتے ہیں اور ترکی میں موتیوں کو۔

میرک علی شاہ | ہرات کا فرماں روا اور نہایت دلیر، شجاع اور عقلمند تھا۔ علم دوست اور علماء کا قدرداں تھا۔ ۶۷۰ھ میں انتقال کیا۔

خواجہ ملک علی | نہ معلوم کیا وجوہات ہوئیں کہ اپنے باپ میرک علی شاہ فرماں روائے ہرات کے انتقال کے

بعد خواجہ ملک علی ہرات چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ہندوستان چلے آئے۔ مولانا حالی کے آبا و اجداد میں یہ سب سے پہلے شخص ہیں جو ہندوستان آئے ہیں۔ چنانچہ مولانا ان کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ 'پیر ہرات' کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء وشعراء اور دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدرداں تھا اس لئے اکثر اہل علم اور خاندانی لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور مدد معاش اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی۔ اور منصب قضاء وصدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیت مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان کے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔"

خواجہ ملک علی انصاری ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں مع اپنے دو بیٹوں خواجہ محمد مسعود اور خواجہ محمد نصیر الدین کے پانی پت میں وارد ہوئے تھے۔ اُس وقت پانی پت علماء اور فضلاء کا مرکز بنا ہوا تھا اور علم و تصوف کے دریا بہاں لہریں مار رہے تھے۔ خواجہ ملک علی نے جو یہ علمی صحبتیں اور مذہبی چرچے دیکھے تو یہیں رہ پڑے اور ایسے رہے کہ آپ کی اولاد آج تک یہاں آباد ہے اور بڑے بڑے معزز اور نامور بزرگ ان میں ہو چکے ہیں۔

مولانا حالی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر

شمس العلماء مولانا حالی کے پانی پت کے استادوں میں سے ایک بزرگ مولوی خواجہ ابراہیم حسین انصاری بھی تھے جن کا تذکرہ حضرت شمس العلماء نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں کیا ہے۔ مولوی خواجہ ابراہیم حسین صاحب کا جب ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۱ء میں پانی پت میں انتقال ہوا تو ان کی قبر کا کتبہ لکھنے کے لئے لائق اور قابل شاگرد سے زیادہ اور کون شخص موزوں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مولانا نے اپنے واجب التعظیم استاد کی قبر کے کتبے کی جو عبارت لکھی وہ میں آج ۴۴ برس کے بعد تبرکاً شائع کر رہا ہوں۔ اس سے جہاں آج پہلی مرتبہ مولانا کی ایک غیر مطبوعہ تحریر پبلک میں آرہی ہے وہاں مولانا کے ایک ایسے استاد کے حالاتِ زندگی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے جن کے حالات اس وقت تک عام طور پر معلوم نہیں تھے۔ مولوی خواجہ ابراہیم صاحب کی قبر عیدگاہ پانی پت کے بالکل سامنے بجانب شمال واقع ہے اور قبر پر یہ مندرجہ ذیل عبارت کا کتبہ لگا ہوا ہے۔ مولوی ابراہیم حسین صاحب کے فرزند مخدومی جناب مولوی محمد علی حیدر صاحب نے میرے دریافت کرنے پر فرمایا کہ یہ عبارت مولانا حالی نے لکھی تھی۔ اس کے علاوہ یہ تحریر مولانا کے اپنے ہاتھ کی تحریر کردہ میں نے خود ان کے مسودات میں دیکھی ہے۔ (محمد اسماعیل پانی پتی)

مرقد خواجہ ابراہیم حسین انصاری

ولادتِ ایشاں در ماہ رجب ۱۲۳۶ھ در پانی پت واقع شدہ۔ بعد از تعلیم ضروریاتِ دین در آغاز شباب برائے تکمیل علم ترک وطن اختیار کردند و از مولانا فضل حق خیرآبادی در سہارنپور و از مولانا واجد علی در لکھنؤ علوم عقلیہ اخذ نمودند۔ باز از سید میرن صاحب قبلہ کتب دینیات از فقہ و تفسیر و کلام پرداختند و ہفت سالہ در لکھنؤ اقامت داشتہ سند اجتہاد و امامت مذہب اثنا عشریہ از جناب مجتہد العصر سید محمد صاحب لکھنوی غفرلہٗ حاصل کردہ بہ پانی پت مراجعت فرمودند و پنجاہ سال در درس و تدریس و وعظ و تذکیر مرجعِ انام و مقبولِ خاص و عام ماندہ۔ چہاردہم رجب ۱۳۰۸ھ داعی اجل را لبیکِ اجابت گفتند۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

فلسفۂ ترقی

اے عزیزو! تم بھی ہو آخر بنی نوعِ بشر — غل ہے کیا نوعِ بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جوہر آشکار — ہو رہی ہے جس سے شانِ کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبارِ ناتواں پہنچا ہے واں — طائرِ وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر
اس نے ان کمزور ہاتھوں سے مسخر کر لیا — ابر و برق و باد سے تا بحر و بر و دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی جو کی تھی عطا — دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور فلاطوں کو بہت کچھ جن پہ ناز — ہو گئے تقویمِ پارینہ وہ سب علم و ہنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج — بڑھ رہا ہے دمبدم یوں آج کل علمِ بشر
قوتِ ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور — شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر
ساز و ساماں جو نہ تھے کل بادشاہوں کو نصیب — کوڑیوں کے مول بکتے پھرتے ہیں وہ دربدر
کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب — عرصۂ آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب — آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی — اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی — علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

ہند میں بھی یارو! آ پہنچا ہے اس رَو کا قدم — جو ہیں ناقابل اب ان کا کھلنے والا ہے بھرم
ہے ترقی، پر تنزل بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ — یہ کسی کے حق میں امرت ہے کسی کے حق میں سم
پست کو بالا یہ کر دیتی ہے اور بالا کو پست — کر دیا زیر و زبر اس نے، جہاں رکھا قدم

گل کھلایا اس نے جو اٹھائے مشرق میں ابھی
اس کے لکھتے وقت ہاتھوں میں لرزتے ہیں قلم

چین جو وسعت میں کم اک برِ اعظم سے نہ تھا
اک جزیرہ کی لپیٹ نے کر دیا اس کو بھسم

دیکھنا پیچھے نہ ہم جنسوں سے رہ جانا کہیں
حق میں ہمسایہ کے ہمسایہ کا بڑھنا ہے ستم

جانتے ہو لے عزیزو! ہے تنزل چیز کیا؟
"اس پہ کر لینا قناعت مل گیا جو بیش و کم"

گو کہ ہے افراد کے حق میں یہ خصلت کیمیا
حق میں لیکن قوم کے یارو یہی خصلت ہے سم

تن پہ تھا فاروقِ اعظمؓ کے پھٹا کرتا، مگر
قوم کی خاطر بھری نیت نہ لے کر ملکِ جم

جیتے ہیں وہ دنیا میں کیڑے مکوڑوں کی طرح
جن کو بڑھنے کی تمنا اور نہ کچھ گھٹنے کا غم

جس طرح موری کا کیڑا خوش ہے اپنے حال پر
گندے جوہڑ حالت اسی میں بس مگن رہتے ہیں ہم

پر زمانہ کہہ رہا ہے یہ بہ آوازِ بلند
یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہِ عدم

بے ترقی ملک میں جینا ہے دشوار آجکل
وحشیوں کی موت ہے شائستہ قوموں کا عمل

ہو نہ ہمدردی کا عنصر قوم میں یارو جہاں
واں ترقی کے لئے سب کوششیں ہیں رائگاں

راس بیڑے کو ترقی کے نہیں کوئی ہوا
جوشِ ہمدردی سے ہوتا ہے جہاز اس کا رواں

قوم تھی یونان کی دنیا میں اک محدود قوم
ہو گئی حبِّ وطن سے فخرِ اقوامِ جہاں

ایک کو کچھ ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں
ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں

قوم کس گنتی میں ہے وہ دل نہ ہوں جس کے ملے
گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں

ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا؟
ہے وہ اک مقتل لہو روتا ہے جس پر آسماں

یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ
ہیں وہ اس مہماں سرا میں کوئی دن کے میہماں

غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودھی اور غلام
رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں

دن برے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے
صفحۂ ہستی سے ان کا مٹ گیا نام و نشاں

دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
ہے مسلمانو! یہ ارشادِ رسولِ انس و جاں

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب — سوز امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں
جس کا تم بھرتے ہو کلمہ جس پہ پڑھتے ہو درود — نام پر جس کے عزیزو تم فدا کرتے ہو جاں
جیتے جی امت کی لَو دل کو رہی اس کے لگی — وقت آخر ’امتی‘ اس کے تھا وردِ زباں
بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم — ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں
کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا؟ — ”کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں“

دین کا دعویٰ اور امت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

ان سے کہہ دو ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا — قوم کی خدمت میں پوشیدہ ہے بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت ہی منصب ہے جس کے واسطے — آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا
قوم کی خدمت میں کر دیں اپنی جب عمریں تمام — تب فرائض سے نبوت کے ہوئے عہدہ برآ
وہ رسول ہاشمیؐ وہ رحمۃ اللعالمینؐ — پیروی کا جس کی دم بھرتے ہو تم صبح و مسا
جانتے ہو قوم سے تھا اپنی کیا اس کا سلوک — اس طرف سے تھی جفا اور اس طرف سے تھی دعا
کونسی تکلیف تھی جو قوم نے اس کو نہ دی — پر کبھی چاہا نہ اس نے قوم کا اپنی بُرا
جب اُحد میں ہو گیا دندانِ پاک اس کا شہید — قوم کے حق میں نہ نکلا منہ سے کچھ اس کے سوا
”کر ہدایت قوم کو یارب! کہ ہیں معذور یہ“ — ”ان کی عقلوں پر ہے پردہ جہل و غفلت کا پڑا“
قوم کے حملے رہے جب تک کہ اس کی ذات پر — خندہ پیشانی سے سب ان کے سہے جور و جفا
پر لگی جب قوم سب مل کر مٹانے نام حق — اور خدا کا پوجنا بندوں کو مشکل ہو گیا
غیرتِ حق نے نہ دی پھر مہلت صبر و شکیب — دین کی آخر حمایت پر کھڑا ہونا پڑا
لشکرِ حق سے مگر جب ہو گئی مغلوب قوم — پھر وہی شفقت وہی رحمت وہی احسان تھا
تھی یہی وہ قوم جس کے حق میں فرماتے تھے آپ — ”ہے عرب کی دوستی جزو دین اور ایمان کا“
تھی یہی وہ قوم تھا جس کے لئے ارشاد یہ — ”قوم کا خادم ہے آقا سب کا بے چون و چرا“

قوم کے خادم رہے اور دوست جب تک اہل دیں　　دین اور دنیا میں بول اسلام کا بالا رہا
پڑ گئے خود غرضیوں نے جبکہ دل ایک اک کے پھاڑ　　حکم جو مالک کا تھا بندوں کو وہ پورا ہوا

حکم تھا اس کا کہ جھگڑوں سے رہو تم برکنار
ورنہ کھو بیٹھو گے سب اپنا وقار اور اعتبار

سچ کسی دانا نے تھا یہ قوم سے اپنی کہا　　"جو کہ حامی قوم کے ہیں ان کا حامی ہے خدا"
دیکھ لو ممتاز دنیا میں وہی قومیں ہیں آج　　قوم پر قربان ہے جن کا ہر اک چھوٹا بڑا
یاں تلک پھیلا ہے اب قوموں میں قومیت کا درد　　اپنے ایک اک فرد پر قوموں کی جانیں ہیں فدا
ملک سارا چین کر بھی ان کو چین آتا نہیں　　اپنے اک مقتول کا جب مانگتے ہیں خوں بہا
اختلاف دین و مذہب گھل رہا تھا جس میں زہر　　جس نے ملکوں میں دئے تھے خون کے دریا بہا
دمبدم وہ اختلاف اب بن رہا ہے اتفاق　　زہر میں ہونے کو ہے پیدا اثر تریاق کا
کر رہا ہے جوش ہمدردی کی صورت میں ظہور　　وہ تعصب جس نے بابوں سے کئے بیٹے جدا
دیتے ہیں وہ اپنے ذاتی فائدوں پر خاک ڈال　　اپنے جب نقصان میں ہو قوم کا ان کی بھلا
وہ ہملٹن کی جواں مردی سنی ہوگی کہ جب　　ہوگئی فرخ سیر کو ہاتھ سے اس کے شفا
قوم پر قربان کر دیں اپنی امیدیں تمام　　آپ کچھ لینا نہ چاہا اپنی خدمت کا صلا
ہے اسی حب وطن کا اس کی یہ سارا ظہور　　ہند پر ہے آج جو برطانیہ فرماں روا
ایک ماما جس کو دس ملتے ہیں ہفتہ میں شلنگ　　جس کے کنبے کا سب اس تنخواہ پر ہے آسرا
جا کے دے آتی ہے خوش خوش ایک ہفتہ کی طلب　　قوم کی خاطر کہیں سنتی ہے جب چندہ کھلا
ہے غرض چندہ کی کیا؟ اس سے نہیں کچھ اس کو کام　　قوم کا نام آیا اور قابو سے دل باہر ہوا
حق کو ہوتا ہے جنہیں دنیا میں کرنا سربلند　　خصلتیں یہ برگزیدہ ان کو ہوتی ہیں عطا
ان کے مفلس قوم کی خاطر وہ کر جاتے ہیں کام　　پست قوموں میں نہیں کر سکتے جو کام اغنیا
ہے انہیں ہمدردیوں کا ان کی یہ ثمرہ کہ آج　　اس کرہ کے گرد ہیں چھائی ہوئی مشل ہوا

لوہا مقناطیس کی جانب ہی کھنچتا جس طرح
اس طرف کھنچتی چلی جاتی ہی دنیا اس طرح

ہے یہ قوموں کی ترقی اور تنزل سے عیاں
خود تنزل میں ہے سرچشمہ ترقی کا نہاں

ایک کا ہے جو تنزل، دوسرے کا ہے عروج
اس کا بکتا ہی مکاں تب اس کی چلتی ہی دوکاں

کوئی یاں بنتا نہیں جبتک نہ بگڑے دوسرا
گھاس کھد جاتی ہی جب اُٹھتی ہی تب کھیتی یہاں

ہوتے ہوتے خشک جب دریا میں خاک اڑنے لگی
تب ہوئے نہروں سے جنگل غیرت باغ جناں

چھچے مرغ چمن کو تب ہوئے جا کر نصیب
کر چکا کیڑے مکوڑے جب ہزاروں نوش جاں

جان لو قسمت کسی کی جاگنے والی ہے اب
جب سنو یارو! بگڑتا کوئی گھر یا خانداں

آسماں سے بن کے خواں آتا نہیں اقبال کا
ہی وہی اک چیز کل یہاں تھی آج واں

میزباں کی دیکھتی ہے آنکھ جب بدلی ہوئی
واں سے اٹھ کر دوسرا جا ڈھونڈتی ہی میزباں

جانے والا ہی مقرران کا گھر غیروں کے پاس
جو کر باندھے ہوئے بیٹھے ہیں گھر کھونے پہ یاں

قصر والیواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو
عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں

یاد رکھو ہوں گے اب حقداران کے جانشیں
ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائگاں

ہوں گے مزدور اور کمیرے ان کی اب قائم مقام
پھرتے ہیں بے کار جن کے کود کے پیر و جواں

اے مسلمانو! فلک کی گردشوں سے غافلو!
تم کو رخصت ہی لٹاؤ وقت و دولت رائگاں

دیکھو جب غیروں کو تم بڑھتا کرو اپنے پہ ناز
ہیں تمہارے عیش و غفلت کی یہ سب فیاضیاں

مت کرو شکوہ مشیت کا خدا ظالم نہیں
بلکہ ظالم ہیں تمہاری اپنی بد اعمالیاں

ہے یہ قانون الٰہی جو کبھی ٹلتا نہیں
گو جگہ سے اپنی ٹل جائے زمین و آسماں

چھنتی جائیں گی وہ قومیں جو بگڑتی جائیں گی
ٹہنیاں جو سوکھتی جائیں گی جھڑتی جائیں گی

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

کیا مسلمان ترقی کرسکتے ہیں؟

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں، یا یوں کہو کہ اس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکت مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے۔

اگرچہ بعضے مومن مسلمان جو کبھی اپنی نسبت برا گمان نہیں کرتے مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے اسی قدر ان کی رائے کی غلطی ان پر ظاہر ہوتی جائے گی۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ "ان میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں" ان کی رائے نہایت غور اور توجہ کے لائق ہے کیونکہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کے لائق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی سراسر انھیں کی رائے کی تائید کرتی ہے یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود ان کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جا رہی ہو، جس کی غذا بالکل مفقود ہو، جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو یہ کہنا کہ "وہ چند روز کا مہمان ہے" ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہو سکتا ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کرسکنے کے متعلق عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں

۱۔ پہلا خیال:۔ مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:۔

"مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لئے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔"

ہمارے نزدیک یہ ایک دلچسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تنزل کی بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو۔ عیسائی قومیں جو اس وقت دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فائق ہیں اور جو علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں ان کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے اس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کونسی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کو حشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کرنی شروع کی اس وقت ان کو کیسے کیسے سخت عذاب دیے گئے۔ ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں نہایت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر ہلاک کئے گئے۔

سنہ ۱۳۹۴ء میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتب مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا، اس کے معتقدوں پر سخت عذاب کیا گیا۔

سنہ ۱۴۱۳ء میں آزادی مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کئے گئے۔

سنہ ۱۵۳۹ء میں اسکاٹ لینڈ میں مصلحان مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کئے گئے اور ساٹھ آدمی بدعت

کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے۔

۱۵۵۵ء میں کئی رفارمر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قید خانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ء میں جبکہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کئے گئے۔

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں اور یہ تمام بندشیں اس وقت تک نہ ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن نے نہایت زور آور تحریروں سے ان کو نہ توڑا۔

کوپرنیکس نے جس وقت سیارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے ایک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھیرایا۔

گلیلیو نے ۱۶۰۹ء میں دوربینیں بنائیں اور سیارات کے متعلق بہت سے حالات مشاہدہ کئے مگر اس کو انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہرچند اس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتاب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بے شمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

لوتھر کی کتاب جو پوپ لیو دھم کے برخلاف لکھی گئی تھی ۱۵۲۰ء میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بےشمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام الف و عادت اور تعصبات کو دبا لیا اور عیسائی مذہب بہ قدر ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے سبقت لے گئی ہیں اسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک طومار طویل الذیل

ہو جاتا ہے اور جب تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں بہت سے رسم و رواج، بہت سے بیجا تعصبات اور بہت سے ظنون و اوہام جو امتداد ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ان سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانہ کی ضرورتیں ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلاف شرافت ہی نہیں بلکہ خلاف شریعت بھی جانتا ہے جب اہل و عیال کے ساتھ سفر حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ دہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اس کو لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود ثانی سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی اور ینگچری فرقے نے جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی کافروں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی تو آخر مجبور ہو کر اس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورت نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کر دیا۔ اور اس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جاری ہوگئی بیشک ینگچری فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی لیکن چونکہ حقیقت میں اس کی بنیاد محض تعصب پر تھی نہ کہ اصول مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلات جنگ سے مسلح ہوئے اور موجودہ طرز نبرد آزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں، اس لئے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کار آزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں جب تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت

نہ جانتا ہو۔ لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا؟ اور کیا اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہوگئے؟ حاشا ثم حاشا۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں دنیوی ترقی ہرگز نہیں کرسکتے۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ جتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہوسکتے ہیں اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوسکتا ہے اور وہ شئے تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند باہمت لوگ کوشش کررہے ہیں۔ اگرچہ قوم ان کی چیخ و پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن انفع المؤدبین (زمانہ) ان کو جلد ہوشیار کردے گا۔

۲۔ دوسرا خیال: ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہوسکتی

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجہ کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو۔

لیکن ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں، بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن نہیں کہ جو قومیں زمانۂ موجودہ کے فنون جہانبانی و کشورکشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ان کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہوسکے یا جو مستقل نظر آتی ہیں ان کا استقلال قائم رہ سکے۔

زمانۂ قدیم اور دور متوسط میں جبکہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی تقریباً یکساں تھیں اس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آجاتی تھی۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعد جنگ و آلات حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے۔ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے۔ اور جو قومیں ترقی کرچکی ہیں ان کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی ان وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے ان کو غلبہ حاصل ہوا ہے۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ

قوموں کا غلبہ اور رعب داب روز بروز بڑھتا جائے اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے کوشش کرنا محض فضول ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اس حد تک پہنچنا اس کا ضروری فرض ہے۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے بے شک ہر علم و ہنر میں ترقی کر سکتا ہے۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہو سکتا ہے ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ضرور ہو سکتا ہے اور اس لئے اس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہو سکے کوشش کرے۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی۔

اور ملکوں کو جانے دو۔ ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہو کر دوبارہ بلند ہوئی ہیں مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالہ میں ہندو۔ ان دونوں قوموں کا حال جو دو سو برس پہلے تھا اور ان کی موجودہ حالت دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کر سکتے۔

یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے تب تک ان کی ترقیات جس قدر وہ رعیت ہونے کی حالت میں کر سکتے تھے رکی رہیں لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور ان کو رعیت کے پورے پورے حق دیئے گئے تب سے ان کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے۔ بعض ملکوں میں تو انھوں نے حکمراں قوموں کے برابر حقوق حاصل کئے ہیں۔ عموماً ہر ملک میں ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور ان کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ بعض دولتمند ان میں ایسے

ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ان کی قرضدار ہیں۔

۳۔ تیسرا خیال۔ موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا لہٰذا کوشش بے سود ہے

جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:۔

"اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں۔ کیونکہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس خیال کی عمر اور پرچہ تہذیب الاخلاق کی عمر برابر نکلے گی۔ پس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے۔ جو بیمار روز بروز بگڑتا جاتا ہے اس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

۴۔ چوتھا خیال۔ پہلے سے ترقی کن قوموں کے برابر چونکہ ہم نہیں ہو سکتے لہٰذا ترقی بے فائدہ ہے

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں ان کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہو۔ پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے کیونکہ ایسی حالت میں ہم ان ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے۔"

بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہئے کہ ہم اپنی ہموطن قوموں سے جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر پھیکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لئے باقی نہیں رہتا۔ پس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پس ماندہ قوم کو مایوس نہ ہو جانا چاہئے کیونکہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل پر جا کر

دونوں مل جائیں گی۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلہ سے جا ملے کیونکہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے یہانتک کہ وہ راہ ہی میں اگلوں سے جا ملتے ہیں۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور ناامیدی ہے

بہرحال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کئے گئے ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی طرف سے مایوسی اور ناامیدی ہے۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے رو براہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں اور قوم کی ابتر حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اٹھتا ہے اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اسی بنا پر ہم کو یہ امید تھی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے۔ مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں یہانتک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں ان پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آ کر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔ وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکاچوند جس نے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے کم ہو جائے اور تاریکی میں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اوروں کی طرح چل پھر سکے۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی

آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اس کا اندازہ کیا ہے وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے اور بیشک بادی النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اجالا بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی۔ پس اگر دس بیس بالیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے۔

(۱) امید۔

(۲) ناامیدی۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے امید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں اور ہزاروں سہل اور آسان کام ناامیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں۔ دیکھو کلمبس نے صرف امید ہی کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام کیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا اور کلائو نے صرف امید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے ؎

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشاں است   کسے نداد تسلی دل زلیخا را

"منقول از مقالات حالی"

شائع کردہ انجمن ترقی اردو

دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنا ہو کہ چراغ کی بتی کا اشتعال آکسیجن سے قائم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے یا دونوں سے، تو ہم کو چاہئے کہ ایک دفعہ بتی کو محض آکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہئے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اس کے اشتعال میں دخل ہے اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور آکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہئے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض آکسیجن ہے نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے تو ہم کو چاہئے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں اَن پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جہاں عالم، فلسفی، ریاضی داں، مصنف، اوریٹر (Orator)، شاعر اور بڑے بڑے فاضل ہیں مگر ان میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان واجب التعظیم اپاہجوں کے کھانے پینے اوڑھنے، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے لیکن اگر بفرض محال کسی خطہ میں ایسی ناشدنی کولونی (آبادی) چند روز کے لئے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعہ کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے، بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پرواہ نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خورد و نوش کا کچھ خیال نہ آئے مگر

بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اس کا رازق نہیں ننگی ہے مگر کوئی اس کا ستار نہیں، حاجتمند ہے مگر کوئی اس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو انھیں خود اپنے اعلیٰ اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام سرانجام کرنے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں یا فوراً اس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطہ میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں ان کے لئے فرمانبردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہوں۔ دونوں حالتوں میں نتیجہ یہ نکلے گا کہ "دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی"

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے اَن پڑھ اور بے علم ہیں مگر محنتی، جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں ان کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر ان کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا، جوتنا، بیج بیوپار، صنعت اور دستکاری غرضکہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے اب ان کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے، دوسرا پیستا ہے، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ ایک کپاس بوتا ہے، دوسرا اُسے کاٹتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیونکہ ان کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں۔ ان کو غنیم کے حملہ کا کچھ ڈر نہیں کیونکہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لئے مستعد اور تیار رہیں۔ ان میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیونکہ ان کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت ہی نہیں۔ ان میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیونکہ ان میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں۔ ان میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیونکہ ان میں کوئی واعظ یا ملا نہیں۔ ان میں کوئی پولٹیکل اختلاف نہیں کیونکہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں۔ ان میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیونکہ ان میں کوئی اور بیرسٹر نہیں ان میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ علم سے۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہو گیا جن کے تمام کام

علمی اصولوں پر مبنی ہیں۔ انھوں نے زراعت، تجارت، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی، کیا لوہار اور کیا کمہار، کیا درزی اور کیا کفش دوز غرضکہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سرانجام کرتے ہیں۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے اَن پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان کی تجارت نے ان کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دئے، ان کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہو گئی۔ ان کی دستکاری نے ان کی دستکاری کو اپاہج کر دیا۔ مگر ایک مدت تک ان کو اس بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بے کار ہو گئے؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں کفتی نہیں ہوتی؟

لیکن اس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا اُن کو ان کی اور ان کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی۔ انھوں نے اول ان کی زبان سیکھی پھر رفتہ رفتہ ان کے علم بھی سیکھنے لگے۔ جن علموں کے ذریعے سے انھوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی وہ علم بھی انھوں نے حاصل کئے مگر سوائے رٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ ان کے علموں سے نہ اُٹھایا۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے، انھوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لئے بنا ہے مگر یہ مشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لئے بنا ہے۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اس کے فوائد پہنچاتے تھے۔ انھوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا۔ وہ دنیا کی مختلف زبانیں اس لئے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور ان کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے۔ انھوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں، مگر نہ اس لئے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں بلکہ اس لئے کہ طوطے کی طرح کہیں "حق اللہ پاک ذات اللہ" اور کہیں "ست گورو دت داتا" بول اٹھیں۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لئے، میز لکھنے کے لئے، کرسی بیٹھنے کے لئے، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لئے اور فرش بچھانے کے لئے خریدتے تھے۔ انھوں نے ان کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ کو جلایا، نہ میز پر لکھا، نہ کرسی پر بیٹھے، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا

اور نہ فرش کو بچھایا بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی علم کے ذوق و شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں ہلانے بالکل چھوڑ دیئے اور علم کا ادب ان کو دنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا۔ اب تا وقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں تب تک ممکن نہیں کہ ان کی حالت درست ہو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے۔

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہے اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ ملک کو کوئی اصلی فائدہ نہیں پہنچا سکتا بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں مضر ثابت ہوں

جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے، نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے۔ ایسے علم سے بے عملی سو درجے بہتر ہے بقول شخصیکہ "کچھ شوئی بلی پو ہا اللہ ہی ہی جئے گا۔"

"منقول از مقالات حالی"
شائع کردہ انجمن ترقی اردو

ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے کہ

یعنی کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بے کار رہنا مردوں کو۔ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؛ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے۔

ایتها[1] النفس اجملی جزعا ان الذی تحذرین قد وقعا

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ ہر قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اُس کے افراد میں عموماً مستعدی، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے۔ لیکن جہاں تک کہ ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں اس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے اور وہ اسلام جو بحر قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا آج بحر منجمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب ہوئے خاک، انتہا ہے یہ

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں۔

ہم کو اپنے تنزل کا پورا یقین ہو گیا ہے۔

امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد اور کسی دَور

---

[1] یعنی اے دل اپنی بیقراری کو کم کر (کیونکہ) جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی۔

میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

ترقی کی قابلیت بھی ہم میں اُسی قدر ہے یا ہونی چاہئے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے لیکن کچھ کرتے نہیں۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھالیں۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آکر پانی چوا جائے۔

ہم توکل کو اس لئے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسہ کرنا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

ہم تدبیر کو اس لئے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ اس لئے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لئے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لئے کہ ہم کو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں۔

ہم اس حیلہ جو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لئے تاک نہیں چھوڑاتے کہ ان کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ ان کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہماری حالت ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گمراہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے۔ ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری۔

مسلمانوں میں قوت عملی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں

اگرچہ ہم میں لائق آدمیوں کا قحط ہے تاہم کم و بیش مصنف، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں۔ ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوت منفعلہ نہیں اور پڑھنے والوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات ان میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا، ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہمدردی ان کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے مگر فی الحقیقت ان کے کلام میں اور فونوگراف کی آوازمیں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم [جو پریکٹیکل آدمی (عملی کام کرنے والے اشخاص) پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے] چشم بد دور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سلیف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرنے) کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کئے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لئے ادھر ادھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہے۔ ان کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسہ نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے۔ وہ وجہ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی پر منحصر جانتے ہیں۔ ان میں اور ایک غریب اورنٹیل اسکالر (عالم عربی یا فارسی) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ انھوں نے زمانے کی ضرورت کے مطابق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بیچارہ نے نہیں سیکھا۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ان کو چارناچار کتاب بالائے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی مثال بعینہٖ اس بدقسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑدوڑ کے لئے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑدوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو۔

مگر وہ عالی ہمت گریجویٹ جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری ان کو پسند نہیں کرتی ان کا حال پہلوں

سے بھی گیا گذرا ہے۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیئے جاتے تو کچھ کام بھی آتے لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں۔ ان کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے نہ ان کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ ان کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی۔ وہ یورپ کے مصنفوں، موجدوں اور رفامروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ ان کے کارنامے بیان کر کے اپنی واقفیت کی داد چاہیں خود کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمہ ہیں کمال ادب سے بیان کرتے ہیں مگر ان کے، ان کے خاندان کے اور ان کی قوم کے حقوق جو خود ان کے ذمہ ہیں ان پر کبھی غور نہیں کرتے۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پا کر آئے ہیں اور اس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حب وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سایہ میں پرورش پاتا ہے مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہٖ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے۔

مکہ گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا　　جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

حب وطن اور قومی ہمدردی ان میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے، قوم سے ان کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے۔ جس حقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ ان سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔ انگریز ان کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ ان کو اَن سویلائزڈ (وحشی مطلق) کا خطاب دیتے ہیں۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے ناقابل بتاتے ہیں اور اس لئے ان کی بھلائی کے لئے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ان کی کوششوں پر ہنستے ہیں اور ان کو بے سود خیال کرتے ہیں۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے ابال سے بھی زیادہ خود بخود اٹھتا ہے
کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن قوم کی بھلائی کے لئے منعقد کرتے ہیں۔
کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں۔
کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لئے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہانتک ہم کو معلوم ہے فی الواقع نہایت خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں اور ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تادم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور ان کو ترقی دیں گے۔ مگر درحقیقت ان کی حرکت ایک مذبوحی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ (الّا ماشاء اللہ) پورا نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوت عملی باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھدار آدمی موجود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو برا جانتے ہیں شادی اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے اس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں۔ جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرچ کرتے ہیں ان پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ ملتے ہیں مگر جب ویسا ہی موقع خود ان کو پیش آتا ہے تو آنکھیں بند کر کے اسی اندھے کنوئیں میں آپ بھی کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا کسی مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لئے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیٔ معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے وہ طریقہ اختیار کریں۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں لیکن سوا ان لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں باقی سب ہمیشہ نقصان اٹھاتے ہیں، دوالہ نکالتے ہیں، مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ بعضے صیغۂ تعمیرات سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں۔ بعضے اخبار نکالتے ہیں۔ مگر جہاں دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی۔

اگر کسی خاندان میں حسن اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اس کے سہارے پر فکر معاش سے فارغ البال ہو جاتا ہے۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں۔ ایک شکاری ہے اور بیس اس کے فضلہ خوار ہیں۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے۔ کھاتے ہیں اور غراتے ہیں۔ مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ہم میں قوت عمل باقی نہیں رہی۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لئے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اس کو مجمع عام میں پیش کرے اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرت رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے تاکہ جو باتیں ان کے کرنے کی ہوں ان کو عمل میں لائیں لیکن آج تک کانفرنس کی ایک صلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں الٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفریں کرتے ہیں اور اس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ان میں قوت عمل باقی نہیں اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں ان کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے وہ دو حال سے خالی نہیں یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے۔ انجام دونوں کا فنا ہے۔ ہم کو صرف وہاں

کی فکر کرنی چاہیے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس۔

نئے خیال والے جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں ان میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز ابھرنے والی نہیں۔ اس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو رطوبت مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اس کو قابل علاج سمجھا جائے بلکہ اس سبب سے ہے کہ اس میں حرارت غریزی باقی نہیں رہی اور اس لئے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بے فائدہ ہے۔

الغرض کیا پرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائیگاں خیال کرتے ہیں۔ پہلے اس لئے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لئے کہ ترقی ممکن نہیں۔ اسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بُری بھلی طرح اپنا پیٹ پال لیتے ہیں۔ ایسے لوگ تو مردہ سے مردہ قوم میں بھی جب تک کہ اس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ضرور ہے کہ پائے جائیں کیونکہ ؎

ایں شکم بے ہنر پیچ پیچ   صبر ندارد کہ بسازد بہ ہیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لئے خود نمونہ بن کر اس کو ترقی کی طرف مائل کریں مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں ان کو نظر آئیں صرف ان کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لئے ایک مثال قائم کریں۔ معاش کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں جیسے دوکانداری یا صنعت و دستکاری، ان کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں، ان پر خود کاربند ہو کر قوم میں تجارت کا چرچا پھیلائیں۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی ان کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے اُس کی اشاعت میں دم سے، قدم سے، درم سے، قلم سے غرض ہر طرح کوشش کریں۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان جن کو ترقی کا مقدمۃ الجیش کہنا چاہئے وہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود ان کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں اور اسی لئے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے۔ ہم میں ہمت اور اولو العزمی کا نام و نشان نہیں رہا۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر۔ ہم بظاہر زندہ ہیں، لیکن حقیقت میں مردہ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو ترقی کا خیال ہے ان کو غور کرنا چاہئے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہئے بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہئے جس سے تمام قوم کی حالت خودبخود بدل جائے؟ یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آئندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے۔

"منقول از مقالات حالی"

شائع کردہ انجمن ترقی اردو

تحفۃ الاخوان

(اقتباسات)

نیند غفلت کی ہے سرتاسر مسلط قوم پر — سب کی آنکھیں ہیں کھلی سوتے ہیں لیکن بیخبر
مصر کی ممیاں ہیں سب گویا نہیں جن میں حیات — گو کہ جیتے جاگتے آتے ہیں ظاہر میں نظر
خاندانوں کو رہا ہے پیٹ دور روزگار — آج بگڑا یہ گھرانا اور کل اجڑا وہ گھر
پر نگاہِ بد کی جو زد میں نہیں آئے ابھی — سمجھتے ہیں دورِ گردوں کا نہیں ہم تک گذر
بھیڑیا نوبت بہ نوبت گوسفندوں کو شکار — کر رہا ہے، اور نہیں کچھ گوسفندوں کو خبر
ہم جو بنتے بھی ہیں تو اکثر بگڑنے کے لئے — گرتے ہیں بانسوں ابھرتے ہیں اگر بالشت بھر
قوم کو اپنے تنزل سے ابھرنے کی امید — اہلِ علم و اہلِ دولت سے بہت کچھ تھی مگر
اہلِ دولت کا ہے اس عالم سے اک عالم جدا — عالمِ بالا سے بھی ہے جو کوئی منزل ادھر
جن دعاؤں کی پہنچ ہے عالمِ بالا تک — ان دعاؤں کا نہیں ڈیوڑھی تلک ان کی گذر
اب رہے عالم، سو اتنا سوقا ان کو کہاں — دین کا پھر کون ہے دنیا میں وہ الجھیں اگر
کون جا کر چین میں پھر دین کی دعوت کرے؟ — کون گمراہوں کی لے جاپان میں جا کر خبر؟
حجتِ حق کون لندن میں کرے جا کر تمام؟ — کون برلن میں کرے تبلیغ قرآن و خبر؟
کون ہے ان کے سوا اسلام کے فرقوں کو جو — مل کے آپس میں نہ ہونے دے کبھی شیر و شکر
ان کی غفلت کا وہ عالم، ان کی فرصت کا یہ حال — ہو یہ بیڑا کیوں نہ پھر منجدھار میں زیر و زبر

ہیں یہی گر قوم کے ساتھ آج بے پروائیاں
تو یہ سن لو غافلو کل ہیں کڑی رسوائیاں

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یا رب کھو کے کمر — جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلائی تھی سو پھیلا چکے — ہو گیا وہ بیج جو بویا تھا نخلِ بارور

پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اسی منزل میں ہیں — باندھ کر اٹھے تھے جس منزل سے احرامِ سفر

روشنیِ تعلیم کی کچھ کچھ جو یاں پاتے ہو تم — سب یہ جگنو کے سے چمکارے ہیں اے اہلِ نظر

ہے جہالت کا اندھیرا ہم پہ جو چھایا ہوا — اس اندھیرے ہی میں آتے ہیں یہ سب جلوے نظر

سارے ہو جاتے ہیں چمکارے ابھی کافور یہ — اس اندھیرے سے ذرا نکلو اجالے میں اگر

ہم نے یہ مانا کہ تھے ہم جو زمیں پکڑے ہوئے — اس سے آگے کچھ قدم ہم نے بڑھایا ہے مگر

دیکھنا یہ ہے کہ اوروں سے ہے کیا نسبت ہمیں؟ — اور بڑھتے ہیں گزوں اٹھتے ہیں ہم گر انچ بھر

جبکہ ٹھیری ہم میں اور اوروں میں یہ نسبت، تو ہم — اتنے ہی یاں گھٹ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں جس قدر

پست ہے ہمسر سے جو اپنے، یہ سمجھا دو اسے — خاک ہے وہ، گو کہ ہے پہونچا ہوا افلاک پر

اپنی پستی کے نشاں پاتے ہیں ہر منزل میں ہم — کیا تجارت، کیا صناعت، اور کیا علم و ہنر

کھل رہے ہیں جو کلوں کے کارخانے ملک میں — جن کے مالک ہیں وطن کے اہلِ ہمت سر بسر

جو کہ ہیں ملکی ترقی کے لئے اک فالِ نیک — جن میں امیدیں ہیں مثلِ روزِ روشن جلوہ گر

قوم کا حصہ نہ واں پاؤ گے تم اس کے سوا — شام کو قلیوں کی اک فوج آئے گی تم کو نظر

کون سا پستی کا حصہ اب رہا ہے اس کے بعد؟

یہ وہ پستی ہے کہ بس تحت الثریٰ ہے اس کے بعد

ہم نے مانا ہے موافق جن سے دورِ ماہ و سال — بھاگوان ایسے بھی ہیں اس قوم میں پر خال خال

چند جانیں بچ رہی تھیں جو کہ قومِ نوح میں — ساٹھ ملین میں ہے وہ ان بھاگوانوں کی مثال

ان کی کیا عزت ہے یارو؟ قوم ہے جن کی ذلیل — ان کو کیا راحت ہے؟ جن کی قوم ہے خستہ حال

ہے وہ ایسا غول میں قلیوں کے جیسے ایک سیٹھ — ہے ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال

شال گدڑی سے ہے واں سو مرتبہ بدتر جہاں — ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کاندھے پہ شال

یاد رکھو! ہے فراخ اسلام کا دامن بہت — دی ہے بنیادِ اخوت اس نے کل امت میں ڈال

ہیں اسی امت میں جو ڈھوتے ہیں دن بھر لکڑی — ہیں اسی امت میں جو ہیں ڈھونکتے دن رات کھال
ہیں انھیں میں جن کے سینے میں نہیں آیا سماں — جب سے آنکھ ان کی کھلی دیکھا ہے گھر میں اپنے کال
ہیں انھیں میں جو کہ بہر نفقۂ فرزند و زن — سامنے ایک ایک کے پھیلاتے ہیں دست سوال
ان عزیزوں کی اخوت سے جنھیں آتا ہو ننگ — نام لیں فہرست سے اسلام کی اپنا نکال
ورنہ ذلت سے نکالیں ان کو اور یہ جان لیں — ان کی ذلت میں انھیں عزت سے رہنا ہے محال
گھر میں اپنے بیٹھ کر جو چاہے سو بن لے کوئی — غیر قوموں میں نہیں حاصل اسے جز انفعال
کہتے ہیں غیر اس کو، ہمجنسوں میں اجلا دیکھ کر — یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال

وہ یہی خطرہ ہے جس کے ڈر سے مال و جان سب
کر رہے ہیں اپنی اپنی قوم پر قربان سب

"منقول از کلیات نظم حالی"
مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی

رُوحِ مسحُور

فرانس کے شہرۂ آفاق سحر نگار رومان رولاں کی تازہ ترین تصنیف ایک مسلسل ناول ہے جو جستہ جستہ چھ جلدوں میں The Soul Enchanted ("روحِ مسحور") کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس معرکۃ الآرا ناول کی جان ایک عورت اینٹ ریویر کی سیرت کشی ہے جس میں فطرت انسانی کے اس رمز شناس نے اپنے آرٹ کا پورا اعجاز دکھا دیا ہے۔ اینٹ کا بچپن اور عہد شباب گھر کی محفوظ چار دیواری میں بسر نہیں ہوا بلکہ بہت سی شورشوں، طغیانیوں اور طوفانوں میں سے گذرا ہے۔ اگر وہ معمولی مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تو اس ہر پرآشوب میں اس کی شخصیت تنکے کی طرح بہہ جاتی لیکن اس کو فطرت نے یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ ہر تجربے سے خواہ وہ کتنا ہی تلخ اور ناگوار کیوں نہ ہو اپنی سیرت کی تعمیر کرتی ہے۔ اس کی نظر زیادہ وسیع، اس کا دل زیادہ حساس، اس کا دماغ زیادہ روشن ہوتا جاتا ہے۔ اپنی لغزشوں اور کمزوریوں کی بدولت اس کی نظر فطرت انسانی میں زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور اس کی نگاہ ان پردوں کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے جن میں ہم اپنی روح کی واردات کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کا عمل اس اصول پر ہے کہ

درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی

اس ارتقائے پیہم کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ زندگی کے نصف النہار سے گذر کر شام کی طرف مائل ہوتی ہے تو ہم اس کے دل اور دماغ کو ان غیر معمولی خوبیوں سے مالا مال پاتے ہیں جو عافیت کی زندگی کا ثمر نہیں ہوتیں بلکہ دنیا کے گرم و سرد اور تلخ و شیریں تجربات کو جھیلنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے دل میں اتنی وسعت ہے کہ سارے جہان کا دکھ درد اس میں سما جائے۔ اس کی روح میں انسانی آزادی کے لئے تڑپ ہے جس کی وجہ سے وہ تمام عمر ایک مجاہدانہ زندگی بسر کرتی ہے اور

ان تمام قوتوں اور تحریکوں کے خلاف جنگ کرتی ہے جو موجودہ یورپ میں انسانی ضمیر کی آزادی کا خون کر رہی ہیں اور حق پرستوں اور انصاف دوستوں کے لئے عرصۂ حیات کو تنگ کر رہی ہیں۔ مگر اس کی سیرت کی سب سے زبردست خصوصیت اس کی بے پناہ اثر آفرینی ہے۔ جو شخص، مرد، عورت، جوان، بوڑھا اس کے اثر میں آجاتا ہے اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ وہ نہ صرف سونے کو کندن بنا دیتی ہے بلکہ کچے لوہے کو بھی فولاد میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس سے ٹکرا کر پتھر سے شرارے نکلنے لگتے ہیں۔ اس کے خالق مجازی نے اس کی محبوب سیرت میں انسانیت اور قیادت کے بہترین جوہر جمع کر دئے ہیں :-

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

شاہراہ زندگی پر اس کو جو دوست اور عزیز ملتے ہیں وہ ان کی فطرت پر اپنی آزاد روح کے آتشیں نشان ثبت کرتی چلی جاتی ہے۔ انھیں میں سے ایک دوست ایک نامور سائنس داں جولین ہے جس کی سیرت کا ارتقا مختصر طور پر ذیل کے ترجمے میں دکھایا گیا ہے۔ تیس سال قبل اس کی نسبت اینٹ سے قرار پائی تھی لیکن اس وقت تک اس کا دل و دماغ سماجی بندشوں اور تعصبات کا غلام تھا۔ اس نے اپنی خوش نصیبی کو نہ پہچانا اور سوسائٹی کے اعتراضات اور ناراضگی کے خوف سے اینٹ کو ہاتھ سے کھو دیا۔ لیکن اینٹ کے اس اثر کو کیا کرتا جو نہایت خاموشی کے ساتھ دن کی پھیلتی ہوئی روشنی کی طرح، بغیر اس کے علم کے، اس کی روح کے اندر سرایت کر گیا تھا۔ چونکہ زمین سنگلاخ تھی اور اس پر بہت کچھ خس و خاشاک اور اینٹوں پتھروں کا انبار تھا اس لئے ان بے باک بیجوں کو پھوٹنے اور اگنے میں عرصہ لگا جو اینٹ نے اس کی طبیعت میں بو دئے تھے لیکن وہ رفتہ رفتہ ظاہر ہو کر رہے۔ مندرجہ ذیل صفحات سے کچھ اندازہ ہو گا کہ کس طرح یہ قدامت پرست، روایت پسند، کمزور دل کا سائنس داں اپنے زمانے کی ایک متحرک اور حرکت آفریں قوت بن گیا۔

جن حضرات نے روماں رولاں کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ اس کی تحریر میں ایک خاص انداز گریز ہے جس کی وجہ سے ترجمہ میں بہت دقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جذبات خیالات اور واقعات کی طرف نہایت لطیف اور خفیف اشارے کرتا ہوا گذر جاتا ہے اور اکثر خیالات کے منطقی تسلسل کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ لہذا اس ترجمے کی خرابیوں اور نقائص کی ذمہ داری زیادہ تر تو میری ذاتی ناقابلیت پر ہے لیکن ایک حد تک اس کا سبب مصنف کا مخصوص انداز تحریر بھی ہے جس میں ایک شان دل آویزی ضرور ہے لیکن اس میں وضاحت سے زیادہ طائر خیال کی سبک رفتاری اور بظاہر بے راہ روی کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ ترجمہ "روح مسحور" کی پانچویں جلد Combat (جنگ) میں سے کیا گیا ہے۔

خواجہ غلام السیّدین

جولین نے کبھی آرام نہیں لیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں آرام لینا آتا ہی نہیں، کام کئے بغیر اس کا جینا محال تھا۔ روزی کمانے کے لئے نہیں بلکہ اپنی ذہنی زندگی کی تشفی کے لئے اس کو کام کرنا لازم تھا۔ اس شدید دماغی محنت نے اس پر دوسرے خیالات کی راہیں بند کر دی تھیں مگر اچھی طرح بند نہ کی تھیں کیونکہ کبھی کبھی دروازہ کھل جاتا اور ہوا کے جھونکے اندر آجاتے اور جولین اچھی طرح گرم نہ ہو پاتا تھا۔

لیکن اب وہ اپنے پرانے مکان میں آگ کے سامنے بیٹھا سردی سے نہیں کانپتا تھا جیسا اس زمانے میں اس کا حال تھا جب اس کی اینٹ سے راہ و رسم تھی۔ وہ ماضی کے گھر سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے طبقۂ متوسط کے تمام تعصبات کو بھاری کپڑوں کی طرح اتار کر پھینک دیا تھا۔ اینٹ نے اس کی کتابوں کو پڑھا تھا اور اس کی حقیقت شناس آنکھوں کے سامنے اپنے اس پرانے دوست کی فطرت بے نقاب ہو گئی تھی۔

پینتیس سال کی عمر میں اس متوسط طبقہ کے فرزند کے لئے، جو فطرتاً ڈرپوک اور بزدل تھا، جس کے بچپن پر اس کی سخت گیر اور مطلق العنان ماں کی حکومت مسلط رہی تھی جس کے خوش عقیدہ، قدامت پرست مذہبی خاندان کے صدیوں پرانے اخلاقی اور روحانی عقیدوں نے پرانے لباس کی طرح اس کے دماغ کو جکڑ دیا تھا،

اپنے نفس کا اس قدر مکمل اور تدریجی محاسبہ کرنا بڑی جرأت کا کام تھا۔ مگر اس نے بغیر اپنے نفس کو دھوکا دئے ایک ایک کرکے ان تمام چیزوں کو اتار پھینکا تھا جن پر اس کو پہلے عقیدہ تھا لیکن وہ اس امتحان میں باطل ثابت ہوئی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ اس حرکت کے بعد انسان کو اپنی عریانی کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ خود کو کس طرح ان لوگوں کو دکھائے جنھوں نے اسے انھیں چھوٹوں میں ملبوس دیکھا ہے جن میں وہ اپنی عریانی کو ڈھانپتے رہتے ہیں، جو ساری دنیا کی عریانی دیکھنے کو تیار نہیں ہوتے، جو اپنی روح کی اصلی صداقت کو دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتے ہیں اور اسے مثل پوشیدہ اعضا کے انجیر کے پتے سے ڈھانک لیتے ہیں۔

جولین کی حالت اس وجہ سے زیادہ نازک تھی کہ وہ ان کم مایہ تارکین مذہب میں سے نہیں تھا جو ایک عقیدہ کو آسانی سے ترک کرکے دوسرے کو آسانی سے اختیار کرلیتے ہیں یا "آزاد خیالی" اور لامذہبی کے جذبات کی خدمت کرنے لگتے ہیں۔ وہ بازار میں تنہا کھڑا تھا اور سرد ہوا کے جھونکوں میں اس کا جسم عریاں تھا۔ یہ بڑی کٹھن آزمائش تھی لیکن یہ شخص باوجود اپنی طبیعت کی کمزوری کے اپنے راستے سے نہیں ہٹا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے گھر والے ایسے تھے جنھیں اس کی ذہنی کشمکش میں کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ (یہ بڑی محرومی ہے کہ کسی شخص کو کوئی ایسا رفیق نہ ملے جس سے وہ آتش دان کے سامنے بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرسکے۔ لیکن اس میں آسودگی بھی ہے کیونکہ اس شخص کا کیا حال ہوگا جس کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں ایسے شخص کے ساتھ نباہنا پڑے جو اس کے خیالات اور عقائد سے دشمنی رکھتا ہو؟) اس کی ماں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے اس کی شادی ایک تندرست "سلیم العقل" عورت سے کردی تھی جو صاحب جائداد تھی، خاصی خوبصورت تھی، گھر کا انتظام اچھا کرتی تھی لیکن تدبیر نا آشنا بھی اور باقی ہر اعتبار سے ناقابل! اور اس کا دماغ ہر قسم کی کاوش اور جستجو سے اس درجہ بے نیاز تھا جو اس کی قسم کی عورتوں کے لئے بھی غیر معمولی بات تھی۔ وہ کبھی کتاب کو کھول کر نہ دیکھتی تھی۔ شادی سے پہلے نوجوانی کے زمانے میں اس نے خانقاہ کے مدرسے میں بہت سی کتابوں کو مجبوراً پڑھا تھا اور ان کو پڑھتے ہوئے بارہا جماہیاں لی تھیں۔ اب وہ ان سے اس درجہ اکتا گئی تھی کہ اس کے خیال میں شادی کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ انھیں مقفل کرسکتی تھی۔ اسے یہ شکایت نہ تھی کہ اس کا شوہر اپنی زندگی کاغذوں اور کتابوں میں بسر کرتا ہے۔ مردوں کے اپنے کاروبار ہوتے ہی ہیں، اسے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

اسے نہ اپنے شوہر سے بہت محبت تھی نہ نفرت۔ اسے روز کھانے کی میز پر اور شب خوابی کے وقت اس کی صحبت ناگوار معلوم نہ ہوتی تھی لیکن خدانخواستہ زیادہ باعث مسرت بھی نہ تھی۔ وہ طبعاً کافی حریص تھی اور جولین میں حرص کا مادہ نہ تھا۔ مختصر یہ کہ اسے اپنے شوہر سے معمولی محبت تھی لیکن اتنی نہیں کہ اسے یہ کرید پیدا ہو کہ اس کے دل و دماغ پر کیا واردات گذر رہی ہیں۔ اس کے خانگی فرائض میں یہ چیز شامل نہ تھی نہ وہ اس بند الماری کی جھاڑ پونچھ بھی کرے۔

اسے شاید اس روحانی زلزلے کی مطلق خبر نہ ہوتی جس نے اس کے شوہر کو پینتالیس سال کی عمر میں اُس قناعت شعار جمود سے جھنجوڑ کر بیدار کر دیا تھا جو "معقولیت پسند" لوگوں کے بنائے ہوئے نظام معاشرت و مذہب کو بے چون وچرا تسلیم کر لیتا ہے لیکن اس کے نیک نیت دوستوں اور اس پادری نے جو اس کا اعتراف سنا کرتا تھا اس کو واضح طور پر یہ بتایا تھا کہ ایک نیک عیسائی بیوی کا کیا فرض ہونا چاہیے اگر اس کا شوہر اپنی مثال اور عمل سے اپنی جماعت کی روحانی رسوائی کا باعث ہو۔ اب بیوی نے میاں کے سامنے رقت وزاری اور بحث واحتجاج شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کا امن تو برباد ہو گیا لیکن نظام اخلاق کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ ظاہر ہے کہ بیچاری نیک نیت کانسٹنس مطلق یہ نہ سمجھتی تھی کہ اس کے شوہر کا جرم کیا ہے۔ لہذا اس کی گفتگو کے ذریعے اس کی اصلاح ہونا ناممکن تھا۔ وہ لوگوں سے ان تمام معاملات میں بہت درشتی سے پیش آتا تھا جن کا تعلق اس کی آزاد خیالی سے ہو۔ اور اس عنوان پر اس کی بیوی کی حماقت اس قدر صراحت کے ساتھ ظاہر ہوتی تھی کہ وہ اس کی پردہ پوشی کرنے سے قاصر تھا۔ اسے خود بھی کبھی کبھی اپنی حماقت کا دھندلا سا احساس ہوتا تھا لیکن اور سب بیوقوفوں کی طرح اس کی حماقت نے اس کی ضد میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ خدا جانے اس معاملے کا کیا حشر ہوتا اگر اس کے پادری نے جو اس سے زیادہ مصلحت شناس تھا اُسے خاموشی کی ہدایت نہ کر دی ہوتی۔ کیوں کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں ناعاقبت شناس طریقہ پر مذہب کی حمایت کر کے وہ کوئی فضیحۂ رسوائی پیدا نہ کرے۔ وہ اپنے حجرہ میں بیٹھا اس مصیبت زدہ بیوی کی رقت اور پریشاں بیانی کو سنتا تھا اور اس کی بے ربا شکایات اور اندیشہ ناک نیک نیتی کو روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس عورت کو جسے عمر میں پہلی دفعہ حوادث نے بے فکری کی جنت سے نکال دیا تھا، وہاں دوبارہ واپس پہنچانا ضروری تھا۔ اسے اس مقصد کی تحصیل میں زیادہ مشکل نہیں ہوئی کیونکہ اس نے

آسانی سے یہ بات تسلیم کرلی کہ خدا اس کو اس کے شوہر کی بداعمالیوں کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھہرائے گا اور گمراہوں سے بحث و مباحثہ کرنے اور ان کی تردید کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ مبادا وہ اپنی ضد میں اور زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا ہو جائیں۔ اس کا سب سے زیادہ ضروری فرض یہی ہے کہ وہ خدا سے اس بدنصیب شخص کی نجات کے لئے دعا مانگے۔ باقی خدا کے اختیار کی بات ہے۔ ("باقی" کا مطلب یہ تھا کہ آیا خدا اس کو عذاب ابدی میں گرفتار کرے گا یا نہیں! کانشنس دل سے یہ چاہتی تھی کہ ایسا نہ ہو لیکن اگر ایسا ہونا ہی ہے .... تو بہتر ہے کہ اس کا خیال ہی نہ کیا جائے۔ انسان کی اپنی مصیبتیں کیا کم ہیں!)

جب اپنی بیوی کے مایوسی اور مظلومی کے انداز سے متاثر ہو کر جولین نے، جس کو اپنے فعل کے نتائج پر کسی قدر پشیمانی ضرور تھی، چاہا کہ اپنے خیالات کو بہت سادہ طریقے پر اسے سمجھائے جس طرح کوئی استاد کسی کم عمر اور کم سمجھ بچے کو کوئی بات سمجھاتا ہے تو اس نے اپنے سارے انداز سے خوف کا اظہار کیا گویا وہ کہتی ہو۔

"نہیں نہیں کون اس بیکار جھگڑے میں پڑے۔ اور فرض کرو یہ بات اس کی سمجھ میں آجائے تو کیسا زبردست حادثہ ہو؟ جیسے کوئی شخص جو برف کے پہاڑ پر چڑھ رہا ہو کسی ایسے بیوقوف کے ساتھ رسی میں بندھ جائے جو نیچے پھسل رہا ہو نہیں، آپ کی عنایت! میں اس کے ساتھ رسی میں بندھنے کو تیار نہیں۔ افسوس بچارے جولین کے حال پر!"

اس نے کہا کہ مجھے کیوں سمجھاتے ہو۔ میں بیوقوف کیا سمجھوں گی (وہ اپنے بیوقوف ہونے پر دل میں خوش تھی اور فخر کرتی تھی .... "مبارک ہیں وہ جن کی عقل مفلس اور ہمت پست ہے") بےچارہ جولین! اور اس خیال سے کہ وہ غریب اکیلا تاریکی کے غار کی طرف پھسلا جا رہا ہے وہ اس بات کی انتہائی کوشش کرتی تھی کہ اس کے ساتھ عمدہ سلوک کرے، اس کی زندگی کو پرسکون اور خوشگوار بنائے، اسے اچھے اچھے کھانے کھلائے!

.. ..

"اس دنیا کی زندگی میں تو غریب کو کچھ راحت مل جائے!"

جولین خوب سمجھتا تھا کہ اس کی رفیق زندگی کیوں اس کے ساتھ اس درجہ مہربانی کا سلوک کر رہی ہے لیکن اس کی بدولت اسے کم از کم اپنے گوشۂ تنہائی میں امن نصیب تھا۔ اس کے آتشدان کی آگ میں زیادہ

گرمی نہ تھی لیکن اپنے خیالات کے لبادے میں لپٹ کر وہ اپنا کام بغیر کسی دخل اندازی کے انجام دے سکتا تھا۔ اسے زندگی سے زیادہ توقعات رکھنے کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اس نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ بے شک تباہ کر دیا تھا۔ یہ بات اس کی ذہن کی گہرائیوں میں ایک مبہم عقیدہ کی طرح مسلط تھی۔ وہ اس بات کی احتیاط کرتا تھا کہ اس جذبے کی تہ کو نہ ٹٹولے۔ اب کیا فائدہ؟ اسے ایک موقع نصیب ہوا تھا مگر اس نے یہی نہیں کہ اسے ہاتھ سے کھو دیا ہو بلکہ اس کو صریحاً مسترد کر دیا تھا۔ اس نے خود کو اس عورت سے چھڑا لیا تھا جس میں اس کی سچی رفیق حیات بننے کی صلاحیت تھی۔ سولہ برس تک اس کی داخلی زندگی، جس پر اس غیر موجود دوست کی حکمرانی تھی، لوگوں کی نظر سے پوشیدہ، اس کی خارجی زندگی، اس کی ازدواجی اور خانگی زندگی سے باہر (یا اس کے اندر) بسر ہوئی تھی۔ یہ محض اینٹ کے چہرے کی یاد یا اس کا جسمانی تصور نہ تھا (وہ بھی ضرور تھا لیکن یہ ذی فہم شخص دل کے معاملات میں کم نظر واقع ہوا تھا اور دوست کی جسمانی تصویر مدھم پڑ گئی تھی) جو اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا بلکہ وہ آتشیں نشان جو اس نے اس کے دماغ کی تہ میں چھوڑا تھا۔ جولین کی اندرونی زندگی میں اس کی وجہ سے انقلاب پیدا ہو گیا تھا۔ ایک مدت گذر چکی تھی یعنی ۱۹۰۵ء سے آج تک اس کی اینٹ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن اینٹ کا اثر اس کی روح میں کار فرما تھا۔ حسرت و افسوس نے اندر ہی اندر اس کی روح کو اس سانچے میں ڈھال دیا تھا جو وہ اس کے لئے پسند کرتی تھی یا جولین کا اپنا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے پسند کرتی۔

لہذا اپنی زندگی کی اس عظیم الشان جدوجہد اور اپنی آزاد خیالی کے لئے وہ اینٹ کا مرہون منت تھا۔ اس پوشیدہ تخمیر نے پانی کو شراب بنا دیا اور اس دماغ کے اندر جو گھر کی چار دیواری میں محدود تھا سارے عالم کائنات کے بے باک بیج بو دئے۔ ان کو زمین سے پھوٹ نکلنے میں کافی عرصہ لگا لیکن وہ خود اپنے دوستوں، عزیزوں اور ساتھیوں سے بہت پیشتر محسوس کرنے لگا تھا کہ آزادی کے بیج اس کی روح میں مکین ہیں۔ اسے ان کی نقاب کشائی کرنے کی جلدی نہ تھی۔ اس ابتدائی زمانے میں اس نے جس قدر کتابیں لکھیں سب سائنس کے مضامین پر تھیں۔ ان سے اس کے اجتہاد فکر کا ضرور پتہ لگتا تھا لیکن وہ تمام تر اصلاحی مسائل تک محدود تھیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ مصلحت شناسی اور احتیاط؟ یا اپنے دوستوں اور عزیزوں

کا لحاظ جن کو یقیناً اس کے بے باکانہ اظہار خیال سے تکلیف ہوگی؟ یا اعلان جنگ کے لئے آمادہ نہ ہونا؟ یا اس کی فطری جھجک جو اس کو اپنی خودی کے پوشیدہ ترین رازوں کے متعلق اجازت گفتار نہ دیتی تھی؟ یا ممکن ہے کہ ان سب سے بڑھ کر اس کا باعث وہ رازداری کا جذبہ ہو جس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنے دل کے تمام گہرے اور بیش بہا معاملات کو جو اس کے اور اس کی روحانی زندگی کی خیالی شاہد یعنی اس کی غیر موجود اینٹ کے درمیان مشترک تھے احتیاط کے ساتھ پردہ خفا میں رکھے؟

مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس نے اس درمیان میں اصلی اینٹ سے ملنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اس کا پتہ لگاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اور یہ کوئی بڑی مردانگی کی بات نہ تھی یا اپنی پریشانی کے اندیشہ سے اس نے یہ بھی معلوم نہیں کیا کہ اینٹ کو کسی مصیبت یا محتاجی کی وجہ سے امداد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی بات تھی جیسے بعض "بہت کمزور دل کے لوگ" کسی جانور کو زخمی یا کچلا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں کیونکہ وہ نظارہ ان کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یا ممکن ہے تکلیف دہ ثابت ہو اور اسی سبب سے وہ اس کے زخم کی مرہم پٹی کرنے کی کوشش نہیں کرتے؟ ہم ایسے بے ہمت لوگوں کو خوب سمجھتے ہیں! وہ خود کو اس بات پر بہت ملامت بھی کرتا تھا کہ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہے۔ حالانکہ اُسے اپنی اس کمزوری کا علم ہے۔ اسے اپنی ان پرانی کمزوریوں کو دور کرنے میں کافی مدت لگی بلکہ درحقیقت وہ کبھی بھی ان پر پوری طرح قابو نہ پا سکا۔ گلدان کی تہ میں ذرا سا زنگ باقی رہ گیا تھا اور اس کے ناخن برابر اس کو کھرچتے رہتے تھے۔

زنگ ہر کسی میں ہوتا ہے، اینٹ میں بھی تھا۔ لیکن روح کی نجات دراصل اس میں ہے کہ پانی بہتا رہے اور زندگی کی نالیاں بند نہ ہونے پائیں۔ تازہ پانی ہو، نیا پانی ہو...... بدترین روحانی فساد وہ ہے جو تالاب کے بند پانی کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ بہتی ہوئی ندی تو اپنے برتن کو دھو کر صاف کر دیتی ہے۔ اینٹ کی ندی ہمیشہ بہتی رہی تھی۔ اس نے جولین کو جھنجوڑ کر اس کے مجہولانہ جمود سے نکالا تھا اور اس روحانی جہنم سے نجات دلائی تھی جس میں وہ قناعت کے ساتھ پناہ گزیں ہو گیا تھا اور جس میں ہزاروں انسانی کیڑے مکوڑے نباتات کی سی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے خود دکھ اٹھا کر، اپنے جذبات کی شدت اور جوش سے اور اپنے تاریکی میں چمکتے ہوئے شعلے کے اثر سے اس میں حرکت پیدا کر دی تھی اور زندگی کے راز

اس پر پھول دیئے تھے۔

علاوہ اس کے (یہ بات قابل افسوس ضرور ہے لیکن سچ ہے) اس کا روحانی ارتقا بہت کچھ اس صدمہ کی بدولت ہوا تھا جو اس کی ذات سے اینٹ کو پہنچا تھا جب ہم اپنے محبوب کو بے جا دکھ پہنچاتے ہیں اور ہم میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ اس کو شدت کے ساتھ محسوس کریں تو یہ علم ہماری روح کے لئے ایک پیغام بیداری بن جاتا ہے۔ اس تجربے کے طفیل اور اپنی ندامت کی وجہ سے فطرت انسانی کو سمجھنے میں جولین کی نظر زیادہ گہری ہوگئی تھی، انصاف کا احساس قوی تر ہوگیا تھا۔ اس کی فطرت کا ہر وقت یہ تقاضا تھا کہ اس نے ایک کو جو تکلیف پہنچائی تھی اس کی تلافی دوسروں کی خدمت کے ذریعہ کرے۔ اینٹ نے اس کی طرف سے قرضہ ادا کیا تھا۔ (اب اسے اینٹ کا قرضہ ادا کرنا تھا۔)

جولین کا تعلق فرانس کے قدیم متوسط طبقے سے تھا جس میں بہت سی پرانی خرابیاں جڑ پکڑ گئی ہیں جو جمع کی ہوئی دولت کو بہت سختی کے ساتھ اپنی گرفت میں رکھتے ہیں لیکن یہی لوگ ادائے قرض کو اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں اور انھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ مرنے سے پہلے اسے ادا کر جائیں جب وہ اپنے کھیتوں میں چلتے پھرتے ہیں تو پرندوں کے گیت ان کو موسم بہار اور کیف محبت کی یاد نہیں دلاتے۔ انھیں تو بٹیر کی آواز بھی یہی کہتی سنائی دیتی ہے:

"اپنے قرضے ادا کردو، اپنے قرضے ادا کردو۔"

جولین نے اپنا قرضہ ادا کر دیا۔

کون اس کا یقین کر سکتا تھا؟ شاید اسے خود بھی اس کا علم نہ ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انھیں قرضوں کو ادا کرنے کی وجہ سے اس نے خود کو جنگ عظیم کے زمانے میں اپنی مرضی کے خلاف اس معاشرتی کشمکش میں گھرا ہوا پایا جس کے خیال سے بھی اس کا جسم اور روح دونوں گریز کرتے تھے۔ اس تہلکہ سے پیشتر جب اس کی غیر مفتوح روح اپنی خودی میں محصور اپنی قوتوں کو مجتمع کئے آزادی حاصل کرنے کے لئے جد وجہد کر رہی تھی، تو اینٹ، نظر سے پوشیدہ، ہر وقت اس کے ساتھ تھی۔ اس کو لب ہلانے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے یہ دکھائی دیتا تھا کہ وہ اس کے سامنے چلی جا رہی ہے اور وہ کبھی خود سے یہ سوال نہ کرتا تھا کہ

یہ راستہ اسے کہاں لے جائے گا۔ راستہ صرف ایک ہی تھا، وہ راستہ جس پر اس کے قریب ہی اینٹ کے سبک رفتار قدم اٹھ رہے تھے۔

اس کی تصانیف کا رجحان رفتہ رفتہ سائنس کی تاریخ اور فلسفہ کی طرف ہوتا جاتا تھا اور عمل اور ردعمل کے تسلسل سے اس کا دماغ ایک طرف تو خود کو دین مسیحی کی ان پیچ دار بیلوں سے رہا کر رہا تھا جو اس کی نقل وحرکت کو روکتی تھیں اور دوسری طرف اسے خیالات کے ایک ایسے جنگل میں لئے جاتا تھا جو نہ صرف مذہب کی حدود سے آگے نکل گیا تھا بلکہ اس کے زمانے کی سائنس اور عقلیت کی حدود سے بھی پرے تھا۔ یہ سفر ایسا ہی معرکہ خیز تھا جیسے واسکوڈے گاما کا سفر اور اس کے لئے بھی طوفان کی راس کا طواف کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ لنگر اٹھانے کے بعد قیام کے لئے کوئی بندرگاہ نہ تھی محض ابر و باد اور موجوں کے رحم پر بھروسہ تھا۔ خشکی کو خیرباد کہنے کے بعد انسان کا وطن یا تو سمندر کی سطح ہے یا اس کی تہ!

کیتھولک مذہب کا لاطینی پیرو ایک دفعہ اپنے عقیدوں کو ترک کرنے کے بعد شک کے سمندر میں کبھی لنگر نہیں ڈالتا۔ وہ ان جرمنوں اور انگریزوں کی طرح ایک جگہ پر قائم نہیں ہوتا جو محض احتجاج کرتے ہیں، یا جنھوں نے مدت ہوئی پراٹسٹنٹ بن کر احتجاج کیا تھا۔ وہ تو سیدھا تہ کو پہنچنا چاہتا ہے اور تہ ہوتی ہی نہیں! وہ پانی کے نیچے اپنے لئے کوئی لکڑی کا پل نہیں بناتا جو تاریک گہرائیوں کے اوپر معلق ہو مثل "مصلحوں" کے جو ہمیشہ آدھے کو مسترد کرتے ہیں اور آدھے کو قبول کر لیتے ہیں! وہ تنہا ہوتا ہے اور عریاں اور تیرتا چلا جاتا ہے۔ اس کو پانی پر سہارنے کے لئے صرف اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈوبنے کا وقت آنے والا ہے لیکن وہ بچاؤ کے لئے کسی کا سہارا نہیں تکتا.......

جولین نے خود کو عقل کی سخت گیر اور حقیقت شناس راہبری کے سپرد کر دیا تھا جو ناحق سے کوئی مفاہمت کرنے کو تیار نہیں ہوتی مثل ان لوگوں کے جو مروجہ عقائد اور سوسائٹی کی باندھی ہوئی تمام بندشوں اور قیود کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دینے کے بعد ان سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اسے دوؤں سے ایسی شدید مخالفت پیدا ہو گئی تھی جو انصاف کی حدود سے بھی متجاوز تھی۔ وہ اس بات کو خود بھی سمجھتا تھا لیکن اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ اس انتقام سے دست بردار ہو جائے۔ وہ خود کو ملامت کے طور پر "مرتد جولین" کہتا تھا۔

اوراس آرزوئے انتقام میں جو جلد اس کی تحریروں میں ظاہر ہونے لگی وہ دراصل خود کو سزا دے رہا تھا یعنی اس شخص کو جو وہ پہلے تھا۔

یہ بات پہلی مرتبہ اس کے فلسفیانہ مضامین میں رونما ہوئی۔ مذہبی گروہ نے یہ محسوس کیا کہ ان میں مذہب پر حملہ کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کے خلاف بہت شور و غوغا کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ چوٹ کاری لگی ہے۔ اس نے اور زیادہ چوٹیں کیں مگر چند تلخ اور شدید مقابلوں کے بعد ان لوگوں کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مصلحت پسپائی اور خاموشی میں ہے (اس معاملے میں تمام "صحیح الخیال" اخباروں نے حیرت انگیز اتحادِ عمل ظاہر کیا اور جولین کی تصانیف کا ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا) مگر جولین اور اس کے قدیم ساتھیوں میں صاف صاف تفرقہ پڑ گیا تھا۔ پرانے ملاقاتی ان سے سلام علیک اب بھی ہوتی تھی لیکن وہ کھلم کھلا ظاہر داری تھی۔ اس سے کسی کو دھوکا نہیں ہو سکتا تھا۔ پیشین گوئی کرنے والے کہا کرتے ہیں کہ "فوجوں کی تیاری جنگ نہیں ہے۔" لیکن وہ اس وقت ایک دوسرے کو دیکھ کر اطمینان کے ساتھ مسکراتے نہیں جنگ ہونے والی ہے، جنگ آپہنچی، گھنٹہ بجنے کی دیر ہے....

جولین کے مخالفوں نے غالباً خود جولین سے زیادہ واضح طور پر صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا کیونکہ خود اسے ابھی پوری طرح اس انقلابی روح کا احساس نہیں ہوا تھا جو اس میں پوشیدہ تھی۔ جب موٹر کاریں ہر وقت سڑک کے کنارے کی عمارتوں کے بیچ میں سے شور مچاتی ہوئی گذرتی رہتی ہیں تو بغاوت کی "خود کلامی" پر خواب کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جیسے مسوڑوں کی تکلیف وہ پھڑک۔ وہاں چیز ہی کیا ہے جس پر انسان اپنے دانت جمائے لیکن یہ سکون فریب وہ ہے۔ جولین کو معلوم تھا کہ اس کی بے پناہ تنقید اس کے مردہ عقائد کی سطح کو توڑ کر سوسائٹی کے سڑے ہوئے خول تک پہنچ گئی ہے۔ اب اس کا فرض تھا کہ وہ اپنے نشتر سے اس پیپ سے بھرے ہوئے زخم کو اندر تک ٹٹولے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے اس بات کو ثابت کرنے میں خیر کی کہ تمام نظامِ معاشرت اور اس کے بنیادی اخلاقی اصول بگڑ چکے ہیں اور تباہ ہونے والے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اسے اپنے لئے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنا پڑتا اور چالیس سال تک ایک گھر کے اندر زندگی گذارنے کی وجہ سے اس کو نقلِ مکان کے خیال سے وحشت ہوتی تھی لیکن وہ

یہ بھی جانتا تھا کہ اسے پرانے مکان کو چھوڑنے کا نوٹس مل چکا ہے لیکن وہ تن بہ تقدیر اس مہلت کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا جب اسے مجبوراً وہاں سے جانا پڑے گا۔۔۔۔۔۔۔علاوہ بریں ماضی کی اس کارواں سرائے میں ایک بہت بڑا بازار ایسا بھی تھا جس کی کنجی واپس کرنے کو اس کا دل نہ مانتا تھا مگر وہ اس کو کھول کر دیکھنے کے لئے اندر بھی نہ جاتا تھا۔ وہاں صدیوں سے خاک جمی ہوئی تھی اور اس نے اس خاک آلود مکان کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کردی تھیں۔ اس میں دن کی روشنی لانا اور جھاڑو دینا کہاں کی مصلحت ہے! وہ بڑا بازار وطن کا بازار تھا۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے فرانسیسیوں کا صرف یہی ایک دیوتا تھا جس کے آگے سب سر جھکاتے تھے اور تمام دیوتاؤں پر زندگی کے عام قانون کی حکمرانی تھی یعنی مجموعی اور انفرادی موت کی، بڑھاپے کی بیماری کی، کیڑے مکوڑوں کی جو منبر کو کھا جاتے ہیں۔ سوائے وطن کے اور کوئی دیوتا ایسا نہ رہا تھا جس پر حملہ نہ کیا گیا ہو۔ مگر اس بارے میں مذہبی لوگ اور 'آزاد خیال' سب ہی متفق تھے بالخصوص آزاد خیال لوگ کیونکہ اس کے علاوہ ان بچاروں کو کہیں قدم جمانے کی جگہ تک نہ تھی۔ کیسی دردناک اور قابل رحم تھی یونیورسٹی کے استاد اعظم بوڑھے لیویس کی یہ فریاد: "اگر تم میرا وطن مجھ سے چھین لو تو میرے پاس کیا رہ جائے گا؟ پھر میں کا ہے کے واسطے زندہ رہوں گا؟"

افسوس ان بوڑھے آدمیوں پر جو آخری دن تک اپنی پہاڑیوں کی پرسکون مگر تنگ فضا میں بند رہے! ان کے لئے ضروری تھا کہ یہ زمین، جس میں ان کے تمام مردے پندرہ سو برس سے گڑے ہوئے تھے، ان کے قدموں کے نیچے ہو۔ ذرا ان کے "وطن" کو ہلاؤ اور انھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ روئے زمین پر تہلکہ پڑ گیا۔ جن لوگوں کو کبھی زلزلے کا تجربہ ہوا ہے وہ جانتے ہیں کہ ایسے وقت میں تمام جانداروں پر کیسا عجیب اور ناقابل بیان کرب طاری ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ہی اٹل نقطہ ہے جس پر انسان نے سب کچھ بنایا ہے۔ جب وہی ہٹ جائے یا ہل جائے تو باقی کیا رہا؟ چونکہ جولین کی حس غیر معمولی طور پر تیز تھی اس لئے اس نے زمین کی خوفناک گڑگڑاہٹ کو قبل از وقت محسوس کیا اور اس کی روح کو جس کا پرانا آسرا معرض خطر میں تھا ایک خاص قسم کا مبہم سا درد محسوس ہوا جسے وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے ادھر سے اپنی نظریں اور زیادہ ہٹا لیں۔ وہ خاموش کھڑا اندر ہی اندر کڑھتا تھا اور اپنے آخری بت کو جو باقی رہ گیا

تھا ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ لیکن جن لوگوں سے اس نے قطع تعلق کر لیا تھا ان میں سے بعض ایسے تھے جو پادریوں کی طرح ضمیر انسانی کو سمجھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں میں اس کا مرشد روحانی بھی تھا جو ایک ہوشیار اور معمر شخص تھا، جس کے ہونٹ والٹیر کی طرح پتلے تھے (لیکن اس کی آنکھوں میں برخلاف والٹیر کے طنز کے لئے گنجائش نہ تھی۔ وہ روح کے گھر میں کسی حیلہ سے یا ڈاکہ زنی کر کے گھس آتی تھیں۔) انھوں نے اس کی بغاوت کی اٹھان ہی سے سمجھ لیا تھا کہ اس خودسر باغی میں اتنی مصلحت شناسی نہیں ہے کہ مناسب اور غیر مناسب میں تمیز کر سکے اور وہ ضرور اس سب سے بڑے بت پر بھی ہاتھ ڈالے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو اپنی لانبی آستینوں میں ڈالے صبر کے ساتھ اس حادثہ کا انتظار کر رہے تھے مگر وہ عطائی اتنے سمجھدار نہ تھے جنھوں نے جولین کو بھی اپنا سا ایک قابلِ اعتبار آزاد خیال سمجھا جس نے ان کے خیال میں "عبادت خانے" کے ساتھ محض "جلسہ گاہ" کی خاطر دغا کی تھی اور خود کو روایتی، قوم پرست، دنیا دار، واجب التعمیل اور متوسط طبقے کی ذہنیت کے ساتھ وابستہ کر لیا تھا۔ انھوں نے اس کے لئے مدرستہ العلوم فرانس کے دروازے کھول دئے اور اس کو "علوم اخلاقی اور سیاسی کی اکیڈمی" کا ممبر بنا لیا اور وہ اس کے لئے صرف اسی ایک چیز کے منتظر تھے جو سب سے بڑھ کر ہے اور انسان کو "غیر فانی" بنا دیتی ہے (یعنی فرانسیسی اکیڈمی کی ممبری) اس اعزاز کے لئے بعض ذی اثر ممبران اکیڈمی کی نظرِ انتخاب اس پر پڑ چکی تھی اور اس کے پرانے استاد نے بھی، جس کا دردناک اور طفلانہ مقولہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، اُسے یقین دلایا تھا کہ دو تین سال کے اندر اندر اس کا انتخاب یقینی ہے۔ وہ اس بات کے لئے ذاتی طور پر کوشاں تھا۔ نہ معلوم کیوں اس بوڑھے آدمی کو جولین سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جماعت میں اس کا بچپن کا زمانہ دیکھا تھا، پھر اُسے یونیورسٹی کے طالب علم کی حیثیت میں بھی دیکھا تھا۔ بغیر اس کے خیالات کی گہرائیوں کو ٹٹولے ہوئے اُسے جولین کے چہرے سے انس پیدا ہو گیا تھا۔ جب وہ لکچر دیتا ہوتا تو اس کی آنکھوں کو یہ چہرہ جس میں نوجوانی کی سنجیدگی اور وفاداری جھلکتی تھی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ استاد اور شاگرد کی آنکھوں آنکھوں میں جو ایک دوسرے پر مسکراتی رہتی تھیں اس طویل رفاقت کے دوران میں ایسی محبت کے مراسم پیدا ہو گئے تھے جیسی باپ بیٹے میں ہوتی ہے۔ بوڑھے استاد کو یقین تھا کہ جولین کی ذات میں اسے اپنا روحانی وارث مل گیا ہے اور جولین نے جو اس کا احترام کرتا تھا اور اس کا شکر گذار تھا کبھی

خود سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا کہ وہ اپنے استاد کی توقعات پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔

جب جنگ شروع ہوئی تو ملک کے اہلِ علم یعنی یونیورسٹی کے سربرآوردہ اراکین نے خود کو برضا و رغبت اپنے ملک کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ دفتری ذہانت کے ہراول یعنی یونیورسٹی کے افسرِ اعلیٰ نے اپنے مخصوص شاگرد کے لئے اس نئے نظامِ مدافعت میں جس کو وہ ترتیب دے رہا تھا ایک نمایاں جگہ تجویز کی۔ یعنی اہلِ علم کی ذہنی قوت جس کو پہلی مرتبہ فوجی لباس پہنایا جا رہا تھا اور جس کو عقلی گولہ بارود کے کارخانوں میں استعمال کرنا مقصود تھا۔ تاریخ، سائنس، قوتِ تقریر سب چیزیں اس کام میں مفید تھیں۔ اگر وہ جولین کو اسی معاملہ میں پس پشت ہی پڑا رہنے دیتا تو زیادہ قرینِ مصلحت تھا۔ وہ از خود محاذِ جنگ پر نہ آتا اور غالباً اپنے بزرگوں، ہم چشموں اور معاصرین سے ان تمام نتائج پر بحث و مباحثہ نہ کرتا جو پڑھنے اور دستخط کرنے کے لئے وہ اس کے سامنے پیش کرتے۔ لیکن یہ کس قدر دور اندیشی کے خلاف تھا کہ اس سے یہ کہا جائے کہ تم ان سب دلائل اور نتائج کو گھڑنے میں شرکت کرو! یہ سچ ہے کہ وہ اپنے طور پر ایمانداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ ان لوگوں کے جذباتِ قومیت اس قدر شدید اور مستحکم تھے اور انھیں اس قدر کامل یقین تھا کہ یہ جذبات حق کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں کہ اگر کبھی حق کا تقاضا یہ ہوتا کہ ان کے جذبات کی تردید کرے تو وہ بلا تامل حق کا گلا گھونٹ دیتے یا اس سے وہی کہلوا لیتے جو وہ چاہتے تھے۔ ضرورت صرف اتنی ہی تھی کہ شکنجہ پر کس کر اس کے اعضا کو ذرا کھینچ دیا جائے (اس بات کا کچھ تو اثر ہونا چاہیے کہ سوربون یونیورسٹی کے قائم کرنے والوں میں ایسے ماہرینِ علوم و فنون بھی تھے جو ان لوگوں پر سوالوں کی بوچھار کرتے تھے جن سے انھیں سچی بات قبول کرانی ہوتی تھی!)، جولین اس فن کا ماہر نہ تھا۔ وہ سچ کی آواز سنتا تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اس پر "جرح" کرنے کے کیا معنی ہیں۔ اس نے جرمنی کے جنگی مراسلات کا مطالعہ کر کے نہایت سادگی سے وہی رپورٹ لکھی جو ان سے مستنبط ہوتی تھی۔ بحث شروع ہوئی اور جب معلوم ہوا کہ اس کی رپورٹ اس کے ساتھیوں کے نتائج سے مختلف ہے تو ان کا باہمی اختلاف ظاہر ہو گیا۔ یہ اختلاف بہت صاف اور اچانک اور شدید تھا۔ جب بے احتیاطی سے کسی دماغی کام کرنے والے کی کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی جائے تو اسے غصہ میں سرخ نہیں بلکہ سفید نظر آتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب حرارت زیادہ بڑھ جاتی ہے تو آگ سرخ سے سفید ہو جاتی ہے۔ جب

جولین نے جنگ کے متعلق اپنے ایک دوست کے بیان کو سنا تو وہ ہونٹوں تک سفید پڑ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا اور چلا کر کہا "مگر یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔"

اس پر کیسا زبردست ہنگامہ برپا ہوا! اس نے جس شخص کی ہتک کی تھی وہ اس کا ایک عزیز اور محترم دوست تھا۔ بحیثیت پروفیسر کے اس کی بڑی شہرت تھی۔ لوگ اس کی علمی قابلیت اور دیانتداری کی بہت قدر کرتے تھے۔ جولین نے فوراً ہی معافی مانگی اور گھبراہٹ میں الجھے ہوئے طریقے پر اپنی رائے کو سمجھانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کے ساتھیوں کو زیادہ قابل اعتنا معلوم ہو۔ لیکن جس چہرے پر اس کا طمانچہ پڑا تھا اس پر اس کا نشان ثبت ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں نہ مٹنے والی نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی علمی کام کرنے والا کبھی اپنے ایسے ساتھی کو معاف نہیں کرتا جو اس کی ذات میں ان چیزوں کو دیکھ لے جنھیں وہ خود اپنے سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہو کیونکہ اب خواہ وہ کچھ کرے اُسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جو چیز دیکھنے سے وہ بچنا چاہتا ہے، وہ اس میں موجود ہے۔ جولین پر اپنے اس حریف سے بھی زیادہ ہیبت طاری تھی جس پر اس نے یہ ضرب کاری لگائی تھی۔ وہ تمام راستے دل میں یہ کہتا رہا "اور غضب یہ ہے کہ وہ دیانتدار ہے!" جولین جانتا تھا کہ وہ دیانتدار ہے۔ وہ اس بات کی تصدیق کے لیے سولی پر چڑھنے کو تیار تھا۔ بے غرضی کی زندگی، حق کی پرستش ...... اس نے زہرخند کیا اور کہا "واہ رے ایماندار لوگوں کی صداقت!"

اس تجربے نے اس کی دنیا کو بالکل ہی درہم و برہم کر دیا۔ اب اس کو اپنی سخت مذہبی تعلیم کے اثرات کا احساس ہوا۔ جو لوگ بہت زیادہ محتاط ہوتے ہیں وہی اکثر مذہب سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے ذوق میں ایسا کر رہے ہیں لیکن دراصل اس میں پاکیزگی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور تلاش حق کا وہ ذوق جو باطل کے ساتھ معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس کو خیال تھا کہ یہ چیز اُسے تہذیب سے باہر ذہنی آزادی کے مدعیوں میں مل جائے گی لیکن یہ وہاں بھی مفقود تھی۔ جولین نے اس لحاظ اور مروت کو دونوں ہاتھوں سے دھکیل دیا جس نے ابتک اس کے گرد و پیش کے ایماندار آدمیوں کی پردہ پوشی کی تھی اور معاملات پر بے لاگ طریقے سے تنقید شروع کر دی۔ اس زمانہ میں اس نے نہ معلوم اپنے کتنے ساتھیوں کو سپرد خاک کیا مگر اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ان پر تعزیتی تقریریں بھی کرتا۔ اس نے اب تک ان کو اسی

قدر عزت کی نظر سے دیکھا تھا کہ ان کی ذلت اس کی اپنی ذلت تھی۔

اس لئے اپنے استاد سے بگاڑ کرنا سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ یہ مفارقت بہت خاموشی کے ساتھ ہوئی جس طرح کوئی باپ بستر مرگ پر اپنی جان دے اور مرتے وقت درد انگیز اور ملامت آمیز نظر سے چپ چاپ اپنے بیٹے کو دیکھے۔ اس نے بغیر کسی اظہار ناراضگی کے جولین کی تحریر کو پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ جب جولین اپنی مرضی کے خلاف ایک راستے پر ڈال دیا گیا تو وہ تلاش حق سے باز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ اپنی تحریر کو لے کر اپنے استاد کے پاس آیا۔ اس نے کہا "نہیں، میں اسے نہیں دیکھوں گا۔ بالکل بے کار بات ہے......" اس نے اپنے چوڑے ہاتھ کو جو بڑھاپے کی وجہ سے سوجا ہوا تھا جولین کے ہاتھ پر رکھا اور کہا:۔

"میرے دوست تم مجھے بہت رنج پہنچا رہے ہو۔ غور تو کرو۔ تم اپنے تمام مستقبل کو تباہ کر رہے ہو۔ ہماری توقعات کو باطل کر رہے ہو، ہمارے فرض مشترک کی ادائگی میں کوتاہی کر رہے ہو۔"

ان الفاظ نے جولین میں سختی پیدا کر دی۔

"ہم سب کا، تمام سائنس کے خادموں کا مشترکہ فرض صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حق کی خدمت کریں خواہ اس کی قیمت کچھ بھی دینا پڑے۔ تم نے خود مجھے یہ سبق پڑھایا ہے۔"

بوڑھے آدمی نے اپنا بھاری سر ہلایا اور اس کی خون آشام آنکھوں میں شعلہ کی سی چمک پیدا ہوئی:

"حق کبھی ہمارے وطن سے جدا نہیں ہو سکتا۔ دونوں کا اقتضا ایک ہی ہے۔"

"یہ تسلیم ہے لیکن وطن کا فرض ہے کہ جادۂ حق سے منحرف نہ ہو۔" جواب ملا "وطن سب پر مقدم ہے۔ ہم سب اس کے خادم ہیں۔" سب ہیں لیکن ——— " مگر استاد نے قطع کلام کر کے کہا "ہر چیز جو ہمارے پاس ہے بغیر استثنا کے۔" دونوں خاموش ہو گئے۔ بوڑھے آدمی کی آنکھوں کا شعلہ بجھ گیا تھا۔ اس نے جولین کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ جولین بولے اور وہ الفاظ کہے جن کی اس کو توقع تھی۔ جب یہ خاموشی طول پکڑ گئی تو اس نے اپنا سر اٹھایا جو ایک بیمار شیر کا سا تھا اور اپنے بھاری پپوٹوں کو کھولا جو تابوت کے ڈھکنے کی یاد دلاتے تھے اور اس کی بھاری نم آگیں نگاہ نے محبت، خوف اور التجا

کے ساتھ جولین کی نگاہ کو تلاش کیا۔ جولین کے دل میں اس نگاہ نے تلاطم برپا کر دیا لیکن اس کے منہ سے اس کے سوا کیا نکل سکتا تھا "میں حق کو کیسے ہاتھ سے دے سکتا ہوں جو میری ملکیت نہیں، جس کی ملکیت میں خود ہوں۔"

مگر اس نے اپنے منہ سے یہ نہیں کہا۔ بے فائدہ ایک اور زخم لگانے سے کیا حاصل! لیکن اس کے استاد کے وہ زخم ضرور لگا کیونکہ اس نے جولین کی آنکھوں میں ان الفاظ کو پڑھا جو اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلے۔ بھاری پپوٹے بند ہو گئے اور اس کا سر اس کے سینہ پر جھک گیا۔ جب ذرا دیر کے لئے اس کا سانس سمایا تو یہ زخم خوردہ بزرگ بدقت تمام اپنی کرسی سے اُٹھا اور اس نے اپنے ہاتھوں کے بل میز کا سہارا لیا۔ جولین اس کی مدد کرنے کے لئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھا لیکن جس طرح کوئی رعشے کا مریض بے ڈھنگے پن سے اشارہ کرتا ہے اس نے بغیر جولین کی طرف نگاہ اُٹھائے اس کو روک دیا۔ اس نے مڑ کر پیچھے کی طرف بھی نہیں دیکھا بلکہ سر اور کمر جھکائے اپنے بھاری قدموں سے کھٹ کھٹ کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ جولین کے انکار سے اس پر ضرب کاری لگی تھی جس سے جانبر ہونا محال تھا۔

جولین کی طبیعت کے آدمی کے لئے وہ چوٹ جو کسی دوسرے کے لگے کچھ کم تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ انسان اپنی چوٹ کی طرح اس کا علاج بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی تو کھال نئی پیدا ہو جاتی ہے اور زخم مندمل ہو جاتا ہے مگر ہم دوسروں کے بجائے کیسے کھال پیدا کر سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے زخم ہیں کھٹکتے رہتے ہیں.... مگر اس کے باوجود جولین جیسے شخص کو یہ تشویش پیہم ذہنی تحقیق اور جستجو سے باز نہیں رکھ سکتی تھی کیونکہ جذبہ تحقیق اپنے مقتولوں اور مجروحوں کے اوپر سے ہوتا ہوا گذر جاتا ہے۔ جولین اپنے دماغ سے یہ نہ کہہ سکتا تھا۔

"ٹھیر جاؤ..... اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ بھول جاؤ۔"

وہ کبھی کوئی چیز نہ بھولتا تھا۔ یہ اس کی ایک دماغی کمزوری تھی۔ وہ آگے بڑھا جاتا تھا۔ حجت و تکرار کا طالب تھا۔ وہ اپنے طریقۂ عمل میں بہت احتیاط کرتا تھا۔ وہ محض اپنے لئے روشنی کا طالب تھا۔ اُسے دوسروں کے راستے کو روشن کرنے کی جلدی نہ تھی۔ وہ ان لوگوں کو اچھی طرح پہچان گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہ روشنی کے جویا نہیں ہیں۔ لیکن ان لوگوں کو محض اس خیال سے کوفت ہوتی تھی کہ وہ ان کے قریب

موجود ہے اور اس کے خاموش محاسبہ سے ان کی تردید ہوتی ہے گویا وہ ان پر محض اپنی خاموشی سے حکم لگا رہا
ہے (کیونکہ اب وہ اُس کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے اور ان کا غصہ اس کے تحمل اور ضبط سے اور بڑھ جاتا تھا۔)
اندھی جبلت سے مجبور ہو کر انھوں نے اس کے ضبط اور خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔سب سے زیادہ
اشتعال دلانے والا اس کا وہ دوست تھا جس کی دوستی اب جانی دشمنی میں تبدیل ہو گئی تھی (جس کے رخسار
پر ہمیشہ کے لئے اس کے طمانچہ کا نشان ثبت ہو گیا تھا۔ جولین کو انھوں نے خاموش رہنے نہیں دیا خاموش
رہنے اور آزادیٔ فکر میں تو بڑا آرام ہے۔ لہذا انھوں نے اس کے سامنے ایک تحریری اعلان پیش کیا جس پر
دستخط کرنے سے اس نے انکار کر دیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ اپنے وجوہات بتاؤ۔ جولین اپنے عقائد کا عام
اعلان کرنے سے بہت گھبراتا تھا لیکن اس نے اپنے فرض کی ادائگی سے کوتاہی نہیں کی اور وجوہات کو
بیان کر دیا۔ اس کا بیان اس قدر صریح اور واضح تھا کہ اس کو دیکھ کر وہ لوگ بہت زچ ہوئے جنھوں نے
ناعاقبت اندیشی سے اس کو اس تحریر پر مجبور کیا تھا اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ الفاظ واپس اس کے گلے
میں اتار دیتے۔ لیکن احمقانہ جوش میں وہ خود ہی نیچے آ رہے۔ انھوں نے دشمن کے لئے ایک جال لگایا
تھا اور خود ہی اس میں پھنس گئے۔ اگر وہ اپنے غیض وغضب کو اندر ہی بند رکھتے تو شاید معاملہ زیادہ نہ بڑھتا
مگر اخبار نویسوں کو اس کی اڑتی ہوئی خبر مل گئی اور ان میں سے ایک نے کسی طرح اس مرتد کے خطرناک
بیان کی ایک نقل حاصل کر لی۔ سیاسی ناظر کی حماقت نے کریلے کو اور نیم پر چڑھا دیا۔ اس کے اعلان سے
جہاں لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کے اراکین نے کس طرح حب وطن کے جوش میں اپنے ایک نااہل
رکن پر کلنک کا ٹیکہ لگایا ہے وہاں انھیں بارود خانہ کا راستہ بھی معلوم ہو گیا اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ مضمون
میں سے بہت سے حصوں کو جن میں کوئی خاص بات نہ تھی جو نہ دوسروں سے زیادہ شورش انگیز تھے نہ کم،
بھونڈے طریقہ پر حذف کر دیا گیا۔ اس سے عوام کے تخیل کو اور اشتعال ملا اور انھیں زیادہ سخت اور
بے پناہ مضامین کی تلاش ہوئی چنانچہ جولین کو خود اپنا مضمون پڑھ کر تعجب ہوا اور اس کی فطری جھجک
نے اس سے سوال کیا "مگر یہ باتیں کس نے کہیں؟ تم سے کس نے کہلائیں؟"

لیکن وہ خود سے یہ سوال کرتے ہی خاموش ہو گیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اینٹ اس کے برابر

کھڑی اس کی تحریر پڑھ رہی ہو۔ جولین بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کمرے میں دو تین چکر لگائے۔ پھر وہ بیٹھ گیا اور مسکرایا:-

"اچھا جو اس عورت کی مرضی۔ . . . جو ہونا ہے ہو جائے گا۔"

بالآخر "اس عورت" نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا جس طرح اس نے خود نظام معاشرت کی زنجیریں توڑ ڈالی تھیں اسی طرح اب جولین سے بھی وہی کرا لیا۔ اب وہ تنہا تھا، اس کی صحبت میں تنہا تھا لیکن وہ ایسا خیال پرست نہ تھا کہ یہ نہ سمجھے کہ "وہ" دراصل اس کے اپنے دماغ کا عکس ہے۔ اسے زندہ جیتی جاگتی گوشت اور پوست کی اینٹ کی ضرورت تھی جو اس کے دوش بدوش اس دنیائے آب و گِل میں جدوجہد کرے لیکن اب بھی اسے کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ اس کی تلاش کرے۔ اب وقت گذر چکا تھا اور بازی ہاری جا چکی تھی۔ وہ ان تقدیر پرستوں میں سے تھا (خدا ان پر اپنی برکت نازل کرے۔ میں ان کی تعظیم کرتا ہوں مگر ان کی ہانڈی پر رشک کی نظر نہیں ڈالتا انھیں ہی ان کے ٹھکانے مبارک ہوں!) جو شکست سے خائف نہیں ہوتے، اس کو قبول کر لیتے ہیں مگر اس کا کوئی تدارک نہیں کرتے۔ جولین خودداری کے ساتھ اپنے گھر کے صحرا میں زندگی بسر کرتا رہا جس میں اس کی خوش نصیبی سے ایک بچی کے شور و غل سے کچھ جان سی پڑ چلی تھی۔ گھر سے باہر کی تمام دنیا اس کے لئے ایسا ویران ماحول بن گئی تھی جو مخاصمت پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے علمی اور تعلیمی مشاغل منقطع ہو گئے۔ اکیڈمی کے معزز اراکین آیندہ احتیاط رکھیں گے کہ صرف اپنے ہم خیالوں کو اکیڈمی میں داخل کریں یعنی وزرا اور افسران اور ان کی اپنی قسم کے ارباب علم جنھوں نے وطن کے نیک مقصد کی خاطر حق کے ساتھ دغا کی تھی۔ جولین کے استاد اور مربی نے اس کے محبت آمیز خطوط کا جواب نہیں دیا اور اس رسالے کو بغیر پڑھے واپس کر دیا جس میں جولین نے اعتدال کے ساتھ اور مخالفین کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنا یہ مقالہ پیش کیا تھا کہ جنگ کی ذمہ داری تمام قوموں کی مشترکہ ہے اور تمام اہل علم کا فرض ہے کہ وہ جلد باہمی مصالحت کرانے میں کوشاں ہوں۔ فرانسیسی "جماعت عمال" کے سورماؤں نے جو خود ہر طرح سے محفوظ تھے لیکن گھر پر رہ جانے والے لوگوں کے محافظ بن بیٹھے تھے کئی مرتبہ اس کے یونیورسٹی کے لکچروں میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی......

جولین نے اس کے بعد اور کوئی چیز ایسی نہیں لکھی جس سے عام رسوائی ہو لیکن اس میں اس کی مصلحت شناسی کو دخل نہ تھا۔ خبروں کا ناظراب زیادہ ہوشیار ہوگیا تھا اور اسکی لکھی ہوئی ایک سطر بھی شائع نہ ہوسکتی تھی یہانتک کہ اس کے وہ رسائل بھی جو عمارات قدیمہ کے متعلق تھے شبہ کی نظر سے دیکھے جاتے تھے مگر اس کا دماغ بالکل بے خوف تھا۔ وہ جس راستے پر پڑتا تھا اس سے کوئی چیز اس کو ہٹا سکتی تھی۔ اس کا جسم بغیر چون وچرا، بغیر کسی شکایت یا اظہار مسرت کے وفاداری کے ساتھ اس کے دماغ کی پیروی کررہا تھا اور بوقت ضرورت اس کے اشارے پر گھسان کی لڑائی میں کودجانے کو تیار تھا۔

لیکن ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۹ء کے درمیان وہ اس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اس عرصے میں وہ خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ غور وفکر میں مصروف رہا۔ اس کے "ارتداد" کی وجہ سے اس کے گرد جو خلا قائم ہوگیا تھا اس کی وجہ سے اسے اور فرصت مل گئی اور اس ذہنی تنہائی کی بدولت اس کی جرأت میں اضافہ ہوا اور اس کی فطرت میں اور زیادہ گہرائی پیدا ہوگئی۔ اس نے دوسروں کے سہارے کے بغیر اپنا کام نکالنا سیکھ لیا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس کو زمین کی ہوا سے محروم کرکے پہاڑ کی ہوا کھانے پر مجبور کیا تھا اپنی عداوت اور اپنے مقصد میں ناکامی کی وجہ سے اور زیادہ برافروختہ تھے کہ انھوں نے خواہ مخواہ اس فضیحت اور رسوائی کو دبایا کیونکہ ان کی کوششوں سے وہ دب تو گئی لیکن اس کا انسداد نہیں ہوا۔

جولین کے نقادانہ دماغ اور وجدان میں جو نادر توازن قائم ہوگیا تھا اس کا پختہ ثمرہ تصنیف تھی جس کا نام اس نے "اونتین کے لوگوں کا مکالمہ" (Dialogues of the People on the Aventine.) رکھا تھا جس میں اہل روح، جو شہر سے اپنا رشتہ منقطع کرچکے ہیں آپس میں ہنگامہ خیز تبادلۂ خیال کرتے ہیں اور اس مرتبہ اس شخص کو آخری لفظ کہنے کا موقع نہیں ملتا جو محض شکم پری کی نیابت کرتا ہے: "جو روٹی کھانا چاہتا ہے وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے کام کرکے دکھائے۔" "اپنے ہاتھوں کو سامنے کرو، اے عالمو، فاضلو، مصورو، مصنفو۔ اپنے اعمال کا دفتر پیش کرو۔ تم نے گذشتہ سو برس میں کیا خدمات انجام دی ہیں کہ تم رائے عامہ کے حاکم (یا غلام) بنے رہے ہو؟" یہ بڑی دلچسپ نمائش تھی۔ تمام قلم کے سورما اسٹیج پر لائے گئے تھے! لیکن اصل ڈراما تماشائی کی روح میں تھا جس نے اس کو دیکھ کر

حقارت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔ اس نے یہ دیکھا کہ لوگ شہر کے باہر خیمے لگائے رات کے وقت آگ کے گرد بیٹھے اس سرخ دھوئیں کو دیکھ رہے ہیں جو آسمان کی خلیج کی طرف بلند ہو رہا ہے جہاں ٹوٹتے ہوئے تاروں کی حیثیت چنگاریوں سے زیادہ نہیں۔ اس کا ذہن بغیر کسی خارجی رہنمائی کے اپنی ذات میں اس وقت ایک انقلاب پیدا کر رہا تھا جس وقت یورپ کے قلب میں قوموں کی شورہ پشتی انقلاب برپا کر رہی تھی لیکن اس کا دماغ خارجی واقعات سے بے خبر تھا اور اس نے دوسروں پر اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ اس زمانے میں جولین نے اپنے نتائج افکار کو شائع نہیں کیا بلکہ جنگ ختم ہو جانے کے بعد بھی جب اشاعت کتب پر زیادہ روک تھام نہیں رہی تھی اور وہ آسانی سے اپنی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کر سکتا تھا اس نے ایسا نہیں کیا۔ اپنے خیالات کی تشہیر سے اُسے تکلیف ہوتی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگر وہ انھیں شائع کرتا تو دن کی تیز روشنی میں اسے خود اپنی روح کے پوشیدہ راز دیکھنے پڑتے اور جب باہر کی روشنی ایک مرتبہ اس کے گھر میں داخل ہو گئی تو وہ دوبارہ کیسے اپنا دروازہ بند کر سکے گا؟ تاریکی کا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔ سایہ ڈھل چکا تھا لیکن شام کی وہ دھندلی سی روشنی باقی تھی جو ارباب فکر کو طبعاً بہت مرغوب ہوتی ہے......

لہذا جنگ کے فوراً بعد اس نے محض ان تمام تصانیف کو شائع کیا جو سائنس کی تاریخ سے متعلق تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی وہ تحریریں بالکل معروضی ہیں لیکن اس کی پرزور شخصیت نے جو عرصے تک جرأت آزما تنہائی میں پرورش پائی رہی تھی اور جس کی کمان سالہا سال کے ضبط کی وجہ سے خوب تنی ہوئی تھی ان بے پناہ تیروں کی طرف خیال نہیں کیا جو وہ اپنی تصانیف کے ہر باب میں حال اور ماضی کی ریاکاریوں اور دروغ بافیوں کے خلاف چلا رہا تھا چونکہ ایک زمانے میں وہ سب خود اس کی ذات میں جمع رہی تھیں اس لئے دراصل وہ خود اپنے خلاف تیر چلا رہا تھا۔ پھر تیر چلا کون رہا تھا؟ وہ خود، ہمارا یہ نیا جولین جس کی قلب ماہیت ہو گئی تھی۔ اس تبدیل شدہ انسان نے اپنے کو آزاد کرنے کی کوشش میں خون کا غسل کیا تھا۔ اس کے تیروں کی یہ بوچھار ایک پورے ذہنی عہد اور سوسائٹی کے ایک ایسے دور کے خلاف تھی جس کا انجام قریب تھا، جس کے جسم پر ان زخموں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔

یہ جری شخص، جو یکہ و تنہا نہایت آزادی اور بے جگری کے ساتھ اپنے اجتہادی خیالات کی ترتیب

میں مشغول تھا در اصل مستقبل کی تشکیل کر رہا تھا اگرچہ خود اسے اس کا مطلق شان گمان نہ تھا۔ وہ لاعلمی میں انسانوں اور قوموں کے اس عظیم الشان کارخانے میں کام کر رہا تھا جہاں اس جیسے بہت سے لوگ ایک نظام جدید، ایک دنیائے نو کی تعمیر میں کوشاں تھے۔ اور بعد میں جب اُسے اس کا احساس ہوا، جب خارجی واقعات جبرانہ طور پر اس کے کتب خانے کے گوشۂ عافیت میں گھس آئے تو اس نے خود کو انقلاب کی جماعت میں بھرتی پایا۔ اس وقت تک یہ "انجان انقلابی" مسلسل دس سال مخالفوں کی ذہنیت کے خلاف اپنے بے پناہ تیر چلا چکا تھا۔

اور ابھی اُسے اس بات کا پوری طرح احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ اینٹ نے جو اس وقت کئی ہفتے کی علالت کے بعد روبصحت تھی اپنے بستر علالت ہی پر اس کی تصانیف کا مطالعہ کیا اور ایک ہی نظر میں اس حقیقت کو، اس کی ذہنیت کے اس انقلاب عظیم کو پہچان لیا۔ مسرت نے اس کے سینے میں جوش مارا اور پرانی محبت جو ابھی تک زندہ تھی بیدار ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے بھی خلاقی کی ہے۔ اس شخص کی، جو اس سے محبت کرتا تھا، اس کا جولین، تیر انداز!

تفاسیر القرآن

قرآن اللہ کا پیغام اور آسمانی نور ہے جو بنی نوع انسان کے لئے شمع ہدایت بنا کر اُتارا گیا۔ صحابہ کرام نے جن کی زبان میں قرآن اُترا تھا اور جو اس کے اولین مخاطب تھے بے تکلف اس کو سمجھا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی ذات جو عمل بالقرآن کا نمونہ تھی ان کے لئے اسوۂ حسنہ تھی۔ انھوں نے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر عمل کرتے دیکھا اسی طرح خود اس کی تعمیل کرنے لگے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے عمل کو اسی کے مطابق رکھا۔

یہ کتاب جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے مفصل اور نور مبین ہے۔ اس کی تعلیمات عمل کرنے اور نصیحت لینے کے لئے واضح اور روشن ہیں۔ صحابۂ کرام پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ یہ کتاب انسان کے ظاہری اور باطنی اعمال کو سنوارنے کے لئے نازل ہوئی ہے اسی کے مطابق اپنے اعمال کو رکھنا اس کے اتارنے والے کے نزدیک مقبولیت کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ نظری بحثوں میں زیادہ نہیں الجھے۔ انھوں نے اس کی آیات کی توضیح اور تشریح کے لئے سوالات بھی بہت کم کئے۔ کیونکہ ان چیزوں میں قومیں اس وقت پھنستی ہیں جب ان کے ایمان اور عمل میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور صحابۂ کرام کی قوت ایمان اور جذبۂ عمل کا وہ عالم تھا کہ ان کی ایک نگاہ سے بڑے بڑے فلسفیوں اور عالموں کے ذخیرے سوخت ہو سکتے تھے۔

عہد صحابہ کے بعد پہلی صدی ہجری کے اواخر میں جب دوسری قومیں بھی جو عرب نہ تھیں اسلام کے آغوش میں آچکی تھیں قرآن کریم کی تشریح اور توضیح کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ اس وقت سے تفسیریں لکھی جانے لگیں بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلی تفسیر خلیفہ عبدالملک کی فرمائش سے سعید بن جبیر نے مدون کی تھی لیکن وہ معدوم ہو گئی۔ تیسری صدی ہجری میں امام ابن جریر طبری نے اپنی مشہور تفسیر لکھی جو آج بھی موجود ہے اور اُم التفاسیر کہی جاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سے آج تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب اسی سے ماخوذ ہیں۔ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں بہ سلسلہ اسناد اس کل علم کو جمع کر دیا جو قرآن کے متعلق اس وقت تک مسلمانوں کے پاس تھا۔

طبری کے بعد علمار اسلام نے اس قدر تفسیریں لکھیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔ جس طرح ہر زمانہ میں فقہا اور محدثین کی کثرت رہی اسی طرح مفسرین کی بھی جماعت ہر عہد میں رہی۔ بعض بعض تفسیریں اس قدر مبسوط لکھی گئیں کہ دو دو سو اور تین تین سو جلدوں میں ختم ہوئیں۔ تفسیر حدائق البیان کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ پانسو جلدوں میں تھی۔ لیکن ان مفسروں نے جہانتک قرآن کی تشریح کا تعلق ہے طبری کی تفسیر پر کچھ زیادہ اضافہ نہیں کیا۔ صرف اسرائیلی قصوں، مجوسیوں کے افسانوں، علمار کے اختلافات اور اقوال کو درج کر کے اس کو بڑھانے کی کوشش کی۔ بعض بعض مفسروں نے اپنے اپنے خاص خاص اعتقادات یا فنی زاویۂ نگاہ سے تفسیریں لکھیں اور قرآن کو اسی رنگ میں رنگنا شروع کیا۔ فلسفیوں نے فلسفیانہ بحثیں کیں۔ معتزلہ نے اعتزال اور صوفیہ نے تصوف کا رنگ بھرا۔ فقہا نے استنباط مسائل پر زیادہ رجحان رکھا اور مورخوں نے تاریخی تفصیلات لکھیں اور انھیں چیزوں کا نام تفسیر رکھا گیا۔ علامہ زمخشری نے تو کشاف میں اپنا سارا زور بدیع اور بیان پر صرف کر دیا ہے تفسیر محض نام کے لئے ہے۔ حقیقت میں امام رازی کی تفسیر کبیر کے متعلق جو فقرہ مشہور ہے کہ "اس میں سب کچھ ہے بجز تفسیر کے" وہ کشاف پر زیادہ چسپاں ہے اس لئے کہ امام رازی نے تو بہت کچھ قرآنی مسائل حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

الغرض آج ہزاروں تفسیروں کے لکھے جانے کے بعد بھی اگر کوئی تفسیر کارآمد ہے تو ابن جریر طبری ہی کی ہے۔ وہی پہلی تفسیر ہے اور اسی کو ابتک آخری تفسیر بھی سمجھنا چاہئے۔ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آغاز عہد اسلام میں صحابۂ کرام اور تابعین اعلام نے قرآنی آیات کو کس طرح سمجھا تھا اور قرآن فہمی میں ان کے اندر کس قسم کے اختلافات تھے۔

طبری کی یہ تفسیر قرآن فہمی کے لئے ایک ذخیرہ تھی۔ اس سے مدد لے کر قرآنی حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی جا سکتی تھی لیکن مابعد کے مفسروں نے بجز نقل در نقل کے کوئی خاص ترقی نہیں کی اور یہ فن ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ اب تک جس قدر تفسیریں لکھی گئی ہیں ان میں غور کرنے سے بڑے بڑے نقائص نظر آتے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

(۱) سب سے پہلی اور ابتدائی خرابی یہ ہے کہ ان مفسروں نے قرآن کی تشریح کے اصول نہیں مقرر کئے۔ زمانۂ مابعد میں اگرچہ علمار اصول نے کچھ قواعد مرتب کئے ہیں لیکن وہ قرآن فہمی کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنائے گئے

ہیں بلکہ زیادہ تر الفاظ اور اس کے استعمال کے متعلق ہیں اور محض قیاسی ہیں جن سے ہر نقطہ پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور پھر بالکل ناکافی۔ علامہ ابن تیمیہ نے جو ترجمان القرآن کے لقب سے مشہور تھے کچھ اصول لکھنے شروع کئے تھے مگر صرف تمہید ہی لکھ سکے۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے بھی اصول تفسیر میں فوز الکبیر نامی ایک رسالہ لکھا مگر اس کو اصول کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ وہ تو صرف ان کی قرآن فہمی کی نوعیت ہے اور بس۔

الغرض تفسیر قرآن کے اصول ابھی تک قطعاً مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔ حالانکہ ایسے اہم علم کے لئے سب سے پہلا کام یہی تھا کہ اس کے اصول بنائے جاتے۔ اس لئے یہ تمام تفاسیر جو لکھی گئی ہیں کسی علمی یا عقلی اصول پر مبنی نہیں ہیں۔

(۲) ان مفسروں نے قرآن کی تفسیر کا جو طریقہ رکھا ہے وہ وہی ہے جس کے مطابق کسی انسانی کتاب کی تشریح کی جاتی ہے یعنی فاتحہ سے شروع کر کے ایک ایک آیت کی سلسلہ وار تفسیر لکھتے چلے جاتے ہیں اور آخر تک پہونچا دیتے ہیں۔ اس سے آیات اور الفاظ کے معنی کی شرح تو ضرور ہو جاتی ہے مگر قرآن نہیں سمجھ میں آتا یعنی اس کی کوئی تعلیم حل نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کی تعلیمات اس ترتیب اور ربط کے ساتھ نہیں بیان کی گئی ہیں جس طرح انسانوں کی کتابوں میں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس کی ہر تعلیم متعدد سورتوں اور آیتوں میں اس کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہے تاوقتیکہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق اس کی تمام تعلیمات متفرق سورتوں سے نکال کر جمع نہ کر لی جائیں اور ان کو صحیح ترتیب کے ساتھ مرتب نہ کیا جائے وہ مسئلہ ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتا۔ لہذا ان تفسیروں اور ترجموں سے جو سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں قرآنی تعلیمات کی مطلق توضیح نہیں ہوتی۔ فہم قرآن کے لئے ایسے ترجموں اور تفسیروں کی نوعیت تقریباً وہی ہے جو فن طب میں کتب مفردات کی ہے جن میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ دواؤں کے نام، خواص اور بدل وغیرہ لکھ دئے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ان کو پڑھ کر طبیب نہیں ہو سکتا بجنسہ ان تفاسیر وتراجم کے مطالعہ سے بھی کوئی قرآن کا عالم نہیں ہو سکتا۔

(۳) ایک خاص عیب یہ ہے کہ ان تفسیر نگاروں نے خود اپنے دماغوں سے بہت کم محنت لی ہے، الا ماشاءاللہ۔ زیادہ تر اپنے سے پہلے مفسروں کے اقوال اور روائتیں درج کی ہیں۔ بہت سے مفسر تو اس قسم کے ہیں جنھوں نے اپنی تفسیریں محض ثواب کا ذخیرہ اور جنت کا ذریعہ سمجھ کر لکھی ہیں یعنی تقرباً الی اللہ خدام قرآن میں

داخل ہو گئے ہیں۔ بجائیکہ ان کی تفسیروں میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی ہے جس پر کسی طالب قرآن کی زبان سے ان کے لئے مغفرت کی دعا نکلے یا جو بوجھ اپنی تصنیف کا وہ پڑھنے والوں پر ڈال گئے ہیں اس کی کوئی تلافی ہو سکے۔ اگر بعضوں نے دماغ سے کام بھی لیا ہے تو یہ کہ اپنے خاص نظریہ کو موقع بے موقع قرآن کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کرمانی کی تفسیر عجائب الغرائب اور وہ تفسیر جو شیخ محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب ہے اسی قسم کی ہیں۔ یہ درحقیقت خالص تفسیر بالرائے ہیں جن سے سوائے انسانی خیالات کے آسمانی پیغام کی ماہیت نہیں سمجھی جا سکتی۔

(۴)۔ عام طور پر ان تفاسیر میں آیات اور الفاظ قرآن کی تشریح روایات سے کی گئی ہے۔ روایت کا بجائے خود جو درجہ ہے وہ ظن سے زیادہ نہیں ہے۔ اس طرح پر قرآن کو جو بالکل یقینی ہے اور جس پر ہر مسلمان ایمان رکھتا ہے ان مفسروں نے مظنون تشریحوں میں ڈال دیا ہے اور اس کے مفہوم کی قطعیت کھو دی ہے۔

بالخصوص تفسیر میں جو روایات ہیں ان کا بڑا حصہ تو خود محدثین کے نزدیک موضوع ہے اور اسرائیلیات تو بیشتر ناقابل اعتبار ہیں۔ قدیم مفسروں نے ان روایات کا سلسلۂ اسناد بھی لکھا تھا مگر متاخرین نے اس کو بھی حذف کر دیا جس کی وجہ سے بعد کی تفسیروں میں وہی قصے اور وہی روایتیں بلا اسناد کے منقول ہوئے اور عوام میں ان کی حیثیت مسلمات کی سی ہو گئی اور بہت سی آیات کی غلط تفسیریں امت میں رائج ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر تفاسیر کی کثرت ہوتی گئی اسی قدر مسلمانوں کو قرآن کریم کی اصلی اور صحیح تعلیم سے بعد ہوتا گیا۔

(۵)۔ یہ مفسرین بالعموم قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ اس لئے محکم اور یقینی آیات پر بھی نسخ کے احکام لگاتے چلے جاتے ہیں بلکہ جن لوگوں نے ناسخ اور منسوخ آیات پر کتابیں لکھی ہیں ان کی تو کوشش یہی ہے کہ جس قدر ہو سکے نسخ دکھلائیں۔ ان کے بیان کے مطابق نصف بلکہ اس سے بھی زیادہ احکامی آیتیں منسوخ ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے زیادہ غور کیا تو ان کو صرف پانچ آیتیں ایسی مل سکیں جو منسوخ ہیں۔ مگر وہ بھی منسوخ نہیں ہیں جیسا کہ تفصیل کے ساتھ ہم نے ان پر اپنی کتاب تاریخ القرآن میں بحث کر دی ہے۔ غرض اس نسخ کے عقیدہ نے ان تفسیروں کے اندر ایک عجیب اہمال پیدا کر دیا ہے۔

(۶)۔ ان مفسروں کو قرآن کریم کی صاف اور سیدھی تعلیم کم تر پسند آتی ہے۔ اس میں مختلف طریقہ سے ندرت اور غرابت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد کو زیادہ تر موضوع اور مجہول روایتوں سے حاصل کرتے۔

ہیں قصص میں اس قسم کی عجیب و غریب باتیں جو بیان کی گئی ہیں ان کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ معمولی اور سیدھی باتوں میں بھی یہ اپنی جدت طرازی سے اضافے کرتے ہیں۔ "تنزل الملئکۃ والروح فیہا" میں 'روح' کی تفسیر کی گئی ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو ساتوں آسمان کا ایک لقمہ بنا سکتا ہے۔ اس کا سر عرش کے تلے اور پاؤں زمین کے ساتویں طبق کے نیچے ہے۔ اس کے ایک ہزار سر ہیں اور ہر سر اس دنیا سے بڑا ہے اور ہر ہر سر میں ہزار ہزار منہ ہیں الی آخرہ۔ قوم ثمود کی آزمائش کے لئے اللہ نے جو اونٹنی نکالی تھی اس کی نسبت تفسیروں میں ہے کہ پہاڑ میں سے کراہنے کی آواز آئی اور وہ اس میں سے پیدا ہوئی حالانکہ قرآن کے کسی حرف سے اس کا اشارہ تک نہیں ملتا "استوت علی الجودی" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح کی کشتی پہلے کعبہ کے پاس آئی (یہ کعبہ ابراہیمی تو ہو نہیں سکتا جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ غالباً فرشتوں کا بنایا ہوا ہوگا اسی وجہ سے ڈوبا نہ تھا) اور سات بار اس کا طواف کیا، پھر یمن کی طرف گئی۔ وہاں سے پلٹ کر جودی پہاڑ پر جا کر دسویں رجب کو جو جمعہ کا دن تھا ٹھہر گئی۔ یہ ہے ہمارے مفسروں کی قرآن فہمی۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ روما کے کنیسہ میں کسی بزرگ کی سنگ مرمر کی مورت بنا کر رکھی ہے جہاں عقیدت مند حاجت طلبی کے لئے آتے ہیں اور اس کے نیچے شمعیں یا بتیاں روشن کرتے ہیں۔ مرور زمانہ سے ان چکنے پیچ دار دھوؤں سے وہ سفید مورت اس قدر سیاہ ہوگئی ہے کہ اب کوئی طاقت اس کو صاف نہیں کرسکتی۔ یہی کیفیت ہمارے ان مفسروں کی ہے جنھوں نے قرآن کو واضح کرنے کے لئے اپنی اپنی تفسیروں کی جو شمعیں روشن کیں ان سے اس کا نورانی چہرہ اس قدر تہ در تہ سیاہیوں کے نیچے چھپ گیا کہ اب اللہ ہی اس کو دور کرے تو کرے۔

(۷) یہ مفسرین بہت سی آیتوں کی تفسیر میں متعدد معانی اور مختلف اقوال نقل کرتے چلے جاتے ہیں مثلاً "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کی تفسیر میں بیسیوں قول ہیں۔ "والفجر ولیالٍ عشر" کی متعدد تفسیریں ہیں۔ "وشاہد ومشہود" کی شرح میں کئی باتیں لکھی گئی ہیں۔ "اصحاب الاخدود" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ وہ اہل فارس تھے یا یمن کے باشندے تھے یا حبشی یا نجرانی یا شامی تھے۔ الغرض سینکڑوں آیات ہیں جن کی تفسیر یا یا کرتے لکھتے چلے جاتے ہیں اور کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ نہیں بیان کرتے۔ ان مختلف اقوال میں نہ اتفاق کی صورت ہوتی ہے نہ تطابق کی۔ اگر ایک بات کو دوسری پر ترجیح دیتے ہیں تو درایت سے کام نہیں لیتے بلکہ

قائل کی عظمت وشہرت کے اوپر اس کا معیار رکھتے ہیں۔ غرض ان مختلف اقوال میں صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ان کے اندر مفقود ہوتی ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ قرآن کا مفہوم ایک اور صرف ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اس لئے ایسی تفسیروں سے بجائے اس کے کہ آیات کا مفہوم واضح ہو اکثر گورکھ دھندا ہو کے رہ جاتا ہے کیونکہ مفسر خود کوئی مفہوم نہیں سمجھ سکا ہے۔

(۸) ان تفاسیر میں قرآنی حقایق کی جستجو کم ہوتی ہے اور غیر متعلق اور غیر ضروری باتوں میں صفحوں کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں جنت کا ذکر آئے گا تو اس کے پیالوں اور آبخوروں کی تعداد شمار کرنے لگیں گے اور حوض کوثر اور طوبیٰ کی پیائش کریں گے۔ دوزخ کے بیان میں اس کے طبقوں کی گہرائی اور سانپوں اور بچھوؤں کی درازی ناپنے لگیں گے۔ اصحاب کہف کے قصے میں ان کی تاریخی حقیقت لکھنے کے بجائے ان کے ناموں کی فہرست اور ان کے کتے کی نسل بیان کریں گے۔ اور جنگ بدر میں فرشتوں کے نزول کی حقیقت سمجھانے کی جگہ ان کی شکلوں، گھوڑوں، عماموں کا رنگ اور سواری اور قتل وحملہ کی کیفیت لکھیں گے۔ اگر ان چیزوں کا موقع نہ ہوگا تو فصاحت وبلاغت کی لطافتیں دکھلائیں گے یا خیالی فلسفیانہ بحثیں کریں گے۔

یہ عیوب و اسقام جو میں نے بیان کئے موجودہ تفاسیر میں کوئی تفسیر بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ اگر اسی کو قرآن کی خدمت سمجھا جاتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ اب تک اس کی کوئی خدمت ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے زمانہ کا ایک متلاشی حق ان تفاسیر کے متعلق لکھتا ہے:۔

> "آج اگر کوئی طالب حقیقت اپنی بجھی ہوئی آگ سلگانے کی نیت سے کسی بڑی سے بڑی تفسیر کی طرف رجوع کرتا ہے تو پہلا ورق کھولتے ہی اس میں انسانی باطل آرائی اور غلط گوئی، داستان سرائی اور حقیقت پوشی، آسمان سوالی اور ریسماں جوابی کی وہ حیا سوز بدعنوانیاں دیکھتا ہے کہ اس قصاب خانۂ عقل وفہم کو دیکھ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ کہیں اس کے اندر صرف ونحو کے مستقل مقالے ہیں، کہیں اعراب پر لمبی چوڑی بحثیں ہیں، کہیں اسالیب فصاحت پر جرح وقدح ہے، کہیں ظن وقیاس کے ظلمت انگیز مناظرے ہیں، کہیں حدثنا اور قال قال کا بے سرا راگ ہے، کہیں فرضی اور بے سند قصوں کا طومار

ہے، کہیں بے ربطیاں میلوں تک ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں، ہر آیت سیاق سے الگ سباق سے علیحدہ، اندر سے ٹکڑے ٹکڑے باہر سے بے مطلب اور بے نتیجہ بن گئی ہے۔ جہاں ربط روز روشن کی طرح عیاں ہے وہاں طفلانہ نمائش ہے۔ جہاں بے ربطی کی خلیج عظیم اور تدبر و علم کی ضرورت ہے وہاں آئیں بائیں شائیں ہے۔ نہ اصول مطلب سے بحث ہے، نہ نتائج پر نظر ہے، نہ علم کی تلاش ہے، نہ حکمت کی جستجو ہے، ....

کسی مفسر قرآن کی نظر آج تک اس بات پر نہیں رہی ہے کہ ناظر کا طرامدعا پیغام الٰہی کی ماہیت کو سمجھنا ہے کہ چند الفاظ میں اس کے اندر کیا لکھا ہے، چند جملوں میں وہ کیا اصول ہیں جن پر عمل چاہئے، ان کی حکمت الٰہی کیا ہے، ان کی دستوری سند کیا ہے، وہ کیوں ذکر للعالمین ہے، کیوں ھدیٰ اور رحمۃ ہیں۔ بعینہٖ یہی باتیں ہیں جو ہر تفسیر اور ترجمہ میں کالعدم ہیں۔ اسی مدعا کو ٹھان کر لوگ تفسیریں پڑھتے ہیں اور مایوس ہو کر رہ جاتے ہیں، کوئی مستقل اصول، کوئی گر، کوئی کارگر بات موجودہ تفاسیر سے ان کے پلے نہیں پڑتی۔ الغرض تفسیر یا ترجمۂ قرآن کا مطالعہ متلاشی علم کے لئے مدت مدید سے وہ بے نتیجہ اور ناموافق شے رہا ہے کہ ایمان کے شعلہ کو آسمان سائے کرنے کے بجائے معتقد کی اس سلگتی ہوئی چنگاری کو بھی بجھا دیتا ہے جو ہر مسلمان کے دل میں رسماً یا خلقاً موجود ہے۔" تذکرہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی۔"

سب سے بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ متاخرین نے یہ طے کر لیا کہ قرآن فہمی میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہئے بلکہ جو کچھ متقدمین کہہ گئے ہیں اسی کو صحیح تفسیر یقین کرنا چاہئے۔ اس عقیدت نے قرآن فہمی کا دروازہ ہی بند کر دیا اور مسلمان بالعموم اسی ذخیرہ پر جو سلف سے چلا آتا تھا قانع ہو گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود علماء اسلام کا طبقہ بھی قرآن سے محروم ہو گیا چہ جائیکہ عوام اور قرآن چھوڑنے کی جو سزا تھی وہ سب کو ملی لیکن وہ چشمۂ نور یعنی قرآن کریم اسی طرح زندہ اور زندگی بخش ہے۔ وہ ہر زمانہ کے لئے ہے اور ہمیشہ ایک نیا عالم پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسی کمل کتاب ہے جو واضح ہے مفصل ہے، اپنے اصول اپنے اندر رکھتی ہے اور اپنی تفسیر خود ہے۔

علم سیاست اور اجتماعی تباہی

[ذیل میں ہم ایک مشہور اطالوی عالم سنیو رتوسکا (روما) کے ایک مضمون کا ترجمہ درج کرتے ہیں۔ یہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "سیاست بحیثیت علم" سے ماخوذ ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مدیر]

یہاں جس سوال پر بحث مقصود ہے وہ علمی حیثیت سے شاید ان تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے جن سے علم سیاست بحث کرتا ہے یا جن پر اسے بحث کرنا چاہئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس علم کی ترقیوں سے ایک دن وہ تباہ کن انتشارات یک قلم رک سکیں گے یا کم از کم ان کی تعداد اور شدت میں کمی ہو سکے گی یا نہیں جو بدفعات وقتاً فوقتاً پیدا ہو ہو کر تہذیب و تمدن کی ترقی کو روک دیتے ہیں اور ان قوموں تک کو، کچھ ہی عرصہ کے لئے سہی، مقابلۃً بربریت کی طرف لے جاتے ہیں جو انسانیت کی تاریخ میں ممتاز حیثیت حاصل کر چکی تھیں۔ میں یہاں بعض باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں جو شاید اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں کچھ مدد دے سکیں، مگر ان کے اظہار سے پہلے خود مسئلہ کو ذرا زیادہ صحت و وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ انتشارات عموماً اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم بوڑھی ہو جاتی ہے اور اسی کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے۔ مجھے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ جب لوگ قوموں کے بڑھاپے اور ان کی موت کا ذکر کرتے ہیں یہ بس ایک شاعرانہ استعارہ کا استعمال ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور استعارہ بھی ایسا جس سے اس منظر کا پورا پورا تصور قائم نہیں ہو پاتا جس کی تحقیق منظور ہے۔ اور ان لوگوں کے ذہن میں تو یہ تصور اور بھی قائم نہیں ہو پاتا جنھوں نے تاریخ کا مطالعہ چنداں غور سے نہیں کیا ہے۔

فرد تو ضرور بڈھا ہوتا ہے اور مرتا ہے۔ یہ اس کی تقدیر کا تقاضا ہے، جب اس کی قوت حیات ختم ہو چکتی ہے، کوئی مرض یا کوئی شدید خارجی سبب اس کے کسی ایسے عضو کے فعل کو پوری طرح انجام نہیں دینے

دبیا یا بالکل بند کر دینا ہے جو حیات کے لئے لازمی ہے۔ جماعت کے باب میں ایسا مادی بوڑھا پا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ ہر نئی نسل کے جوانوں میں پوری پوری قوت حیات موجود ہونی چاہئے۔ مادی موت بھی ناممکن سی معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کے واسطے تو یہ ضروری ہوگا کہ ایک پوری نسل کی نسل اولاد پیدا کرنے سے محترز رہے۔

ہاں، لوگ ایسی قوموں کی مثالیں دے سکتے ہیں جو بالکل غائب ہو گئیں اور جن کے اخلاف کا آج پتہ بھی نہیں لگتا۔ مثلاً تسمانیہ کی دیسی آبادی غائب ہو گئی، آسٹریلیا کی اصلی آبادی بھی ختم ہوا چاہتی ہے، جزائر کناری کے گوانوں میں شاید کچھ گنتی کے آدمی بچے ہوں تو بچے ہوں۔ امریکہ کے بہتیرے اصلی قبائل بالکل مٹ چکے اور بہت عنقریب مٹنے کو ہیں۔ لیکن ان سب صورتوں میں ایک چھدری چھدری منتشر آبادی کا معاملہ تھا جو شکار یا ماہی گیری سے اپنا پیٹ پالتی تھی، جن کی روزی سفید آدمیوں کی نو آبادی نے ان سے چھین لی۔ جب سفیدوں سے ان کا تعلق ہوا تو ان کا تمدن اس قدر پست تھا کہ نہ یہ زراعت شروع کر سکے نہ ان سفیدوں سے دولت آفرینی کے اور طور طریقے سیکھ سکے۔

لیکن صورت حال بالکل اور ہوتی ہے جب ایسے لوگوں کا معاملہ ہو جو زراعت تک پہنچ چکے ہیں، کثیر التعداد منظم اور قوی قومیتوں کی شکل رکھتے ہیں اور اپنا مخصوص تمدن پیدا کر چکے ہیں۔ اس حال میں شاید کبھی بھی اخلاف کی کمی کے باعث کوئی نسل مادی طور پر نہیں مری ہے۔ اس منزل کو پہنچ چکنے کے بعد لوگ اپنی اصلی شکل کھو سکتے ہیں، دوسرے تمدنوں میں جذب ہو سکتے ہیں، اپنا مذہب اور کبھی کبھی اپنی زبان بھی بدل سکتے ہیں، ان میں کامل ذہنی اور اخلاقی تبدیلی ہو سکتی ہے، مگر مادی طور پر پھر بھی جئے جاتے ہیں!

اس قسم کے قلب ماہیت کے باوجود جئے جانے کی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ قدیم گیلک اور قدیم آئبیرین قوموں کے اخلاف برابر لاطینی تمدن کے زیر سایہ زندگی گزارتے رہے جس نے ان کی تشکیل کی تھی۔ قدیم عراقی یا شامی اقوام آٹھویں صدی کی عربی فتوحات کے بعد عربوں کی زبان اور ان کا مذہب اختیار کرنے کے باوجود بھی آخر جیا ہی کیں۔ یہی مصر میں ہوا، جہاں نام نہاد عربی آبادی میں اب تک بھی اپنے ان اصلی اجداد کا ناک نقشہ محفوظ ہے جنھوں نے عہد فرعونی کا تمدن پیدا کر کے اسے چار ہزار سال کی عمر بخشی تھی۔

اٹلی کے موجودہ باشندے آج بھی زیادہ تر قدیم اطالوی نسل سے ہی ہیں اور موجودہ اہل یونان کی رگوں میں آج بھی پریکلیس یا ارسطو کے کسی ہم عصر کا یا نویں دسویں صدی کے کسی بازنطینی کا خون دوڑتا ہے۔

اگر ہم ان قوموں کو نظر انداز کر دیں جنھیں کسی بلند تر تمدن والی پردیسی حکومت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے، جیسے کہ گیلک، آئبیرین اور بہت سی اور کم و بیش بربریت میں رہنے والی قوموں کو روما کی اولوالعزمی نے ایک قومی شیرازہ میں منسلک کر لیا تھا، ہاں، اگر ہم ایسی قوموں کو نظر انداز کر دیں تو یہ بات صاف ہے کہ جو قوم خود اپنا تمدن بنا سکتی اور اسے صدیوں تک قائم رکھ سکتی ہے اس کی موت بس دو وجوہ سے آسکتی ہے اور آتی بھی ہے۔ یہ وجوہ اسے اندر سے گھن کی طرح کھا کھا کر کھوکھلا کر دیتی ہیں اور پھر باہر سے ذرا سا دھکا انھیں ختم کر دینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اور تقدیر کا کرشمہ دیکھئے یہ دونوں وجہیں ایک دوسرے سے اکثر وابستہ ہوتی ہیں۔ قومیں واقعی مرتی اس وقت ہیں جب ان کے برسر اقتدار طبقہ میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ زمانہ کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے ساتھ اپنی نئی تنظیم کر سکیں اور جماعت کی پست ترین گہرائیوں سے نئے عناصر کو ابھار کر اپنے خون کی تجدید کر سکیں۔ اور جیسا کہ اوپر کہہ چکا ہوں موت ان قوموں کے لئے بھی مقدر ہے جن میں وہ اخلاقی قوتیں فنا ہو جائیں جو انھیں مجتمع کئے رہتی ہیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی مساعی کی ایک بڑی تعداد متفق و متحد و منظم ہو کر ایک ہی مشترک مقصد کی خادم بن جاتی ہے، بالفاظ دیگر، بڑھاپا جو موت کا پیش خیمہ ہے، ان سیاسی تنظیمات پر طاری ہوتا ہے جن میں وہ خیالات و جذبات اپنا تسلط کھو چکتے ہیں جو ان کی انفرادیت کے برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں اور ایسے نئے خیالات و جذبات پیدا نہیں ہوتے جو انھیں مشترک اور متحد سعی کے قابل بنا سکیں۔

اسی حقیقت سے روایات، رسم و رواج، اور بزرگوں کی ریت سے اس وابستگی کی توجیہہ ہوتی ہے جو فرات و مصر کی پرانی ریاستوں سے لے کر سلطنت روما کے عہد تک قدیم اقوام کے مذہب اور سیاسی ذہنیت کی بنیاد تھی۔ یہی وابستگی چند نسل پہلے تک چین و جاپان میں کار فرما رہی اور جس سے باوجود اس کے کہ بظاہر صورت اس کے خلاف ہے خود یورپ کی جدید اقوام بھی نا آشنا نہیں، خصوصاً اینگلو سیکسن نسل کی قومیں۔ قوم بظاہر جبلی طور پر محسوس کرتی ہے کہ اگر اسے مرنا نہیں ہے تو بعض اصولوں اور بعض بنیادی خصائص کا پابند رہنا ازبس ضروری ہے اور یہ اصول اور خیالات ان تمام اجزا میں جاری و ساری ہوتے ہیں جن سے قوم عبارت ہے۔ وہ محسوس کر لیتی ہے

کہ اس کی شخصیت اسی طرح قائم اور اس کی مخصوص اجتماعی ہیئت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے کہ اس سے ہی ہر الگ الگ پتھر کو وہ چونا میسر ہوتا ہے جو ان سب کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔

اگر ماضی کی پرستش میں مبالغہ ہو اور دوسری قوتیں اس کی وجہ سے یک قلم اثر انداز نہ ہو سکیں تو پھر خوش قسمتی کہیئے یا بدقسمتی اس کا لازمی نتیجہ جمود ہوتا ہے۔ لیکن جمود بلایا داش بس اسی وقت ممکن ہے کہ دوسری تمام قومیں بھی حرکت نہ کریں۔ چین و جاپان نے سترھویں، اٹھارویں اور کچھ کچھ انیسویں صدی میں یہ کوشش کی تھی کہ کامل سکون کی حالت میں زندگی گزاریں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی اور انھیں اس سکون سے نہایت سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر باہر گھسیٹا گیا۔ اور یہ بات ہے بھی قدرتی۔ اس لئے کہ کامل جمود انسانی جماعت کے لئے ایک مصنوعی سی کیفیت ہے۔ خیالات، جذبات اور رسوم کا دائمی تغیر فطری ہے اور اس تغیر کا اظہار سیاسی تنظیمات سے ہونا ضروری ہے۔ اگر اس بات کو روکنا منظور ہو تو ان تمام اثرات کو مٹانا ہوگا جو مشاہدہ و تحقیق، اشاعت علوم اور وسعت تجربہ سے رونما ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی موجودگی میں تو نئی ذہنیت کا پیدا ہونا اور ان نئے جذبات کا نشو و نما پانا ناگزیر ہے جن سے اجداد کی تعلیمات پر یقین اور روایتی خیالات پر بھروسہ، جو سیاسی عمارت کی بنا ہے، اکثر اوقات اندر ہی اندر سے کمزور ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک یونانی جو فلاطون اور ارسطو کے ساتھ رہتا سہتا ہو ان دیوتاؤں پر مشکل ہی سے عقیدہ رکھ سکتا تھا جو ہومر نے انسانی شکلوں میں پیش کئے ہیں؛ اور اس بات کے تسلیم کرنے پر تو وہ اور بھی آمادہ نہ ہوتا کہ یہ دیوتا یونانی شہروں کے فرمانرواؤں کو جنھیں یونان کے سب سے بڑے شاعر نے مخلوق کا چرواہا قرار دیا ہے، برابر مشورہ دیتے رہتے ہیں اور ان کے پشت پناہ ہیں۔ والٹیر کا کوئی ہمعصر فرانسیسی مشکل ہی سے باور کر سکتا کہ لوئی پانزدہم کو خدا کی طرف سے فرانس پر حکومت کرنے کا فرض تفویض ہوا ہے۔ اور ایک چینی یا جاپانی جو کسی یورپی یا امریکی یونیورسٹی میں پڑھ آیا ہے بمشکل اس یقین کو محفوظ رکھ سکتا ہے کہ حکمت انسانی کا مکمل ترین و جامع ترین اظہار بس کنفوسیوس کی تصانیف میں ہے۔

ان حالات سے ظاہر ہے کہ ان سخت انتشارات اجتماعی کو جن سے تہذیب کا کوئی خاص نمونہ ختم ہوتا اور جس کے باعث متعلقہ نسلوں کو بے حساب مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، یعنی اس چیز کو جسے ریاست یا قوم کی موت کہتے ہیں ٹالنے کی بس ایک تدبیر ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ آہستہ آہستہ مگر مسلسل اخلاقی اتحاد عمل

کے نئے عناصر پیدا کیے جائیں جو پرانوں کی قایم مقامی کرسکیں۔ غالبًا اس معاملہ میں بھی بہترین نتایج اسی طرح حاصل ہو سکتے ہیں کہ دو فطری طور پر متضاد رحجانات میں یعنی تحفظ و تجدید، بقا و تغیر کے رحجانات مخالف میں صحیح توازن قائم رکھا جائے۔ بالفاظ دیگر ایک سیاسی تنظیم، ایک قوم یا ایک تمدن صحیح معنوں میں غیر فانی ہو سکتے ہیں اگر وہ یہ کرسکیں کہ اپنے کو برابر بدلتے رہیں مگر کبھی منتشر نہ ہونے دیں۔

اور اگر واقعی قوموں کی موت، سیاسی تنظیمات کا مکمل انتشار، اور پیہم و شدید مصائب اجتماعی، جن سے تمدن کی ترقی بالکل رک جاتی اور انسانیت پھر سے بربریت کے قعر میں جا پڑتی ہے، کبھی مٹائے جاسکیں گے تو اس میں یقینًا علم سیاست کی ترقی اور اثر کو بہت کچھ دخل ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ گذشتہ زمانہ میں بارہا محض سیاسی تجربہ نے ایسے انتشارات کو روکا تھا، بشرطیکہ اس تجربہ کو کسی غیر معمولی دماغ نے روشن کردیا ہو اور کسی غلط تعلیم نے اسے گمراہ نہ کردیا ہو۔ اس لئے مجھے یہ بات بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ اگر ان قوانین کا صحیح علم ہو جائے جو انسان کی اجتماعی فطرت میں کارفرما ہیں تو یقینًا یہ علم شخصی تجربہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔ اس علم سے ہمیں کم سے کم اس میں تمیز کرنا آ جائے گا کہ کن چیزوں کا وقوع ممکن اور کن کا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔ اور اس طرح کم از کم یہ تو نہ ہوا کرے گا کہ بہتیرے نیک ارادے اور بہت ساری خوش نیتی اس میں ضائع جائے بلکہ الٹی نقصان وہ ثابت ہو کہ آدمی خواہ مخواہ جماعتی زندگی میں اس تکمیل کی امید لگا بیٹھے جو کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی، علاوہ بریں اس سے یہ بھی ممکن ہو جائے گا کہ سیاسی زندگی میں بھی وہی طریقے برتے جائیں جن کا استعمال انسانی ذہن قدرت کی قوتوں کو قابو میں لانے کے وقت کیا کرتا ہے۔ اور وہ طریقہ بس یہی تو ہے کہ آدمی ان قوتوں کے فعل کو توجہ سے مشاہدہ کرتا ہے، انھیں سمجھتا ہے، اور انھیں مسترد کیے بغیر ان کے عمل کو کم و بیش بدلتا رہتا ہے۔

میں کہیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میری رائے میں انیسویں صدی میں اور بیسویں صدی کے اس ابتدائی زمانہ میں علم تاریخ کی ترقیات اور علوم اجتماعی کی تصریحات نے یقینی واقعات اور حکمی معلومات کا ایسا ذخیرہ فراہم کردیا ہے کہ موجودہ اور آنے والی نسل کے لئے ایک واقعی علمی سیاست کی تدوین ممکن ہوگئی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جو پہلی نسلوں کے لئے ناممکن نہ تھی۔ البتہ یہ بتلانا بہت دشوار ہے کہ یہ علم اپنے کو عمل کے لئے موثر کب بنا سکے گا۔ یہ ایک عنصر فعال کی حیثیت کب اختیار کرے گا جس سے دوسرے عناصر عمل کی تکمیل اور ان میں تغیر ممکن ہو تصورات

کا کوئی نظام، علمی سیاسی قوت اس وقت بن سکتا ہے جب وہ کم سے کم حکمراں طبقہ کی اکثریت کا جزو ذہن بن جائے اور ان کے خیالات و احساسات پر اسے غلبہ حاصل ہو جائے۔ مگر اس غرض کے لئے وہ خیالات سب سے کم موزوں ہوجاتے ہیں جو واقعی علمی ہوں، اس لئے کہ ان میں لوچ یا نطابق کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اسی لئے ان میں بہت کم یہ قوت ہوتی ہے یا بالکل نہیں ہوتی کہ ان جذبات کا رخ موڑ سکیں جو کسی خاص وقت غلبہ پاتے ہیں یا کسی وقتی غرض کے پورا کرنے میں مدد دے سکیں۔

فاشزم

[ذیل میں ہم فاشستی مذہب کے بانی' مسولینی کا ایک مقالہ ترجمہ کرکے پیش کرتے ہیں۔ یہ مقالہ مسولینی نے ۱۹۳۲ء میں Encyclopodia Italiana کی چودھویں جلد کے لئے لکھا تھا۔ اس سے اس نئے سیاسی مذہب کی فلسفیانہ اساس اور بانی مذہب کی ذہنیت پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ مدیر]

(۱)

اب تو اس بات کو بہت زمانہ ہونے آیا۔ جب میں نے ۱۹۱۹ء میں میلان کے اندر پوپولو ڈ اٹالیہ میں دعوت دے کر جنگ عظیم میں مداخلت کی حامی جماعت کے ان سب اراکین کو یکجا کیا تھا جو خود جنگ میں شریک ہو چکے تھے اور جنوری ۱۹۱۵ء میں فاشستی انقلابی جماعت کے قیام کے بعد سے برابر میرے ساتھ تھے۔ تو اس جلسہ کے وقت میرے ذہن میں کوئی خاص مسلک یا مذہب نہ تھا۔ مجھے ذاتی تجربہ صرف ایک مذہب کا تھا یعنی اشتراکیت کا کوئی دس برس کا تجربہ یعنی ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۴ء کے موسم سرما تک۔ لیکن اگرچہ میں اس تحریک میں پہلے ایک معمولی رکن کی حیثیت سے اور پھر بہ حیثیت قائد حصہ لیتا رہا مگر اشتراکی مذہب کا تجربہ عمل میں مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اور میرا مسلک ذاتی اس زمانہ میں بھی عمل کا مسلک تھا۔

۱۹۰۵ء کے بعد سے اشتراکیت کا کوئی ایسا نظریہ نہ تھا جسے سب بلا اختلاف مانتے ہوں۔ اس لئے کہ مذہب اشتراک میں ترمیم کی تحریک برنشٹائن کی قیادت میں اٹھ چکی تھی۔ ادھر حالات وقت کے اثر سے ایک انتہا پسند انقلابی تحریک بھی رونما ہو چکی تھی جو اگرچہ اٹلی میں کبھی بھی باتوں سے آگے نہیں بڑھی، مگر روس میں اسی پر بولشویک مذہب کی بنیاد قائم ہوئی۔ غرض اصلاح' انقلاب' اور مرکزیت یہ وہ الفاظ تھے جن کی صدائے بازگشت بھی آج ختم سی ہو چکی ہے۔ مگر فاشستی تحریک کے بہتے دھارے میں ان خیالات کا پتہ چلتا ہے جو سوریل اور پگی سے شروع ہوئے تھے اور لاگردیل کی 'تحریک اشتراکی' Mouvement Socialiste سے' یا اطالوی حزب العمال کی

تحریک سے جس نے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک اطالوی اشتراکی حلقوں میں ایک نیا عنصر شامل کر دیا تھا، جسے گیولیٹی کی دغا نے بہت کچھ کمزور کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد اشتراکیت بہ حیثیت ایک مسلک کے ختم ہو چکی تھی۔ بس ایک نفرت باقی تھی۔ عمل کا صرف ایک امکان اس کے لئے تھا، خصوصاً اٹلی میں یعنی ان لوگوں سے انتقام جنھوں نے جنگ کی حمایت کی تھی اور جنھیں اب اس کے نتائج کا کفارہ دینا چاہئے تھا۔ میرے اخبار 'پوپولو ڈاٹالیہ' کا دوسرا نام ان دنوں تھا " سابق سپاہیوں اور دولت آفریں جماعت کا اخبار"۔ اور یہ الفاظ " دولت آفریں جماعت" اسی وقت سے ایک ذہنی رجحان کا پتہ دے رہے تھے۔ فاشستی تحریک کسی ایسے مسلک کی پیداوار نہیں ہے جس کی پہلے سے مفصل طور پر تدوین ہو چکی ہو۔ اسے تو عمل کی ضرورت نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے پہلے دن سے یہ اس قدر نظری نہیں ہے جس قدر عملی ہے۔ فاشزم محض ایک اور سیاسی جماعت کا نام نہیں ہے۔ یہ تو اپنی زندگی کے پہلے دو سال میں بھی سب سیاسی جماعتوں کا مخالف رہا۔ یہ تو بجائے خود ایک زندہ تحریک ہے۔

میں نے اس زمانہ میں اسے جو نام دیا اس سے گویا اس کی ماہیت متعین ہو گئی۔ پھر بھی اگر کوئی اس زمانہ کے اخباروں کی گرد آلود مسلیں الٹے پلٹے اور اس جلسہ کی کارروائی پڑھے جس میں *Fasci Italiani di combattimento* نامی جماعت کی تشکیل ہوئی تھی تو وہاں کسی مرتب مسلک کی تعلیمات نہ ملیں گی بلکہ کچھ جوامع الکلم ہوں گے، کچھ امیدیں اور کچھ حوصلے، جو اپنی اصل حالت سے تپ تپا کر ایک دن اس مسلک کے تصورات ترکیبی بننے والے تھے جسے فاشستی سیاسی مسلک کہتے ہیں اور جو حال و ماضی کے تمام اور مسلکوں سے جدا ہے۔

میں نے اس وقت کہا تھا کہ " اگر سرمایہ دار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ جو بجلی ان پر گرنے والی ہے اسے اپنے اندر سے گذار دیں تو وہ بہت دھوکے میں ہے۔ ہمیں تو اپنا کام فوراً شروع کر دینا چاہئے .... ہم تو محنت کرنے والے گروہ کو حقیقی اور موثر قیادت کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔ اور انھیں یقین دلانا کہ کسی صنعتی یا تجارتی کاروبار کو کامیابی سے چلانا سہل کام نہیں ہے ...... ہم ہر رجعت پسندی کا مقابلہ کریں گے، چاہے وہ صنعتی ہو چاہے روحانی، ...... جب مسند حکومت پر جانشین کی جگہ خالی ہو تو ہمیں اس کے لئے لڑنے

کو بھی تیار رہنا چاہیئے .... ہمیں عجلت کی ضرورت ہے' جب موجودہ حکومت ٹوٹے تو ہمیں اس کی جگہ لینے کے لیے تیار ہونا چاہیئے ۔ جانشینی کا حق ہمیں تو پہنچتا ہے' اس لئے کہ ملک کو جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہمیں نے کیا تھا اور ہمیں نے اسے فتحیاب کرایا .... نیابتی نمائندگی کا موجودہ طریقہ بالکل ناکافی ہے' نمائندگی براہ راست افراد متعلقہ کی ہونی چاہیئے .... اس لائحۂ عمل کے خلاف یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہ تو اسی 'کارپوریشن' کے خیال کی طرف لوٹنا ہوا ۔ اگر ایسا ہے تو بھی کیا مضائقہ ہے .... لہذا میری خواہش ہے کہ یہ جمعیۂ معاشی نقطۂ نظر سے قومی حزب العمال کی حمایت کو از سر نو قبول کرے ؟"

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اس پہلے دن بھی پیا زاسان سیولکر ، یہ لفظ "کارپوریشن" منہ پر آیا جو پھر بعد کو دوران انقلاب میں وہ ادارہ ثابت ہوا جسے جماعتی قانون سازی نے ترتیب دے کر ہمارے عہد کی بنیاد بنا دیا ہے ۔

---

(۲)

روم پر چڑھائی سے پہلے کا زمانہ بڑی دشواریوں کا زمانہ تھا ۔ عمل کی ضرورتوں میں تحقیق علمی اور تکمیل مسلک کی فرصت کہاں تھی ؟ قصبوں اور گانووں میں جنگ کرنی تھی ۔ بیشک کچھ بحث مباحثہ بھی ہوتا تھا مگر جو بات اہم تھی اور مقدس' وہ یہ کہ لوگ جانیں دے رہے تھے اور جانتے تھے کہ جان کیسے دیتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ مسلک کی' خوبصورتی سے بیان کئے ہوئے اور اہتمام سے مکمل ۔ کئے ہوئے مسلک کی' موٹے موٹے عنوانات کی اور کٹے چھٹے دفعات کی کمی ہو' مگر اس کی جگہ ایک اور چیز لے رہی تھی جو اس سے زیادہ فیصلہ کن تھی یعنی یقین ۔

پھر بھی اگر کوئی شخص جو تحقیق کرنا اور مواد سے کام لینا جانتا ہو' کتابوں اور مضمونوں' کم و بیش اہم کانگرسیوں کی قراردادوں اور تقریروں سے اس زمانہ کے واقعات کو سمجھنے کی کوشش کرے تو وہ پائے گا کہ فاشستی مسلک کے اساسی اصول اسی کشاکش کے زمانہ میں ڈھل گئے تھے ۔ اسی زمانہ میں فاشستی تخیل نے اپنے کو خوب مسلح کر لیا تھا' اچھی طرح نکھار لیا تھا اور اپنی ذہنی تنظیم کا کام شروع کر دیا تھا ۔ انفرادی شہری اور

ریاست کے تعلق کا مسئلہ تھا، اس سے متعلق انتداب اور آزادی کے مسائل تھے، سیاسی اور جماعتی مسائل بھی تھے اور مخصوص قومی مسائل بھی اور ان سب کے لئے حل کی تلاش بھی اُدھر لبرلزم، جمہوریت، اشتراکیت اور فری میسن جماعتوں سے مقابلہ بھی جاری تھا۔

لیکن چونکہ نظم و ترتیب کا نہ ہونا ان حالات میں ناگزیر تھا اس لئے فاشزم کے مخالفوں نے اس کی اس صلاحیت ہی سے انکار کیا ہے کہ وہ کوئی منظم مسلک پیش کر سکتا ہے۔ اگرچہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہی یہ مسلک نشو و نما پاتا رہا اور مرتب ہوتا رہا ہے، پہلے جیسا کہ سب نئے خیالات کا حال ہوتا ہے کچھ شور و شغب کے ساتھ اور ایک شدید بے دلیل انکار کی صورت میں اور بعد کو مثبت تعمیری حیثیت سے اس نے ان قوانین اور اداروں کی شکل اختیار کی جو ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں فاشسٹی حکومت نے نافذ کئے ہیں۔

اس وقت فاشزم ایک بالکل نرالی چیز ہے، بہ حیثیت عہد حکومت کے بھی اور بہ حیثیت مسلک سیاسی کے بھی۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آج فاشزم خود اپنے اوپر اور دوسروں پر اپنی تنقیدی استعداد سے کام لینے کے بعد ایک واضح اور مخصوص نقطۂ نظر قائم کر چکا ہے، جس کی طرف وہ رجوع کر سکتا ہے اور تمام معاملات میں جن سے دنیا اس وقت دوچار ہے، چاہے عملی ہوں یا ذہنی، یہ اس کی روشنی میں عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وقت کی سیاسی مصلحتوں سے قطع نظر فاشزم جس قدر انسانیت کے مستقبل اور اس کی نشو و نما پر نگاہ ڈالتا ہے تو نہ امن عام کا فائدہ سمجھ میں آتا ہے، نہ اس کے امکان پر یقین۔ لہذا یہ امن پرستی کے مسلک کو رد کرتا ہے، کہ یہ ترک سعی کا مسلک ہے اور قربانی و ایثار کے مقابلہ میں بزدلی کا مظاہرہ۔ جنگ ہی انسانی قوت کو بلند ترین درجہ تک پہنچا سکتی ہے اور جن قوموں میں اس کی صلاحیت ہے ان پر شرافت کی مہر ثبت کر دیتی ہے باقی سب آزمائشیں بس بدل اور قائم مقام ہیں جن سے آدمی کبھی اس جگہ نہیں پہنچتا جہاں ایک عظیم الشان فیصلہ کرنا ضروری ہوتا ہے یعنی زندگی اور موت میں فیصلہ۔ لہذا جو مسلک امن کے اس مفروضہ پر مبنی ہو وہ فاشزم کا مخالف ہے۔ اسی طرح فاشزم کی روح کے منافی ہیں تمام بین الاقوامی جمعیتیں اور انجمنیں۔ ہر چند کہ مخصوص حالات سیاسی کی وجہ سے کبھی انھیں تسلیم ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور تاریخ بتا دیگی کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی محرک سے قومی جذبہ بیدار ہو گیا تو وہ جذباتی محرک ہو یا خیالی یا عملی، یہ سب جمعیتیں اور انجمنیں منتشر

ہو کر ہوا میں اڑتی پھریں گی۔

یہ امن پرستی کی مخالف ذہنیت فاشزم نے افراد کی زندگی میں بھی شامل کردی ہے۔ سکواڈرسٹا کا یہ پرغرور مقولہ Me ne frego جو زخم کی پٹیوں پر لکھا ہوتا ہے محض stoic فلسفہ نہیں، ایک سیاسی مسلک کا خلاصہ نہیں، بلکہ مقابلہ و مبارزت کی تعلیم ہے، مقابلہ کے خطروں کو اٹھانے کا درس ہے، اور اٹلی کے لئے زندگی کی ایک نئی راہ کی علامت ہے۔ غرض یہ کہ فاشست زندگی کو قبول کرتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے، یہ خودکشی کا نام نہیں جانتا اور اسے بڑی حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک فریضہ ہے، ایک کشمکش اور ایک فتح۔ اس کے نزدیک زندگی بلند ہونی چاہئے اور پر، اپنی خاطر بھی زندہ رہنا چاہئے لیکن اس سے زیادہ دوسروں کے لئے، ان کے لئے جو قریب ہیں اور ان کے لئے جو دور ہیں، ان کے لئے جو اس وقت موجود ہیں اور ان کے لئے جو بعد کو آئیں گے ....

فاشست واقعی اپنے ہمسایہ سے محبت کرتا ہے لیکن یہ ہمسایہ اس کے لئے کوئی غیر واضح اور دھندلا تصور نہیں ہوتا۔ اس ہمسایہ کی محبت کی وجہ سے ضروری تعلیمی و تادیبی سختی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی، نہ یہ فرق مراتب میں حائل ہوتی ہے۔ فاشزم کسی "عالمگیر معانقہ" کا قائل نہیں۔ مہذب اقوام کی جمعیۃ میں اچھی طرح زندہ رہنے کے لئے وہ اپنے معاصرین پر نہایت تیز نگاہ رکھتا ہے، ان کی کیفیت دماغی کو اچھی طرح دیکھتا رہتا ہے، اور ان کے اغراض کے متغیر رجحانات میں کسی عارضی اور فریب دہ ظاہرداری سے دھوکا نہیں کھاتا۔

زندگی کے اس تصور نے فاشزم کو اس نظریہ کی ضد بنا دیا ہے جو نام نہاد علمی مارکسی اشتراکیت کی بنیاد ہے، یعنی تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ، جس کی رو سے تہذیب انسانی کی تاریخ کی تشریح بس مختلف جماعتی طبقوں کے اغراض کے تصادم سے اور وسائل و ذرائع دولت آفرینی میں تغیر و ترقی سے ہو سکتی ہے۔ اس بات سے بے شک کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ معاشی زندگی کے تغیرات مثلاً نئے اجناس خام اور انھیں کارآمد بنانے کے نئے طریقوں کی دریافت اور سائنس کے نت نئے اختراعات سے بہت کچھ اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ تاریخ انسانیت کی تشریح ان سے ہو سکتی ہے اور دوسرے تمام عناصر کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے ایک دھوکا ہے۔ فاشزم آج بھی

اعتقاد رکھتا ہے اور ہمیشہ رکھیگا تقدس پر اور شجاعت پر یعنی ان اعمال پر جن میں براہ راست یا بالواسطہ کوئی اثر کارفرما نہیں ہوتا۔

اور اگر تاریخ کا یہ مادی تصور تسلیم نہ کیا جائے جس کی رو سے انسان بس کٹھ پتلیاں ہیں جنھیں بخت و اتفاق کی موجیں کبھی ادھر لاڈالتی ہیں کبھی اُدھر کہ اصلی موثر قوتیں تو ان کے قابو سے باہر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم جنگ طبقات کے تصور کے بھی منکر ہیں جو اس نظریۂ تاریخ کا ناگزیر نتیجہ ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فاشزم اس بات کا منکر ہے کہ جماعتی زندگی کو بدلنے میں جنگ طبقات کی قوت ہی سب سے غالب قوت ہے۔

اشتراکیت کے ان دو بنیادی اصولوں کو رد کرنے کے بعد اس میں سوائے ان جذباتی آرزوؤں کے اور کیا رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسا جماعتی نظم ہو جائے کہ انسانی رنج و تکلیف میں کمی ہو سکے اور یہ آرزو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود انسانیت۔ لیکن اس میں بھی فاشزم 'معاشی' مسرت کا منکر ہے جسے اشتراک پورا کرنا چاہتا ہے اور معاشی ارتقا کے ایک خاص لمحہ میں ہر ایک کو مادی خوشحالی کی زیادہ سے زیادہ مقدار فراہم کر دینے کی امید دلاتا ہے۔ فاشزم مسرت کے مادی تصور اور اس کے امکان سے بھی انکار کرتا ہے اور اسے اپنے مخترعین یعنی انیسویں صدی کے نصف اول کے معاشیین کے لئے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ یعنی فاشزم اس حسابی مساوات کا منکر ہے جس کی رو سے مادی خوشحالی برابر ہوتی ہے مسرت کے کہ اگر یہ صحیح ہو تو انسان حیوانوں کی سطح پر اتر آئے جنھیں بس ایک ہی چیز کا دھیان ہوتا ہے کہ خوب کھائیں اور موٹے ہوں اور اس کی وجہ سے انسانیت خالص جسمانی وجود کی پستیوں میں پہنچ جاتی ہے۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

جمعیۃ اقوام اور جنگ حبش

اٹلی اور حبش میں بالآخر جنگ شروع ہوگئی۔ بین الاقوامی مشوروں سے بس یہ کام نکلا کہ اٹلی نے پوری طرح تیاریاں کرلیں اور پھر وقت مقررہ پر فوجی اقدام شروع کر دیا۔ جمعیۃ اقوام نے غالباً برطانوی اثر سے اٹلی پر نقض امن کا الزام لگا دیا ہے اور اب اپنے دستور کی مختلف دفعات کے ماتحت اٹلی کے خلاف مناسب کارروائیوں کا مسئلہ درپیش ہے۔

جمعیۃ کے دستور کی جن دفعات کا ذکر اس سلسلہ میں آیا ہے وہ دفعہ ۱۰، ۱۱، ۱۳ (شق ۴)، ۱۵ (شق ۶ و ۷) اور دفعہ ۱۶ ہیں۔ دفعہ ۱۰ کی رو سے اراکین جمعیۃ پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ باقی تمام اراکین جمعیۃ کی مملکت اور ان کی سیاسی خودمختاری کا احترام کریں اور انھیں خارجی حملوں سے محفوظ رکھیں۔ اور اسی دفعہ میں یہ عام اور غیر معین سی شق ہے کہ اگر حملہ ہوجائے تو جمعیۃ کی کونسل ان تدابیر کے متعلق ہدایت کرے گی جن سے یہ فرض پورا کیا جاسکے۔

دفعہ ۱۱ کے الفاظ بھی بہت عام اور غیر واضح ہیں۔ اس کی رو سے "قوموں میں امن کے تحفظ کے لئے جمعیۃ ہر مناسب اور موثر تدبیر کیا کرے گی"۔

دفعہ ۱۳ (شق ۴) کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست کسی ثالثی یا عدالتی فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو جمعیۃ کی کونسل اس فیصلہ کو نافذ کرانے کی تدابیر تجویز کرے گی۔

دفعہ ۱۵ (شق ۶ و ۷) میں اراکین جمعیۃ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ کسی تنازع میں وہ اس فریق کے خلاف جنگ نہ کریں گے جس نے جمعیۃ کی کونسل کی سفارشات کو تسلیم کرلیا ہو بشرطیکہ یہ سفارشیں فریقین کو چھوڑ کر باقی سب ریاستوں نے بہ اتفاق رائے منظور کی ہوں۔ اور اگر یہ اتفاق رائے نصیب نہ ہو تو پھر ہر ایک ریاست کا یہ حق محفوظ ہے کہ وہ حق و انصاف کے قیام کے لئے جو کارروائی مناسب سمجھے کرے۔

لیکن ان دفعات کی عدم وضاحت کے مقابلہ میں دفعہ ۱۶ بالکل واضح ہے اور اس میں حملہ آور کے خلاف کارروائیوں کی تفصیل ہے مگر ان کارروائیوں کے اختیار کرنے کی شرط یہ ہے کہ جمعیۃ کا کوئی رکن دستور کی دفعات ۱۲،

۱۳ اور ۱۵ کی خلاف ورزی کر کے جنگ شروع کردے۔ ایسی صورت میں سمجھا جائے گا کہ اس نے تمام اراکین جمعیتہ کے خلاف ایک جنگی کارروائی کی ہے اس لئے وہ ذمہ داری لیتے ہیں کہ فوراً اس پر ایسا دباؤ ڈالیں گے کہ وہ قانون جمعیتہ کی پابندی پر مجبور ہو جائے۔ اور پھر اس کے بعد اسی دفعہ میں دباؤ ڈالنے کی تدابیر کی تفصیل ہے۔ اس دفعہ میں اہم بات یہ ہے کہ جس ریاست کے خلاف یہ تدابیر اختیار کی جائیں اس نے واقعی جنگ شروع کر دی ہو۔ غالباً اسی خیال سے اٹلی نے جنگ تو شروع کر دی ہے مگر اعلان جنگ نہیں کیا!

اس سلسلہ میں دباؤ ڈالنے کی جو تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں ان کی چار قسمیں کر سکتے ہیں (۱) اخلاقی اور سیاسی تدابیر (۲) مالی اور معاشی تدابیر (۳) بین الاقوامی مقاطعہ (۴) فوجی تدابیر۔

اخلاقی اور خالص سیاسی تدابیر اسی وقت تک کارگر ہوتی ہیں کہ سابقہ کسی کمزور سے ہو۔ اسی وقت بین الاقوامی رائے عامہ کا پاس بھی ضروری ہوتا ہے اور سیاسی تعلقات کے انقطاع کا ڈر بھی کچھ کارگر ہوتا ہے ورنہ جب کوئی طاقتور ریاست شر پر آمادہ ہوتی ہے تو وہ رائے عامہ اور سیاسی تعلقات کی زیادہ پروا نہیں کرتی۔ نہ اس کا خیال رکھتی ہے کہ اس کے اعمال کے نتائج کو باقی حکومتیں تسلیم کریں گی یا نہیں۔ جاپان نے چین میں جو کیا اس میں دنیا کی رائے عامہ کیا کر سکی جمعیتہ اقوام نے جب منچوکو کی ریاست کو اپنی قرارداد مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۵ء کی رو سے تسلیم نہیں کیا تو کیا جاپان نے زبان حال سے یہ جواب نہ دیا کہ "کردم و شد"! لیکن بہر حال وضع داری کے سلسلہ میں یہ چیزیں بھی ابھی تک غاصب کو غصب سے روکنے کی تدابیر میں شمار ہوتی ہیں۔

مالی تدابیر میں طویل مدت کے لئے قرض اور تھوڑی مدت کے لئے ساہوکارہ اور تجارت میں ادھار کا انتظام کرنے سے انکار کرنا خاصی مؤثر تدبیر ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ دباؤ ضرورت پڑتے ہی ڈالا جا سکتا ہے اور اگر بروقت ڈالا جائے تو خاصا مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی دشواریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادھار اور اعتبار کا جال کچھ ایسا پیچیدہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ اس میں آسانی سے یہ پتہ چل سکے کہ ادھار کسے دیا گیا۔ بظاہر کسی کو دیا جا سکتا ہے اور استفادہ کوئی اور کر سکتا ہے۔ دوسرے جس کے خلاف یہ تدبیر اختیار کی جائے وہ بھی یہ کر سکتا ہے کہ اپنے تمام سابقہ قرضوں کی ادائگی سے انکار کر بیٹھے۔ البتہ مالی تدابیر کو بہت زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے اگر مظلوم قوم کے لئے زمانہ جنگ میں مالی آسانیوں کا انتظام کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں مظلوم اقوام کی مالی امداد

کے متعلق ایک معاہدہ کا مسودہ بنا تھا اور اس پر بہت سی ریاستوں کے دستخط بھی ثبت ہو چکے تھے (جس میں اٹلی بھی شامل ہے!) لیکن اس معاہدہ کا نفاذ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اٹلی اور حبش کے قضیہ میں حبش کو مالی امداد پہنچانے کے متعلق اراکین جمعیۃ کا رویہ کیا رہتا ہے۔

معاشی تدابیر میں سب سے پہلے تو یہ ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ ان اسلحہ اور ان تمام اشیاء خام کی برآمد ممنوع قرار دے جو جنگ کے لئے لابد ہیں۔ لیکن اگر تمام اراکین جمعیۃ عملاً ایسا کر بھی دیں تو بھی یہ تدبیر کارگر اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جو ملک جمعیۃ کے رکن نہیں ہیں (مثلاً امریکہ، جرمنی اور جاپان) وہ بھی اس پر عمل کریں۔ اگر یہ ایسا کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو جمعیۃ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ بحری ناکہ بندی کی جائے یا نہیں۔ ناکہ بندی میں ان قوموں سے بھی جنگ کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

لیکن معاشی اعتبار سے اس سے زیادہ موثر چیز یہ ہے کہ اراکین جمعیۃ غاصب ملک کے مال کی درآمد اپنے یہاں روک دیں۔ اس میں عملی آسانیاں بھی ہیں اور ناکہ بندی کی ضرورت بھی نہیں۔ غاصب اس کی وجہ سے مبادلۂ خارجہ سے محروم ہو جاتا ہے، جس کے سبب وہ دوسرے ملکوں سے بھی بآسانی مال نہیں خرید سکتا۔

رہا مقاطعہ معاشی جو دفعہ ۱۶ کا منشا معلوم ہوتا ہے سو اس کی تاثیر میں کیا کلام۔ مگر اس کی عملی دشواریاں بھی بے حساب ہیں۔ اس دفعہ کی رو سے تمام اراکین جمعیۃ کا فرض ہے کہ فوراً غاصب ریاست سے تمام تعلقات تجارتی و مالی منقطع کر دیں، اپنی رعایا اور غاصب حکومت کی رعایا میں ہر قسم کا ربط ضبط روک دیں، اور غاصب حکومت کی رعایا اور تمام دوسری حکومتوں کی رعایا کے درمیان مالی، تجارتی اور شخصی روابط کو روکیں چاہے یہ دوسری حکومتیں جمعیۃ کی رکن ہوں یا نہ ہوں"۔ لیکن ایسی کارروائی کے امکانات بہت کم ہیں۔ مقاطعہ کرنے سے بعض حکومتوں کو کم اور بعض کو زیادہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جس کا انحصار غاصب سے سابقہ تعلقات پر ہے۔ پھر اس کے لئے ناکہ بندی ضروری ہو جاتی ہے جس میں صاف صاف جنگ کی صورت نکل آتی ہے، غاصب سے بھی اور دوسری ریاستوں سے بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں۔

اور جمعیۃ کے دستور میں غالباً انھیں دشواریوں کا خیال کر کے فوجی تدابیر کا ذکر بھی ہے چنانچہ اسی دفعہ ۱۶ میں ہے کہ "ایسے حالات میں کونسل کا فرض ہوگا کہ متعلقہ حکومتوں کو مشورہ دے کہ کس قدر بری،

بحری یا ہوائی فوج ہر رکن جمعیۃ کو اس غرض سے فراہم کرنی ہوگی کہ دستور جمعیۃ کو برقرار رکھا جائے۔" لیکن مختلف اراکین میں فوجی فراہمی کا تناسب مقرر کرنے کی دشواری، کسی نئی بین الاقوامی فوج کے اجتماع کی دقتیں، پھر اس فوجی قوت کی قیادت کا مسئلہ اور ایسی ہی اور بہت سی باتیں اس سفارش پر عمل کرنے میں حائل ہوں گی۔

بلکہ اس وقت کہ اٹلی کے خلاف برطانیہ کے سخت اصرار پر محض معاشی اور مالی تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس پر سخت اختلاف رائے ہے کہ یہ تدابیر بھی کس انداز سے اختیار کی جائیں۔ ایک طرف تو وہ ہیں جو دفعہ ۱۶ سے اٹلی کا کامل مقاطعہ کرانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ قومیں بھی جو جمعیۃ کی رکن نہیں کسی طرح اس بات پر مجبور کی جائیں کہ اٹلی کو مالی و معاشی مدد نہ دیں اور اگر دینا چاہیں تو انھیں روکا جائے۔ دوسری طرف وہ ہیں جو جتاتے ہیں کہ ایسا کیا گیا تو ان دوسری قوموں سے تصادم ہو جائے گا اور ہم معاہدۂ پیرس میں یہ عہد کر چکے ہیں کہ سوائے اپنی ملکی حفاظت کے کسی حال میں جنگ نہ کریں گے۔ لہذا دفعہ ۱۶ کے ماتحت بھی جو کارروائی کوئی ریاست کرے وہ بس اپنے ہی علاقہ میں محدود ہو، اپنے ملک سے باہر نکل کر کچھ کرنا ضروری نہ قرار دیا جائے۔

اس تذبذب اور اختلاف کی صورت میں ظاہر ہے کہ اٹلی کے خلاف معاشی اور مالی دباؤ کی تدابیر بھی کچھ بہت موثر طور پر کام میں نہ لائی جا سکیں گی، لیکن اخلاقی لحاظ سے اس میں شک نہیں کہ اٹلی کو جمعیۃ نے غاصب قرار دے کر بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ یوں ہی بڑوں کے جھگڑوں میں ایسی کارروائیاں چند بار ہو جائیں تو شاید بین الاقوامی معاہدوں کی وقعت میں تھوڑا بہت اضافہ ہو۔ فی الحال تو اٹلی نے اس معاشی دباؤ کے مقابلہ کا کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیا ہے۔ چنانچہ اواخر اگست ہی میں سولینی نے یہ بیان دیا تھا کہ "فاشستی حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اطالوی قوم کو یہ بتا دے کہ ملک کے اعلیٰ ترین فوجی حکام نے دوسری قوموں کے دباؤ ڈالنے کے مسئلہ پر ہر پہلو سے غور کر لیا ہے اور جہاں تک جنگی دباؤ کا تعلق ہے ان کے مقابلہ کے لئے تمام ضروری فیصلے اور تدابیر کچھ عرصہ ہو چکا کی جا چکی ہیں۔ غذا کے مسئلہ پر بھی غور کیا جا چکا ہے اور اس سال ہماری فصل بہت اچھی ہوئی ہے۔ صنعتی مال کے متعلق حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ حال اور مستقبل کی فوجی ضروریات کے لئے شہری آبادی کو اپنے صرف میں کمی کرنی ہوگی۔ چنانچہ حکومت نے مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنے کا فیصلہ

کیا ہے:۔

(۱) جس شخص کی پردیس میں کوئی رقم یافتنی ہو اُسے لازمی طور پر حکومت کے سپرد کر دے اور تمام پردیسی قرضوں کے تمسکات نیز اطالوی قرضوں کے تمسکات کو ۹ سال کے اطالوی تمسکات میں تحویل کرا دیا جائے جن پر ۵ فی صدی سود ملے گا۔

(۲) تمام تجارتی شراکتوں کا منافع عارضی طور پر ۶ فی صدی سے زیادہ نہ دیا جائے۔

(۳) منافع، سود اور تمسکات کی آمدنی پر ۱۰ فی صدی ٹکس لیا جائے۔

(۴) ۱۹۳۷ء کے ختم تک تمام موٹر سے چلنے والی گاڑیوں میں تیل کی جگہ اس کے بدل کا استعمال عام کر دیا جائے۔

ان تدابیر سے اٹلی کو امید ہے کہ وہ معاشی اور مالی وباؤ کو کچھ عرصہ آسانی جھیل لے گا اور اس عرصہ میں فرانس کسی نہ کسی نہج سے معاملہ طے کرا ہی دے گا اور اس کے قرائن اسی وقت سے معلوم ہو رہے ہیں۔ رسالہ جامعہ میں شروع سے یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جنگ میں اٹلی زیادہ دن مبتلا نہیں رہنا چاہتا۔ اس کی مالی حالت کا تقاضا یہی ہو کہ جنگ طویل نہ ہو۔ مگر ملک کی اندرونی سیاسی حالت مجبور کرتی ہے کہ جنگ ہو اور اس میں فتح بھی حاصل ہو حبش کے ملک کو فتح کرنا بہت صبر آزما اور دشوار کام ہے مگر حبش کی غیر منظم افواج پر ابتدائی معرکوں میں فتح حاصل کرنا بہت سہل ہے۔ چنانچہ اٹلی یہ ابتدائی فتوحات حاصل کرنے کے بعد بخوشی مصالحت پر تیار ہو جائے گا۔ مصالحت کے وقت چونکہ جمعیۃ کے فیصلوں اور دنیا کی رائے عامہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس کی اخلاقی حالت بہت قوی نہ ہوگی اس لئے حبش کی تقسیم میں دوسرے حصہ داروں کو بھی اپنا حق لینے میں آسانی ہوگی۔ غرض مختصر سی جنگ کے بعد معاملات کے طے ہو جانے میں سب کا فائدہ ہے۔ اس لئے شاید یہی صورت پیش آئے۔

جاپان اور حبش | اٹلی اور حبش کی جنگ کے سلسلہ میں حبش کے ساتھ جاپانی ہمدردی کی خبریں بار بار اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلے سامان جنگ بھیجنے کی اطلاعیں آئیں، پھر جاپانی فوجی افسروں کے وہاں پہنچنے کی

خبر آئی۔ ان خبروں کی تردید بھی کبھی شائع ہوئی لیکن یہ خبریں ایک ایک کر کے صحیح ہوں یا نہ ہوں اجمالی طور پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ جاپان ایشیائی اور افریقی اقوام کی سیادت کا خواب ضرور دیکھ رہا ہے کہ اس سیادت کے صلہ میں ہی اس کی روز افزوں صنعتی قوت کے لئے نئی نئی منڈیاں کھلیں گی۔ حبش کے متعلق جن خبروں کا ذکر ہم نے کیا ان سے اس معاشی رابطہ کا جزوی اظہار ہوتا ہے جو پچھلے چند سال میں جاپان اور حبش کے درمیان قائم ہو گیا ہے۔

ابھی ۱۹۳۱ء تک حبش کی کل درآمد کا تقریباً ۵۰ فیصد ہندوستان سے جاتا تھا اور صرف ۱۲ فیصد جاپان سے۔ آج حبش کی کپڑے کی منڈی میں جاپانی مال ۸۰ فیصدی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ جاپانی فوجی انجنیروں کی جماعت بھی عرصہ سے وہاں گئی ہوئی ہے۔ بظاہر اس غرض سے ہوائی جہازوں کے مرکز قائم کرنے میں حکومت کو مشورہ دے۔ ۱۹۳۳ء کے موسم سرما میں حبشی وزیر خارجہ نے قاہرہ میں یہ بیان دیا کہ جاپانی اثر حبش کی معاشی زندگی میں بہت اہم جزو بن گیا ہے۔ پھر حبشی حکومت نے یہ اعلان کیا کہ روئی کی کاشت کے لئے حکومت نے ۴ لاکھ ہکٹار (ایک ہکٹار = ۲½ ایکڑ) زمین جاپان کو بلاکسی معاوضہ کے دی ہے اور اس کے بعد اور بھی دینے کا قصد ہے۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوا کہ یہ قصد پورا بھی کیا گیا۔ اس کے علاوہ جاپانی تاجروں کو اور اہل صنعت کو ملک کے بعض علاقوں میں مستقل بود و باش اختیار کرنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایک جاپانی حبشی شراکت کو ۲½ لاکھ ہکٹار زمین کا ٹھیکہ دیا گیا ہے اس شرط پر کہ حکومت کو پیداوار کا ۱۰ فی صدی بطور مالگذاری دیا جائے گا۔ چونکہ یہ علاقہ غیر آباد ہے اور وزراعتی جس میں حبشی خوشی سے بستے نہیں اس لئے مارچ ۱۹۳۴ء میں حبش اور جاپان میں ایک اور معاہدہ ہوا کہ جاپانی کسان اس علاقہ میں آکر بس سکتے ہیں۔ چنانچہ جاپانیوں کی روز افزوں تعداد وہاں بسنے کے لئے برابر بھیجی جا رہی ہے۔ اس معاہدہ میں یہ قابل لحاظ دفعہ بھی ہے کہ دونوں حکومتیں اپنے باشندوں میں مناکحت کے تعلقات بڑھانے میں ساعی ہوں گی!

حبش نے جاپانی مال پر محصول درآمد میں بھی بہت کچھ کمی کر دی ہے جس سے برطانوی اور اطالوی تجارت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ مگر اب جاپانی 'غیر مہذب ایشیائی' تو رہے نہیں کہ جب چاہا دبا لیا۔ ایک مضبوط حکومت کی قوت ان کے ساتھ ہے۔ ان کا یہ منصوبہ کہ افریقہ میں کپاس کی کاشت بڑے پیمانہ پر کر کے یورپ کی صنعت پارچہ بافی پر ایک اور ضرب کاری لگائیں سب پر عیاں ہے۔ مگر کوئی کرے تو کیا کرے۔

سچ ہے زبردست مارے اور رونے نہ دے۔

نہر سویز اور جنگ حبش | اٹلی کے خلاف تدابیر اختیار کرنے کا چرچا اب عرصہ سے ہے۔ ان میں ایک تدبیر شاید پہلی مرتبہ ۷ جون کو برطانوی ایوان عام میں مسٹر اٹلی اور مسٹر ہنیڈرنے اپنی تقریروں میں یہ پیش کی اگر اٹلی اور حبش میں جنگ شروع ہو جائے تو نہر سویز کو اٹلی کے جہازوں کے لئے بند کر دیا جائے۔ اس وقت سے اس مسئلہ پر بڑی دلچسپ بحث ہو رہی ہے جمعیۃ اقوام یا برطانیہ یا مصر کو اس کا حق بھی ہے کہ نہر سویز کو بند کرے۔

نہر سویز ایک کمپنی کی ملک ہے جسے ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء میں خدیو مصر نے تعمیر نہر کے لئے کچھ مراعات عطا کیے تھے۔ اس شراکت پر فرانسیسی قانون کی دفعات نافذ ہیں اور اس کی آخری عدالت مرافعہ پیرس ہے۔ لیکن چونکہ کمپنی کا مقام اسکندریہ میں ہے اس لئے مقامی نوعیت کے معاملات میں مصری عدالتوں کو حق سماعت حاصل ہے کمپنی کا انتظام ۳۲ ڈائرکٹروں کے سپرد ہے جس میں سے ۲۱ فرانسیسی ہیں، ۱۰ برطانوی ہیں اور ایک ولندیزی۔ منجملہ ۴ لاکھ حصوں کے ۱۷۶۶۰۲ یعنی کوئی ۴۴ فی صدی برطانیہ کے ہاتھ میں ہیں۔

نہر ۱۸۶۹ء میں کھل گئی تھی۔ جب ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا نے خدیو کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو اس وقت برطانوی فوجوں نے اس عذر پر کہ نہر خطرہ میں ہے اس پر قبضہ کر لیا اور نہر ۴ دن تک جہازوں کے لئے بند رہی۔ اسی وقت سے نہر کی بین الاقوامی حیثیت کا مسئلہ سامنے آیا اور ۱۸۸۸ء میں برطانیہ، جرمنی، آسٹریا ہنگری، اسپین، فرانس، اٹلی، نیدرلینڈ، روس اور ترکی میں باہم ایک معاہدہ ہوا جس کا منشا یہ تھا کہ نہر سویز جنگ اور صلح کے زمانہ میں یکساں بلا روک ٹوک سب جہازوں کے لئے کھلی رہے گی چاہے تجارتی ہوں چاہے جنگی۔ اس معاہدہ کی تصدیق برطانیہ نے مصری سیاست کی غیر یقینی حالت کی بنا پر ملتوی رکھی اور کہیں ۱۹۰۴ء میں جاکر اس معاہدہ کو قبول کیا۔ اس معاہدہ کی دفعہ ۹ کی رو سے مصری حکومت اس معاہدہ کو نافذ کرنے کے لئے مناسب کارروائی کرے گی اور اس کے وسائل کافی نہ ہوں گے تو سلطان ترکی سے مدد لے گی۔ مصر کی حفاظت کے لئے حکومت کو مناسب کارروائی کا اختیار ہے مگر پھر بھی نہر میں جہازوں کی آمد و رفت میں ہرج نہ واقع ہونا چاہیئے۔ نہر اپنی تاریخ میں صرف دو دفعہ بند ہوئی ہے۔ ایک تو ۱۸۸۲ء میں خدیو کے حکم سے سر ولسلے نے

تین روز کے لئے اسے بند کیا، اور دوسرے جنگ عظیم کے زمانہ میں جبکہ ترکی افواج کی نقل وحرکت کے باعث مصر اور نہر کی حفاظت خطرہ میں تھی۔ مگر چند ہی روز بعد نہر پھر کھول دی گئی۔ اسپین اور امریکہ کی جنگ کے زمانہ میں اسپینی بیڑہ نہر میں سے گذرا (۱۸۹۸ء) ۔ مصری حکومت نے اسپینی بیڑہ کو جو منیلا جا رہا تھا اس شرط پر کوئلہ لینے دیا کہ وہ اسپین کو واپس ہوجائے گا۔ روس اور جاپان کی جنگ میں (۱۹۰۴ء) برطانیہ نے باوجود جاپان کا حلیف ہونے کے روسی بیڑہ کو نہر میں سے گذرنے دیا۔

غرض سوائے اس کے خود نہر کا وجود خطرہ میں ہو یا مصری مملکت کا، نہر سویز کو بند کرنا اس معاہدہ کے خلاف ہوگا۔ لیکن اٹلی کے خلاف اس حربہ کو استعمال کرنے کے موید کہتے ہیں کہ جمعیتہ اقوام اس بین الاقوامی معاہدہ کو اپنے دستور کی دفعہ ۲۰ کے ماتحت رد کر سکتی ہے جس میں سب ارکین جمعیتہ نے اس دستور کو قبول کرکے ان تمام معاہدوں کو رد کر دینے کا اقرار کیا ہے جو اس کی دفعات سے متصادم ہوں۔ لیکن قانونی تدبیر زیادہ صحیح معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ خود صلحنامہ ورسائی میں اس معاہدہ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور جس معاہدہ کو صلحنامہ صحیح تسلیم کرے اسے پھر اپنے سے متصادم قرار دے کر رد کیسے کرا سکتا ہے۔ اس پہلو پر اٹلی کے رسالہ Affari Esteri نے اپنی جون کی اشاعت میں بڑی وضاحت سے بحث کی ہے۔ لہذا اگر جمعیتہ نہر سویز کو بند ہی کرانا چاہے تو اسے اپنی دفعہ ۱۹ کے تحت پہلے اس ۱۸۸۸ء والے معاہدہ کو غیر ضروری ہونے کی بنا پر منسوخ کرانا ہوگا اور اس معاہدہ پر خود اٹلی کے دستخط بھی ہیں !

لیکن سچ پوچھئے تو یہ قانونی بحثیں بے سود ہیں۔ اگر جمعیتہ صرف اعلان کرے گی کہ نہر بند ہے تو اٹلی نے اس کے دوسرے اعلانات کے ساتھ جو کیا ہے اس کے ساتھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر جمعیتہ یا جمعیتہ کا کوئی رکن اتنی قوت رکھتا ہے کہ اٹلی کو روک سکے اور اس قوت کے استعمال کے لئے بھی تیار رہے تو وہ بحر روم اور بحر احمر میں بحری ناکہ بندی کرکے اطالوی جہازوں کو سویز تک پہنچنے ہی کیوں دے گا کہ اس کے بلا روک ٹوک آزاد گذرگاہ ہونے کا مسئلہ زیر بحث آئے۔

مطبوعات جامعہ اور اکیڈیمی کی کتابیں

ادب، تاریخ، مذہب، سوانحعمریاں، ڈرامے اور بچوں کی کتابیں

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش:- نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوفہ نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا کر جامعہ میں پڑھے۔

پہلا خطبہ۔ عثمانی ترک بانیان سلطنت کی حیثیت سے۔ دوسرا خطبہ۔ عثمانیوں کا زوال۔ تیسرا خطبہ۔ انقلاب اور جنگ۔ چوتھا خطبہ۔ ترکی اور جنگ آزادی۔ پانچواں خطبہ۔ ادب و تہذیب نمبر ۱۔ چھٹا خطبہ۔ ادب و تہذیب نمبر ۲۔ ساتواں خطبہ۔ ترکی عورتیں۔ آٹھواں خطبہ۔ موجودہ حالت پر نظر اور مستقبل کی توقعات۔ یہ لیکچر اس درجہ پسند کیے گئے کہ ہر دفعہ جامعہ کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔

اصل لیکچر انگریزی زبان میں تھے۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا نہایت جامع اور اہم مقدمہ ہے جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور خود مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مصنفہ کی تازہ ترین تصویر بھی ہے۔ طباعت کتابت وغیرہ بہت اچھی، کاغذ سفید و چکنا، حجم تقریباً ۳۰۰ صفحات اور قیمت صرف عہ/ انگریزی نسخے کی قیمت صرف للعہ

نجم السحر:- یہ ہندوستانی کے ان گرانقدر ناولوں میں سے ہے کہ ایسے پایہ کے ناول ابتک ہماری زبان میں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ یہ مشہور و مقبول ناول عذرا اور عذرا کی واپسی کے مشہور فرنگی مصنف رائڈر ہیگرڈ کا گویا تیسرا شہ پارہ ہے۔ جو خوشی کی بات ہے کہ مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی سابق ناظم دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے بزرگ کے قلم سے ہماری زبان کا سرمایہ ناز بنا۔ جہاں مصنف کا کمال مسلمہ ہے مترجم کی خصوصیات ترجمہ بھی مترجمین کو قیمتی سبق دیتی ہیں۔ نہ اس میں کوئی کسر نہ اس میں انگلی رکھنے کی جا۔ یہ مصر قدیم کا ایک دلاویز افسانہ ہے اور بہت سی قیمتی معلومات اور دلچسپ باتیں عشق و محبت و ولولہ انگیز مرقع۔ طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اعلیٰ ۲۰×۲۶/۸ سائز ۳۴۸ صفحے اور قیمت صرف (عہ)

تسہیل العربیہ:- مدت سے عربی اردو کی ایک جامع لغت کی تلاش تھی خوشی کی بات ہے کہ اب ایک ایسا لغت تیار ہو گیا جس میں ۔ ہزار عربی الفاظ اور رائج اردو معانی ہیں۔ نئے علمی الفاظ اور اصطلاحات بھی شامل ہیں نیز قرآن کے محاورات خاص و الفاظ کے معانی بھی خصوصیت سے درج ہیں۔ حجم دیباچہ کے علاوہ ۱۰۰۰ صفحے جلد مطلا قیمت صرف (للعہ)

سخنوران ایران در عصر حاضر:- ایران کی مردم خیز و شعر آفرین سرزمین شعر و ادب کا مرکز رہی ہے لیکن موجودہ انقلاب کے بعد وہاں کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی پرانی ڈگر کو چھوڑ دیا ہے۔ غرضکہ ایران جدید کی اب ہر چیز جدید ہے اس بلند پایہ تصنیف میں عصر حاضر کے ایرانی شعرا کے حالات ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ جس سے کتاب بہت دلچسپ ہو گئی ہے۔ زبان بھی جدید فارسی ہے شعرا کی تصاویر کے اعلیٰ بلاک ہیں۔ یہ ہندوستان میں کم کتابیں اس اہتمام سے شائع ہوئی ہیں از پروفیسر محمد اسحاق کلکتہ یونیورسٹی۔ کتاب مجلد ہے قیمت صرف (ما عہ/)

ناول

جویائے حق مولانا عبدالحلیم شرر دو حصے	للعہ
زوال بغداد ۔ " "	۸ر
ایام عرب " " دو حصے	[illegible]
حسن و سرور ۔ حکیم محمد علی	للعہ
جعفر و عباسہ " "	۱۲ر
امراؤ جان ادا ۔ مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم	۶ر
چوگان ہستی ۔ منشی پریم چند دو حصے	للعہ
گوشۂ عافیت ۔ " "	۱۲ر
پردۂ مجاز ۔ " "	[illegible]
عورت کی محبت ۔ مصنفہ سدرشن	عمر
ایامیٰ ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم	[illegible]
ابن الوقت " "	[illegible]
منازل السائرہ ۔ مولانا راشد الخیری دو حصے	عکار
تائیس ۔ مولوی محمد عنایت اللہ صاحب	[illegible]
نجم السحر " "	[illegible]
شمیم	للعہ
شوکت آرا بیگم ۔	[illegible]
خونبانۂ عشق ۔ سر آرتھر کانن ڈائل	عمر
شاہد رعنا ۔ قاری سرفراز حسین عزمی	[illegible]
جور فلک ۔ ایسٹ لن کا ترجمہ تین حصے ۔	ھہ
خواب ہستی ۔ مرزا محمد سعید	عمر
عذرا ۔ مولوی خلیل الرحمٰن صاحب	[illegible]
عذرا کی واپسی ۔ " "	عکار

افسانے

کیمیا گر ۔ پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن)	عمر
نگارستان ۔ مولانا نیاز فتحپوری	عکار
پریم پچیسی ۔ منشی پریم چند دو حصے مجلد اعلیٰ	[illegible]
پریم بتیسی ۔ " "	[illegible]
پریم چالیسی	[illegible]
دامن باغباں ۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی	عمر
بنگال تیسی ۔ مترجمہ سدرشن ۔ دو حصے	[illegible]
حجاب زندگی ۔ سید عابد علی صاحب عابد بی۔اے ال ال بی۔	۱۲ر
دنیا کے بہترین افسانے ۔	عکار
قدیم افسانے ۔ عبدالقادر صاحب سروری	عمر
دلگداز افسانے ۔ کوثر چاندپوری	عمر
دلچسپ افسانے ۔ " "	[illegible]
ہفت پیکر ۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری ۔	[illegible]
خیالستان ۔ سید سجاد حیدر یلدرم	[illegible]
حکایات و احتسابات " "	[illegible]
ہیبتناک قصے ۔ مسز لیول مترجمہ امتیاز علی تاج	[illegible]
رفیق تنہائی ۔ سید علی عباس حسینی	عمر
چار چاند ۔ حکیم ناصر نذیر فراق دہلوی ۔	عمر
پیغام سرکش ۔ ایم ۔ اسلم	[illegible]
عروس غربت ۔ " "	[illegible]
سہرگل ۔ جلیل احمد قدوائی ۔	[illegible]
افسانہائے عشق ۔ عابد علی صاحب عابد ایڈیٹر ہمایوں ۔	[illegible]
خواب و خیال ۔ مجنوں گورکھپوری ۔	عکار

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈرامے

پردۂ غفلت ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین	عمر
فاؤسٹ ۔ " " "	للعہ
انجام ۔ پروفیسر محمد مجیب ۔	۱۲ر
کھیتی ۔ " "	۶ر
نفرت کا بیج ۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی	۸ر
نیم شب ۔ " " "	۸ر
نقش آخر " " "	۱۰ر
صید زبوں ۔ " " "	۱۰ر
ہمزاد ۔ " " "	۶ر
گناہ کی دیوار ۔ " " "	۸ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۔ سجاد حیدر یلدرم ۔	۸ہر
جنگ وجدال ۔ " "	۱۲ر
فریب عمل ۔ جان گالزوردی ۔	عمار
ناتن ۔ لیسنگ ۔	۸عہ
انارکلی ۔ سید امتیاز علی تاج	۸عہ
ڈرامہ اکبر ۔ مولوی محمد حسین آزاد	عہ
شہید وفا ۔ مولانا عبدالحلیم شرر ۔	۱۰ر
وکرم اروسی ۔ کالیداس ۔	۸عہ
سلمیٰ ۔ آسکر وائلڈ ۔ مترجمہ انصار علی ۔	۵ر
آغاز ہستی ۔ برنارڈ شا ۔ مجنوں گورکھپوری	۱۲ر
حشرات الارض ۔ محمد فضل الرحمٰن	۸ہر
پرواز خیال ۔ حکیم یوسف حسن	۵ر
قزاق ۔ محمد عمر نور الہٰی ۔	۸عہ

مزاحیہ

انتخاب اودھ پنچ ۔ منشی سجاد حسین	۸عہ
سرگذشت حاجی بغلول ۔ " "	۸ر
ملفوظات حاجی بغلول ۔ ہمدرد کے مضامین ۔	۸ر
مضامین فرحت ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب مکمل مجلد	عہ
پطرس کے مضامین ۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری	۸ہر
مرزا جنگی ۔ ایم ۔ اسلم ۔	۸ہر
چٹکیاں گدگدیاں ۔ خواجہ حسن نظامی ۔	۱۲ر
ماہ پروین ۔ میر ولی اللہ صاحب	۱۴ر
غنچۂ تبسم ۔ تمکین کاظمی ۔	عمار
نکات رموزی ۔ مجموعہ مضامین ملا رموزی	۸عہ
انتخاب نقیب جناب ملا بودھا مئولی ۔	۸ر
نانی عشو ۔ مولانا راشد الخیری ۔	۱۰ر
موج تبسم ۔ شوکت تھانوی مجلد مصور	عمار
سیلاب تبسم ۔ " " "	عمار
طوفان تبسم ۔ " " "	عمار
پھل بوٹ ۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی ۔	۸عہ
کولتار ۔ " "	عمار
روح لطافت " "	۸ہر
روح ظرافت ۔ "	۸عہ
منتخب لطائف ۔ مرزا عبید زاکانی ۔	۸ہر
نمکدان فصاحت ۔ میر ولی اللہ صاحب	۸عہ
بزم خیال ۔ شعرائے اردو فارسی کی حاضر جوابی	عہ
لطائف عجیبہ ۔ منشی بشیر الدین صاحب	سے ر

تاریخ وتنقید ادب

مقدمہ شعر وشاعری۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۸ہر
آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ سے ر
تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ۔ للعہ ر
سیر المصنفین۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا دو حصے۔ ۸صر
تاریخ نثر اردو۔ احسن مارہروی۔ صر
گل رعنا۔ مولوی سید عبدالحی مرحوم صر
شعر الہند۔ مولوی عبدالسلام ندوی۔ مکمل مجلد ۳لے
مراۃ الشعر۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب۔ سے ر
دکن میں اردو۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب۔ عکار
پنجاب میں اردو۔ عکار
محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ڈاکٹر محی الدین زور ۱۲ار
مخزن نکات (تذکرہ) مولوی عبدالحق صاحب ۸عہر
تذکرہ ریختی۔ تمکین کاظمی۔ عہر
چمنستان شعراء صر
نکات الشعراء۔ میر محمد تقی میر ۸عکار
ایشیائی شاعری۔ سید امجد علی اشہدی عہ
ہندی شاعری۔ عکار
روح تنقید۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور ۱۲ار
تنقیدی مقالات ؍؍ ؍؍ ۸ہے
اردو کے اسالیب بیان ؍؍ ۸عہر
جدید اردو شاعری۔ عبدالقادر صاحب سروری سے ر
موازنہ انیس ودبیر۔ مولانا شبلی۔ سے ر
تاریخ ادبیات ایران۔ پروفیسر براؤن ۸للعہ

مقالات ومکاتیب

انتخاب مضامین سر سید ۱۲ار
مقالات شبلی چار حصے۔ ۱۲ار للعہ
نیرنگ خیال۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ دو حصے۔ ۸عہر
مقدمات عبدالحق۔ دو حصے۔ صر
افادات سلیم۔ مولانا وحید الدین سلیم۔ ۸عہر
افادات مہدی۔ ایم مہدی حسن ۸ہے
مقالات نیاز۔ مولانا نیاز فتحپوری۔ ۶ر
داستان۔ مولانا خلیقی دہلوی۔ ۸عکار
انتخاب مخزن۔ لاہور۔ للعہ ر
بقائے دوام۔ ایم۔ اسلم۔ ۸عہر
سیپارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی عکار
مضامین چکبست۔ پنڈت برج نراین چکبست سے ر
مقالات حالی۔ خواجہ الطاف حسین حالی ۸ہے
اردوئے معلیٰ۔ خطوط غالب ۸عکار
عود ہندی۔ ؍؍ ۱۲ار
خطوط سر سید سے ر
مکتوبات آزاد۔ مولوی محمد حسین آزاد عہر
موعظہ حسنہ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم ۸عہر
مکاتیب امیر مینائی۔ ۸عکار
مکاتیب محسن الملک ووقار الملک ۸عہر
مکاتیب شبلی۔ دو حصے۔ سے ر
خطوط اکبر۔ دو حصے۔ ۸عکار
رقعات عالمگیر شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر مجلد للعہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

OKASA اوکاسا

دماغی کام کرنے والوں کے لئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرہ کا رنگ نکھرتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجیے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے　　آزمائش کیلئے ۲۰ ٹکیاں ڈھائی روپے

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی گولیاں استعمال کی جائیں اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے۔

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے۔ یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں

اوکاسا کمپنی برلن انڈیا لمیٹڈ، نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس ۴۹۶ بمبئی

جزو نمبر — ال-۱۸۹۲



جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیرادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صر — مطبع جامعہ دہلی — فی پرچہ ۸ر

اُردو اکادمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جدید مطبوعات اُردو:۔

سیرت النبی۔ (جلد پنجم) مولفہ جناب مولوی سید سلیمان صاحب ندوی شائع کردہ دارالمصنفین تقطیع کلاں

قیمت قسم اول صہ قسم دوم للعہ

چینی مسلمان۔ مصنفہ مولوی بدرالدین صاحب چینی بی۔ اے (جامعہ) شائع کردہ دارالمصنفین۔ قیمت ؏

مسدس حالی۔ (صدی ایڈیشن) مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ شائع کردہ حالی پبلشنگ ہاؤس

قیمت قسم اول دو روپیہ قسم دوم ایک روپیہ

نقش چغتائی۔ یعنی مصور دیوان غالب از جناب محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی قیمت پانچ روپیہ

نجم السحر۔ کا ترجمہ از جناب مولوی

محمد عنایت اللہ صاحب بی۔ اے سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ

(نوٹ) مندرجہ بالا کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکین اُردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں۔

بسم اللہ

جامعہ

جلد ۲۴	نومبر ۱۹۳۵ء	نمبر ۱۱

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

جوہر کی شاعری

(۱)

"آپ میری شاعری کو کیا پوچھتے ہیں۔ بچپن میں تو بہت سے سامان ایسے بہم ہو گئے تھے کہ میں آج زلف و ابرو کی تعریف میں خاصے شعر نکال لیا کرتا۔ رام پور میں اُس زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جب گھر گھر مشاعرہ ہوتا تھا۔ داغ، امیر، تسلیم، جلال، عروج، دلی اور لکھنؤ کے آسمانوں کے ٹوٹے ہوئے تارے سب رام پور کے آسمان سے نور افشانی کر رہے تھے۔ خود میرے خاندان میں بھی شعر گوئی کا ذوق ہوا۔ تین چار عزیز استاد داغ کے شاگرد ہوئے جن میں ایک میرے حقیقی بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر اور میرے چچا زاد بھائی اور خسر عظمت علی خاں صاحب اور اُن کے بھائی حافظ احمد علی خاں صاحب شوق شامل تھے گھر پر بارہا مشاعرہ ہوا، پھر داغ کو نواب کلب علی خاں صاحب مرحوم نے جن کی نظر ہمیشہ کفایت شعاری پر رہتی تھی، ازراہ پرورش سرکاری اصطبل کا داروغہ بھی کر دیا تھا، تاکہ وظیفہ محض کار بیکاراں کی نذر نہ ہو، یہ میرے مکان کے عقب میں تھا، اس لئے روز اُن کی زیارت یوں ہی ہو جاتی تھی، اور اب اس بذلہ سنج کے شعر کا لطف اٹھاتا ہوں جس نے داغ کے اس تقرر پر کہا تھا ممکن ہے کہ تاریخ بھی نکلتی ہو، کہ

آیا دلی سے ایک مشکی خر ؛ آتے ہی اصطبل میں داغ ہوا

داغ کی غزل یاد کیجئے ؎

آج رخصت جہاں سے داغ ہوا ؛ خانہ عشق بے چراغ ہوا

اس پر مستزاد یہ کہ ذوالفقار روزانہ داغ کے گھر جاتے تھے جو ہمارے مکان سے دور نہ تھا اور مجھے بھی لے جاتے تھے۔

داغ نے پہلے دن پوچھا کہ کہو کچھ شعر بھی یاد ہیں، میری عمر بہت ہی کم تھی، مگر بھائی نے کچھ شعر یاد کرا دیئے تھے، جنھیں میں نہایت زور اور شان سے کڑک کر پڑھا کرتا تھا، میں نے داغ ہی کے چند شعر انھیں سنا دیئے، سُن کر پھڑک گئے۔ اور اس کے بعد ہمیشہ اصرار رہا، کہ اس بچہ کو ضرور لایا کرو۔ جناب والا اس کے بعد اگر میں یہ دعویٰ کروں، کہ شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں تو بے جا نہ ہوگا مگر میرا دعویٰ تو اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے، سنئے، میں نہ صرف شعر و سخن کی گود میں پلا ہوں بلکہ اُس کی توند پر کودا ہوں۔ اُسے ہاتھی بنا کر پیٹھ پر سوار ہوا ہوں۔ غرض کوئی بے ادبی یا گستاخی باقی نہیں رہی ہے جو میں نے شعر و سخن کی شان میں نہ کی ہو۔

میری پیدائش ۱۸۸۰ء کے اواخر کی ہے میں نے دس برس ہی کی عمر میں بہت سے لغو و فضول شعر مگر بامعنی اور موزوں کہے تھے اور اچھا ہوا کہ اب کسی کو یاد نہیں ورنہ جب میری OFFICIAL BIOGRAPHY (یعنی گورنمنٹ کی طرف سے نہیں بلکہ بقول آپ کے میری "اُمّت" کی طرف سے) لکھنے کا وقت آتا۔ تو میرے سیرت نگار کو سخت مشکل کا سامنا ہوتا کہ اس لچر پوچ کو ردّی دان بلکہ آتشدان کے نذر کیا جائے یا سیرۂ پیشوائے قوم و ملک میں جگہ دی جائے۔ ہمدرد کے سنسر نے (جن کا چند ماہ کے بعد ہی انتقال یکایک ہو گیا) تو ہمدرد میں سے ایک بار چڑیا چڑونٹے کی کہانی کو بھی (جو محض مزاحاً درج کی گئی تھی) خارج کر دیا تھا۔ اور اعتراض کیا گیا تو کہا کہ بھائی ہے تو چڑیا چڑونٹے ہی کی کہانی اور مطلب بھی صاف صاف معلوم ہوتا ہے، مگر ہمدرد والوں سے ڈر ہی لگتا ہے۔ اور روٹی کا معاملہ ہے نہ معلوم اس میں بھی کچھ زہر بھر دیا ہو، اور جوابدہی ہمارے سر آپڑے؟ آپ نفسیات کے ماہر ہیں، کیا ممکن نہیں کہ میرا پوجنے والا سیرۃ نگار باوجود نقادِ سخن ہونے کے محض بطل پرستی کے باعث یہ خیال کرنے لگتا۔ کہ نہ معلوم کیا کیا اسرار اس بظاہر لچر پوچ میں پوشیدہ ہیں اور آنے والی نسلیں ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ روشن ضمیر ہوں اور اُن اسرار سے واقف ہو کر دنیا کو نئے نئے معلومات اور عجیب عجیب انکشافات سے مالامال کر دیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ انھیں داخل ہی کر دو۔ اور اسی طرح ہمیشہ کے لئے میری پوچ گوئی باقی رہتی اور قیامت کے دن استاد داغ میرا دامن پکڑتے کہ خود بھی بدنام ہوئے اور ہمیں بھی بدنام کیا۔ خیر اب سُنئے کہ گیارہ برس

کی عمر میں علی گڈھ گیا۔ ایک بڑے بھائی نے میری موزوں گوئی کا ذکر مولانا شبلی مرحوم سے کیا۔ دوسرے نے میرے حافظہ کی تعریف کی کہ "المامون میز پر رکھا تھا، اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور ایک دن میں نے امین کے قتل پر جو مرثیہ ہے اس کا ایک شعر عربی کا پڑھا۔ تو اس کا مجھے ترجمہ سُنا دیا۔ حالانکہ عربی سے بالکل ناواقف ہے"۔ مولانا کو یقین نہ آیا اور امتحان کی غرض سے ہم بلائے گئے پہلے مامون کی اولاد کی فہرست مانگی۔ پھر اس کا حلیہ پوچھا۔ جب اس میں پاس ہو گئے تو ایک مصرعۂ طرح اُسی وقت دیا۔ اور کہا کہ شعر لکھو۔ چیزے از قسم لچر پوچ اسی وقت تیار ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مرحوم پر تو جو سکّہ بیٹھ گیا تھا وہ اُسی لچر پوچ کا تھا۔ میں اسکول ہی میں تھا کہ ایک نظم انعامی میں نے بھی لکھی اور مولانا حَکم ٹھہرے انعام تو ایک کہنہ مشق بزرگ کو ملا۔ مگر ہماری لچر گوئی کا بھی خاصہ شہرہ ہوا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ذوالفقار بھائی نے کوئی نظم لکھ دی۔ اور ہم نے اپنی طرف سے پڑھ دی۔ مگر جب عمر ذرا زیادہ ہوئی تو امتحانوں نے فرصت نہ دی۔ کالج میں البتہ آخری سال سجاد حیدر کی صحبت میں شعر و سخن کا چرچا رہا۔ پہلے بھی جب ہم لوگ انٹرنس میں تھے۔ تو ایک نظم تین شعرائے باکمال نے حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب (تربیت الدجاج دیونین جیک والے) کی دعوت کے شکریہ میں تیار کی تھی، ان میں سے ایک یہ خاکسار تھا۔ ایک سجاد حیدر صاحب اور ایک سید وزیر حسن صاحب، آنریبل و آزمودہ کار سکریٹری مسلم لیگ کے برادر "اصغر" خیر ایک سال آخری کالج میں خوب گذر گیا۔

اور وہ مشاعرہ جسے بعدۂ حسرت نے رونق بخشی ہم لوگوں ہی کا ایجاد کردہ تھا۔ چودہویں کو ہوا کرتا تھا اور شمع پیش نہیں کی جاتی تھی، کرکٹ کا لان جائے مشاعرہ تھا۔ ایک بار چودہویں کو بارش ہو گئی تو تین چار دن مطلع صاف ہونے کی راہ دیکھ کر ڈائننگ ہال میں کیا گیا اس وقت میں نے اپنی ایک غیر طرحی غزل میں اس شعر کا بھی اضافہ کر دیا ؎

فرشِ زمرّدیں نہیں وہ چاندنی نہیں ٭ لطفِ مشاعرہ تو گیا چودہویں کے ساتھ

علی گڈھ کالج میں شاعری تو کچھ کی، مگر وہی فرضی معشوق۔ اگر کچھ اصلیت تھی بھی تو اتنی ہی جتنی ایران کی شاعری کو اور "سبزۂ خط" وغیرہ کو ایک حد تک بامعنی کر دیتی ہے۔ کالج چھوڑا تو ولایت جانا ہوا۔ یہاں البتہ شاہدان اصلی کی کمی نہ تھی۔ مگر "ذوقِ نظارۂ جمال" لاکھ سہی اور گرہ میں مال بھی سہی تاہم طبیعت کا میلان

خلاف دستور عام زہد و ورع کی طرف تھا۔ دو برس کے قریب تو ہندوستان کے کچے دھاگے نے باندھے رکھا۔ دو برس کسی اور کے خیال نے مگر یہ آخری خیال بھی باعصمت تھا اور محض حالات گردوپیش کا تقاضا اس کا محرک تھا جب ان سب تجربوں کے بعد "کپڑے پھاڑے گھر کو آئے" تو تاہل کی زندگی بال بچوں کے خیال نے شاعری سے مستغنی نہیں تو غافل ضرور کردیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اگر کچھ ترشح شاعری کا ہوا۔ تو وہی قومی مرثیہ مگر زیادہ ترترسی۔ البتہ پچھلے دو تین برس میں عشق حقیقی رنگ لایا ہے۔ اور تغزل کا زور ہے۔ یہ اپنی تنک آبی ہے کہ سوائے چار پانچ غزلوں کے اس فرصت کے زمانہ میں بھی کچھ نہ لکھ سکا۔ لکھنے کے لئے نہ بیٹھتا ہوں نہ کوشش کرتا ہوں۔ مگر طبیعت پر خود ہی کسی بیرونی تحریک کا غلبہ ہوتا ہے۔ تو بغایت مجبوری کہہ لیتا ہوں اور یہی ایک ذریعہ (علاوہ تلاوت قرآن پاک کے) تسکین قلب رہ گیا ہے۔ چونکہ آپ کا اصرار ہے کہ پوری غزلیں لکھ بھیجو۔ اس لئے یہ لکھے بھیجتا ہوں (TOUCH STONE) کی معشوقہ سے زیادہ قابل قدر نہیں

A POOR THING BUT MINE OWN

اب رخصت ہوتا ہوں اور تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔

.... (غزلیں درج ہیں) یہ چند اشعار ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بقول آپ کے "میری اُمت" ان سے کچھ تسکین پائے۔ بہرحال خود مجھے ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے۔ مگر ان کو لٹریچر سے کیا تعلق۔ یہ صرف اپنی دست افشانی اور پاکوبی کے لئے ہیں"

(۲)

جوہر کی شاعری کی داستان آپ نے خود جوہر کی زبان سے سُن لی؟ یہ ٹکڑا اُن کی کسی تصنیف کا نہیں، کسی اخباری مضمون کا نہیں، ایک نجی مکتوب کا ہے۔ تاریخ اس پر ۱۲ اگست ۱۹۱۶ء کی پڑی ہے چھندواڑہ (ممالک متوسط) میں نظر بند تھے۔ اُس وقت کوئی جانتا بھی نہ تھا، کہ حضرت شاعر بھی ہیں۔ ۱۶ء کے شروع میں، اسی نظر بندی کی حالت میں، ان سطور کے راقم سے مراسلت شروع ہوئی، پہلے انگریزی میں، اور پھر اُردو میں۔ کسی والا نامہ میں اپنے ایک آدھ شعر بھی درج کر دیے تھے۔ اس پر اس نیاز مند کا اشتیاق بڑھا عرض کیا، کہ کچھ اور عنایت ہو۔ عنایتیں مسلسل ہوئیں۔ دوبارہ عرض کیا کہ آپ کے یہ جوہر تو اب جا کر کھلے، ذرا کچھ

فرمائیے تو، کہ آپ نے یہ شعر گوئی کا فن کب سیکھا؟ کہاں سیکھا؟ کس سے سیکھا؟ جواب مفصل مرحمت ہوا، آپ اوپر پڑھ چکے، بالکل قلم برداشتہ ـــــــ اس طرح کے دوستانہ خطوط بھی بھلا دنیا میں کہیں سوچ بچار کرکے، ٹھہر ٹھہر کے، اور غور کر کر کے، لکھے جاتے ہیں؟ ـــــــ بے چارہ کو خیال تک نہ ہوگا، کہ کسی دن یہ خانگی بے تکلف تحریریں بھی چھپ کر، اور تصنیفوں کا جزو بن کر رہیں گی!

(۳)

محمد علیؒ کو دنیا نے اول اول جانا، تو اس حیثیت سے، کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، "قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، امین، پرجوش ہیں۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کردیں۔ آکسفرڈ گئے، نام اور چمکا۔ ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قائم کی، خود ہی صدر بنائے گئے۔ یا ("کانگریسی" اردو میں) "چنے گئے"۔ لوٹ کر آئے۔ بڑودہ سول سروس میں داخل ہوئے۔ ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آگیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں، اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقہ میں دھوم مچ گئی۔ نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی، اور کلب میں بھی! شیکسپیر کے فلاں ڈراما پر تنقید کیا خوب لکھ دی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علیؒ ایڈیٹر نہ تھے، ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح معنی میں لیڈر تھے، اب "قوم" ان کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی، اور محمد علیؒ، بیخودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علیؒ کے قلب پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی، تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کردیا۔ چندہ کے لئے پکارا، تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کان پور کا ہنگامہ خونین پیش آگیا، محمد علیؒ، دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ـــــــ اب ان کا شمار، ہوشیاروں میں، عاقلوں میں، تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے! ہاں، "مست الست"!

ولایت گئے اور آئے۔ گرجے، پچنے، چلّائے۔ دم لینے نہ پائے تھے، کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز

جنگ یورپ شروع ہوگئی ــــــ خلافت اسلامیہ کی آخری جنگ ! آہ، کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا ــــــ محمد علیؒ اب اپنے عالم میں کہاں تھے ! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر ! زبان کھولی، تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینہ، دو مہینہ کی نہیں، اکٹھے پانچ برس کی ! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نذر ! شاعری کے جوہر اسی زمانہ میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بنکر، نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا، دیکھ!

جس کے دیوانے تھے، اُس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں، مہر ہی مہر، لیکن حقیقت مہر کبھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ، سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔ امتحان پر امتحان، سوز پر سوز، ابتلاء پر ابتلاء ؎

عشق معشوقان نہان ست و ستیر
عشق عاشق با دو صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے، اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے، سوچ سمجھ کر بولے، ؎

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہائے ہوش اب جا کر کھلے !

اور پھر اس سے بھی ترقی کرکے بولے، کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے، اس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لئے تو نقد جان کا مطالبہ ہوتا تھا ؎

مستحقِ دار کو حکم نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسی رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں، کہ بھائی، اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ، یہ تو اپنے اپنے

ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؎

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر
"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

آپ فرمائیں گے، کیا خوب مصرعہ لگایا ہے، یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہارِ حقیقت کر دیا ہے!
اسی نظر بندی کے زمانہ میں، ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا، رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا، ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے، یورپ پہونچوں، اور گلی گلی گھر گھر تبلیغ اسلام کروں!
نظر بندی اور اس کے بعد جیل! پانچ برس بعد چھوٹ کر آئے، تو ملک میں تلاطم برپا تھا، ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار، توپ کے گولوں کے بجائے اب صلح کانفرنس کے ہتھیار! ادھر ہندوستان کے اندر، حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع ۱۹۲۰ء تھا، کہ محمد علیؒ دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے، دوڑے دوڑے پھر یورپ پہونچے۔ اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کر ڈالیں، وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہے، لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا، چپکے چپکے اور اندر ہی اندر، دین کی تبلیغ بھی!

اذاں حرم میں، کلیسا میں، دیر میں، ناقوس
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا کھلا ہوا پھاٹک منتظر تھا۔ "عدم تشدد" پر لاکھ زور دیتے رہے، لیکن حق گوئی کا جرم بہر حال جرم ہی بنا جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڈھ میں ڈال چکے تھے، اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے، اور ۱۹۲۳ء تک، کچھ کم دو برس، پھر چوروں اور رہزنوں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے، ساتھ، سرکار دولتمدار کے مہمان! ——— اب سجدہ زمین ہی پر ہوتے تھے، لیکن سجدہ والی زمین، رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! ذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روئداد تو کان لگا کر سن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں!

نکلے، تو ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، استقبال میں وہ بھی پیش پیش، جن کے ہاں 'وطن' 'مذہب' سے عزیز تر 'دنیا' 'دین' پر مقدم۔ کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ ملک نعروں سے گونج اٹھا۔ محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر ——— وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا 'اللہ اکبر'! لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے، کہ منجھلی لڑکی، جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی۔ جو دوسروں کی اولاد کے لئے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی، لخت جگر کے لئے یہ خبر سن کر، کیا کچھ پھڑ پھڑایا ہوگا! دل پر کیا کچھ بیت رہی ہوگی! بیٹی سے، عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں

'والدین کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں۔ پھر وہ باپ، جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور!

امتحاں سخت سہی، پر دل مومن ہی وہ کیا ؛ جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں!
ہم کو تقدیر الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ ؛ اہل تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں۔

پھر اپنے، اور اپنی نور نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر، اور گڑ گڑا گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے، قرآں میں کیا ؛ تخرج الحیّ من المیّت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم ؛ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں۔

اب اس کے بعد جو شعر ہے، اس کے پڑھنے سے پہلے، اولاد رکھنے والے، اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے، لیکن اس کو ؛ نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں!

اللہ اللہ! جیل سے نکلے، تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اسے قبر میں بھی اُتارا!

سنہ ۲۴ء کا وسط تھا، کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! ——— نہ پوچھئے

کہ محمد علیؒ پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا مثنیٰ تو تھا ہی، خبر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر، جھلس کر رہ گئے۔ وسط ۲۴ء سے آغاز ۳۱ء تک زندہ ضرور رہے، اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے، سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں، خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے، اور بچھڑے۔

۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی، اور سال ہی بھر بعد ۲۹ء میں اُسے بھی اپنے ہاتھوں کفنایا دفنایا۔ کامریڈ نکالا، ہمدرد نکالا۔ مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا۔ یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا، لیکن دل کی کلی جو الغاء خلافت سے مرجھائی تھی، پھر نہ کھلنی تھی، نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! ——
اب وہ انسان نہ تھے صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں!

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لئے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بدبینوں نے کہا، کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوئے، تو انگریز اور ہندی، سب پکار اُٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے، یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے تھے) کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا، یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"! مالک نے بندہ کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ، اور شعبان ۱۳۵۰ھ ہجری کی پندرہویں شب میں، عین اس وقت جب روئے زمین کے مسلمان، اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی، مغفرت کی، نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمیٰ، دنیائے اسلام سے واپس لے لی! —— شاید اس لئے کہ اُس کے ہم قوم اور ہم وطن اُس کے اہل نہیں ثابت ہو رہے تھے! "آزادی" محمد علی کے ملک کو نہ ملی تھی، محمد علی کی روح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی۔ اور دفن کے لئے جگہ کہاں ملی ؟ سرزمین قدس میں، قبلۂ اول، ہیکل سلیمان کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، "ذرا دیکھنا، محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی، جا کس راستہ سے رہا ہے!"

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت!

اس موت پر، اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور و شور سے، تنہا لکھنؤ یا دلی یا کلکتہ یا بمبئی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں، کہ قدس شریف میں، مقبرہ ایک زیارت گاہ خلایق بن گیا ہے، زایروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے۔

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے!

وہ مشک ہی کیا، جس کی خوشبو عطار کی تعریف و تعارف کے بعد سونگھنے میں آئے؟ جوہر کا کلام آگے خود ہی موجود ہے۔ اس کے لئے ضرورت نہ کسی تمہید کی، نہ دیباچہ کی، نہ پیش نامہ کی۔ ورق الٹئے، اور لطف اندوز ہونا شروع کر دیجئے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ کوئی طویل، عریض، ضخیم دیوان ہو، کہ گھنٹوں ورق گردانی میں لگ جائیں، جب جا کر کوئی چیز اپنے مذاق کی مل پائے۔ ایک ننھی سی کتاب۔ جب جو حصہ چاہئے، کھول لیجئے۔ البتہ چند سرسری باتیں کسی رہبر کی زبان سے نہیں، ایک پرانے رہرو کی زبان سے سُنی ہوئی کانوں میں پڑی رہیں، تو راہ شاید اور زیادہ سہولت و خوشگواری سے کٹ جائے۔

محمد علی ابھی کالج میں پڑھ رہے ہیں۔ شاعری کا گویا ابھی لڑکپن ہے۔ اس سن کا کھیل کود ذرا ملاحظہ ہو

ارادہ تھا یہ نالوں کا ہلا دیں ربع مسکوں کو ؎ مگر اے ہم نفس، دل کی تھکن کچھ اور کہتی ہے
یقیں آنے کو تو آ جائے تیری عہد و پیماں کا ؎ تیری آنکھ اے بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں ؎ پر اس مرحوم کی بوئے کفن کچھ اور کہتی ہے

کس زور کی لڑائی تھی اللہ رے کشمکش ؎ تھی رات یاس اور دل ناصبور تھا

میں تیرا گھر سمجھ کے سر راہ گر پڑا ؎ دیکھا جو آنکھ اٹھا کے تو دروازہ دور تھا

اب کالج چھوڑ چکے ہیں۔ زندگی کی کشمکش میں داخل ہو چکے ہیں، انگریزی سنہ ۱۹۰۷ء ہے۔ علی گڈھ، محمد علی کے محبوب علی گڈھ میں، لڑکوں نے انگریز استادوں کے خلاف 'اسٹرائک' کر رکھی ہے۔ کالج بند، خدایان کالج حیران و پریشان! بوڑھے سید کی آنکھ بند ہوئے کل دس ہی برس ہوئے ہیں، مگر اتنے عرصہ میں دنیا کی دنیا ہی بدل چکی ہے۔ محمد علی آتے ہیں، اتفاق سے وہی دن سرسید کی برسی کا ہے، 'اولڈ بوائز' جمع ہو کر اپنا جلسہ منا رہے ہیں، محمد علی اپنے 'نیچری پیر' سے ڈرتے لرزتے نہیں، ناز کرتے ہیں، ان کی خدمت میں، اپنے جیسے "بڈھے لڑکوں" کو سنا سنا کر کچھ عرض کرتے ہیں۔ معروضہ میں ناز بھی ہے، اور نیاز بھی، شوخی اور مستی بھی ہے اور درد و گداز بھی ؎

خبر لو قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی، مشغول دعا تم ہو

تمھیں کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڈھ میں
اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تم ہی ہو زندۂ جاوید، باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم، تو تمثیل بقا تم ہو

دس برس کا زمانہ اور گزرا۔ اب محمد علی چھندواڑہ میں نظربند ہیں۔ یک بیک خبر پہونچتی ہے، کہ غلام حسین چل بسے۔ کون غلام حسین؟ کامریڈ کی ایڈیٹری میں محمد علی کے دست و بازو۔ انگریزی کے زبردست انشا پرداز کامریڈ کے بند ہو جانے کے بعد نیو ایرا کے ایڈیٹر۔ اچھے خاصے جوان و تندرست۔ سرِ شام لکھنؤ میں، ایک پبلک جلسہ سے چلے آ رہے تھے، کہ قضا نے ایک چھوٹے ہوئے گھوڑے کے قالب میں پشت کی طرف سے آ کر ٹکر دی، اور یہ رونقِ صحافت و سیاست رخصت! محمد علی کلیجہ تھام کر رہ گئے فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھائے، تو نالۂ موزوں کی کچھ آوازیں سننے والوں کے کان میں بھی پڑ گئیں ؎

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین ❊ کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے ❊ ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے
اے مرے رندِ بادۂ حق کے ❊ ابھی دو چار خم پئے ہوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی ❊ کام کچھ اور بھی کئے ہوتے
خوب کٹتا بہشت کا رستہ ❊ ساتھ ہم کو بھی کر لئے ہوتے

تکلف اور تصنع سے محمد علی کی زندگی کا ہر شعبہ پاک تھا۔ وہی رنگ یہاں بھی۔ شعر کہتے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے بے تکلف باتیں کرتے چلے جاتے ہیں، نہ کسی قسم کی تیاری، نہ کوئی اہتمام کیسی نظرِ ثانی اور کہاں کا غور و فکر، نہ اصلاح نہ ترمیم، بس جو دل میں آگیا، جھٹ کہہ گذرے۔ یہی حال نثر کا، یہی حال نظم کا

زمانہ، حکومت کی اصطلاح میں، نظربندی، کا تھا۔ لیکن احکم الحاکمین کے ہاں اس میں یہ وقت، نظر کشی، کا قرار پایا! خوب خوب، پتہ پتہ کی کہنے لگے ؎

سوزِ دروں سے جل بجھو لیکن دھواں نہ ہو ❊ ہے دردِ دل کی شرط کہ لب پر فغاں نہ ہو
دیر و حرم میں ڈھونڈھ کے سب تھک گئے اسے ❊ اب کون کہہ سکے کہ کہاں ہو کہاں نہ ہو

شعر سنئے گا۔ ؎

کرنا ہی تھا حرام تو پھر وعدہ کس لئے ❊ یہ کیا کہ شب وصال وہاں ہو یہاں نہ ہو
سنتے ہیں جس کو خلق میں کہرام مچ گیا ❊ جوہر وہ تیری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

ذیل کی غزل ایک اچھے خاصے دیوان پر بھاری ہے ؎

دورِ حیات آئیگا قاتل قضا کے بعد ٭ ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں تری آرزو نہ ہو ٭ باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد

'حنا' کا قافیہ اس 'طرح' میں آسانی سے آسکتا تھا، لیکن ذرا دیکھئے، محمد علی نے اسے کس رنگ سے باندھا ہے ؎

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ٭ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا پڑا خجل ٭ ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد

حالی کا ایک لاجواب شعر ہے ؎

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب ٭ بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

حالی بہر حال، ایک مسلّم استاد تھے، جوہر اُن کے مقابلہ میں مبتدی اور نو آموز محض۔ پھر بھی شعر کچھ ایسا ہیٹا نہیں رہا ؎

لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ٭ آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

اور یہ شعر تو اردو ادب میں گھل مل کر گویا ضرب المثل بن گیا ہے ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے ٭ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اب عالم ہی اور تھا۔ جیل کے باہر، ہندوستان بھر کی سڑکوں پر، گلیوں میں، گھر گھر، زبانوں پر یہ ٹپ تھا، ؎

بولیں اماں محمد علی کی ٭ جان بیٹا خلافت پہ دیدو

یہ کہنا تو محمد علی کی 'بی اماں' کا تھا، اور محمد علی خود، جیل کے اندر، کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کہہ رہے تھے ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے ٭ پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابنِ علیؓ کو ٭ خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے

یہ غزل کہہ رہے تھے، یا اپنی آٹو بایوگرافی (خود نوشت سوانح عمری) "آپ بیتی" قلمبند فرما رہے تھے؟

میں کھو کے تیری راہ میں سب دولت دنیا ✿ سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے ✿ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف ✿ کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

اے شافع محشر جو کرے تو نہ شفاعت ✿ پھر کون وہاں تیرے سوا میرے لئے ہے

کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے ✿ اچھے تو سبھی کے ہیں، بُرا میرے لئے ہے

اسی آپ بیتی کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎

کیوں جان نہ دوں غم میں ترے جبکہ ابھی سے ✿ ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لئے ہے

بعد وفات جب ایک عالَم، ماتم و شیون سے گونجنے لگا، تو صاحب معارف، مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے تعزیتی مقالہ کا عنوان ہی اسی دوسرے مصرعہ کو رکھا۔ ع

ماتم یہ زمانہ میں بپا تیرے لئے ہے

خدا جانے الہام شاعر کو ہوا تھا، یا تعزیت نگار کو! عجب نہیں کہ دونوں کو ہوا ہو۔

جسم قید فرنگ میں۔ دل ترکوں میں اٹکا ہوا۔ جیل کے اندر اخبار آنے نہیں پاتا۔ جیل خود آبادی سے بہت دور۔ ایک دن دور دراز سے "اللہ اکبر" کے نعرے کان میں آتے ہیں۔ دل معاً گواہی دے اٹھتا ہے کہ ہو نہو، ترکوں نے سمرنا فتح کر لیا ہے۔ جوش سے بے خود، یہ قیدی گوشہ نشیں کہہ اٹھتا ہے ؎

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی ✿ سُن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

مطلع سُن لیا ہے تو دو چار شعر اور سنتے چلئے ؎

شیطان جلد باز کا جادو نہ چل سکا ✿ تفسیر آج ہو گئی 'کیدی متین' کی

تیرے کرم نے اور بھی گستاخ کر دیا ✿ اک عرض اور ہے ابھی اس کمترین کی

اک گھر ترا یہاں بھی تو ہے "اس کا" باب میں ✿ کب ہو گی لامکاں سے مشیت مکین کی

تینوں حرم اُسی کے جو ہے لاشریک لہ ✿ ترکیب ہے درست یہی ایک تین کی

اسی "گھر" کے جنون نے تو خود اپنا گھر چھڑا، اور جلا وطن بنا رکھا تھا۔ رام پور میں پیدا ہوئے تھے، پلے تھے،

بڑھے تھے، کھیلے تھے، چپہ چپہ دل میں بسا ہوا تھا۔ مگر مجال نہ تھی کہ جیل سے چھوٹ کر بھی وطن جاسکتے! کسی کو یہ مستقل جلاوطنی بھگتنی پڑے، جب قدر معلوم ہو۔ ٹھنڈی سانس بھرتے جاتے ہیں، اور آبدیدہ ہو ہو کر کہتے جاتے ہیں ؎

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے ٭ ہم نہ تھے اُن کے آستانے کے
ایک ایک کرکے سب کے سب تنکے ٭ ہوئے برباد آشیانے کے
دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر ٭ کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باشش کا حال ٭ ہم ہیں باشندہ جیل خانے کے

قید اور وہ بھی قید تنہائی! بیجاپور جیل کی کال کوٹھری کے اندر، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا کیا نعمتیں نصیب میں آگئیں! سینہ کیسے کیسے انوار سے جگمگا اٹھا۔ کیا کچھ دیکھ لیا۔ کیا کچھ دکھا دیا گیا! راز کبھی کیوں کھلتا؟ ایک دن قلم کی زبان، درد خوانی پر آئی، تو کچھ اتے پتے اُس عالم کے بھی دیتی چلی گئی ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ٭ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے ٭ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے ہیں وعدے ٭ ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ٭ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ٭ بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

قربان ہو جائیں اس 'قید' پر ہزاروں آزادیاں! نثار ہوں اس ویرانے پر ہزارہا آبادیاں! مشت خاک کا شمار اب عالم پاک میں تھا۔ لوہا، جب، تپ کر، دہک کر، لال انگارہ بن جائے، تو لوہا باقی ہی کب رہ جاتا ہے۔ جو ہر اب عالم معانی و حقایق کی سیر کر رہے تھے، ان کی شاعری الفاظ و حروف کی اب رہ کہاں گئی تھی؟ ایک دیوانہ تھا دیوانہ، جسے ایک دوسرے دیوانے نے، بلا کسی ظاہری ملاقات و تعارف کے، خوب پہچانا، اور خوب ہی کہہ ڈالا ؎

بدینِ مصطفیٰ دیوانہ بودی ٭ فدائے ملتِ جانانہ بودی

سیاست زانقاب چہرہ کردی ✤ وگرنہ عاشق مستانہ بودی

سیاست تہمتے برعشق پاکت ✤ زآئینِ خرد بیگانہ بودی

رسیدی از رہ اغیار تا یار ✤ عجب مستے عجب دیوانہ بودی

(از مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، نظم کے باقی اشعار، سیرت محمد علی میں ہیں)

زبان پر آئی ہوئی واہ، کا غلغلہ بس یہیں محفل کے فرش تک، دل کی نکلی ہوئی آہ، کی رسائی مالکِ عرش تک! رومی، اور حافظ اور سعدی آج تک کیوں زندہ ہیں؟ اس لئے کہ کلام فصیح و بلیغ ہوتا تھا؟ یا اس لئے کہ خوش مزہ کلام کے اندر کوئی روح بھی ہوتی تھی؟ فارسی زبان بدل گئی، الفاظ متروک ہو گئے محاورات تبدیل ہو گئے، ترکیبیں نئی ہو گئیں، لیکن حیّ و قیوم کا نام جپنے والے صدیوں کے بعد بھی جوں کے توں! خود بھی زندہ، اور دوسروں کو زندگی بخشنے والے بھی! جو ہر نے بھی اپنے کو اُسی نہ مٹنے والے زندہ کے نام کے پیچھے مٹا دیا تھا، فنا کر دیا تھا، عجب کیا ہے کہ کچھ زندگی اُن کے نصیب میں بھی آجائے!



اخیؔلر

[محترمہ خالدہ ادیب خانم کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے بہ کمال مہربانی یہ مضمون رسالہ جامعہ کو اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ قارئین کو شاید یاد ہوگا کہ محترمہ موصوف نے "مشرق و مغرب کی کشمکش" کے عنوان سے گذشتہ جنوری اور فروری میں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کئی لکچر مسلسل دئے تھے، جن کے اکثر مباحث نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ پانچویں خطبہ میں اہل حرفہ کی ان انجمنوں کا اجمالی ذکر آیا تھا جو درویشوں کے حلقوں کی شکل میں قائم ہوگئی تھیں جنھیں اخیلر کہتے تھے اور جن سے اناطولیہ میں ایک معاشی تصوف کے سلسلہ کا آغاز ہوا تھا۔ یہ بحث اس قدر دلچسپ تھی کہ اس وقت اس تحریک کے متعلق جو کچھ ضمناً کہا گیا تھا اس سے عام طور پر لوگوں کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ ہمیں امید ہے کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد جو تشنگی اس وقت محسوس کی گئی تھی رفع ہوسکے گی۔]

جب ماضی اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑتا، مستقبل میں جو ہونے والا ہے اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ہوتا اور حال ہزاروں متضاد قوتوں کا شکار رہتا ہے۔ کچھ لوگ مذہب سے تسکین حاصل کرنے کے لئے دنیا سے کنارہ کش ہوجاتے ہیں اور کچھ موجودہ شورش و بے نظمی میں جو کچھ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اسے غنیمت سمجھ کر اس

لہ ابھی کچھ عرصہ پیشتر تک "اخی" کے نام کی اصلیت کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ عربی لفظ "اخی" ہے جس کے معنی بھائی کے ہیں لیکن پروفیسر جین ڈینی نے اپنے ایک تازہ مضمون میں جو "سوسائٹی ایشیاٹک ڈی پیرس" میں شائع ہوا ہے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس لفظ کی اصلیت دراصل ترکی ہے۔ بہرحال اس کے ہجے ا۔ خ۔ ی۔ جو عام طور پر جرمن اور فرانسیسی مصنفوں کی طرف سے کئے جاتے ہیں اس لفظ کے ترکی تلفظ کو صحت کے ساتھ ظاہر نہیں کرتے۔ ترکی تلفظ کا اظہار زیادہ بہتر طریقہ پر "اخی" اور "اخیلر" سے کیا جاسکتا ہے۔

کے جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب دنیا کی تماشا گاہ پر معاشرت کے نئے نظام کا مقدمۃ الجیش نمودار ہوتا ہے۔

اناطولیہ کی تاریخ میں تیرھویں صدی کا ابتدائی حصہ اسی قسم کا زمانہ تھا سلجوقوں کی ریاست کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ اناطولیہ کے مسلمان ترک چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں منقسم ہو گئے تھے۔ ملک کے باہر صلیبی جنگجوؤں کے حملہ کا خوف تھا اور ملک کے اندر ہر شخص کے حق پر دوسرے کی نظر تھی۔ ان قوتوں میں جو باہم دست و گریباں تھیں، کبھی آپس میں ٹکراتی تھیں اور کبھی ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی تھیں۔ حلقۂ اخیلر کی قوت (جس کا دوسرا نام ارباب فتوت تھا) ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اس میں اس عہد کی تمام معاشرتی، معاشی اور تصوف کی قوتیں جمع ہو کر ایک ہم آہنگ رشتہ میں منسلک ہو گئی تھیں کیونکہ یہ زمانہ ایسا تھا جب کہ روحانی تسکین اور اخلاقی قوت کی ضرورت اتنی ہی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی جتنی کہ امن و انتظام کی۔

پہلی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تصوف کی ایک تحریک موجود تھی جو اناطولیہ میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ارباب فتوت یا حلقۂ اخی پر اس کا جو اثر پڑا اسے بتانے سے پہلے یہ مناسب ہوگا کہ تیرھویں صدی کی اس ممتاز تحریک کی اصلیت، تنظیم اور ادب کی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی جائے[1]۔

اس عہد کی تحریک تصوف کا آغاز تین بڑی شخصیتوں سے ہوتا ہے۔ تینوں کی تعلیمات کی بنیاد اسلام پر ہی رکھی گئی تھی لیکن ان کے عقاید پر ایک حد تک ایرانی، نوفلاطونی اور البیرونی کی معرفت ہندی فلسفہ اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ خیالات مثلاً مذہب عیسوی اور مذہب مانی وغیرہ کا بھی اثر پڑ رہا تھا۔

اناطولیہ کے خیالات پر جن تین صوفیوں کا اثر پڑ رہا تھا ان کے حالات زندگی ذیل میں درج

---

[1] جرمن اور روسی عالموں نے چند سال سے تحریک اخیلر سے بہت دلچسپی لینا شروع کی ہے فرانس بھی پروفیسر جبن کی عنایت سے ان کی پیروی کر رہا ہے۔ چونکہ تیرھویں صدی میں اس جماعت کے اہم مرکز انقرہ میں تھے اور چونکہ انقرہ اب جدید ترکی کا دارالسلطنت بن گیا ہے اس لئے ترکی علما بھی اس مسئلہ سے بہت دلچسپی لے رہے ہیں اور اس موضوع پر معلومات حاصل کرنے کے لئے پرانے ماخذوں کو چھان رہے ہیں۔

کیے جاتے ہیں۔

(۱) مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء)۔ ان کے والد بلخ کے ایک ترک تھے اور ان کی والدہ خوارزم کے شاہی خاندان کی ایک رکن تھیں۔ یہ اپنے والد کے ساتھ اناطولیہ گئے تھے اور اپنے عہدِ جوانی میں قونیہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی مشہورِ عالم مثنوی فارسی میں لکھی تھی۔ ان کی اس تصنیف سے مشرقی ممالک بہت متاثر ہوئے۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی زندگی پر آج بھی یہ مثنوی اپنا اثر ڈال رہی ہے لیکن ترکی ذہن پر اس کا جو اثر پڑا وہ اور بھی زیادہ تھا۔ یہ ان کے ذہن پر چھ سو سال سے برابر حاوی ہے اور صوفیہ کے جو سلسلے اس سے چلے[۱] جو اب معدوم ہو گئے ہیں، ترکی کے بہترین شاعر اور ماہرانِ موسیقی انھیں میں سے پیدا ہوئے۔ کچھ غالباً اس وجہ سے کہ فارسی سرکاری زبان تھی اور کچھ اس لئے کہ مولانا جلال الدین رومی کو ایرانی فلسفہ سے بڑی محبت تھی، انھوں نے اپنی اس عظیم المرتبت تصنیف کو فارسی زبان میں ہی لکھا لیکن وہ ترکی اور عربی زبانوں سے بھی خوب واقف تھے اور ان میں تصنیف و تالیف بھی کر سکتے تھے۔ ان کی فارسی تصنیفوں کے ترجمے اور شرحیں خود ان کے بیٹے نے کی ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے عہد میں اس بات کی ایک عام خواہش پائی جاتی تھی کہ مذہبی علوم کو سادہ ترکی زبان میں منتقل کیا جائے اور عوام میں پھیلایا جائے۔ مولانا کی تصنیف پر ترکی میں جو شرحیں لکھی گئی ہیں وہ بے شمار ہیں اور مثنوی کا ترکی میں جو ترجمہ نحیفی نے کیا ہے وہ ابھی تک بہترین سمجھا جاتا ہے۔

باایں ہمہ اپنے عہد میں مولانا کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ صرف خواص کے لئے لکھتے ہیں اور ان کی تعلیمات کے متعلق خیال تھا کہ ان کا خطاب عوام سے ہے مگر ان کی بین الاقوامیت نسل و مذہب کے حدود کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ ان کا قول ہے "شاعر، ساقی اور شراب کو میں عالمِ مستی میں ایک ہی سمجھتا ہوں [illegible] وحدت کی مہر اسلام اور کفر دونوں پر لگاتا ہوں۔" حقیقت یہ ہے کہ اپنی تعلیمات میں انھوں نے کل انسانیت

۱؎ ان کے سلسلۂ تصوف سے جو لوگ وابستہ تھے انھیں ترکی میں "مولوی" اور یورپ میں "رقصاں درویش" کہتے تھے

پر وحدت کی مہر ثبت کر دی۔ علاوہ ازیں اپنی صلح جوئی اور امن پسندی میں وہ کسی قسم کی پابندی گوارا نہ کرتے تھے۔ انھیں کسی ایسے جھگڑے سے جو آدمیوں کے درمیان تفرقہ ڈالے کبھی کوئی ہمدردی نہ ہوتی تھی اور ان کی فہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتی تھی۔ اس لئے ان کے فلسفہ سے انفرادی طور پر چاہے جس قدر بھی روحانی، خیالی اور جمالی تسکین کیوں نہ حاصل ہوتی ہو لیکن اس عہد کی منتشر اور غیر منظم معاشرت کی کوئی تنظیم بڑے پیمانہ پر نہ ہو سکتی تھی۔

(۲) محی الدین عربی (۱۱۶۲ء تا ۱۲۴۰ء) اس عہد کے دوسرے صوفی تھے جنھوں نے اناطولیہ میں تصوف کے خیالات کو پھیلایا۔ یہ اشبیلیہ کے رہنے والے تھے۔ اسپین پر جب حملہ ہوا اور مسلمانوں پر ظلم کئے جانے لگے اس وقت انھوں نے اپنا ملک چھوڑ دیا اور اناطولیہ میں آکر پناہ لی۔ ابتدا میں انھوں نے قونیہ میں سکونت اختیار کی اور وہاں ایک ترکی بیوہ سے شادی کی لیکن بعد کو وہ دمشق چلے گئے اور وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے فلسفہ کے متعدد پہلو ہیں اور ان کی تصانیف کے بیشتر حصہ میں پیشین گوئی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ ان کے سوتیلے ترکی فرزند 'صدر الدین قونوی' نے ان کی تصانیف کے ترجمے اور شرحیں لکھیں اور ان کے خیالات کی اشاعت کی۔ ضیا رحلمی اپنی تصنیف "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ان کا شمار بھی ان لوگوں میں کرتا ہے جنھوں نے ترکی تصوف پر بہت اثر ڈالا ہے۔ لیکن عوام میں جس تصوف کو قبولیت حاصل ہوئی اور جس سے اس عہد کی معاشری، معاشی اور روحانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صوفیوں کے حلقے پیدا ہوے اس کا مبدا اور مرجع دراصل خواجہ احمد یوسفی ہیں۔

(۳) خواجہ احمد یوسفی سمرقند اور بخارا کے قرب وجوار میں پیدا اور فوت ہوئے۔ وہ کبھی اناطولیہ نہیں آئے۔ ان کی تعلیمات کو ان کے مرید تیرھویں صدی میں اناطولیہ لائے اور ان کی ایک وسیع رقبے میں اشاعت ہوئی۔ ان کی خاص تصنیف دیوان حکمت ہے۔ اگرچہ یہ دیوان پورا ان کا لکھا ہوا نہیں ہے لیکن اس کا اثر بہت گہرا اور وسیع ہے۔ یہ ترکی میں لکھتے تھے اور ان کی تعلیمات میں مابعد الطبیعیات کی کوئی پیچیدگی یا ایرانی تصوف کی موضوعیت نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب اعمال اور کردار کا نام ہے۔ ان کے اور ان کے مریدوں کی تعلیم سے تمام اناطولیہ میں باعمل صوفیوں کے حلقے پیدا ہو گئے جن

میں بیک تاشی اور اخی حلقے بھی شامل تھے۔ اخیوں کا سلسلہ بیک تاشیوں کے سلسلے سے بعض باتوں میں مشابہ تھا۔ کم سے کم کپرولوزادے فواد کا یہی خیال ہے جو اپنی تصنیف "ترکی ادب کے ابتدائی صوفیا" میں اس بات پر خاص زور دیتے ہیں۔

ان صوفیوں کے حلقے میں ہر طبقہ کے لوگ شہزادے، سپاہی، تاجر سب ہی شامل ہوتے تھے۔ چونکہ اخیوں کو اربابِ فتوت بھی کہا جاتا ہے اس لئے اس کے معاشی پہلو پر بحث کرنے سے پہلے جو غالباً اس کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت ہے یہ مناسب ہوگا کہ اس اصطلاح کا مفہوم بتلا دیا جائے۔

"فتوت" کے معنی ہیں اسلامی جذبہ شجاعت و جانبازی۔ اس کی ابتدا ان دو عظیم شخصیتوں سے ہوتی ہے جو دونوں عہد رسالت میں موجود تھیں یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ۔ بصورت مجموعی حضرت علیؓ کا اقتدار زیادہ تھا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ تھا کہ جاں بازوں کے تمام خراج مثلاً اژدہوں کا مارنا، کمزوروں کی حمایت کرنا وغیرہ وغیرہ خصوصیت کے ساتھ ان کے ساتھ ہی منسوب کیے جاتے تھے اور کچھ اس لئے کہ رسول اللہؐ نے ان کے متعلق کہا تھا کہ "لَا فَتیٰ اِلّا علی۔ لا سیف اِلّا ذوالفقار" یعنی علیؓ کے مقابلہ کا کوئی جانباز نہیں ہے اور ذوالفقار کے ٹکر کی کوئی تلوار نہیں ہے۔" بغداد کے خلیفاؤں کے زمانہ میں فتوت نے عجیب عجیب شکلیں اختیار کرلی تھیں لیکن اناطولیہ میں ان کی شجاعت اور جانبازی ایک مسلمہ حقیقت تھی۔ مشرق قریب کے مسلمان جانباز صلیبی افواج کے نائٹوں (عیسائی جانبازوں) کا مقابلہ کیا کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ بہت مشہور رہتے تھے۔ صلاح الدین ایوبی، رچرڈ شیردل کا فیاض دشمن (جس نے مغربی ادب اور خصوصیت کے ساتھ والٹر اسکاٹ کے "تلسمان" میں اپنے لیے ایک لازوال نام پیدا کرلیا ہے) ترکوں کے مسلمان جانبازوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال تھا۔ ان لوگوں کا تعلق یا تو کسی نہ کسی زوال پذیر سلجوق ریاست سے ہوتا تھا یا ان جانبازوں سے جو ترکوں اور ترکمانوں اور خصوصیت کے ساتھ عثمانی قبائل کے ساتھ اناطولیہ میں آتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کا بانی عثمان خود بھی ایک اخی تھا اور جب وہ سلطان ہوا تو ایک مشہور اخی ہی نے تلوار کا پٹکا اس کی کمر سے باندھا تھا۔ تیرھویں صدی کے تمام تاریخی مواد سے یہ بات ثابت ہے کہ حلقہ اخی کے فوجی اور جانباز عنصر کا سلطنت عثمانیہ کے قیام میں بہت بڑا حصہ ہے۔ "خونی خراج" کے نظام (یعنی عیسائی نوجوانوں کو فوج میں

بھرتی کرنے کے طریقہ) سے پہلے ینی چری، اخی اور بیک تاشی ہی ہوا کرتے تھے۔ سپاہی اور سوار جو اناطولیہ کے ترک زمینداروں پر مشتمل ہوتے تھے سب سلسلہ اخی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ کا امتیازی نشان ایک خاص قسم کی شلوار (یا جامہ) ہوتی تھی۔

مگر اس کے برعکس یہ بات بھی صاف ظاہر ہے کہ ان حلقوں کے لڑنے والے عناصر کو جذب کرنے کے بعد عثمانیہ حکومت نے اس کے سیاسی اقتدار کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ گو جہاں کہیں مرکزی حکومت کمزور ہوتی تھی اخی یا ارباب فتوت حکومت کیا کرتے تھے۔ انقرہ اور کرشیہر میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی تھی۔ جب عثمانیوں نے چودھویں صدی کے وسط میں انقرہ کو فتح کیا تو وسط اناطولیہ میں حلقہ اخی کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد سے یہ لوگ اپنی معاشی قوت اور تنظیم کی بنا پر اٹھارویں صدی تک با اثر رہے بلکہ ان کی تجارتی انجمنیں جنگ عظیم کے آخری ایام تک باقی رہیں اگرچہ مغربی تجارتی طریقوں اور مشین کی نئی ہوئی اشیاء کے رواج سے ان کی حالت بہت زیادہ مائل بہ زوال ہو گئی تھی۔

چونکہ حلقہ ہائے اخی کا طویل ترین اور موثر ترین رخ ان کا معاشی رخ ہے۔ اس لئے ہمیں ان کا سراغ تیرھویں صدی تک جب اخی اور ارباب فتوت کا آغاز ہوا تھا لگانا چاہیے۔ اپنی کتاب "ترکی خیالات کی تاریخ" میں ضیا ء علمی خیالات کے اس رخ کو "تنظیمی تصوف" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

معاشی تنظیم کی ابتدا اخی ایوران سے ہوئی جو انھی برادریوں میں سے ایک کے رکن تھے اور ان کا پیشہ چمڑا رنگنا تھا۔ انھوں نے چمڑا رنگنے والوں کی انجمن قائم کی اور خود اس کے پیر و مرشد بن گئے۔ دوسرے پیشے والوں نے بھی یکے بعد دیگرے ایوران کی انجمن کے نمونہ پر انجمنیں بنانا شروع کیں لیکن گذشتہ تمام صدیوں میں چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کو برابر بزرگی و برتری حاصل رہی۔ یہ انجمنیں تمام اناطولیہ میں پھیلی ہوئی تھیں اور سترھویں صدی میں ایولیا سیلیبی نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ استنبول کے پیشوں کی تنظیم بھی اسی قاعدے کے ماتحت ہوئی تھی۔ سترھویں صدی تک اخی ایوران کی کرامات اور خرق عادات کے بہت سے افسانے زبان زد خلائق ہو گئے تھے۔ ان کا مقبرہ اگرچہ حقیقتاً کرشیہر میں تھا لیکن اس کے متعلق اناطولیہ کے متعدد شہر دعوے کرنے لگے تھے اور اخی ایوران مستقل طور پر ایک زبردست جانباز، پیر شہید اور اس پیشہ کے

تنظیم دینے والے بن چکے تھے اور ان سے اژدہوں کے مارنے اور دوسری ان صفات کو جن کا ایسی ذات میں اجتماع ضروری ہے منسوب کی جانے لگی تھیں۔

چودھویں صدی کے سیاح ابن بطوطہ[۵۹] کے تعلقات اخی کے حلقوں سے بہت گہرے تھے اور وہ ان کے طریقۂ زندگی کے متعلق بہت مفصل اور دلچسپ معلومات فراہم کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کے ورود کے وقت تک ان حلقوں میں معاشی خصوصیت کے ساتھ ساتھ جانبازی کی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ ان شہروں کے رواج کے مطابق جب کوئی سلطان نہ ہوتا تھا تو اخی حکمراں کے فرائض انجام دینے لگتا تھا۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق "اس کا حکومت کا اقتدار، سزا کا حق اور شان وجلوس بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا تھا" علاوہ ازیں وہ اس بات کو بھی وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ کس طرح یہ لوگ ہر قسم کے ناجائز مطالبات کے خلاف جدوجہد کرتے تھے اور کس طرح نیچے سے چوری ڈکیتی اور اوپر سے ظلم و تعدی کا انسداد کرتے تھے۔ ابن بطوطہ کو اس قسم کی انجمنیں ہر جگہ شہر و دیہات میں جہاں جہاں ترکمان آباد تھے موجود ملیں۔ وہ انھیں تمام پیشوں اور حرفوں کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ نوجوانوں کی انجمنیں کہتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ معاشی اور جانبازوں کی انجمنوں کے سردار کو اخی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ان کے مشترکہ دسترخوان، مشترکہ کام اور اجتماعی زندگی کو وہ نہایت تفصیل سے بیان کرتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ برادریاں گلڈ سوشلزم (حزب العمال کی اشتراکیت) کی ایک مکمل مثال تھیں۔

ابن بطوطہ کے بیان کے علاوہ ہمیں اخی یحییٰ بن خلیل کی تصنیف میں ان انجمنوں کا ایک نہایت

---

[۵۹] ابن بطوطہ کو اخی کے حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی۔ شہر مدوک میں اخی سنان اور اخی نومان کے پیروں کو اس عرب سیاح کی ضیافت کے لئے قرعہ اندازی کرنا پڑی "عید دہیم" کا دن تھا ابن بطوطہ کہتا ہے کہ "میں عیدگاہ گیا۔ جس طرح سلطان اپنی افواج کے ہمراہ آتا ہے اسی طرح اخی کے حلقے بھی مسلح ہو کر آتے ہیں۔ ہر جانی انجمن کا ایک ڈھول، بگل اور جھنڈا ہوتا ہے اور ان میں اپنے پیروؤں کی ظاہری زینت اور اسلحہ کی تکمیل کے لئے باہم مقابلہ ہوتا ہے"۔

سیر حاصل بیان ملتا ہے۔[۵]

ان کی زندگی کے مکمل مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اخیوں کی یہ انجمنیں صحیح معنی میں ایک جمہوریت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ یہ جمہوریت موجودہ عہد کی جمہوریت نہ تھی جس میں دیوانہ وار مسابقت اور انفرادی خود غرضی کا دور دورہ نظر آتا ہے بلکہ ایک ایسی جمہوریت تھی جس میں قناعت منصفانہ تقسیم دولت اور جماعت کی بہبودی کو سب سے زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ حلقہ اخی کا ایک سخت قانون یہ تھا کہ ان کی انجمن کا ہر آدمی اپنی ذاتی کوشش سے بنا ہو۔ اگر کسی کو اپنے نسب پر ناز ہو تو وہ اس دائرے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کا قول تھا "خواہ انسان پیغمبر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اگر وہ جوہر ذاتی نہیں رکھتا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں"۔

ان کے نزدیک سات کا عدد متبرک سمجھا جاتا تھا۔ جب کوئی امیدوار کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا تو اسے داخلہ کی تقریب کے موقع پر سات قسمیں اس بات کی کھانا پڑتی تھیں کہ وہ سات نیکیوں پر عمل کرے گا اور سات برائیوں سے بچے گا۔ ان کے استعارے میں اسے سات دروازے کھولنا اور سات بند کرنا پڑتے تھے :۔

(۱) بخل کا دروازہ بند کرنا اور سخاوت کا دروازہ کھولنا۔

(۲) ظلم و جور کا دروازہ بند کرنا اور لطف و کرم کا دروازہ کھولنا۔

(۳) حب جاہ کا دروازہ بند کرنا اور قناعت کا دروازہ کھولنا۔

---

[۵] فتوت نامہ۔ ۹۰۱۔ فاتح کتب خانہ :۔ اخی کے حلقوں نے جو تصانیف چھوڑی ہیں انھیں فتوت نامہ کہتے ہیں۔ اس خاص فتوت نامہ کا مصنف جو ترکی زبان میں سب سے زیادہ قدیم ہے (ابن بطوطہ سے بھی ربع صدی پہلے کا) کہتا ہے:۔ "میں اپنی نوجوانی میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ اخی کی انجمنیں کاہل ہوتی جارہی ہیں اور انھیں رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا ہے کہ وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومه (ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب اپنی قوم کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ میں نے بھی اہل فتوت کو ان ہی کی زبان میں تعلیم دینی چاہیے۔ میں نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور کئی کتابیں پڑھ لیں اور اب میں یہ کتاب لکھ رہا ہوں"۔

(۴) عیش کا دروازہ بند کرنا اور زہد و ریاضت کا دروازہ کھولنا۔

(۵) تالیفِ قلوب کا دروازہ بند کرنا اور عدل کا دروازہ کھولنا۔

(۶) "ہرزہ و ہذیان" کا دروازہ بند کرنا اور علم و حکمت کا دروازہ کھولنا۔

(۷) جھوٹ کا دروازہ بند کرنا اور سچ کا دروازہ کھولنا۔

جو لوگ اخی کے حلقے میں شامل نہیں کئے جاتے تھے ان کی فہرست حسب ذیل تھی :۔

دروغ گو، غیر مومن، نجومی، بھاٹ، جراح، قصائی، محصل اور سود خوار۔

ہر انجمن کی عاملہ کے سات ارکان ہوتے تھے اور ان کے کاروبار میں جمہوریت اور مساوات کے اصول پر عمل کیا جاتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اخلاقی اوصاف کی بنیاد پر فرق مراتب بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا اور درجہ بدرجہ حق حکومت تسلیم کیا جاتا تھا۔

ان انجمنوں میں جو نام رائج تھے وہ تجارت اور تفریح کی اصطلاحوں میں داخل ہو گئے تھے جو آج تک باقی ہیں۔ گارڈلیوسکیؔ[1] کا قول ہے کہ ان برادریوں کی بنیاد کاریگروں پر رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ان کا سیاسی اقتدار عثمانی سلطنت کے قیام کے بعد کم ہو گیا تھا لیکن صنعت کی انجمنوں کی حیثیت سے انھوں نے اپنی اہمیت اور مشاغل کو باقی رکھا تھا۔

انجمن کا پہلا درجہ امیدوار کا ہوتا تھا۔ ایک نوجوان یا تو خود کسی انجمن میں شریک ہوتا تھا یا اس کے والدین امیدوار کی حیثیت سے اس کا داخلہ کراتے تھے۔ ایک ہزار ایک دن تک اسے کسی استاد کے ماتحت تربیت حاصل کرنا پڑتی تھی جس کے بعد اس کی امیدواری کا زمانہ ختم ہو جاتا تھا۔

اسی اثنا میں اس کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم زاویا (مذہبی مرکز) میں دواخوان طریقت (یول کردشی)

[1] Gordlevskij : Les derviches de L'Ordre D'Ahi-evran et les corps de metier en Turquie." Bulletin de L'Academie des sciences de l'U.R.S.S. 1927 P.1172.

اور ایک پدر طریقت (یول آتاسی) کی نگرانی میں ہوتی رہتی تھی۔ امیدوار کو مزدوری نہیں ملتی تھی لیکن اس کا استاد اسے وظیفہ دیتا تھا جسے وہ اس دعوت کے لئے جمع کرتا رہتا تھا جس میں اس کا درجہ بڑھا کر استاد کر دیا جاتا تھا۔

امیدواری کا زمانہ ختم کرنے کے بعد اسے چھ مہینہ تک رفیق طریقت (جس کا نام کلفہ تھا) کے درجے میں رہنا پڑتا تھا بزرگوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے اسے کوئی خاص کام کرنا پڑتا تھا۔ اگر مہتیہ کی اہلیت کے اس امتحان کا نتیجہ تشفی بخش ہوتا تھا تو اسے استاد کا خطاب دے دیا جاتا تھا اور دستارِ فضیلت باندھ دی جاتی تھی۔ اس کی انجمن کے بزرگ اس کے لئے اتنا سرمایہ فراہم کر دیتے تھے جو ذاتی طور پر کام شروع کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ درجہ بدرجہ ترقی کی ہر منزل پر ایک مذہبی تقریب منائی جاتی تھی۔

ہر انجمن کی جماعت عاملہ کی صدارت تاجروں کا سردار (اصناف باشی) کرتا تھا۔ صرف چمڑا رنگنے والوں کی انجمن کے سردار کو اخی بابا (اخیوں کا باپ) کہا جاتا تھا۔ اس کا حلقۂ اقتدار چمڑا رنگنے والوں تک محدود نہ ہوتا تھا بلکہ وہ انجمنوں میں جتنے اختلافات ہوتے تھے ان میں حکم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس کا قول تمام انجمنوں کے لئے قانون کا مرتبہ رکھتا تھا۔ وہ عموماً ان استادوں میں سے منتخب کیا جاتا تھا جن کے سامنے تین استادوں کی دستار بندی کی رسم ادا ہو چکی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ اس کی پاکبازی، وجاہت اور نیکی کی تمام انجمن معترف ہو۔ ہر دو ہفتہ کے بعد مجلس جمع ہوتی تھی۔ ہر انجمن آزادی سے اپنے معاشری بیت المال کی رقوم اور قہوہ کے مشترکہ ذخیرہ کو خرچ کر سکتی تھی۔ ہر جلسہ میں معاملات و مسائل کے متعلق فیصلے کیے جاتے تھے جن میں سزا کے فیصلے بھی شامل ہوتے تھے۔ مجلس کو چونکہ اپنی کام کی اعلیٰ نوعیت کا بہت پاس تھا اس لئے ہر ایسے کاریگر کو سزا دی جاتی تھی جو پیدائش اشیاء کے معیار کو پست کرتا تھا۔ اس کی دوکان عارضی طور پر بند کر دی جاتی تھی اور اس کا خراب کام اس کے دروازے پر لٹکا دیا جاتا تھا اور وہ انجمن کی رکنیت سے بھی خارج کر دیا جاتا تھا۔ ترابیزانڈ میں اس تعزیری کارروائی کو افوروز یعنی برادری سے اخراج کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

انجمن سال میں ایک مرتبہ کسی مقام پر ایک عام جلسہ کا بھی انتظام کرتی تھی جو تفریحی جلسہ (تفرج) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس میں تمام اختلافات دوستانہ طریقہ پر طے کر دئے جاتے تھے۔

مشین کی بنی ہوئی اشیاء کے سیلاب نے ترکی بازاروں پر قبضہ کرلیا اور ترکی حکومت نے تمام معاشی اداروں کو اپنی نگرانی میں لینے کا تہیہ کرلیا اور دستی صنعتیں ختم ہوگئیں تو ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ عظیم کے بعد ان انجمنوں میں سے جو انجمنیں آخری سانس توڑ رہی تھیں وہ بھی ختم ہوگئیں۔

ماخذ

(۱) م۔ جودت :۔ اخی پر مختلف مضامین۔ بیوک مجموعہ۔ استنبول ۱۹۱۸ (ترکی میں)

(۲) م۔ جودت :۔ ذیل علی فصل الاخیۃ الفتیان الترکیہ فی کتاب الرحلۃ لابن بطوطہ استنبول ۱۹۳۲ (عربی میں)

(۳) فواد کاپرولو :۔ ترکی ادب میں ابتدائی صوفیا استنبول ۱۹۱۹ (ترکی میں)

(۴) فواد کاپرولو۔ عثمانی سلطنت کی بنیاد ترکیات مجموعاسی میں مضمون۔

(۵) Franz Taescher – "Die Futuwwa Bunde in der Turkie und ihre Literatur." Der Islam. Vol. II. Fasc 3.

(۶) Franz Taescher – " Das Futuwwetname in Gulschehris Altosmanisches Baerbeitung."

(۷) Zia Hilmi – " History of Turkish Thought," (Turk Teffekur Tarihi) in two Volumes. Istanbul 1933.

(۸) Georges Vajda – "Les corps de Metier en Turquie, d'apres deux publications de V. Gordlevskij." (Revue des Etudes Islamiques 1934.

(۹) Franz Taescher – " Beitrage Zur Geschihte der Achis in Anatolien." Der Islam. Vol: IV.

روسی مُسلمانوں کا ادب[1]

اگست ۱۹۳۴ء میں روس کی اشتراکی وفاقی ریاستوں کی ایک ادبی کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی جس میں یورپ کے بعض ممتاز ادیب بھی بلائے گئے تھے۔ یورپ کے ادبی حلقوں میں اس کانفرنس کے سلسلے میں بہت چہ می گوئیاں ہوئیں، کیونکہ ادبی تخلیق ایک انفرادی چیز ہے، اور ایسی اشتراکی ریاست میں جو مطلق اختیارات رکھنے کا دعوے کرتی ہو، اپنی مصلحت کے مقابلے میں کسی اور معیار کو نہ مانتی ہو اور عقیدے اور عمل میں یکرنگی اور تقلید پر سختی سے اصرار کرتی ہو انفرادیت کا وجود ہی ممکن نہیں۔ اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا کہ روس میں انسانی سرشت کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اور اس نئے انسان کے لئے نئے ادبی اسالیب اور نئے نصب العین پیدا کئے جا رہے ہیں، اب روس میں ایک ادب کی بنیاد ڈالی گئی ہے جس کا ظاہر قومی اور باطن اشتراکی ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی ادیب کی رائے تھی کہ اب "اشتراکی انفرادیت کا" دور دورہ ہوگا۔

لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے بہت دور ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم ان رودادوں اور مضامین پر غور کریں جو روس کی مسلمان آبادیوں کے نمائندوں نے پڑھے۔ یہ معاملے کی بات ہے۔ اس سے ہمیں پتہ چلے گا کہ روسی مسلمانوں کے ادب کی نشو و نما کس ڈھنگ پر ہو رہی ہے، ان کے ممتاز ادیب کون ہیں اور ان کی تصانیف کیا حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہم پہلے اس مسئلے کے خالص لسانی پہلو پر نظر ڈال لیں اور یہ دیکھیں کہ نئے خیالات اور تصورات کو ادا کرنے کے لئے کیا تدبیریں کی گئی ہیں تو ہمیں صحیح اندازہ لگانے میں بہت آسانی ہوگی۔

پچھلے سال لینن گراد سے مضامین کا ایک مجموعہ جس کا عنوان "زبان اور ذہنیت" ہے، شائع ہوا۔

---

[1] ماخوذ از رسالہ "REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES"

اس میں بوروکوف کا ایک مضمون، " ازبکوں کی ادبی زبان" ہے۔ مصنف نے بحث اس اصول پر مبنی کی ہے کہ ادبی زبان کا معیار قائم کرنے کی کوشش دراصل ایسے تصورات کی باہمی جنگ ہے جو قومی یا ملکی تہذیب پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔ ہم ادبی زبان کو ایک مصنوعی چیز نہیں ٹھہرا سکتے۔ وہ بول چال کی زبان کی ایسی شکل ہے جو قواعد کے ذریعے سے منضبط کی گئی ہو۔ اور انھیں قواعد کی سختی اور پیچیدگی ادبی اور بول چال کی زبان کے درمیان تفاوت پیدا کر دیتی ہے۔ ازبکستان کی اب تک کوئی عام ادبی زبان نہیں تھی۔ اب اس کے قواعد آہستہ آہستہ بن رہے ہیں۔ لاطینی خط اختیار کر لیا گیا ہے، اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس میں ان تمام حروف علت کے لئے علامتیں مقرر کر لی جائیں۔ اسی بنا پر نوئے حروف علت کا اضافہ کیا گیا۔ لیکن پھر یہ طے پایا کہ مختلف ازبک بولیوں میں مفاہمت کی گنجائش نہیں اور اگر ہر صوت کے لئے ایک علامت رکھی گئی تو ابجد بہت پیچیدہ ہو جائے گی۔ اب آخری فیصلہ یہ ہوا ہے کہ صرف پانچ چھ حروف علت رکھے جائیں۔ اصطلاحات وضع کرنے کا کام ابھی شروع ہی کیا گیا ہے۔

بوروکوف کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازبک یا کسی اور زبان کو جس کی نشو و نما معاشرتی حالات کے پہلو بہ پہلو نہ ہوئی ہو نئے خیالات کا حامل بنانے میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کے قواعد زبردستی گھڑے ہوئے ہوتے ہیں، اصطلاحیں معین نہیں ہوتی ہیں۔ ازبک زبان کے ساتھ ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ خط بدل دیا گیا ہے۔ فی الحال ہم کسی اعتبار سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ازبک ادیبوں کا کام سہولت سے چل رہا ہے یا ان کی زبان خیالات کو صحیح طور پر ادا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ کمی اشتراکی تعلیم کے مبلغ خود بھی محسوس کر رہے ہیں، اور اس کو طرح طرح سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گو زبان میں نئے سیاسی اور معاشی نظام کے متعلق جو کتابیں شایع ہوئی ہیں ان سب کے آخر میں ایک فرہنگ ہوتی ہے جس میں اصطلاحات کی توضیح کی جاتی ہے۔ لیکن اس تدبیر سے مشکل حل نہیں ہو جاتی۔

بوروکوف نے اسی مضمون میں آگے چل کر بتایا ہے کہ تعلیم یافتہ اور مہذب ازبکوں میں ادبی زبان کی نسبت دو طرح کے رجحانات مقابلے پر پائے جاتے ہیں۔ ایک جس کے علم بردار پروفیسر فکرت[۵] ہیں، یہ ہے کہ

---

[۵] اس سلسلے میں خالدہ ادیب کی " ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" چھٹے باب " تہذیب اور ادب" پر نظر ڈال لینا مفید ہوگا (م)

ازبک ادب کے اس معیار اور ان روایات کو زندہ کرنا چاہیئے جو چودھویں اور سولھویں صدیوں کے درمیان چغتائی ادب کی روح رواں تھیں۔ دوسرے خیال کے لوگ چغتائی کو امرا اور جاگیرداروں کی زبان سمجھتے ہیں جسے کبھی عمومیت حاصل نہیں ہوئی، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں مختلف بول چال کی زبانوں کو نئے ادب کا سنگ بنیاد بنانا چاہیئے۔ بوروکوف کی رائے میں دونوں فریق غلط راہ پر ہیں۔ چغتائی کے حامی دراصل قومیت، جمہوریت اور ترکوں کے اتحاد کے نصب العین کو اس طرح مقبول عام کرنا چاہتے ہیں، اور یہ نصب العین صرف مردہ اور خیالی نہیں ہے بلکہ اشتراکی انقلاب کے مسلک کے خلاف ہے۔ مقامی زبانوں کے حامی خیالی گھوڑے تو نہیں دوڑاتے، مگر وہ ازبک زبان کی نشو و نما کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں۔ ازبک زبان پر غور کرتے وقت اس کی تاریخ اور اس کی نشو و نما کے دوروں کا یکساں لحاظ رکھنا چاہیئے، اور خالص ادبی تصانیف کے ساتھ سرکاری، عدالتی اور انتظامی احکامات کی لسانی حیثیت کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ یہ کام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔

ازبک زبان کی تاریخ کو بوروکوف کے مطابق ہم دراصل دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک انقلاب سے پہلے اور ایک اس کے بعد کا۔ چغتائی سے اس کا رشتہ جوڑنا مشکل ہے، کیونکہ چغتائی زبان کا ارتقا بالکل مختلف تاریخی حالات میں ہوا۔ جاگیرداری کے زمانے میں نیچے ہمیں ایسی جماعتیں ملتی ہیں جن کی معاشی زندگی محدود اور باقی دنیا سے علیحدہ تھی، اور وہ سب اپنی مقامی بولیاں بولتی تھیں۔ اوپر کے طبقے میں ہمیں اشراف کی ادبی زبان ملتی ہے جس کا محرک مذہب تھا۔ یہ تو حال ہی کا قصہ ہے کہ ایک تاجروں کا طبقہ پیدا ہوا جس نے ایک قومی زبان کے ڈول ڈالے، لیکن اگر سرمایہ داروں نے نئی زبان کی تحریک شروع کی تو انھوں نے اسے بالکل اپنے مقاصد کے لئے وقف بھی کر دیا۔ یہ مختلف اسباب اور محرک اس طرح ایک دوسرے پر اثر ڈالتے اور مل کر نئی شکلیں اختیار کرتے رہے کہ ہم ازبک زبان کی تاریخ کا ایک سلجھا ہوا سلسلہ قائم نہیں کر سکتے۔ یہ بات تو قطعی اور یقینی ہے کہ اس وقت کی ازبک زبان پرولتاری انقلاب کی پیداوار ہے اور اسے چغتائی سے کوئی نسبت نہیں (بوروکوف یہاں پر یہ تو بیان کرتا ہے کہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۷ء تک اس کی ہر جگہ بہت کوشش کی گئی کہ تمام روسی مسلمانوں کی ایک متحدہ ترکی زبان ہو جائے، اور اسمعیل بک گسپرلی کے اخبار "ترجمان" اور سمرقند کے اخبار "آئینہ" نے اس مقصد کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا، مگر وہ یہ نہیں بتاتا ہے کہ اس تحریک کا

اشتراکی انقلاب کے بعد کی ادبی جدوجہد پر کیسا اثر پڑا۔)

انقلاب سے پہلے ازبک عربی حروف میں لکھی جاتی تھی، اور اس کے صرف ونحو قدیم اصول پر تھے۔ اس کا رخ اناتولیہ کے ترکوں کی طرف تھا، اگرچہ اس پر روسی زبان کے قواعد کا خفیف سا اثر معلوم ہوتا ہے۔ انقلاب کے بعد نئے اسالیب وجود میں آئے، خاص طور پر ایک نئی نثر، جو بالکل روسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے، کیونکہ اس کا خاص سرمایہ روسی ادب اور اشتراکی تعلیم کے شاہکاروں کے ترجمے ہیں۔ ازبک کے قواعد صرف ونحو بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں، اس لئے کہ نئے حالات کی وجہ سے ڈھیروں الفاظ دوسری زبانوں سے لینا پڑے ہیں۔ جدید SYNTAX کی اصطلاحی پشت وپناہ لاطینی حروف اور اوقاف ہیں۔ ہم نئی انشاپردازی کی عجیب عجیب مثالیں دے سکتے ہیں، لیکن یہاں لینن کے ایک جملہ کے ازبک ترجمے پر اکتفا کریں گے۔ ناظرین خود ہی دیکھ لیں گے کہ ترجمہ اور اصل میں کتنا فرق ہے۔

"اگر کسی ایک ملک میں سرمایہ دار شکست کھا جائیں — اور یہ آپ سمجھئے ایک مثالی نمونہ ہے۔ کیونکہ کئی ملکوں میں ایک ساتھ انقلاب ہونا ایک بالکل نادر واقعہ ہوگا۔ تو اس کے باوجود وہ مزدوروں سے کم طاقت ور نہ ہو جائیں گے۔"

یہ جملہ لینن کا تھا۔ اس کا ازبک میں یوں ترجمہ کیا گیا ہے:۔

"اگر سرمایہ دار صرف کسی ایک ملک میں دیکھیں کہ وہ شکست کھا گئے ہیں، تو جہاں تک اس (ملک) کا تعلق ہے، یہ ایک مثالی نمونہ ہوگا۔ کئی ملکوں میں انقلاب کا ایک ساتھ نمودار ہونا ایسا واقعہ ہے جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اس وقت سے وہ (یعنی سرمایہ دار) حسب سابق ان لوگوں سے زیادہ طاقت ور رہیں گے جو سرمایہ داروں کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں۔"

لیکن ان سب باتوں کے باوجود بوروکوف صاحب بزبان کومرید ستالن فرماتے ہیں:۔

"قومیں اب سرمایہ داری کے زیر سایہ نہیں بلکہ سوویٹ کی سرپرستی میں نشوونما پا رہی ہیں اور مستحکم ہو رہی ہیں۔ اپنا کام جاری رکھو، تاریخی نظیریں نہ ہوں تب بھی کام جاری رکھو!"

اب ہم کانگریس کی روداد پیش کرتے ہیں، اور یہ دیکھیں گے کہ ازبکوں کے ادبی ارتقا کا رنگ ڈھنگ کیا ہے۔

ازبکستان کا ادب

کومریڈ مجیدی، ازبکستان کے انشا پردازوں کے اتحاد کے صدر کی رپورٹ

(۱) سرمایہ داروں کی قومیت کے خلاف جنگ

ازبکستان نے صنعت اور زراعت میں جو ترقی کی ہے اس کا ملک کی تہذیبی نشوونما پر بہت مفید اثر پڑا ہے۔ اس وقت آبادی میں ۵۲ فی صدی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ پانچ سال کا جو پروگرام بنایا گیا تھا اس کے سلسلے میں ثانوی تعلیم پانے والوں کی تعداد ۲۵٫۰۰۰ سے بڑھ کر ۵٫۲۰۰۰ اور اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی ۱۱۴۱ سے ۶۰۰۰ ہوگئی ہے۔ انقلاب کے بعد ہماری جمہوریہ کو جو فروغ ہوا ہے اس سے ہماری تہذیب کے اہم اجزا خصوصاً سوویٹ (یعنی اشتراکیت سے) ادب کو نئی قوت پرواز حاصل ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں اشتراکی اور پرولتاری ادب کے نقطۂ نظر سے وہی دور شمار میں آتا ہے جو اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد شروع ہوا۔ ازبکستان کے مزدوروں کو جنگ عظیم سے پہلے کے دور کی جو ادبی دولت ورثے میں ملی وہ بہت ہی حقیر تھی۔ اس مسئلے پر بہت وقت ضایع نہ کرنا چاہیئے۔ ہم اس گروہ کی جو "جدید" کہلاتا ہے، ادبی کارگذاری کی ایک مختصر سی تشریح کئے دیتے ہیں، کیونکہ یہی ایک حلقہ ہے جس کی تصانیف ہمارے ملک کی ادبی زندگی پر اپنا نقش چھوڑ گئی ہیں، اگرچہ انھیں نے ان لوگوں کو جو پرولتاری اور اشتراکی ادب کے مخالف تھے لڑنے کے لئے ہتھیار بھی بہم پہنچائے۔

زار کی حکومت نے جب ازبکستان فتح کیا تو یہاں سرمایہ دار تاجروں اور کارخانہ داروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا، جس نے بہت فروغ پایا، اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے جو روسی سرمایہ دار اور دوسرے ملکوں کے تاجران کے رستے میں ڈالتے تھے اُنھوں نے قومیت کا یہ نظریہ پیش کیا کہ اپنے ملک کی منڈیوں پر ہمارا قبضہ ہونا چاہیئے۔ اسی زمانے سے ایک ذہنی اور معاشرتی تحریک شروع ہوئی جو ان سرمایہ داروں کے رجحانات اور حوصلوں کو صحیح طور پر ظاہر کرتی ہے۔ وہ گروہ جو "جدید" کہلاتا ہے عمل اور تصورات کے اعتبار سے اس تحریک کی نمائندگی کرتا تھا۔ قوم پرستوں نے اس گروہ اور اس تعلیم کو آسمان پر چڑھا دیا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد انقلاب کے مخالف سرمایہ دار اور وہ لوگ جو ان کے خیالات کو ظاہر کرتے تھے اپنے عمل اور اپنی تصانیف کے ذریعے سے اسی قومیت کا چرچا کرتے رہے اور معلوم ہوتا تھا کہ پرولتاریہ اور سوویٹ ریاست کے دشمن ہیں۔

ازبکستان کی پہلی ادبی انجمن "چغتائی جماعت" تھی۔ اس کے بیشتر اراکین بورژوا (سرمایہ دار) طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے جو سوویٹ اقتدار کی مخالفت اور ترک اتحاد کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس ادبی تحریک کے خاص عقائد معلوم کرنے کے لئے کافی ہے کہ ہم ان متعدد مضامین پر جو انھیں عقائد کے اثر میں لکھے گئے تھے ایک نظر ڈال لیں۔ اور ان کی علم نما تحقیقات کو جانچ لیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان، املاء اور ادب کے تمام مسائل پر چغتائی اور ترک اتحاد کے نقطۂ نظر سے غور کیا جانے لگا۔ انقلابی دور کے ابتدائی زمانے میں بھی قوم پرست اور بورژوا انشا پردازوں نے اپنے خیالات کو چھپایا نہیں، بلکہ اس بہانے سے کہ تہذیبی ورثے کے متعلق تحقیق کرنے سے ادبی بحث میں گہرائی پیدا کی جا رہی ہے ان کی تبلیغ کرتے رہے۔ اسی علمی تحقیق کی آڑ لے کر وہ احمد یسوی جیسے صوفی اور اسی قسم کے دوسرے پرولتاری مصنفوں کی نسبت دعوے کرتے ہیں کہ وہ غریبوں کے حامی تھے۔ اگر ہم اس کشمکش پر جو قوم پرستوں نے ان تصورات کی بدولت ۱۹۲۵، ۱۹۲۶ اور ۱۹۲۷ میں پیدا کی ایک نظر ڈالیں تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ان لوگوں کا مقصد گذشتہ زمانے کو ایک عینی شکل دینا ہے۔ دیکھئے توفیق فکرت یسوی کی نسبت کیا کہتا ہے:۔

"ہمارے ادب کا بانی یسوی مظلوموں میں سے ایک مظلوم تھا۔ اس نے آہیں بھریں اور آنسو بہائے، کیونکہ مظلوموں کا دکھ اس کا اپنا دکھ تھا۔ یسوی ... اپنے زمانے کے حاکم طبقوں کی ملامت کرتا ہے اور ہم کو چاہیئے کہ اسے اس کا ایک وصف سمجھیں۔ اسی بنا پر ہم اسے ایک غریبوں کا شاعر ٹھہرا سکتے ہیں جس کے کانوں میں درد کی صدا آئی اور اس کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ (غریبوں کے) دشمنوں کی ملامت کرتا ہے اور ان کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔" (رسالہ "تعلیم و معلم"، نمبر ۶، ۱۹۲۷)

ان قوم پرستوں نے جو ادبی ورثے کے سرمائے سے تجارت کرتے ہیں اپنی جد و جہد کو اب تک ختم نہیں کیا ہے۔ علی محمد نامی ایک انشا پرداز فکرت کے اسی خیال کی رسالہ "اُز ترمنکوما" (یعنی "کتاب در انقلاب")

میں حمایت کرتا ہے۔ چونکہ اس کا ارادہ ہے کہ قومیت پر ازبک ادب کی بنیاد رکھے، وہ اپنی تاریخ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایسی نازیبا چالیں بھی چلتا ہے کہ ایرانی اور عرب شاعروں اور عالموں کو کہدے کہ وہ ازبک اور ترک تھے۔

پرولتاریہ ادب کا ارتقا غیر ملکی اثرات اور بورژوآ انشا پردازوں سے جو کشمکش ہوئی اس سے ازبکستان کے سوویٹ ادب کو فروغ ہوا اور اشتراکی انشا پردازوں نے اپنی تنظیم کرلی۔ انقلاب کے ابتدائی زمانہ ہی سے، اگرچہ بورژوآ انشاپردازوں کا بہت چرچا تھا، چند شاعر جن میں افلیانی، صوفی زادہ، حمزہ، حکیم زادہ وغیرہ ممتاز تھے سوویٹ انقلاب کے متعلق گیت گانے لگے . . . اور آہستہ آہستہ اشتراکی انشا پرداز اپنے حریفوں پر حاوی ہوتے گئے۔ ۱۹۲۳-۲۴ میں پرولتاری ادب کو نئی دولت ملی، یعنی غیرتی اور شمسی جیسے نوجوان شاعر نمودار ہوئے۔ اس وقت جب کہ باشیچی گروہ فساد برپا کر رہے تھے اور بورژوآ انشا پرداز علانیہ سوویٹ حکومت کی مخالفت کر رہے تھے، غیرتی کی یہ نظم سننے میں آئی جو اس نے مزدوروں اور کسانوں کے لئے لکھی تھی۔

"کسانوں اور مزدوروں کا اتحاد ہوگیا ہے، انھوں نے عظیم الشان سرخ جھنڈا لہرایا ہے، اپنے ہل اور کاشتکاری کے اوزار چھوڑ کر ایک فوج کی طرح آگے بڑھے ہیں" (ماخوذ از نظم "آج")۔ اس کے بعد جب بورژوآ انشا پردازوں نے ازبکستان کے سب سے زرخیز علاقے فرغانہ کی نسبت مشہور کیا کہ وہ بالکل اُجڑ گیا ہے تو غیرتی نے اپنی نظم "فرغانہ" میں ان کو اس طرح سے جواب دیا: "وہ اندھیری راتیں ختم ہوگئی ہیں جب فرغانہ پر ظلم و ستم ڈھایا جا رہا تھا، جب اس کے ایک سرے سے دوسرے تک قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جب اس کا دل غم و غصے اور تقدیر کی شکایتوں سے بھرا ہوا تھا اور جب وہ معصومانہ انداز سے ہر طرح کا ظلم سہتی تھی۔"

اشتراکیت کی تعمیری کوششوں میں جو کامیابی ہوئی اس کی بدولت پرانے انشاپردازوں میں اور بھی پھوٹ پڑگئی ہے۔ اب ان میں بعض ایسے ہیں جو سوویٹ کی حمایت پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور سوویٹ کے مسائل اور کارگزاریوں پر مضامین لکھتے ہیں، اگرچہ انھوں نے سوویٹ کا رنگ پوری طرح اختیار نہیں کیا ہے۔

پھر یہ محسوس کیا گیا کہ ایک ایسی ادبی انجمن قائم کرنا چاہئے جس کا مقصد انشا پردازی کو فروغ دینا ہو۔ ۱۹۲۶ میں سمرقند میں ایک انجمن کی بنا ڈالی گئی جو "قزل قلم" (یعنی "سرخ قلم") کہلاتی ہے۔ سمرقند اس وقت ازبکستان کا دارالحکومت تھا، اور اس انجمن میں شہر کے تمام انشا پرداز اور بیشتر ازبک مصنف شامل تھے۔ لیکن انجمن کی شیرازہ بندی کے لئے کوئی اصول یا مقصد پیش نظر نہیں تھا۔ اس کے اراکین میں وذل محمودی اور التائی باتو جیسے انقلاب کے چھپے دشمن اور غیرتی، شمسی، اوئی غون، ایڈن، ارگاش اور تاش پلت جیسے اشتراکیت پرست نوجوان شاعر شامل تھے۔ اسی میں چند ہمدرد، نقاد اور ایسے اشتراکی انشاپرداز تھے جو بعد کو بہت مشہور ہوئے، جیسے ضیا سعیدوف، انک بائی، ہاشمو وغیرہ۔ "قزل قلم" میں داخل ہونے کے بعد انشا پردازوں نے اپنے عقائد، تصورات اور مذاق کے مطابق مختلف حلقے بنائے، اور ازبکستان کی ادبی تاریخ میں "قزل قلم" کا دوران مختلف حلقوں کی "خونریز" جنگ کی وجہ سے نمایاں ہے۔ یہ انجمن اپنے گرد ان انشا پردازوں کو جمع نہ کرسکی جو بین طور پر اشتراکی ہوگئے تھے، اس میں اتنی جان نہیں تھی کہ نوجوان انشا پردازوں کو جوش دلائے اور پرولتاری ادب کو فروغ دے۔ وہ بورژوا اور انقلاب کے دشمن بن کر اس انجمن میں شامل ہوئے تھے ان اشتراکیوں کی چشم پوشی اور رواداری سے جو اس انجمن کے نگران تھے فائدہ اٹھا کر قومیت کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کا زہر نوجوانوں تک پھیل گیا۔ آخر کار ازبکستان کے مصنفوں کی ایک نئی انجمن بنائی گئی جو "اوزاپ" کہلاتی ہے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ادبی تحریک کو تقویت پہنچائے اور عقائد اور اخلاق کو مستحکم کرے۔

"اُوزاپ" ہی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی کہ کارخانے کے مزدوروں کے لئے پڑھنے کو کچھ ہونا چاہیئے۔ انشا پردازوں کا بہت بڑا حصہ اشتراکی زندگی اور اس کے مسائل پر غور کرنے لگا، اور ایسی تصانیف کی تعداد بہت بڑھ گئی جن کا موضوع اشتراکیت کی تعمیری کوششیں تھیں۔ ضیا سعیدوف اور معروف نے اپنی تصنیف "تاریخ نے کہہ دیا ہے" شائع کی، اور اسی زمانے میں اسماعیلوف نے ایک کتاب لکھی جس میں کپاس بونے والوں کی جنگ آزادی کا سارا حال تھا۔ لیکن "اوزاپ" کے رہبروں نے کئی غلطیاں بھی کیں انھوں نے پرانے انشا پردازوں کی طرف التفات ہی نہیں کیا۔ وہ یہ بھول گئے کہ اشتراکی معاشرت کی تعمیر اور

توسیع کے ساتھ حالات بدل گئے ہیں، اور اس کا پرانے انشا پردازوں کے خیالات پر بھی بہت اثر پڑا ہے بجائے اس کے کہ ان انشا پردازوں کو جو ہمدرد تھے یا ہر جماعت سے الگ تھے سہارا دے اور اپنی طرف کھینچے، "اوزاپ" انتظامی مسائل میں محو رہی۔

ایک عظیم الشان کوشش | ۲۳ اپریل ۱۹۳۲ کو اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے جو فرمان جاری کیا (جس سے ادبی معاملات میں پابندیاں بہت کم کر دی گئی تھیں) اس نے ازبکستان کے اشتراکی ادب کے لئے ایک نیا رستہ کھول دیا۔ اس تاریخی فرمان کو ایک حقیقت بنانے کی کوشش نے ازبکستان کی ادبی نشو و نما میں بہت مدد دی۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھا گیا کہ انشا پردازوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ان کی انجمن (یعنے "اوزاپ") کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا۔ اس وقت اس کے اراکین کی تعداد ۲۰۰ ہے، جس میں سے زیادہ تر نومشق ہیں، اور انھوں نے عام طور سے اشتراکیت کی تاریخ کے کارنامے بیان کرنے کے لئے اپنا قلم اٹھایا۔ بے ساقی، فتح اللہ فلام، صالح صابری، زاہدوف جیسے انشا پرداز کارخانوں کو چھوڑ کر ادب کے میدان میں طبع آزمائی کے لئے نکلے اور "اوزاپ" کے حلقے میں شامل ہوئے۔ ان کی ابتدائی نظمیں تو اوسط درجے کی تھیں لیکن اب ان میں سے ہر ایک کسی نئے اور خاص طرز کا موجد مانا جاتا ہے۔ پھر بھی ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے نوجوانوں میں جو کام کیا ہے وہ ناکافی ہے اور اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔

مرکزی کمیٹی کی تاریخی فرمان کے بعد جو دور شروع ہوا اس میں ان قوموں کے کئی انشا پرداز نمودار ہوئے جو اقلیت میں ہیں۔ صرف ایک شہر تاشقند میں اس وقت ۱۷ یہودی انشا پرداز ہیں، حالانکہ انقلاب سے پہلے یہودیوں کا ادب شمار ہی میں نہ آتا تھا۔۔۔ اسی طرح ازبکستان کے روسی بھائیوں نے بھی بہت سی نئی کتابیں شائع کی ہیں، لیکن ہم ان سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کا نقطہ نظر بہت محدود ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ ہمارے کام میں رکاوٹیں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

اسی دوران میں پرانے کہنہ مشق اور نوجوان انشا پردازوں نے اپنی تصانیف کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے۔ شاعری اور ڈراما کے میدان میں بھی بہت کچھ کیا گیا ہے جس سے گذشتہ دور کا کوئی کارنامہ لگا نہیں کھاتا۔ پرانے انشا پرداز جو آپس کے جھگڑوں سے عاجز آ کر ادبی دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے، یا "اوزاپ" کی فرقہ بندی

اور حکومت کو اس طرح سراہا جیسا کہ یہ انجمن کرتی ہی برا سمجھتے تھے پھر ادبی حلقوں میں شامل ہو گئے اور تخلیقی کاموں میں شریک ہونے لگے۔

اب ہماری ادبی تحریک کے لئے ایک علمی بنیاد تیار کر لی گئی ہے، اور یہ ہمارا ادبی تحقیق کا ادارہ ہے۔ اس ادارے کے نوجوان محقق ادب کی تاریخ، ادب عوام اور ہمارے کل ادبی ورثے کا مطالعہ کر رہے ہیں اس کانگریس سے پہلے یہ ادارہ مارکس اور اینگلس کے نظریوں کی ترجمانی میں مشغول تھا، اور اس نے ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی ہے جو نوجوانوں کو مارکس اور لینن کی تعلیمات میں تربیت دینے کے لئے بہت مفید ہے۔ اس ادارہ نے "منتخبات از خوارزم" کے طور پر ادب عوام کی منتخب چیزیں اور تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا ہے۔ اس نے روس کے ادبی شاہکاروں کا ترجمہ کیا ہے اور بیرونی ممالک کے انقلاب پسند مصنفوں، خصوصاً لہوتی، سے بھی واقفیت پیدا کی ہے۔

لیکن ان تمام ہمت افزا علامتوں کے باوجود اس میں شک نہیں کہ ازبکستان کا پرولتاری ادب سیاسی اور معاشرتی ضروریات کو دیکھتے ہوئے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

بعض حلقے ایسے تھے جنھوں نے مرکزی کمیٹی کے مذکورہ بالا فرمان کی مخالفت کی۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس پر عمل کرنے سے پرولتاری ذہنیت کو صدمہ پہنچے گا۔ بعض اس حقیقت کو بھول گئے کہ پرولتاری اور بورژوا قومی مقاصد میں مصالحت نہیں ہو سکتی، اور وہ ان پرانے انشا پردازوں کی بھی مدح سرائی کرنے لگے جنھوں نے ابھی تک پرولتاری ہونے کا کوئی ثبوت نہیں دیا تھا۔ اس طرح ازبکستان کے ادب کی ایسے ماحول میں شیرازہ بندی ہوئی جو مختلف طبقوں کی جنگ کے شور سے گونج رہا تھا۔ قوم پرست انشا پرداز مدت تک ازبکستان کے ادب کو اپنے رنگ میں رنگتے رہے۔ پرولتاری انشا پردازوں میں اب تک ایک ہم آہنگ اور منظم جماعت کے اوصاف پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اشتراکی نظام کی کامیابی سے مرعوب ہو کر سوویٹ حکومت کے مداح بن گئے، بعض شروع ہی سے اشتراکیت کے معتقد تھے۔ بہتیروں نے ابھی مشق شروع کی ہے۔ لیکن سب اپنے اپنے طرز میں پرولتاری فلسفے اور اپنی تہذیب کی ایسی آمیزش کرنا چاہتے ہیں کہ دونوں ایک ہو جائیں۔ اشتراکیت کی تعمیری کوششیں جاری ہیں، ترقی کی رفتار روز بروز تیز

ہوتی جاتی ہے، صنعت اور زراعت کو ایسا فروغ ہوا ہے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہ ملے گی، اور نئی زندگی کی یہی صفات انشا پردازوں کی ذہنی محرک ہیں۔

سیاسی اور معاشی تغیرات کی بدولت معاشرتی حالات نے ایک بالکل نیا رنگ اختیار کیا ہے، اور اس اعتبار سے ازبکستان کے انشا پردازوں کو اپنے فرائض انجام دینے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس وقت ان کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ معاشرتی انقلاب کو سمجھیں اور اس کے اصولوں کو عوام کے ذہن نشین کرنے کے لیے اپنی شاعرانہ استعداد سے کام لیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں مارکس، انگلس، لینن، اور ستالن کی تصانیف کا مطالعہ کرنا، انھیں اپنانا اور اپنے عقائد میں گہرائی پیدا کرنا ہے۔

ادب کے مختلف شعبے | تصانیف اور مصنفوں کی تعداد دیکھتے ہوئے ازبکستان کے اشتراکی ادب میں شاعری کو سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہے۔ نوجوان انشا پرداز تقریباً ہمیشہ اسی سے ابتدا کرتے ہیں، اسی کا معیار بڑھانے اور اسی کو صحیح ڈھرے پر لانے کی خاص کوشش کی جاتی ہے۔ اس پر تنقیدی نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک طرف ترقی ہی ترقی دکھائی دیتی ہے تو دوسری یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پرولتاری شاعروں میں زندگی کو سمجھنے کی استعداد کم ہے، اور اپنا کلام چھپوانے کا شوق ایسا زبردست ہے کہ شاعر خیالات کی قدر اور گہرائی کا جیسا کہ چاہیے خیال نہیں رکھتے۔ مغربی کی نظم "ماں کے نام خط" اوئی گان کی "ژانتے میر" اور "اشتراکیت کے سرسبز باغ"، کا فور غلام کی "کوکان محض ایک جال نہیں ہے"، حامد کی "وادی مسرت" اور "قوت"، ایبک کی "دلبر ہمارے زمانے کی ایک لڑکی"، الیک اور حسن پلات کی ایک دو نظمیں خاص ادبی کارنامے ہیں جو اشتراکیت اور اس کے سورماؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن یہ خامیوں سے پاک نہیں ہیں، خاص طور پر اس اعتبار سے کہ وہ زندگی اور مختلف طبقوں کے باہمی تعلقات کی نسبت اکثر غلط فہمی پیدا کرتے ہیں۔

پہلی صف کے ادیبوں میں بھی اسی طرح کے نقائص پائے جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہم بے شک زندگی کی ایک تصویر دیکھتے ہیں اور مزدوروں کی فتوحات کا بیان پڑھتے ہیں، مگر ہمیں یہ نہیں بتایا جاتا کہ مزدوروں نے اپنا مقصد کس طرح حاصل کیا۔ عملی جدوجہد، لڑائی کی اصل صورت، جیتے جاگتے سورما، یہ

چیزیں ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ سورما یہ تو محسوس کرتا ہے کہ پرانی زندگی کو بدلنا اور نئی زندگی تعمیر کرنا ہے، پردہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا ہے، اور یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں اتنا مادہ ہے بھی کہ ماحول کو اپنے قابو میں کرلے ہمیں جنگ کا نقشہ نہیں دکھایا جاتا، ملاقاتوں اور ارادوں کی خبر سنائی جاتی ہے۔

وہ تصانیف جن کا موضوع روئی کا مسئلہ ہے بہت سطحی ہیں، اور اس کی کاشت پر اسی بے پروائی سے ایک خالص اصولی بحث کی گئی ہے جیسے کہ بورژوا طبقے کے ادنیٰ لوگ کرتے ہیں۔ معاملے کی بات کم ملتی ہے، روئی کی مدح سرائی میں انداز اور مناسبت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ کوئی اسے "سفید سونا" کہتا ہے، کوئی "وجد"، کوئی "پھول" اور کوئی "مسرت"، اور اس طرح روئی ایک دیوتا بنادی گئی ہے۔

اُن نظموں میں جو ایسے مزدوروں پر لکھی گئی تھیں جنھوں نے کسی بڑی صنعتی مہم میں شرکت کی تھی یہی خامیاں، ایسے ہی مصنوعی اور اعلیٰ انسانی صفات سے محروم کیرکٹر پائے جاتے ہیں۔ دوسری طرف صنعتی اور مزدوروں کی زندگی پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ یہاں پر ہمیں صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ ازبکستان کے ادیب مزدوروں کے طبقے کو ادبی حیثیت دینے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

اسی طرح زبان کا حق بھی ادا نہیں کیا جاتا۔ اس میں ملکہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اور عوام کی بولی کا مطالعہ بھی نہیں کیا جاتا۔ روسی کے مقابلے میں ازبک زبان بہت کم نشوونما یافتہ ہے، اور اس کا مطالعہ صرف اکتوبر ۱۹۱۷ کے بعد اور خصوصاً پچھلے چند سالوں میں تھوڑا بہت کیا گیا۔ چونکہ ادبی اور بول چال کی زبان میں بڑا فرق ہے، اس لئے یہ مسئلہ اور بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے باوجود ادیب اسے کیوں اس طرح نظرانداز کرتے ہیں۔

نظم کے مقابلے میں نثر کی ترقی اور بھی کم ہوئی ہے۔ انشا پردازوں نے نثر پر محنت کرنا ابھی حال ہی میں شروع کیا جب کہ حکومت نے ایک مقابلے کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ بہترین نثر کی تصنیف پر انعام دیا جائے گا۔ عبداللہ قادری، جو روزمرہ میں استاد مانا جاتا ہے، غفور غلام، شمسی، غیرتی، عبداللہ قہر، صابر و دا اور دوسرے نوجوان ادیبوں نے جی توڑ کر ادب کے اس شعبے کو فروغ دینے اور اس میں ملکہ حاصل کرنے کی

کوشش شروع کردی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے مشہور انشا پرداز صدرالدین عینی نے "غلام" کے عنوان سے ایک ناول لکھا ہے اور اسے کانگریس کے نام معنون کیا ہے۔

باوجود اس کے کہ نثر کی طرف حال ہی میں توجہ کی گئی ہے، اشتراکی نثر کے مضامین اور اسلوب قوم پرست بورژوا انشا پردازوں کی نثر سے بالکل مختلف ہیں، بیشتر تصانیف میں ہم نئی زندگی کا اثر دیکھتے ہیں اور زبان اکثر بول چال کی زبان سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ مگر ہمیں اس کا بھی اقبال کر دینا چاہیئے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی اوچھاپن اور گھڑت بہت ہے۔ عبداللہ قادری، ایک مشہور اور کہنہ مشق انشا پرداز فرمان مذکور کے بعد نئی زندگی کے جاں بخش دریا میں کود پڑا ہے۔ اس کا مختصر سا مضمون، "میں سورج سے بھی لڑنے کو کھڑا ہو جاؤں گا" اور اس کا افسانہ "ماجد کمیں" اشتراکیت کی تعمیری کوششوں سے بحث کرتے ہیں اور نئے حوصلوں سے معمور ہیں۔ لیکن اگرچہ ان سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مصنف نے نیا مذہب اختیار کرلیا ہے، ان میں بہت سے نقائص بھی ہیں۔ "میں سورج سے بھی لڑنے کو کھڑا ہو جاؤں گا" معاشرتی حوصلوں میں سے ایک کو بھی واضح تصور یا ارادے کی شکل میں پیش نہیں کرتا، اور اس لئے مزدوروں کی تعلیم و تربیت میں کام نہیں آسکتا۔ اس مضمون کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو نئے حوصلے پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ایک طرح سے جوا کھیل رہے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرتی حوصلوں کا حلیہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے۔

اپریل ۱۹۳۲ء سے بعد کی نثر میں ہمیں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان کا سبب انشا پردازوں کی کمسنی مشق کی کمی اور زبان پر حاوی ہونے کی دشواریاں ہیں، اور چونکہ یہ ادب کے شباب کا زمانہ ہے، ایسی خامیوں کا ہونا لازمی ہے۔ بعض نقائص ایسے ہیں جن کی ذمہ داری اس اثر پر ڈالی جا سکتی ہے جو پرانے انشا پردازوں کو اب تک حاصل ہے۔ اس وقت ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ ہمارے انشا پرداز زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچنے کے اہل نہیں ہیں، اور حقیقت نگاری بھی ان کے بس کی بات نہیں۔ مختلف طبقوں کی باہمی جنگ کے جن مظاہر کا انھوں نے خاکہ اتارا ہے وہ بالکل من گھڑت ہیں ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ کسی سیرت کا ایسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے جو دل نشیں ہو سکے، اشتراکی شخصیت کے مثالی نمونے پیش کرنے میں بھی وہ

بہت ناکامیاب ہوئے ہیں۔ ناولوں اور افسانوں میں جو اشخاص ہمیں ملتے ہیں وہ کسی خیال کے مطابق بنائے ہوئے اور اس وجہ سے مصنوعی معلوم ہوتے ہیں، زندہ آدمیوں سے ان کو دور کی بھی مشابہت نہیں۔

تھیٹر اور ڈراما | ازبکستان میں تھیٹر اور ڈراما براہ راست وہاں کی اشتراکی پارٹی کی قائم کی ہوئی تحریکیں ہیں اور اسی کی بدولت چل رہی ہیں، اگرچہ وہ مسائل جو ڈراما کے موضوع ہوتے ہیں پرولتاری ہیں اور ناٹک کا فن قومی۔ اس طرح تھیٹر اور ڈراما کی بنیاد بہت مستحکم ہے۔ اشتراکی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے پانچویں عام جلسے میں کومریڈ اکراموف نے ایک تقریر کی تھی جس میں انھوں نے کہا:-

"مجھے یاد ہے کہ انقلاب سے پہلے کسی شہر میں ڈراما کا دکھایا جانا بہت ہی غیر معمولی واقعہ تھا، اس وقت ازبکستان میں تھیٹر اور ڈراما کی حیثیت علمی اور تعلیمی ہو گئی ہے۔ مختلف شہروں میں تماشے کرائے جاتے ہیں اور فن کے نقطۂ نظر سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا ناٹک بیٹن خیمے کا کام کر رہا ہے۔"

دراصل اس وقت سے جب کہ روسی ڈراما نویسوں کے کارنامے ازبکستان میں دکھائے گئے ہیں یہاں ڈراما مزدوروں کو اشتراکیت کی تعلیم دینے کا ایک بہت با اثر اور کارآمد ذریعہ بن گیا ہے۔ ازبکستان کے تھیٹر میں گوگول، شیکسپیر وغیرہ کے ڈراما بہت خوبی اور کامیابی سے دکھائے گئے ہیں اور جس وقت سے ... تھیٹر قائم ہوا ہے ہمارے یہاں نہ اچھے ایکٹروں کی کمی رہی ہے نہ اسٹیج تیار کرنے والوں کی۔

اس وقت ازبکستان میں ۴۲ سرکاری تھیٹر ہیں۔ ان میں ناٹک کے شائقین کی وہ غیر ... جماعتیں شامل نہیں ہیں جو ملک کے ہر حصے میں پائی جاتی ہیں اور جو اپنے گرد ایسے تمام نوجوانوں کو جمع کرتی رہتی ہیں جن میں یہ فن سیکھنے کی استعداد ہے۔ یہ خوشگوار حالت ایک طرف تو اس سیاسی پالیسی کی کامیابی کا نتیجہ ہے جو لینن اور ستالن نے اختیار کی، اور دوسری طرف مزدوروں کے طبقے کی اس پوشیدہ استعداد کا جو انقلاب اور پرولتاری ڈکٹیٹر شپ کی بدولت ظہور پذیر ہوئی۔

اس وقت جو ڈراما دکھائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر روسی تصانیف کے ترجمے ہوتے ہیں لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سب سے قابل قدر وہی ڈرامے ہیں جو ازبک انشا پردازوں نے تیار کئے ہیں۔ ان ڈراما نویسوں میں سب سے ممتاز ضیا سعید وف، یاسین اور عبداللہ ذکور ہیں۔

اسی طرح ازبکستان کے مزدوروں نے موسیقی اور اُوپیرا[۵] کی ترقی کے لئے بھی زمین تیار کی ہے۔

لیکن اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ہم واقعی بہت آگے بڑھ گئے ہیں، انشاپردازی کی طرح ہمارے ڈراما میں بھی بہت سی خامیاں ہیں۔ ایک ایسا وقت ضرور آئے گا جب ہم زندگی کی حقیقتوں کو نفاست کے ساتھ ایسے ڈراماؤں میں دکھا سکیں گے جن میں "خیالات کی گہرائی، تاریخ کا صحیح اور سچا تصور، شیکسپیر کی سی زندہ دلی اور عملی جدوجہد کی ایک تصویر ہو"، مگر اب تک جو ڈرامے لکھے گئے ہیں ان کے ہیرو بس نام کو آدمی ہوتے ہیں، وہ نہ ہم کو جوش دلا سکتے ہیں نہ ہم پر اثر کر سکتے ہیں، اس لئے کہ ڈراموں میں حقیقی زندگی کا عکس نہیں اتارا جاتا۔ ان کے اشخاص اوچھے، من گھڑت ہوتے ہیں، اور محض پروپگنڈا، اور تقریریں کرنے کے لئے اسٹیج پر لائے جاتے ہیں...

اس وقت بورژوا قوم پرست ادیبوں کا جم کر مقابلہ کیا جا رہا ہے، اور اسی طرح ان تمام ادبی تحریکوں کا جو مارکس اور لینن کی تعلیم کے خلاف ہیں، اور ادب کے ہر شعبے میں سوویٹ کے انشاپردازوں کا پلہ بھاری ہو رہا ہے تندرست جسم اور صحیح دماغ رکھنے والے انشاپرداز جنھوں نے سوویٹ ادب کو ترقی دینے کا بیڑا اٹھایا ہے روز بروز بڑھ رہے ہیں اور ازبک مزدوروں میں سے نئے ادیب آ کر ان کی ہر کمی پوری کرتے رہتے ہیں۔ یہ علامت ہے اس حقیقت کی کہ ہماری تاریخ کے اس عظیم الشان دور کی ادبی حیثیت بھی مناسب ہوگی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انشاپردازوں کو چاہیئے کہ مارکس، لینن اور ستالن کی تصانیف کا زیادہ گہرا مطالعہ کریں اور اپنی عام واقفیت بھی بڑھاتے رہیں۔ انھیں روس اور اشتراکی وفاق کی دوسری ریاستوں کے ادب کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے اور نوع انسانی کے عام ادبی ورثے کو بھی کام میں لانا چاہیئے ؛



---

[۵] اوپرا ڈراما کی وہ قسم ہے جس میں ساز، گانا اور ناٹک تینوں کی آمیزش ہوتی ہے۔

ادا یا قضا؟

صبح کا وقت تھا۔ حکیم اعجاز حسین کے مکان کے سامنے والی گھنی نیم پر دھوپ پھیل چکی تھی۔ مگر سورج کی کرنوں میں ابھی گرمی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک تخت پر میلی سی چادر بچھی تھی۔ جس پر جا بجا پیک اور روشنائی کے دھبے تھے۔ صدر میں گاؤ تکیہ رکھا تھا جس کے سامنے حکیم صاحب کرتہ پائجامہ پہنے بیٹھے تھے۔ ان کا سن چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ ڈاڑھی کے بال سفید ہو چلے تھے۔ تخت کے ایک کونے پر دیہاتی وضع کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ ایک اور آدمی تہمت باندھے نیم کی جڑ پر بیٹھا تھا۔

حکیم صاحب چلم کے انتظار میں تھے۔ بار بار مکان کے دروازے کی طرف دیکھتے۔ اتنے میں چھدو چلم لیے ہوئے نکلا۔ راستہ میں ایک کتا ٹانگیں پھیلائے لیٹا تھا۔ چھدو نے چپکے سے ایک ڈھیلا اٹھا کر مارا۔ نشانہ پورا پڑا اور کتا پیں پیں کرتا ہوا بھاگا۔

چھدو۔ "جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے۔ جب دیکھو بیچ میں پڑا ہے۔"

حکیم صاحب۔ "ابے چلم بھی لائے گا۔"

چھدو کے انداز سے ذرا بھی نہ معلوم ہوا کہ اس نے آواز سن لی۔ اسی طرح خرام خرام بلکہ مخرام پر عمل کرتا ہوا بڑبڑاتا ہوا آیا۔ حقہ ایک کنارے رکھا تھا اس پر چلم لگا کر حکیم صاحب کے سامنے رکھ دیا۔

حکیم صاحب۔ "میاں براتی! ذرا حقے کی نبض تو دیکھنا۔"

میاں براتی جو تخت کے کونے پر بیٹھے تھے بہت مستعدی سے آگے بڑھے۔ حقہ آگے سرکا کر دو ایک کش لگائے۔ پھر چلم اتار کر زمین سے ایک لکڑی اٹھائی اور چلم کے نیچے ڈال کر تواا چکا دیا۔ پھر منہ اوپر اٹھا کر چلم کے نیچے زور سے پھونک ماری۔ کچھ راکھ اور چنگاریاں اڑیں۔ کچھ ان کی داڑھی اور کندھے پر بھی پڑیں مگر انھوں نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا' اور چلم حقہ پر لگا ئی ایک لمبا سا کش کھینچا۔

اتنے میں ایک صاحب شرعی پیجامہ پہنے گذرتے دکھائی دئے۔ حکیم صاحب نے پکارا۔

" حافظ جی ! کہاں ؟ "

حافظ جی گویا منتظر ہی تھے - آواز سنتے ہی پلٹ پڑے -

حافظ جی - " ذرا لکھنؤ گیا تھا - عجب قہر خدا چھایا ہوا ہے - طاعون کا اتنا زور ہے - کہ ہزاروں لاشیں روز نکل جاتی ہیں - نہلانے اور دفن کرنے والے نہیں ملتے - آج کل تو بس شہدوں کی بن آتی ہے "

براتی - " اللہ رحم کرے - ہمارا قصبہ تو ابھی تک بچا ہوا ہے - اور اللہ چاہے گا تو بچا ہی رہے گا "

حافظ جی - " کیا خاک بچا ہوا ہے ؟ ننھو رات کو مر گیا - دو روز سے بخشی کی بیوی کو بخار تھا - کل رات میں گٹھلی نکھائی دی ...... "

حکیم صاحب - " کون بخشی ؟ "

حافظ جی - " وہی جو ٹھنٹھنا ٹھنگنا ہے - اکہ ہانکتا ہے - محرم میں علم اٹھاتا ہے "

حکیم صاحب - " ارے اس کی بیوی ! خدا کرے اچھی ہو جائے - علاج کس کا کر رہا ہے "

حافظ جی - " خدا جانے - یہ لوگ کسی کی سنتے ہیں - میرے پاس تعویذ لکھوانے آیا تھا - لکھ دیا ـــــ اماں براتی حقہ کیسا آ رہا ہے ؟ ذرا ادھر بڑھانا ـــ حکیم صاحب ! ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ بیماری ویاری نہیں - ہمارے ہی اعمالوں کا نتیجہ ہے - سنا ہے کل جانو کی لڑکی بھاگ گئی "

حکیم صاحب - " اللہ کو یاد کرو - براتی ! وہ تعویذ لگ گئے "

براتی - " جی ہاں حکیم صاحب - ہندوؤں نے بھی مانگ مانگ کر لگائے - مگر نورو میاں نے یہاں نہیں لگانے دے "

حکیم صاحب خاندانی حکیم ہونے کے علاوہ قصبہ کے مشہور بزرگ شاہ ولایت حسین صاحب کے مرید و خلیفہ بھی تھے - لکھنؤ اور پاس پڑوس کے مقامات پر طاعون کا زور سن کر انھوں نے ایک نقش دافع طاعون لکھا ، پانچ سو کی تعداد میں لکھ کر قصبہ کے تمام گھروں میں لگانے کے لئے تقسیم کر دیا تھا - مگر نورو میاں جن سے حکیم صاحب سے خاندانی چلی ہوئی تھی - اس نقش کے خلاف ہو گئے اور کہنے لگے " وہی ہوتا ہے جو خدا ہوتا ہے - ان ڈھکوسلوں سے کیا حاصل ؟ "

حکیم صاحب نے براتی کا جواب سُن کر تاسف آمیز خاموشی اختیار کرلی۔

حافظ جی۔ ” یہ جھوٹ جو نہ کرائے تھوڑا ہے۔“

براتی کوئی جواب دینے والا تھا کہ اتنے میں بخشی تیز تیز قدم اٹھاتا آپہونچا۔

بخشی۔ سلام حکیم جی۔ گھر میں طبیعت بہت خراب ہے۔ طاعون ہوگیا ہے۔ کل تک، دو دن کے اندر سات آٹھ دوائیاں پلائیں۔ صدقے اتارے۔ سرھانے بکرا باندھا۔ یہ حافظ جی بیٹھے ہیں انھوں نے کیلے کے پتے پر تعویذ لکھ دیا ہے وہ گلے میں ڈالا۔ مگر کچھ فائدہ نہیں۔ (ہاتھ جوڑکر) اب حضور کے ہاتھ میں اسکی جان ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔

حکیم صاحب۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔ گھبراتے کیوں ہو۔ اچھی ہو جائے گی۔ چھدو!! گھر سے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگ لاؤ۔

چھدو لپکا ہوا ڈیوڑھی میں گیا۔ اور زور سے آواز لگائی۔

” حکیم صاحب نے طاعون والے کشتوں کا صندوقچہ مانگا ہے۔“

یہ صدا سنتے ہی گھر میں ایک بے چینی پھیل گئی۔ ماما روٹی توے پر چھوڑ۔ گھبرائی ہوئی ڈیوڑھی میں بھاگ آئی۔ اور چھدو سے دس بارہ سوالات کرڈالے۔ چھدو نے ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔ لڑکے آنکھ مچولا کھیل رہے تھے۔ حکیم صاحب کی بیوی نے ان کو بہت زور سے ڈانٹا۔ وہ سہم کر بیٹھ گئے۔ حکیم صاحب کی بیوی فوراً کہنے لگیں کہ میں بچوں کو لے کر کل ہی گوالیار اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔ حکیم صاحب کی ماں اونچا سنتی تھیں، ہر ایک سے پوچھنے لگیں کیا بات ہے کسی نے پاس جاکر چلا کر کہا کہ قصبہ میں طاعون پھیل گیا۔ یہ سنتے ہی چلا چلا کر استغفار پڑھنے لگیں۔

چھدو نے تھوڑی دیر کے بعد پھر پکارا ” کشتوں والا صندوقچہ دے جاؤ۔“

ماما تو آواز سُن کر بڑبڑانے لگی۔

” دیجاؤ، دیجاؤ کی رٹ لگائی ہے۔ میں ناحق پیدا ہوئی ایسے قصبہ میں۔ کبھی طاعون، کبھی ہیضہ مرے ماں باپ حیدرآباد کے رہنے والے تھے۔ وہاں کبھی ایسی بیماریاں۔۔۔۔۔۔“

حکیم صاحب کی بیوی نے ڈانٹ کر بلایا۔ اور ایک ٹین کا ڈبہ جس میں بہت سی پڑیاں اور شیشیاں تھیں اس کو دیا۔ وہ اسی طرح بڑبڑاتی ہوئی گئی۔ اور چھدو کو دے آئی۔

چھدو بیٹھا تنکے سے زمین کرید رہا تھا۔ ڈبہ پاتے ہی بھاگا۔ حکیم صاحب نے ڈنڈا لیا۔ اور بخشی سے بولے۔

"بسم اللہ، چلو، اللہ چاہے گا تو دوا دیتے ہی فائدہ ہوگا۔"

آگے آگے حکیم صاحب اور پیچھے پیچھے بخشی اور چھدو چلے۔ راستہ میں جو ملتا حکیم صاحب کو سلام کرتا اور بخشی سے یا چھدو سے پوچھتا کون بیمار ہے؟ بخشی ہر ایک سے بیان کرتا۔ دو ایک آدمیوں نے بخشی کو ڈھارس دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس مرض میں حکیم صاحب تو شرطیہ علاج کرتے ہیں۔

بڈھا رامداس جو اپنی کرانے کی دوکان کھولنے جا رہا تھا۔ ہاتھ میں کنجیوں کا گچھا لئے تھا یہ باتیں سن کر آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں سے کہنے لگا۔

پچھلے طاعون میں۔ جب ان کا سن سترہ اٹھارہ برس کا ہوگا، بڑے حکیم صاحب کے ساتھ مری ماں کو دیکھنے روز آتے تھے۔ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ ایسے ایسے بیماروں کو انکی دوا سے فائدہ ہوا جو دنیا بھر میں گھوم پھر کر مایوس ہوگئے تھے۔ رام نرائن کے بیٹے پر کوئی آتا تھا۔ اتنا خوبصورت لڑکا مگر کسی کام کا جو رہا۔ دن بھر بیری کے درخت کے نیچے کھیلا کرتا۔ واہی تباہی بکتا۔ اکثر دو دو دن تک کچھ نہ کھاتا۔ بچارا رام نرائن نہ جانے کہاں کہاں گھوم آیا۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جو اچھا بھی ہوا تو حکیم صاحب کے ایک چراغ سے۔

اتنے میں دو لڑکے سودا خریدنے آگئے۔ رامداس نے اپنی بات یہیں پر ختم کردی اور دوکان کھولنے لگا۔

اتنے عرصہ میں حکیم صاحب ایک ٹوٹے ہوئے مکان کے بیچ سے ہوکر جو اب مستقل راستہ ہوگیا تھا ایک کچے مکان کے پاس پہونچے۔ باہر چھپر پڑا تھا اس میں ایک گھوڑا بندھا تھا۔ بخشی کے ساتھ حکیم صاحب اندر گئے۔

مریضہ پلنگ پر بیہوش لیٹی تھی آس پاس بہت سے کپڑوں اور چیتھڑوں کا ڈھیر تھا۔ پلنگ کے پایہ کے برابر چنوں سے بھرا توبڑا رکھا تھا۔ بڑھیا ماں پاس بیٹھی تھی۔ اس نے فوراً حکیم صاحب کے پاؤں پکڑ لئے اور گڑگڑا کر کہنے لگی۔

"حکیم صاحب! اپنے بچوں کا واسطہ اس کو جلالو۔ ہائے ننھے ننھے بچے ہیں۔ ان کا کوئی سہارا نہیں میں کیا کروں کسی طرح یہ بچ جائے" یہ موئی بڑھیا ماں مرجائے۔ صبح ذرا ہوش آیا تھا رو رو کر کہنے لگی اماں! اب ہم مرجائیں گے۔ گھسیٹے اور بھورے تمھارے حوالے۔ پھر بولی حکیم صاحب کو بلا کر اور دکھادو زندگی ہوگی تو بچ جاؤں گی۔

حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ قارورہ دیکھا پھر ایک پڑیا نکال کر ایک تمچے میں ڈالی۔ اس پر شہد ٹپکایا اور مریضہ کو چٹانے کے لئے ماں کو دی۔ دوا پہونچتے ہی ایک تے ہوئی۔ حکیم صاحب کود کر الگ ہوئے ماں نے مریضہ کو سنبھالا۔ بخشی نے دوڑ کر راکھ لاکر تے پر ڈالی۔ دونوں بچے جو دور پرے سہمے کھڑے تھے ماں کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔ مریضہ کو کچھ ہوش آگیا اور کراہنے لگی۔ حکیم صاحب نے وہی دوا ایک پڑیا میں بخشی کو دی کہ شام تک چٹاتے رہو۔ گلٹیوں پر لگانے کا لیپ کا نسخہ لکھا۔ اور یہ کہہ کر کہ "شام کو دیکھنے پھر آؤں گا" اس درمیاں میں اگر طبیعت بگڑے تو حال کہنے فوراً آنا" حکیم صاحب چلے گئے۔

شام تک دو اور مریضوں کی خبر آئی۔ حکیم صاحب دیکھنے گئے، نسخہ لکھ کر اور ضروری ہدایات دیکر چلے آئے۔ شام کو بخشی کے یہاں کا ایک اور پھیرا کیا۔ وہاں سے آکر کشتے اور دوائیاں تیار کرنے کا سامان کرنے لگے۔

(۲)

اس واقعہ کو ایک مہینہ ہوچکا تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ مگر اب بھی حکیم صاحب کے مطب میں چھ سات ڈولیاں مریضوں کی رکھی تھیں۔ کچھ اور لوگ تھے جو حال کہنے آئے تھے۔ حکیم صاحب ابھی قصبہ کا چکر لگا کر واپس آئے تھے فوراً پھر مریضوں کے دیکھنے میں مشغول ہوگئے۔ کسی کو نسخہ لکھ دیا۔ کسی کو اپنے پاس سے دوا دی۔ اتنے میں تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا، سفید کرتا، اور بلا پھندنے کی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے مطب

میں آیا۔ حکیم صاحب اس پر نظر پڑتے ہی چونک کر بولے۔

"کیوں سلطان؟ خیریت ہے"

سلطان۔" دو بجے سے بجیا کو بہت تیز بخار چڑھا ہے۔ اس وقت بالکل بیہوش ہیں۔ اور برابر بک رہی ہیں"

حکیم صاحب۔" ٹھہرو۔ چلتا ہوں"

یہ کہہ کر جس مریض کو دیکھ رہے تھے اس کے بھائی سے بولے۔

"کہاں رہتے ہو"

"ہنیا پار"

"بہت دور ہے۔ بہت دور ہے۔ اگر چاہتے ہو کہ مریض اچھا ہو جائے تو ہمارے احاطے میں ٹھہر جاؤ" اتنے میں ایک اور آدمی دوڑا ہوا آیا، اور بولا۔

حضور لڑکی کا حال بہت خراب ہے۔

حکیم صاحب۔" سلطان! ذرا اس لڑکی کو دیکھ لوں۔ یہ بچارے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہمارے یہاں ٹھہرے ہیں۔ ذرا سی جگہ میں نہ معلوم کیسے بسر کرتے ہیں۔

حکیم صاحب نے جلدی جلدی مریضوں کو دیکھا۔ اور پھر لپک کر احاطے میں پہونچے۔ یہاں دو بڑے بڑے دالان تھے جس میں پہلے بھینسیں بندھتی تھیں اور بیل گاڑی رکھی جاتی تھی۔ کچھ بھوسا اور گھاس بھی رکھی رہتی تھی۔ مگر اب سب ہٹا دیا گیا تھا۔ بھینس مر گئیں تھی۔ گاڑی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اب دالانوں میں پردے پڑے تھے۔ کسی طرف ٹسٹر کھڑے تھے۔ ان میں آٹھ دس مریض مقیم تھے۔ جگہ بالکل ہسپتال معلوم ہو رہی تھی کسی طرف سے رونے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں کوئی چلا رہا تھا۔ ایک عورت ایک ٹسٹر کے پاس دوا پیس رہی تھی، اس کے برابر ایک بچی بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک مریض زور زور سے کراہ رہا تھا۔ اور پانی پانی چیخ رہا تھا۔ ایک بڈھا اس کے حلق میں عرق ٹپکا رہا تھا۔ کچھ مریض پردے دار بھی تھے۔ حکیم صاحب ایک ٹسٹر کے پاس جا کر ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پردہ ہو گیا۔ حکیم صاحب اندر گئے۔ اس گیارہ برس کی ایک

لڑکی تعویذوں کا ہار پہنے بستر پر پڑی تھی۔ پٹی کے پاس پلنگ کے پایہ سے ایک بکرا بندھا تھا لڑکی بخار کی تیزی میں واہی تباہی بک رہی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی حال سُنا۔ اور عمل تجویز کیا۔ نسخہ لکھنے کو قلم دوات مانگی۔ مریضہ کا بھائی دوڑ کر اٹھا لایا۔ حکیم صاحب نے نسخہ پر ہوالشافی لکھا۔ آگے لکھنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ صدائے اللہ اکبر کان میں آئی۔ حکیم صاحب نے قلم رکھ دیا۔ اور مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔

شاہ ولایت حسین صاحب نے جو مغرب وعشار کی امامت کرتے تھے، اس وقت بھی امامت کی۔ نماز کے بعد حکیم صاحب نے سنتیں اور نفلیں پڑھیں۔ پھر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ جب دو ایک خاص خاص مریدوں کے علاوہ سب رخصت ہو گئے تو شاہ صاحب نے ان کو مراقبہ کرایا۔

عبادت سے فارغ ہو کر حکیم صاحب شاہ صاحب سے کہنے لگے۔

"حضرت! آج کل مراقبہ کی طرف میرا قلب نہیں رجوع ہوتا۔ نماز میں بھی مریضوں کی طرف دھیان رہتا ہے حالت ایسی ہے کہ اگر ذرا غفلت کروں تو ایک نہ ایک کی جان چلی جائے۔"

شاہ صاحب۔ "دل لگے تو کیسے لگے۔ کاملین اسی وجہ سے دنیا سے پرہیز کرنے کی ہدایت کرتے ہیں دنیا سرائے ہے۔ پل ہے۔ یہاں کے 'اعمال' سے دل لگانا بے سود ہے۔ یہ تمھارا خیال بالکل غلط ہے کہ تمھاری بے توجہی سے کوئی مر جائے گا۔ یا تمھاری توجہ سے کوئی بچ جائے گا۔ موت و زندگی سوائے اس کے اور کسی کے اختیار میں نہیں۔ اگر اس کی مرضی ہی ہے کہ سب کو مار ڈالے تو اس میں کسی کا کیا اجارہ۔"

پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگے۔ "تم نے جہانیاں جہاں گشت کا قصہ نہیں سنا کہ وہ ایک مرتبہ ایک شہر سے گذرے دیکھا تو بہت دین دار لوگوں سے آباد تھا۔ سب رہنے والے خوش اخلاق صوم، صلوٰۃ کے پابند تھے۔ حضرت ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد پھر ادھر سے گذرے تو دیکھا کہ تمام شہر ویران پڑا ہے، مکان کے نشان تک نظر نہیں آتے۔ دیکھ کر ان کو بہت تاسف ہوا۔ خدمت باری میں عرض کیا کہ "اے مرے مالک تجھے اتنے اچھے بندے تباہ کرتے کچھ افسوس نہ ہوا۔ ارشاد ہوا کہ زمین پر کچھ لکیریں بناؤ یہ عمل پیرا ہوئے۔ پھر ارشاد ہوا ان کو مٹا ڈالو۔ انھوں نے مٹا ڈالیں۔ جناب باری سے سوال ہوا تم کو ان لکیروں کے مٹانے کا کچھ افسوس تو نہیں ہوا۔ انھوں نے عرض کیا ان لکیروں کے مٹانے کا کیا افسوس ہو سکتا ہے

جب چاہوں بنالوں۔ جناب باری سے ندا آئی اسی طرح مجھے بھی اپنے بندوں کے مٹانے کا کچھ افسوس نہیں ہوتا۔

تو مقصد یہ ہے کہ یہ اسی کے کارخانے ہیں۔ وہی خوب جانتا ہے۔ ہمارے لئے تو یہ ہے کہ اسی میں خوش ہوں جو مرضی الٰہی ہو۔"

پھر ایک لمبی سانس بھر کر بولے ؎

ترک دنیا گیر تا سلطاں شوی

شاہ صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ انھوں نے یہ تقریر آہستہ آہستہ اور دلنشین لہجے میں فرمائی تھی۔ حکیم صاحب اس کو سن رہے تھے، اور ایک ہاتھ سے چٹائی کا تنکا توڑتے جاتے تھے۔ جب تقریر ختم ہوئی تو اس پر غور کرنے لگے۔ مگر ذہن فوراً ہی بہک گیا۔ اور یہ دیکھنے لگے کہ شاہ صاحب کے ڈنڈے کی شام پر ایک سبز رنگ لگا ہوا ہے۔ اس پر ایک سیاہ دھبا معلوم ہوتا ہے۔ دھبہ کیسے لگا؟ کوئی چیز بھر گئی ہوگی کیا چیز ہو سکتی ہے؟ دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے، پھر خیال آیا لاؤ اس کو صاف کر ڈالوں۔ مگر اکبارگی کھڑے ہو گئے۔ اور تیزی سے مسجد سے نکل کر احاطے میں آئے۔ مریضہ کے عمل کا نسخہ لکھا۔ اور پھر سلطان کے ساتھ چلنے لگے۔ مریضہ کا بھائی سمجھتا تھا کہ حکیم صاحب حسب دستور اپنے سامنے عمل دلائیں گے۔ مگر جب ان کو جاتے دیکھا نسخہ کی ترکیب پوچھی۔ حکیم صاحب نے سرسری طور پر بتا کر پیچھا چھڑایا۔ اور سلطان کے ساتھ چلے۔ سلطان کی بہن زہرہ کو بچپن میں نمونیا ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب کے علاج سے اچھی ہوئی۔ اس وقت سے وہ حکیم صاحب سے بہت ہل گئی تھی ان کو چچا چچا کہتی تھی۔ اکثر چیزیں پکا کر ان کو بھیجا کرتی ان کے رومال اور تکیہ کے غلاف کاڑھ دیتی تھی۔

حکیم صاحب نے گھر جا کر زہرہ کو دیکھا۔ بخار بہت تیز تھا۔ چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔

حکیم صاحب " زہرہ۔ زہرہ بی "

سلطان۔ بجیا حکیم صاحب پکار رہے ہیں۔

زہرہ کی ماں پردہ کے اندر سے بولیں۔" حکیم صاحب! اس کو غفلت سی ہے اور چونک پڑتی

حکیم صاحب ۔ آپ گھبرایئے نہیں مرض کا معمولی حملہ ہے۔ جلد ہی اچھی ہو جائے گی۔

حکیم صاحب نے نسخہ لکھا ۔ ضروری ہدایات دیں ۔ اور سلطان سے کہا کہ گھر آکر دوائیں لیجانا ۔ اور پھر پان کھا کر کہنے لگے ۔

" معاف کیجئے گا ۔ ٹھہر نہیں سکتا ہوں ۔ سلطان سے پوچھئے مریضوں کی کتنی کثرت ہے ۔ کھانا کھانے تک کی مہلت نہیں ملتی۔" " آپ لوگوں کی محنت خدا قبول کرے ۔ ایک ہفتہ ادھر سنا تھا کہ بیماری کا زور کم ہوگیا ہے ۔"

حکیم صاحب " ادھر تو زور ضرور کم ہوگیا تھا ۔ میں تو سمجھا تھا کہ خدا نے اپنا فضل کیا اور یہ بلا دفان ہوئی مگر پھر اکدم سے زور بڑھ گیا ۔ عجب پریشانی ہے ۔ گھر کی ماما بھاگ گئی ۔ وحیدہ کی ماں ایک طرف تو گھر بھر کا کھانا پکاتی ہیں ۔ دوسری طرف کبھی چار چھ مریضوں کے لئے بھی کھانا تیار کرنا پڑتا ہے ۔ وحیدہ سے بن جو بن پڑتا ہے کرتی ہے ۔ مگر اس بچاری کو اپنے بچے سے چھٹی نہیں ملتی ۔

ادھر وحیدہ کی ماں کو ان کے بھائی بہت بلا رہے ہیں ۔ وہ اس پر راضی نہیں ہوتیں کہ بچوں کو لے کر بلا میرے چلی جائیں خدا اپنا فضل کرے ۔ اب تو پورا قصبہ ویران ہوگیا ۔ بازار دیکھ کر آنسو بھر آتے ہیں ۔

زہرہ کی ماں ۔ " حکیم صاحب کچھ مریض اچھے بھی ہوتے ہیں ۔ آپ کو سلیم کی قسم ۔ مری زہرہ اچھی ہو جائے گی ؟ "

حکیم صاحب ۔ " آپ پریشان نہوں ۔ مرض کا ہلکا اثر ہے، انشاء اللہ جلد ہی اچھی ہو جائے گی ۔"

وہاں سے حکیم صاحب بھاگے ہوئے آئے ۔ پیچھے اساطے کا ایک چکر لگایا ۔ دو ایک مریضوں کو ہدایات دیں اور پھر گھر آئے ۔ بیوی نے کھانے کو پوچھا تو بولے ۔

" نماز سے آکر "

بیوی نے لوٹا دیا ۔ انھوں نے وضو کیا ۔ پھر مسجد گئے ۔ وہاں سے آکر ایک نیا مریض آیا تھا اس کو دیکھا ۔ تقریبا گیارہ بجے کھانا کھا کر لیٹے ۔ تھکے بہت تھے فوراً سو گئے ۔ دو بجے چھدو نے آکر آواز دی کہ نیا مریض آیا ہے ۔ حکیم صاحب کا حکم تھا کہ اگر کوئی نیا مریض آئے یا کسی کی حالت نازک ہو تو فوراً

جگادو۔ بیوی نے چھدو کی آواز سُنی۔ مگر خاموش رہی، چھدو نے ایک آواز اور دی۔

حکیم صاحب کی بیوی بڑبڑانے لگیں" دن کو کھانا نہ نصیب ہو، رات کو سونے سے بھی گئے ان موئے مریضوں کو اپنی جان کی پڑی رہتی ہے۔ حکیم کی جان کی پروا نہیں۔"

بڑبڑاتے ہوئے اُنھوں نے حکیم صاحب کو جگایا۔ اُنھوں نے جیسے نئے مریض کا نام سُنا بستعدی سے اُٹھے۔ اور باہر چلے گئے۔

(۳)

طاعون کا اتنا زور تھا۔ مگر حکیم صاحب کا گھرانا ابھی تک محفوظ تھا۔ لیکن فلک کو یہ نہ بھایا اور ایک دن حکیم صاحب کی ماں کو بخار آیا جو دم بدم تیز ہوتا گیا۔ دوسرے دن بغل میں گلٹی دکھائی دی۔ حکیم صاحب سے جو بن پڑا کیا۔ مگر موت سے کب رستگاری ہے پھر ضعیفی میں معمولی مرض بھی مرض الموت ہو جاتا ہے بچاری تیسرے دن دنیا سے سدھار گئیں۔

حکیم صاحب کے دل پر جو گذرا ہو گذرا ہو۔ مگر ان کی زبان سے کسی نے سوائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْن کے ایک کلمہ بھی نہیں سُنا۔ دو ایک دن تک ذرا چپ چپ ضرور رہے، لیکن مریضوں کی خدمت یا نماز کی پابندی میں ذرا فرق نہ آیا۔

اس کے چوتھے روز حکیم صاحب ایک مریض کو جو اب سنبھل گیا تھا، کچھ ہدایات دے کر احاطے سے رخصت کر رہے تھے کہ چھدو بھاگتا ہوا آیا۔

چھدو۔" بی بی نے کہا ہے کہ بٹیا کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ اور بخار بھی معلوم ہوتا ہے۔ آکر فوراً دیکھ لیجئے۔"

حکیم صاحب بے اختیار زنانے کی طرف بھاگے۔ ہاتھ میں مریض کا نسخہ تھا وہ بھی دینا بھول گئے سلیمہ ماں کی گود میں لیٹی ہوئی رو رہی تھی۔ ماں آنکھوں میں آنسو بھرے سر دبا رہی تھی۔ حکیم صاحب نے پکارا۔ سلیما۔ سلیمہ

سلیمہ۔" ابا درد کے مارے سر پھٹا جاتا ہے۔"

" تو روتی کیوں ہے، ابھی درد کم ہوا جاتا ہے "

پھر بیوی سے بولے " ذرا پانی گنگنا کردو اس کو ایک خوراک دوا دے دوں " پھر بیوی نے منہ پھیر کر دوپٹہ سے آنسو پونچھے۔ اور چپکے سے اٹھیں۔ حکیم صاحب پاس بیٹھ گئے۔ تھرمامیٹر لگا کر بخار دیکھا تو ۱۰۵۔ لڑکی پھنکی جاتی تھی۔ بلبلا بلبلا کر باپ کے گلے میں باہیں ڈال دیتی حکیم صاحب اس کے رخساروں پر ہاتھ پھیرتے، سر دباتے، اور بہلاتے جاتے۔ جب پانی گرم ہو کر آگیا تو حکیم صاحب نے دوا بنا کر بیوی کو دی، اور کہنے لگے۔

" درد، اور بخار کم ہوجائے گا۔ میں ابھی آتا ہوں "

بیوی۔ " لڑکی کی حالت چھوڑنے کے قابل نہیں "

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ باہر آئے یہاں ایک نیا مریض آیا تھا، اس کو دیکھا۔ جلدی سے نسخہ لکھا اور پھر اندر جانا چاہا مریض کا باپ اس کو اس خیال سے اٹھا لایا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے یہاں ٹھہر جاؤں گا۔ مگر انھوں نے پوچھا نہیں۔ تو خود بولا۔

" حضور میں ٹھہر جاؤں "

" حکیم صاحب نے روکھے پن سے جواب دیا " احاطے میں جا کر دیکھو۔ اگر جگہ ہو ٹھہر جاؤ "

جس مریض کا نسخہ حکیم صاحب لئے چلے گئے تھے بولا

" حضور پھر ہم جائیں "

حکیم صاحب۔ اور کیا کروگے۔

مریض۔ اور وہ نسخہ تجویز نہیں دیا گے ؟

حکیم صاحب۔ کون نسخہ ؟

مریض۔ جو آپ نے لکھا تھا۔ شاید اندر لئے چلے گئے۔

حکیم صاحب نے جواب نہیں دیا، اور اندر چلے گئے۔ لوگ متحیر تھے کہ یا تو حکیم صاحب اتنی مہربانی سے پیش آتے تھے یا یہ تغیر۔

"حکیم صاحب کچھ ناراض ہیں؟"

"بچارے گھبرائے ہوئے ہیں۔ ان کی لڑکی کو بخار آ گیا۔"

"کون لڑکی؟"

"چھوٹی"

"ارے توبہ۔ کتنی پیاری بچی ہے۔ مرے مالک اچھا رکھنا۔"

"بچارے حکیم صاحب نے ہم لوگوں کی خاطر دن کو دن' اور رات کو رات نہ سمجھا۔ کوئی اور ہوتا تو قصبہ چھوڑ کر بھاگ گیا ہوتا۔ گھر میں کیا روپیہ کی کمی ہے۔ مگر کیا دل ہے۔ آدمی نہیں فرشتہ ہیں فرشتہ۔"

"ان کے باپ کا بھی یہی حال تھا۔ پچھلی مرتبہ ہیضہ کی فصل میں انھوں نے اتنی بلکہ اس سے زائد قصبہ کی خدمت کی پھر ان کا اسی میں انتقال ہوا۔"

"اتنے میں چھدو نسخہ لئے آیا۔ اور مریض کو دیا۔"

"بٹیا کیسی ہیں؟"

بخار دم بدم تیز ہوتا جاتا ہے۔ سرسامی کیفیت ہے۔ سر کے بال حکیم صاحب نے کٹوا دئے ہیں۔ ماں کا تو عجب حال ہے۔ بچے بوڑھے سب ہی پریشان ہیں۔ لڑکی تو گھر بھر کا کھلونا ہے۔"

دو گھنٹے کے بعد حکیم صاحب گھر سے نکلے۔ جو مریض موجود تھے ان کو سرسری طور پر دیکھا۔ کسی کو بھی اپنے سامنے دوا نہیں دی۔ سلطان آیا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"بجیا کا بخار اتر گیا ہے۔ آپ کو بہت بلا رہی ہیں۔ کہا ہے کھڑے کھڑے آ جائیے۔"

حکیم صاحب۔ "بٹیا سلیمہ کو تیز بخار ہے۔ حالت اچھی نہیں۔ ورنہ میں ضرور چلتا۔ نسخہ لیتے جاؤ۔

نماز میں حکیم صاحب نے پیر صاحب سے حال بیان کیا انھوں نے ہمدردی ظاہر کی اس دن مراقبہ بھی نہیں کیا گیا۔ اور پیر صاحب حکیم صاحب کے ساتھ گھر آئے۔ مریضہ پر پھونک ڈالی۔ کچھ ماں کو سمجھاتے رہے۔ پھر ایک تعویذ لکھ کر سلیمہ کے گلے میں ڈال دیا۔ اور بولے "لڑکی اچھی ہو جائے گی۔"

پیر صاحب کے ہمراہ حکیم صاحب باہر آئے۔ یہاں مریضوں کا مجمع لگا تھا۔ مگر کسی نے پکارا نہیں تھا

رام لال۔ جس کی بہن حکیم صاحب کے احاطے میں بیمار پڑی تھی۔ قریب آکر بولا۔

"حکیم جی۔ بہن کی حالت بہت خراب ہے۔"

حکیم صاحب خاموش اس کے ساتھ ہولئے۔ یہاں آکر دیکھا تو سانس اکھڑ چکی تھی۔ کہنے لگے

"اب کوئی امید نہیں۔"

مریضوں کو سرسری دیکھ رہے تھے کہ ان کے ایک دوست اکبر آگئے اور بولے کہ "لڑکے کی حالت بہت خراب ہے ان سے تعلقات ایسے تھے کہ انکار بن نہیں پڑا۔ اور ساتھ چلے گئے وہاں کافی دیر لگی، جب واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سلیمہ کے گلٹیاں ظاہر ہوگئیں۔

حکیم صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر لیپ تیار کرنے کا حکم دیا۔

دوسرے دن حالت بہت بگڑ گئی۔ حکیم صاحب نے اپنا علاج کارگر نہ ہوتے دیکھ کر لکھنؤ سے ایک مشہور ڈاکٹر بلایا۔ اس نے آتے ہی گلٹی کا اپریشن کیا۔ دو ایک انجکشن دئے۔ مگر کچھ فائدہ نہیں ہوا دوسرے دن سانس اکھڑ گئی۔

حکیم صاحب کو دو گھنٹہ سے اندر جانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ چھدو روتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"بٹیا کی حالت بگڑ رہی ہے۔"

حکیم صاحب لپکے ہوئے اندر گئے۔ تو دیکھا ماں پٹی سے لگی بیٹھی ہے سسکیوں کی آواز آرہی ہے سلیمہ کی گردن تکیہ پر ڈھلک گئی ہے۔ دو دو منٹ کے بعد ایک تشنجی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سانس کھینچتے وقت گردن میں سخت جھٹکا لگتا ہے۔

حکیم صاحب نے آواز دی۔ مگر جواب دینے کا سلیمہ کو ہوش کہاں تھا؟ انھوں نے شاہ ولایت حسین صاحب کے بلانے کو آدمی بھیجا وہ خبر سنتے ہی فوراً آئے۔ ماں کو صبر کی تلقین کی، اور سرھانے بیٹھ کر یٰسین پڑھنے لگے۔

اس وقت حکیم صاحب کو کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ یہ بھی بھول گئے تھے کہ باہر مریضوں کو منتظر چھوڑ

آئے ہیں۔ اسی طرح گردن جھکائے عرصہ تک بیٹھے رہے۔ سلیمہ کو سکرات کی تکلیفوں میں دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو نہ تھم سکے۔ اور دو ایک بڑے بڑے قطرے پلکوں سے ڈھلک کر گالوں پر ہوتے ہوئے ڈاڑھی پر آگرے۔ غم کی شدت میں ان کو پوچھنا بھی بھول گئے۔ حکیم صاحب دنیا میں سب سے زیادہ سلیمہ کو چاہتے تھے۔ صرف یہی ایسی ذات تھی جس کی خاطر وظیفہ کے دوران میں اکثر بول دیتے تھے۔

ایسی حالت میں تھے کہ "اللہ اکبر" کی آواز کان میں آئی۔ جس طرح مردے صور کی آواز سے چونک پڑیں گے۔ حکیم صاحب اور شاہ صاحب دونوں چونک پڑے۔ اور بسم اللہ کہہ کر اٹھے۔ حکیم صاحب کے گھر میں بھی بچے بوڑھے سب نماز کے بہت پابند تھے۔ مگر اس وقت غم نے سب کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ کسی کے دل میں اتنی تاب نہ تھی کہ نماز کو جاتا۔ مگر آگے آگے شاہ صاحب، اور پیچھے پیچھے حکیم صاحب مسجد کی طرف چلے۔ جس طرح بجھتا چراغ بھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح سلیمہ کو بھی آخری سانس کے ساتھ ہوش آگیا۔ اور اس کی زبان سے نکلا۔

"ابا !!!"

حکیم صاحب نے پلٹ کر دیکھا وحیدہ کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں ملیں۔ ہونٹوں کو کچھ حرکت ہوئی اور لوگوں کو ایسا گمان ہوا کہ واپس آجائیں گے۔ مگر منہ کے الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ اور وہ "یا ارحم الراحمین" کہہ کر ویسے ہی چلے گئے۔

ادھر وہ باہر نکلے ادھر لڑکی کی سانس بند ہوگئی۔ بچاری ماں نے ہائے کہہ کر پٹی پر سر دے مارا۔ اس وقت حکیم صاحب نیت باندھے نماز میں کھڑے تھے۔ نہ معلوم دل کی کیا حالت تھی، مگر بظاہر خشوع وخضوع میں کچھ فرق نہیں تھا۔

(۴)

ایک ہفتہ اور گذر گیا۔ بیماری کی وہی حالت تھی، اور حکیم صاحب کی مصروفیت بدستور۔ حکیم صاحب کی بیوی کے پاس ان کے بھائی کے خط پر خط چلے آتے کہ تم مع حکیم صاحب اور بچوں کے یہاں چلی آؤ۔ مگر ان سے یہ تو نہ ہو سکا کہ حکیم صاحب کو چھوڑ کر چلی جائیں۔ اور حکیم صاحب سے چلنے کے لئے کہنا ہی بے سود تھا مجبوراً

انھوں نے لڑکوں کو گوالیار بھیج دیا۔ اور خود مع حکیم صاحب کی ایک بیوہ بھاوج کے گھر بھر میں تنہا رہ گئیں۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ حکیم صاحب نے بیوی سے کہا کہ "ذرا پانی رکھ دینا۔ اگر موقع ملا تو بدن پر ڈالوں گا۔"

گیارہ بج رہے تھے حکیم صاحب مطب میں تھے کہ ایک نیا مریض آیا یہ سولہ سترہ برس کا لڑکا تھا۔ بڑا سا قد خوبصورت جسم، بڑی بڑی آنکھیں جو بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ گال تمتمائے ہوئے تھے ماتھے پر چھوٹا سا سیندور کا ٹیکا تھا۔ اکثر "ابا ابا" چلاتا اور اٹھ بیٹھتا۔ بدن پر ایک پھٹی ہوئی لال لوئی پڑی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا بڈھا باپ تھا۔ اور چھوٹی سی بیوی تھی، بس کا سن مشکل سے بارہ تیرہ برس کا ہوگا۔ مگر پھر بھی گود میں ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کو چھپائے گھونگھٹ نکالے سسکیاں لے رہی تھی۔ باپ بھی غم سے بدحواس تھا۔ اس کا یہی ایک لڑکا تھا۔ دو سال ہوئے شادی کی تھی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھی۔ حالت نازک تھی۔ بچنے کی امید کم تھی۔ مگر تھی۔ جب لڑکے کے حواس درست ہوتے گھبرا گھبرا کر بیوی اور بچے کی طرف دیکھتا اور پھر بڈھے باپ کی طرف۔ اس کی بیکسی بھری آنکھیں مستقبل کے خطرات سے سہمی ہوئی تھیں اور ان میں ایسا درد نہاں تھا جس نے حکیم صاحب کی ہمدردی کو جذب کر لیا۔

حکیم صاحب نے اپنے ہاتھ سے دوا دینا شروع کی۔ سلیمہ کی موت کے بعد سے انھوں نے پہلی مرتبہ ایک مریض کا اتنا خیال کیا تھا۔

ایک گھنٹہ کے اندر مریض کو دو مرتبہ استفراغ ہوا۔ استفراغ کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بخار کا زور کم ہو جاتا۔ مگر پھر فوراً تیز ہو جاتا۔ مریض باپ اور بیوی کی پریشانی کے خیال سے ہوشیار رہنے کی کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ اس کی بیماری کی غفلت سے جنگ اور پھر ناکامی باپ اور بیوی کو اور زیادہ بدحواس کئے دیتی تھیں۔ اس نے کئی بار حکیم صاحب سے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بدن میں جھرجھری پیدا ہوئی۔ حکیم صاحب نے دوا دی جس سے فوراً قے ہوئی حکیم صاحب ایسے موقعوں پر اپنی احتیاط بہت کرتے تھے اور عموماً استفراغ کے وقت دور ہٹ جایا کرتے تھے۔ مگر اس مرتبہ انھوں نے خلاف معمول لڑکے کو تھام لیا۔ چھدو جو قریب کھڑا تھا فوراً دوڑ پڑا حکیم صاحب کو دھکا دے کر الگ کیا اور خود لڑکے کو تھامنے لگا۔ باپ نے اس کا ہاتھ ہٹا لیا لڑکے کو ذرا سکون ہوا اور خاموش

لیٹ گیا۔ اذان ہو چکی تھی۔ نماز کا وقت قریب آرہا تھا۔ چھدو نے وضو کے لئے پانی لاکر رکھ دیا تھا۔ حکیم صاحب بار بار آستین اُلٹنا شروع کرتے۔ مگر پھر رک جاتے اور ٹہلنے لگتے۔ آخر وضو کرنے کو بیٹھ گئے۔ استفراغ کے بعد لڑکے کو کوئی دوا دی گئی تھی۔ مگر پانچ ہی چھ منٹ گذرے ہوں گے کہ اس کو پھر ابکائی آئی حکیم صاحب بے تحاشا کھڑے ہوگئے۔ اور چھدو کو دوا تیار کرنے کو بھیجا خود ٹہلنے لگے۔ لڑکے کے منہ سے تھوڑا سا زرد زرد پانی گرا پھر دبی دبی سانس لیتا ہوا لیٹ گیا۔

حکیم صاحب بہت بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ چھدو کا انتظار تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آواز دیتے نماز کا وقت گذرا جا رہا تھا۔ بڈھے باپ، اور کمسن بیوی کی آنکھیں حکیم صاحب کی نقل و حرکت کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آخر حکیم صاحب ذرا تیز ہو کر مسجد کی طرف چلے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ نماز کو گئے، اور ڈیڑھ گھنٹے سے قبل نہیں واپس ہوں گے۔ حکیم صاحب کے راستہ میں ایک بڑا سا پیپل کا درخت لگا تھا جس پر مریضوں کے بھیگے کپڑے سوکھنے کو پھیلے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب کی رفتار سست ہوتی گئی اور درخت کے پاس آکر بالکل معمولی رفتار ہوگئی۔ حکیم صاحب کپڑوں کی طرف دیکھنے لگے۔ اور درخت کے گرد چکر لگا کر واپس آگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو درخت پر کسی چیز کو تلاش کرنے گئے تھے یا ٹہلتے ٹہلتے وہاں تک بڑھ گئے تھے۔ واپس آکر مریض کی نبض دیکھی۔ اتنے میں چھدو دوا لئے ہوئے آیا۔

اور حکیم صاحب کو بالکل خلاف امید موجود پا کر حیرت زدہ ہوگیا۔ اور بولا

"حکیم صاحب!! میں عمل دے لوں گا۔ نماز کا وقت جا رہا ہے"

حکیم صاحب نے کچھ جواب نہیں دیا۔ چھدو کے ہاتھ سے دوا لے کر اس لڑکے کو پلائی۔ اپنے سامنے عمل دلایا دو گھنٹہ کے بعد جب اس کی حالت سنبھلتی معلوم ہوئی تو اپنے ساتھ لے کر احاطے میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ حکیم صاحب کا نماز کو قضا کر دینا اتنا حیرت انگیز واقعہ ہوا کہ ایک مریض جو ڈیڑھ ہفتہ سے اٹھ نہیں پاتا تھا۔ یہ خبر سُن کر مارے حیرت کے بے تحاشا اٹھ کر بیٹھ گیا، اور پوچھنے لگا کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟"

مولانا ولایت حسین صاحب یہ خبر سُنا کر سناٹے میں آگئے، پھر آہستہ سے بولے "تقاضائے بشریت"۔ پھر اُس کی دو تین بار تکرار کی ؛

ہندوستان میں صنعت کی موجودہ حالت

صنعتوں کی اہمیت | ہر ملک کے باشندوں کو چاہے وہ ترقی پذیر ہوں یا پس ماندہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے زراعتی پیداوار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے آبادی کا ایک حصہ تو ہمیشہ زرعی پیشوں میں مصروف رہے گا۔ لیکن آج کل تمام مہذب ملکوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جہاں تک حالات اجازت دیں معاشی طور پر کسی دوسرے ملک کا دست نگر ہو کر نہ رہا جائے بلکہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے یہاں پیدا کی جائیں۔ زراعت سے چند ابتدائی ضروریات مثلاً آبادی کے لئے غذا، صنعتوں کے لئے اشیاء خام اور برآمد کے لئے زاید پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ زراعت کے بغیر کوئی ملک بھی جس کا حوصلہ یہ ہے کہ اپنی تمام ضروریات خود مہیا کرے اپنا کام نہیں چلا سکتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ملک محض زراعت کی بنا پر موجودہ عہد میں دولت مند نہیں بن سکا ہے۔ تہذیب کی ترقی اور انسانی احتیاجات کے اضافہ سے، ان پیشوں کا منافع اور اہمیت جو صنعتوں سے وابستہ ہیں بڑھ گئی ہے اور صنعت کی ترقی اب نہ صرف لازمی بلکہ تہذیب کے مترادف سمجھی جانے لگی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں جدید دستور یہ ہو گیا ہے کہ اپنی محنت کرنے والی آبادی کے لئے کام صنعتی اور ضمنی پیشوں میں زیادہ ڈھونڈھا جاتا ہے اور زراعت میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی تعداد محدود کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح گویا اس بات کو عملاً تسلیم کیا جاتا ہے کہ زراعت میں ایک محدود تعداد سے زیادہ کے کام کرنے سے افراد کی اوسط آمدنی اور قوم کی مجموعی آمدنی گھٹ جاتی ہے لیکن ہندوستان میں یہ معقول طریقۂ عمل ابھی تک رائج نہیں ہوا۔

۱۹۳۰ء میں ان صنعتی کارخانوں کی تعداد جن کے متعلق اعداد و شمار رکھے گئے تھے برطانوی ہندوستان میں ۸ ہزار ایک سو ۴۸ اور تمام ملک میں ۹ ہزار ۴ سو ۲۲ تھی۔ صنعتی کارخانہ کی تعریف میں صرف وہ کارخانے آتے تھے جن میں مزدوروں کی تعداد ۲۰ سے کم نہ تھی جتنا سرمایہ ان کارخانوں

میں لگا ہوا ہے اس کے مجموعی اعداد ان اعداد و شمار میں جو چھپتے ہیں علیٰحدہ علیٰحدہ فراہم نہیں کیے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کمپنیوں کے سرمایہ کو بھی شامل کرکے جن کی رجسٹری سلطنت متحدہ برطانیہ میں ہوئی لیکن کام ہندوستان میں کر رہے ہیں بڑے پیمانہ کی صنعتوں کے مجموعی سرمایہ کا تخمینہ ماہروں نے ۶ ارب روپیہ کیا ہے۔ اس میں ہندوستانیوں کا حصہ غالباً ۲ ارب سے زیادہ نہیں ہے۔ ممالک متحدہ برطانیہ میں جس کی آبادی ہندوستان کے مقابلہ میں صرف ۱۳ فیصدی ہے۔ ان صنعتی کارخانوں کی تعداد جو ۱۹۲۶ء میں کام کر رہے تھے ایک لاکھ ۶ ہزار ۵ سو تھی۔ صرف صنعتی کمپنیوں میں ۶۰ ارب ۷۶ کروڑ کا سرمایہ یعنی ہندوستانی سرمایہ سے ۳۲ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ممالک متحدہ امریکہ میں جس کی آبادی ہندوستان کے مقابلہ میں ۵۰ فیصدی ہے ۱۹۲۹ء میں صنعتی کارخانوں کی تعداد ایک لاکھ ۸۴ ہزار ۱۳۶ تھی اور ان میں ۲۳۰ ارب یعنی ہندوستانیوں کے مقابلہ میں ۷۵ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ کناڈا کی آبادی ایک کروڑ سے کچھ یونہی زیادہ ہے یعنی ہندوستان کے مقابلہ میں صرف ۳ فیصدی ہے۔ لیکن ۱۹۲۹ء میں اس ملک میں ۲۴ ہزار ۲۰ صنعتی کارخانے تھے جن میں ۱۴ ارب ۵۴ کروڑ کا سرمایہ یعنی تقریباً ہندوستان سے ۵ گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ جاپان میں ۱۹۲۶ء میں ہندوستان کے مقابلہ میں ۱۹ فیصدی آبادی ۱۳۰ ہزار ۱۱۷ صنعتی کمپنیاں اور ۱۰ ارب ۹ کروڑ یا ہندوستان سے تین گنا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جاپان میں مصنوعہ پیداوار کی قیمت ۱۹۱۴ء تا ۱۹۲۶ء کی درمیانی مدت میں ۷ گنا زیادہ بڑھ گئی۔ ہندوستان بدنصیب اس عرصہ میں کوئی نمایاں ترقی نہ کرسکا۔

بڑی منظم صنعتوں میں جو لوگ مصروف تھے ان کی تعداد برطانوی ہندوستان میں ۱۹۳۰ء میں ۱۵ لاکھ یا تقریباً کام کرنے والی آبادی کا صرف ایک فیصدی تھی۔ تمام ہندوستان میں یہ تعداد ۲۰ لاکھ تھی۔ تمام قسم کی صنعتوں میں مصروف آبادی کا تناسب جس میں کان کنی کی صنعت بھی شامل ہے اسی سال ۱۰٫۲ فیصد تھا۔ درآنحالیکہ سلطنت متحدہ برطانیہ میں یہ تناسب ۴۷٫۲ فیصدی، ممالک متحدہ امریکہ میں ۳۲ فیصدی، کناڈا میں ۲۵ فیصدی، جرمنی میں ۴۱٫۳ فیصدی، فرانس میں ۳۳٫۳ فیصدی اور جاپان میں ۱۹٫۵ فیصدی تھا۔

ہندوستان کے مقابلہ میں جس ترقی یافتہ ملک کو چاہیئے رکھیئے، ہندوستان سے دو گنے آدمی صنعت یہ

انحصار کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس لئے جس مسئلے سے یہ ملک اس وقت دوچار ہے وہ یہ ہے کہ اس تعداد کو کس طرح بڑھایا جائے تاکہ صنعت و زراعت میں ایک معقول تناسب قائم ہو جائے۔

صنعت و زراعت سے جو آمدنی فی کس ہندوستان کو اور دنیا کے پانچ ترقی یافتہ ملکوں کو حاصل ہوتی ہے اس کا مقابلہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

نام ملک	آمدنی فی کس	
	صنعت (روپیوں میں)	زراعت (روپیوں میں)
ہندوستان	۱۲	۵۹
جاپان	۱۵۸	۵۷
سوئیڈن	۳۸۴	۱۲۹
سلطنت متحدہ برطانیہ	۴۱۲	۶۲
کناڈا	۴۷۰	۲۱۳
ممالک متحدہ امریکہ	۷۲۱	۱۷۵

یہ اعداد محض تخمینہ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن ان سے زراعت و صنعت کی آمدنیوں کے نسبتی فرق کا پتہ چل سکتا ہے۔ ان کے دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں صنعتوں سے جو آمدنی فی کس حاصل ہوتی ہے وہ بہت کم ہے۔ برخلاف اس کے جتنے دوسرے ملکوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہاں دولت کا خاص منبع یہی آمدنی ہے۔ ہندوستان کے ملک کی وسعت اور یہاں کی آبادی کی کثرت کا خیال کرتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ تمام ایسی قوموں کے مقابلے میں جن میں ایک منظم حکومت پائی جاتی ہے ہندوستان کی اہلیت کسب معاش سب سے کم ہے۔

برطانیہ عظمٰی سب سے پہلا وہ ملک ہے جس نے صنعتوں کو ترقی دے کر اپنی آبادی کی آمدنی

اور معیارِ زندگی کو بلند کیا۔ پھر دوسرے ممالک نے برطانیہ کی پیروی کی۔ مثال کے طور پر ممالک متحدہ امریکہ کو لیجئے۔ یہاں ۱۹۰۰ء میں صنعتوں سے آمدنی زراعت کی آمدنی کے تقریباً برابر تھی۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے بعد سے جو آبادی زراعت میں مصروف ہے اس میں اس پیشے کے نسبتاً غیر منافع بخش ہونے کی وجہ سے اضافہ نہیں ہوا۔ ۱۹۰۰ء میں ایسے لوگوں کی تعداد جو زراعت میں مصروف تھے ایک کروڑ چار لاکھ تھی لیکن ۳۰ سال بعد بھی یعنی ۱۹۳۰ء میں یہ تعداد صرف ایک کروڑ پانچ لاکھ نظر آتی ہے حالانکہ کل آبادی میں اس عرصے میں ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اسی مدت میں صنعتوں اور میکانکی پیشوں میں جو آبادی لگی ہوئی تھی اس کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ کناڈا جو جنگ سے پہلے بہت بڑی حد تک زراعتی ملک تھا جنگ کے بعد صنعتی ملک ہوگیا ہے۔ سویڈن ایک دوسرا ملک ہے جس میں ۱۸۷۰ء میں صنعت و تجارت کے ذریعے سے آبادی کا صرف آٹھواں حصہ کسب معاش کرتا تھا۔ آج ان پیشوں سے اس کی آبادی کا تقریباً نصف حصہ اپنی آمدنی حاصل کر رہا ہے۔ سوویٹ روس میں صنعتوں کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس حقیقت سے ہوگا کہ ۱۹۱۳ء میں مجموعی پیداوار کا ۴۲٫۱ فی صدی حصہ صنعت سے اور ۵۷٫۹ فیصدی زراعت سے حاصل کیا جاتا تھا لیکن ۱۹۳۲ء میں پیداوار کا یہ تناسب بدل کر ۷۰٫۷ اور ۲۹٫۳ ہوگیا۔

جن ملکوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں سے کسی میں بھی جو آمدنی صنعت سے فی کس حاصل کی جاتی ہے وہ زراعت کی فی کس آمدنی سے کم نہیں ہے۔ ایک مثال میں تو (یعنی برطانیہ کی مثال میں) یہ آمدنی دوگنی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں یہ برابر بھی نہیں ہے بلکہ صرف پانچواں حصہ ہے۔

اس وقت لوگ مصنوعہ اشیاء کو جن کی انھیں ضرورت رہتی ہے بیشتر باہر سے منگاتے ہیں (ان میں کچھ روزمرہ کی ضروریات مثلاً کپڑا، لوہا، شکر اور نمک بھی شامل ہیں) اور یہ وہ اشیاء ہیں جنھیں کسی زمانہ میں یہ خود بنایا کرتے تھے۔ اس سے صرف یہی نہیں ہوا ہے کہ صنعت سے براہ راست جو منافع حاصل ہوتے ہیں وہ تلف ہوگئے ہیں مثلاً ترقی یافتہ مہارت، صنعت کے ذریعے سے حاصل کی ہوئی زیادہ قوت خرید بلکہ انھیں صرف ایک واحد غیر یقینی پیشہ یعنی زراعت کی مختصر آمدنیوں سے، درآمد کی ہوئی اشیاء کے دام ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ انتظام درست نہیں ہے کیونکہ آبادی کا دباؤ زمین پر ویسے ہی بہت زیادہ

ہے اور کسان کے منافع میں برابر کمی ہو رہی ہے۔

منظم صنعتوں کے علاوہ باقی تمام دوسری صنعتوں کے اعداد و شمار اس وقت موجود نہیں ہیں منظم صنعتوں میں صرف ان کارخانوں کو شامل کیا جاتا ہے جن میں بیس یا زائد آدمی کام کرتے ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں جس قدر آدمی کام کرتے ہیں ان کی تعداد ۱۷ لاکھ سے کم ہے۔ ایسی چھوٹی یا گھریلو صنعتوں کی تعداد جن میں ۲۰ آدمیوں سے کم آدمی کام کرتے ہیں اور جن کا کوئی شمار سرکاری اندراجات میں نہیں کیا جاتا بہت کثیر ہے۔ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے مطابق تمام صنعتوں سے جو آدمی روزی حاصل کرتے تھے ان کی تعداد ۳ کروڑ ۳۱ لاکھ ۷۶ ہزار ۸۰ یعنی کل آبادی کا ۹ء۴ ۱۰ فیصد تھی۔ ۱۹۳۱ء کے لیے یہ اعداد ۳ کروڑ ۲۴ لاکھ یعنی ۹ء۷ فیصد ہیں۔ ان صنعتوں میں جو آدمی واقعی کام کرتے ہیں ان کی تعداد کی رفتار کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد سے ہو سکے گا۔

سال	تعداد	تناسب فی صد
۱۹۱۱ء	ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ۶ ہزار ۲۷۹	۵ء۵
۱۹۲۱ء	ایک کروڑ ۵۷ لاکھ ۴۱ ہزار ۹۰۷	۴ء۹
۱۹۳۱ء	ایک کروڑ ۵۳ لاکھ ۵۱ ہزار ۹۵۳	۴ء۴

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک صنعتی میدان میں برابر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ ہندوستان میں مزدوروں اور کاروبار کی تنظیم ایسی نہیں ہے جیسی ترقی یافتہ ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے کام کے اوقات مقرر نہیں ہیں۔ ملک کے اکثر حصوں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں روایتی طریقوں پر کام کو جاری رکھتی ہیں اور انھیں سائنس یا فنی ماہرین سے کسی قسم کی ہدایت نہیں ملتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ جدید مشینوں کی صنعت کے مقابلہ میں غیر منافع بخش ثابت ہوتی ہیں تو ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔

ہندوستان کی درآمد | برطانوی ہندوستان میں جو خاص خاص اشیا ۳۲-۱۹۳۱ء میں درآمد کی گئیں ان کی قیمت ایک

ارب ۴۲ کروڑ ۲۷ لاکھ تھی۔ ان میں سے بڑا حصہ یعنی ۸۰ فیصدی چیزیں ایسی ہیں جو ملک کے اندر بنائی جا سکتی ہیں بلکہ ان میں سے بعض اشیاء کو بنانا شروع بھی کر دیا گیا ہے لیکن متعلقہ صنعتوں کی تعداد اور پیمانہ نہایت ناکافی ہے۔ ضروری صنعتوں کو شروع نہ کرنے کی وجہ تنظیم کی کمی، حکمت عملی اور کوشش کا فقدان ہے۔ روس کے تازہ ترین اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سے یہ حکمت عملی اختیار کی گئی ہے کہ ملک کی تمام ضرورتیں خود ملک میں پیدا کی جائیں اس ملک کی غیر ملکی تجارت کی ایسی قلب ماہیت ہوئی ہے کہ اس کی ۸۰ فیصدی درآمد اشیاء خام، مشینری اور تعمیری اشیاء پر مشتمل ہو گئی ہے اور صرف ۱۵ فیصدی سے کم لایق صرف مکمل طور پر مصنوعہ اشیاء پر۔

ہندوستان کی برآمد

برطانوی ہندوستان میں ۳۲-۱۹۳۱ء میں برآمد اوسط سے کم رہی تھی اس کی قیمت ایک ارب ۵۵ کروڑ ۹۰ لاکھ تھی۔ روئی کی مصنوعات جو برآمد کی گئیں وہ ۹۹-۱۸۹۸ء یعنی ۳۲ سال قبل کے اعداد کے مقابلہ میں صرف ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھیں۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں خام روئی جو برآمد کی گئی اس کی قیمت ۲۳ کروڑ ۷۰ لاکھ تھی حالانکہ ۹۹-۱۸۹۸ء میں اس کے مقابلہ کے اعداد صرف ۱۱ کروڑ ۱۹ لاکھ تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت خام روئی کو ترقی دینے کی حکمت عملی پر کاربند رہی اور سوت اور کپڑے کی برآمد کی طرف اس نے توجہ نہیں کی۔ گذشتہ ۳۴ سال میں ملک سے روئی کی مصنوعہ اشیاء جو برآمد کی جاتی تھیں ان میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ اب جو اشیاء برآمد کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر وبیشتر (سن کو مستثنےٰ کرنے کے بعد جس کا ہندوستان کو اجارہ حاصل ہے) خام اشیاء اور غذائی پیداواروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان اشیاء کی برآمد کو صرف اس حالت میں ترقی دینا چاہئے جب وہ ملک کی ضرورت سے زیادہ ہوں۔ اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فہرست میں بہت سی ایسی اشیاء ہیں جن کو ملکی صرف یا برآمد کے لئے مصنوعہ یا نیم مصنوعہ شکل دی جا سکتی ہے اور جن کو اس طریقہ پر مقامی محنت کو مصروف کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی یہ کام نہیں کیا جاتا۔

بہت سی اشیاء جو عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں اور جن کے بنانے کے لئے ملک میں اشیاء خام موجود ہیں یا جو ایک زمانہ میں ملک میں بنائی جاتی تھیں غیر ملکوں سے حاصل کی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں ایسی حکمت عملیوں پر عمل درآمد ہو رہا ہے جن سے ملک اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے بھی غیر ممالک

کا وست نگر ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے قریبی سالوں میں مصنوعات کی کچھ ترقی ہوئی ہے خاص کر سوت اور روئی کے کپڑے کی صنعتوں میں۔ اور لوگوں میں عام طور پر اس بات کا عزم پایا جاتا ہے کہ سودیشی کو ترقی دی جائے یعنی اپنا کپڑا اور دوسری ضرورت کی چیزیں جہاں تک ہو سکے مقامی سرمایہ اور مقامی محنت کو مصروف رکھ کر حاصل کی جائیں۔

واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندوستان کے لوگ زمانہ قبل از تاریخ سے برابر اپنے لیے کپڑا بناتے چلے آرہے ہیں۔ روئی کے کپڑے اور سوت بننے کے لئے ملک میں مواد خام موجود ہے اس لیے انھیں باہر سے منگولنے کے لئے کوئی عذر موجود نہیں ہے تنظیم اور معقول حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے ملک کو دوہرا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اول تو یہاں کے کاریگر ایسے پیشوں سے جو ان کا حق ہے محروم ہو جاتے ہیں دوسرے وہ روپیہ جو درآمد کی ادائگی میں صرف کیا جاتا ہے اور جس کے ادا کرنے کی یہاں کی آبادی میں قطعی اہمیت نہیں ہے اندرون ملک میں گردش نہیں کرتا بلکہ باہر بھیج دیا جاتا ہے جس سے ملک غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اعلیٰ قسم کے سوتی کپڑے تعیش کا سامان ہیں جنھیں صرف امرار استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر سخت امتناعی محاصل کے ذریعے سے ان کی درآمد بند کر دی جائے تو اس سے کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں کی جائے گی۔ حکومت کا یہ ابتدائی فرض ہے کہ موجودہ حالات میں اس قسم کے امتناعی محاصل عاید کرے۔

تین قسم کی صنعتیں | تمام صنعتوں کو تنظیم کی سہولت کے لحاظ اور سرمایہ اور پیمانہ کی مناسبت سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی (۱) وزنی یا بڑے پیمانہ کی صنعتیں (۲) اوسط پیمانہ کی صنعتیں اور (۳) چھوٹی صنعتیں۔

ان میں وجہ امتیاز سرمایہ کی وہ مقدار ہے جس کی ضرورت ان کے ابتدا کرنے اور فراہمی سامان میں ہوتی ہے۔ وزنی یا بڑے پیمانہ کی صنعتیں وہ ہوں گی جن میں ۳۰ لاکھ یا زاید سرمایہ لگانے کی ضرورت ہوگی اوسط پیمانہ کی وہ ہوں گی جن میں ایک لاکھ یا تیس لاکھ کے درمیان سرمایہ لگایا گیا ہے اور چھوٹی یا گھریلو صنعتوں میں ان کا شمار کیا جائے گا جن کا سرمایہ ایک لاکھ یا اس سے کم ہے۔ اس قسم کی تقسیم غالباً من مانی اور غیر علمی ہے لیکن اس کو اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ سرمایہ کی کمی و بیشی سے ہی عموماً کسی صنعت کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً پارچہ بافی کی صنعت ان تینوں قسموں میں شامل ہو سکتی ہے۔

بڑے پیمانہ کی صنعتیں | بڑے پیمانہ کی صنعتیں اس لئے اہم ہیں کہ عموماً ان میں بنیادی یا کلیدی صنعتیں شامل

ہوتی ہیں۔ ان میں ترقی یافتہ مشینری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بہت کثیر تعداد میں پیدا کی جاتی ہیں اور ان سے صنعتی انٹرپرائز اپنی اعلیٰ ترین شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ذیل کی بارہ صنعتوں کو اس قسم کی صنعتوں کا نمونہ سمجھنا چاہیے:۔

(۱) کان کنی ۔ کوئلہ، خام دھاتیں اور مٹی کا تیل۔

(۲) لوہا اور فولاد ۔ لوہا ڈھالنے والے اور فولاد بنانے والے کارخانے۔

(۳) انجینئرنگ کی صنعتیں ۔ انجنوں، پمپوں اور مشینوں کا بنانا۔

(۴) ریلوے پلانٹ جس میں رولنگ اسٹاک بھی شامل ہے۔

(۵) ہتھیار، بارود اور فوجی ذخائر۔

(۶) تیل کی طاقت سے چلنے والی گاڑیاں اور ہوائی جہاز۔

(۷) زرعی اوزار اور مشینیں۔

(۸) پانی سے پیدا کی ہوئی بجلی اور بجلی کے اوزار اور مشینیں۔

(۹) روئی اور اون کے کپڑے۔

(۱۰) سن کی صنعت

(۱۱) کیمیاوی صنعتیں۔ وزنی کیمیاوی اشیاء

(۱۲) جہاز سازی

وزنی صنعتوں کی طرف ان کی موجودہ حالت میں حکومت، بڑے بڑے تاجروں اور ساہوکاروں کو خاص طور پر توجہ اور پوری امداد کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے بہت بڑے سرمایہ اور با مہارت نگرانی کی ضرورت ہے تاکہ یہ قائم کی جا سکیں اور ان کا معقول انتظام جاری رکھا جا سکے۔ ان پر چونکہ قیمتوں کی تبدیلیوں اور غیر ملکی مقابلہ کا بہت اثر پڑتا ہے اس لئے ان کے لئے اس تمام تحفظ اور امداد کی ضرورت ہوگی جو روپیہ کی منظم قوت اور سیاسی اقتدار کے ذریعے سے دی جا سکتی ہے اور جس کے بروقت عطا کرنے کا کام قوم نے حکومت کو تفویض کر رکھا ہے۔

جب صوبوں کی حکومت کو خود مختاری مل جائے گی اس وقت تمام صوبوں کے نمایندوں کو یکجا جمع ہونا چاہئے اور اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر تمام ہندوستان کے لئے ایک پلین (منصوبہ) بنانا چاہئے تاکہ مندرجہ بالا بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو قائم کیا جا سکے۔ ہر صوبہ کو اپنے ذرائع اور آبادی کی فطری مناسبت کے اعتبار سے چاہئے کہ بڑے پیمانہ کی صنعتوں میں سے دو یا تین کی ابتدا کرنے اور چلانے کی ذمہ داری اپنے سر لے چاہے ابتدا میں اس میں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اگر ذمہ داری اس طرح تقسیم ہو جائے گی تو کسی ایک صوبہ پر بہت زیادہ بار نہ پڑے گا اور ملک میں بصورت مجموعی تمام ایسی صنعتیں قائم ہو جائیں گی جن کو ایک قومی اہمیت حاصل ہے۔

ہر صوبے کے بڑے بڑے تاجروں اور صناعوں کا حوصلہ بڑھانا چاہئے کہ وہ حکومت کی معقول امداد کے ساتھ اس قسم کی صنعتوں کو شروع کرسکیں۔ جہاں ذاتی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہ ہو سکے وہاں صوبہ کی حکومت کو مدد دینے کے لئے بڑھنا چاہئے۔ روپیہ قرض لینا چاہئے جیسا کہ مرکزی حکومت نے ریلوے اور آبپاشی کی تعمیر کے لئے لیا ہے اور اپنے صوبہ کے کاروباری طبقہ سے پوری طرح اشتراک عمل کرنا چاہئے۔ زیادہ ترقی یافتہ صوبوں میں بڑے بڑے تاجروں کو اپنے نفع کی خاطر خود مل جانا چاہئے اور ان صنعتوں کو شروع کرنے کے لئے آگے بڑھنا چاہئے اور یہ صورت اس وقت ممکن ہے جب انھیں اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ حکومت سخت غیر ملکی مقابلہ کی صورت میں یا ایسے دوسرے خطرات کے وقت جن کا مقابلہ ان کی طاقت سے باہر ہے ان کی پشت پناہی کے لئے اپنی پوری قوت اور ذرائع کے ساتھ آمادہ ہے۔ صنعتی ترقی میں صرف اس قسم کی حمایت نہ ہونے کی وجہ سے دقت اور دشواری ہے۔ اگر اس قسم کی حمایت حاصل ہو جائے تو سستی محنت اور وسیع قدرتی ذرائع کی بنا پر ہندوستان چند ہی سال میں صنعتی حیثیت سے بہت زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔

ہر سال ریلوے پلانٹ، رولنگ اسٹاک، ہتھیاروں، گولی بارود اور فوجی ذخائر کے لئے غیر ملکوں میں بہت روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ بعض سالوں میں ۳۰ کروڑ سے لے کر ۴۰ کروڑ تک اس طرح رقوم ادا کی جاتی ہیں۔ ۲۸-۱۹۲۷ء میں صرف ریلوے کے جو ذخائر خریدے گئے تھے ان کی قیمت ۳۶ کروڑ روپیہ تھی۔ اگر ایک سال میں جو روپیہ اس طرح خرچ کیا جاتا ہے وہ صرف سرکاری کارخانوں میں ضروری پلانٹ اور مشینری فراہم

کرنے میں لگادیا جائے اور عارضی طور پر عملہ بھرتی کر لیا جائے تو صرف چند سالوں میں ملک اپنی ضرورت کی چیزیں آپ پیدا کرنے لگے۔ یہی مقصد اس صورت میں بھی حاصل ہو سکتا ہے اگر پرائیویٹ فرموں کو کچھ امداد دی جائے اور مشینری اور پلانٹ معقول شرحوں پر طویل مدت کے لئے ان سے خریدنے کا معاہدہ کر لیا جائے۔

اوسط پیمانہ کی صنعتیں | یہ صنعتیں عموماً مشترکہ سرمایہ سے چلائی جاتی ہیں گو ان میں سے اکثر پرائیویٹ سرمایہ سے بھی چلتی ہیں۔ ان کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ صوبہ کی حکومت متعلقہ محکموں کی معرفت اس بات کا یقین دلائے کہ وہ نئی صنعتیں شروع کرانا چاہتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اشتراک عمل کے لئے تیار ہے۔ حکومت کو نہایت آمادگی کے ساتھ صوبہ کے قدرتی اور معاشی ذرائع کے متعلق جتنی گزشتہ پیمائشیں ہو چکی ہیں ان کے ریکارڈوں کو بڑے بڑے تاجروں اور ایسے لوگوں کے سامنے جنھیں صنعتوں کے بنانے سے دلچسپی ہے رکھنا چاہیئے۔

مقامی پبلک میں جو کاروباری لوگ ہیں انھیں دعوت دینی چاہیئے کہ وہ ایسی اسکیموں کو جن سے انھیں دلچسپی ہے حکومت کے سامنے رکھیں۔ تاجروں اور صناعوں کی انجمنوں کو مشورہ دینے کے لئے کہا جائے۔ اگر کسی صنعت کے لئے مقامی یا غیر ملکی ماہروں کا رکھنا اور ان کا صوبہ میں دورہ کرنا ضروری ہو تو ایسے آدمیوں کو بھی صوبہ کی حکومتوں کو ملازم رکھنا چاہیئے۔ ان ماہروں کو مقامی تاجروں اور ساہوکاروں سے مشورہ کرنا چاہیئے اور نئی صنعتوں کی ابتدائی تجاویز کو حکومت کے سامنے رکھنا چاہیئے اور یہ بتلانا چاہیئے کہ ان میں سے کونسی ان کی رائے میں نفع بخش ثابت ہوں گی۔ اس قسم کی ابتدائی تحقیقاتیں اگر کی گئیں تو ان سے پبلک کی دلچسپی بیدار ہوگی اور وہ اشتراک عمل کے لئے آمادہ ہو جائے گی اور دس بارہ ایسی صنعتیں ضرور نمودار ہو جائیں گی جن کے متعلق تفصیلی تحقیقات ضروری ہوگی اور ان میں سے کچھ سال کے اندر اندر شروع بھی کی جاسکیں گی۔

ذیل میں اوسط پیمانہ کی کچھ صنعتیں نمونہ کے لئے درج کی جاتی ہیں:۔

لوہے کے اوزار ڈھالنے کے کارخانے۔

انجنیری کی صنعتیں جن سے انجن، پمپ اور مشینیں بنائی جاتی ہیں۔

مصنوعہ فولاد

دھاتوں کے برتن بنانے والے کارخانے۔

اونی اور سوتی کپڑے کے متوسط کارخانے اور مصنوعی ریشم کے کارخانے۔

روئی اوٹنے اور دبانے والے کارخانے۔

کیمیاوی اشیا اور رنگ۔

شکر۔

کاغذ۔

دیاسلائی کے کارخانے۔

کیمیاوی کھاد۔

غذا اور مشروبات۔

شرابیں۔

تمباکو کی صنعت۔

صابن اور موم بتیاں۔

ربڑ اور ربڑ کی اشیا۔

ٹائل اور اینٹیں۔

مٹی کی صنعتیں جن میں سمنٹ، شیشہ، پتھر کی اشیا، پائپ وغیرہ شامل ہیں۔

چمڑے کی اشیا، کھالیں چمڑے رنگے ہوئے اور کمائے ہوئے۔

طباعت اور اشاعت۔

فوٹوگرافی اور سنما کی اشیا۔

کلاک اور گھڑیاں۔

ٹائپ رائٹر۔

ان میں سے بہت سی صنعتیں ملک کے مختلف حصوں میں اس وقت بھی چلائی جارہی ہیں۔ لیکن

ان کی تعداد کم، تنظیم ناقص اور پیداوار قلیل ہے۔ مناسب تامینی پالیسی اور حکومت اور بڑے بڑے تاجروں کے اشتراک عمل سے اس قسم کی صنعتیں بہت تیزی سے ترقی کر سکتی ہیں۔

چھوٹی صنعتیں | زراعتی شکل سے تجارتی اور صنعتی شکل اختیار کرنے کے لئے صنعتوں کو دستی صنعت کی منزل سے گزرنا پڑتا ہے۔ برطانوی قبضہ سے پہلے ہندوستان میں چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کا بہت رواج تھا۔ اس زمانہ میں ملک کو اپنی تمام ضروریات خود ہی مہیا کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور غیر ملکی تجارت کے فروغ سے بہت سی پرانی صنعتیں مثلاً لوہے، فولاد اور نمک کی صنعتیں باہر سے آئے ہوئے مال کے مقابلہ کی اہلیت نہ رکھنے کی وجہ سے تباہ ہوگئیں۔ جدید قسم کی صنعتیں آہستہ آہستہ جاری کی جا رہی ہیں لیکن رفتار میں وہ تیزی نہیں ہے جس کا مطالبہ ملک کی وسعت ضروریات اور رفتار آبادی کی تیزی کر رہی ہیں۔ پرانے قسم کی جو چھوٹی صنعتیں بچ گئی ہیں صرف وہ ہیں جو زراعت سے وابستہ ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مقامی صناعوں کی حوصلہ افزائی کی پالیسی پر مستقل طور پر عمل کیا جائے تو چھوٹی صنعتوں کی توسیع کا خاصا امکان پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں صرف ایسی چھوٹی صنعتوں کی سرپرستی کرنا چاہئے جو ضرورت کی چیزیں پیدا کرتی ہیں اور جن کی ملک کے اندر طلب پائی جاتی ہے۔

میونسپلٹیوں، لوکل بورڈوں، دیہی پنچایتوں اور مقامی انجمنوں کو چاہئے کہ وہ معقول رعائتیں اور سہولتیں فراہم کرکے اپنے علاقوں میں صنعتوں کی سرپرستی کریں۔ اس سے نہ صرف روپیہ کی گردش اور آبادی کی قوت خرید میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے مقامی حکومتوں کی آمدنی بھی بڑھے گی۔ انگلستان میں مقامی اداروں کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ وہ سرمایہ اور صنعتوں کو ہر طرح کا لالچ دے کر اپنے علاقے میں کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ذیل میں نمونہ کے لئے ایسی دستی، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کی فہرست دی جاتی ہے جنھیں آبادی کا بیشتر حصہ نفع کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے:۔

دھاتوں کے کام — لوہار، زراعتی اوزار اور مشینیں۔

دھاتوں کے برتن بنانا — تانبا، پیتل، المونیم وغیرہ۔

دستی سوت کتائی اور بنائی، روئی اوٹنا، ریشم کا دھاگہ کھینچنا۔
دری اور کمبل بنانا۔
آٹا پیسنا۔
چاول صاف کرنا۔
تیل کی گھانیاں لگانا۔
غذا کی پیداواریں۔ پھلوں کا ڈبوں میں بند کرنا مشروبات اور بوتلوں کے پانی۔
سگریٹ، بیڑی۔
اینٹیں، کھپریل اور ٹائل۔
فرنیچر، کرسیاں، میزیں، بنچیں، صندوق، کنگھیاں وغیرہ۔
مٹی کے برتن
چٹائی بننا، ٹوکری اور رسی بنانا۔
جوتا بنانا۔
شہد کی مکھی پالنا۔
کھلونے۔
نباتی رنگ، پالش، سیاہی وغیرہ۔
پنسل بنانا۔
بٹن بنانا۔
صابن بنانا۔
شیشہ کے کام، چوڑیاں۔
تام چینی کے برتن
چھپائی۔

جلد سازی۔

جدید طریقوں پر مکان بنانا۔

جرمنی اور جاپان جیسے ممالک میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو ملک کی دولت آفرینی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنی کے ۹۰ فیصدی صنعتی کارخانے چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں سے وابستہ ہیں اور ان میں آبادی کا ⅓ حصہ کام کرتا ہے۔ اسی طرح جاپان میں صنعتی کارخانوں کی بیشتر تعداد چھوٹے سائز کی ہے۔ ایک تازہ تصنیف[1] میں درج ہے کہ ان ۵۵ ہزار نو سو ۴۸ کارخانوں میں سے جن کی فہرست ۱۹۲۸ء میں بنائی گئی تھی۔ ۵۰ فیصدی ایسے تھے جن میں پانچ سے نو مزدوروں تک کام کرتے تھے اور صرف ۰.۵ فی صدی ایسے کارخانے تھے جن میں ایک ہزار یا زیادہ مزدور کام کرتے تھے۔

صنعتی تنظیم۔ اس کے خاص لوازم | صنعتی محکموں کا انتظام کچھ سالوں سے صوبوں کو سپرد کر دیا گیا ہے مگر مرکزی حکومت نے محاصل درآمد و برآمد کے ذریعے سے صنعتوں کی حفاظت، ساہوکارے کی سہولتوں کی نگرانی، محاصل ریلوے میں کمی بیشی اور تجارتی اور مالی حکمت عملیوں کی تشکیل کو جن سے صنعتی ترقی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ صنعتی مشاغل کی طرف پورے طور پر توجہ کرنے کے لئے صوبوں کے وزراء کے پاس نہ روپیہ ہے اور نہ اختیار۔ اسی لئے باوجود اس کے کہ نگرانی کو ان کے ہاتھ میں آئے چودہ سال گزر گئے ہیں لیکن پھر بھی صوبہ کی حکومتیں من حیث الجماعت اس قومی ضرورت کی طرف کوئی التفات نہیں کر سکی ہیں۔

صنعتی محکموں کو اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ تنظیم اور تعین حکمت عملی کے بڑے مسائل سے موثر طریقہ پر کوئی سروکار رکھیں اور بعض صوبوں میں ان کے مشاغل فنی مشورہ اور فنی اور صنعتی تعلیم کے ابتدائی درجوں تک محدود رہتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے آخری سالوں سے ان تاجروں کی کوشش سے جو ہندوستانی اور برطانوی کمپنیوں

---

[1] Harold G. Moulton : Japan – An Economic and Financial Appraisal (1932). صفحہ ۱۳۲

کو ترقی دینا چاہتے تھے کچھ بڑے پیمانہ کی صنعتیں قائم ہوگئی ہیں۔ بعض صوبوں میں صنعتی پیمائش کے کام بھی جزئی طور پر کئے گئے ہیں اور بقیہ صوبوں میں انفرادی طور پر بعض موجودہ یا مجوزہ اسکیموں پر بھی غور کیا گیا ہے۔ لیکن ان تحقیقاتوں کی نوعیت بہت محدود رہی ہے۔ بڑے پیمانہ کی جو چند صنعتیں پائی جاتی ہیں ان میں اور سرکاری صنعتی محکموں کے تعلقات میں کوئی زندگی نہیں پائی جاتی۔ اس بات کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی کہ ایسے پیمانہ پر ملک کی صنعتی ترقی کو جاری رکھا جائے جس کا ملکی مفاد اور ملک کی وسعت مطالبہ کر رہی ہیں اور ہر چند صنعتوں کا مسئلہ ملک کی بہبود کے مسائل میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی اس یتیم بچے کا آج کل کوئی والی اور وارث نہیں ہے۔

علاج | ملک میں ایک مناسب تنظیم کو شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صنعتوں کی ترقی کے لئے ایک تندرست ماحول پیدا ہو سکے۔ ذیل کی چند باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ کرنا چاہیئے۔

(۱) ایک عام ادارہ جس میں حکومت اور کاروباری لوگوں کے نمائندے شامل ہوں تاکہ باہمی اشتراک عمل سے ایک ایسی فضا پیدا ہو سکے جس میں صنعتیں تیزی کے ساتھ ترقی کریں۔

(۲) شہروں، ضلعوں اور دیہی علاقوں کے لئے ایک مقامی ادارہ یا کونسل جو ان معاملات میں مقامی کاروباری آدمیوں کی حوصلہ افزائی کر سکے۔

(۳) محاصل درآمد کے ذریعہ سے تامین و تحفظ۔

(۴) ساہوکارے کی سہولتیں۔

(۵) امداد و شمار کے ذریعہ سے معلومات فراہم کرنے کا معقول انتظام۔

(۶) کمپنی کے قانون اور منیجنگ ایجنسی کے نظام کے لئے ضروری قوانین بنائے جائیں۔

اس کے علاوہ جن ضمنی سہولتوں کی اور ضرورت ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نمائشیں اور تجارتی میوزیم۔

(۲) تجربہ اور نمائشوں کے مرکز۔

(۳) صنعتی ریسرچ۔

(۴) فنی اور تجارتی تعلیم۔

(۵) غیر ممالک میں ہندوستانی تجارتی کمشنر اور تجارتی معلومات جمع کرنے والے لوگ۔

(۶) نقل و حمل اور کرایہ کی سہولتیں۔

صنعتی ترقی کا جو مکمل پروگرام اختیار کیا جائے گا اس میں ان تمام سہولتوں کے فراہم کرنے کی ضرورت ہو گی۔ ان میں سے ہر عنوان کے متعلق جو وضاحت طلب امور ہیں ان کی تشریح جامعہ کی کسی اور اشاعت میں کی جائے گی۔

فاشزم

(بسلسلہ گذشتہ)

اشتراکیت کے بعد فاشزم جمہوری تخیلات کے سارے نظام کا مخالف ہے اور اسے نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے رد کرتا ہے۔ فاشزم اس کا منکر ہے کہ اکثریت محض اس وجہ سے کہ اکثریت ہے انسانی سماج کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ وہ منکر ہے کہ صرف اعداد وقتاً فوقتاً استفسار کے ذریعہ حکومت کر سکتے ہیں، فاشزم توانائی کی ناگزیر، مفید اور کارآمد عدم مساوات کا مقر ہے جسے عام حق رائے دہندگی جیسے مکانکی طریقوں سے کبھی بھی ہموار نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوری حکومت میں کبھی کبھی لوگوں کو با اقتدار ہونے کا مغالطہ سا ہو جاتا ہے، حالانکہ اصلی موثر اقتدار پوشیدہ اور غیر ذمہ دار ہاتھوں میں رہتا ہے۔ جمہوریت میں برائے نام تو کوئی بادشاہ نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت میں چاہے وہ غائب ہی کیوں نہ ہو بہت سے بادشاہ ہوتے ہیں اور یہ ایک اکیلے بادشاہ سے کہیں زیادہ مطلق العنان، ظالم اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فاشزم نے اگرچہ پہلے ۲۲ء میں مصلحت کی بنا پر جمہوریت کے موافق رویہ اختیار کیا تھا لیکن روم پر اقدام سے پہلے اسے ترک کر دیا۔ اس لئے کہ اس کو یقین ہو گیا تھا کہ ہیئت سیاسی کی شکل کا مسئلہ اس وقت تک کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اور موجودہ اور گذشتہ شاہوں اور جمہوریتوں کی مثالوں کا مطالعہ کرنے کے بعد فاشزم اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ شاہی اور جمہوریت کو کسی مطلق معیار سے نہیں جانچا جا سکتا، بلکہ یہ تو محض وہ شکلیں ہیں جن میں کسی خاص ملک کے سیاسی، تاریخی، روایتی اور نفسیاتی ارتقا نے اپنا اظہار کیا ہے۔ فاشزم نے شاہی اور جمہوریت کے نفاذ کو ختم کر دیا ہے حالانکہ جمہوریت اس نفاذ کے خیال کے ماتحت شاہی کی برائیاں جتلانے میں مصروف ہے اور اپنے کو مکمل طرز حکومت جتانے سے نہیں تھکتی، آج یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جمہوریتیں موجود ہیں جو سخت قدامت پسند مطلق العنان ہیں اور شاہیاں ہیں جن سے مستقبل کی نہایت قیمتی

جماعتی اور سیاسی امیدیں وابستہ ہیں۔

اپنے افکار فلسفیانہ میں رینان جو فاشزم کا ایک پیشرو تھا کہتا ہے: "عقل اور حکمت انسانیت کی پیداوار ضرور ہیں، لیکن عقل کو لوگوں سے براہ راست نکلا ہوا جاننا اور اسے لوگوں کے عمل کا بلاواسطہ نتیجہ سمجھنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ عقل کے وجود کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اسے سمجھ سکے۔ اور اگر ایسا ہونا ضروری بھی ہوتا تب بھی ایک ادنیٰ درجہ کی جمہوریت میں اس کا حصول ناممکن تھا جس کی فطرت ہی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر برتر تربیت کا خاتمہ کر دے۔ یہ اصول کہ سماج کا وجود ان تمام افراد کی خوشحالی اور شخصی آزادی پر منحصر ہے جن سے سماج بنی ہے قدرت کے منصوبوں کے مطابق نظر نہیں آتا۔ کہ قدرت کے کارخانہ میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف نسل کا خیال کیا گیا ہے اور فرد کو اس پر سے قربان کیا ہے۔ اس کا بڑا اندیشہ ہے کہ جمہوریت کے ایسے تصور کی (میں یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ لفظ جمہوریت کی مختلف تعبیریں کی جا سکتی ہیں) آخری منزل بس سماج کی یہ حالت ہوگی کہ ایک رذیل گلہ کو سوائے اس کے کوئی کام نہ ہوگا۔ کہ اپنی ادنیٰ خواہشات کے پورا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے"

یہ تھے رینان کے الفاظ۔ فاشزم جمہوریت کے اس بے معنی اور رسمی جھوٹ کا منکر ہے جس سے سیاسی مساوات کو جماعتی فقدان ذمہ داری کے پردہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ فاشزم اس جمہوریت کی 'مسرت' اور لامتناہی ترقی کے افسانوں کا بھی منکر ہے۔ لیکن جمہوریت کی مختلف تعبیریں ہو سکتی ہیں یعنی اگر جمہوریت سے مراد سماج کی وہ حالت ہو سکتی ہے جس میں عوام امور سیاسی میں بے اثر نہیں ہوتے تو فاشزم اپنے کو "منظم، مرکزی، با اقتدار جمہوریت" کہہ سکتا ہے۔

فاشزم نے سیاست اور معیشت دونوں میدانوں میں لبرل مسلک سے کامل مخالفت کا رویہ اختیار کیا ہے۔ مناظرہ و مباحثہ میں کامیابی کی خاطر لبرل مسلک کو گذشتہ صدی کی تاریخ میں بیجا مبالغہ سے کام لے کر غیر معمولی اہمیت نہ دینی چاہئے۔ اور نہ اس مسلک کو جو اس علم میں منجملہ بہت سے نظریوں کے

ایک نظریہ کے طور پر ظاہر ہوا تھا تمام انسانیت کے لئے ہمیشہ ہمیش کے لئے مذہب کی حیثیت دیدنی چاہیئے یہ مسلک ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوا، اس اتحاد مقدس کے خلاف جس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کو ۱۷۸۹ء سے پہلے والے زمانہ کی طرف دوبارہ لے جائے۔ اس مسلک کی کامیابی کا زمانہ عروج ۱۸۴۸ء تھا جب کہ پوپ پایس نہم تک لبرل تھا۔

اس سال کے بعد ہی اس میں سوال شروع ہوا۔ اس لئے کہ اگر ۱۸۴۸ء کو روشنی اور امید کا سال کہہ سکتے ہیں تو ۱۸۴۹ء تاریکی اور مصیبت کا سال تھا۔ جمہوریہ روما کو اسی سال ایک دوسری جمہوریہ' فرانس' نے ایک مہلک ضرب لگائی' اسی سال مارکس نے مذہب اشتراکیت کی ابتدا اپنے مشہور صحیفہ اشتراکیت' سے کی۔ ۱۸۵۱ء میں نپولین ثالث نے وہ سیاسی انقلاب کیا جسے کسی حال میں لبرل نہیں کہہ سکتے اور ۱۸۷۰ء تک فرانس میں حکومت کرتا رہا' اور تب جاکر اس عام برکت کی وجہ سے اسے تخت سے اتار اگیا جو تاریخ کی سب سے زیادہ فیصلہ کن شکستوں میں سے ایک شکست فوجی کا نتیجہ تھی۔ اس معرکہ میں فاتح بسمارک تھا جسے نہ اس مذہب آزادی کی کچھ خبر تھی نہ ان پیغمبروں کی جنھوں نے اس مذہب کی تلقین کی تھی۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایسی مہذب قوم جیسے کہ جرمن ہیں پوری انیسویں صدی میں اس مذہب آزادی سے بالکل ناواقف رہے۔ یہ چیز بس ایک جملہ معترضہ کے طور پر وہاں آئی جس کی نشانی وہ جماعت تھی جسے "فرانک فرٹ کی مضحکہ خیز پارلیمنٹ" کہتے ہیں اور جو بہت تھوڑے عرصہ قایم رہ سکی۔ ورنہ جرمنی نے اپنا اتحاد قومی لبرل مسلک سے بالکل باہر رہکر حاصل کیا کہ یہ مسلک تو جرمن ذہن کے لئے بالکل ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ذہن اصلاً شاہ پسند واقع ہوا ہے اور لبرل مسلک منطق اور تاریخ دونوں کے لحاظ سے نراج کا پیش خیمہ ہے۔ جرمن اتحاد کے حصول میں ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۶ء، ۱۸۷۰ء کی تین جنگیں منازل کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں رہنمائی کا سہرا ایسے' لبرلوں' کے سر ہے جیسے فان مولٹکے اور بسمارک۔

رہا اٹلی کا اتحاد قومی سو یہ بھی لبرل مسلک کا اس سے کہیں کم مرہون منت ہے جتنا کہ مینرنی اور گری بالڈی کا جو لبرل نہ تھے۔ اگر لبرلوں کا مخالف نپولین مداخلت نہ کرتا تو ہمیں لمبارڈی نہ ملتا' اور لبرلوں کی مخالف بسمارک کی مدد سے وادیور

میدان میں نہ ہوتی تو غالباً ہمیں ۱۸۶۶ء میں وینس کا صوبہ نہ ملتا، اور ۱۸۷۰ء میں ہم روم میں داخل نہ ہو سکتے۔ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ زمانہ تھا کہ خود اس مذہب کے پجاری اس کے شام زوال کے دھندلکے کو تسلیم کرنے لگے تھے، کہ اسے ادب کے انحطاط اور عمل کی رجعت نے شکست دے دی تھی۔

لبرل عہد نے ہر طرف بے شمار گتھیاں پیدا کر کے چاہا کہ گذشتہ جنگ عظیم کی خونریزی سے ان سب کو سلجھائے۔ کبھی کسی مذہب نے اپنے پیروؤں سے ایسی مہیب قربانی کا مطالبہ نہ کیا ہوگا۔ غالباً لبرل دیوتا خون کے پیاسے تھے! لیکن آج لبرل مذہب کو اپنے ویران مندروں کے دروازہ بند کرنے پڑے ہیں اس کے مندر اس لئے ویران ہیں کہ اقوام عالم نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی پوجا سے، جو معیشت کے میدان میں لاادریت اور اخلاق و سیاست میں بے پروائی کے مرادف ہے، قوموں کی تباہی یقینی ہے۔ اور موجودہ دنیا کی تمام سیاسی امیدیں لبرل مذہب کی مخالف ہیں۔ اس لئے یہ نہایت مضحکہ انگیز بات ہے کہ لوگ اس مذہب کو تاریخ کے فیصلہ سے ماوراء سمجھیں، جیسے کہ تاریخ انسانیت بس لبرل مذہب کے حاملوں ہی کی جولانگاہ ہے، یا جیسے لبرل مذہب ہی تہذیب کا ناقابل تغیر قول فیصل!۔

لیکن فاشزم جب اشتراکیت، جمہوریت، اور لبرل فلسفہ کا انکار کرتا ہے تو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ دنیا کو ۱۷۸۹ء سے پہلے والی حالت پر لانا لے جانا چاہتا ہے، کہ اسی تاریخ کو بعد کی نیم لبرل صدی کا نقطۂ آغاز کہہ سکتے ہیں۔

ہم پیچھے مڑنا نہیں چاہتے۔ فاشزم نے دی میتر کو اپنا رہنما نہیں بنایا ہے جس طرح کلیسائی اقتدار کی بے چون و چرا تسلیم پھر سے پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح مطلق العنان شاہی بس ہو چکی اور پھر سے واپس نہیں آ سکتی۔

اسی طرح منصب داری نظام کی رعایتیں بھی ہو چکیں، اور سماج کی تقسیم ایسی ذاتوں میں جن میں باہر سے کوئی داخل نہ ہو سکے ختم ہو چکی۔ فاشزم اور اس قسم کی ہیئت اجتماعی میں کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

ایک پارٹی جو پورے طور سے ساری قوم پر حکمراں ہو تاریخ میں بالکل نرالی چیز ہے، اس لئے اس کی مثالیں اور حوالے نہیں ملتے۔ اشتراک، لبرل مذہب، اور جمہوریت میں جو عناصر بھی زندہ ہیں اُنھیں فاشزم نے اپنی تعمیر میں استعمال کیا ہے۔ یعنی تاریخ سے جو چیزیں حقایق محکم کی حیثیت سے ملی ہیں انھیں لے لیا ہے اور باقی سب کو رد کر دیا ہے یعنی اس تصور کو کہ ہر زمانہ اور ہر قوم کے لئے ایک ہی مسلک ایک سا مفید ہو سکتا ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیجئے کہ اُنیسویں صدی اشتراک اور لبرل مذہب اور جمہوریت کی صدی تھی تو اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ بیسویں صدی میں بھی انھیں کی فرمانروائی رہے۔ سیاسی مسلک آتے جاتے رہتے ہیں، انسانیت باقی رہتی ہے۔ اور یہ توقع کرنا بیجا نہیں کہ یہ صدی حکومت و اقتدار کی صدی ہوگی، فاشزم کی صدی۔ اس لئے کہ اگر انیسویں صدی انفرادیت کی صدی تھی تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیسویں اجتماعیت کی صدی ہوگی یعنی ریاست کی صدی۔ اور اس میں کون سی بات منطق کے خلاف ہے کہ یہ نیا مسلک پچھلے مذاہب کے تمام زندہ اور حیات بخش عناصر کو کام میں لائے؟

فاشزم کی اساس ریاست کا تصور ہے، اس کی ماہیت، اس کے فرایض اور مقاصد۔ فاشزم ریاست کو حقیقت مطلق سمجھتا ہے جس کے مقابلہ میں سب افراد اور گروہ اعتباری ہیں، اور صرف ریاست کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے ان کا تصور ممکن ہے۔ لبرل ریاست کا تصور ایک ہدایت کرنے والی قوت کا تصور نہیں ہے جو ایک ہیئت اجتماعی کی مادی و روحانی نشو ونما کی رہنمائی کرتی ہو بلکہ ایک قوت کا سا تصور ہے جس کا کام بس نتائج کا درج کر لینا ہو، برخلاف اس کے فاشستی ریاست میں خود شعور ہے، اس میں اپنی قوت ارادی ہے، اپنی شخصیت ہے، یعنی اسے اخلاقی ریاست کہہ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں فاشست عہد کے پہلے پنج سالہ اجتماع میں میں نے کہا تھا:۔ "ہم فاشستیوں کے نزدیک ریاست بس محافظ کی حیثیت نہیں رکھتی جس کا کام صرف یہ ہو کہ وہ شہریوں کے شخصی تحفظ کا یقین دلا دے، نہ ان کے نزدیک یہ ایک تنظیم ہے جس کا مقصد خالص مادی ہو مثلاً زندگی کے ایک خاص معیار اور پرامن خوشحالی کی ایک خاص سطح کی ضمانت کرنا۔ اس لئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے تو ایک انتظامی کونسل کافی ہوتی۔ نہ ہماری ریاست خالص

سیاسی تخلیق ہے جسے اس حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں جو افراد اور کل قوم کی زندگی سے عبارت ہے۔

فاشزم نے ریاست کا جو تصور پیدا کیا ہے اور فاشزم نے جس ریاست کو قایم کیا ہے وہ بجائے خود ایک روحانی اور اخلاقی حقیقت ہے۔ اس کی سیاسی، عدالتی، اور معاشی تنظیم تو محض ایک محسوس چیز ہے اور لازم ہے کہ اپنی اصل اور اپنی نشو و نما میں یہ تنظیمات ایک روح کے مظاہر ہوں۔ ہماری ریاست داخلی اور خارجی تحفظ کی ضامن ضرور ہے مگر ساتھ ہی توم کی اس روح کی امانت دار اور اسے آگے منتقل کرنے والی بھی ہے جو صدیوں کی ترقی سے پیدا ہو کر ہماری زبان، ہمارے رسم و رواج اور ہمارے مذہب کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور ریاست صرف زمانہ حال ہی کی ایک جیتی جاگتی حقیقت نہیں بلکہ اس کا رابطہ ماضی سے بھی ہے اور اس سے بھی زیادہ مستقبل سے۔ یوں یہ انفرادی زندگی کی تنگ حدود سے متجاوز ساری قوم کی روح مضمر کی نائب ہے۔ ریاستیں اپنے کو جن شکلوں میں ظاہر کرتی ہیں وہ بدل سکتی ہیں مگر ایسی شکلوں کی ضرورت ازلی ہے۔

ریاست ہی شہریوں کو مدنی محاسن کی تعلیم دیتی ہے، یہی ان میں اپنے مقصد حیات کا احساس پیدا کراتی ہے، انھیں متحد کرتی ہے، عدل کے ذریعہ ان کے مختلف اغراض میں یکجہتی پیدا کرتی ہے، اور آنے والی نسلوں تک علوم، فنون، قانون، کی ذہنی فتوحات اور اتحاد انسانیت کا خیال منتقل کرتی ہے۔ ابتدائی قسم کی قبیلہ وار زندگی سے یہی انسانی قوت کے اعلیٰ ترین مظہر یعنی سلطنت تک لے جاتی ہے، یہ صدیوں تک ان کے ناموں کو باہم مربوط کر دیتی ہے جو اس کے وجود کی ضروری اور اس کے قوانین کی اطاعت میں جان دیتے ہیں۔ یہ ان فاتحوں کی جنھوں نے اس کی مملکت کے حدود کو وسیع کیا ہے، اور ان غیر معمولی شخصیتوں کی جنھوں نے اسے روشن کیا ہے یاد تازہ رکھتی ہے اور آنے والی نسلوں کے سامنے قابل تقلید مثال کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ جس قوم میں ریاست کا تصور دھندلا ہونے لگتا ہے اور انتشار کی قوتیں پھیلنے لگتی ہیں، چاہے افراد کی وجہ سے چاہے مخصوص گروہوں کی وجہ سے، تو وہ قوم زوال کے راستہ پر لگ جاتی ہے۔

۱۹۲۹ء سے لے کر آج تک کے تمام سیاسی و معاشی تغیرات نے ان نظری بیانات کی صحت کو ثابت کیا ہے اور ریاست کی اہمیت بھی ایسی ہی مہتم بالشان۔ یہی وہ قوت ہے جو نظام سرمایہ داری کے تصادمات کا

حل نکال سکتی ہے، اور بین الاقوامی پیچیدگیوں کو سلجھا سکتی ہے۔

جولس سائمن کی روح کہاں ہے جس نے لبرل مذہب کے دور ابتدائی میں یہ اعلان کیا تھا کہ "ریاست کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے کو غیر ضروری بنا دے، اور خود اپنی برخاستگی کی سبیل نکالے" یا میک کلاک کی، جس نے پچھلی صدی کے نصف آخر میں کہا تھا کہ ریاست کو بہت زیادہ حکومت کرنے سے احتراز کرنا چاہیئے! انگریز منتظم آج یہ دیکھ کر کیا کہتا کہ معیشت کے ہر شعبہ میں برابر ریاست کی مداخلت کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے حالانکہ اس کے نزدیک تو صنعت کو صرف یہ چاہیئے کہ ریاست اسے چین سے رہنے دے۔ یا جرمن ہم بولٹ جس کی رائے میں "سست" ریاست کو سب سے اچھی ریاست سمجھنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ لبرل معاشیوں کی دوسری نسل پہلوں کی بہ نسبت کم انتہا پسند تھی اور خود آدم اسمتھ نے وہ دروازہ کھول دیا تھا (اگرچہ کمال احتیاط کے ساتھ) جس سے معیشت میں ریاست کی مداخلت کی راہ نکلتی ہے۔ پھر بھی جب ہم لبرل مذہب کا نام لیتے ہیں تو مراد ہوتی ہے انفرادیت سے اور جب فاشزم کہتے ہیں تو مراد ہوتی ہے ریاست۔

لیکن فاشستی ریاست ایک انوکھی چیز ہے اور بے مثل۔ یہ قدامت پسند نہیں اس لئے کہ یہ ان عالمگیر مسائل سیاسی کے حل کرنے کی توقع رکھتی ہے جنھیں دوسرے ملکوں میں سیاسی فرقوں کی رقابت، پارلیمنٹ کی غیر معمولی قوت اور سیاسی جماعتوں کی غیر ذمہ داری سے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معیشت میں یہ مسائل کا حل سنڈیکیٹ کے نظام سے کرتی ہے جس کی اہمیت صنعت اور مزدوروں دونوں کے لئے روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اخلاق میں یہ نظم اور ضبط کا حامی ہے اور ملک کے مسلمہ قانون اخلاق کی اطاعت کرانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ فاشزم چاہتا ہے کہ ریاست مضبوط اور مؤیذ پر ہو اور اسے وسیع پیمانہ پر عام پسندیدگی بھی حاصل ہو۔ فاشستی ریاست نے تو اپنے اندر قوم کے معاشی مشاغل کو بھی شامل کر لیا ہے اور مختلف صنعتی جمعیتوں کے اجتماعی اور تعلیمی اداروں کے ذریعہ جو اس نے قائم کئے ہیں اس کا اثر قومی زندگی کے ہر گوشہ میں پہنچتا ہے اور اپنی اپنی تنظیمات کی معرفت قوم کی تمام سیاسی، معاشی اور اخلاقی قوتیں اس میں شامل ہیں۔

یہ ریاست جسے کروڑوں افراد کی حمایت حاصل ہے، جو اس کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں، برابر اس کی قوت کا احساس رکھتے ہیں، اور ہر وقت اس کی خدمت کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ یہ ریاست قرون وسطیٰ

کی پرانی ظالم ریاست نہیں ہے، نہ اس میں اور ان مطلق العنان حکومتوں میں کوئی بات مشترک ہے جو ۱۷۸۹ء سے پہلے یا بعد کو رہی ہیں۔ فاشستی ریاست میں فرد گھٹتا نہیں، تقویت پاتا ہے۔ جیسے فوج میں سپاہی اپنے دوسرے ساتھیوں کی وجہ سے کچھ کم نہیں ہو جاتا بلکہ بڑھتا ہے۔ فاشستی ریاست قوم کو منظم کرتی ہے مگر فرد کے لئے آزادی کا کافی میدان چھوڑتی ہے۔ فرد کو بے سود اور غالباً مضر آزادی سے ضرور محروم کیا جاتا ہے مگر جو ضروری آزادی ہے وہ برقرار رہتی ہے۔ ہاں اس بات کا فیصلہ کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری فرد نہیں کر سکتا، صرف ریاست کر سکتی ہے۔

فاشسی ریاست کو نہ بہ حیثیت عام دین کی حقیقت سے بے تعلقی ہے نہ اس مخصوص دین سے جسے اطالوی کیتھلک دین کہتے ہیں۔ البتہ ریاست کسی فرقہ وارانہ دینیات کو تسلیم نہیں کرتی بلکہ ایک مخصوص اخلاقی تعلیم کو تسلیم کرتی ہے۔ فاشستی ریاست دین کو روح انسانی کے عمیق ترین مظاہر میں سے تسلیم کرتی ہے اور اس لئے اس کا احترام ہی نہیں کرتی بلکہ اس کی حمایت و حفاظت بھی اپنا فرض جانتی ہے۔ فاشستی ریاست نے کبھی خود اپنا نیا خدا تراشنے کی کوشش نہیں کی جیسے کہ روبس پیر اور انقلاب فرانس کے انتہا پسندوں نے کی تھی، اور نہ اس نے انسانوں کے دلوں سے دین کے نقش کو مٹانے کی بے سود سعی کی جیسے بولشوزم کر رہا ہے۔ فاشزم راہبوں اور ولیوں کے خدا اور شجاع شہدا کے خدا کا بھی احترام کرتا ہے اور اس خدا کا بھی جسے سیدھے سادے عام لوگ محسوس کرتے اور جس کے آگے وہ سر عبادت خم کرتے ہیں۔

فاشستی ریاست قوت اور حکومت کے عزم کا مجسمہ ہے۔ اس میں روما کی قوت عمل کی روایت کارفرما ہے۔ فاشزم کے نزدیک حکومت کا اظہار رقبۂ مملکت یا فوجی اعتبارات سے اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ اخلاق اور روح کی کیفیات سے۔ فاشزم کو ایک سلطنت سمجھنا چاہئے یعنی ایک قوم جو براہ راست یا بالواسطہ دوسری قوموں پر حکمرانی کرتی ہے جس کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ وہ ان کے رقبۂ زمین سے ایک مربع گز بھی فتح کرے۔ فاشزم کے نزدیک اس سلطنت کی توسیع یعنی قوم کی توسیع زندگی کی لازمی نشانیوں میں ہے اور اس کے خلاف صورت انحطاط اور زوال کی علامت۔ جو قومیں ابھرتی ہیں یا زوال کے بعد پھر ترقی کرتی ہیں وہ ہمیشہ

سامراجی ہوتی ہیں، ترک و قناعت زوال اور موت کی نشانیاں ہیں۔ جو قوم اطالوی قوم کی طرح صدیوں کی ذلت اور پردیسیوں کی غلامی کے بعد ابھرنا شروع کرے اس کے رجحانات اور توقعات کی ترجمانی کے لئے فاشزم کا مسلک ہی سب سے زیادہ مناسب ہے۔

سلطنت کے لئے ضرورت ہے ضبط کی، قوتوں کے تعاون باہمی کی اور نہایت گہرے احساس فرض اور ایثار کی۔ اس بات سے فاشستی حکومت کے عملی پہلو کے بہت سے رخ سمجھ میں آسکتے ہیں، ریاست کی بہت سی قوتوں کی ماہیت معلوم ہو سکتی ہے، اور ان سخت کارروائیوں کی وجہ کا پتہ مل سکتا ہے جو ان لوگوں کے خلاف کرنی لازم ہیں جو بیسویں صدی میں اطالوی قوم کی اس ناگزیر حرکت کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں انیسویں صدی کے وہ فرسودہ خیالات پیش کرتے ہیں جنھیں ہر اس جگہ رد کر دیا گیا ہے جہاں لوگوں کو سیاسی اور جماعتی تغیر کے کسی بڑے تجربہ کی ہمت ہوئی ہے۔ قوم کو آج جس قدر حکومت، ہدایت اور نظم کی ضرورت ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ اگر ہر زمانہ کا اپنا مخصوص مسلک ہوتا ہے تو ہزاروں علامتیں اس بات کا پتہ دے رہی ہیں کہ ہمارے زمانہ کا مخصوص مسلک فاشزم ہے۔ اس لئے کہ اگر مسلک کے لئے زندہ چیز ہونا ضروری ہے تو فاشزم نے ایک زندہ یقین پیدا کر دیا ہے اور اس یقین کی قوت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ اس کے لئے تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور جانیں دیتے ہیں۔

فاشزم کو اب ان مذاہب کی سی عالمگیر حیثیت حاصل ہے جن کی تکمیل دراصل روح انسانی کی تاریخ کی ایک منزل ہوتی ہے۔

وارداتِ نفس

نہ مجھے ابر سے مطلب نہ تمنائے بہار ٭ دل کے بہلانے کو تھوڑی سی خوشی ہے درکار
ابر اُٹھا کریں، برسا کرے، بارانِ کرم ٭ سبھی اچھے ہیں، جو دم لے مری چشمِ خونبار
ایک سبزہ ہے کہ مدت ہوئی سوتے سوتے ٭ ایک میں ہوں کہ جو ہوں صبحِ ازل سے بیدار
سینکڑوں پھول ہنسے، سینکڑوں کلیاں پھوٹیں ٭ ٹوٹنا آبلۂ دل کا مگر ہے دشوار
ایک شبنم ہے کہ روتی ہے تو دم لے لے کر ٭ ایک میں ہوں کہ نہ ٹوٹا کبھی اشکوں کا تار
بزمِ احباب نہیں، خلوتِ مرقد بھی نہیں ٭ نہیں معلوم ہے زندوں میں کہ مُردوں میں شمار
ساکنِ دہر ہوں کہنے کو، مگر پھر کیا ہے ٭ آج تک تو کبھی دم بھر نہیں ٹھہرا دلِ زار
قلزمِ اشک میں طوفان کا عالم کب تک ٭ کبھی چڑھتے ہوئے دریا کا نظر آئے اُتار
زور ٹانگوں میں نہیں، قوتِ غم کے آگے ٭ ایک اک چاک جگر میں نے سیا سو سو بار
خود سے غربت کدۂ دہر میں آیا نہیں میں ٭ اور کے ہاتھ میں تھی باگ مگر تھا میں سوار
وہ خیابانِ عدم، اس سے کہیں بہتر تھا ٭ جس میں گل کا کوئی دھبا تھا نہ سیہ تابیِ خار
نہ کوئی نوحہ گرِ بسترِ شبہائے فراق ٭ نہ کوئی نغمہ کشِ صبحِ دل افزائے بہار
نہ سیہ خانۂ غم اور نہ زندانِ بلا ٭ نہ وہاں اہلِ جنوں اور نہ اہلِ آزار،
بدعتِ اہلِ جفا پاس نہیں جا سکتی ٭ اس سے نیچا ہے کہیں گنبدِ نیلی کا حصار
تنگیِ دہر سے جھپکی نہ کبھی آنکھ یہاں ٭ پاؤں پھیلا کے وہیں سوتے ہیں اصحابِ مزار
وہ تو اک جنتِ خاموش تھی کیا ذکر اس کا ٭ نہ کسی سے کوئی جھگڑا نہ کسی سے تکرار

وہی ٹھہرے ہوئے دل ہیں جو تڑپتے ہیں یہاں
وہی خاموش ہیں جو کرتے ہیں نالے ہر بار

احسن الکلام

لیجئے حسنِ عمل سے کام، احساں کیجئے ٭ کم سے کم کچھ خاطرِ بیمارِ ہجراں کیجئے
ہو کے خود معدوم، نام اپنا نمایاں کیجئے ٭ اٹھیے بعدِ مرگ بھی جینے کا ساماں کیجئے
جان کو مایوس، دل کو وقفِ حرماں کیجئے ٭ پھر کسی کو چاہیئے، پھر کوئی ارماں کیجئے
ہے دلِ بے مایہ تنہا، اور صدہا تیرِ ناز ٭ کہہ رہی ہے ہمتِ دل سب کو مہماں کیجئے
عشق ہے آوارہ قسمت، حسن ہے راحت نصیب ٭ آپ کیوں بے چین ہوں، ہم کو پریشاں کیجئے
ہو نہ جائے خونِ دل ناواقفیت میں کہیں ٭ آشنائے درد بن کر دل کا درماں کیجئے
میری وحشت ہی سے ہے جمعیتِ خاطر اگر ٭ بیٹھیے! نظارۂ چاکِ گریباں کیجئے
نقدِ دل دنیا لٹاتی ہے لٹانے دیجئے ٭ آپ کیوں حسنِ گراں مایہ کو ارزاں کیجئے
قیدِ غم میں کس طرح رہتے ہیں ہم آزاد و شاد ٭ یہ تماشا دیدنی ہے، سیرِ زنداں کیجئے
ڈھونڈھ لے گی ہر جگہ چشمِ تصور آپ کو ٭ جلوہ پنہاں رکھیے اپنا یا نمایاں کیجئے
حشر سے پہلے نہ ہو مشقِ خرامِ ناز ختم ٭ جتنے گھر آباد ملتے جائیں ویراں کیجئے
صدقے اس حسنِ تبسم کے، ہنسی جاری رہے ٭ دل کے زخموں پر ہی خالی یہ نمکداں کیجئے

ہو چکی صبحِ قیامت آخر، احسن آپ بھی
ختم اپنی داستانِ شامِ ہجراں کیجئے

غزل

آنکھیں[۵۱] ہیں بند تیری جو افسونِ خواب سے ؛ تجھ کو جگاؤں نغمۂ تارِ رباب سے

سرمایۂ حیات ہے میرے لئے وہ نور ؛ چھن کر نکل رہا ہے جو بند نقاب سے

برہم ہو نظمِ ہر دو جہاں ہو جو سامنے ؛ کونین کو قرار ہے اس کے حجاب سے

اُس حُسنِ لازوال سے مجھ بے کمال کو ؛ نسبت ہے وہ جو ذرہ کو ہے آفتاب سے

مجھ سے ہوا نہ شکر ترا ایک بھی ادا ؛ شرمندہ ہوں ترے کرمِ بے حساب سے

زاہد کو فکرِ لذتِ حُسنِ عمل نہیں ؛ اُس کو اگر غرض ہے تو بس ہے ثواب سے

اُس میں یہ حُسن و رنگ و طراوت بھلا کہاں ؛ تشبیہ لب کو دیتے ہیں برگِ گلاب سے

ہر چند سر پہ ہو وہ اک نامۂ عتاب ؛ تسکین دل کو ہوتی ہے تیرے جواب سے

ناکامیاب ہوں، مجھے غم نہیں جلیلؔ
خوش ہو رہا ہوں اپنے غمِ کامیاب سے

---

۵۱ یہ ایک روسی شعر کا انگریزی زبان کے واسطہ سے ترجمہ ہے جو ایک کہانی کے ترجمہ کے سلسلے میں ایک عزیز دوست کے فرمائش پر کیا گیا تھا۔ بعد کو غزل مکمل ہو گئی۔ (ج)

تنقید و تبصرہ

عربوں کی جہاز رانی | از مولٰنا سید سلیمان ندوی۔ تقطیع چھوٹی ضخم ۲۰۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ نہایت نفیس۔ قیمت مجلد صرف ایک روپیہ ملنے کا پتہ۔ آصف علی صاحب اصغر فیضی ام اے ۲۴۳ چوپاٹی روڈ بمبئی ۷۔

یہ کتاب مولانا کے اُن چار خطبوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کے ماتحت ۱۹۳۱ء میں پڑھے تھے۔ مولانا نے اپنی تحقیق کا آغاز عہد جاہلیت کے عربوں سے کیا ہے کہ عرب اس زمانے میں بھی جہاز رانی سے واقف تھے اس امر کا ثبوت انھوں نے بحریات کے عربی الفاظ اور زمانہ جاہلیت کے اشعار سے دیا ہے۔ نیز قرآن پاک کی آیتیں بھی پیش کی ہیں جن میں سمندر جہاز اور کشتی وغیرہ کا ذکر آیا ہے اس کے بعد عہد اسلام میں اس فن کی تدریجی ترقی کا ذکر ہے اس سلسلے میں آپ نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح عرب جہاز رانوں نے تجارت، یا جنگی پیش قدمیوں کے سلسلے میں تمام سمندر کو چھان ڈالا تھا اور اسے ایک مستقل فن بنا دیا تھا۔

مولانا نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد یہ مواد جمع کیا ہے اور بڑی خوش اسلوبی سے معلومات کا بہترین ذخیرہ فراہم کر دیا ہے اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہ تھی اور آیندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے ماخذ کا کام دے گی۔ کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی بہت نفاست سے کام لیا ہے۔ اور قیمت شاید افادۂ عام کے خیال سے بہت کم یعنی صرف ایک روپیہ رکھی ہے۔

نقش چغتائی | (دیوان غالب مصور) از خان بہادر محمد عبدالرحمٰن صاحب چغتائی۔ تقطیع متوسط ضخامت مع تصاویر دو سو صفحات قیمت ۵؎۔

مرقع غالب کے بعد یہ جناب چغتائی کی دوسری کامیاب کوشش ہے۔ اس میں بھی انھوں نے غالب

کے اشعار کی اپنے موئے قلم سے تشریح کی ہے۔ اس مرقع میں اُن کے پہلے مرقع کی طرح رنگوں کا سحر نہیں بجز ایک کے تمام تصاویر یک رنگ ہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ فنی اعتبار سے یہ کوشش پہلی کوشش سے کہیں زیادہ کامیاب ہے۔

شروع میں انتساب کے بعد چغتائی صاحب کا مختصر دیباچہ ہے پھر کسی مغربی نقاد کی تقریب یا تعارف ہے اس کے بعد ایک رنگین تصویر ہے اس کے بعد غالب کا دیوان شروع ہوتا ہے پہلا صفحہ رنگین ہے اس کے علاوہ پورا دیوان مرقع کی طرح بلاک پر چھاپا گیا ہے۔ خط نسبتاً باریک ہے جس سے خوش نمائی میں اضافہ ہوگیا ہے دیوان کے بیچ بیچ میں ۱۷۔ ۱۸۔ تصویریں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کمال فن کی حامل ہے، ہمیں یقین ہے کہ چغتائی صاحب کا یہ نقش مرقع کی طرح خواص و عوام میں مقبول ہوگا۔

مطلع الانوار | از مولانا مفتی محمد رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ۔ حجم نوے صفحات تقطیع چھوٹی کتابت وطباعت معمولی کاغذ اوسط درجے کا۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

مولانا انوار اللہ خاں مرحوم صدر الصدور و معین المہام امور مذہبی کی ذات اقدس محتاج تعارف نہیں آپ علمائے سلف کا ایک مکمل نمونہ تھے آپ کے علم و عمل اخلاق و روحانیت کا فیض صرف حیدرآباد تک محدود نہ تھا بلکہ ہند و بیرون ہند کے تشنگان علم اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے تھے۔ زیر نظر کتاب ان ہی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے جو ان کے شاگرد رشید مفتی محمد رکن الدین مرحوم نے لکھی ہے، کتاب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دورِ ابتلا میں بھی کیسی مقدس اور جامع ہستیاں ہم میں گذر چکی ہیں۔ مواد کی جمع و ترتیب میں محنت اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے البتہ بعض بعض جگہ حیدرآباد کی زبان کا اثر نمایاں ہے۔



دنیا کی رفتار

(الف) ممالک غیر

جنگ حبش اٹلی اور حبش کی جنگ اسی طرح چل رہی ہے جیسا کہ خیال تھا۔ اٹلی والوں نے شروع شروع میں اچھی کامیابیاں حاصل کیں۔ لیکن بعد کو رفتار اتنی تیز نہ رہ سکی۔ ان صفحات میں اس طرف توجہ دلائی جا چکی ہے کہ اٹلی کے لئے جنگ کی طوالت مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مالی حالت کی کمزوری، ساری دنیا کی رائے عامہ کی مخالفت، دوسروں ملکوں سے سامان اور ادھار ملنے کی دشواریاں سب یہی چاہتی ہیں کہ یا تو اٹلی جلد از جلد حبش کو ایسی شکست دے کہ اس کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں یا پھر ابتدائی کامیابیوں کے بعد گفت وشنید کا دروازہ پھر کھلے۔ اور کسی ایسی تقسیم پر سمجھوتہ ہو جائے جس سے اٹلی کو بھی بہت کچھ ملے لیکن دوسرے حقدار بھی محروم نہ رہیں۔ اٹلی نے جب ساری دنیا کے خلاف یہ جنگ شروع کی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی خواہش یہی ہوگی کہ کامل فتح سے یہ مسئلہ ہمیشہ کو طے ہی ہو جائے۔ اسی وجہ سے پیش قدمی کی موجودہ رفتار سے مسولینی غیر مطمئن معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک نئے سپہ سالار کے ذمہ جنگ کی قیادت کی گئی ہے۔ لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رفتار میں معتدبہ اضافہ مشکل ہوگا اور اگر آگے بڑھنے میں بہت تیزی کی گئی تو ممکن ہے پیچھے ہٹنے میں اس سے زیادہ عجلت کرنی پڑے۔ حبش کا ملک بہت دشوار گذار ہے اور حبشیوں کا شبخوں والا طریقہ جنگ ایک عظیم الشان جدید فوج کے لئے بہت مصیبت کا باعث بن سکتا ہے۔ پھر قدرت کی قوتیں موسم اور بیماریاں، اٹلی والوں کے لئے سدراہ ہیں۔

خود اٹلی کی اندرونی حالت خطرات سے بالکل خالی نہیں ہے۔ مسولینی کی مطلق العنان حکومت بیشک نہایت مضبوطی سے قایم ہے لیکن اس کی جڑوں میں کہیں کہیں گھن لگنا شروع ہو گیا ہے۔ جنگ کی رفتار ایسی نہ رہی جیسی اطالوی چاہتے ہیں تو ممکن ہے کہ یہ گھن زیادہ تیزی سے حکومت پر قومی اعتماد کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیں۔ آج بھی خود روما میں ایسی افواہیں سننے میں آتی ہیں کہ مسولینی شاہ اٹلی، ڈکٹر ایمانول

میں سخت اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک جہاز سپاہیوں کو لے کر جاتا ہے تو دو بیماروں کو واپس لے کر آتے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ سارڈینیا میں فوج نے جہازوں پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور مسولینی نے خود وہاں پہنچ کر انھیں غیرت دلائی اور میدان جنگ کی طرف روانہ کرایا۔ وغیرہ وغیرہ۔ مانا کہ یہ افواہیں ہیں لیکن ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر کا ہے۔ اور ایسے واقعات بھی ہیں جن سے ان افواہوں کو تقویت ہوتی ہے۔ مثلاً ابھی گذشتہ چند ماہ میں کئی سو ذہنی کام کرنے والوں کو یکایک گرفتار کر کے قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ روم میں امریکہ کے قنصل خانوں میں صبح سے شام تک ان اٹلی نژاد امریکنوں کا تانتا بندھا رہتا ہے جو پھر واپس آ کر اٹلی میں رہ پڑے ہیں لیکن اب اٹلی کو چھوڑ کر پھر امریکہ جانا چاہتے ہیں اور اپنی برائے نام امریکن قومیت سے فائدہ اٹھا کر اپنے اصلی وطن کو ترک کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ جرمن وزارت نشر و اشاعت کا ایک ہدایت نامہ حال ہی میں بعض انگریزی اخباروں کو ہاتھ لگا ہے جس میں وزارت نے اپنے ملک کے جرائد کو یہ ہدایت کی ہے کہ "اطالوی فوج میں بغاوت کی خبریں بالکل شائع نہ کی جائیں۔" اگر ایسی خبریں آ نہ رہی ہوتیں تو غالباً یہ ہدایت نہ دی جاتی! ملک کے مختلف طبقے بوجوہ غیر مطمئن معلوم ہوتے ہیں۔ مزدور غیر مطمئن ہیں اس لئے کہ فاشزم نے ان سے تو وہ قوت چھین لی جس سے وہ خود اپنی شرح اجرت کا اچھا سودا کر سکتے تھے لیکن بے کاری کو کم نہ کیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک بیکاروں کی تعداد پانچ گنی ہو گئی تھی۔ اب کچھ کمی ہوئی ہے وہ بھی اس جنگ کے عارضی مشاغل کی وجہ سے۔ فاشزم نے شرح اجرت میں تخفیف سے بھی مزدوروں کو نہیں بچایا۔ سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد سے اجرتوں کی شرح میں ۱۶ تا ۴۸ فیصد کی کمی ہو گئی ہے۔ اجرتیں گھٹتی تھیں تو گھٹتیں مگر اس عہد میں یہ بھی تو نہ ہوا کہ ضروریات زندگی کی قیمتیں بھی ساتھ ہی گھٹ جائیں۔ وہاں تو پچھلے ہی ایک سال میں ۲۵ ضروری اجناس کی قیمت میں اوسطاً کوئی ۱۰ فیصدی کا الٹا اضافہ ہو گیا ہے۔

کاروباری لوگ اور سرمایہ دار جو فاشستی ریاست کو اپنی بقا کا ذریعہ جانتے رہے ہیں اور دل و جان سے اس کے حامی و مددگار رہے، وہ بھی کچھ کچھ جھنجھلاتے جاتے ہیں۔ روز بروز کاروبار میں حکومت کا دخل بڑھتا جاتا ہے۔ منافع کی شرح تک حکومت کی طرف سے مقرر ہونے لگی ہے۔ کام کے وقت اور

اجرتوں کے فیصلہ کے معاملہ میں حکومت جا و بیجا دخل دیتی رہتی ہے، کاروبار بڑھانے کے لئے پہلے حکومت سے اجازت حاصل کرنی ہوتی ہے غرض بے شمار ایسے قوانین ہیں جن سے سرمایہ دار کی آزادی بالکل تلف نہیں تو بہت کم تو ضرور ہو جاتی ہے اور ان طبقوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا ہے کہ فاشزم جو ہمارے تفوق کو قائم رکھنے کے لئے اٹھا تھا کہیں دھوکہ دھوکہ میں اشتراکیت کو تو ہم پر مسلط نہ کر رہا ہو۔ اس شبہ کے ساتھ ہی یہ تاریخی بات بھی یاد آجاتی ہے کہ فاشزم کا بانی اور قائد اعظم مسولینی اس تحریک کو اٹھانے سے پہلے آخر تھا تو وہی اشتراکی!

زمینداروں کو فاشستی حکومت کی یہ کارروائی ذرا نہیں بھاتی کہ ان کی جو زمین بیکار پڑی ہو وہ ان سے لے لی جائے، نہ انھیں یہ پسند ہے کہ یہ اپنے کھیت کسانوں کو بٹائی کے اصول پر کاشت کے لئے دینے پر مجبور کئے جائیں۔

ساہوکاروں کے حلقوں میں بھی بے اطمینانی ہے۔ ابھی پچھلے سال دسمبر میں ایک حکم نافذ ہوا کہ جس اطالوی شہری کے پاس چاہے وہ اٹلی میں مقیم ہو یا نہ ہو کوئی پردیسی تمسکات، یا کمپنیوں کے حصے یا بنکوں میں یافتنی رقوم ہوں وہ سب کی فہرست اطالوی قومی بنک میں پیش کردیں۔ پانچ مہینہ بعد ایک اور حکم نکلا کہ ان کاغذات کو اسی بنک میں دیدیا جائے۔ بنکوں اور جمعیتوں کو یہ ہدایت ہوئی کہ اپنے تمام تمسکات کو موجودہ شرح مبادلہ پر اس قومی بنک کے ہاتھ فروخت کردیں۔ اطالوی سرمایہ کو باہر جانے سے روکنے کے لئے اور جو سرمایہ باہر جا چکا ہے اسے واپس لانے کے لئے یہ تدابیر خاصی موثر ہیں! اور ساہوکاروں کو ناگوار ہوں تو کیا تعجب۔ پھر اٹلی کا توازن تجارت بھی ملک کے خلاف ہی ہے، کہ آبادی بہت زیادہ ہے اور دولت آفرینی کے وسائل مادی مقابلۃً کم۔ ادھر لیرا کی قیمت کو مصنوعی طور پر ابھار کر اور سونے سے اس کی وابستگی قائم رکھ کر اس صورت حال میں اور بھی ابتری پیدا کردی گئی ہے۔

اور اب مصیبتوں پر مصیبت یہ کہ قائد اعظم نے جنگ کی ٹھان لی ہے، نہ معلوم یہ قصہ کب تک چلے اور اس کا مالی بار ملک سے اٹھ سکے نہ اٹھ سکے۔ یہ ضرور ہے پر اطالوی تا یہ عقیدہ ہے کہ

حبش کو اطالوی سلطنت میں شامل کرنے سے ہی ملک کی مشکلات کا حل ہو سکتا ہے۔ لیکن بہت سے سمجھدار لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اس کے لئے جنگ ضروری نہ تھی، سیاست کے دوسرے طریقے جن پر خود اٹلی عرصہ سے چل رہا تھا شاید کافی ہوتے کہ دوسروں نے بھی تو ان طریقوں سے دنیا کا کچھ رقبہ اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔ صرف ضرورت اس کی تھی کہ وزارت خارجہ کا کام تجربہ کار ہوشیار معاشیین کے ہاتھوں میں ہوتا۔ اور مسولینی خود ہی وزیر خارجہ نہ بن بیٹھا ہوتا۔ سب کام چپ چپاتے ہو جاتا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ بجائے اس کے مسولینی نے اس قدر شور مچایا کہ ایک غیر مہذب ملک کو ہڑپ کر جانے کا چھوٹا سا معاملہ سیاست عالم کا اہم سوال ہو گیا اور اٹلی ساری دنیا میں نکو بنا۔ اور صرف اسی معاملہ میں نہیں بلکہ اور موقعوں پر بھی اطالوی سیاست خارجہ ایسی رہی ہے کہ سوچنے سمجھنے والے اطالوی اس سے شاکی ہیں۔ ان کو شکایت یہ ہے کہ سیاست خارجہ میں کسی قسم کا تسلسل نہیں۔ ۳۲ء میں اٹلی جرمن کا دوست تھا، سال بھر بعد اس کا دشمن۔ ابھی فرانس کے یورپی اقتدار کا سب سے بڑا مخالف، ابھی اس کی پریم اور بھائی چارہ۔ انگلستان سے عمر بھر کی دوستی اور دیکھتے دیکھتے تعلقات میں وہ ترشی و تلخی کہ بیان سے باہر۔ فرانس کے یورپی اثر کو مٹانے کے لئے عرصہ تک جنگ کے شکست خوردہ ملکوں سے ساز باز رہا۔ پہلے ہنگری کو ساتھ لیا پھر آسٹریا کو۔ بلغاریہ کے بادشاہ کی زوجیت میں ایک اطالوی شاہزادی دی گئی۔ جرمنی کو اکسایا کہ صلح نامہ ورسائی میں ترمیم کراؤ۔

یہ سب کچھ ہوا مگر ادھر ہٹلر کا اقتدار جرمنی میں قایم ہوا ادھر جرمنی سے ان بن شروع ہو گئی۔ جرمنی نے اسٹریا سے اتحاد کی کوشش شروع کی تو یہ سمجھ میں آیا کہ صلح نامہ ورسائی کی ترمیم کا اثر تو خود اٹلی پر پڑے گا۔ اس تجویز کو شکست دینے کے لئے اسٹریا کو ابھارا گیا کہ وہ بھی ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں عنان حکومت دیدے اور ڈول فس کو عام شورش کے دبانے کے سارے ہتھکنڈے سکھائے گئے۔ مگر اس کے ہاتھوں اسٹریا کے اشتراکیوں کا قلع قمع ہو گیا تو پتہ چلا کہ اسٹریا کو نازی جرمنی سے بچانے کے لئے جو قوت تھی وہ اپنے ہی ہاتھوں تباہ ہو گئی اور جرمنی اور اسٹریا کے اتحاد کو روکنا پہلے سے کہیں زیادہ دشوار ہو گیا۔ پھر ہنگری سے اتنی دوستی اور محبت کا اظہار کرنے کے بعد شاہ الگزنڈر کے

قتل کے بعد صنبوا میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور یوں سب کیا کرایا ختم کر دیا۔ ہر چند آج بھی ہنگری پر اٹلی کا اثر باقی ہے مگر جرمنی سے اس کا رشتہ روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اور یوگوسلاویا اور بلغاریہ میں اتحاد کی کوششیں روبراہ آتی دکھائی دیتی ہیں سیاست خارجہ کی غلطیاں اور ناکامیاں عام لوگ تو نہیں سمجھتے مگر اوپر کے حلقوں میں ان سے بھی خاصی بے اطمینانی ہے۔

غرض مختلف طبقوں کو طرح طرح کی شکایتیں ہیں۔ مسولینی کا اقتدار قایم ہے۔ اس لئے یہ شکایتیں اہم نہیں معلوم ہوتیں۔ اگر جنگ میں قوم کو توقعات سے کم کامیابی ہوئی تو یہی شکایتیں مسولینی کے خلاف فرد جرم بن سکتی ہیں۔ اور جنگ کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا رنگ اختیار کرے اور کس قدر وقت لے۔

(ب) ہندوستان

سرحدی صوبہ اور ہندی صوبہ سرحد کے وزیر تعلیم سر عبدالقیوم نے گذشتہ جون میں ملکی زبانوں کے متعلق ایک یادداشت مرتب کی تھی جس کی بنیاد پر حکومت سرحد نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ابتدائی مدرسوں کے نیچے کے درجوں کو چھوڑ کر جہاں ہندی، گرمکھی، پشتو اور اردو وغیرہ کے ذریعہ سے حسب دستور سابق بچوں کو تعلیم دینا جاری رکھا جائے گا، باقی تمام اعلیٰ درجوں مڈل اسکولوں اور ایسے امدادی مدرسوں میں جہاں مذہبی تعلیم بھی دی جاتی ہے ذریعہ تعلیم صرف اُردو یا انگریزی رہیں گے البتہ طالب علموں کے لئے یہ ممکن ہوگا کہ وہ دوسری زبانیں بھی سیکھ سکیں۔ جہاں کہیں طلبا اس کی خواہش کریں گے اور انتظام ممکن ہوگا وہاں ان کے سکھانے کا ضرور بندوبست کیا جائے گا۔ لیکن "عام مضامین" کی تعلیم صرف "سرکاری" زبانوں میں ہی دی جائے گی اور اگر امدادی مدرسوں میں اس کی پابندی نہیں کی گئی تو ان کی امداد بند کردی جائے گی۔

ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے اس فیصلہ پر سخت احتجاج کیا جا رہا ہے۔ اخباروں میں مضامین نکل رہے ہیں گورنروں کے پاس وفد جا رہے ہیں۔ دھواں دھار تقریریں ہو رہی ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں کے

ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ انھیں ان کے مذہب اور تمدن سے محروم کرنے کی دانستہ طور پر کوشش کی گئی ہے اور ان کے تحفظ کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں تعلیم کی ہر منزل پر ہندی اور گرمکھی کو سرکاری، نیم سرکاری اور امدادی مدارس میں ذریعۂ تعلیم بنانے کی آزادی ہو اور ذریعۂ تعلیم کے اردو نہ ہونے کی وجہ سے وہ حکومت کی سرپرستی اور اعانت سے محروم نہ کئے جائیں۔

حقیقی صورت حال یہ ہے کہ لڑکوں کے تمام مدرسوں میں اردو اس اعلان سے پیشتر بھی ذریعۂ تعلیم تھی۔ اس لئے اس جدید فیصلہ سے ان مدرسوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کا اثر اگر کچھ پڑے گا تو صرف لڑکیوں کے اُن ستر اسکولوں پر جن میں ہندو لڑکیوں کو شاید ہندی اور گرمکھی کے ذریعۂ تعلیم دی جاتی ہے۔

وزیر تعلیم نے اپنے اعلان میں اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے لئے جو دلیلیں پیش کیں وہ یہ ہیں:۔

(۱) پشتو اور پنجابی گفتگو کی زبانیں ہیں۔ ان کا کوئی تحریری ادب نہیں ہے۔ اس لئے جو لوگ سرحدی صوبہ میں رہنا، کاروبار اور خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ مناسب ہے کہ اُردو کے ذریعہ جو سرحدی صوبہ کی تحریری زبان ہے تعلیم حاصل کریں۔

(۲) اردو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے اس کے اختیار کرنے سے دوسرے صوبوں کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں سہولت ہوگی۔

(۳) چونکہ سرکاری کاغذات اردو میں لکھے اور محفوظ رکھے جاتے ہیں اس لئے عملی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے بھی اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانا ضروری ہے۔

ہندوؤں کا اعتراض یہ ہے کہ

(۱) ہندوستان کے دس کروڑ ہندو، ہندی کے ذریعۂ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے تعلقات پیدا کرنے کی بہتر صورت یہ ہے کہ ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔

(۲) ہر چند ہندوؤں کی تعداد سرحدی صوبہ میں صرف ۵ فی صدی ہے لیکن لڑکیوں کے مدرسوں میں ان کا تناسب ۶۰ فی صدی ہے اور جو ہندو لڑکیاں مدرسوں میں تعلیم پا رہی ہیں انھیں سیاسی اور مدنی تعلیم

سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ (اگر قطعی طور پر نہیں تو زیادہ تر) تعلیم اس لئے حاصل کرتی ہیں کہ اپنی مذہبی اور تمدنی کتابوں سے مانوس ہو جائیں۔ یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ انھیں اپنی زبانوں اور سادہ روایتوں سے جبراً بے تعلق کرنا درست نہیں۔

اردو اور ہندی کے جس جھگڑے کا حال اوپر بیان کیا گیا ہے یہ ایک منفرد اور محدود قضیہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندو مسلم مسئلہ کا ایک جزوی شاخسانہ ہے۔ جب تک اس بڑے مسئلہ کا کوئی تشفی بخش حل نہیں نکلے گا اس قسم کے فتنے برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں معاشری تعلقات، راہ و رسم، رواداری اور دوستی پیدا نہ ہوگی، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، شادی غمی میں باہم شرکت کے مواقع نہیں نکلیں گے اختلاف کی خلیج برابر بڑھتی جائے گی۔ اگر ایسی ہی صورت حال چند دن اور قائم رہی تو ہندو اور مسلمان ہمسایوں میں اتنا فرق پیدا ہو جائے گا، جتنا دو غیر ملکوں کے باشندوں میں پایا جاتا ہے۔ معمولی گفتگو اور خط و کتابت کے لئے انھیں مترجم کو بلانے کی ضرورت ہوا کرے گی ایک دوسرے کے لباس، وضع قطع، تہذیب تمدن، مذہب اور رسم و رواج کو اس طرح حیرت سے دیکھا کریں گے گویا کسی دوسرے کرہ پر پہنچ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں یہ نہ خود آزادرہ کر جی سکیں گے نہ دوسروں کو جینے دیں گے صرف انگریزیا کسی اور غیر ملکی حکومت کا ڈنڈا انھیں ایک جوئے میں کس کر برابر برابر چلا سکے گا اور مشترکہ ضرورت کے کام ان سے لے سکے گا۔ تنگ نظری اور تعصب جو کچھ نہ کرائے کم ہے۔!

رسالہ "ہنس"

اگست کے شذرات میں ہم نے لکھا تھا کہ ہندی کانفرنس منعقدہ اندور نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک ایسا رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب ہر مہینہ "ہندوستانی" زبان میں پیش کیا جایا کرے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے منشی پریم چند صاحب کے ہندی رسالہ "ہنس" کو "ہنس" کمپنی لمیٹڈ نے اپنے انتظام و نگرانی میں لے لیا ہے اور اس کی ادارت کے فرائض انجام دینے کے لئے منشی پریم چند صاحب اور کنھیا لال منشی صاحب کا تقرر کیا ہے۔ کنھیا لال منشی صاحب گجراتی زبان کے ایک لائق ادیب ہیں اور منشی پریم چند صاحب (جن سے اردو داں طبقہ بخوبی واقف ہے) اُردو اور ہندی دونوں کے نہایت مشہور افسانہ نگار اور ادیب ہیں ان ہر دو حضرات کی مشترکہ ادارت میں ستمبر اور اکتوبر کے دو پرچے نکل چکے ہیں۔ ان میں ہندی، اُردو، گجراتی، مہاراشٹری، بنگالی، سندھی، کرناٹکی، سنہالی، ملاباری اور دوسری زبانوں کے ادب کو پیش کیا گیا ہے مضامین عموماً ادبی ہوتے ہیں جن میں نظموں، افسانوں، ڈراموں اور ادبی تنقیدوں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

یہ کوشش جس قدر لائق تعریف اور مفید ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جس وسیع ملک کے رہنے والے ہیں وہاں ایک زبان نہیں بولی جاتی بلکہ ۲۲۲ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی زبانیں محض بول چال میں استعمال کی جاتی ہیں اور ان کا تحریری ادب کوئی نہیں ہے لیکن چند زبانیں ایسی ہیں جن کے ادب کا ذخیرہ خاصا وقیع ہے اور انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے ۳۵ کروڑ ہم وطنوں کے دل میں کون سے جذبات، کون سے خیالات تمنائیں اور منصوبے پرورش پارہے ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنا کوئی خیال، کوئی پیغام ان ۳۵ کروڑ برادران وطن تک پہنچا سکیں تو ان کے ادب سے واقفیت حاصل کرنا بالکل ناگزیر ہے۔ ملک کے رہنماؤں نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں اس کام کی ابتدا کرکے ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنے کا تہیہ کیا ہے اور وہ

یقیناً اس کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔

لیکن "ہنس" کے جو دو پرچے نکلے ہیں ان میں جس زبان کے ذریعہ سے مختلف زبانوں کی مضامین کو پیش کیا گیا ہے، اسے "ہندوستانی" کہنا ہٹ دھرمی ہے۔ پہلے پرچہ میں سہائے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب کے ایک افسانہ کے اور دوسرے میں ایک نہایت ہی مختصر اُردو کی نظم کے باقی کوئی مضمون ایسی زبان میں نہیں لکھا گیا ہے جسے صحیح معنی میں "ہندوستانی" کے نام سے موسوم کیا جا سکے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ جو چیز اردو میں لکھی جائے صرف وہی "ہندوستانی" زبان کہلائے جانے کی مستحق ہے کیونکہ اُردو میں فارسی عربی کے بہت سے ایسے الفاظ آتے ہیں جو اُردو ادب نہ جاننے والے ہندوؤں کی سمجھ میں آسانی سے نہیں آسکتے۔ لیکن عربی فارسی کے بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں جو عام طور پر ہندوؤں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں اور جنھیں روزمرہ کی بول چال میں وہ بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ انھیں جان بوجھ کر زبان سے الگ کرنا اور ان کی جگہ سنسکرت بھاشا کے الفاظ استعمال کرنا "ہندی" ہو سکتا ہے لیکن "ہندوستانی" نہیں ہو سکتا۔

منشی پریم چند صاحب سے جو اردو اور ہندی دونوں کے ایک بلند پایہ ادیب ہیں ہمیں توقع تھی کہ وہ ایک ایسی صحیح "ہندوستانی" زبان کی داغ بیل ڈالیں گے جو ایک طرف غیر ضروری عربی فارسی اور دوسری طرف سنسکرت بھاشا سے آزاد ہوگی جو بجا طور پر ہندو مسلم میل جول اور ہندوستانی قومیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہوگی اور جس کو اردو اور ہندی دونوں کے ادیب اپنی مشترکہ زبان کہنے میں کسی قسم کا تامل نہ کریں گے بلکہ جس کو بولنا اور لکھنا اپنے لئے فخر و سعادت سمجھیں گے۔ یہ کام منشی پریم چند صاحب کے کرنے کا ہے قوم کی نگاہیں ان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین بہت اچھے ہیں اور انھیں لوگ عرصے تک یاد رکھیں گے لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان کی یاد کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھیں تو انھیں چاہئے کہ وقت اور موقع کے اس واحد مطالبے کی طرف وہ سب سے پہلے توجہ کریں۔ اگر ایسی "ہندوستانی" زبان میں رسالہ "ہنس" نکلنے لگے تو ہمیں پورا یقین ہے کہ اس کے ایڈیشن اُردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں یکساں طور پر مقبول ہو سکتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوفہ نے جامعہ میں پڑھے۔

پہلا خطبہ۔ عثمانی ترک بانیان سلطنت کی حیثیت سے۔ دوسرا خطبہ عثمانیوں کا زوال۔ تیسرا خطبہ۔ انقلاب اور جنگ۔ چوتھا خطبہ۔ ترکی اور جنگ آزادی۔ پانچواں اور چھٹا خطبہ۔ ادب تہذیب ساتواں خطبہ ترکی عورتیں۔ آٹھواں خطبہ۔ موجودہ حالت پر نظر اور مستقبل کی توقعات۔

اصل لیکچر انگریزی زبان میں تھے۔ اُردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہی۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کا مقدمہ ہی جو ترکی کی اجمالی تاریخ اور خود مصنفہ کے حالات پر مشتمل ہی۔ طباعت کتابت بہت اچھی کاغذ سفید و چکنا مصنفہ کی تازہ ترین تصویر حجم تقریباً (۳۰۰) صفحات اور قیمت صرف عا/ انگریزی نسخے کی قیمت سے ۲/

نجم السحر

ان گرانقدر ناولوں میں سے ہی کہ ایسے ناول اب تک ہماری زبان میں اُنگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ عذرا اور عذرا کی واپسی کے فرنگی مصنف رائڈر ہیگرڈ کا گویا تیسرا شہ پارہ ہی جو خوشی کی بات ہی کہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی۔ اے دہلوی سابق ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے بزرگ کے قلم سے ہماری زبان کا سرمایہ ناز بنا۔ جہاں مصنف کا کمال مسلمہ ہی مترجم کی خصوصیات ترجمہ بھی مترجمین کو قیمتی سبق دیتی ہیں۔ طباعت کتابت کاغذ وغیرہ اعلیٰ ۲۷×۱۷ سائز (۳۴۸) صفحے اور قیمت صرف (عہ)

تسہیل العربیہ

مدت سے عربی اُردو کی ایک جامع لغت کی تلاش تھی۔ خوشی کی بات ہی کہ اب ایک ایسا لغت تیار ہوگیا جسمیں ساٹھ ہزار عربی الفاظ اور ان کے اُردو معانی ہیں نئے علمی الفاظ اصطلاحات بھی شامل ہیں نیز قرآن کے محاورات و الفاظ کے معانی بھی خصوصیت سے درج ہیں۔ حجم دیباچے کے علاوہ (۱۰۰۰) صفحات جلد مُطلا قیمت صرف (للعہ/)

سخنوران ایران در عصر حاضر

ایران کی مردم خیز و شعر آفرین سرزمین شعر و ادب کا مرکز رہی ہی لیکن موجودہ انقلاب کے بعد وہاں کے شاعروں اور راویوں نے بھی پرانے ڈگر کو چھوڑ دیا ہی۔ غرضکہ ایران جدید کی اب ہر چیز جدید ہی اس بلند پایہ تصنیف میں عصر حاضر کے ایرانی شعرا کے حالات ہیں اور انکے کلام کا نمونہ شعرا کی تصاویر کے اعلیٰ بلاک ہیں۔ ہندوستان میں کم کتابیں اس اہتمام سے شائع ہوتی ہیں از پروفیسر محمد اسحاق کلکتہ یونیورسٹی۔ کتاب مجلد ہی۔ قیمت صرف (عہ/ ۱۲)

تاریخ و تنقید ادب

مقدمۂ شعر و شاعری۔ خواجہ الطاف حسین حالی	عہ/۸
آب حیات۔ مولوی محمد حسین آزاد	سے/
تاریخ ادب اُردو۔ رام بابو سکسینہ	لعہ/
سیر المصنفین۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ دو حصے	صہ/
تاریخ نثر اُردو۔ احسن مارہروی۔	صہ/
گلِ رعنا۔ مولوی سید عبد الحی مرحوم	صہ/
شعر الہند۔ مولوی عبد السلام ندوی مکمل مجلد	شے/
مراۃ الشعر۔ مولوی عبد الرحمٰن صاحب۔	سے/
دکن میں اُردو۔ نصیر الدین ہاشمی صاحب	عار/
پنجاب میں اُردو۔	عار/
محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ڈاکٹر محی الدین زور	۱۲ر
مخزن نکات (تذکرہ) مولوی عبد الحق صاحب	یہ/
تذکرہ ریختی۔ تمکین کاظمی	عہ/
چمنستان شعراء	صہ/۸
نکات الشعراء۔ میر محمد تقی میر	عار/۸
ایشیائی شاعری۔ سید امجد علی اشہری	عہ/
ہندی شاعری۔	عار/
روح تنقید۔ ڈاکٹر سید محی الدین زور	عہ/۱۲
تنقیدی مقالات۔ 〃 〃	بے/۱۴
اُردو کے اسالیب بیان 〃 〃	عہ/۱۴
جدید اُردو شاعری۔ عبد القادر صاحب سروری	سے/
موازنۂ انیس و دبیر۔ مولانا شبلی	بے/
تاریخ ادبیات ایران۔ پروفیسر براؤن	للعہ/

مقالات و مکاتیب

انتخاب مضامین سرسید۔	۱۲ر
مقالات شبلی چار حصے۔	للعہ/۱۲
نیرنگ خیال۔ مولوی محمد حسین آزاد۔ دو حصے	عہ/۸
مقدمات عبد الحق۔ دو حصے	صہ/
افادات سلیم۔ مولانا وحید الدین سلیم۔	عہ/۸
افادات مہدی۔ ایم مہدی حسن	بے/۸
مقالات نیاز۔ مولانا نیاز فتحپوری۔	۶ر
ادبستان۔ مولانا خلیقی دہلوی	عار/۸
انتخاب مخزن۔ لاہور۔	للعہ/
بقائے دوام۔ ایم۔ اسلم۔	عہ/۸
سیپارۂ دل۔ خواجہ حسن نظامی	عار/
مضامین چکبست۔ پنڈت برج نرائن چکبست	سے/
مقالات حالی۔ خواجہ الطاف حسین حالی	بے/۸
اُردوئے معلیٰ۔ خطوط غالب	عار/۸
عود ہندی۔ 〃	۱۲ر
خطوط سرسید	سے/
مکتوبات آزاد۔ مولوی محمد حسین آزاد	عہ/
موعظۂ حسنہ۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم	عہ/۱۴
مکاتیب امیر مینائی۔	عار/۸
مکاتیب۔ محسن الملک و وقار الملک	عہ/۸
مکاتیب شبلی۔ دو حصے۔	سے/
خطوط اکبر۔ دو حصے	عار/۸
رقعات عالمگیر شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر مجلد	للعہ/

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

جنوری سنہ ۳۶ء کے نگار میں کیا ہوگا؟

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ

ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب

اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات

برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ

ہریجن شاعری کے بے مثل نمونے

ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے

ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری

قیمت فی پرچہ دو روپیہ — نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں

نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے